سہ ماہی
اسلام آباد
ادبیات
امرتا پریتم نمبر
1919-2005

سہ ماہی ادبیات

شمارہ 85/86، اکتوبر 2009 تا مارچ 2010

مدیر اعلیٰ

فخر زمان

مدیر منتظم

ڈاکٹر راشد حمید

مدیر

محمد عاصم بٹ

اکادمی ادبیات پاکستان

ایچ ۸/۱، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد

ضروری گزارشات

☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ان کی آراء کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آراء نہ سمجھا جائے۔

☆ نگارشات ان پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔

قیمت

قیمت موجودہ شمارہ: 300 روپے

قیمت فی شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)، -/40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)

سالانہ (۴ شماروں کے لئے): 400 روپے (اندرون ملک)، 160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)

(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔ڈاک خرچ ادارہ ادا کرے گا۔)

طباعت: طارق شاہد 051 9250585

سرکولیشن: مسعود اقبال 051 9250578

مطبع: ماریہ پرنٹرز، راولپنڈی

اشاعت دوم: مارچ 2010ء

ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد۔

رابطہ: مدیر اعلیٰ: 0519250570، مدیر منتظم: 9250572 051، مدیر: 9250342 051

E-mail: academy@apollo.net.pk

حرف چند

امرتا پریتم برصغیر کی ان معدودے چند اہل قلم میں سے ایک ہیں جنہوں نے عالمی سطح پر شہرت حاصل کی۔ پنجابی زبان وادب میں امرتا پریتم کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے اور وہ بلاشبہ پنجابی کی سب سے معروف ادیبہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان کی تحریریں دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں' اور ان کے فکر و فن کے اثرات ان کے بعد کی نسلوں میں بھی اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

پنجاب کی دیہی زندگی' اور خاص طور پر ایک عورت کی نظر سے اس منظر نامے کی عکاسی جیسی امرتا پریتم کے ہاں موجود ہے اس کی مثال پنجابی ادب میں کہیں اور نہیں ملتی۔ عورتوں کی سماجی حالت زار کا بیان ہو، سماج کے کم تر طبقات کے حقوق کی پامالی کی داستان، یا خود اپنی ہڈ بیتی، امرتا پریتم کی تحریر کی بے باکی اور جرات اظہار پڑھنے والے کو اپنی شدت کا اسیر کر لیتی ہے۔ اپنی نظم "آکھاں وارث شاہ نوں" سے ہندوستان اور پاکستان بھر میں شہرت حاصل کرنے والی اس شاعرہ نے ناول اور افسانہ کے میدان میں بھی اپنی فنی عظمت کی گواہی لی اور بطور براڈ کاسٹر اور مدیرہ بھی ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔

"ادبیات" کے موجودہ شمارے میں ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ امرتا پریتم کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر جامع بات کی جائے۔ ہم امروز' احمد سلیم' افضل توصیف، ڈاکٹر ستندر سنگھ نور، ڈاکٹر رویل سنگھ اور ڈاکٹر امیہ کنور کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس خصوصی شمارے کی تکمیل میں ہماری معاونت کی۔

امید ہے یہ شمارہ آپ کو پسند آئے گا۔

فخر زمان

آئندہ خصوصی شمارے

درج ذیل موضوعات پر سہ ماہی 'ادبیات' کے آئندہ خصوصی شمارے ترتیب دیے جا رہے ہیں:

- جوش ملیح آبادی نمبر
- پرواسی ادب (بیرون ملک آباد پاکستانی اہل قلم) نمبر
- ن م راشد نمبر
- سعادت حسن منٹو نمبر
- عالمی مزاحمتی ادب نمبر
- غنی خان نمبر
- سوبھو گیان چندانی نمبر
- مجید امجد نمبر

فہرست

امرتا پریتم تاریخ ساز شخصیت	فخر زمان	13

چانن دی پھلکاری

(اردو مضامین)

احمد سلیم	امرتا پریتم، امروز۔۔ میں اور نانک مل کے روئے	21
اظہر جاوید	ایک بے چین روح	33
اعزاز احمد آذر	امرتا پریتم۔۔۔ایک سچی عورت	38
افضال شاہد	امرتا پریتم	44
افضل توصیف	امروز جی۔۔۔۔۔۔	47
ایم خالد فیاض	امرتا کے چند نسوانی کردار	57
پرتو روہیلہ	ایک شام امرتا پریتم کے ساتھ	65
تنویر ظہور	پھولوں کے درمیان امرتا پریتم سے ملاقات	68
حسن عباس رضا	عمر بھر ایک مُلاقات چلی جاتی ہے	74
حمید اختر	ساحر اور امرتا پریتم	81
خالد فتح محمد	'ایک لڑکی ایک جام' کا مطالعہ	87
ڈاکٹر سلیم اختر	حقیقت سے حقیقت تک کا سفر	91
رفعت ناہید	امرتا کا سولھواں سال: ایک چور	100
زاہد حسن	زندگی پروف کی غلطیوں سے بھری ہے	103
سلیم پاشا	محبت کی اسیر۔۔امرتا	107
شاہدہ دلاور شاہ	امرتا۔۔۔ایک تاریخ	113

شبنم شکیل	امرتا پریتم کی زندگی کے رس میں ڈوبی ہوئی باتیں	126
شبہ طراز	امرتا پریتم۔۔۔بس ایک ہاتھ کے فاصلے پر	132
شمع خالد	امرتا پریتم	139
صغرا صدف، ڈاکٹر	تخیل کو وجود بنانے والی ساحرہ	144
صوفیہ بیدار	پریت کی شہزادی	164
طاہرہ اقبال	امرتا پریتم۔۔محبت کا غنائی استعارہ	167
ظفر اقبال	امرتا پریتم ایک زندہ لیجنڈ	171
فرزند علی	ایک ملاقات	175
قاضی جاوید	امروز	178
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	امرتا پریتم	189
محمد منشا یاد	امرتا پریتم کی یاد میں	190
نبیلہ کیانی	امرتا پریتم	196
نسرین انجم بھٹی	امرتا پریتم مجھے کہاں ملی؟	199

(پنجابی مضامین)

احمد سلیم	دردو چھوڑے دا حال	202
افضل توصیف	میرا تیرا کیہ رشتہ؟	208
امیا کنور، ڈاکٹر	نیاز بوجھی شخصیت	214
بلوندر کور دھیر، ڈاکٹر	امرتا پریتم دی کاوسمویدنا	220
پال کور	رسیدی ٹکٹ دا لکھن جگت	226
تمارا کھوجائیوا	امرتا پریتم دا رچنا تمک راہ	233
تمارا کھوجائیوا	ناول کار امرتا پریتم	251
جسبیر بھلر	تڑکے گھڑے دا پانی	283
جسونت دید	پچھو تجی دس وے جوگی	289
حسین شاد	درد کتھا	298
دیوندر	میں کنا جاندا ہاں	306
دیوندر سنگھ دھالیوال، ڈاکٹر	امرتا پریتم دا پنجابی ناول وچ ستھان	311

ستندر سنگھ نور، ڈاکٹر	امرتا پریتم دا کاوشاستر	315
سجاد حیدر	جان پچھان	326
سدرشن گاسو، ڈاکٹر	وشو بھائی چارے اتے سد بھاونا دی شاعری	336
سرب جیت سنگھ، ڈاکٹر	امرتا پریتم کاوی دے کاوشاستری نکتے	345
سرجیت سنگھ کنجاہی، ڈاکٹر	ناری دی آواز۔۔۔امرتا پریتم	354
سرندر سنگھ کومل، ڈاکٹر	امرتا پریتم- 141 کوتاواں	358
سریندر شرما	امرتا پریتم نوں ست سوال	368
فرخندہ لودھی	وجوگ	375
کرانتی پال	امرتا پریتم پنجابی ساہت دامان	377
کرن دیپ سنگھ کرن، ڈاکٹر	امرتا پریتم نویں پرت ماناں دی سرجک	381
موہن جیت	گیت اکھراں والی ورن مالا	386

چانن دیاں چھٹاں
(اردو نظمیں)

احمد لطیف	کون کہے اب وارث شاہ کو	395
افضل احسن رندھاوا	امرتا پریتم کے نام ایک خط	396
دل نواز دل	امرتا پریتم کو یاد کرنے کی بھول	398
زبیر کنجاہی	امرتا پریتم	400
سلطان کھاروی	تیرا نام امر	401
شفیق احمد خان	امرتا پریتم کے لیے	402
عامر سہیل	نذر امرتا پریتم	403
نذیر قیصر	چانن دی چھاکاری	405
نذیر قیصر	امرتا پریتم کے نام	406

(پنجابی نظمیں)

آغا علی مزمل	امرتا پریتم جی دے نال	408

افتخار نسیم	امرتا پریتم واسطے	409
امریک سنگھ	امرتا پریتم	411
امیا کنور، ڈاکٹر	ہیر روح تے رانجھا قلبوت جانیو	413
انوپ ورک	امرتا پریتم دے مان	415
انیل سویرا، ڈاکٹر	پرنام	417
اوتار جیت	امرتا دے ناں	419
اوم کار سود بہونا	امر۔امرتا	420
ایرا کلی آباشی ولیش	شاعری دیاں لاٹاں	423
ایم اے رانا	امرتا پریتم	425
بلوندر سنگھ سندھا	امرتا پریتم	427
پال کور	بال امرتا	429
پرمندر جیت	ممتا تے اسیس دا چہرہ۔۔ امرتا پریتم	432
ترلوچن میر	چانن	436
جگ پال	اک شردھانجلی۔۔امرتا پریتم	438
جمیل احمد پالؔ	امرتا پریتم لئی اک نظم	441
دیوراج	توں دسیا۔۔۔	443
دیوتت	اک صدی اک ندی	445
رجندر سنگھ بھٹی	اٹھ دنیا دے مالکا	447
رخشندہ نوید	ہجراں دی ماری	450
رمیش کمار	دھی وارث دی۔امرتا پریتم	452
سرجیت پاتر	شاعرانہ روح	456
سردول سنگھ اجالا	غزل	458
سریندر کور	ساحر دے جان پچھوں	460
سلیم پاشا	تیرے ناں	462
شائستہ نزہت	اج یاد پیا کوئی آوے	463
صوفیہ بیدار	امرتا لئی	466
ظفر اقبال	تو موئیوں۔۔۔	467

ظفر اقبال	لبھیے وارث شاہ اک ہور	468
〃	کوئی ویل ودھائیے	469
〃	اسیں دونویں	470
〃	ایس طرح نہیں جاوی دا	471
〃	تیری اک بلا ہنگ	472
گربخش سینی	کوتا	473
لکھوندر باجوہ	یگ بیت گئے	475
منجیت کورانبالوی	ویہویں صدی دی لوہ	477
من موہن سنگھ راؤ	اک وہ صدی داو گوچا امرتا پریتم	481
موہندر کمار مودگل	امرتانوں	485
موہن جیت	امرتا	487
نائب سنگھ منڈیر	امرتا دے ناں	490
نرمل سنگھ، ڈاکٹر	ستویں وہی	492
نسرین انجم بھٹی	امر کہانی	495
ہربجن سنگھ رینو	توں بات پائی	497
ہرنیک سنگھ کلیر، ڈاکٹر	غزل	502

فیر تیہنوں یاد کیتا

امروز	امرتا لئی لکھیاں نظماں	505
امروز	تن دن ۔۔تن کال	522
امروز	ڈھپ رنگی	527

کتاب عشق

انتخاب نظم

گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ و انتخاب: احمد سلیم 535

میں جمع تو (ساحر اور امروز کے حوالے سے چند نظمیں)

لپی انتر :افضل ساحر،منیر گجر،طاہر سندھو 600

آکھاں وارث شاہ نوں، امرتا پریتم،
تڑکے گھڑے دا پانی، رب خیر کرے،
وے پردیسیا، توں نہیں آیا، سفر،اک خط،
محبت، عمر دی رات، ناگ منی، پنجواں چراغ،
کفر، بڑکی، انب دا بوٹوا، عرض، عشق،
اک ٹوٹا دھپ دا، ویکھ کبیرا رویا،لفظ، بستی،
آتم ملن، میرا پتہ، فیملی فوٹو گراف،سٹل لائف،
امروز چتر کار، وقت،میرے اتہاس دا اک پاتر،
پنجویں اداسی، نی مائے،
او میرے دوست میرے اجنبی، سورج، پل،
شکوہ، دوستو،

انتخاب نثر

کہانیاں
(گورمکھی سے شاہ مکھی میں منتقلی)

آڑوواں تے جامنواں دے راکھے	لپی انتر: جمیل احمد پال	645
کرماں والی	لپی انتر: جمیل احمد پال	652
اک نمبر دا فرق	لپی انتر: جمیل احمد پال	658
پردیسی	لپی انتر :افضل راز	666
بھابھی مورنی	لپی انتر :افضل راز	673
تیز دے کپڑے	لپی انتر :ڈاکٹر شائستہ نزہت	679
اک شہر دی موت	لپی انتر :ڈاکٹر شائستہ نزہت	684
نہ جانے کون رنگ رے	لپی انتر :ڈاکٹر شائستہ نزہت	692
اک رُمال اُک چھاپ تے چھانی	لپی انتر :قمر الزمان	700
انب دلور	لپی انتر :فیصل مقصود	712

(اردو زبان میں ترجمہ)

بُو	ترجمہ: میر تنہا یوسفی	720
کہانی در کہانی	ترجمہ: زاہد حسن	728
کینی کا سفر	ترجمہ: قمر الزمان	732
تہہ خانہ	ترجمہ: احمد اعجاز	743
جنگلی بوٹی	ترجمہ: خورشید قائم خانی	749
پانچ برس لمبی سڑک	ترجمہ: خورشید قائم خانی	758
مترا	ترجمہ: علی یاسر	767
سفید دھوتی زری کا کفن	ترجمہ: علی یاسر	770
اجنبی اندھیرا	ترجمہ: حمزہ حسن شیخ	772
مرکی عرف بلاکی	ترجمہ: الیاس بابر	777
ترشول	ترجمہ: الیاس بابر	783

ناول

پنجر	(گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ): قمر الزمان	788

مضامین

جہنم کی آگ		873
کجھ ہور وی روے	لپی انتر: جمیل احمد پال	876
ہم سب غدار ہیں	گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم	879
مصور امروز کا فن اور شخصیت	گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم	881
سیاہ حاشیہ	ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ: شبنم شکیل	888
گربن کتھا	پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: ازہر منیر	891
امروز	پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: علی یاسر	898

خطوط

	امرتا پریتم بنام مظہر الاسلام / احمد سلیم	903

نی جندے میریئے

بلونت گارگی	امرت کور سے امرتا پریتم تک	913

احمد سلیم (گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ و انتخاب) سرخ دھاگے کا رشتہ 926

زاہد حسن حدیث درد 940

اک ملاقات

آصف فرخی کتاب عشق کا اگلا ورق 943

سحر اچوہدری / شبنم شکیل حدیث دل 954

انگریزی تحریریں

Khushwant Singh — Amrita Pritam: Queen of Punjabi Literature

Kartar Singh Duggal — Virgin (English translation of Amrita Pritam's poem)

Ajeet Cour — An Era Vanishes

Fakhar Zaman — Amrita Pritam: A Great Wordsmith in Punjab's Literary History

Dr. Fatima Huassain — Amrita Pritam: The Dayen of Punjabi Literature

Hamza Hassan Sheikh — Amrita Pritam: A woman or Aphrodite

Hamza Hassan Sheikh — Amrita Pritam (english translation of Amrita Pritam's poem)

Hamza Hassan Sheikh — You Did'nt Come (english translation of Amrita Pritam's poem)

فخر زمان

امرتا پریتم۔۔۔۔تاریخ ساز شخصیّت

جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور پنجابی ادب پڑھنا شروع کیا تو امرتا پریتم کی شاعری کی کتاب ''نویں رُت'' مجھے بہت اچھی لگی۔ دراصل مجھے اس سے انسپریشن ہوئی کہ اپنی ماں بولی میں لکھنا چاہیے۔ اس سے پہلے میں نے پنجابی کے چند صوفی شعراء کو پڑھا ہوا تھا۔ امرتا پریتم کی شاعری نے مجھے بہت متاثر کیا بعد میں نے ان کی بہت سی تحریریں پڑھیں۔ یونیورسٹی کے بعد میں تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو پنجابی کی طرف رجوع کیا۔ اردو اور انگریزی میں تو پہلے ہی لکھتا تھا۔ لیکن اب پنجابی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ پہلے پنجابی ریڈیو ڈرامے لکھے' پھر پنجابی میں شاعری شروع کی۔ میری پہلی کتاب ''کنسو ویلے دی'' 1972 میں شائع ہوئی۔ میں نے یہ کتاب امرتا پریتم کو بھیجی۔

جب انڈیا ٹیلی ویژن ''دوردرشن'' پاکستان میں بھی دکھائی دینا شروع ہوا اور انہوں نے بھارتی فلمیں دکھانا شروع کیں تو ہمارے ہاں بھارتی چینل دیکھنے کا اس قدر شوق تھا کہ لوگ گھروں کے اُوپر بڑے بڑے اونچے اینٹینے لگا کر ان پر سلور کی تھالیاں باندھ باندھ کر انڈین چینل کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوردرشن سے نشر ہونے والا پنجابی ادبی پروگرام ''درپن'' جو امرتا پریتم پیش کرتی تھیں' میں بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ ایک شام امرتا پریتم نے میری کتاب ''کنسو ویلے دی'' کی شاعری پر بات شروع کی۔ اور کہا ''یہ بہت اچھی شاعری ہے۔ یہ نظمیں بالکل نئے شعور اور نئے احساس Sensibility کی ہیں۔ اور اب تک ہونے والی شاعری کو ایک نیا ٹرینڈ اور ایک نئی شکل دی ہے۔ اس میں جدیدیت ہے۔ بہت گہری ایمائیت اور سمبولزم ہے۔' انہوں نے مجھے ٹیلی ویژن پروگرام کے ذریعے مبارک باد دی۔

میں نے انہیں خط لکھا اور شکریہ ادا کیا اور کہا ''میرا حوصلہ بہت بڑھا ہے کہ اتنی بڑی شاعرہ اور ادیبہ نے میری شاعری کو اتنا پسند کیا ہے کہ ٹیلی ویژن میں آ کر اس کا خصوصی ذکر کیا ہے''۔ میرے خط کے جواب میں

امرتا جی نے لکھا ''مجھے تمہاری کتاب ملی، میں نے پڑھی اور مجھے بہت پسند آئی۔ جو چیز مجھے پسند آئے تو میں اس پر کھل کر اظہار کرتی ہوں''۔

اس کے بعد میری پنجابی شاعری کی دوسری کتاب ''ونگار'' شائع ہوئی پھر میرا ناول ''ست گواچے لوگ'' ہندوستان گیا تو اس کی چرچا میں شامل ڈاکٹر ہربھجن سنگھ، ڈاکٹر عطر سنگھ ایسے سکہ بند نقاد شامل تھے جنہوں نے لکھا کہ ''ست گواچے لوگ'' نے ہماری ناول کی راویت کو بدل دیا ہے۔ اب جو ناول لکھے جائیں گے وہ سب اس ناول کو سامنے رکھ کر لکھے جائیں گے کیوں کہ اس ناول نے ایک نیا موڑ دیا ہے۔ ''ست گواچے لوگ'' امرتا پریتم کو بھی اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے ٹی وی پر اس کا بہت ذکر کیا۔ اس کے بارے میں آرٹیکل لکھے۔ پھر میرا دوسرا ناول ''اک مرے بندے دی کہانی'' پھر ''بندی وان'' اور پھر ''بے وطنا'' انہیں بھیجا۔ اس دور میں ہندوستان میں آمدورفت بند ہوگئی۔ صرف خط و کتابت جاری تھی۔ ڈاک پر سنسر تھا۔ میری کتابوں پر ضیاء حکومت نے ''بین'' لگا رکھا تھا۔

اس لیے جب میں ملک سے باہر ہوتا تو امرتا پریتم کو خط لکھتا اور ٹیلی فون پر ملاقات ہوتی تو وہ بڑی خوشی کا اظہار کرتیں۔ مجھے امرتا پریتم کی تمام تحریریں پڑھنے کے بعد ان کے متعلق پوری جانکاری حاصل ہوگئی۔ خاص طور پر 1976 میں شائع ہونے والی ان کی خودنوشت سوانح عمری ''رسیدی ٹکٹ'' اور پھر 1977 میں سوانح عمری کا دوسرا حصہ ''میں جمع توں''۔

''رسیدی ٹکٹ'' نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی۔ بہت سارے لوگوں نے اعتراض کیا کہ انہیں بعض باتیں نہیں لکھنا چاہیے تھیں۔ میں سمجھتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل ان کے ہاں منافقت نہیں۔ وہ ہر بات سیدھے پیرائے میں کر دیتی ہیں۔ اپنے دوستوں کے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں، ادب کے حوالے سے اپنے نظریات کے حوالے سے کسی ڈپلومیسی کے تحت کچھ بھی چھپایا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں سچے فنکار کو ایسے ہی بات کرنی چاہیے۔

1947 میں ہندوستان کی تقسیم پر فرقہ وارانہ فسادات میں قتل و غارت گری ہوئی، اس پر امرتا پریتم کو ان کی نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول'' نے پنجابی شاعری میں امر کر دیا۔ پھر 1956 میں ان کی پنجابی شاعری کی کتاب ''سنیہڑے'' پر ساہتہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا اور پھر 1969 میں انہیں پدم شری کا ٹائٹل دیا گیا۔ 1973 میں انہیں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی

گئی۔ امرتا پریتم ورلڈ پیس کانگریس 1973 کے موقع پر ماسکو گئیں۔ اس سے پہلے 1961 میں وہ ماسکو کے رائٹر یونین کی دعوت پر تاشقند' تاجکستان' ازبکستان اور 1966 میں بلغاریہ اور 1967 میں حکومت نے انہیں ماسکو میں ثقافتی تبادلے کے سلسلے میں یوگوسلاویہ ہنگری اور رومانیہ بھیجا تھا۔

اس سب کی تفصیل انہوں نے ''رسیدی ٹکٹ'' میں درج کردی ہے لیکن 1980 میں بلغاریہ میں ملنے والا ایوارڈ بہت ہی اہم تھا۔ 1979 میں بلغاریہ نے اپنے انقلابی شاعر نکولا واپتسا روف کے نام پر پہلی بار ایوارڈ دینا شروع کیا اور دنیا میں روس' امریکہ' اٹلی' پولینڈ اور ہندوستان کے پانچ ادیبوں کو یہ ایوارڈ دینے کے لیے منتخب کیا۔ تو ہندوستان سے صرف ''امرتا پریتم'' کا نام سامنے آیا۔

16 اکتوبر 1980 کو باقاعدہ ایک تقریب میں امرتا پریتم کو یہ ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈ کمیٹی کے صدر پنچودان چیف نے اپنی تقریر میں کہا۔ ہم بلغارین ادیب اور سب لوگ خوش ہیں کہ ہندوستان کی ممتاز اور مشہور ادیبہ اور شاعرہ ہماری دوست ہے۔ ہم اپنے ملک بلغاریہ میں امرتا پریتم کی تحریروں کو شائع کرتے ہیں اور پیار کرتے ہیں کیوں کہ امرتا پریتم کی شاعری سماجی شعور اور انسانی بہتری کے لیے جدوجہد کو تسلیم کرتی ہے۔

امرتا پریتم کو آزادی کا نشان (پیتل کا ایک زخمی پرندہ جس کے دونوں پر آسمان کی طرف پھیلے ہوئے ہیں) اور ایوارڈ کی آدھی رقم 1300 ڈالر نقدی کی صورت میں دیا گیا۔ امرتا پریتم کو یہ اعزاز انٹرنیشنل صوفیہ میٹنگ آف رائٹرز میں شامل ہونے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس تقریب میں 22 ملکوں کے ادیبوں نے حصہ لیا۔

1983 میں امرتا پریتم کو وشو بھارتی یونیورسٹی اور جبلپور یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔ 1986 میں امرتا پریتم راجیہ سبھا کے لیے نامزد ہوئیں۔ یہ 1987 کی بات ہے۔ میں ملک سے باہر ہالینڈ میں تھا۔ مجھے پنجابی کی نامور فکشن رائٹر اجیت کور نے دہلی میں ہونے والی دوروزہ ''پنجابی کہانی کانفرنس'' کے لیے دعوت دی۔ میں دہلی پہنچا۔ کانفرنس کے بعد امرتا جی کو فون پر بتایا کہ میں دہلی میں ہوں۔ انہوں نے کہا 'فوراً سیدھے میرے گھر چلے آؤ'۔ میں K-25 حوض خاص ان کے گھر پہنچا اور تین دن اور تین راتیں وہاں گزاریں۔ وہ لمحے میری زندگی کے سنہری لمحات میں شامل ہیں۔ امرتا پریتم سے مختلف حوالوں سے ادب سیاست اور تصوف پر گفتگو ہوئی۔ پنجابی زبان ادب اور ادیبوں کے بارے میں۔ ہندو پاک تعلقات کے حوالے سے تبادلہ خیال ہوا۔ انہیں پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کے دور میں میری پنجابی کتابوں پر پابندی کا علم تھا۔ جب میں نے انہیں اپنے ناول ''بندی وان'' کی ڈرامائی تشکیل کی ویڈیو دیکھنے کے لیے کہا تو

انہوں نے حیرانی سے پوچھا کہ کتابوں پر پابندی کے باوجود آپ نے اس ناول کو ڈرامے کے رُوپ میں کیسے پیش کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب ضیاءالحق نے چادر اور چار دیواری کا احترام کرتے ہوئے چار دیواری کے اندر ادبی ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی اور ہم نے پہلی عالمی پنجابی کانفرنس لاہور 1986 کے موقع پر یہ ڈرامہ گھر کی چار دیواری میں دکھایا تو ایک دوست نے اس ڈرامے کی ویڈیو ریکارڈنگ کر لی۔ یہ ریکارڈنگ گھریلو ویڈیو کیمرے سے کی گئی تھی، اس لیے تکنیکی اعتبار سے کمزور ہے۔ بہرحال ایک دستاویز تو ہے۔

امرتا پریتم نے کہا میں نے ناول ''بندی وان'' پڑھا ہے لہٰذا میں جان سکتی ہوں کہ اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کتنے دل گردے والے شخص نے کی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے ناول کا ایک ایک کردار درد کی چبھن بن کر آنکھوں سے بہتا گیا۔ ڈرامائی تشکیل ممتاز ادیب احمد سلیم نے کی تھی۔

امرتا پریتم نے ''بندی وان'' کی ڈرامائی تشکیل کی ویڈیو دیکھی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی اُداس ہو گئی تھیں۔

اُردو ادیبوں نے دوسرے دن ''قلم زار'' تنظیم کی طرف سے مجھے استقبالیہ دیا جہاں اُردو کے ادیب قمر رئیس کی صدارت تھی اور مہمانِ خصوصی کے لیے امرتا پریتم سے کہا گیا تھا۔ امرتا پریتم عام طور پر گھر سے نہیں نکلتی تھیں۔ اور ادبی تقریب میں تو وہ بالکل نہیں جاتی تھیں۔ لیکن انہوں نے مہربانی کی کہ مہمانِ خصوصی بننے پر رضامند ہوئیں بلکہ انہوں نے اس تقریب میں میری شاعری اور ناولوں خاص طور پر ''بندی وان'' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ''فخر زمان اپنے ناول ''بندی وان'' میں زیڈ کا کردار پیش کرتے ہیں تو زیڈ کہتا ہے، 'کل جو انسان قتل ہوا تھا وہ بھی میں تھا۔ آج جو قتل ہو رہا ہے وہ بھی میں ہوں' آنے والے کل میں جو قتل ہوگا وہ بھی میں ہوں گا۔' میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت میرا یہ عالم ہے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ وہ زیڈ فخر زمان بھی ہے اور میں بھی۔ مجھے اس وقت فراق گورکھپوری بہت یاد آ رہے ہیں جو اکثر ایک بات سنایا کرتے تھے۔ ادبی تاریخ میں جنت اور جہنم کا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا والوں نے یہ دیکھا کہ یہ شاعر ادیب ہیں، یہ پتہ نہیں عوام کا دکھ اپنے دلوں میں کیوں بسا لیتے ہیں کہ پھر ساری زندگی تڑپتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں عوام کے غم سے کوئی سروکار نہیں ہوگا انہوں نے زندگی کو دو نام دیئے ایک جنت جو ان کی اپنی زندگی کے لیے تھی ایک دوزخ جو شاعروں اور ادیبوں کے لیے تھی۔ پھر ایک دفعہ جنت میں ایسی ٹھنڈی ہوا چلی کہ لوگ سردی سے کانپنے لگے۔ انہوں نے سوچا جہنم میں بہت آگ جلتی بجھتی ہے، اس لیے تھوڑی آگ جہنم سے مانگ لی جائے۔ لیکن جب

انہوں نے اہل جہنم سے آگ کی فرمائش کی تو جہنم سے جواب آیا کہ ادھر فالتو آگ نہیں ہوتی۔ ادھر جو لوگ آتے ہیں وہ اپنی آگ ساتھ لے کر آتے ہیں۔'

تو ایسی ہی آگ شاعروں اور ادیبوں کے سینوں میں جلتی ہے۔ یہ آگ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ اس آگ کو حاصل کرنے کے لیے شاعر یا ادیب ہونا ضروری ہے۔ یہ جو آج کی منفی قوتوں کے اندھیرے میں شعور کی آگ فخر زمان کی صورت میں جلتی ہے' آج ہم سب بھی اپنی اپنی آگ سینوں میں لے کر ان کی آگ کا استقبال کرنے کے لیے آئے ہیں''۔

میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میں تو ویسے ہی امرتا پریتم جیسی بڑی شخصیت کے ساتھ سٹیج پر بیٹھا فخر محسوس کر رہا تھا۔

دہلی میں امروز اور امرتا جی کے ساتھ شہر میں بھی گھوما۔ امرتا پریتم پچھلے پہر آرام کرتی تھیں۔ ہم شام کو بیٹھ جاتے تھے پھر باتیں شروع ہو جاتیں۔ کچھ کتابوں کا ذکر ہوتا۔ میرے اصرار پر وہ کوئی نئی نظم سناتی' رشیوں' منیوں' صوفیوں اور درویشوں کے حوالے سے اپنے تجربات و مشاہدات کا ذکر کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بارے میں ایک دو ڈاکومنٹریز دکھائیں جو بہت ہی خوبصورت بنی ہوئی تھیں۔ میرا مطلب ہے تین دن میرے لیے اپنے گھر جیسا ماحول تھا۔ بالکل جیسے آپ اپنے Parents کے ساتھ رہ رہے ہوں۔ بالکل اسی طرح امرتا جی دوپہر کا کھانا پکا رہی ہیں' روٹیاں بنا رہی ہیں' امروز وہیں باورچی خانے میں میز پر روٹیاں رکھ رہا ہے' سالن رکھ رہا ہے۔ کبھی امروز چائے بنا رہا ہے۔ کبھی میں ہاتھ بٹا رہا ہوں۔ مطلب یہ کہ بالکل اپنے گھر کے فرد کی طرح میں وہاں رہا۔ مجھے انہوں نے سونے کے لیے جو کمرہ دیا وہ ان کی لائبریری تھی اور جس میں بہت اہم کتابیں تھیں چنانچہ ان دنوں مجھے جو بھی وقت ملتا، میں صبح جلدی اُٹھ جاتا اور کتابیں دیکھتا رہتا تھا۔

میں نے کہا آج کل آپ شاعری بہت کم کر رہی ہیں اور آپ نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کی ہندی میں شاعری'' کاغذ اور کینوس'' شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا:

''شاعری میں نے ویسے ہی بہت زیادہ نہیں کی۔ جب محسوس کرتی ہوں کہ شاعری کرنی چاہیے تب میں شاعری کرتی ہوں۔ میں کبھی زبردستی یا Conscious Effort نہیں کرتی کہ کوئی نظم لکھوں۔ ہندی کی بہت ریڈرشپ ہے اس لیے ہندی میں لکھنا بھی ضروری ہے۔''

1987 سے اب تک میں کوئی پندرہ بار ان سے مل چکا ہوں۔ 1987 میں انہیں پنجاب یونیورسٹی نے

ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری اور اسی سال فرانس کی حکومت نے بھی انہیں اعزازی ڈگری سے نوازا۔ جبکہ 1989 میں بمبئی کی ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی نے بھی انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی اور 1990 میں پنجابی اکیڈمی دِلّی نے انہیں وارث شاہ ایوارڈ دیا۔ انہوں نے مجھے ایک کتاب دی جس میں تین ہزار رائٹرز تھے۔ ان میں ''میں'' بھی شامل تھا۔ انہوں نے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے رائٹرز کے بارے میں اور ان کی تحریروں کے بارے میں لکھا اور اس کے بعد ایک ہندی کی کتاب دی جس میں ایک خاص چیپٹر مجھ پر لکھا تھا۔ دو چار انگریزی میں آرٹیکل بھی میرے بارے میں لکھے۔ یہ سب باتیں میرے لیے بہت ہی بڑی باتیں ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امرتا پریتم ایک بہت ہی عمدہ شخصیت تھیں۔ ایک بہت بڑی انسان' فراخ دل اور امن کی پرچارک' محبت کی پیغامبر اور بہت ہی روشن خیال اور ترقی پسند نظریات کی حامل خاتون تھیں جس نے روایت کی اس طرح پاسداری نہیں کی جس طرح ہمارے ہاں روایتی کھوبہ (دلدل) میں لوگ دھسے ہوئے ہیں اور ساری زندگی ایک غلط اور جھوٹے قسم کے ڈسپلن کے تحت گزارتے ہیں۔

امرتا پریتم نے ساری زندگی ڈسپلن توڑے اور روایات سے بغاوت کی۔ اسی لیے زندگی میں انہیں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ زندگی میں انہیں امروز کی صورت میں اچھا رفیق' دوست اور ہمسفر ملا۔ امروز سے ان کی پہلی ملاقات 1955 میں ہوئی اور دوستی 1960 میں شروع ہوئی اور 1964 میں وہ ایک ہو گئے۔ دونوں نے مل کر ''ناگ منی'' ماہنامہ پنجابی رسالہ نکالا اور اشاعت گھر بنایا۔ ''ناگ منی'' رسالہ 1966 میں شروع ہوا اور اپریل 2004 میں بند ہو گیا۔ ''ناگ منی'' کے حوالے سے میں نے امرتا پریتم اور امروز کو اکٹھے کام کرتے دیکھا۔ میٹر کا انتخاب امرتا کرتیں۔ پروف اور سکیچز امروز کی ذمہ داری تھی۔ یہ چھوٹا سا رسالہ بڑا معیاری اور پاپولر رہا۔ اس رسالے نے اپنا ایک پورا گروپ پیدا کیا جو اعلیٰ ادب تخلیق کر رہا تھا۔

ایک بات اور جو اُن میں سب سے اچھی تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ جس طرح ایک لکھنے والا ''مافیا'' ہوتا ہے کہ کسی بھی لکھنے والے کی حوصلہ افزائی یہ سمجھ کر نہیں کرنی چاہیے کہ کل کو یہ ہمارے لیے چیلنج نہ بنے۔ اس طرح کا ایسا کوئی رویہ سامنے نہیں آیا۔ وہ بڑی فراخدل تھیں۔ کوئی بھی لکھنے والا چاہے وہ پاکستان میں تھا یا ہندوستان میں تھا یا کہیں دوسرے دیس اور ملک کا اور زبان چاہے کوئی بھی لکھتا تھا۔ اچھا لکھنا ہی ان کی شرط تھی اور کی تعریف اور اس کے متعلق لکھنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھیں۔

اس طرح اچھا لکھنے والوں میں ایک حوصلہ پیدا کیا۔ امرتا پریتم ہمیشہ ایسی تحریروں کی تعریف کرتی

تھیں۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ صرف اپنے نام کے لیے یا شہرت کے لیے ہر کسی کی کتاب کا پیش لفظ' ابتدائیہ یا رائے لکھ دی۔

میں نے جب بھی انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی انہوں نے کہا میری صحت اجازت نہیں دیتی۔ جب بھی مجھے موقعہ ملا میں ضرور پاکستان میں آؤں گی۔ میری یہ ہمیشہ حسرت رہی کہ وہ پاکستان آئیں۔ میں جب بھی انہیں فون کرتا اور انہیں معلوم ہوتا کہ میرا فون ہے تو وہ فون ضرور سنتیں اور ہمیشہ پیار سے گفتگو کرتیں۔ میری عادت تھی کہ میں ہفتہ میں ایک بار فون ضرور کرتا تھا۔ چاہے ملک میں ہوں یا ملک سے باہر، ان کی خیریت ضرور دریافت کرتا۔ فون پر ہی وہ مجھے بتاتیں کہ 'میں نے فلاں کتاب پڑھی ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں بھی ملتی ہے اسے لے کر پڑھو بڑی زبردست کتاب ہے۔'

مجھے یاد ہے میری مرحومہ بیوی وخوب صورت شاعرہ شائستہ حبیب اور ہمارا بیٹا فرخ جب ہندوستان گئے اور امرتا پریتم سے ملے۔ شائستہ ان سے پہلی بار مل رہی تھی۔ جب کہ انہوں نے اس کی شاعری کو اپنے رسالے میں بہت شائع کیا تھا کیوں کہ انہیں شائستہ کی شاعری بہت پسند تھی۔ انہوں نے شائستہ سے مل کر بہت سی باتیں کیں۔ عورتوں کے حوالے سے Male dominated society کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا۔ شائستہ بہت خوش تھی کیوں کہ ایک بڑی شاعر اس کی شاعری کے بارے میں اچھے کلمات کہہ رہی ہیں' ''سورج پر دستک'' اور پھر پنجابی شاعری ''میں کپاہ تے چانئی'' امرتا جی نے بیماری کے باوجود امروز سے پوری کتاب کی نظمیں سنیں۔ کیوں کہ امرتا پریتم پنجابی کا شاہ مکھی (فارسی) رسم الخط نہیں پڑھ سکتی تھیں۔

امرتا پریتم اور دیوندر نے مل کر میرا ایک انٹرویو لیا جو ''ناگ منی'' میں شائع کیا۔ امرتا پریتم کی ''آواز کی دنیا'' 1998 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کی آل انڈیا ریڈیو لاہور اور پھر تقسیم کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی اور پھر آکاش وانی دہلی سے وابستگی کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کرتی ہے۔

فروری 2000 میں غسل خانے میں امرتا پریتم کا غسل خانے میں پاؤں پھسل گیا جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ 81 سال کی عمر میں ہڈی کا ٹوٹنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دو گھنٹے کا آپریشن پانچ گھنٹے میں مکمل ہوا۔ امرتا پریتم گھر آئیں انہیں امید تھی کہ وہ پھر سے چلنے پھرنے لگیں گی۔ لیکن چند دنوں کے بعد دوبارہ ان کے پاؤں میں پھر سے تکلیف شروع ہوگئی اور پھر اس کے بعد امرتا پریتم بستر پر ہی رہیں۔ بدن میں یا ہڈیوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ دوبارہ آپریشن ہوتا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اس لیے چلنا پھرنا' اٹھنا بیٹھنا' کچھ بھی

ممکن نہیں رہا۔ میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا وہ بڑی آہستہ آہستہ باتیں کرتی تھیں اور جب میں محسوس کرتا کہ اب انہیں آرام کی ضرورت ہے تو میں واپس آ جاتا۔ ان دنوں ان کی عام طور پر ملاقاتیں بند تھیں۔ لیکن میں جب بھی دہلی جا کر فون کرتا اور انہیں بتاتا تو وہ امروز سے کہتیں "فخر سے کہو ابھی آ جاؤ" یہ ان کی خاص مہربانی تھی۔ ایسے ہی جب بھی میں نے لاہور سے فون کیا اور انہیں معلوم پڑا تو وہ فوراً فون سنتی تھیں۔

ہم نے امرتا پریتم کے لیے ورلڈ پنجابی کانگریس کی طرف سے Life time achievement award 2003 کا اعلان کیا۔ اگرچہ انہیں کسی ایوارڈ کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم نے ایک Gesture دیا۔ ہم نے ان کے لیے ایک شیلڈ بنائی' محمود بٹ نے امرتا جی کی تصویر بنائی۔ وہ ہمارے بہت بڑے پینٹر ہیں۔ یہ بہت بڑی تقریب تھی۔ اس میں ہمارے ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں نے امرتا جی کے لیے لکھ کر بول کر اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر امرتا جی پر ایک ڈاکومنٹری فلم جو کہ باسو بھٹہ چاریہ نے بنائی تھی' دکھائی گئی۔ اس تقریب کی بڑی ستائش ہوئی کہ انڈو پاک بلکہ اس وقت دنیا بھر کی سب سے بڑی پنجابی ادبی شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ میں نے فون پر اس ایوارڈ کے متعلق امرتا جی کو بتایا تو انہوں نے کہا میں تو تمہارے کہنے پر اڑ کر آ جاتی' لیکن میں چارپائی سے اٹھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے اس ایوارڈ کی دلی خوشی اس لیے ہے کہ مجھے یہ ایوارڈ پاکستان میں دیا جا رہا ہے۔ جہاں میں پیدا ہوئی' پلی بڑھی' جوان ہوئی' شادی ہوئی' بچے ہوئے (امرتا جی کے دو بچے بڑی بیٹی کندلاں اور بیٹا نوراج لاہور میں پیدا ہوئے) پورے اٹھائیس سال وہاں گزارے۔

مجھے ایک ہی حسرت ہمیشہ رہی کہ وہ پاکستان نہیں آ سکیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان آئیں اور ان کا اتنا شاندار استقبال ہو کہ لوگ یاد رکھیں کہ جتنی مہان ادیبہ شاعرہ ہیں اتنا ہی عظیم ان کا استقبال ہوا۔ لیکن میرے بار بار اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی لاہور آنے کا وعدہ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کہتیں: "اچھا۔۔ میں دیکھوں گی۔ ٹھیک ہوئی تو آؤں گی۔" لیکن وہ لاہور نہ آ سکیں۔

بس یہ کسک ہمیشہ میرے دل میں ہمیشہ رہے گی۔

☆☆☆☆☆

چانن دی پھلکاری

چانن دی پھلکاری

چانن دی پھلکاری تو پا کون بھرے!

انبر دا اک آلا سورج بال دیاں
من دی اُچی ممٹی دیوا کون دھرے!

انبر گنگا ہوندی گاگر بھر دیندی
درداں وا دریاؤ کیہڑا گھٹ بھرے!

ایہہ جو سانوں اگ را کھوئیں دے چلیوں
دل دی بکل بلدی چنگاں کون جرے!

اپنے ولوں ساری بات مُکا بیٹھے
حالے وی اک ہوکا تیری گل کرے!

چانن دی پھلکاری تو پا کون بھرے!

احمد سلیم

امرتا پریتم، امروز۔۔ میں اور نانک مل کے روئے

دروازہ امروز جی نے کھولا اور آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ صرف ایک دن پہلے میں دہلی پہنچا تھا اور ہوٹل سے امرتا جی کو فون کیا تھا۔

''تم سیدھے ہمارے ہاں کیوں نہیں آئے؟ راستے میں کہاں اور کیوں اٹک گئے؟''

امرتا جی نے فون پر خفگی کا اظہار کیا تھا۔

''مجھے سیدھا آپ کے پاس آنا تھا لیکن پاکستان سے روانہ ہوتے وقت کسی نے بتایا کہ آپ انڈیا سے باہر گئی ہوئی ہیں اس لیے سوچا ہوٹل پہنچ کر فون سے پہلے آپ کے بارے میں معلوم کروں گا۔''

''اچھا تو اب سامان لے کر آ جاؤ۔''

اور اب امروز جی ایک ہاتھ سے میرا اٹیچی پکڑے ہوئے تھے دوسرے سے انہوں نے مجھے بغل میں لے رکھا تھا۔ ہم دونوں گھر کے اندر داخل ہوئے۔ میں تو جیسے کسی نشے سے مدہوش تھا۔ 1969 میں امرتا جی کا پہلا خط ملا تھا اور آج چودہ برس بعد انہیں دیکھنے ملنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع نصیب ہو رہا تھا۔ اس دن کا مجھے چودہ برس سے انتظار تھا۔ آج میں اپنی دیوی کے سامنے تھا۔ امروز اسی طرح بغل گیر ہوتے ہوئے اندر کمرے میں لے گئے۔ مجھے دیکھ کر امرتا جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بڑی اپنائیت سے میرا ہاتھ دبایا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔ وہاں دیوندر بھی بیٹھے تھے۔ دیوندر جن کی کہانیاں میں نے پاکستان میں پنجابی کے گورمکھی رسم الخط سے اردو میں شائع کی تھیں۔ سب لوگ قالین پر بیٹھے تھے یہ امرتا جی کی سنڈی تھی۔ کتابوں کی چار دیواری میں اپنے بیڈ پر بیٹھی وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ دیوندر کے ہاتھ میں پنجابی ماہنامہ ''ہیراں'' کا امرتا پریتم نمبر تھا۔

''بھئی تمہارے مضمون کا لطف آ گیا۔ ابھی ابھی دیوندر پڑھ کر سنا رہا تھا۔ تم نے کوئی ادھار نہیں

رکھا۔ اور اس شمارے میں میرے کلام کا انتخاب بہت خوبصورت ہے' ایک سیاسی نظر کا تخلیقی انتخاب۔''

میں ابھی تک جیسے کسی سحر میں گرفتار تھا۔ اتنے میں امروز گلاسوں میں چائے بنا کر لے آئے۔ میں نے تھوڑا سا حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا' گھر میں کوئی کام کرنے والی دکھائی نہ دی۔ امرتا جی کہنے لگیں۔

''سناؤ سارا شگفتہ کا کیا حال ہے؟''

''بہت برا حال ہے اس کا' چوتھی شادی اور طلاق کے بعد وہ بہت بیمار رہنے لگی ہے۔''

''لیکن اتنے تجربے کس لئے' اسے کہنا ان تجربوں کو چھوڑ کر اپنے لیے جینے کی کوشش کرے۔۔۔''

''لیکن یہ سب کچھ وہ ہوش و حواس میں رہ کر نہیں کرتی۔ الیکٹرک شاک لگ لگ کر اس کی ذہنی اور روحانی حالت تباہ ہو گئی ہے۔''

یہ سن کر امرتا جی چپ ہو گئیں۔ سارا ماحول چپ ہو گیا۔ کمرہ چپ ہو گیا۔ کتابیں چپ ہو گئیں۔ ہم سب چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد امرتا جی بہت گہری اداسی میں کہنے لگیں۔

''کمبخت' بہت بڑھیا شاعرہ ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔''

امرتا جی نے بہت پیار اور احترام کے ساتھ سارا شگفتہ کی کتاب 'بلدے اکھر' (سلگتے حروف) شائع کی تھی اس وقت یہ کتاب پاکستان نہیں پہنچی تھی' اس لیے امرتا جی ایک نسخہ الماری میں سے نکال کر لے آئیں۔ کتاب بہت خوبصورت شائع ہوئی تھی' اتنی ہی خوبصورت جتنی خوبصورت کتابیں امرتا جی شائع کرتی تھیں۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ امروز کہنے لگے۔

''یہ بلھے شاہ کی محبت کا انداز ہے۔''

''بلھے شاہ؟'' میں نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں بلھے شاہ کا کیا ذکر تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امرتا جی کے کئی نام ہیں اور ان میں سے ایک نام بلھے شاہ بھی ہے۔ دیوندر کہنے لگے۔

''دوست ہم تو تمہیں دیکھے بغیر ہی عشق کرنے لگ گئے ہیں۔ تمہیں زندگی میں پہلی بار ابھی ابھی ملا ہوں' لیکن پیار تجھے برسوں سے کر رہا ہوں۔''

دیوندر کا لہجہ بہت جذباتی ہو گیا ہے۔ دیوندر ہمیشہ سے ایسا ہی ہے' میں اسے اس کی کہانیوں کے حوالے سے جانتا تھا۔ اپنی تحریروں میں وہ اتنا ہی اپنا محسوس ہوا تھا۔ گھنٹوں تک ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر سیر ہوتے رہے' چائے پیتے رہے' باتیں کرتے رہے اور پتہ بھی نہ چلا کہ کھڑکی میں سے گزر کر رات

ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی' کھانے کا وقت ہو گیا۔ ہم سب اکٹھے امرتا جی کے ساتھ کچن میں گئے وہ کھانا نکال کر ہمارے سامنے لگانے لگیں۔ امروز جی بھی کچن میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ چپاتی پکانے سے لے کر اپنے رسالے "ناگ منی" کے ایڈریس لکھنے تک امرتا' امروز اپنا ہر کام خود کرتے ہیں۔ گھر میں ایک لڑکی نظر آئی لیکن اسے کام کرنے والی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس لڑکی کا انٹرویو میں نے "ناگ منی" میں پڑھا تھا۔ وہ اس وقت رات کو آ کر روٹیاں پکا جاتی تھی۔ ایک عورت آ کر کپڑے دھوتی تھی۔ اس کے علاوہ اس گھر میں نوکر یا نوکرانی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ وہ نتائج تھے جو میں نے اس گھر میں پہلے دن ہی اخذ کر لیے اور پھر اس دن سے لے کر وہاں اپنے پچاس دن قیام تک مجھے اپنے کسی نتیجے پر نظر ثانی نہیں کرنا پڑی لیکن میرے لیے اس گھر میں ابھی بہت ساری ملاقاتیں اور بہت ساری حیرانیاں پڑی تھیں اور وہ سب کچھ اتنا قیمتی' اتنا سرشار کر دینے والا' اتنا حیران کن تھا کہ وہ میرے دل میں ہی نہیں' میرے ذہن میں بھی بیٹھ گیا۔ ایک سوچ بن کر' ایک نظر بن کر۔

دوسری صبح ابھی میں سویا ہوا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے سر کے بالوں کو چھو کر کہا "احمد سلیم چائے پی لو"

میں نے آنکھیں کھولیں۔ امروز چائے کا گلاس لے کر میرے پاس کھڑے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو میں ساری زندگی Idealise کرتا رہا ہوں' وہ مجھے یوں شرمندہ کریں۔

آج دوسرا دن تھا۔ مجھے یاد نہ رہا کہ امروز جی نے کتنی بار مجھے چائے بنا کر پلائی تھی۔ ان انگلیوں کے لمس سے یہ گھر ایک میوزیم بن گیا ہے۔ ایک آرٹ گیلری اور ان آنکھوں کے لمس سے میرے دل کی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ یہ کیسی انگلیاں ہیں جو چائے بھی اسی پیار کے ساتھ بناتی ہیں جس پیار سے تصویر بناتی ہیں۔ میں اپنا گلاس اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے امرتا جی کے کمرے میں آ گیا۔ دوسرا گلاس انہوں نے امرتا جی کو پکڑایا اور تیسرے گلاس کے لیے کچن کی طرف چل پڑے۔ ہم تینوں چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

میں نے کہا "پاکستان میں کون یقین کرے گا کہ آپ نے مجھے اتنا پیار' اتنی عزت دی تھی" امروز کہنے لگے "پیار یقین دلانے کے لیے نہیں ہوتا۔ وہ بس ہوتا ہے' ایک شعور کی طرح' ایک نظر کی طرح۔۔۔۔"

میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ آج تک سنا تھا پیار اندھا ہوتا ہے' اس کی آنکھیں نہیں

ہوتیں۔اور امروز جی کہہ رہے تھے۔۔۔

پھر میں نے امرتا جی کی طرف دیکھا۔وہ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''نظر کا مطلب اندر کی نظر سے ہے۔تجھے میں نے کل پہلی بار دیکھا۔لیکن کیا سچ مچ پہلی بار دیکھا ہے؟ پیار کی اپنی ایک نظر ہوتی ہے۔۔۔۔''

نہا دھو کر، کپڑے بدل کر میں نے اپنے میلے کپڑے اٹھائے اور امروز جی سے پوچھا ''یہاں لانڈری کس طرف ہے؟''

''لانڈری کی کیا ضرورت ہے۔میلے کپڑے بالٹی میں ڈال دو۔کپڑے دھونے والی آئے گی تو دوسرے کپڑوں کے ساتھ ان کو بھی دھو دے گی۔لانڈری یہاں بہت امیر لوگوں کا شوق ہے۔''

''کوئی بات نہیں، امرتا جی سے جھجک سے جی نہ ڈالیں۔''

میری بات سن کر امروز جی نے اور کچھ نہ کہا اور لانڈری دکھانے کے لیے میرے ساتھ چل پڑے۔

لانڈری والے نے رسید بنائی تو میں حیران رہ گیا۔۔''چوبیس روپے؟''

امروز جی ہنس پڑے۔''تجھے کہا تھا نا لانڈری یہاں امیر لوگوں کا شوق ہے''۔

ہم باتیں کرتے ہوئے واپس گھر آ رہے تھے۔چھوٹی چھوٹی باتیں، کوئی فلسفہ نہیں تھا ان میں اس لیے وہ اتنی پیاری، اتنی سیدھی اور سچی باتیں تھیں۔

''بندے کو اپنے تمام کام خود کرنے چاہئیں۔کسی دوسرے بندے سے خدمت لینا برا تو ہے ہی لیکن اس کے علاوہ اپنی تسلی بھی نہیں ہوتی۔لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ اپنی داڑھی بھی تم خود نہیں بنا سکتے۔''

واپسی پر میں نے امروز جی سے حجام کی دکان کا پوچھا تھا تو انہوں نے یہ بات کہی تھی۔ہم گھر واپس آ گئے۔

امرتا جی کو چند روز میں پانچ چھ دن کے لیے پیرس جانا تھا۔کسی ادبی تقریب میں فرانس کے قونصلیٹ جانے کا کام تھا۔امروز ادھر چلے گئے۔میں امرتا جی کے پاس بیٹھ گیا۔پاکستان کے بارے میں اور پاکستانی دوستوں کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔فخر زمان، مظہر الاسلام، منشا یاد، سارا شگفتہ، لیکن سارا شگفتہ کے ذکر پہ امرتا جی ہر بار جذباتی ہو جاتی تھیں۔میں نے کہا ''آپ سے ایک بات کی تصدیق کرنی ہے۔''

''کون سی بات؟''

''سارا جب ہندوستان آئی تھی تو آپ نے سارا کے بارے میں ''ناگ منی'' میں ایک واقعہ لکھا تھا۔ اس میں جس ادیب کا ذکر ہے اس کا نام کیا ہے؟''

''بھئی یوں ہوا کہ سارا اردو کے ایک افسانہ نگار بلراج مین را کے گھر ٹھہری تھی۔ ایک رات جب ادیب کے بیوی بچے سو گئے تو وہ سارا کے کمرے میں آ گیا' سارا بھی اسے دیکھ کر خوش ہوئی اور دونوں باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ادیب نے سارا سے پوچھا ''تم نے منٹو کی کہانی'' کالی شلوار'' پڑھی ہے؟''

''جی پڑھی ہے'' سارا نے جواب دیا۔

''تم نے اس کی کہانی ''ٹھنڈا گوشت'' بھی پڑھی ہے؟''

''جی وہ بھی پڑھی ہوئی ہے۔''

یہ سن کر وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور کہنے لگا ''آئی لو یو۔''

سارا یہ سن کر تھوڑا سا پیچھے کھسکی اور کہنے لگی ''جی میں نے منٹو کی یہ کہانی نہیں پڑھی'' ایسی ہے ہماری شاعرہ سارا شگفتہ۔۔۔۔

ایسا لگتا تھا میں تمام دن سارا شگفتہ کی باتیں کرتا رہوں تو امرتا جی خوش خوش سنتی رہیں گی۔ باتوں کے دوران وہ اداس ہو کر کہنے لگیں ''میں چاہتی ہوں اسے یہاں ہی ہمیشہ کے لیے بلا لوں وہ یہاں مزے سے رہے اور شعر لکھے۔''

میں نے کہا ''چوتھی شادی اور طلاق سے اس پر قیامت گزری ہے' کوئی اور ہوتی تو یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکتی۔''

''شریف آدمی! تم ناگ منی۔۔۔ جولائی کے شمارے کے لیے سارا کے متعلق اور اس حادثے کے بارے میں ایک مضمون کیوں نہیں لکھ دیتے۔''

میں رضا مند ہو گیا لیکن مشکل یہ تھی کہ مجھے گورمکھی رسم الخط میں لکھنا نہیں آتا تھا اور امرتا جی کو اردو پڑھنی نہیں آتی تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ پنجابی کے لیے میں فارسی رسم الخط میں لکھوں گا اور پھر امرتا جی کے سامنے بولتا جاؤں گا اور امرتا جی اسے گورمکھی رسم الخط میں لکھیں گی۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے بڑی شرم محسوس ہو رہی

تھی کہ میں امرتا جی کو ڈکٹیٹ کراؤں گا۔ وہ اتنی سینئر اور عالمی شہرت رکھنے والی شاعرہ ادیبہ اور میں۔۔۔

میری بات سن کر امرتا جی ہنس پڑیں اور کہنے لگیں۔۔۔ ''کچھ نہیں۔ ناگ منی کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

اس دن کی ڈاک میں پاکستان سے دو چیزیں آئیں۔ ایک پنجابی ماہنامہ ''لہراں'' کا نیا شمارہ تھا جس کے اداریئے میں ایڈیٹر نے امرتا پریتم نمبر کی اشاعت کے بارے میں معذرت خواہی کا انداز اپنایا ہوا تھا اور دوسری چیز لاہور کے ایک اخبار کی کٹنگ تھی۔۔۔ یہ شہباز ملک کا مضمون تھا جس میں اس نے لہراں کے امرتا پریتم نمبر کے حوالے سے مجھے اور امرتا جی کو گالیاں دی تھیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر بلکہ سن کر امرتا جی اداس ہو گئیں۔

اداسی کی بات یہ نہیں کہ گالیاں چھپی ہیں' اداسی کی بات یہ ہے کہ شہباز ملک اگر میرے بارے میں ایسا سوچتا ہے تو یہاں مجھے ملنے کیوں آیا تھا؟ اس نے بڑی عزت۔۔۔ سے مجھے اپنی کتابیں آٹوگراف کے ساتھ پیش کی تھیں۔ میں نے بڑی عزت سے۔۔۔ ''ناگ منی'' کے لیے اس کا انٹرویو کیا اور شائع کیا لیکن وہاں واپس جا کر۔۔۔''

مجھے اس دن معلوم ہوا کہ امرتا جی نے شہباز ملک کو میرے لیے ''ناگ منی'' کی ایک سال کی فائل بھی بھیجی تھی وہ مجھے آج تک نہیں ملی۔

اداسی کے یہ لمحات گہرے اور طویل ہو گئے۔ امرتا جی کا کہنا تھا اگر اختر حسین اختر نے میرے بارے میں نمبر شائع کر کے پچھتانا ہی تھا تو پھر اتنی تگ و دو کی کیا ضرورت تھی۔

انہی دنوں امرتا جی کچھ فرقہ پرست اور کٹر سکھوں کی طرف سے دائر کیا ہوا ایک مقدمہ بھگت رہی تھیں جو ایک پنجابی اخبار کے ایڈیٹر نے ان کی نظم ''ماتا ترپتی کے نو سپنے'' اور چند دوسری نظموں پر کیا تھا۔ انہوں نے الزام لگایا تھا کہ امرتا جی نے سکھ دھرم اور گورونانک جی کی توہین کی ہے۔

یہ سن کر مجھے وہ سارے الزام یاد آ گئے جو یہاں ہمارے اوپر لگائے جاتے ہیں۔ میں نے کہا'' سکھ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہیں۔ اس لیے فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔''

بہت گہری اداسی میں امرتا جی اپنی ایک نئی سطر گنگنانے لگیں'' میں تے نانک رل کے روئے۔''

میں نے سوچا ایسا مصرعہ لکھنے والی شاعرہ گورونانک کی توہین کیسے کر سکتی ہے۔

چند دن بعد کی بات ہے' پنجابی کے افسانہ نگار اور انگریزی کے اعلیٰ پایہ کے صحافی راج گل کے ساتھ

ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے ادیبوں کا بیان پڑھنے کے لیے دیا جس میں امرتا جی کی بھرپور حمایت کی گئی تھی۔ میں نے کہا ''ایک بڑے ادیب کے دستخط رہ گئے ہیں۔''

''کون سے ادیب کے؟'' راج گل نے حیران ہو کر پوچھا۔

''گورونانک جی کے'' میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

یہ بات جب بعد میں امرتا جی نے سنی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تیسرے دن کئی لوگوں کے فون آئے جو مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ چند کو میں نے فون کیے تاکہ خود جا کر ان سے ملا جا سکے۔ اس دن دیوندر پھر آ گئے اور ہم سب گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ اس دن دیر تک فیض صاحب کی باتیں ہوتی رہیں' وہ ختم ہوئیں تو گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں شروع ہو گئیں۔ کبھی کام کرنے والی چائے بنا کر لے آتی' کبھی امرتا جی۔ گھر کے پچھلے حصے میں امرتا جی کا بیٹا نوراج اور بہو رہتے تھے۔ ایک حصے میں ان کی بیٹی کی رہائش تھی۔ امرتا جی ان سب میں اس قدر Involve ہو جاتیں کہ محسوس ہوتا ان کا لکھنے پڑھنے سے کوئی تعلق نہیں' بس وہ ایک عام سی عورت ہیں۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں' کام اور آرٹ کی خوبصورتی ساتھ ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔ وہ اپنے تمام کام خود کرتی تھیں۔ اسی دلچسپی کے ساتھ لکھتی اور پڑھتی تھیں۔ میں نے کسی ادیب یا شاعر کی تحریروں اور نجی زندگی کے تجربوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب کبھی نہیں دیکھا۔ اس دن جب کسی کام کے لیے میں اور امروز بازار جانے کے لیے گھر سے نکلے تو یہی باتیں شروع ہو گئیں۔

میں نے کہا' ''آرٹ اور زندگی کیسے اس قدر ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔۔۔؟''

''ہمارے آرٹ اور ہماری زندگی میں کوئی گلیمر نہیں۔ یہ گلیمر ہے جو زندگی کو اور فنکار کے فن کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔''

امروز جی کو سننا مجھے بہت اچھا لگنے لگا تھا' اس لیے ہر وقت میں ان کے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کرتا۔ انہوں نے کتنی خوبصورت بات کی تھی۔۔۔ یہ گلیمر ہے جو زندگی اور آرٹ کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ بھلا اور کوئی بندہ یہ بات اس طرح کہہ سکتا تھا؟

ایک بار بلونت گارگی کی تحریروں کی بات ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی سوانح عمری میں ایک ایکٹرس کا ذکر بڑے مزے لے لے کر کیا تھا۔ ایک آرٹسٹ کے گھر میں ایک تقریب میں ایک ایکٹرس لڑکی نے مصور

سے فرمائش کی کہ اس کے گھر لگی ہوئی ایک پینٹنگ اسے دے دی جائے۔

مصور نے کہا اگر وہ اپنے تمام کپڑے اتار کر جہاں بیٹھی ہے وہاں سے ننگی چل کر پینٹنگ تک جائے اور پینٹنگ اتار کے اسی حالت میں اپنی جگہ واپس آ جائے تو پینٹنگ اس کی ہو جائے گی۔ نہ جانے دل کے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اس لڑکی نے ایسا ہی کیا اور پینٹنگ حاصل کر لی۔

اس سارے واقعہ کو بلونت گارگی نے بڑے مزے لے لے کر لکھا جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے جب امروز سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے:

گارگی اور امرتا کی تحریروں میں یہی تو فرق ہے۔ گارگی کا بس چلتا ہے تو کپڑوں میں بھی ایک عورت کو برہنہ کر دیتا ہے۔ امرتا کا بس چلتا ہے تو وہ ایک برہنہ عورت کو بھی کپڑوں میں دکھانا چاہتی ہے کیونکہ امرتا کو اس کے دل کا درد اپنی طرف کھینچتا ہے۔"

ایک بار عورت اور مرد کے رشتے کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ میں نے امروز سے بازار جاتے ہوئے باتیں کرتے پوچھا۔

"آپ کے اور امرتا جی کے رشتے میں یہ جو مضبوطی یہ جو توازن ہے اس کی کیا وجہ ہے؟"

"ہمارے سماج میں عورت اور مرد کا رشتہ رات کے سہارے کا ہوا ہے اس لیے اس میں پختگی ہے نہ توازن۔ ہم نے اس رشتے کو دن کا اجالا دیا ہے۔ جب تک عورت اور مرد کے درمیان دن کا رشتہ قائم نہیں ہوتا یہ رشتہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔"

امروز میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ مجھے لوگوں سے ملواتے وقت بھی میری مدد کرتے تھے۔ مجھے کسی کا فون نمبر، کسی کا ایڈریس درکار ہوتا، کسی کے گھر جانا ہوتا، وہاں پہنچنے کا سوال ہوتا، وہ ہر طرح میری مدد کرتے تھے جیسے وہ میرے وجود کا حصہ بن گئے ہوں۔

ابھی مجھے ان کے گھر آئے چوتھا دن ہی ہوا تھا اور میں نے کئی بندوں سے فون پر بات کر لی تھی۔ ایک دو سے تو مل بھی چکا تھا۔

امرتا جی کا روز کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر ناگ منی کے دفتر میں جو اسی گھر کے ایک حصہ میں بنا ہوا تھا، پچھلے دن کی ڈاک دیکھتیں۔ "ناگ منی" کے مسودے درست کرتیں۔ کبھی کبھی خطوط کے جواب لکھتیں۔ ان دنوں ان کو زیادہ وہ خط اس مقدمے کے بارے میں آتے تھے جو ان کی نظموں کے بارے میں ان

پر وار کیا گیا تھا۔ قانونی نوٹس کی انہیں ذرا بھی پروا نہیں تھی لیکن جو اخبار ان کے بارے میں روز ہی گندگی اچھالتا اُسے پڑھ کر کئی بار وہ اداس ہو جاتیں۔ ایک بار اس اخبار نے لکھا کہ امرتا پریتم نے سکھوں کے مطالبے کے سامنے سر جھکا دیا ہے اور معافی مانگ لی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ امرتا جی کو قریب سے نہیں جانتے تھے انہوں نے بھی اخبار کے اس پراپیگنڈا کو محض جھوٹ جانا۔ ان کی کتابوں کے عام قاری کو اخبار کی اس اطلاع پر اعتبار نہیں تھا۔ ایک بار خط آیا: لکھنے والے کا لہجہ جذباتی تھا لیکن اس میں ایک گہرا یقین بھی بھرا ہوا تھا۔ اس نے لکھا تھا

"دیوی! جس نے بھی آپ کی کوئی تحریر پڑھی ہے وہ اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ آپ معافی بھی مانگ سکتی ہیں۔ سچ لکھنے والا جھوٹ کے آگے سر کیسے جھکا سکتا ہے۔؟" لیکن اس جھوٹ کا پراپیگنڈا ہندوستان میں ہی نہیں پاکستان میں بھی ہو رہا تھا۔

"لہران" کے امرتا پریتم نمبر کے بارے میں شہباز ملک نے ایک اخبار میں کالم بھر مضمون لکھا تھا۔ اس میں اس نے جالندھر کے روزنامہ اجیت کی کٹنگ بھی شائع کی تھی جس کی سرخی تھی

"امرتا پریتم معافی کے لیے تیار

معافی مانگنے پر پنتھ کی طرف سے معاف کر دیا جائے۔" خوشونت سنگھ کا شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو خط (خبر میں جو زبان استعمال کی گئی تھی وہ خوشونت سنگھ جیسے فرقہ پرست کو ہی زیب دے سکتی تھی۔)

"معروف صحافی خوشونت سنگھ ممبر راج سبھا نے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو ایک خط کے ذریعے درخواست کی کہ سکھ دشمن تحریریں لکھنے پر امرتا پریتم نامی پنجابی کی ایک شاعرہ سکھ پنتھ سے معافی مانگ لے تو اسے معاف کر دیا جائے۔"

اس قسم کا ایک اخبار شہباز ملک کے حوالے سے پاکستان میں بھی آگے بڑھ کر رہا تھا۔ شہباز ملک کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ وہ امرتا پریتم کی خواہش پر اس کے گھر اسے ملا اور وہ سگریٹ کے بھبھوکے اڑا رہی تھی۔ شراب کی بو اس سے تین کرسیوں سے بھی دور تک آ رہی تھی۔ وہ امروز کے ساتھ نکاح کیے بغیر بیوی کی طرح رہ رہی ہے۔ یہ وہ انداز تھا جسے امرتا پریتم نے اپنی تحریروں میں گندگی کا نام دیا تھا۔

میں نے کہا "دیوی! آپ، وارث اور بلھے شاہ کو پنجاب یونیورسٹی والے پسند نہیں کرتے لیکن فرق کیا ہے، بلھے شاہ کے ساتھ ساتھ آپ بھی لوگوں کے دلوں میں بستی ہیں۔"

میں نے انہیں بتایا ''جب پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم اے پنجابی کی کلاسیں شروع ہوئیں تو ڈیپارٹمنٹ کے پہلے چیئرمین ڈاکٹر وحید قریشی نے بلھے شاہ کو نصاب میں شامل نہ کیا۔ جب پنجابی کے چند سیانے ادیبوں نے اس بارے میں احتجاج کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر بلھے شاہ کو نصاب میں شامل کیا تو نوجوان لڑکے لڑکیوں میں فحاشی پھیلے گی اور خدشہ ہے کہیں وہ بے دین اور ملحد نہ ہو جائیں۔۔

''سن لو بلھے شاہ' امروز امرتا جی کو کہنے لگے۔

ان دنوں امرتا جی کے خلاف قانونی نوٹس کے بارے میں بے شمار خطوط موصول ہوئے۔ امروز کے نام ایک خط میں ''ناگ منی'' کے ایک قاری پورن سنگھ نے پوچھا تھا۔

''یہ جو اخباروں میں لکھا جا رہا ہے' اس کے بارے میں امرتا جی کیسا سوچتی ہیں۔''

مجھے یاد ہے' امروز نے ناگ منی میں جواب شائع کیا ''تمہارے طویل خط کے جواب میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ امرتا اس بات پر حیران ہیں کہ لفظ آدر (عزت) کے معنی ان آدر (بے عزت) کب سے ہو گئے ہیں۔۔۔؟''

یہ سب سیاست تھی' گھٹیا سیاست' اسی لیے' ناگ منی' میں کبھی سیاستدانوں کے انٹرویو شائع نہیں ہوئے۔

ایک سوال کے جواب میں ایک بار امرتا جی نے کہا تھا' ''سیاستدانوں کے انٹرویو میں اس لیے نہیں شائع کرتی کہ ان کی فلم میں ''کلوز اپ'' نہیں ہوتا۔''

مجھے دہلی آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ امرتا جی چار پانچ دن کے لیے ایک بین الاقوامی ادبی تقریب کے لیے پیرس جا رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا امرتسر اور جالندھر کا چکر لگا آؤں۔ بھلا امرتسر سے لاہور کا فاصلہ ہی کیا ہے؟ بالکل قریب۔۔ اب تک دہلی میں کتنے ہی لوگوں سے ملاقات ہو چکی تھی' امرتا جی کے گھر کوئی نہ کوئی آیا رہتا تھا۔

دہلی کے نوجوان پنجابی ادیب' ہندی ادیب' بمبئی سے' کلکتے سے' پنجاب سے' پیرس سے' صوفیہ سے' ماسکو' لندن' لاہور اور کراچی سے' دنیا کے تمام شہروں کے تمام راستے یہاں آ کر ایک دوسرے میں مل جاتے تھے اور وہاں ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ چند لوگ جو وہاں نہیں آئے تھے۔ ان سے امروز جی ساتھ جا کر میری ملاقات کروا آئے تھے۔

بھارت ٹائیمز ڈانسر سونل مان سنگھ پنجابی کے ادیب اور انگریزی کے جرنلسٹ راج گل اور عورتوں کے میگزین ''منوشی'' کی ایڈیٹر مدھو کشور سے امروز خود جا کر مجھے ملوا لائے تھے۔ بلونت گارگی اور اجیت کور دہلی میں نہیں تھیں۔ رشم اور گگن گل سے ملاقات ہو چکی تھی۔

امرتا جی کے پیرس جانے سے پہلے ہی میں نے ''ناگ منی'' کے لیے پاکستان کے پنجابی ادب کا خاص شمارہ ایڈٹ کر دیا تھا۔ مجھے گورمکھی رسم الخط لکھنا نہیں آتا' اس لیے امرتا جی نے رشم کو ذمہ داری سونپ دی کہ وہ مجھ سے ڈکٹیشن لے کر مسودہ گورمکھی رسم الخط میں تحریر کر دے۔ جس شام امرتا جی پیرس جا رہی تھیں' اس سے ایک رات پہلے رشم میرے ساتھ بیٹھ کر پاکستان کے بارے میں ''ناگ منی'' کے خاص شمارے کے لیے نظمیں فارسی رسم الخط سے گورمکھی رسم الخط میں تبدیل کر رہی تھی۔ جب وہ ثروت سلطانہ کی نظم ''یقین ایک سوالیہ نشان'' کی پہلی لائن ''میں مٹی گوندھتی ہوں'' لکھ رہی تھی تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنستے ہنستے کہنے لگی ''کیا ضرورت ہے اس پاگل پن کی۔۔۔؟''

میں نے کہا ''کمہارن جو ہوئی۔''

رشم نے جب آگے نظم پڑھی تو ایک لائن تھی' میں سپنے بن رہی ہوں۔۔۔

یہ سطر پڑھ کر وہ اور زور سے ہنستے ہوئے کہنے لگی'' سالی جولاہی' سپنے ہی بنتی رہی' کسی کا سپنا نہ بنی۔''

نظم کی آخری سطر تک پہنچتے ہوئے بھی رشم نہ رکی۔ امرتا اور امروز دوسرے کمرے میں تھے۔ بعد میں جب انہیں رشم کی ہنسی اور ساری بات کا علم ہوا تو امرتا جی کہنے لگیں۔

''میں نے جب ساحر کو بتایا کہ ایک دن جب امروز تمہاری کتاب ''میں سپنے بنتا ہوں'' کا ٹائٹل بنا رہا تھا تو کہنے لگا'' سالا سپنے بنتا ہے۔ کسی کا سپنا نہیں بنتا'' تب اس وقت ساحر نے ہنس کر کہا'' امروز ٹھیک کہتا ہے۔ میں کبیر کی اولاد میں سے ہوں' اس لیے ساری عمر بنتا ہی رہا ہوں۔''

اور امرتا جی کی یہ بات سن کر میں نے کہا'' پھر تو ثروت سے پوچھنا چاہیے کہ ساحر کی طرح وہ بھی کہیں کبیر کی اولاد میں سے تو نہیں۔''

اگلی شام امرتا جی پیرس روانہ ہو گئیں اور میں پنجاب کی طرف۔۔۔ جالندھر میں ہر جیت کے گھر ٹھہرا جس کے ساتھ دہلی میں امرتا جی کے گھر ملاقات ہو چکی تھی' وہ جالندھر میں ٹی وی پروڈیوسر تھے۔ وہیں من جیت ٹوانہ چندی گڑھ سے ملنے آ گئیں۔ میں جس دن دہلی پہنچا' اس رات امرتا جی پیرس سے واپس آ رہی تھیں'

میں اور امروز انہیں ائیر پورٹ لینے گئے۔ ہم نے گیلری میں سے دیکھا امرتا جی کا ایک بازو بندھا ہوا ہے۔
امروز یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ کوئی حادثہ؟

ہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ 24 جون کو وہ پیرس پہنچی تھیں۔ 26 جون کی دوپہر وہ پیرس کی ایک سڑک پار کرتے ہوئے گر پڑیں جس سے ان کی دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ ہسپتال اور ہوٹل میں پڑی درد سے تڑپتی رہیں۔ اسی حالت میں Pain Killer کھا کر جب اخباری نمائندوں نے امرتا جی کا انٹرویو کیا تو ایک اخبار کے نمائندے نے اسی ماہ شائع ہوئی ان کی چھ سات نظموں کا ترجمہ دکھا کر کہا:

"Madame! you are the first person to break the barrier of two cultures."

امرتا جی درد کی گولیاں کھا کر بھی درد سے تڑپ رہی تھیں کہنے لگیں:

"I suppose to break the barriers of two cultures, one has to break one's bones..."

☆☆☆☆☆

امرتا پریتم اہل خانہ کے ساتھ

امرتا پریتم اور اندرا گاندھی
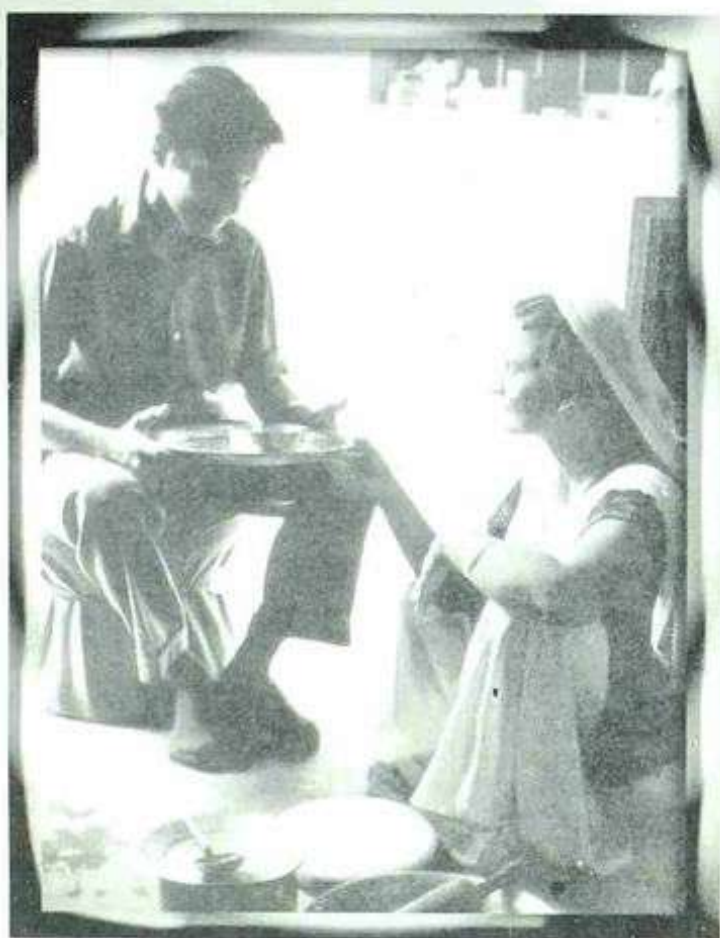
امرتا پریتم، امروز اور ڈاکٹر رویل سنگھ

امرتا پریتم، شیلا ڈکشت، ڈاکٹر رویل سنگھ وغیرہ

امرتا پریتم

امرتا پریتم اور فخر زمان

امرتا پریتم، دیوندر ستیارتھی و دیگر

اظہر جاوید

ایک بے چین رُوح۔۔۔امرتا پریتم

امرتا پریتم عظیم ادیبہ ہیں' امرتا پریتم ممتاز شاعرہ ہیں۔اپنا پرایا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ انہیں بہت پہچان ملی۔ انہیں سراہا گیا اور ان گنت ایوارڈ بھی ملے۔ان کی کئی کہانیوں' ناولوں پر بھارت میں فلمیں بھی بنیں۔ ان کی ایک نظم' جو اُن کی تعریف کا واحد ذریعہ بن گئی' پاکستان میں سیف الدین سیف نے اپنی فلم " کرتار سنگھ" میں استعمال کی۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں
کتھے قبراں وچوں بول

یہ نظم' ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان کے وقت جو کشت وخون ہوا' جس میں ہندو' سکھ اور مسلمان' ہر کوئی بوٹی بوٹی ہوا۔۔ کچھ مارے گئے' کئی شہید کہلائے۔۔۔امرتا پریتم نے انہی بے ثبات دنوں میں بے کسی اور بے چارگی میں گندھی ہوئی نظم کہی۔۔۔

امرتا پریتم اپنی ساری عظمت کے باوجود دو تین چھتریوں تلے چھپی رہیں' جو اُن کی شخصیت کا حصہ تو تھیں' مگر اس سے انہیں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا یہ میری ذاتی رائے ہے۔۔۔نقاد اور نکتہ چین اسے مانیں یا نہ مانیں۔

امرتا پریتم نے اپنی زندگی' اپنی شاعری کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔۔۔شاعری کے ساتھ موسیقی کو بھی شامل کریں۔۔۔یوں وہ ریڈیو سٹیشن پر بھی جانے لگیں۔۔۔ایک معزز گھرانے کی نہایت خوبصورت لڑکی (خاتون) دنوں میں شہر بھر اور پھر سارے ملک کا تذکرہ بن گئیں۔۔۔لڑکی حسین ہو' تھوڑی ملنسار ہو اور علم و ادب (فنونِ لطیفہ) سے بھی تعلق ہو' تو وہ موضوعِ گفتگو بن جاتی ہے اور اُس کے (یک طرفہ) چاہنے والوں (اور ساتھ ساتھ ناکام رہنے والے حاسدوں) کا بھی ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے۔امرتا پریتم اگرچہ اس سے خوش اسلوبی سے بچتی رہیں' لیکن دل تو عورت کا دھڑکتا اور مچلتا ہے۔

اُن کی شادی کم عمری ہی میں ہوگئی تھی' اور پھر دو بچے بھی پیدا ہوگئے۔ اس عرصے میں جن محبتوں نے شدت اختیار کی اور جن کی حدت نے امرتا پریتم کو بھی بے کل کیا' وہ بے کلی عمر بھر اُن کے ساتھ چمٹی رہی۔۔۔ پہلے نمبر پر ساحر لدھیانوی ہیں' جنہوں نے نہ صرف امرتا بلکہ ساحر کی بھی زندگی' اتھل پتھل کردی۔۔ انہی دِنوں کا ایک نام براڈ کاسٹر ریڈیو کے افسر اور پنجابی لکھاری سجاد حیدر بھی ہے۔۔۔ امرتا' بیک وقت ساحر سے اور سجاد حیدر سے کیسے پیار کرتی رہیں' اور گھر گرہستی کو بھی (کچھ عرصہ تک) نبھائے رکھا۔۔ یہ دلچسپ سوال اور انوکھی صورتِ حال ہے۔۔

یہ مفروضہ غلط ہے۔۔ ''عورت صرف ایک دفعہ ہی پیار کرتی ہے۔۔!'' کیا عورت کے جذبات نہیں ہوتے۔۔ کیا اس کی پسند ناپسند نہیں ہوتی' کیا اس کی زندگی میں کمزور (اور دل پذیر) لمحے نہیں آسکتے۔؟ یہ ساری باتیں' فلسفے سے پرکھنے کی نہیں' زندگی میں ڈوب کر جاننے کی ہیں۔

امرتا پریتم کو بظاہر اپنے پتی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے' پریتم سنگھ سے علیحدگی کے باوجود' برسوں بعد عمر کے آخری حصے میں جب وہ بیمار ہوگیا' تو امرتا اور ان کے مشترکہ بیٹے نوراج کے کہنے پر وہ امرتا ہی کے گھر پر رہا اور امرتا' اُس کی دیکھ بھال بھی کرتی رہیں۔۔

کچھ رُوحیں بے چین ہوتی ہیں۔۔ وہ خود کو جاننے نہ جاننے' اور کچھ ماننے نہ ماننے میں ساری حیاتی گزار دیتی ہیں۔ پتی ورتا اپنی جگہ۔۔ دل کا کہنا اپنی جگہ۔۔ ساحر اُن کی زندگی ہی نہیں آتما میں بھی رچ بس گیا تھا۔۔۔ لیکن ایک اضطراب تو پھر بھی تھا۔۔۔

''رسیدی ٹکٹ'' پڑھنے والے اس کا کھوج لگا سکتے ہیں' اور میری دلیل کی رو میں بہہ سکتے ہیں۔ ''رسیدی ٹکٹ'' کے گورمکھی ایڈیشن میں امرتا نے سجاد حیدر سے بھی گہری محبت کا اظہار کیا ہے۔۔ جب میرے پیارے دوست مرحوم کنول مشتاق نے اس کو فارسی لپی (اس طرف کی پنجابی) میں اُتارا اور اپنے رسالے ''سورج مکھی'' میں شائع کیا' تو اس میں سے سجاد حیدر والے بہت سے حصے کو چھوڑ دیا۔ اُن دِنوں سجاد حیدر زندہ تھے' کنول مشتاق نے وضع داری نبھائی۔۔ پھر جب 'رسیدی ٹکٹ' کتابی صورت میں چھپی اور ابھی تک چھپتی جارہی ہے' اس کا وہی پہلا رُوپ ہے۔۔

میں نے جن چھتریوں کا ذکر کیا تھا' جنہیں امرتا ساری عمر تانے رہیں اور ان سے انہیں فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی ہوا۔ اُن کی ایک چھتری پنجابی زبان کی مصنفہ کی تھی۔۔۔ پنجابی زبان کی تمام تر وسعت کے

باوجود امرتا کو وہ وسیع حلقہ نہ مل سکا' جو سامنے کی زبان اُردو میں ہو سکتا تھا۔ ابھی اور وضاحت ضروری ہے۔۔ وہ گورمکھی میں لکھتی ہیں اُن کی بہت سی تخلیقات اس طرف منتقل تو ہوئیں' مگر بیشتر کے ساتھ 'زبیدی ٹکٹ' جیسا سلوک ہوا۔ مجھے ذاتی تجربہ ہے۔۔ ان کے جس ناول ''پنجر'' پر بھارت میں فلم بھی بنی' اُسی کو مدنظر رکھ کر یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پنجابی شعبے کے ایک طالب علم نے ایم اے کا تھیسس لکھا۔ اُس نے ناول کے کئی لفظ غلط لکھے۔۔ میں نے وہ تھیسس دیکھا تھا۔۔۔ طالب علم سے پوچھا' تو اُس نے سچائی سے بتایا کہ ناول پر انگریزی زبان میں ایک تبصرہ پڑھا تھا ظاہر ہے۔۔ انگریزی کے ہجے اور طرح سے ہو جاتے ہیں اور اصل لفظ اور اُس کے باطن کے معانی کچھ اور بن جاتے ہیں۔

امرتا پریتم کی کہانیاں اور ناول اُردو زبان میں بھی منتقل ہوئے ہیں مگر کسی خوش بخت اُردو نقاد نے اُن پر کبھی کُھل کر رائے نہیں دی' امرتا کو پنجابی لکھاری کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا۔۔ بھارت میں امرتا پر کتنا کام ہوا' وہ مکمل پاکستان میں نہیں پہنچا۔۔ یوں امرتا پنجابی کی چھتری کے نیچے ہی بیٹھی رہ گئیں اور ان سے اچھا یا بُرا وہی سلوک ہوتا رہا' جو سیف الدین سیف اور کنول مشتاق نے کیا تھا۔۔۔

امرتا کی ایک اور چھتری ساحر تھا۔۔۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے رہے' مگر شاید ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے یا سمجھے بھی تو اس کا اظہار نہیں کر سکے۔۔۔ ساحر محبوبہ میں ممتا بھی تلاش کرتا رہا اور امرتا ایک اور کشمکش میں رہی۔۔ یا تو اسے حکمران مرد چاہیے تھا یا سپر انداز محبوب' جسے جب اُن کا جی چاہے پیار کر لیں' جب چاہیں وہ اپنے خول میں واپس چلی جائیں چاہے محبوب ''ہاں۔ہاں'' کرتا رہے' کوئی جواب نہیں آئے گا۔

میں نے اپنی کتاب ''ناکام محبت۔ ساحر لدھیانوی'' میں امرتا پریتم کو ایرانی بلی کہا ہے۔۔ ایرانی نسل کی بلی کا معاملہ عجیب ہے۔ وہ چوہے کھاتی نہیں فطری تقاضے کے تحت چوہے کو دبوچتی ہے' تھوڑا نوچتی ہے' اور ادھ مُوا کر کے چھوڑ دیتی ہے۔۔ خود بھی جگہ سے ہلتی نہیں۔۔ چوہے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔ بے چارہ ذرا سا ہوش میں آ کر بھاگنے لگتا ہے' تو بلی اُس سے پھر وہی سلوک کرتی ہے۔ امرتا پریتم جیسی اور ایرانی بلی ایسی میری بھی کئی محبوبائیں ہیں' اس لیے یہ تجربہ صادق ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب امرتا پریتم دِلّی میں جا کر آباد ہو گئیں' اور کچھ عرصے بعد ساحر لدھیانوی بھی لدھیانہ اور لاہور سے ہوتے ہوئے دِلّی چلے گئے' تو پرانی محبت تازہ دم ہو گئی۔۔ ساحر ممبئی چلے گئے۔۔ بقول

حمید اختر ٬فلمی نغمہ نگاری ساحر کا Passion (سب سے بڑی آرزو) تھا۔۔تھوڑی جدوجہد کے بعد ساحر نہ صرف کامیاب ہو گیا' بلکہ وہ مقام اور مرتبہ پالیا' جو آج تک پاک و ہند کے کسی نغمہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔۔ ساحر بھی امرتا سے شادی کرنا چاہتے تھے۔لیکن اس کے لیے کچھ بننا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔۔۔امرتا اپنی جذباتیت میں یہی چاہتی تھیں' ساحر دِلّی ہی میں رہیں' اُس کے سامنے رہیں۔۔ ساحر کا فیصلہ درست تھا۔ یعنی۔۔۔

ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا

امرتا پریتم نے اس کا اظہار خود ایک اور طریقے سے کیا ہے۔ جب مصور اندرجیت (امروز) اُن کی زندگی میں آئے' اور کچھ عرصے انہیں ممبئی میں' فلموں کے آرٹ ڈائریکٹر کی پیش کش ہوئی' تو وہ بھی بہتر مستقبل کے لیے ممبئی چلے گئے۔۔۔تب امرتا نے کرب سے لکھا۔۔

''ایک پہلے مجھے چھوڑ کر ممبئی چلا گیا تھا' اب دوسرا بھی اچھے کل کے لیے میرا آج ویران کر گیا ہے۔۔''

امروز واپس آ گئے اور دونوں نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔۔اب اس زندگی میں نہ ساحر تھے نہ سجاد حیدر اور نہ دیوندر ستیارتھی۔۔(یہ یک طرفہ عشق کرنے والوں میں سے تھے)'رسیدی ٹکٹ' کے علاوہ امرتا نے ساحر سے عشق کی کتھا ''اک سی انیتا'' میں بھی لکھی۔ یہاں ساحر' ساگر ہو گیا تھا۔

امرتا پریتم' اب امروز کی چھتری تلے آ گئیں۔۔ یہ عجیب طرح کے کا سمبندھ اور سنجوگ تھا۔۔۔نہ پھیرے ہوئے نہ بیاہ کی باقاعدہ رسم۔۔لیکن عمر بھر اکٹھے رہے۔۔ میری بھارتی دوست اوما ترلوک نے 'امرتا امروز' کے عنوان سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے' جس کا دِلّی میں اُردو ترجمہ بھی چھپ گیا۔۔اس حوالے سے' اور کئی دوسرے ذرائع سے پتا چلا کہ سکھ برادری امرتا پریتم کے اس عمل پر کافی ناراض تھی اور ایک طرح سے اُن کا سماجی بائیکاٹ (مقاطع) کر رکھا تھا۔۔۔نوراج' جسے امرتا پریتم نے ساحر لدھیانوی سے مشابہ لکھا ہے اور کہا ہے' لوگ کہتے ہیں' یہ ساحر کا بیٹا ہے۔نوراج بھی اس' اطلاع' سے رنجیدہ نہیں ہوتا' خوشی کا اظہار کرتا ہے' مگر وہ امرتا اور امروز کے رشتے (غیر سماجی اور غیر مذہبی) کو خوش دلی سے قبول نہیں کرتا۔

ممتاز ادیب حمید اختر نے میری کتاب' ناکام محبت۔ ساحر لدھیانوی'' کے دیباچے میں بھی لکھا اور مجھ سے اختلاف کیا ہے کہ امرتا آخر وقت تک ساحر سے پیار کرتی رہی تھی۔۔ میں سوال کرتا ہوں کیسے۔۔۔؟ ادھر وہ امروز کو زندگی کا حاصل بنا چکی ہیں' اور یہ کہتی ہیں'' ساحر ایک خواب تھا۔ امروز تعبیر ہے۔۔'' تو پھر یہ پیار

اور عشق تو نہ ہوا نا۔۔۔ساحر لدھیانوی نے ایک سے زیادہ دائمی سنگت کی کوشش کی تھی۔۔اپنی ماں کے انتقال کے بعد تو وہ اور بھی تنہا ہو گیا تھا۔

ساحر لدھیانوی کو جب پدم بھوشن ایوارڈ ملا اور وہ اسے وصول کرنے دلی آیا' تو امرتا کو فون کیا۔۔۔۔

امرتا پریتم گئیں' لیکن یوں کہ۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ساتھ لیے رقیب کو

امروز ساتھ تھے۔۔اور پھر بہت کم وقت گزرا اور دونوں' امرتا اور امروز' اٹھ کر چلے آئے امرتا نے 'رسیدی ٹکٹ' میں لکھا ہے۔۔کچھ دیر بعد ساحر کا فون آیا۔

''تم چلی گئیں میں وسکی پیتا رہا اور ایک نظم ہو گئی۔۔۔سُن لو۔۔۔''

محفل سے اُٹھ جانے والو تم لوگوں پر کیا الزام

تم آباد گھروں کے باسی' میں آوارہ اور بدنام

میرے ساتھی خالی جام

مگر۔۔امروز سے قربت اور اپنی محبت کی نُصرت کے باوجود امرتا کے بھیتر کی بے کلی اور اضطراب ختم نہیں ہوا۔۔شاید ایسی شخصیات کے لیکھ یہی ہوتے ہیں۔کشمکش میں رہیں' بے سکون رہیں اور عظیم ادب تخلیق کرتے رہیں۔۔۔

امرتا پریتم کی نظمیں دیکھ لیں۔۔۔' میرا کمرہ' پڑھ لیں۔۔۔ترکے گھڑے کا در پانی یا اور بھی کسی نظم کو پڑھ لیں' ایک بے چارگی' تنہائی اور نارسائی کا احساس نمایاں ملے گا۔

شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جس میں مکمل آسودگی جھلکتی ہو۔۔۔اور اچھا ہی ہے' ورنہ اتنا آفاقی اور لاثانی ادب کیسے میسر آتا۔۔۔تاہم' امرتا پریتم پر کام کرنے' اور بہت زیادہ کام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔۔ دیکھیں' یہ بھاری پتھر کون اٹھاتا ہے۔۔۔؟

☆☆☆☆☆

امرتا پریتم ۔۔ ایک سچی عورت

فلم کا شو ختم ہوا۔ سینما ہال نے ان گنت شائقین کا ایک جم غفیر باہر کو اُگلا۔ اچانک ایک چیخ نما آواز فضاؤں میں گونجی ''اوئے۔۔۔ ساحر لدھیانوی'' اور اگلے ہی لمحے ساحر بیسیوں لوگوں کے گھیرے میں تھا۔ کوئی ہاتھ ملانا چاہ رہا تھا اور کوئی بات کرنے کا متمنی تھا۔ مگر ان گنت وہ تھے جن کے پاس جو کاغذ نما شے میسر تھی وہ آگے بڑھا رہے تھے۔ نوٹ بک، کتاب، کرنسی نوٹ، کاغذ کا ٹکڑا۔۔۔ اور آوازیں تھیں کہ گڈمڈ ہوئی جا رہی تھیں 'سر آٹوگراف' سر آٹوگراف' سر آٹوگراف۔'' ساحر اپنے چاہنے والوں میں گھرا ایک کے بعد دوسرے کو اور جس بھی کاغذ، کرنسی نوٹ، نوٹ بک۔۔۔ کو اس کا ہاتھ لگا وہ مسکراتے ہوئے آٹوگراف دیئے جا رہا تھا۔ مجمع تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔۔۔ یہ کوئی نئی فلم ریلیز ہوئی تھی جس میں ساحر لدھیانوی نے گیت لکھے تھے۔ گیتوں اور موسیقی کے رسیا اپنے گیت نگار سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار اس سے آٹوگراف مانگ مانگ کر کر رہے تھے کہ اچانک اس مجمع میں ایک نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھا اور ایک جانی پہچانی نسوانی آواز فضا میں گونجی ''سر آٹوگراف''۔۔۔ اس ہاتھ میں کوئی کرنسی نوٹ، کوئی آٹوگراف بک یا کوئی نوٹ بک نہیں تھی بلکہ ساحر کے سامنے ہاتھ کی ہتھیلی کھلی تھی۔ ساحر نے آواز اور ہتھیلی والی کی سمت دیکھا ۔۔۔ یہ امرتا پریتم تھی جو عجیب جادو اثر نظروں سے ساحر کو دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

ساحر لدھیانوی نے اپنے پین کی نب کی الٹی جانب سے اپنے انگوٹھے کو سیاہی لگائی، پیار سے ہتھیلی پکڑی اور اس کے عین درمیان میں لکیروں کے اوپر انگوٹھا لگا دیا۔۔۔ یہ کیا طلب تھی اور کیا عطا تھی۔۔۔!! امرتا پریتم ساحر سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ وہ محبت جسے کوئی محبت کرنے والا ہی سمجھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ وہ ساحر لدھیانوی کی محبت میں آنکھوں تک ڈوبی ہوئی تھی۔

امرتا پریتم عجیب عورت تھی جس سے محبت کی اس سے شادی نہ ہو سکی۔ جس کے ساتھ شادی کی اس کے

ساتھ محبت اور نباہ دونوں ہی نہ ہو سکے اور جس کے ساتھ آخری دم تک ساتھ رہا اس کے ساتھ نہ محبت کی نہ شادی کی۔ وہ اپنی ذات' اپنے آدرش' اپنی سوچ' اپنے نظریے اور اپنے عشق کے حوالے سے ایک پختہ یقین اور پختہ کار عورت تھی۔ عشق عبادت سمجھ کر کیا شاعری ریاضت جان کر کی۔

میں تواریخ ہاں ہند دی' مینوں ڈوہو دل وچ چین
جو جو کنیں سنے میں کتھے لکھاں او وین
کالے میرے صفحے دے' ہور لخے نہ جان
کیہ کیہ دساں ہور میں' میرے ورقے پئے شرمان

عشق امرتا پریتم کا ذاتی مسئلہ تھا' اس نے اسے کبھی ڈھنڈورا بنا کے نہیں پیٹا مگر اس کی شاعری کا تمام تر حوالہ انسانیت اور اجتماعیت ہے۔ وہ انسان کو ایک فرد کی حیثیت میں بھی اسی حرمت و تکریم کا سزاوار مانتی ہے اور مجموعی طور پر انسانی سماج کو بھی قدروں کے اعلیٰ ترین مقام پر سرفراز دیکھنا چاہتی ہے۔ انسانیت سے محبت اس کا دین ہے عشق اس کا مسلک ہے۔ امرتا کا کہنا ہے کہ ''مذہب کا نام روحانیت رکھ دینا چاہیے کیوں کہ ملاّ (ہر مذہب کا اپنا ملاّ ہوتا ہے) نے مذہب کو انسٹی ٹیوشن بنا دیا ہے۔'' اس بات کو سطحی طور پر لینے کی بجائے اسے وسیع تر مفہوم میں دیکھا جائے تو عالمی بھائی چارے کی آفاقیت اس فقرے میں سے جھلکتی ہوئی محسوس ہوگی۔ امرتا پریتم کی بحیثیت لکھاری (خواہ شاعری ہو یا نثر نگاری) ون پوائنٹ فلاسفی ہے' یعنی ''عالمی امن''۔

امرتا پریتم کی زندگی کے ماہ و سال اوائل عمر ہی سے رنگ ڈھنگ بدلتی دھوپ چھاؤں کا شکار رہے۔ گورے رنگ' بادامی آنکھوں اور تیکھے نقوش والی ''امرتا'' اوائل عمر ہی سے شاعری کر رہی تھی۔ اس کی پیدائش 31 اگست 1919 کو گوجرانوالہ میں ہوئی تھی مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا سو باپ اپنی لاڈلی بیٹی کو لے کر لاہور (گوالمنڈی) میں آ آباد ہوا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب ''امرتا'' کا پہلا شعری مجموعہ ''امرت لہراں'' شائع ہوا تھا۔ ''امرتا'' کے مداحوں میں انارکلی بازار لاہور میں ہوزری کا کاروبار کرنے والے ایک جگت سنگھ کواترا بھی تھے جنہوں نے امرتا کے باپ سے اس کا ہاتھ اپنے بیٹے پریتم سنگھ کے لیے مانگ لیا جسے قبول کر لیا گیا یوں نوخیز امرتا شادی کے بعد امرتا پریتم کہلائی اور زندگی بھر۔۔۔۔ بلکہ شوہر سے بالآخر علیحدگی کے بعد بھی۔۔۔ مرتے دم تک اپنے شوہر کا حوالہ۔۔۔۔ قائم رکھا' اپنے نام کے ساتھ اس کا نام جوڑے رکھا۔ کیسی عجیب عورت ہے' شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی نام سے وابستگی قائم رکھی۔ وہ اخلاقی طور پر

مضبوط بھی بے حد تھی۔ اس نے اپنے خاوند کو اس بات پر خود راضی کر لیا تھا کہ وہ اسے طلاق دے دے اور اپنا بیٹا اسے سونپ دے۔ پریتم سنگھ کا اخلاقی ورتارا اپنی جگہ پر ایک الگ تحریر کا متقاضی ہے۔

یہ امرتا پریتم کی اخلاقی جرات کی بات ہے نا کہ "رسیدی ٹکٹ" میں کھلے لفظوں میں اعتراف کرتی ہے کہ جب شادی کے بعد اس کو بچے کی امید پیدا ہوئی تو اس نے قصے کہانیوں میں سے واقعات اور کتابوں رسالوں میں پڑھے تجزیاتی عمل کو اپنے اوپر وارد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سن اور پڑھ رکھا تھا کہ اس عرصے میں عورت جس قسم کے تصورات اپنے قلب و ذہن میں رکھے یا تصویریں دیکھے اس کا ہونے والا بچہ ہو بہو ویسا ہی ہوتا ہے۔ امرتا لکھتی ہے

"۔۔۔۔۔ تے میری کلپنا نے جدوں دنیا توں اوہلے ہو کے ہولی جہی میرے کناں وچ آکھیا۔۔۔۔ جے میں ہر ویلے ساحر دا منہ چتواں تاں میرے بچے دی شکل اوہدے نال مل جاوے گی۔ جو زندگی وچ میں نہیں پا سکی جو پایا جان دی ہاں ایہہ اوس نوں پالین دا کرشمہ کر کا جتن سی۔"

امرتا پریتم کے اپنے کہنے کے مطابق 3 جولائی 1947 کو بچے کا جنم ہوا۔ پہلی بار جب اس نوزائیدہ بچے کا منہ اس کی ماں نے دیکھا تو بقول اس کے اپنے "رب دے جون دا یقین آ گیا"۔۔۔ بچے کی شکل سچ مچ ساحر لدھیانوی جیسی تھی۔ اس حوالے سے امرتا ایک دلچسپ بات کا تذکرہ خود کرتی ہے کہ ایک بار جب یہ ساری بات میں نے ساحر کو بتائی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور اس نے صرف یہ کہا

"Very Poor Taste"

دراصل ساحر لدھیانوی ساری زندگی اس کمپلیکس کا شکار رہا کہ وہ خوبصورت نہیں ہے۔ مگر امرتا پریتم کے عشق میں لت پت تو وہ بھی تھا۔ جب ساحر امرتا سے ملنے لاہور آتا امرتا کے سامنے کرسی پر خاموش بیٹھا سگریٹ پیے جاتا۔ ابھی سگریٹ آدھا بھی نہ جلا ہوتا کہ ایش ٹرے میں بجھا دیتا۔ امرتا کا کہنا ہے کہ "میں اوہدے ہتھاں نوں چھونا چاہندی ساں پر میرے سامنے مذہبی روایات دا اک فاصلہ ہندا سی جو طے نہیں سی ہو سکدا۔ اوہ دوں وی میں کلپنا دی کرامات دا آسرا لیا سی"۔۔۔۔

ساحر اٹھ کر چلا جاتا تو امرتا اس کے چھوڑے بغیر بجھائے ہوئے سگریٹوں کے ٹوٹے سنبھال کے الماری میں رکھ لیتی۔ پھر ایک۔۔۔ ایک۔۔۔ ٹکڑے کو۔۔۔ باری باری (اکیلی بیٹھ کے) سلگاتی۔۔۔

جدوں اوہناں انگلاں وچ پھڑ دی ساں اینج

جاپ داسی جیوں ساحر دا ہتھ چھو رہی ہوواں۔۔

یہ صرف محسوسات کے جہان کی باتیں تھیں' افسانوی باتیں۔۔۔افسانوی کرداروں کی باتیں۔۔۔امرتا کہتی ہے مجھے پہلی بار سگریٹ پینے کی عادت انہی دنوں میں پڑی تھی' ہر سگریٹ سلگاتے ہوئے یوں لگتا جیسے وہ میرے پاس ہے وہ سگریٹ کے دھوئیں میں ''نمودار'' ہوتا تھا۔۔۔

امرتا پریتم کے اندر بسنے والی عشق زار عورت کی داستان تو ختم ہونے والی نہیں ہے وہ جدید سائنسی دور میں بھی محبت کے معجزوں کو متشکل کرنے والی عشق زادی ہے۔اس کے عشق کا ایک دوسرا روپ امن اور آزادی کے ساتھ عشق ہے۔ یہ اس کی حیاتی کا بہت محترم حوالہ ہے۔ امن اس کی کمزوری' اس کا آدرش' اس کا نظریہء حیات اور اس کا زندگی بھر کا خواب رہا ہے۔ دُنیا بھر میں انسانی سماج کو امن کو پھلواری کی صورت میں دیکھنے کے خواہش مند لوگ' دُنیا کے سارے امن پسند سماج امرتا پریتم کا احترام ہی نہیں کرتے بلکہ اس سے محبت کرتے ہیں۔اب میں یہاں دانستہ طور پر اس کی نظم'' پنجاب دی کہانی'' کو موضوع گفتگو نہیں بناؤں گا جس کا ایک ٹکڑا وہ ہے جس میں اس نے تقسیم ہند اور پاکستان کی آزادی کے لمحات میں پنجاب کو خون میں ڈبو دیا۔ وہ اصل نظم نہیں ہے بلکہ ایک طویل نظم کا محض ایک بند ہے

اج آکھاں وارث شاہ نوں

کتھے قبراں وچوں بول

بلکہ میں اس کی نظم'' تواریخ'' کا حوالہ دینا چاہوں گا اور صرف دو شعر نقل کروں گا ایک درمیان میں سے اور ایک آخری شعر بلکہ چلئے پہلا شعر بھی نقل کرتا ہوں تا کہ جب آپ ان شعروں کی پرتیں کھولیں' جب تاریخ پر نگاہ ڈالیں' جب کتابوں کے اوراق پلٹیں تو جو جو منظر آپ کی آنکھوں کے سامنے کھلتا جائے وہ ان شعروں کے آئینے میں مزید واضح اور صاف دکھائی دے۔امرتا نے کہا:

ایس چوداں تاریخ دی' میری کرماں والی رات

جس دی بُکل وچ ہے میری قسمت دی پربھات

میں تواریخ ہاں ہند دی' میرے ورقے لہولہان

ویکھن لئی ایہہ دن اج دا' رہی گھلدی میری جان

پیڑاں ہن جاگن چیتیوں' پئے نین پرین وی رو

اک پرتاں ورقہ پشاں نوں جے کوئی سن دا ہو

سوویت روس میں امرتا پریتم کو بہت عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر جب سوویت فوجیں چیکوسلواکیا میں داخل ہوئیں تو امرتا بہت دکھی ہوئی۔ اس وقت پراگ شہر کے لوگوں نے حفاظتی نکتہ نگاہ سے اور حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے گھروں کے نمبر مٹا دیے تھے۔ گلیوں سڑکوں کے نام بھی کھرچ ڈالے تھے۔ یہ خاموش احتجاج کا ایک انداز بھی تھا۔ امرتا پریتم عالمی امن اور عالمی بھائی چارے کی داعی امرتا پریتم۔۔۔۔ پراگ شہر کے لوگوں کے ساتھ تھی اس نے لکھا:

''آج میں نے اپنے گھر کا نمبر مٹا دیا ہے

گلی کا نام اور سڑک کا نشان بھی ختم کر ڈالا ہے

اب اگر تم مجھے ڈھونڈنا چاہو

تو دروازے کھٹکھٹاتے رہو

ہر گلی ہر شہر ہر ملک میں جاؤ

جہاں تمہیں کہیں کوئی آزاد روح مل جائے

سمجھنا

وہی میرا گھر ہے''

یہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے قلم کو روکنے میں دقت ہو رہی ہے مگر روکنا تو ہے۔ سو چلئے امرتا پریتم کی گیت نگاری پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ آپ کو تو علم ہے گیت تو ہوتا ہی جذبوں' دھڑکنوں' خوابوں' امنگوں آرزوؤں کا اظہار ہے سو امرتا کے گیت بھی زیادہ تر اس کے دل کے راز ہیں۔ کبھی اداس' کبھی غمگین' کبھی محبت سے لبریز اور کبھی جذبات واحساسات کی لہریں۔ اس کے یہ سارے گیت اس کی آپ بیتی ہیں۔ اسی لیے ان میں درد بھی ہے اثر بھی اور لذت بھی۔ امرتا کے پہلے گیتوں میں کھلے پھولوں' بادلوں کے آنچلوں اور قوس قزح کے رنگوں کا ذکر تھا' خاموشی نہیں تھی وہ اس وقت کسی انجانے پیار کی ناشناس مٹھاس کا ذکر کر رہی تھی۔ اس نے محبت کی نظمیں لکھی ہیں۔ اسے چونکہ سماج کے ٹھیکے داروں سے چڑ تھی۔ اسے اپنے گھر درشن کے لیے آنے والے بھی اچھے نہیں لگتے تھے اس نے کہا تھا ''ہر نیا شاعر ادیب اپنی لکھت سنانے چلا آتا ہے اور سب سے پہلے یہی فقرہ بولتا ہے'' جی بس درشن کرنے حاضر ہوا ہوں''۔ اس نے کہا ''مجھے اس انکساری سے بھی ڈر آتا

ہے''۔۔۔۔مگر۔۔۔زندگی کا سبھاؤ امرتا پریتم کے ساتھ ہی خاص حوالہ رکھتا ہے۔وہ امرت کور سے امرتا پریتم ہوئی۔''امرتا'' اپنی سبھاؤ' اپنی شاعری' اپنی نثر نگاری ہر ہر حوالے سے امر ہوگئی۔وہ ایک سچی عورت تھی' ایک سچی شاعرہ' ایک سچی' اکل کھری لکھاری۔۔۔جس نے کہا:

''وے میں تڑکے گھڑے دا پانی
کل تک نہیں رہنا

☆☆☆☆

افضال شاہد

امرتا پریتم

سماج کے بنائے ہوئے ناقابل عمل ضابطوں مذہب کے اجارہ داروں کی زورزبردستی اور ریاستی جبر کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف صدائے احتجاج بلند کرنا ہی بڑے دل گردے کا کام ہے اور ایسے حوصلہ مند بہت کم ہیں جنہوں نے یہ کام انجام دے کر تاریخ میں اپنا نام باقی چھوڑا ہو۔ خاص طور پر مردوں کے عالمی معاشرے میں اگر کوئی عورت اس عمل سے گزری ہے تو تاریخ نے اس کا نام اپنے اوراق میں محفوظ کرلیا ہے۔ قلم کا جہاد کرنے والوں کی فہرست یوں تو اچھی خاصی ہے مگر اس میں عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی کسی خاتون نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے اسے سراہا گیا اور اس کی قلمی جدوجہد کو تاریخ کے ہر دور میں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ امرتا پریتم کا نام بھی انہی لکھاریوں کی فہرست میں شامل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ صف اول میں ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ شعروادب کی دنیا میں ہندوستان کے حوالے سے وہ غالباً واحد خاتون ہے جس کے فن کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اور جتنے عالمی ایوارڈ امرتا کے حصے میں آئے شاید ہی کسی خاتون لکھاری کو نصیب ہوئے ہوں تاہم دکھ کی بات یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان میں خاص طور پر امرتا کے کردار کے مبینہ منفی حوالوں کو زیادہ اجاگر کیا گیا اور اس کے فن پر جو کچھ لکھا اور کہا جانا ضروری تھا' بہت کم ہوا۔ یہ بات درست ہے کہ آج سے ساٹھ پینسٹھ سال پہلے ایک لڑکی اور وہ بھی سردارنی کا سگریٹ نوشی کرنا' سماجی بغاوت سے بھرپور اظہار پر مبنی شاعری کرنا' شادی شدہ ہونے اور دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ساحرلدھیانوی سے عشق کا برملا اظہار اور اقرار کرنا' خاوند سے علیحدگی کے بعد مرتے دم تک امروز کے ساتھ ایک ہی چھت تلے زندگی گزارنا اور خودساختہ اصولوں کے ساتھ کسی بھی طور سمجھوتہ کرنا' بجائے خود اچنبھے کی باتیں ہیں اور سماج کے ماتھے پر کسی بھی دوا دارو سے ختم نہ ہونے والا بوجھ ہیں مگر کیا ضروری ہے کہ امرتا کا تذکرہ ہو تو صرف انہی باتوں کا ذکر کیا جائے اور اس کی شاعری' کہانی کاری' افسانہ اور ناول نویسی

اور صحافتی خدمت کا تذکرہ محض ضمناً کیا جائے۔ سرداروں کو یقیناً آج بھی امرتا پر غصہ آتا ہوگا۔ وہ آج بھی اس بات پر پیچ و تاب کھاتے ہوں گے کہ امرتا نے ان کی ناک کاٹ دی مگر کاش وہ یہ بھی سوچتے کہ ان کی اس سپتری نے اپنی سوچ، عمل اور تخلیق کے ذریعے سارے پنجابیوں کا نام بھی روشن کیا ہے۔ دنیا بھر کے ترقی پسند اور مزاحمتی ادب میں اس کی تخلیقات کی ایک الگ پہچان ہے۔ ہو چی منہ جس کا ماتھا چوم کر اس کے قلم کو اپنی بندوق سے تشبیہ دیتا ہے، ایوارڈز دینے والے جسے پنجاب کی آواز کہتے ہیں اور جس کی تخلیقات آج بھی پڑھنے والوں کو ایک انجانا سرور اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ جو آج بھی جنوبی ایشیا کی خواتین کی بڑی آبادی کے حقوق اور جدوجہد کی علمبردار ہے۔ وہ اس خطے میں بسنے والی عورتوں کی آواز اور ان کے تشخص کی پہچان ہے۔

پورا پنجابی ادب اور اُردو ادب ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے کی گئی شاعری میں اس کی ایک نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' کا بدل نہیں لا سکا۔ جو آج بھی تاریخ کے اس موڑ پر اپنوں کے ہاتھوں اپنوں پہ ہونے والے مظالم کے خلاف ایک شاہکار صدائے احتجاج ہے تاہم یہ بھی امرتا کے ساتھ زیادتی ہے کہ اسے صرف ایک اسی نظم کے حوالے سے یاد رکھا جائے۔ اس نے اپنی شخصیت کی ساری بے باکی اپنی خودنوشت ''رسیدی ٹکٹ'' میں سمو دی تھی۔ اس کی شائع ہونے والی کتب کی تعداد سوا سو کے قریب ہے جو بجائے خود ایک خاتون لکھاری کے لیے ایک ریکارڈ ہے۔ اس نے پنجابی اور ہندی میں شاعری کی، کہانیاں لکھیں، میں کالم تحریر کیے۔ اس کے فن پر لکھنے اور کہنے کے لیے بہت کچھ ہے مگر یاروں نے اسے محدود کر دیا ہے۔ جو کسی طرح بھی اس کے فن کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

امرتا اور اس کے فن کے ساتھ ہونے والی اس ناانصافی کا ازالہ ہی اس وقت ہمارے پیش نظر تھا جب اس کے اس دارِ فانی سے رُخصت ہونے کے بعد ورلڈ پنجابی کانگریس نے لاہور میں امرتا کی یاد میں ایک عالمی تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں بھارت سے آنے والے دانشوروں نے اس پر اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا کہ امرتا کی یاد میں اتنی بڑی تقریب بھارت کے کسی بھی شہر میں نہیں ہوئی اور یہ بلاشبہ کانگریس کے چیئرمین فخر زمان اور ان کے ساتھیوں کا اعزاز ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ کبھی میں بھی اس باکمال تخلیق کار سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔ امن کانفرنسوں کے سلسلے میں بھارت جانے کا آغاز ہو چکا تھا مگر ابھی دلّی کی باری نہیں آئی تھی پھر جب دلّی کانفرنس کا دعوت نامہ موصول ہوا اور ورلڈ پنجابی کانگریس کا وفد تیار کر لیا گیا تو اس بار خوشی اس بات کی تھی کہ امرتا سے بھی ملاقات ہوگی۔ امرتا جی سے ملنے کے لیے وفد کے

تقریباً تمام اراکین بے چین تھے۔

کانفرنس کی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنے اپنے طور پر بہت سے ساتھیوں نے K-25 حوض خاص پر حاضری دی۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل تھا۔ خواہش تو یقیناً پوری ہوئی مگر ایک حسرت باقی رہ گئی کہ امرتا کے ساتھ ہمکلام نہ ہو سکا۔ میرے سامنے ایک زندہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ بس کبھی کبھی آنکھیں کھول کر پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ لیتی۔ امروز اشاروں میں اُسے بتاتا' جو ہماری سمجھ سے بہر حال بالاتر تھے۔ وہ کئی برسوں سے اسی طرح بستر پر تھی اور امروز نے اس کے ساتھ تکلم کے لیے اشاروں کی یہ خاص زبان ایجاد کر رکھی تھی۔ امروز نے بتایا کہ بس رُوح اور جسم کا ایک معمولی سا تعلق باقی ہے' نہ جانے کب ٹوٹ جائے اور امرتا ہمیں چھوڑ کر پرلوک سدھار جائے۔ یہ منظر آج بھی ایک تازہ دُکھ کی طرح میرے اندر موجود ہے۔ میں نے امرتا کا ہاتھ چھوا۔ جس میں بس ہلکی سی حرارت تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ سانس کی ڈور ابھی بندھی ہے۔ ہماری دِلّی سے واپسی کے چند ماہ بعد ہی امرتا کی رحلت کی خبر آ گئی۔ وہ بھی دنیا کے دیگر بہادر لوگوں کی طرح انتہائی سخت جان تھیں' جس طرح اُس نے زندہ رہنے کے لیے اپنے اصول خود وضع کیے تھے اسی طرح کئی برس تک مسلسل موت کے فرشتے کو بھی خود پر فتح پانے سے روکے رکھا۔ تاہم مجھے تو کبھی وہ رانجھے کی ہیر' کبھی مہینوال کی سوہنی اور کبھی مرزے کی صاحباں لگتی ہے۔ جس نے ''توڑ نبھانا'' تو سیکھا تھا مگر اپنے رانجھے' مہینوال اور مرزے کو پانا شاید اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

☆☆☆☆

افضل توصیف

امروز جی۔۔۔۔۔

امرتا پریتم کا جیون ساتھی امروز ایک بڑا آرٹسٹ ہے۔ وہ دونوں قریب قریب آدھی صدی ساتھ رہے۔ اس عرصے میں دونوں نے اپنا اپنا کام کیا۔ امرتا نے شاعری کی اور ادب لکھا۔ امروز نے مصوری کی اور رنگوں کو نئے رنگ لگاتا رہا۔

مگر جب شاعرہ چلی گئی تو امروز شاعر ہو گیا۔ امروز جی نے مجھے بتایا کہ ہر شام گہری اداسی کے پل میں ایک نظم ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے اور بیٹھی رہتی ہے۔ جب تک وہ قلم اٹھا کر اُسے لکھ نہیں لیتے۔ نظم جو پہلے شاعرہ کے کمرے میں آتی تھی اب مصور کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔

مصور اب شاعر بھی ہے۔ زندگی محبت اور فن کس کس طرح اپنی نمو کرتے ہیں امروز جی نے امرتا کو کئی ناموں سے پکارا تھا۔ ایک پسندیدہ نام ان کا ”برکتے“ تھا۔ پنجابی مسلم کلچر کی چھاپ ان کی ساری گفتگو پر لگی ہوئی ہے۔ دونوں خوبصورت پنجابی تھے اور دھرتی کے بہت قریب رہے۔ ’امرتا ورگی روح کس طرح اس جمدی اے، ہستی کس طرح بنی ہے۔‘ امروز کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پنجاں دریاواں دی جائی
دھرتی دی پھلکاری دے
سارے پانیاں جہی
کوتیا کوتیا کردی ہے
ہن اوہ دس نہیں رہی۔۔ پر
اوہدی کوتا دے اکھر اکھر وچوں
اوہدی ہوند دس رہی اے

سُن رہی اے

امرتا پریتم کون تھی، کیسی تھی؟ اگر پوچھو تو.... امروز کہتا ہے:

اوہ اکھر اکھر کوتا

تے کوتا کوتا زندگی

امروز امرتا، امرتا امروز ایک رُوح دو قالب نہیں قالب بھی ایک، روح بھی ایک

ثبوت

ہر کوئی کہہ رہیا اے

کہ اوہ نہیں رہی

پر میں کہندا ہاں

کہ اوہ ہے

کوئی ثبوت ــــــــ؟

جے اوہ نہ ہوندی

میں وی نہ ہندا

امرتا کون تھی، کیسی تھی اور کیا تھی؟؟؟ ساری بات کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہاں مگر امروز کو ٹھیک پتہ ہے وہ کون تھی، کسی تھی اور کیا تھی۔

اُمرتا

کدے کدے خوبصورت سوچاں

خوبصورت سریر دی

دھار لیندیاں ہن

آرٹ کیا ہے؟

زندگی کے رنگوں میں

اپنے رنگ ملا لینا

۳۱ر اکتوبر ۲۰۰۵ء امرتا امروز کی الوداعی رات تھی اُس رات کی سوچ کیا تھی۔

دُکھ

کل تک

زندگی کول اک دُکھ سی

زندہ دُکھ

پھُلاں پھَلاں تے مہکاں نال بھریا

تے اج

زندگی کول ذکر ہے

اوسے دُکھ دا

اوہ دُکھ جو بیج بن گیا

ہواواں نال رل کے اُڈ گیا

پتہ نہیں کس دھرتی ول

کسے ڈونگی مٹی دی تلاش وچ

خورے......

امروز مصور، شاعر بھی بن گیا نہیں۔۔۔۔۔شاعری خود اس کے پاس آنے لگی۔ عجیب بات ہے۔

اوس رات

اک نظم نے ہولی جہے

میرا ناں بلایا

مینوں کول بٹھایا

تے آپنا ناں دسیا

میں کاغذ لیاندہ

اوہدا ناں پچھیا

امرتا میرا ناں،

اوہ کاغذ تے اکھر اکھر ہو گئی

وہ پہلا دن تھا پھر نظم اکثر آنے لگی۔ تیری شکل میں تیری طرح میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ کئی بار وہ میرے ساتھ بات کرتی ہے۔ وہی پرانی بات۔

''میں تینوں فیر ملاں گی''

اوہ کتے جاندی نہیں

کتے میرے اندر ہی گم ہو جاندی اے

مُڑ کے آؤن لئی۔

مُڑ کے آؤن لئی تاں اوہ آپ وی کہہ گئی اے

امرتا پریتم کی آخری نظم ''میں تینوں فیر ملاں گی''۔ ۲۰۰۲ء میں شاعرہ کا وقت پورا ہو گیا۔ لیکن اب یادوں کی عمر امروز کی عمر کا باقی حصہ بن گئی ہے۔

''وقت دی گل''

جدوں آپاں کول

صرف اک شام ہوندی سی

تاں روز شام نوں ملدے ساں

تے جہی شام دے مدھم ہوندے رنگاں دی

کہکشاں تھلے

چپ چاپ اک دوجے نوں ویکھدے

تردے رہندے تردے رہندے

ویلے دا پل پار کر لیندے

فیر اوہ وقت آیا، جدوں

آپنی شام عمر جڈی ہو گئی

آپے ای ویہڑے وچ ہر روز

کئے ای رنگ کھِڑدے

رل مل جاندے

سویرے دے رنگاں وچ دوپہر دے رنگ

دوپہر دے رنگاں وچ شام دے رنگ

تے فیر شام دے رنگاں وچ رل جاندے

چانی دے رنگ

یاد اے تینوں،

جدوں دل کردا

سارے رنگ رل کے کدے

تیرے کمرے وچ چلے جاندے

تیری نوین نظر دے رنگ ویکھدے ہوئے

تیرے مونہہ تے کھلر جاندے

کدے کدے اوہ رنگ رل کے

میرے کمرے وچ وی آ جاندے تاں

میریاں تصویراں دے رنگ کھڑ کھڑ

جس پیندے

اوہ سارے دن،

میرے تیرے جیون دے دن

شاعری فنکاری نال رنگے ہوئے دن!

ساڈا گھر امن پیار دے رنگاں نال

کھڑیا کھڑیا رہندا۔

گھر وچ تیری موجودگی دی مہک

ہر شے چوں لنگھدی ہوئی

میرے دل توں لگ جاندی

اُمرتا کے چلے جانے کے بعد اُمروز کو لگا۔ ساری دُنیا اس کے دل جیسی ہوگئی ہے۔ اُمرتا کے بارے میں ہی سوچ رہی ہے۔

امروز کی ایک اور نظم ہے:

سوہنی

تصویراں دی دکان دے باہر

سوہنی دی تصویر ویکھی

میں اُوس سوہنی نوں گھر لے آیا

اُوس تصویر نوں ویکھدیاں ویکھدیاں

مینوں اُوہ سوہنی دسن لگ پئی

جس نے پنجاب دا اک دریا

گھڑے نال پار کیتا سی کئی وار

تے اج میں اک ہور سوہنی وارے

سوچ رہیاں۔

اُمرتا بڑی سوہنی سی

اُوسے نیں آپنے قلم نال اَدھی صدی

سارا پنجاب پار کیتا

لگاتار

کویتا

من کوئی ہو جاندا

اوہ کویتا لکھدا نہیں

کویتا جیوندا اے

کیوں؟

لوکی پُچھدے نیں

خورے ٹھیک پُچھدے نیں

امرتا دے ہوندیاں کدے

تینوں نظم کیوں نہ اتری؟

نظم کدے وی اتری نہیں

اوہ دوں زندگی وچ اُتر دی رہی

مَن کاغذ تے اتر رہی اے

تصویر

زندگی تصویر وی ہے تقدیر وی

مَن چاہے رنگاں نال

بن جائے

تاں تصویر

ان چاہے رنگاں نال بنے

تاں تقدیر

امروز کون اے؟ کیا اے؟

شاعر یا مصور

رانجھا یار اکھا؟

چلو پُچھ لیندے آں

اوسے کولوں

بہت عمدہ ڈیفائن کیا ہے اپنے آپ کو امروز جی نے:

میں اک لوک گیت

بے نام ہوا وچ کھڑا

ہوا دا حصہ

جنہوں چنگا لگاں

اوہ چیتنا بنا لوے

جنہوں بہتا چنگا لگاں اوہ

آپنا بنا لوے

دل کرے تے دا تاں

گا وی لوے

میں اک گیت ہاں

صرف لوک گیت

جس نوں ناں دی لوڑ نہیں پیندی

عوام دا مصور، لوک گیت امروز

میں ایس داوی وچ آں

نویں دنیا وچ نی اے

تساں ویکھی اے تاں دسو، اوہ دنیا کیسی اے۔۔۔

کون حاکم، کیہا انتظام اے اتھے

بزرگ نے دسیا

اوس دنیا وچ کوئی حکمران نہیں

بس لوگی اپنے آپ، آپنا قنون بناوندے

اپنا نظام آپ چلاوندے نیں

ڈر کوئی نہیں، خطرہ کوئی نہیں

پولیس نہ کمانڈر، نہ کماڈو

اندر سب ٹھیک، باہروں حملے دا

ڈر وی کوئینا.....

ایس وادی دا بریک وسنیک سپارکس اے

تینوں پتہ اس

سپارکساں نوں کوئی ہتھ نہیں سکدا

اچھا!

تے فیر تسیں کون ہو؟

کیہ کر دے ہو ایس دُنیا وچ......؟

میں..؟

میں بلیو پرنٹ ہاں

ایس دُنیا دا

امروز جی کی شاعری میں ایک نویکلی ٹرمینالوجی آئی ہے۔ آرٹسٹ رنگوں کی زبان میں اپنا خیال ظاہر کرتا ہے لیکن جب کوئی آرٹسٹ پوئیٹری کرے تو اس کے لفظوں کے معنوں میں نئے رنگ آ جاتے ہیں۔ ایک نظم ہے۔

سوچاں تُردیاں

پتہ نہیں دن سی کہ رات

زندگی سوچاں وچ تُردی تُردی

اپنا نال تُر گئی.......

سامنے پُھلاں دی وادی آ گئی

سوچاں ورگی خوب صورت وادی

تھوڑا اگے جا کے ویکھیا!

پُھلاں دے اک رُکھ ہیٹھ

اک بزرگ چٹے سفید کپڑے پائیں

دھیان لگائیں بیٹھا سی

ہور اگے جاکے ویکھیاں تاں

عجب نظارا دس پیا

آسے پاسے، ہر پاسے

کنے سارے لکھے ان لکھے کاغذ

تے بہت سارے، پورے ادھورے سکیچ ویکھے

زندگی نے رتا کو سوچیا

اوہ ویکھیا

جدوں بزرگ نے اکھاں کھولیاں

تاں ہتھ دے اشارے نال بلایا

کول بٹھا کے پُچھیا!

ایتھے کس طراں؟

☆☆☆☆☆

ایم۔ خالد فیاض
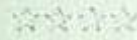
امرتا کے چند نسوانی کردار

میرے پیشِ نظر اس وقت امرتا پریتم کے جو نسوانی کردار ہیں ان میں ''جندرو'' (کنویں کی بوکی)
''چھلو'' (چھمک چھلو) ''مس کملا داس'' (کوری ہانڈی) ''بندو'' (تجارت کا سوال) ''شمی'' (شمی)
''ماڈل گرل'' (ماڈل گرل) ''کیرتی'' (ایک المیہ) ''دھنو'' (دھنو) ''نہال کور'' اور ''ویرو'' (سرد آہ) قابل
ذکر ہیں۔

امرتا کے بیشتر نسوانی کردار دھیمے مزاج کے اور اپنی دنیا میں گم یا الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب سے
بڑھ کر یہ کہ حالات اور واقعات کے بہاؤ میں بہتے چلے جاتے ہیں' زمانے کی ہواؤں کا رُخ موڑنے یا رسم و
رواج کی دیواروں سے ٹکراتے دکھائی نہیں دیتے۔ ان میں ردِعمل اور تحرک کی وہ جہت مفقود ہے جو ہمیں بالعموم
عصمت کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ امرتا کے ان کرداروں میں ایک طرف نسوانی جذباتیت کے عناصر ہیں تو
دوسری طرف صبر و تحمل اور برداشت کی قوت ہے۔ امرتا اپنے نسوانی کرداروں کی مختلف جذباتی حالتوں اور
صورت حال کی نزاکتوں کا بیانیہ رقم کرتی ہیں' کسی خاص نتیجہ کو اخذ کرنے یا خاص تاثر کو شدت سے ابھارنے کی
کوشش نہیں کرتیں اور اسی لیے ان کے ہاں کوئی خاص ڈرامائی صورت حال بھی پیدا نہیں ہوتی۔

''کنویں کی بوکی'' کی 'جندرو' ایک باہمت عورت ہے جو پہاڑ کی اوٹ میں درختوں کے جنگل میں ایک
چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں رہتی ہے اور کھیتوں میں کام کرتی ہے۔ بچپن سے ہی وہ باپ کی لاٹھی بن گئی اور
پھر ساری زندگی اپنے وجود کو سہارتی رہی۔ اس کی زندگی کنویں کی بوکی کی طرح گزرتی ہے جس میں ایک پیاسا
راہ گیر آتا ہے اور اپنے ہاتھوں کی روک اس کے سامنے کرتا ہے تو وہ ساری کی ساری اس میں جا گرتی ہے مگر وہ
پیاسا مصور جو وہاں رنگوں سے بھری ہوئی تصویریں بنانے کے لیے آیا تھا' جندرو کو پتھر کی مورت بنا کر اس میں
رنگ بھرے بنا چلا جاتا ہے اور کنویں کی بوکی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی رہ جاتی ہے۔ لیکن کنویں کی اس بوکی کو کسی

پر کوئی افسوس نہیں۔ وہ کہتی ہے
''نہیں نہیں کوئی غم نہیں' میرا پانی تو کام آیا۔۔۔اس کی پیاس تو بجھ گئی۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے کوئی افسوس نہیں نہ اس
پر نہ اپنے آپ پر۔۔۔۔۔۔!''

یوں جندرو صابر و شاکر عورت کے رُوپ میں سامنے آتی ہے اس میں احتجاج یا ردِّعمل نہیں ابھرتا' وہ مفاہمت پر آمادہ ہے۔ بے شک وہ ایک باہمت اور حوصلہ مند عورت ہے مگر اس کی ساری ہمت اور حوصلہ فطرت سے ٹکرانے میں ہے' سماجی ناانصافی سے ٹکر لینے میں نہیں۔ اس کی مزاحمت جس قدر بھی ہے فطرتی مظاہر کے ساتھ ہے سماجی عوامل کے ساتھ نہیں۔ سماجی سطح پر اس نے اپنے آپ کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ رکھا ہے۔

غربت کے ہاتھوں جنسی استحصال کا شکار امرتا کے دونسوانی کردار قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ''چھمک چھلو'' کی ''چھلو'' اور دوسری ''کوری بانڈی'' کی ''مس کملاداس''۔ چھلو کا باپ معذور اور ماں سوتیلی ہے۔ وہ ٹوکریاں بناتی ہے اور گھر سے باہر جا کر لاری والوں یا موٹر والوں کو ٹوکریاں بیچنے پر مجبور ہے۔ لیکن ٹوکریاں بیچتے ہوئے اس کا منہ لوئے جیسا بن جاتا ہے اور اس کی سوتیلی ماں کے بقول اسی لیے چھلو کی زیادہ ٹوکریاں نہیں بکتیں۔ مگر ''رتنا'' سے' جو اخبار بیچتا ہے' باتیں کرتے ہوئے چھلو کا منہ لوئے جیسا نہیں رہتا بلکہ کھل اٹھتا ہے۔ چونکہ آج چھلو سے اس کے باپو نے فرمائش کر رکھی ہے کہ ''چھلو بیٹا۔۔۔ آج پوری بیس ٹوکریاں بیچنا اور لوٹتے وقت کونے کی دکان سے پورا آدھ سیر گوشت لیتی آنا۔۔۔ لہسن' پیاز' ادرک اور ہری مرچ بھی لیتی آنا نہیں تو تیری ماں ابلا ہوا گوشت سامنے رکھ دے گی۔''

اس لیے آج چھلو بیس ٹوکریاں بیچنے کے لیے اس کوشش میں ہوتی ہے کہ اس کا منہ لوئے جیسا نہ بننے پائے۔ اگرچہ رتنا اسے موٹر والوں کے پاس جا کر ٹوکریاں بیچنے سے منع بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے اخبار بکنے دو میں تمہاری ٹوکریاں خرید لوں گا لیکن چھلو کو یہ بھی گوارا نہیں۔ لہٰذا وہ ایک موٹر والے کے پاس جا کر اپنی ٹوکریاں دکھانے لگتی ہے لیکن موٹر والے کے دل میں کچھ اور ہے وہ چھلو کو ساری ٹوکریاں خرید لینے کا جھانسا دے کر موٹر میں سوار کر کے ویرانے میں لے جاتا ہے اور جب چھلو کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک درخت کے نیچے نُچی کھچی پڑی ہوتی ہے اور اس کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ہوتا ہے۔ جب وہ لاری میں سوار ہو کر گھر کو جاتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ ''اچھا ہوا اگر وہ اس چلتی ہوئی لاری سے کود پڑے اور مر جائے اور اس نوٹ کے

ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔'' مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا بلکہ جب وہ گلی کے کونے پر گوشت کی دکان کے سامنے پہنچتی ہے تو اس کے قدم رک جاتے ہیں'' گھر پہنچ کر چھلو نے باورچی خانے میں گوشت رکھا اور اس کے ساتھ ہی لہسن' پیاز اور ادرک اور ہری مرچ بھی رکھ دی۔'' اور جب اس کی ماں'' کرتارو' ہانڈی میں گوشت بھونتی ہے تو چھلو کا باپ' کرتارو سے کہتا ہے'' دیکھو آج گھر بستا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔'' اور پھر افسانے کا اختتام ان معنی خیز سطور پر ہوتا ہے

> ''چھلو نے جلتے ہوئے چولہے کی طرف دیکھا۔ چولہے کا سارا جسم آگ کی طرح جل رہا تھا۔ چولہے کے اوپر ہانڈی رکھی ہوئی تھی' چھلو کو محسوس ہوا جیسے اس ہانڈی میں اس کی مسکراہٹ بھونی جا رہی ہے۔
>
> 'اچھا بیٹی اب تو نئی ٹوکریاں بنانا شروع کر دے میں نے تیرے لیے نئے پتے بھگو رکھے ہیں۔' ماں کرتارو زندگی میں پہلی بار اس سے اتنے پیار سے بولی۔
>
> حکم کی بندی چھلو مونڈے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں سُوا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج کھیتوں میں وہ پتے نہیں اُگیں گے جن سے وہ ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں اور نہ آج سے 'رتنا' کے پہنچنے کے لیے ایسے اخبار شائع ہوں گے جن میں دن دھاڑے ایک معصوم لڑکی کے 'قتل' ہونے کی خبر چھپے گی!!''

چھلو اپنی خواہشات کے مقابلے میں اپنی ماں اور باپ کی خواہشات اور ضروریات کے لیے'' حکم کی بندی'' بن کر جینے پر مجبور ہے۔ وہ اس مجبور زندگی سے لاتعلق سی بھی ہے اور وابستہ بھی ہے۔ اس کے اندر بیگانگی اور ذمہ داری کا احساس بیک وقت موجود ہے۔ گاہکوں کے سامنے اس کا لوٹے جیسا منہ بنانا اس کی اپنے پیشے اور مجبوری سے لاتعلقی کا اظہار ہے جسے'' کمزور سا احتجاج'' کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن باپ کی فرمائش کو پورا کرنے کے لیے موٹر والے کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کرنا (یعنی اپنوں کی توقعات پر پورا اترنے کی خواہش) اور اس کے لیے 'رتنا' جیسے چاہنے والے محبوب کی بات کی پرواہ نہ کرنا اس کے ایک طرح کے تعلق اور ذمہ داری کے احساس کا پتہ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ افسانے کی اختتامیہ سطور اس بات کا اعلامیہ ہیں کہ اب چھلو گاہکوں کے سامنے لوٹے جیسا منہ کبھی نہیں بنائے گی اور اس کمزور سے احتجاج سے بھی دستبردار ہو جائے گی جو ممکن تھا کہ آگے چل کر کسی بڑی اندرونی کشمکش یا 'Dilemma' کو جنم دے سکتا اور یہی وہ'' قتل'' ہے جس کی

خبر اخبار میں کبھی شائع نہیں ہوگی۔

مس کملاداس جو ملازمت کرنے پر مجبور ہے اسے اس کا باس دوگنی تنخواہ کا لالچ دے کر اپنے ساتھ دورے پر لے جاتا ہے اور جب واپس لوٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مس کملاداس اب ''کوری باندی'' نہیں رہی بلکہ'' کالی کلوٹی باندی'' یعنی نجر بٹو (نظر بٹو) بن گئی ہے۔ اگرچہ یہ کالکھ مس کملاداس نے اپنے چہرے پر خود نہیں لگائی ایک ظالم نے لگائی تھی مگر '' سماج کے دل میں محبت کا ایسا پانی تھا ہی نہیں کہ جس سے وہ اس کوری باندی کی سیاہی کو صاف کر دیتا۔۔۔اسے دھوڈالتا۔۔۔پونچھ لیتا۔۔۔اسے سنوار لیتا۔۔۔اور پھر اس کو کسی مقدس چوکے کی زینت بنالیتا!'' لہٰذا مس کملاداس کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتی ہے۔

یہ افسانہ (کوری باندی) اگرچہ اپنی تکنیک اور تاثر کے حوالے سے بڑا بھرپور اور منفرد ہے مگر مس کملاداس کا کردار اپنی حددرجہ انفعالیت کی وجہ سے متاثر نہیں کر سکا اور اس میں امرتا کی مجبوری یہ تھی کہ انہیں معاشرے کی اس فعالیت کو شدت سے ابھارنا تھا جو امیر مردوں کے معاشی اور جنسی استحصال کو نمایاں کر سکے اور اس کے لیے مس کملاداس کے کردار میں انفعالیت کے درجات کو بڑھانا ضروری تھا۔

''بندو'' عورت کا ایک پروٹو ٹائپ ہے۔ وفا شعار' ٹوٹ کر محبت کرنے والی اور اپنا سب کچھ نچھاور کر کے کچھ نہ طلب کرنے والی خالص ہندی ناری' جو اپنے لیے نہیں صرف اپنے اس مرد کے لیے زندہ رہتی ہے جسے دل سے ایک بار اپنا پتی مان لیتی ہے۔

بندو سریندر کی محبت میں اپنا گھر بار سب چھوڑ چھاڑ کے آ جاتی ہے اور بغیر پھیرے لیے اس کے بچے کی ماں بن جاتی ہے لیکن سریندر اس کی زندگی جہنم بنا دیتا ہے اور آخر کار اس کی بے رُخی کی وجہ سے ہی بندو کو گھر واپس آنا پڑتا ہے۔ سریندر کی وجہ سے وہ بے انتہا دکھ اٹھاتی ہے حتیٰ کہ اس کا بچہ بھی مر جاتا ہے مگر ''جیسے تم خوش ہو سکتے ہو اسی میں میری خوشی ہے'' کہنے والی بندو سے تجارت کا سوال بھی نہیں آتا' سریندر کو اس وقت پھر اپنی محبت بھری بانہوں میں پناہ دیتی ہے جب وہ افلاس' بیماری اور گناہوں کے بوجھ تلے دبا ہوا در بدر کی ٹھوکریں کھا کر بندو کی چوکھٹ پر آن بیٹھتا ہے۔

پورے افسانے میں بندو کی زندگی صرف اور صرف سریندر کے گرد گھومتی ہے اس کی دنیا' اس کا جہان صرف سریندر ہے۔ یہ کردار بھی خاموش' سب کچھ سہہ جانے اور راضی برضا رہنے والا ہے۔ یہاں مثالیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ حقیقت پسند قاری کا ذہن بار بار جھٹکے کھاتا ہے۔ جذباتیت اور مثالیت پسندی کا ادغام اس

کردار کی بنت میں کئی سقم چھوڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے فنی سطح پر یہ کردار متاثر نہیں کر پاتا۔

''شمی'' ایک مکمل جذباتی کردار ہے جس کا المیہ یہ ہے کہ ''جب میں نے محبت کے حروف پڑھنے شروع کیے تو زندگی نے میرے سامنے دو کتابیں رکھ دیں! ایک میں زندگی کا فلسفہ تھا' زندگی کا گیان تھا' زندگی کا حل تھا' دوسری میں دلچسپ کہانیاں تھیں اور چند رنگین و شوخ تصویریں۔ پہلی کتاب مجھے مشکل نظر آئی اور میں نے زندگی کا وید الگ رکھ دیا اور دوسری کتاب کی رنگین تصاویر میں محو ہو گئی۔ جب دل کے معنی سمجھنے شروع کیے تو مجھے میری کہانیاں تسکین نہ دے سکیں اور پھر جب میں نے پلٹ کر زندگی کے وید کو چھونا چاہا تو زندگی نے وید میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔'' اور اسی غم میں غلطاں و پیچاں شمی موت کے منہ میں چلی جاتی ہے اور ایک sodo-Tragic تاثر ابھارتی ہے۔

جہاں تک سوال ہے Realistic Approach کا تو وہ امرتا کی ''ماڈل گرل'' میں نظر آتی ہے۔ امرتا کی یہ ماڈل گرل بہت دور اندیش ہے کیوں کہ اسے ''بہت دور تک دیکھنے کی عادت سی ہو گی ہے۔۔۔'' وہ زمانے کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہے اور سراسر تعقلاتی سطح پر زندگی بسر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ

''چیتن اجسم کی بھی ایک آگ ہوتی ہے لیکن وہ جسم سے ٹکرا کر بجھ جاتی ہے۔ بعد میں سب کچھ ٹھنڈی راکھ بن جاتا ہے۔'' اور کپڑوں کی طرح بدن بھی اتارا جا سکتا ہے۔ لیکن کپڑوں کے بٹن کھول کر ہی سب کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔ صرف جسم تک رہ جاتے ہیں۔ اور جو کچھ اس سے آگے ہوتا ہے اس سے دور۔۔۔۔۔''

''کیرتی'' امرتا کا ایسا نسوانی کردار ہے جو پیش منظر پر زیادہ نمایاں تو نہیں ہوتا مگر اس کے باوجود اپنا گہرا تاثر ابھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کیرتی اور شوکمار کے درمیان پیدا ہونے والا تعلق وقت اور سماج کی روایتوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس لیے یہاں جس المیہ سے ہم دوچار ہوتے ہیں اس کا جنم' داخلی جذبات اور خارجی مجبوریوں کی کشمکش سے ہوتا ہے۔ کیرتی کی خوب صورتی یہ ہے کہ وہ پابندیوں کے ساتھ ساتھ آزادیوں کے اظہار کی قوت رکھتی ہے۔ وہ اگر ایک طرف راکھی بھیج کر سماج کے تقاضوں کو نبھاتی ہے تو دوسری طرف چڑ کتے ہوئے لفظوں سے بھرا خط لکھ کر اپنے جذبات کا حال بھی سناتی ہے۔ اس کردار کی موثر عکاسی امرتا کے ان الفاظ میں ہوتی ہے۔ لکھتی ہیں:

''انسانی رشتوں کی دوہری گرفت میں بندھی ہوئی کیرتی نے شوکمار کے جلتے خط کے جواب میں ایک ویسا ہی خط لکھ دیا تھا اور رسموں اور روایتوں سے ایک سرد رسم کے تقاضے پر اس نے سرخ دھاگے کا ایک سر ٹکڑا بھیج دیا تھا۔''

تبدیلی کی خواہاں اور منہ پھٹ اور مرد مار قسم کی ''دھنو'' امرتا کے تمام نسوانی کرداروں میں واحد متحرک اور جی دار کردار نظر آتا ہے۔ اس کے ماضی کی حقیقت سے پوری طرح کوئی آگاہ نہیں محض روایتیں مشہور ہیں۔ منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے گاؤں بھر میں کسی کو دھنو کے سامنے کچھ کہنے کی جرات نہیں۔ وہ جب تک زندہ رہتی ہے اپنے زور کے بل پر زندہ رہتی ہے۔ بظاہر اسے کوئی فکر نہیں اور وہ اکثر کہتی ہے کہ'' پلے دھیلی بندھی ہوئی ہے کوئی مشکل بنی تو بھنا لوں گی۔'' لیکن ایک بار جب گاؤں کا ایک نوجوان ''دھنو'' سے کہہ بیٹھتا ہے کہ ''دھیلی تو دکھاؤ کیا کھری بھی ہے'' تو دھنو اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہتی ہے ''چلو دکھاؤں۔۔۔ تمہاری ماں کی شلوار میں ہے۔۔۔'' اس کے بعد گاؤں کے کسی مرد کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ دھنو کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔

اصل میں دھنو عورت کی معاشرتی حیثیت اور اس کی مجبوریوں سے بخوبی واقف ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں اس کا فلسفہ بڑا سیدھا سادہ اور دوٹوک ہے۔ کہتی ہے

''عورت کو تو خدا نے شروع ہی سے دھیلی بنایا ہے۔ روپیہ ڈبل تو کوئی کرموں والی ہوتی ہے جسے اپنی مرضی کا مرد مل جائے۔ لیکن ایسی عورت تو کسی نے دیکھی نہ سنی۔ گھر گھر دھیلیاں ہیں۔ بس دو تین پولیوں کو جنم دیا اور دنیا سے لد گئیں۔۔۔۔''

دھنو سماجی روایتوں اور بندھنوں کی باغی ہے جس کی وجہ سے اس کی باتوں میں تندی و تیزی کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر بھی موجود ہیں۔ اس کی بغاوت محض جذباتی نہیں اس کی پوری زندگی کے تجربہ کا نتیجہ ہے اسی لیے جب مرتے وقت دھنو سے کہا جاتا ہے کہ وہ توبہ کر لے تاکہ اگلے جہان کا حساب کتاب آسان ہو جائے تو وہ ہنس کر کہتی ہے

''میری فکر کیوں کرتی ہو۔ بھگوان کو حساب دینا ہے دے لوں گی۔ یہ دھیلی جو پلے بندھی ہوئی ہے بھگوان سے کہوں گی' تو بھنا لو اور حساب چکتا کر لو۔''

بغاوت سے بھری ہوئی یہ دھنو تبدیلی پسند ہے اور جب اس کی وصیت سامنے آتی ہے تو وہ باغی سے زیادہ انقلابی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ دھنو اپنی تمام زمین گاؤں کے اسکول کو دے جاتی ہے اور لکھ جاتی ہے کہ

''میری ایک ہی خواہش ہے کہ لڑکیاں بھی چار حرف پڑھ لیں اور ان کی زندگی خوار نہ ہو۔''

امرتا کا افسانہ ''سرد آہ'' حقیقت نگاری کی ذیل میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ یہاں دو نسوانی کردار ''نیہال کور'' اور ''ویرو'' اس طرح آمنے سامنے ہیں کہ جو نہ صرف دو مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ انہیں نمایاں بھی کرتے ہیں۔ بظاہر یہ کردار ایک دوسرے کا counter part ہونے کا شائبہ پیدا کرتے ہیں مگر ایسا کچھ نہیں ہے کیونکہ دونوں اپنی اپنی صورت حال کے مدمقابل ہیں۔

نیہال کور سردار کی پہلی بیوی ہے۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے سردار کو وارث کی فکر لاحق ہوتی ہے تو نیہال کور خود سردار کی دوسری بیوی ویرو کو تلاش اور پسند کرتی ہے اور یوں وہ سردار کے سینے سے نکلنے والی سرد آہ کو اپنے سینے میں دبی دوسری سرد آہوں کے ساتھ دبا لیتی ہے۔ وہ ویرو کو بالکل اپنی بیٹی اور بہو کی طرح خیال کرتی ہے اس کی ایک ایک بات کا اسی طرح پاس اور لحاظ رکھتی ہے جیسے ایک ماں اپنی بیٹی کا رکھتی ہے۔ نیہال کور کا کردار یہاں سوتن ہوتے ہوئے بھی ماں کی شکل میں پیش ہوا ہے جس نے نیہال کور کے کردار کو ایک وقار اور متانت بخشی ہے۔

دوسری طرف ویرو اس بات پر نالاں ہے کہ اس کے باپ نے دو ہزار روپے کے عوض اسے ایک بوڑھے کھونٹے (سردار) کے ساتھ باندھ دیا ہے اسی لیے ''نیہال کور جب بھی ویرو کے چہرے کی طرف دیکھتی تو اس کے دل میں ایک فکر پیدا ہو جاتی۔ ویرو کی کالے بھونروں جیسی آنکھیں تھیں۔ رنگ کی ذرا سانولی تھی مگر سانولے رنگ میں جوانی سخت آٹے کی طرح گندھی ہوئی تھی اس کی بانہیں بیلنوں کی طرح گول اور سخت تھیں۔ کسے ہوئے جسم میں انگلی کا ایک پور بھی نہیں گھستا تھا۔ سرداران کو محسوس ہوا کہ سردار سے جو سرد آہ اس نے لے لی تھی ویرو نے اسی سرد آہ کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا تھا۔''

اسی اثنا میں ویرو کے پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں اور وہ زچگی کے لیے نیہال کور کے ساتھ اپنے میکے چلی آتی ہے۔ یہاں وہ ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے اور ساتھ ہی نیہال کور پر انکشاف کرتی ہے کہ یہ بچہ سردار کا نہیں بلکہ اس کے منشی کا ہے اور پھر اپنا فیصلہ بھی سنا دیتی ہے کہ اب وہ سردار کے گھر لوٹ کر نہیں جائے گی۔ وہ نیہال کور سے صرف اتنی التجا کرتی ہے کہ سردار کو اس منشی کا نام مت بتانا ورنہ وہ اس منشی کو نوکری سے نکال دے گا۔ جب سرداران (نیہال کور) کہتی ہے کہ مدن سنگھ (منشی) تو شادی شدہ ہے اور اس کے دو بچے ہیں تو ویرو کہتی ہے ''اسی لیے تو وہ ڈرتا ہے کہ سردار کو پتہ چل گیا تو اس کی نوکری بلاوجہ جاتی رہے گی۔ اسے کون سا مجھے اپنے گھر

بسانا ہے کہ میں اس کی نوکری چھڑاؤں۔ وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔ میں نے ایک دفعہ دیکھ تو لیا جوان بازوؤں کی پکڑ کیسی ہوتی ہے۔۔''

اس طرح اگر چہ ویرو کا باغیانہ رویہ ہمارے سامنے آتا ہے لیکن اگر غور کریں تو یہ بغاوت محض فطری تقاضوں کی تسکین تک محدود رہتی ہے' سماجی یا معاشرتی حقوق کی پاسداری اس کا مطمع نظر نہیں۔ ویرو جانتی ہے کہ منشی مدن سنگھ اسے گھر بسا نہیں سکتا اور وہ اس پر مُصر بھی نہیں اور نہ وہ اسے اپنا حق سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کا خلوص دیکھیے کہ اس منشی کی نوکری کے لیے متفکر ہے۔ دوسری طرف اب وہ سردار کے گھر بھی نہیں جا سکتی اور وہ اس لیے نہیں کہ اسے سردار کا کچھ لحاظ یا پاس ہے بلکہ نیہال کور کا وہ مشفقانہ اور ہمدردانہ رویہ ہے جس نے اسے مجبور کر دیا ہے اور وہ اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔ یہاں بھی نیہال کور کے ساتھ ویرو کا خلوص اور سچائی دیکھیے۔ ۔۔۔۔وہ کہتی ہے:

''سردارنی! میں دنیا سے جھوٹ بول سکتی ہوں مگر تم سے نہیں۔۔۔۔ میں سردار کی کسی طرح بھی احسان مند نہیں ہوں۔ مگر میں تمہاری احسان مند ضرور ہوں۔ اگر یہ لڑکا صرف سردار کے آنگن میں ہی کھیلتا تو مجھے کوئی عذر نہیں تھا مگر میں اسے تمہاری جھولی میں نہیں ڈال سکتی۔ یہ تمہاری جھولی کے قابل نہیں ہے۔۔۔۔ سچ کہتی ہوں تم سے' مجھے اپنے لیے کوئی پچھتاوا نہیں اگر دل میں کوئی پچھتاوا ہے تو صرف تمہارے لیے۔۔۔۔''

اگر چہ امرتا پریتم اُردو افسانے کو کوئی بڑا نسوانی کردار تو نہیں دے سکیں مگر چند دلچسپ اور قابل ذکر کردار ضرور تراش گئیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ منٹو' بیدی' عصمت اور کرشن چندر کے نسوانی کرداروں کے مقابلے میں یہ کردار زندگی کی ایسی حقیقتوں کی نقاب کشائی نہیں کر سکے جن سے ہم پہلے سے واقف نہ ہوں لیکن اس کے باوجود ان کرداروں کی بنت یہ ضرور بتاتی ہے کہ یہ امرتا پریتم کے خاص نسوانی کردار ہیں۔

☆☆☆☆

پرتو روہیلہ
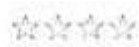
ایک شام۔۔۔۔امرتا پریتم کے ساتھ

ابتدائی جاڑے تھے‘ مجھے پشاور پوسٹ ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا‘ لیکن سب سے اہم اور وقیع بات یہ کہ صادقین صاحب ہمارے مہمان تھے اور اپنے دیرینہ اور ایفا نا آشنا وعدوں کی ایفا کی مساعی میں محو تھے۔ ڈرائنگ روم نگار خانہ چین بنا ہوا تھا اور گھر کی ساری ذی روح موجودات فرش پر جھکی اس قرطاس پر نظر جمائے بیٹھی تھی جس پر وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ رہے تھے کہ کسی نے آکر اطلاع دی کہ ملہوترا صاحب تشریف لائے ہیں۔ اچھا تو گویا ملہوترا صاحب اسلام آباد سے میرے تعاقب میں پشاور بھی پہنچ گئے۔ راجندر ملہوترا صاحب ہر سال بڑی پابندی کے ساتھ انبالہ سے آتے اور انبالہ ٹرسٹ کے مشاعرے کی پرزور دعوت دیا کرتے لیکن ملازمت کی الجھنوں کے سبب باوجود کوشش کے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی تھی۔ میں خود اپنے آپ سے شرمندہ تھا کہ ہر سال ان سے وعدہ کر لیتا ہوں لیکن پورا نہیں کر پاتا۔ اسلام آباد پہنچ کر انہوں نے مجھے اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر چہ میرا ویزا پشاور کا نہیں ہے لیکن میں آپ کا دعوت نامہ بہر صورت ایک بار پھر آپ کو ضرور پہنچاؤں گا جس کا مجھے چنداں یقین نہ تھا۔

لیکن اس بار تو انہوں نے انبالے کے دعوت نامے کے ساتھ ہی دلّی کے مشاعرے کا دعوت نامہ بھی نتھی کر دیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ یقین دلایا تھا کہ آپ کے اسلام آباد کے سارے ساتھی بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ ان ناموں میں سرفہرست فراز کا نام تھا۔ فراز سے پوچھا تو انہوں نے کہا ”ہاں میں جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو‘ گپ رہے گی۔“

دلّی اور فراز اور پھر گزشتہ کئی سالوں کی وعدہ شکنی کی شرمندگی نے ایسا کام کیا کہ یکدم قلندروں کی طرح (دل ہی دل میں) میں نے نعرہ، خفی مارا اور زندگی کی کمند لال قلعے کی فصیل پر پھینک دی۔ ممبر سی بی آر کو ڈرتے ڈرتے فون کیا۔

''سر ایک پندرہ دن کی چھٹی چاہیے۔ عزیزوں سے ملنے ہندوستان جانا ہے۔ انتہائی ضروری ہے۔ میں نہیں گیا تو گھر کے دوسرے افراد بھی نہ جا سکیں گے''۔ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ انہوں نے ترنت فون پر ہی چھٹی دیدی اور چند دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد میں' ثروت' شمیم اکرام الحق' پروین فنا واہگہ کے راستے انبالے پہنچ گئے۔ فراز اکیلے ایک دن بعد پہنچے۔

انبالے میں دو تین بڑے یادگار اور بقول ایرانیوں کے ماندگار دن گزار کے ہم لوگ دلّی پہنچے۔ میں اپنے ایک دوست فرید صدیقی کے ہاں ٹھہرا جب کہ فراز پاکستان کے ایک سفارت کار کے ساتھ۔ یوں تو یہ دلّی کا مشاعرہ بھی بوجوہ بڑا ماندگار تھا لیکن اس بارے میں کچھ کہنا مجھے موضوع سے دور کر دے گا اس لیے اپنے بیان کو صرف اس شام پر محدود کرتا ہوں جب میرے میزبان نے امرتا پریتم' امروز اور فراز کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔

کھانے کے مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی خانم میزبان نے مجھے اطلاع دی کہ آج کے کھانے پر فراز کے علاوہ امرتا پریتم اور امروز بھی آ رہے ہیں۔ یہ سن کر میرا اکسائٹ منٹ اس نقطہء عروج پر پہنچ گیا کہ اس کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا اور میں نے خانم گرامی سے ایسے ایسے بچگانہ سوال کرنا شروع کر دیے کہ انہیں تنگ آ کر کہنا پڑا Patience Patience she will be here within an hour

اس ایک گھنٹے میں امرتا پریتم کی اس شبیہ نے جو 1952-53 کی ایک عام سی شام میں لاء کالج پشاور کے ہوسٹل کے نیم روشن کمرے میں یکدم میرے ذہن پر چھا گئی تھی۔ کیسے کیسے رنگ بدلے' قابل بیان نہیں۔ اس ہی شام زندگی میں پہلی بار میں نے امرتا پریتم کا نام سنا اور پہلی بار اس کی شہرہ آفاق نظم کی تا ابد زندہ رہنے والی لائنوں سے میرے کان آشنا ہوئے جب میرے ہم کلاس نے ''ساوے پتر'' سے لہک لہک کر یہ لائنیں پڑھیں:-

آکھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی تو لکھ لکھ مارے وین
آج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

ہر ہر لمحہ یہ اضطراب بڑھتا جاتا اور ہر گھڑی ذہن کے ہیولے صورت بدلتے رہتے تا آنکہ جب ان کے

آ جانے کی ہمیں اطلاع ملی اور ہم ان کے ڈرائینگ روم میں جہاں فرید صدیقی کے مارے ہوئے ایک شیر کی کھال بھی دیوار پر آویزاں تھی' پہنچے تو میں نے دیکھا کہ لمبے ہاڑ اور ڈیل ڈول کی ادھیڑ عمر کی ایک خاتون جن کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے عاری تھا انتہائی سادی ساڑھی میں ملبوس صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ان کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ ان کے ساتھ امروز ان سے عمر میں بہت کم دبلے پتلے سانولے رنگ کے پینتیس چالیس کی عمر کے نظر آتے تھے۔ تعارف کی چھوٹی سی تقریب کی مصروفیت ختم ہی ہوئی تھی کہ برادرم فراز بھی آ پہنچے اور پھر یک دم محفل میں جان آ گئی۔ اس کا دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ پھر شربت رُوح افزا کی بوتل بھی کھول لی گئی اور یہ کمرہ جو چند لمحے پیشتر نسبتاً پر سکون تھا پر جوش آوازوں اور بلند بانگ قہقہوں سے گونجنے لگا۔

کھانے کی یہ تقریب یقیناً دو تین گھنٹے تو جاری رہی ہوگی۔ اس کی کوئی خاص بات تو حافظے میں نہیں البتہ اس کے چند روشن تاثرات آج بھی قائم ہیں۔ پہلی بات امرتا پریتم کی شخصیت سے متعلق ہے۔ اور یہی اس تحریر کا موضوع بھی ہے۔ اس تمام عرصے میں' میں نے محسوس کیا کہ وہ گہرے پانیوں کی طرح خاموش و پرسکون تھیں۔ انتہائی سنجیدہ انتہائی متین' ایسی شخصیت کہ نفس مطمئنہ حاصل کر چکی ہو۔ باتوں میں بھی کوئی تیزی نہیں کوئی تندی نہیں۔ کسی پر کوئی پوائنٹ اسکور نہیں کرنا۔ دھیمی آواز' چھوٹے چھوٹے جملے' آہستہ آہستہ باتیں۔ کوئی عجلت کوئی اضطرابی دُور دُور نہیں۔ مجھے جہاں تک یاد ہے (ممکن ہے غلط ہو) انہوں نے شربت رُوح افزا بھی نہیں پیا۔ چہرے پر گوتم کی سی طمانیت کہ مسکراہٹ بھی نہ کہی جا سکے لیکن ہم نشین کو یہ اعتماد کہ ہمہ تن میری طرف متوجہ ہیں۔ البتہ امروز نے تو مجھے بڑے واشگاف الفاظ میں بتایا کہ وہ شراب نہیں پیتا۔ ۔ ۔ اور اس وجہ سے کہ اچھی نہیں لگتی۔ ۔

فرید صدیقی کی میزبانی کا دوگونہ سپاس گزار ہوں کہ جہاں انہوں نے مجھے اور میری ہم سر کو اپنے ہاں ٹھہرایا اور مجھے ہندوستان کی ایک عظیم شخصیت سے ملنے کا موقع فراہم کیا وہیں اس تقریب کو یادگار بنانے کے لیے ایک فوٹو گرافر کا بھی انتظام کیا۔ سو یہ ان ہی کے طفیل ہے کہ میں آپ کی خدمت میں یہ تصویر ارسال کر رہا ہوں جہاں ہندوستان و پاکستان کی دو عظیم شخصیتوں کے درمیان میں بھی ایک ادنیٰ عقیدت مند ہم سری کے درپے نظر آ رہا ہوں۔ جب کہ تصویر زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ میں حقیقت سے زیادہ دیر پا ہوں۔

☆☆☆☆

تنویر ظہور

پھولوں کے درمیان اُمرتا پریتم سے ملاقات

۲۲ تا ۲۵ دسمبر ۲۰۰۰ء کو بھارت کے شہر چندی گڑھ میں عالمی پنجابی کانفرنس ہوئی۔ پاکستان سے اُدیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا وفد عالمی پنجابی کانگریس کے چیئر مین فخر زمان کی سربراہی میں بھارت گیا۔ ان دِنوں بھارت کے ساتھ پاکستان کے حالات خوشگوار نہیں تھے اس لیے سب سے پہلے دِلی جا کر پولیس رپورٹ کرانی پڑتی تھی۔ دِلی سے ہم چندی گڑھ گئے۔ واپسی پر بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ یہ میرا پہلا بھارتی دورہ تھا۔

دِلی پہنچ کر اُمرتا پریتم سے ملاقات نہ کی جائے یہ ناممکن تھا۔ کنوَل مشتاق سے میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ چوں کہ وہ قبل ازیں دِلی جا چکا تھا۔ اُس کی ملاقات اُمرتا پریتم اور اِمروز سے ہو چکی تھی جب کہ اِمروز سے اس کی خط و کتابت بھی رہی۔

کنوَل مشتاق اور میں رکشہ میں بیٹھ کر ''حوض خاص'' پہنچ گئے۔ کنوَل مشتاق، اُمرتا جی کی کوٹھی کا نمبر بھول گیا۔ کوٹھی پر پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہاں اُمرتا نام کی کوئی خاتون رہائش پذیر نہیں۔ حوض خاص کی آبادی میں ہمیں ایک پوسٹ مین نظر آیا۔ اُس سے اُمرتا پریتم کی کوٹھی کا نمبر دریافت کیا۔ پوسٹ مین نے کہا'' کیا یہ کسی شخص کا نام ہے'' پوسٹ مین کا جواب سن کر میں سوچنے لگا کہ اتنی نامور شخصیت کے بارے میں پوسٹ مین کہہ رہا ہے'' کیا یہ کسی شخص کا نام ہے؟''

ہم نے کتابوں کی ایک دکان سے معلوم کیا۔ اُنھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ کنوَل نے پھر دِلی میں کسی کو فون کر کے اُمرتا پریتم کی کوٹھی کا نمبر دریافت کیا۔ آخر ہم اُمرتا کی کوٹھی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اِمروز نے دروازہ کھولا۔ اُس نے کنوَل مشتاق کو پہچان لیا اور ہمیں چھت پر لے گیا۔ اِمروز نے بتایا کہ سردی کی وجہ سے اُمرتا اُوپر دُھوپ میں بیٹھی ہے۔ چھت پر اُمرتا جی پھولوں کے درمیان ایک چارپائی پر لیٹی تھی۔ ہمیں دیکھ

کر بیٹھ گئیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ بیماری کے سبب کنول مشتاق کی اُمروز سے خط و کتابت رہتی ہے، اس لیے مَیں نے دیکھا۔ اُمرتا پریتم نے چارپائی کے قریب میز پر ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی دونوں ادویات رکھی تھیں۔ مَیں نے دریافت کیا۔ دو مختلف علاج ۔۔۔۔ اُمرتا نے جواب دیا کہ ''ڈاکٹرز دے مشورے نال ہی دونوں قسم دی میڈیسن استعمال کردی ہاں''۔ میز پر کالا انگور بھی پڑا تھا جو ہمیں کھانے کے لیے دیا گیا۔ کنول نے سگریٹ پینے کی اجازت چاہی تو اُمرتا نے کہا۔ ''اجازت کہڑی؟ میں خود وی تے سگریٹ پیندی ہاں''۔ اُنھوں نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا دکھائی۔

مَیں نے کہا کہ بیماری کے باوجود آپ سگریٹ پیتی ہیں۔ ڈاکٹرز کے منع کرنے کے باوجود پی لیتی ہوں، گو اب کم کردیے ہیں۔ میں نے اپنی ڈائری اُمرتا جی کے سامنے رکھ دی اور آٹوگراف کی درخواست کی۔ اُنھوں نے گُرمکھی میں لکھا۔

''تنویر ظہور لئی میریاں شبھ اچھیاواں۔ امرتا پریتم''

ان دنوں اُمرتا پریتم کی کتاب ''عشق اللہ حق اللہ'' زیرِ طباعت تھی۔ اس کتاب کے بارے میں اُنھوں نے بتایا کہ کتاب میں روحانی پہلو اجاگر کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب ''چراغوں کی رات'' کے بارے میں بتایا کہ یہ کتاب ہندی میں چھپ چکی ہے۔ اَب پنجابی میں شائع ہوگی جس کا نام رکھا گیا ہے ''چراغاں دی رات'' اُنھوں نے مجھے اپنی ایک کتاب ''آواز دی دُنیا والو'' عنایت کی جو گرمکھی میں ہے۔ اس کتاب میں اُمرتا پریتم نے لاہور اور دلی ریڈیو کے تجربات بیان کیے ہیں۔ ایک کتاب ان کی ''گاؤندا بھارت'' شائع ہوئی جس میں اُنھوں نے بھارت میں مقیم مختلف قوموں کے گیتوں کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔

اُمرتا جی نے بتایا کہ بیماری کے سبب اَب مَیں کہیں نہیں جاتی۔ ۱۹۸۰ء سے قبل مَیں نے کافی سیاحت کی ہے۔ مختلف علاقوں میں جا کر تقریریں کرتی۔ میری تقریروں کا موضوع ''اَمن'' ہوتا۔ مَیں نے اپنی کئی تقریروں کا موضوع پاکستان کے معروف افسانہ نویس مظہر الاسلام کو Quote کیا ہے۔ مَیں اکثر کہا کرتی ہوں کہ ''اے خدا لکھنے والوں کو سچ لکھنے کی توفیق دے''

اُمرتا جی نے بتایا کہ اُردو افسانہ نگاروں میں اُنھیں مظہر الاسلام کے علاوہ احمد داؤد کے افسانے پسند ہیں جب کہ پنجابی لکھاریوں اور شاعروں میں افضل توصیف، افضل احسن اندھاوا، فخر زمان اور سارا شگفتہ کو پسند کرتی ہیں۔

اُمرتا جی نے بتایا کہ افضل توصیف کا فون آیا۔

وہ کہہ رہی تھیں۔ آپ کے لیے کیا لاؤں؟

میرا جواب تھا۔ اپنی کہانیاں اور کالم لے آؤ۔ ''دوسرے آدم کی بیٹی'' یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں ہندی میں شائع ہوئی۔ اس کا اُردو ترجمہ ۲۰۰۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اُمرتا نے اپنے رسالے ''ناگ منی'' کا ایک شمارہ ''توصیف نمبر'' بھی شائع کیا۔ اُمرتا پریتم افضل توصیف کے بجائے اُنھیں ''توصیف'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ اُمرتا پریتم نے افضل توصیف کے کالموں کے بارے میں لکھا ''اخباروں میں چھپنے والے توصیف کے کالم مصیبت زدہ طاقت کی ایک واحد گواہی ہیں۔ اُس کے کالم کبھی ایک اخبار میں سلسلہ وار آتے ہیں۔ پھر اس اخبار پر پابندی لگ جاتی ہے۔ تو توصیف کوئی دوسرا اخبار تلاشتی ہے۔ لیکن اپنی آواز کو وقت کی ضرورت کے وقت غیر حاضر نہیں ہونے دیتی''

جس روز اُمرتا جی سے ملاقات کی۔ اُس روز ملکہ ترنم نور جہاں کے انتقال کی خبر سنی۔ مَیں نے ملکہ ترنم کے بارے میں اُمرتا سے پوچھا تو اُنھوں نے کہا۔۔۔ ''جب میں لاہور گمٹی بازار میں مقیم تھی تو نور جہاں کا مکان قریب ہی تھا۔ میری اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اُس وقت وہ ''بے بی نور جہاں'' تھی۔ نور جہاں اور لتا منگیشکر کا دور منفرد ہے''

مَیں نے اُمرتا جی سے دریافت کی آپ نے اپنی نظم میں وارث شاہ ہی کو کیوں آواز دی؟

اُمرتا پریتم کا جواب تھا.....

> ''اُس وقت میں ڈیرہ دُون سے دہلی روزی کی تلاش میں آ رہی تھی۔ اس سفر کے دوران مَیں نے سڑکوں پر، اسٹیشنوں پر اجڑے ہوئے بے گھر اور تباہ حال لوگ دیکھے۔ رات کی ویرانی میں ریل کے سفر کے دوران مجھے دُوڑتے ہوئے درخت انسانی ڈھانچے لگے جو چیخ رہے تھے۔ ریتلے ٹیلے مجھے قبریں لگیں۔ میرے سامنے اس وقت وارث شاہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا جسے مَیں مخاطب کر کے اپنے اندر کا کرب منتقل کر سکتی۔''

جنوری ۲۰۰۱ء کو میں راولپنڈی گیا تو مجھے بتایا گیا۔ پنجابی کے مشہور ادیب افضل پرویز فالج کی وجہ سے سخت علیل ہیں۔ مَیں ان کی عیادت کو چلا گیا اور ان کا انٹرویو کیا۔

یہ انٹرویو روزنامہ جنگ لاہور میں ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء کو شائع ہوا۔ افضل پرویز نے مجھے بتایا کہ ان کی جب اُمرتا پریتم سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے اپنی مشہور نظم ''آکھاں وارث شاہ نوں'' سنائی۔ اُمرتا پریتم کی نظم میں یہ شعر نہیں تھا۔

اُٹھ درد منداں دیا دردیا اٹھ تک اپنا پنجاب

اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہودی بھری چناب

افضل پرویز کے بقول یہ شعر ان کا ہے جو اُمرتا کو ''دان'' کر دیا اور اُنھوں نے اس شعر کو اپنی نظم میں شامل کر لیا۔ مَیں نے اس انٹرویو کی فوٹو کاپی دِلی میں امروز کو بھجوائی اُنھیں لکھا کہ اُمرتا جی سے پوچھ کر لکھیں کہ کیا افضل پرویز کا دعویٰ دُرست ہے؟ اس کے ساتھ ہی مَیں نے ایک اور سوال اُمروز سے پوچھا۔

کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے مذہب کے حوالے سے رسمیں ادا کیے بغیر اُمرتا پریتم کے ساتھ شوہر اور بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں؟

اُمروز نے میرے لیٹر کا جواب دیا۔ ملاحظہ کریں

''یاد رہے کہ اُمروز شاہ مکھی یعنی فارسی سکرپٹ لکھ اور پڑھ لیتے تھے، جب کہ اُمرتا پریتم شاہ مکھی سکرپٹ پڑھ نہیں سکتی تھیں۔

''تنویر ظہور جی۔ تہاڈے خط دا شکریہ۔''

راجستھان دے کئی پنڈاں وچ عورت تے مرد پنڈ دے سرپنچ کول جاندے سن تے کہندے سن کہ اج توں اوہ میرا مرد ہے تے اوہ میری عورت ہے تے سرپنچ کہندا ہے ٹھیک ہے.... تقریباً چالی سال پہلاں اُساں وی اک دوجے نوں اپنا مرد تے اپنی عورت آکھیا سی، پر اپنی حاضری وچ بغیر کسے بول دے تے بغیر کسے سرپنچ دے۔

جو بندہ اپنے بول دا اپنے کرم دا، تے اپنی سوچ دا ذمے دار ہے، اُس نوں قانون دی کی لوڑ ہے۔ پر صدیاں ہو گئیاں نے نہ کسے قانون نال تے نہ کسے مذہب نال آدمی ذمے وار نہیں ہو پایا۔ نا اپنے بول دا نہ اپنے کرم دا تے نہ اپنی سوچ دا.....''

افضل پرویز جی نے جو وی لکھیا ہے اس دے اوہ آپ ہی ذمے دار نے۔ اُمرتا اُردو نہیں پڑھ سکدی۔ ''جنگ'' دا کالم کیویں پڑھے گی تے نہ اوہ اہ بول، بول سکدی

اے۔ میرے دھن بھاگ.....! پرویز جی نے اپنے کولوں ہی اہ سب کچھ لکھ لیا اے۔
اپنے آپ نوں خوش کرن لئی۔ اُمرتا بارے اکثر لوک اپنے کولوں ہی بڑا کجھ لکھ دے
آئے ہن۔ پہلاں اپنے آپ نوں تے فیر پاٹھکاں توں بھلیکھے پان لئی۔ پتہ نہیں اہ
بھلیکھے بازاں دے دن کدوں ختم ہون گے۔

میرے خیال وچ کوئی وی جاگ دالیکھک نہ بھلیکھے پاوندا اے تے نہ بھلیکھے پالدا
اے۔ قانون تے مذہب آدمی نوں جگاں دی گل تاں کردے، ہن پر جگاندے نیں۔
کیوں جو جاگدے آدمی تے حکومت نیں ہوسکدی۔''

امروز

کنول مشتاق جی نوں میرا اسلام
تے ہر جاگ دے آدمی نوں میرا اسلام

اُمرتا پریتم پاکستانی شاعرہ سارا شگفتہ کی شاعری کی مداح تھیں سارا شگفتہ کا قیام کراچی میں تھا۔ کراچی قیام کے دوران سارا سے میری بھی چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔

وہ جوانی ہی میں ایک حادثے میں انتقال کر گئی۔

سارا شگفتہ کے بارے میں اُمرتا پریتم کا کہنا تھا کہ وہ ایک بجھتے ہوئے ستارے کی مانند میرے سامنے آئی تھی۔ کسی بھی ستارے کے ٹوٹنے کے بعد اس کی جو گرم راکھ زمین پر گرتی ہے وہی راکھ میں نے اُس کی نظموں میں محسوس کی ہے۔ میں نے اُس کو لکھا تھا کہ تم اپنی زندگی کے حالات خود اپنے ہاتھوں لکھو، لیکن وہ نہ لکھ سکی۔ میرے پاس اس کی بہت سی نظمیں اور خطوط محفوظ ہیں۔ اب میں ان کو لکھوں گی۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں جو لوگوں کو اُس کی زندگی کے بارے میں ہیں ختم ہو جائیں گی۔

اُمرتا پریتم کی وفات کے بعد پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج آرٹ اینڈ کلچر نے الحمرا ہال میں تعزیتی ریفرنس کیا۔ نظامت شائستہ نزہت اور صدارت منیر نیازی نے کی۔ سٹیج پر ان کے ساتھ سبط الحسن ضیغم، منو بھائی، شہزاد احمد، افضل توصیف، فرخندہ لودھی اور بشریٰ اعجاز تشریف فرما تھیں۔۔۔ اقبال باہو نے اُمرتا جی کی مشہور نظم ''اَج آکھاں وارث شاہ نوں'' ترنم سے سنائی۔ افضل توصیف نے کہا کہ اُمرتا جی میری دوست ہی نہیں، استاد بھی تھی، میرے کئی اساتذہ ہیں مگر اُمرتا پریتم کو میں Best Teacher کہتی ہوں۔ میں نے

اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ اُن کی نظمیں سنیں اور اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کو پڑھا۔ وہ گھنٹوں کے حساب سے گفتگو کرتیں اور اپنی نظمیں سناتیں۔

سبط الحسن ضیغم نے بتایا کہ امرتا کا شعری مجموعہ ''نویں رُت'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب اس طرح فروخت ہوئی جس طرح ہیر وارث شاہ اور سیف الملوک فروخت ہوتی ہیں۔

اُمرتا کی بائیوگرافی ''رسیدی ٹکٹ'' کے نام سے شائع ہوئی، مَیں نے اُس نام کی وجہ دریافت کی تو امرتا پریتم نے کہا۔ خشونت سنگھ جی سے ایک دِن بات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ تمھاری زندگی میں دو تین حادثوں کے علاوہ کیا ہے۔ ان کو اگر لکھیں تو ایک ٹکٹ پر لکھا جا سکتا ہے۔ پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ ٹکٹ کے سائز تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن ''رسیدی ٹکٹ'' کا سائز کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔

میری زندگی میں وقتاً فوقتاً جو حادثے ہوئے تھے مَیں نے اُنھیں نظم اور افسانے میں منتقل کر دیا تھا۔ اِن ہی واقعات و حادثات کو دوبارہ قلم بند کر کے مَیں نے ان ''رسیدی ٹکٹ'' لگا کر پکا کر دیا ہے۔

☆☆☆☆

حسن عباس رضا
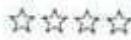
عمر بھر ایک مُلاقات چلی جاتی ہے

میں نے اُن کے ہاتھوں پہ بوسہ دیا، اور رخصت کی اجازت لینے کے لیے اٹھا، مگر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا،

'' نہیں، بیٹا ابھی نہیں، کچھ دیر اور رک جاؤ، ابھی میں نے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، اپنے دیس کی باتیں، اپنی جنم بھومی کی باتیں، اپنے پنجاب کی باتیں۔۔۔ ابھی تو میرا دل یادوں کے خزانوں سے بھرا پڑا ہے۔۔۔۔۔ابھی نہیں ،، بیٹھ جاؤ، تم دونوں نے مجھے ماضی میں لا کھڑا کر دیا ہے۔''

اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، میں نے کہا، دل تو نہیں چاہتا، مگر ایک کمٹمنٹ ہے، جو جانے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔ احمد داؤد نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا، اور گلوگیر لہجے میں کہنے لگا، امرتا جی، آپ نے ہمارے دامن میں اتنی محبت، شفقت اور خلوص بھر دیا ہے کہ آنے والے دنوں تک یہ ہمیں سرشار کرتا رہے گا۔ امرتا جی نے ایک بار پھر ہم دونوں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا، سر جھکا کر کہنے لگیں، '' اچھا بیٹا، رب راکھا ''۔ اس سارے الوداعی منظر کے دوران امروز خاموشی سے ہم تینوں کی باتیں سنتے اور آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو گنتے رہے، اور پھر سر جھکائے وہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔

امرتا پریتم کے ساتھ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ دوسری بار میں دلّی گیا، تو وقت کی کمی کے باعث صرف فون پر بات ہو سکی، ملاقات نہ ہونے پائی۔ پہلی بار احمد داؤد مرحوم اور میں اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی اور ممبئی گئے تھے، دہلی میں قیام کے دوسرے دن سے ہی ہم نے کوششیں شروع کر دی تھیں کہ امرتا پریتم سے ضرور ملنا ہے، امروز کے ذریعے ان سے ہماری خط و کتابت پہلے سے تھی، وہ ہمارے نام اور کام سے واقف تھیں کیونکہ ان کے میگزین ناگ منی میں احمد داؤد کے افسانے اور میری نظمیں شایع ہو چکی تھیں، یہ تخلیقات امروز نے پاکستانی رسائل سے لی تھیں۔

جس دن ہماری ملاقات طے ہوئی، اس شام کو کانفرنس میں احمد داؤد نے مضمون پڑھنا تھا جب کہ مجھے اختتامی مشاعرے میں شرکت کرنا تھی۔ ناواقفیت کی وجہ سے کافی دیر ٹیکسی ڈرائیور ہمیں گھماتا رہا، بالآخر ہم حوض خاص کے علاقے میں ان کی رہائش پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے، امروز نے ہمارا استقبال کیا اور لاؤنج میں لے گئے، امرتا جی صوفے پر بیٹھی تھیں، ناسازیءطبع کے باوجود انہوں نے اٹھ کر ہمیں گلے لگایا، اور صوفے پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ حال احوال کے بعد امرتا جی نے کتابِ ماضی کھولی، اور پھر ورق کے ورق الٹتے گئے، چند ایک قہقہوں کے سوا، بقیہ وقت آہوں اور آنسوؤں کے جلو میں گزرا، تقریباً تین گھنٹے وہ ہم سے باتیں کرتی رہیں، بچپن، جوانی، برصغیر کی تقسیم، پنجاب کا المیہ، کچھ نظموں کے پس منظر، بیرونی ممالک میں سفر کے احوال۔ بیچ بیچ میں وہ نظموں کی کچھ لائنیں بھی سناتی رہیں، میری فرمائش پر انہوں نے ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' سنائی۔ امروز چائے لے کر آئے تو امرتا جی خود اپنے ہاتھوں سے ہمیں چائے بنا کر دی۔ اس دوران ہم نے امروز کی پینٹنگز بھی دیکھیں۔

پاکستان واپس آنے کے بعد میں نے انہیں دو تین خط لکھے، مگر ایک خط کا جواب آیا، جس میں انہوں نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا تھا

۲

اُن کی تمام خط وکتابت امروز کیا کرتے تھے، کیونکہ میرے خیال میں امرتا جی اردو نہیں لکھ سکتی تھیں، بعدازاں ان سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا، لیکن پہلی ملاقات ہمیشہ دل کے آنگن میں تازہ بتازہ پھول کھلاتی رہی، بقول میرؔ،

عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

امرتا جی سے میرا پہلا تعارف، ان کی مقبول ومعروف سوانح ''رسیدی ٹکٹ'' سے ہُوا تھا، اس کے بعد ان کی شاید ہی کوئی تحریر ہو، جو میرے مطالعے سے بچ گئی ہو۔ ان کی کئی نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں، جو میں اکثر تنہائی میں خود کو اور محفل میں احباب کو سناتا۔ یوں تو امرتا جی کی لاتعداد ایسی نظمیں ہیں جو جدید پنجابی نظم میں سب سے منفرد دکھائی دیتی ہیں، تاہم کچھ نظموں کی سطریں ایسی ہیں کہ وہ دل اور روح تک اتر جاتی ہیں، ان کی نظموں کے استعارے، علامتیں، اور تشبیہات قاری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہیں؛

سُفنے دا اک تھان بنایا

گز کوں کپڑا پاڑ لیا

تے عمر دی جھولی سیتی۔

۲ عرض کرے دھرتی دی دائی

رات کدے دی بانجھ نہ ہووے،

۳ اک وار اچانک تُو آیا

تے وقت ازلوں حیران

میرے کمرے وچ کھلوتا رہ گیا

۴ ست رنگ پانی وچ گھلدے

اٹھواں دل وچ گھلدا

ست رنگاں وچ بھیس رنگاواں

اٹھویں رنگ وچ سُفنا

۵ ننجی اکھ زمیں دی پھڑکی

موت دے کورے کاغذ اُتے

زندگی نے انگوٹھا لایا

۳

چند ماہ پہلے گلزار جی نے مجھے ممبئی سے ایک بہت خوبصورت اور ہمیشہ یاد رہنے والا تحفہ بھیجا، وہ قیمتی تحفہ ہر رات مجھے گلزار اور امرتا جی سے ملاقات کراتا ہے۔ یہ ایک سی ڈی ہے، امرتا جی کی نظموں کو گلزار نے اپنی منفرد آواز میں ریکارڈ کیا، اور ہر نظم سے پہلے امرتا جی کے بارے میں اور نظم کے حوالے سے بہت خوبصورت تبصرہ کیا ہے، جن احباب تک یہ سی ڈی نہیں پہنچی، ان کے لیے چند اقتباسات؛

'' امرتا جی نے پنجابی شاعری کے صفحوں پر تقریباً پوری بیسویں صدی چل کے اکیسویں صدی کی دہلیز پار کی تو جسم تھکنے لگا، روح مگر تازہ دم تھی، شاید چلنے کو اُٹھیں، تو امروز نے ہاتھ تھام لیا، جو ایک صدی سے ان کا ہم قدم تھا، مڑ کے دیکھا،،،، ہاتھ ہٹا نہیں تھا، انگلیاں ابھی چھوٹی نہیں تھیں، بولیں، '' میں تینوں فیر ملاں گی''

میں تینوں فیر ملاں گی

کتھے، کس طراں، پتہ نہیں!

شاید تیرے تخیل دی چِنگ بن کے

تیرے کینوس تے اُتراں گی

یا خورے تیرے کینوس دے اُتے

اک رہس نی لکیر بن کے

خاموش تینوں تکدی رہواں گی،

میں تینوں فیر ملاں گی۔۔۔

یا خورے سورج دی لُو بن کے

تیرے رنگاں وچ گُھلاں گی

یا رنگاں دیاں بانہواں وچ بیٹھ کے

تیرے کینوس نوں وَلاں گی

پر تینوں ضرور ملاں گی

یا خورے اک چشمہ بنی ہوواں گی

تے جیویں جھرنیاں دا پانی اڈدا،

میں پانی دیاں بونداں تیرے پنڈے تے ملاں گی

تے اک ٹھنڈک جئی بن کے

تیری چھاتی دے نال لگاں گی

۴

میں ہور کجھ نہیں جاندی

پر ایناں جاندی آں کہ وقت جو وی کرے گا

ایہہ جنم میرے نال ٹُرے گا

ایہہ جسم مُکدا اے، تے سب کجھ مُک جاندا اے

پر چیتیاں دے دھاگے
کائناتی کناں دے، ہوندے نیں
میں انہاں کناں نوں
چناں گی،
دھاگیاں نوں ولاں گی
تے تینوں فیر ملاں گی۔

بقول گلزار'' ،امرتا جی کی نجی نظموں میں بھی زمانہ نظر آتا ہے، اُن کا دور دکھائی دیتا ہے، بات کرتے کرتے ایک کائنات کھول کے رکھ دیتی ہیں، لیکن جب کائنات کو سمیٹ کر نجی بات پر آتی ہیں تو کچھ دوستوں کے چہرے نظر آنے لگتے ہیں، اور وہاں وہ گوڑھے، گہرے دنیاوی رشتے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں جہاں سماج کے گھاٹ پار کرنے کے لیے بہت سے پُل جلا دینے پڑتے ہیں'':

کل اساں دونہواں نیں
اک پُل جلایا سی
تے اک دریا دے کنڈھیاں وانگوں
نصیب ونڈے،
نصیب ونڈے، تے بدن چھنڈے
تاں اک پنڈے دی ویرانی ایس کنڈھے سی
تے اک پنڈے دی ویرانی اوس کنڈھے
تے فیر رُتاں نے جدوں دی کجھ پُھل دتے
تاں ٹوں وی اوہ پنڈےتوں توڑ دتے
تے میں وی اوہ رُتاں نوں موڑ دتے
تے جھڑے پتیاں وانگوں
کنے ای ورھے اساں پانی وچ روڑھ دتے

۵

ورھے مکے نیں، پر پانی نہیں سکے
تے وگدے پانیاں وچوں پر چھانویں تاں ویکھے
پر منہ نہیں تکے
تے ایس توں پہلاں
کجھ وتھ تے کھلوتے اسیں مُک جایئے
چل کھنگراں جئے پنڈے پانی تے وچھایئے
تُوں آپنے پنڈے تے پیر رکھیں
تے ادھے دریا نوں لنگھ آویں
میں آپنے پنڈے تے پیر رکھاں گی
تینوں اگوں دی ملاں گی
چل کھنگراں جئے پنڈے پانی تے وچھایئے۔

گلزار کہتے ہیں،"چند ملاقاتیں یاد ہیں امرتا جی، اور امروز سے، انہیں سوچ میں تو اکثر دیکھا تھا، ٹھاٹ فُل، نظر آتی تھیں، لیکن اداس کبھی نہیں دیکھا، ہمیشہ بھری ہوئی، دودھ سے بھرے کٹورے کی طرح چھلکتی ہوئی۔۔۔لیکن شاعر اپنی اداسی چہرے پہ کہاں لکھتا ہے، وہ تو اپنی نظموں میں بھر دیتا ہے، جیسے پانی میں مٹھی بھر ریت انڈیل دے، وہیں کہیں تہہ میں بیٹھ جاتی ہے وہ اداسی، نظم کی سطح پر بھی نظر نہیں آتی۔۔نظم کھڑونچی پر پڑی رہتی ہے، رِستے گھڑے کی طرح:"

وے میں رتو کے گھڑے دا پانی
کل تک نئیں رہنا۔۔
ایس پانی دے گن ترھیائے
ترپہہ دے ہونٹھاں وانگوں
او میرے ٹھنڈے گھٹ دیا مترا
کہہ دے جو کجھ کہنا،
میں رتو کے گھڑے دا پانی، کل تک نئیں رہنا

اج دا پانی لیکن لاہوے

کل دی تریہہ دا قرضہ

نہ پانی نے کنئیں بجھنا

نہ پلّے وچ رہنا ، دے میں ترو کے گھڑے دا پانی کل تک نیں رہنا

۶

امرتا جی کو ہم سے بچھڑے کئی موسم بیت گئے ، مگر ان کی کہانیاں ، ان کی نظمیں آج بھی ادبِ عالیہ کے صفحات پر جگمگا رہی ہیں ، بیس برس پہلے اُن سے ملاقات آج بھی یادوں کے بام پر جلتے چراغوں کی طرح جگمگا رہی ہے ، اور تصور کے منظروں میں آج بھی یوں لگتا ہے کہ وہ ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کہیں گی ، بیٹا ، کچھ دیر اور رک جاؤ نا ، ۔۔۔ وہی آواز ، وہی ممتا بھرا میٹھا لہجہ میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے ۔ امرتا جی ، میں تو رک جاؤں ، مگر آپ ۔۔۔۔

زیادہ سے زیادہ دل بچھا دیتے ہیں رستے میں
مگر جس نے بچھڑنا ہو ، اُسے روکا نہیں کرتے

☆☆☆☆

حمید اختر

ساحر اور امرتا پریتم

امرتا پریتم کو میں نے 1943 میں پہلی بار دیکھا۔ پریت لڑی رسالہ شائع کرنے والے اور امرتسر اور لاہور کے درمیان انسان دوستی اور محبت کے نام پر ''پریت نگر'' نامی بستی بسانے والے سردار گوربخش سنگھ اس بستی میں ہر سال ایک ادبی کانفرنس اور مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ یہ ساحر لدھیانوی کے بطور شاعر شہرت حاصل کرنے کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اسے اس سالانہ کانفرنس کی دعوت ملی۔ وہ تنہا سفر کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ کسی بھی نئی جگہ جانے کے لیے اسے بیساکھی کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ بہت اصرار بلکہ منت ترلے کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ پریت نگر لے گیا۔ یہ ہماری دوستی کا ابتدائی زمانہ تھا۔

کانفرنس میں ہم دن بھر تقریریں سنتے رہے مگر ہماری اصل دلچسپی رات کو منعقد ہونے والے مشاعرے سے تھی۔ اس مشاعرے میں سولہ سترہ برس کی امرتا پریتم نے ایک پنجابی نظم سنائی۔ اسے داد بھی بہت ملی مگر بیشتر لوگ اس کی شکل وصورت کے اسیر ہو گئے' ہمارا دوست نہ صرف ان میں شامل تھا بلکہ وہ تو جیسے اس پر فدا ہو گیا۔ اس نے بھی اس مشاعرے میں اپنی نئی نظم ''تاج محل'' سنائی اور خوب داد پائی۔ یہ ان دونوں کی پہلی تعارفی ملاقات تھی۔ سٹیج پر بیٹھے ہوئے ان دونوں میں کچھ بات چیت بھی ہوئی اور غالباً دونوں نے ایک دوسرے کی نظموں کی تعریف بھی کی۔ اس کے بعد اگلے روز ہم واپس لدھیانہ آ گئے لیکن ساحر کئی روز تک اس نئی شاعرہ کی باتوں کا ذکر کرتا رہا۔ ہمارے لدھیانہ کے اس گروپ میں آرٹسٹ پری کشن' موسیقار جے دیو درما' پنچھی باورا' چودھری غلام مرتضیٰ' فیض الحسن چودھری' احمد ریاض اور میں اور میرے بڑے بھائی صفدر علی شامل تھے۔ ساحر کی زبانی ہفتوں امرتا پریتم کا اتنا ذکر ہوا کہ ہم سب یہ سن کر عاجز آ گئے۔ 1945 میں ساحر لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکالے جانے کے بعد لاہور آ گیا' اس نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا مگر وہ کالج کم ہی جاتا تھا۔ مکتبہ اُردو لاہور کے چودھری برکت علی اور چودھری نذیر نے اسے ادب لطیف کی ایڈیٹری کی پیش

کش کی جو اس نے فوراً قبول کر لی' اب اس کی سرگرمیوں کا مرکز بھاٹی اور لاہوری دروازوں کے درمیان سرکلر روڈ پر واقع ادبِ لطیف کا دفتر تھا۔ میں ان دنوں بے کار تھا۔ میں بھی لدھیانہ سے لاہور آ گیا اور تقریباً چھ ماہ اسی شہر میں ساحر کے ساتھ قیام پذیر رہا۔ اس دوران کسی ادبی محفل میں امرتا سے اس کی دوسری ملاقات ہوئی اور اسے پتہ چلا کہ اس کی شادی ہوگئی ہے اور وہ انارکلی کی دکان، جس پر جگت سنگھ کواتڑا کا بورڈ لگا ہوا تھا، کے مالک کے بیٹے سے بیاہی گئی ہے اور اندرون شہر مقیم ہے۔ اس نے ساحر کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔

اگلے روز ہم اس کے گھر گئے۔ دو گھنٹے کی اس ملاقات میں باتیں بہت کم ہوئیں البتہ دونوں ایک دوسرے کو محبت اور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہاں سے واپسی کے بعد تو ساحر اس ملاقات کی باتیں ہی دہراتا رہا اور دو تین روز بعد پھر اس کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اسے کہیں جانے کے لیے ہمیشہ بیساکھی کی ضرورت ہوتی تھی' مجھ سے جب اس نے ساتھ چلنے کو کہا تو میں نے سختی سے انکار کر دیا' میرا موقف یہ تھا کہ مجھے اس قسم کی افلاطونی محبت سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ میں اس بور لاقات کا فالتو کردار بننے کو تیار نہیں ہوں۔ ادبِ لطیف کے دفتر میں اس وقت دیوندر ستیارتھی بیٹھا تھا۔ ساحر بہلا پھسلا کر اسے ساتھ لے گیا' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ واپسی پر جب میں نے ستیارتھی سے پوچھا کہ ملاقات کیسی رہی تو اس کا جواب تھا ''حمید جی امرتا نے ہمیں اپنے بیڈروم میں بلالیا' وہاں دیوار کے ساتھ کھونٹی پر اس کی شلوار لٹک رہی تھی' میں نے اپنا کوٹ اس کے اوپر لٹکا دیا' بڑا مزا آیا۔''

چھ مہینوں کے اس قیام لاہور کے دوران ساحر دو چار بار پھر بھی اس کے گھر گیا مگر میں نے ان دونوں کی ان ملاقاتوں میں مخل ہونے سے ہمیشہ اجتناب ہی کیا۔ ساحر وہاں جاتا ضرور رہا مگر وہ اس کے تندرست اور توانا شوہر سے خوف زدہ بھی رہتا تھا۔ جگت سنگھ کواتڑا کی دکان ادبِ لطیف کے دفتر سے انارکلی میں داخل ہونے والی سڑک کے عین سامنے واقع تھی۔ ہم صبح نظام ہوٹل انارکلی میں ناشتے کے لیے جاتے تو اس دکان کے سامنے سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ ساحر اس راستے کے بجائے ایک دوسرا اور نسبتاً لمبا راستہ اختیار کرتا۔ اسے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا کہ امرتا کا شوہر اسے پکڑ کر اپنے گھر جانے سے منع کر دے گا۔ چند ماہ بعد ہم دونوں واپس لدھیانہ چلے گئے' مگر امرتا کا ذکر مہینوں ہوتا رہا۔ جنوری 1946 میں ساحر کو فلم ''آزادی کی راہ پر'' کے گانے لکھنے کی پیش کش ہوئی۔ یہ فلم کانگریس کی آزادی کی جدوجہد کے موضوع پر تھی اور اس کے پروڈیوسر ساحر کے ایک کلاس فیلو کلونت رائے تھے۔ کلونت' کٹر کانگریسی تھے' ساحر کی زندگی کا تو مقصد ہی فلمی گانے لکھنا تھا اس نے کبھی بڑا

شاعر بننے کی آرزو نہیں کی، ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ وہ فلموں کے لیے ایسے نغمے لکھے گا کہ دُنیا اسے یاد کرے گی۔ فلموں کے لیے گانوں کے ذریعے دولت اور شہرت حاصل کرنے کی اس آرزو کا ایک اور پہلو بھی تھا اس کی وہ محبوبہ جس کی وجہ سے وہ کالج سے نکالا گیا تھا، بمبئی میں مقیم تھی۔

گورنمنٹ کالج سے ساحر ہی نہیں اشیر کور بھی نکالی گئی تھی، کالج کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اشیر کور ہوسٹل میں قیام پذیر تھی اب دونوں عام طور سے کالج کے اوقات کے بعد ملتے تھے اور کالج کے گیٹ سے ملحقہ دیوار پر براجمان ہوتے تھے اشیر کور کا تعلق لدھیانہ سے سات آٹھ میل دور واقع ایک قصبے بددوانی کے ایک سکھ زمیندار گھرانے سے تھا' جب وہ کالج سے نکالے جانے کے بعد اپنے گاؤں میں چلی گئی تو ساحر کا ہم سب دوستوں کے ساتھ ہر شام اس دیوار پر جا کر بیٹھنا معمول بن گیا' ہر شام اس "کند" پر جانا ایک طرح سے عبادت کی حیثیت اختیار کر گیا اور کسی دن اس فریضے کی ادائیگی میں دیر ہو جاتی تو ہم میں سے کوئی دوست اسے یاد کراتا۔ آج کند (دیوار) پر نہیں جانا' جب ساحر کو بمبئی جانے اور فلم کے گیت لکھنے کی پیش کش ہوئی تو اس کی گفتگو کا موضوع بمبئی میں مقیم اشیر کور ہو گیا۔ وہ برابر اس عزم کا اظہار کرتا کہ وہ فلمی گانوں کے ذریعے شہرت اور دولت حاصل کر لے گا تو ایک روز اس کی یہ محبوبہ ضرور اس سے ملنے آئے گی۔ یہ ایک احمقانہ قسم کی خواہش تھی۔ ساحر کو اشیر کور نے رد نہیں کیا تھا۔ وہ تو اپنا گھر چھوڑ کر اس کے پاس بھی آ گئی تھی' جس روز وہ بددوانی سے لدھیانہ ساحر کے گھر آئی' ہم سب دوستوں نے اس کی اس خواہش کی پذیرائی کی کہ ساحر اس سے شادی کر لے لیکن ساحر خوف زدہ تھا اور شاید بجا طور پر کہ اس شادی کے بعد اشیر کور کے زمیندار والد کے ہاتھوں قتل کر دیا جائے۔ وہ اپنے باپ سے پہلے ہی علیحدگی اختیار کر چکا تھا بلکہ اس کے والد سے اس کی باقاعدہ مقدمہ بازی تھی' وہ سکھ طلباء میں لدھیانہ میں موجود تھے جنھوں نے ان دونوں کی ملاقات کا غلط نقشہ پیش کر کے انہیں کالج سے نکلوا دیا تھا۔ ان سب کی مخالفت مول لینے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اس نے اشیر کور سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگرچہ وہ رات بھر اس کے ساتھ اس کے کمرے میں رہی مگر اس نے اس سے کسی قسم کا جسمانی تعلق قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اشیر کور واپس گھر تو جا نہیں سکتی تھی' اگلی صبح وہ اپنے بمبئی میں مقیم ایک کزن کے پاس چلی گئی جو شاید اس سے قبل اسے شادی کی پیش کش کر چکا تھا۔ وہاں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

جنوری 1946 میں ہم دونوں بمبئی چلے گئے۔ ساحر نے منت سماجت سے پھر مجھے ساتھ چلنے کے لیے

نہ صرف مجبور کیا بلکہ کلونت رائے کی کمپنی ہندوستان کلامندر سے میرے لیے مکالمہ نویس کی حیثیت سے تقرر نامہ بھی حاصل کرلیا۔ ہم اگست 1947 تک بمبئی میں مقیم رہے۔ اس عرصے میں دوبار چند دنوں کے لیے لدھیانہ بھی آئے۔ اس سارے زمانے میں امرتا کا ذکر اس نے شاید ہی کبھی کیا ہو' قیام پاکستان کے بعد لاہور آنے اور چند ماہ کے قیام کے بعد جون 1948 میں واپس ہندوستان جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں کامیاب فلمی نغمہ نگار بن کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچا۔ امرتا بھی اس زمانے میں ایک بڑی شاعرہ اور ادیبہ کے طور پر قبول عام کی سند حاصل کر چکی تھیں۔ خاص طور پر اس کی نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' نے تو اسے برصغیر کی معروف ترین شاعرہ بنا دیا تھا۔ وہاں پر ساحر اور اس کے درمیان ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا' اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ علم نہیں البتہ امرتا کی کتاب ''رسیدی ٹکٹ'' کی اشاعت کے بعد مجھے بھی یہ معلوم ہوا کہ نہ صرف ان کے درمیان دوستی اور محبت کے رشتے قائم ہو گئے تھے بلکہ خود امرتا ساحر کو اس سے کہیں زیادہ چاہنے لگی تھی۔ ساحر کے پاکستان سے جانے کے بعد برسوں میرا اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ بیس برس تک حکومت پاکستان نے مجھے پاسپورٹ ہی سے محروم رکھا۔ پاسپورٹ ملنے کے بعد ہندوستان جانے کے لیے صحافیوں پر وزارت داخلہ سے اجازت لینے کی پابندی تھی۔ میں نے متعدد بار درخواست دی مگر ہمیشہ انکار کیا گیا۔ ساحر کی والدہ کے انتقال پر میں نے ایک دفعہ پھر درخواست وزارت داخلہ کو بھجوائی اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کی والدہ نے مجھے بیٹا بنایا ہوا تھا اس لیے میں اس کی تعزیت کے لیے بمبئی جانے کا خواہش مند ہوں۔ اس درخواست کا بھی گھڑا گھڑایا جواب آیا کہ ''چونکہ ساحر سے تمہارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے اس لیے اجازت نہیں مل سکتی۔''

اس کے بعد میں نے اسلام آباد جا کر سیکرٹری داخلہ جناب روئیداد خان سے ملاقات کی جس میں باقاعدہ ان سے سخت لڑائی ہوئی اور بالآخر وہ اجازت دینے پر رضامند ہو گئے۔ دسمبر 1978 میں میری بیوی چھ سالہ بیٹا عمر اور میں بمبئی میں ساحر کی جہازی سائز کی بلڈنگ پرچھائیاں پہنچ گئے۔ ہم نے پندرہ روز اس کے گھر پر اس کے ساتھ قیام کیا۔ دو دوستوں کی یہ ملاقات تیس برس بعد ہوئی۔ دوست بھی ایسے جو جون 1948 سے دن رات ایک ساتھ رہے۔ مگر دولت شہرت اور بے پایاں عزت حاصل کرنے والا یہ ساحر وہ نہیں تھا جو تیس برس قبل مجھ سے جدا ہوا تھا' وہ عارضہ قلب میں مبتلا تھا اور مردم بیزاری کا شکار بھی۔ وہاں اشیر کور کی بات ہوئی اور نہ امرتا پریتم کا ذکر' اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ بمبئی پہنچنے سے قبل ہم نے جو چار روز دہلی

میں گزارے اس میں بمبئی کے دوستوں نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں ساحر کے ہاں قیام نہ کروں۔ وہ دوستوں کو گالیاں دیتا ہے اور ان کی بے عزتی کرتا ہے۔ میرا جواب تھا کہ مجھے گالی دے گا تو میں بھی یہ عمل دہراؤں گا لیکن میں تو ملنے ہی اس سے آیا ہوں' اس لیے میں اس کے پاس ہی ٹھہروں گا۔ رہائش کے متبادل انتظام سے جو کیفی اعظمی اور شبانہ کے گھر کیا گیا ہے مجھے کوئی غرض نہیں۔ اس پندرہ روزہ قیام میں اس نے میرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی' میرا اور میری بیوی بچے کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ میرے بیٹے سے پیار کرتا رہا اور میری بیوی کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا' بلکہ روزانہ جب شام کی محفل میں' میں نے اس کے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر ٹوکا تو میری بیوی سخت پریشان ہوئی اور بعد میں علیحدگی میں مجھ سے کہا'' ساحر آپ کی بات کا برا مان سکتا ہے اور یہ کہ اسے کسی بات پر ٹوکنے سے اجتناب کروں۔'' بہر حال پندرہ روز بعد 13 جنوری 1979 کو ہم بمبئی سے واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس کے ایک ڈیڑھ برس بعد وہ یہ دُنیا ہی چھوڑ گیا اس نے مجھ سے لاہور آنے اور پرانے دوستوں سے ملنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

1983 میں آمر ضیاء الحق کے زمانے میں مجھے دوسری بار دہلی جانے کا موقع ملا۔ اس دورے کے دوران اپنے قیام دہلی میں' میں نے ایک روز امرتا کو فون کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی' اسے اپنے گھر یا پریت نگر ہونے والی ملاقات تو یاد نہیں تھی مگر ساحر کا قریبی دوست ہونے کا اس کو شبہ تھا' چنانچہ اس نے مجھے اسی شام اپنے گھر آنے اور وہیں رات کا کھانا کھانے کی دعوت دی۔ اس ملاقات میں امرتا' امروز اور میں تین افراد ہی شامل تھے۔ یہ محفل کوئی چار گھنٹے پر محیط تھی۔ شغلِ مے نوشی بھی جاری رہا اور ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پر باتیں بھی جاری رہیں لیکن ملاقات شروع ہونے کے کوئی ایک گھنٹے بعد امرتا نے اچانک مجھ سے سوال کیا '' 47-1946 میں جب ساحر اور آپ بمبئی میں ایک ساتھ رہے تو کیا وہاں ساحر کی اشیر کور سے ملاقات ہوئی تھی؟ میرا جواب تھا کہ اشیر کور بمبئی میں فرار تھی' ساحر اس کا ذکر بھی بہت کرتا تھا مگر نہ تو ہمیں اس کا اتہ پتہ تھا اور نہ ہی ساحر اتنا مشہور ہوا تھا کہ اشیر کور کو اس کے بارے میں علم ہوتا۔ فلم '' آزادی کی راہ پر'' لٹک گئی تھی اور جو فلم تقسیم ہند کے خلاف تھی وہ قیام پاکستان کے بعد ریلیز ہوئی اور فلاپ ہو گئی۔ اس ڈیڑھ سال میں ان دونوں کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر امرتا کی تو جیسے سوئی اس سوال پر اٹک گئی تھی۔ ہر پندرہ منٹ بعد وہ پھر یہی سوال دہراتی '' حمید صاحب ڈیڑھ برس سے زائد عرصہ بمبئی میں رہنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ ساحر اس سے نہ ملا ہو' میں نے بار بار اسے یقین دلایا کہ ہم دونوں دن رات ایک ساتھ رہتے تھے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ کہتا

ہوں کہ وہاں ان دونوں کے درمیان ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر وہ بار بار یہی سوال دہراتی رہی، حتیٰ کہ میں نے کہا
''اب تو ساحر اس دُنیا میں نہیں ہے اور غالباً اشیر کور بھی نہیں، اس لیے یہ ذکر چھوڑیئے اور کوئی اور بات کیجئے'' مگر
جیسے جیسے اس کا نشہ غالب آتا رہا وہ مجھ سے یہ سوال دہراتی رہی۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے، وہ کتنی بڑی شاعرہ
اور ادیبہ کیوں نہ بن جائے، اپنے محبوب کے کسی اور کی زُلف کا اسیر ہونا برداشت نہیں کرتی۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ساحر کی توقع کے عین مطابق جب وہ فلمی نغمہ نگار کے طور پر ہندوستان بھر میں
شہرت کی بلندیوں پر پہنچا اور اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تو اشیر کور نے اسے ڈھونڈ لیا۔ ساحر کا اس کے گھر آنا جانا
بھی شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ اس روز تک جاری رہا جس روز اس کے شوہر نے ساحر سے کہا ''اشیر کور میری بیوی
ہے، یہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو جا سکتی ہے، تم اسے لے جانا چاہو تو لے جاؤ، اگر یہ ممکن نہیں ہے تو مہربانی
کر کے ہمارے ہاں آنے جانے کا معاملہ ختم کرو۔'' اس کے بعد ساحر اشیر کور کے گھر کبھی گیا نہ اس سے ملا۔

☆☆☆☆

خالد فتح محمد
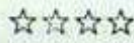
'ایک لڑکی ایک جام' کا مطالعہ

اس افسانے کے تین کلیدی اجزا ہیں۔ ایک لڑکی کی دو تصویریں؟ پہلی تصویر میں دیکھنے والوں کو اس کے چہرے سے زیادہ کمر دکھائی گئی تھی اور دوسری تصویر ایسی تھی کہ جس کے بارے میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ منہ سے بول اٹھے گی۔ اس تصویر کا نام تھا ''ایک لڑکی ایک جام'' اور راوی نے اسے دیکھو کر مصور سے کہا تھا: ''ایسا جام پینے کے لیے تمہاری ساری عمر بھی کم ہے۔'' دوسرا وہ لڑکی (جس کی تصویریں تھیں) جو چائے کے باغ میں پتیاں چنتی تھی اور اس کا خاندان (ایسے تمام خاندانوں کی طرح) غربت کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ تیسرا جزو وہ مصور ہے جس نے لڑکی کی تصویر بنائی۔

مصور شہر کا رہنے والا ایک جدید آدمی تھا جسے بوتل سے رغبت تھی اور لڑکیاں لباس کی طرح تھیں جو روزانہ تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس نے جب لڑکی کو دیکھا تو اس کے روپ کی چمک اسے چندھیا گئی۔ یہ ایک نئی لڑکی تھی جسے اس کے لیے نیا تجربہ ہونا تھا۔ لیکن ایسے ہوا نہیں۔ دراصل مصور پالم پور کے چائے کے باغات کے نزدیک کانگڑہ کے ایک گاؤں میں کچھ عرصہ کے لیے ٹھہرا ہوا تھا اور یہ تصویریں اس نے ہی بنائی تھیں۔ مصور نے لڑکی کو جب دیکھا تو برسات کے دن تھے۔ نالے کے پانی میں ساتھ والے گاؤں کو جانے والی سڑک بھی ڈوب گئی تھی۔ تین دن کے بعد سڑک دکھائی دی۔ مصور اور لڑکی کی اس سڑک پر مڈبھیڑ ہوئی۔ مصور نے لڑکی سے کہا تھا ''دیکھو نا پانی آخر سوکھ ہی گیا۔ ایک بار تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ پانی کبھی سوکھے گا ہی نہیں۔'' لڑکی کے جواب پر امرتا پریتم نے اس کہانی کو تعمیر کیا ہے۔ اگر لڑکی وہ جواب نہ دیتی تو مصور کی سوچ میں تبدیلی نہ آتی اور وہ لڑکی کو ایک جسم ہی سمجھتا۔ لڑکی نے کہا تھا ''یہ بھی کوئی آدمی کے آنسو ہیں جو کبھی نہ سوکھیں۔''

مصور نے کسی وقت یہ بات ایک بنگالی ناول میں پڑھی تھی۔ ان پڑھ لڑکی کا جواب اسے اس (لڑکی) کے گھر لے گیا۔ یہاں سے افسانے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا۔ مصور کے لیے پہلے وہ لڑکی ایک ماڈل تھی۔ وہ اس

کے لیے اتنی غیر اہم تھی کہ اس نے لڑکی کا نام جاننا بھی مناسب نہ سمجھا' وہ اسے ٹونی کہہ کر بلانے لگا۔ مصور لڑکی کے گھر جا کر اس کی بات میں چھپے دُکھ کو سمجھ گیا۔

لڑکی کے گھر میں اس کا باپ تھا' ماں تھی' ''بھائی اور ایک بھابھی تھی۔ ان کے مشترکہ دُکھ میں اسے آفاقیت نظر آئی۔ وہ جانتا تھا کہ دُکھ سے ہی انسانی تہذیب رقم ہے۔ وہی تحریر اس گھر میں ہر طرف لکھی ہوئی تھی۔ وہاں بے کسی' بے بسی' محرومی اور غربت ہر سو بکھری ہوئی تھی۔ ''ایک جام ایک لڑکی'' والی تصویر کے پس منظر میں چائے کے باغات تھے لیکن ان باغات پر ٹونی اور اس کے خاندان کی غربت اور مجبوری کے بادلوں کا گہرا سایہ پھیلا ہوا تھا۔

زیرِ نظر افسانے کے بیانیہ عمل اور کرداروں کی پیش کش متاثر کن اور دلچسپ ہے۔ یہاں دونوں تصویریں بھی کردار کی حیثیت لے گئی ہیں۔ کہانی کے آغاز میں مصنف نے ان تصویروں کا تعارف کرواتے وقت لکھا ہے ''چائے کے ایک پودے میں آخری کونپل ڈیڑھ پتی پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک پوری پتی اور دوسری اس کے ساتھ جڑی ہوئی چھوٹی سی نازک پتی' اس ڈیڑھ پتی کا رنگ الگ دکھائی دیتا ہے۔ اس آخری کونپل کے نیچے ڈھائی پتیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں' بہت ملائم اور نازک۔۔۔۔ ان پتیوں سے جو چائے بنتی ہے وہ بیش قیمت ہوتی ہے۔''

ایک مشہور مصور کانگڑہ کے ایک غیر معروف گاؤں میں ایک خوبصورت لڑکی کے حسن اور تعقل کا گرویدہ ہو کر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں امرتا پریتم نے کہانی کو دلچسپ بنانے کے لیے روایت کا سہارا لیا ہے۔ کیا ایک تعلیم یافتہ اور مشہور عورت کسی اَن پڑھ' مردانہ حسن سے مالا مال اور ذہین مزدور کے ساتھ اس کے گاؤں میں زندگی گزارنے کا عہد کرلے گی؟ اگر ایسا ممکن ہے تو مہیش نندہ (مصور) کا اس لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کرلینا بھی منطقی ہے۔ وہ جب ٹونی کے گھر جاتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس علاقے میں لڑکیوں کی قیمت لگتی ہے۔ غریب' مہاجنوں کے مقروض ہوتے ہیں اور اس قرضے کے عوض ان کے پاس لڑکیاں بیچ دی جاتی ہیں۔ ٹونی کے باپ کے سر پر بھی قرضے کا بوجھ تھا۔ تب مہیش نے اس گھر میں اداسی اور بے بسی کے آسیب کو پہچان لیا۔

قرضہ دینے والے مہاجن نے پندرہ سو روپے کے قرضے کے عوض ٹونی کو اس کے باپ سے مانگا ہوا تھا۔ یہاں امرتا پریتم کے پاس کہانی کو آگے بڑھانے کے صرف دو راستے تھے۔ وہ یا تو لڑکی کو مہاجن کے پاس

جانے دیتی۔ اگر وہ ایسے کرتی تو خطے میں جاری ناانصافی کا حصہ بن جاتی اور افسانہ بے مقصد ہو کر رہ جاتا۔ اور اگر ٹونی اس ظلم کے خلاف آواز بلند کر کے مہیش نندہ کے پاس پناہ لے لیتی یا اسے اپنی قیمت ادا کرنے کے لیے کہہ دیتی تو مہیش نندہ اس کے پیسوں کے عوض اس کے جسم کا تقاضا بھی کر سکتا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ٹونی مہاجن سے خائف تھی۔ وہ اسے پہلے ہی بتا چکی تھی ''بابو! وہ آدمی نہیں شیطان کا بچہ ہے۔ مجھے تو خواب میں بھی اس سے ڈر لگتا ہے۔''

اب کہانی ایک نازک موڑ لیتی ہے۔ کسی وقت مہیش نندہ نے پوچھا تھا ''ٹونی تو چائے کے پودے کی آخری کونپل ہے، بتا یہ چائے کون پیئے گا؟'' مہیش نندہ کو جب خاندان کی پریشان کن صورت حال (Predicament) کا پتا چلا تو اس نے ٹونی سے کہا کہ وہ پندرہ سو روپے کا بندوبست کر دے گا اور نہ وہ اپنے باپ کو بتائے کہ وہ سگائی توڑ دے۔ مہیش کو شاید امید تھی کہ ان پندرہ سو روپوں کے عوض ٹونی ممنویت میں اپنے آپ کو مہیش کر دے گی۔ لیکن فکشن تو (Improbables) پر مبنی ہوتا ہے اور سماجی، معاشی اور بعض اوقات نظریاتی اکائی اس کے لیے معنی نہیں رکھتے۔ مہیش نندہ، ٹونی کو عقلی سطح پر اپنے برابر سمجھ چکا تھا۔ شاید اسے ایسی کوئی لڑکی پہلے ملی ہی نہیں تھی جو اس کے عقلی معیار پر پورے اُترتی؟ اس لیے لڑکیاں اسے لباس کی طرح لگا کرتی تھیں۔ ٹونی اس کے معیار پر پورا اترتی تھی لیکن اس نے ابھی تک اس کے ساتھ اپنے رشتے کی نوعیت طے نہیں کی تھی۔

عالمی تناظر اور نظریہ مصنف کے ارادے کو سمت دیتے ہیں۔ دراصل ہوا و ہی عالمی تناظر اور نظریے کی تشریح کرتا ہے۔ ''ایک لڑکی ایک جام'' عالمی تناظر میں جبر و استبداد کے خلاف ایک آواز ہے۔ امرتا پریتم نے اس افسانے کا تانا بانا مہارت کے ساتھ بنا ہے۔ ٹونی ایک حساس، ذہین اور خوش کل لڑکی ہے۔ مہیش نندہ اسے جب پندرہ سو روپے کی پیش کش کرتا ہے تو وہ کہتی ہے ''بابو تو مجھ سے بیاہ کرے گا؟'' اور پھر ''ارے بابو میں کوئی بھکارن تھوڑی ہی ہوں۔''

مہیش نندہ نے ٹونی کو اپنی زندگی اور رُوح کی آگ کے متعلق بتایا اور اسے یہ احساس دلایا کہ وہ اس آگ میں جل جائے گی تو اس نے فوراً کہا ''پھونک پھونک کر پی لوں گی۔'' اس جواب نے ٹونی کو مہیش نندہ کی نظر میں ایک نیا مقام دے دیا۔ اسے لگا کہ وہ صرف اسی لڑکی کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر طے کر سکے گا۔ اس نے ٹونی کو اپنی زندگی میں آئی لڑکیوں کے متعلق بتایا کہ وہ تو ایک جام کی طرح نہیں، ایک خالی کر کے دوسرا بھر لیا۔ ٹونی یہ سن کو ہنس پڑی ''کیوں بابو، تیری پیاس نہیں بجھی؟'' اس مکالمے کے بعد ''ایک لڑکی ایک جام'' اپنے

کلائمکس کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ کلائمکس افسانے کے اختتام کے بجائے اگلے مکالمے میں پوشیدہ ہے۔''ایک وعدہ کر بابو جب تک میرے من کا پیالہ ختم نہ ہو جائے تو کسی اور پیالے کو ہاتھ نہیں لگائے گا'' یہاں مہیش نندہ کو گزری ہوئی زندگی کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔ اسے تو صرف خالی جام ہی ملے تھے جنہیں وہ بھر بھر کر خالی کرتا رہا۔

اب افسانہ ایک مانوس سے گرد و پیش کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ گرد و پیش ہمارے فکشن اور فلم میں عام ہیں۔ زیر نظر افسانے کے انجام کو ہم مصنف کی ''فن کارانہ ناکامی'' نہیں کہیں گے کیوں کہ یہ اس کا فن کارانہ ارادہ نہیں تھا' اس کے اس ارادے کی تکمیل میں سماجی مخالفت ایک رکاوٹ تھی۔ سماج کا مستقل جھوٹا نقش؛ یادداشت اور بے مقصد ہدایات فن کار کو بے بس کر دیتے ہیں۔

سماج کی خواہش ہوتی ہے کہ فن کار کے کردار غیر متحرک اور واقعات بنیادی منطق سے عاری ہوں۔ ''ایک لڑکی ایک جام'' کے کردار متحرک اور زندگی کو ایک قدم آگے لے کر جانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے مہیش نندہ پندرہ سو روپے کا بندوبست کرنے شہر چلا جاتا ہے۔ جب وہ واپس پہنچتا ہے تو بوڑھے مہاجن نے اپنا سودا ٹوٹنے کی خبر سن کر ٹونی کو دھوکے سے زہر دلوا دیا تھا۔

مہیش نندہ نے ٹونی سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اس (ٹونی) کے من کا پیالہ ختم نہ ہو جائے وہ کسی دوسرے پیالے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ راوی کے بقول اس نے ایسے ہی کیا۔ سماج نے ٹونی کا بھرا ہوا پیالہ توڑ دیا لیکن مہیش نندہ کا کسی اور پیالے کو نہ تھامنا زندگی سے فرار تھا یا ٹونی سے وفاداری؟

واقعات کو کھولنے کے لیے مصنف نے خود کو راوی بنایا ہے اور ''فلیش بیک'' کی تکنیک کا استعمال کر کے کہانی کو مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ سماج کی ناانصافی پر مبنی ایک روایتی کہانی ہے' ایسی کہانی جس کی صداقت آفاقی ہے!۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر سلیم اختر
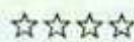
حقیقت سے حقیقت تک کا سفر

(''رسیدی ٹکٹ'' کا مطالعہ)

''مَیں کے بغیر'' تم'' کے معنی نکلتے ہیں' نہ دُینا کے' یہ مَیں کے آگے تم کا سفر ہوتا ہے'' اور تم کے آگے اپنی کائنات کا''

امرتا پریتم

آپ بیتی لکھنے کا کیا محرک ہے؟

سوال آسان، جواب مختلف!

معتدد جوابات میں سے ایک بنیادی بات تو یقیناً واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ''مَیں'' کا اظہار ہے۔ مَیں جو کہ ذات وصفات کا آئینہ ہے، یہی آئینہ شخصیت کا عکاس اور استعارہ قرار پاتا ہے۔ فرد اِس آئینہ میں جب اپنا جلوہ دیکھتا ہے تو خود سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر خود بینی کے اس عمل میں دُوسرں کو بھی شریک کرنے کی سعی کرتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ فرد کے لیے جو آئینہ طلسمِ ہوش افزا ہوتا ہے دوسروں کے لیے DISTORTING MIRROR بھی ثابت ہو سکتا ہے

آپ بیتی کا محرک اگر نرگسیّت ہے تو پھر نرگسیّت فن کارانہ طریقہ سے اظہار پاتی ہے (یا ایسا ہونا چاہیے) اسی لیے آپ بیتی میں ''مَیں'' کا راگ دھیمے سُروں میں الاپنا چاہیے ورنہ قاری کی نرگسیّت مصنف کی نرگسیّت سے متصادم ہوگی اور یوں آپ بیتی میں سے شخصیت کا رس معدوم ہو جائے گا۔

آپ بیتی قلم بند کرنے والا بالعموم دیباچہ میں آپ بیتی کے محرک کے بارے میں تحریر کرتا ہے، مگر کبھی معذرت کے انداز میں تو کبھی دفاع کے اُسلوب میں، کبھی بہانوں کی مانند وہ جواز تراشتا ہے تو کبھی داد طلب ہوتا ہے۔ اُمرتا پریتم نے ایسا کوئی تنقیدی دیباچہ نہ لکھا کتاب کے آخر میں اُس نے یوں لکھا۔

''وہ بھی ایک دن تھا۔۔۔۔۔ جب مَیں نے اپنے بارے میں اس قدر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بجائے سوچا تھا۔۔۔کبھی جب مَیں، اپنی سوانح حیات لکھوں گی، صرف دس سطریں لکھوں گی اور وہ سطریں مَیں نے کاغذ پر لکھ کر رکھ لی تھیں۔ وہ سطریں آج بھی میرے سامنے ہیں اور آج بھی وہ اتنی ہی سچی ہیں، جتنی اُس روز لکھتے وقت تھیں۔
میری تحریر، کیا نظم اور کیا نثر، مَیں جانتی ہوں کہ غیر قانونی بچے کی طرح ہے۔
میری دُنیا کی حقیقت نے میرے دل کے خواب سے عشق کیا، اور ان کے وصلِ ممنوع سے یہ تحریر پیدا ہوئی۔
جانتی ہوں۔۔۔ایک غیر قانونی بچے کی قسمت اُس کی قسمت ہے اور اُس کو ساری عمر اپنے اَدبی سماج کی پیشانی کے بل سہنے ہیں۔
دل کا خواب کیا تھا، کون تھا اس کی تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کمبخت بہت حسین ہوگا، ذاتی زندگی سے لے کر کل کائنات کی بہتری تک کی باتیں کرتا ہوگا تب ہی حقیقت اپنی اوقات کو بھول کر اس سے عشق کر بیٹھی اور تحریر جو پیدا ہوئی۔۔۔ ہمیشہ کچھ کاغذوں میں لاوارث بھٹکتی رہی۔۔۔۔
اور آج بھی میرا یقین ہے۔۔۔۔ یہ دس سطریں میری پوری اور طویل سوانحِ حیات ہے۔۔۔'' (رسیدی ٹکٹ:۱۶۲)

یہ سطریں سچی اور کھری حقیقت نگاری کی مظہر ہیں۔ اس سے دوچار ہونے کے لیے ہر اَدیب میں ہمت نہیں ہوگی بالخصوص ہمارے معاشرے کی عورت کے لیے!
وہ ''خالص عورت'' کی ضمنی سرخی کے تحت لکھی ہے۔
''یوں میرے وجود کے اندر کی عورت ہمیشہ میرے اندر کے اَدیب سے ثانوی درجہ پر رہی ہے، کئی بار یہاں تک کہ مَیں اپنے بیچ کی عورت کی اپنے آپ کو یاد دلاتی رہتی ہوں (رسیدی ٹکٹ:۳۲)
مزید لکھتی ہے۔
''اس میرے اندر کی خالص عورت کی خالص اَدیب کے ساتھ کوئی پُرخاش نہیں۔ اس

نے خود ہی اس سے پیچھے، اس کے عقب میں کھڑے رہنا قبول کرلیا ہوا ہے۔

(رسیدی ٹکٹ:۴۳)

''خالص عورت'' کا خالص عورت ادیب'' کے لیے جگہ خالی کردینا دراصل برتر وجود کو تسلیم کرنا ہے۔ایک اور موقع پر بھی اُمرتا پریتم نے آپ بیتی کے بارے میں اِس خیال کا اظہار کیا:

''خود نوشت سوانحِ حیات کو اکثر چمک دمک بھری یک طرفہ سچائی خیال کیا جاتا ہے۔۔۔۔خود ستائش کا فن کارانہ وسیلہ، لیکن بنیادی سچائی کو اَدیب کی اپنی ضرورت مان کر مَیں کہنا چاہوں گی۔۔۔۔۔یہ حقیقت سے حقیقت تک'' پہنچنے کا عمل ہے۔''

(رسیدی ٹکٹ:۱۲۷)

یوں دیکھیں تو اُمرتا پریتم کی جذباتی اور تخلیقی زندگی ''حقیقت سے حقیقت تک پہنچنے کا عمل قرار پاتی ہے۔کام مشکل اس لیے کہ اس میں خسارہ بھی ہے۔وہی بات:

''عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا''

یہ سطریں دیکھیے:

''المیہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ اپنے عشق کے ٹھٹھرتے بدن کے لئے ساری عمر گیتوں کے پیراہن ستے رہیں۔المیہ یہ ہوتا ہے کہ ان پراہنوں کو سینے کے لیے آپ کے پاس خیالوں کا دھاگا ختم ہو جائے اور آپ کی قلمی سوئی کی نوک ٹوٹ جائے

(رسیدی ٹکٹ ص:۴۲)

غالباً یہ المیہ ہر تخلیق کار کا ہے کہ ہونے اور نہ ہونے کے دو پاٹن بیچ لینا اس کا مقدر ہے اس عمل سے البتہ اعصابی تناؤ بھی دراصل تخلیقی محرک ثابت ہوتا ہے یوں کہ جبلّت قلم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

امرتا پریتم نے ''رسیدی ٹکٹ'' میں غسل آتش کی ضمنی سرخی کے تحت یوں لکھا!۔

Create an idealzed image of yourself and try to resemble it.

''یہ الفاظ کازان زاکس نے اپنی پہلی ملاقات میں اپنی محبوبہ سے کہے تھے۔مجھے یہ کسی نے نہیں کہے۔لیکن مَیں نے یہ سنے تھے۔اپنے لہو میں سے سنے تھے۔۔۔۔اور پھر اپنے ہونٹوں سے ہی اپنے کانوں کو کئی بار کہتی رہی۔ہر اس بار بھی۔جب ان پر عمل

سے بچھڑ جاتی تھی۔۔۔میں یہ نہیں کہتی کہ ان لفظوں کا طلسم میری پکڑ میں آیا

ہے۔۔۔صرف یہ۔۔۔کہ ساری عمر یہ مددگار و معاون رہے ہیں۔ان کا طلسم ہی شائد

اسی بات میں ہے کہ اپنی شبیہہ جب بھی اپنے تخیلی وجود سے کچھ مشابہت پکڑنے لگتی

ہے۔۔۔۔خیالی وجود۔۔۔۔اور بھی حسین بن کر دور جا کھڑا ہوتا ہے۔صرف یہ کہہ

سکتی ہوں کہ ساری عمر اس تک رسائی پانے کے لیے سعی و جہد کرتی رہی ہوں۔

(رسیدی ٹکٹ ص:۸۲)

کیا یہ TO BE OR NOT TO BE کا دائمی DELLIMA ہے یا برتر وجود کی تلاش یا پھر داخلی خلا کو

پر کرنے کا ایک انداز۔۔؟

دراصل اس کشمکش سے جو بعض اوقات فرد کو ذہنی ہفت خواں طے کراتی ہے عام شخصیت اور تخلیقی شخصیت

میں اس سے امتیاز پیدا ہوتا ہے۔عام فرد سوز نہانی میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔مگر تخلیق کار رائڈ ہیگرڈ ''SHE

'' کی مانند ''عمل آتش'' سے نیا جنم حاصل کرتا ہے۔''رسیدی ٹکٹ'' میں اُمرتا پریتم نے ''ققنوسی نسل'' کے ضمنی

عنوان تلے یہ بھی لکھا!

''دُنیا کے سب سچے اُدیب مجھے ققنوسی معلوم ہوتے ہیں، تخلیقی عمل کی آگ میں جلتے ،

اور پھر اپنی راکھ میں سے تخلیق کی صورت میں پیدا ہوتے!''

(رسیدی ٹکٹ:۱۴۶)

اُمرتا پریتم کی آپ بیتی چھپی تو اچھی خاصی متنازعہ کتاب ثابت ہوئی غالباً ساحر لدھیانوی کے تذکرہ کی

وجہ سے؟ اتنا سچ؟ اتنی بولڈ؟ اتنی جرأت؟ لیکن میں تذکرۂ ساحر کو اُدیبہ کی دیانت داری سمجھتا ہوں۔اپنی ذات

سے دیانتداری، اپنے فن سے دیانتداری، اپنے آئیڈیل سے دیانتداری شاید اسی لیے وہ یہ بھی لکھ سکی!

''ساحر ایک خیال۔۔۔ہوا میں چمکتا، شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا جادُو''

(رسیدی ٹکٹ:۸۴)

''رسیدی ٹکٹ'' میں اور بھی بہت کچھ ہے اتنا کہ ساحر کا تذکرہ حذف کر دینے کے باوجود بھی کتاب

قابل دید اور دلچسپ اور پُر معنی رہتی ہے ملاحظہ ہوں اُمرتا کے ایک گیت کے یہ بول:

''سپنے کا ایک تھان بنوایا

گز بھر کپڑا پھاڑ لیا، اور عمر کی چولی سی لی
آج ہم نے عرش کے گھڑے پر سے
بادل کی ایک چپنی اُتاری، گھونٹ بھر چاندنی پی
گیتوں کے ساتھ چکا جائیں گے۔
یہ جو ہم نے موت سے گھڑی اُدھار پہ لی (رسیدی ٹکٹ: ۱۰۹)

اور اس گیت کے ساتھ ان منہ بولتی سطروں کا بھی اضافہ کرلیں تو بات کہیں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

''یہ کتابوں کے نہیں زندگی کے ورق ہیں، لیکن ان کی عبارت صرف اُن کی سمجھ میں پڑتی ہے، جنھوں نے زندگی کے بگولے اپنے بدن پر جھیلے ہیں، اور جو ہاتھوں کی قوت صرف اپنے دلوں سے لیتے ہیں'' (رسیدی ٹکٹ: ۱۱۵)

''۔۔۔آج یہ جو کچھ اپنے دل کے عمیق ترین گوشوں سے نکال کر کاغذوں کے اوپر رکھ رہی ہوں، یہ صرف اُن کے لیے ہے جو دُنیا کی روایتوں اور اداسیوں کو دروازے سے باہر بٹھا کر، دل کے سچ کو اندر بیٹھ کر جینے کا حوصلہ کر سکتے ہیں''

(رسیدی ٹکٹ: ۱۱۶)

آخری اقتباس اس بنا پر قابلِ غور ہے کہ اُمرتا کو عمر بھر معاندانہ تحریروں سے مصلوب کرنے کی کوشش جاری رہیں۔اُمرتا پریتم اپنی تخلیقات کے برعکس اپنے طرزِ عمل کی وجہ سے متنازعہ ہیں۔ مذہب و مسلک میں حلال و حرام کا تعین اِن احکامات سے ہوتا ہے، جو عملی زندگی میں بعض اوقات تضادات کا باعث بھی بنتے ہیں۔ بندر سے لے کر گائے بلکہ چوہے تک کو پوتر سمجھنے والا اور اہنسا کا قائل ہندو مسلمان کا خون بہاتے وقت ذرا بھی متردّد، پریشان یا پشمان نہیں ہوتا، ہم مسلمان بھی اس ضمن میں کسی سے کم نہیں، کون سا گناہِ کبیرہ یا صغیرہ ہے جو ہم سے سرزد نہیں ہوتا بلکہ جو گناہ نہ کرسکیں ان کی حسرت کے دادطلب بھی ہوتے ہیں۔عورتوں پر کتے چھوڑنے والے، اُنھیں زندہ دفن کرنے والے اور ننگی عورتوں کے جلوس نکالنے والے سب کچھ کر گزریں گے بعض سور کا نام بھی نہ لیں گے۔ سکھوں میں شراب جائز لیکن تمبا کو نوشی حرام، لہٰذا اسموکنگ کرنے والے کا نزاعات کے بھنور میں گھرے رہنا باعث تعجب نہ ہونا چاہیے۔

اُمرتا پریتم کیونکہ منافق نہ تھی اس لیے اس نے ذاتی زندگی کو اخفاء میں رکھنے کے برعکس گفتنی، ناگفتنی

سب کا برملا اعتراف کیا اور یہی باعث خرابی تھا۔ منافق معاشرہ سچائی کو برداشت نہیں کرسکتا ایسے معاشرہ میں زیست کرنے کے لیے جھوٹ پر سچ کے ملمع کی ضرورت ہوتی ہے۔ امرتا پریتم اگر منافق ہوتی تو ساحر سے نہ تو محبت کا اعتراف کرتی اور نہ ہی اس کے سگریٹوں کے ٹوٹوں کو سنبھال کر رکھنے اور سگریٹ پینے کا اعلان کرتی۔

(رسیدی ٹکٹ: ۲۵، ۸۸، ۱۱۸)

امرتا پریتم نے زندگی کو چار حصوں (۱) شعور (۲) لاشعور (۳) دلیری اور (۴) تنہائی میں تقسیم کرتے ہوئے دلیری کے ضمن میں یہ لکھا:

''حال کو ادھڑنے والی اور مستقبل کو سینے والی دلیری، خوابوں کو تاش کے پتوں کی طرح ملا کر اور بانٹ کر کوئی کھیل کھیلنے کی دلیری جس کی کوئی بھی ہار دائمی ہار نہیں ہوتی۔ جس کے پتے پھر سے ملائے جاسکتے ہیں اور جیت کی امید پھر سے باندھی جاسکتی ہے''۔

(رسیدی ٹکٹ: ۴۶)

دلیری کا یہ تصور کتابی کے برعکس ''وارداتی'' ہے اس لیے اپنے اندر واضح کے ساتھ ساتھ بین السطور مفہوم کا بھی حامل ہے اس لیے جب یہ لکھتی ہے تو بات سمجھ میں آجانی چاہیے۔

''بہت سگریٹ پیتی ہوں اور کبھی کسی کسی دن مجھے وسکی بھی اچھی لگتی ہے۔ اس کو روز عادت کے طور پر نہیں پی سکتی، لیکن کسی دن اچانک اس کی تیکھی طلب ہوتی ہے۔۔۔۔ جانتی ہوں یہ دونوں چیزیں جب کسی عورت کے ساتھ وابستہ ہو کر ایک ذکر بنتی ہیں۔ یہ ذکر عورت کی شخصیت کو سنجیدگی لفظ کے ساتھ نہیں جوڑتا''۔

(رسیدی ٹکٹ: ۱۶۰)

امرتا پریتم کس تیقن سے یہ لکھتی ہیں:

''سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے'' (رسیدی ٹکٹ: ۱۱۸)۔

میرا یہ قیاس ہے کہ اگر سکھ عورت نے مسلمان مرد کی محبت کا اعتراف نہ کیا ہوتا تو شاید اتنی جبینوں پر بل نہ آئے ہوتے اس امر کے باوجود کہ ایک وقت وہ ساحر کے بارے میں یہ بھی کہہ دیتی ہے:

''سالا جولاہا، ساری عمر خواب بنتا ہی رہا، کسی کا خواب نہ بنا'' (رسیدی ٹکٹ: ۸۸)

امرتا پریتم کی ''رسیدی ٹکٹ'' صرف ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے اس لحاظ سے تو اسے مختصر بلکہ مختصر ترین

آپ بیتی قرار دیا جاسکتا ہے، عمر عزیز کی تصویر اتنے چھوٹے کینوس پر پینٹ کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے کار گر اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی اُمرتا کا سب سے بڑا ہتھیار ہے وہ قرۃ العین حیدر کی مانند تفصیل پسند نہیں اس لیے اشاروں اور کنایوں میں بھید کھولتی ہے۔

کفایت الفاظ کی بناء پر مجھے تو ''رسیدی ٹکٹ'' منیچر جیسی دل کشی کی حامل نظر آتی ہے۔

جہاں تک اس آپ بیتی کی تکنیک کا تعلق ہے تو یہ روایتی انداز میں تحریر نہیں ہوئی۔ واقعات کی ترتیب نہ زمانی ہے نہ مکانی بعض آپ بیتیاں منظم اور مرتب انداز میں لکھی جاتی ہیں۔ پیدائش، والدین، خاندان، تعلیم، ابتدائی اثرات، کیریئر، شادی، بچے، وغیرہ وغیرہ سب کے بارے میں ضروری (اور غیر ضروری) کوائف، معلومات اور تفصیلات ملتی ہیں۔ مگر رسیدی ٹکٹ میں یہ انداز روا نہیں رکھا گیا۔

رسیدی ٹکٹ کو ایک شاعر نے قلم بند کیا مجھے تو یہ طویل نثری نظم محسوس ہوتی ہے ایسی نظم جس نے شعور کی رو کے زیر اثر جنم لیا۔ اس لیے واقعات سے مملو جذبات اور احسات کے بیان میں مدوجزر جیسا انداز کارفرما ملتا ہے۔ واقعات کے بیان میں منطقی ترتیب کے برعکس تلازم خیال جیسا انداز ملتا ہے۔ اس میں ڈائری بھی ہے، خواب بھی ہے، اس میں دُنیا کے بعض بڑے ملکوں کے دوروں کی روداد بھی ہے اور عالمی سطح کے قدآور اہل قلم سے ملاقاتوں کا احوال بھی ہے اور اُن کی زندگی پر تبصرہ بھی ہے اور اپنے ناولوں، افسانوں اور نظموں کا تذکرہ بھی، ساحر بھی ہے اِمروز بھی اور بچے بھی۔۔۔۔۔ سب کچھ ہے، لیکن اِن سب کے بیان میں صرف اتنے ہی الفاظ خرچ ہوتے ہیں جتنے الفاظ کی ضرورت ہے۔۔۔ الفاظ کے استعمال میں اسے کفایت شعار عورت قرار دیا جاسکتا ہے۔ عورت جب تخلیق کار بنی تو یہ دعویٰ کرسکی:

> ''۔۔۔۔۔ زندگی کے ہر اتار چڑھاؤ میں جو سدا ساتھ رہتی تھی۔۔۔۔۔ وہ میری قلم تھی۔ چاہے کوئی حادثہ میری اکیلی چھاتی پر گزرتا، چاہے ملک کی تقسیم ایسا لاکھوں لوگوں کو پیش آتا، یہ قلم میرے اعضاء کی مانند میرا حصہ، بدن بن کے رہتی تھی۔ سو صرف یہی زندگی کا فیصلہ تھا۔ باقی سارے شوق گویا کھاد بن کر اس کے رگ و ریشہ میں سما گئے۔
>
> معلوم نہیں، زندگی میں کون سی مہک کی خاطر کیا کیا کھاد بنتا ہے۔۔۔ ساحر۔۔۔ کی دوستی بھی، محسوس ہوتا ہے،۔۔۔ اِمروز کی دوستی کے پھول میں کہیں شامل ہے

، چاہے کھاد بن کر اس کو زرخیز بنانے کی صورت میں:

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۵)

مَیں نے جب اپنی آپ بیتی ''نشان جگر سوختہ'' قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تو اس الجھن سے دوچار ہوا کہ گفتنی اور ناگفتنی کا کیا تناسب ہو؟ کتاب زیست سے کون سی عبارت حذف کی جائے، کن تصویروں کے لیے ہلکے رنگ استعمال کریں کہاں کنایہ سے کام لیں اور کن امور کو نمایاں تر کیا جائے، وضح رہے کہ مَیں جھوٹ، ملمع اور مبالغہ کی بات نہیں کر رہا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ''رسیدی ٹکٹ'' کا مطالعہ کیا تو اسے جھوٹ، ملمع اور مبالغہ سے پاک پایا، اُمرتا شاعرہ تھی مگر اس نے شاعرانہ اُسلوب نہ اپنایا۔ وہ جذباتی عورت ہو گی مگر اس نے آپ بیتی کے چولہے پر جذبات کی ہنڈیا نہ پکائی اور نہ ہی اس میں اُبال پیدا کیا۔ غیر جذباتی نثر میں ذات وصفات کا بیان کیا، ساحؔر لدھیانوی کی محبت کے اعتراف کی صورت میں اُمرتا نے ناگفتنی کا بھی تذکرہ کر دیا۔

اُمرتا پریتم یورپین عورت نہ تھی جسے سب کچھ کہہ دینے کی آزادی حاصل ہے وہ اس معاشرہ کی فرد تھی جس میں ٹیبوز کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توقع کی جاتی ہے مگر اُمرتا پریتم نے نہ صرف یہ کہ ٹیبوز توڑے بلکہ اس ضمن میں اخفا سے بھی کام نہ لیا یہ بڑی بات ہے اور یہی ''رسیدی ٹکٹ'' کا plus point۔

بقول اُمرتا پریتم:

''مَیں صرف دل میں نہیں ٹرنکوں، الماریوں میں بھی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں سنبھال رکھتی ہوں'' (رسیدی ٹکٹ: ۱۴۶)

یہاں قلم کار اُمرتا پریتم نہیں بلکہ ایک عورت سے ملاقات ہوتی ہے، عورت جسے نامساعد حالات میں بھی اپنے عورت ہونے کا احساس ہی نہیں ۔۔۔ بلکہ جو عورت ہونے پر فخر بھی کر سکتی:

''۔۔۔۔ جب تک میری نگاہوں میں میری عزت ہے، میرے ناموس پر حرف نہیں آسکتا'' ۔۔۔ میری طرح میری عزت نے بھی ساری عمر کسی پر انحصار نہیں کیا''۔

(رسیدی ٹکٹ: ۱۴۴)

وہ مزید لکھتی ہے:

''اپنی ہستی پر فخر ہے ۔۔۔ اگر پنجاب کی سرزمین پنجاب کی ایک نظم ہے ۔۔۔ تو مَیں

اس نظم کے معانی ایسی ہوں'' (رسیدی ٹکٹ: ۱۴۵)

یہ تعلّی نہیں، عزتِ نفس کا احساس ہے جس کا ''رسیدی ٹکٹ'' میں قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ یوں دیکھیں تو ''رسیدی ٹکٹ'' اس عورت کے رزمیہ میں تبدیل ہو جاتی ہے جس نے مخالفت، گالی، طنز استہزا، بہتان کے کانٹوں سے بھری راہ کا انتخاب کیا مگر فخر سے سربلند کیے کسی فاتح کی مانند تخلیقی سفر جاری رکھا اور کامران بھی رہی۔۔۔ اس لیے کہ اس کے پاس تخلیق کار کا ید بیضا اور منور قلم تھا:

''زندگی کے اتار چڑھاؤ میں جو سدا ساتھ رہتی تھی وہ میری قلم تھی

(رسیدی ٹکٹ: ۱۳۵)

قلم۔۔۔ جو کبھی پتوار بنتی ہے تو کبھی بادبان ک، کبھی راہنما ستارہ بنتی ہے تو کبھی اندھیرے کو منور کرنے والا چاند، کبھی عصا تو کبھی ضرب کلیم!

☆☆☆☆

رفعت ناہید

امرتا کا سولھواں سال: ایک چور

امرتا پریتم عشق کے رس میں گوندھ کر بنائی گئی ایک حسین عورت، جو سراپا گداز تھی۔ سرتاپا چاہت، جس کارواں رواں محبت کے گیت گاتا ہوا، ٹوٹتی، ٹوٹ کر بنتی، بکھرتی، بکھر کے سمٹتی، وہ Bybirth شاعرہ تھی، اس نے بہت لکھا، بے تحاشہ لکھا اور آخری دم تک لکھا، اس میں ہر احساس کو لکھنے کی طاقت تھی، خود اس پر بیتی، پڑھنے والے پر بیت جاتی ہے۔ ایک شفاف عورت جس نے اپنی زندگی کی کتاب یوں کھول کر رکھ دی، کہ جیسے

دیکھو وہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں بر سرِ عام رکھ دیا

جیسے شعر سن کر لڑکیاں دھک سی رہ جاتی تھیں۔

شاید کہانی اس سے بھی پہلے کی ہے، جب امرتا کے باپو سے چوری چوری سولھواں سال اس سے ملنے آیا تھا، نہیں، بلکہ یہ کہانی اس سے بھی پہلے کی ہے جب دس برس کی عمر میں اس کے خوابوں نے ایک صورت بنائی جو بعد میں ساحر بن گیا (بلکہ اور بھی نہیں) کہانی اور بھی پہلے کی ہے جب چار برس کی عمر میں اس کی سگائی پریتم سے ہوئی اور یہ نام اس کی جان سے ایسا جڑا کہ اس کی جان جانے کے بعد بھی جڑا ہوا ہے۔

امرتا کی سوچ میں گداز،، لطافت اور پیار ہی پیار ہے۔ اس نے ہر اٹھتی ہوئی لڑکی کی طرح اپنی زندگی میں آنے والے شہزادے کی تصویر بہت کم عمری میں ہی بنائی۔ سولھواں برس بقول اس کے اس کی زندگی میں چوروں کی طرح چپکے چپکے، چھپتے چھپتے آیا تھا۔ اسی آنکھ مچولی میں امرتا نے وہ تصویر اس میٹھے برس کے حوالے کر دی، جو سب سے چوری خوابوں میں اس نے بنائی تھی، وہ سولھواں برس مدتوں اس تصویر میں طرح طرح رنگ بھر کے اس کے دیتا رہا۔

پھر یہ ہوا کہ امرتا نے یہ سارا پیکر ساحر کی ذات میں ایڈجسٹ کر کے اس کی پوجا پاٹ شروع کردی۔

ساحر نے امرتا کو کیوں نہیں اپنایا؟ کوئی مجبوری تو بیچ میں تھی نہیں پھر بھی کوئی بات تو ہوگی۔ خیر ساحر نے وہ سنیہڑے پڑھے بغیر واپس کردیے، جن میں روتی، کرلاتی، سسکتی، پیار کرتی، پیار مانگتی امرتا تھی، وہ وہ سنیہڑے تھے جن کے لیے 1957 میں امرتا کو اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ امرتا نے سوچا، ''خدایا یہ سنیہڑے میں نے کسی انعام کے لیے تو نہ لکھے تھے۔ جس کے لیے لکھے، اس نے نہ پڑھے اب کل عالم بھی پڑھ لے تو مجھے کیا۔'' (ایک تو نہ ملا ساری دنیا ملے بھی تو کیا)''

عشق ترے انگوٹھا لایا، کون حساب چکا دے گا

کا پس منظر بتاتے ہوئے امرتا پریتم خود لکھتی ہے۔

''میں نے ہنس کر ہاتھ کی ہتھیلی اس کے آگے کردی اور کہا،''آٹو گراف'' ساحر نے ہاتھ میں پکڑے پین کی سیاہی انگوٹھے پر لگا کر وہ انگوٹھا میری ہتھیلی پر لگا دیا۔ جیسے میری ہتھیلی کے کاغذ پر دستخط کردیے۔ اس میرے کاغذ کی عبارت کیا تھی جس کے اوپر اس نے دستخط کیے۔ یہ سب ہواؤں کے حوالے ہے۔

عبارت نہ کبھی اس نے پڑھی، نہ زندگی نے، اس لیے کہہ سکتی ہوں ساحر ایک خیال تھا، ہوا میں چمکتا ہوا۔ شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک جادو۔''

خود امرتا کے حسابوں، وہ ساحر کہیں Exist کرتا ہی نہیں تھا۔ کیا یہ واقعی شیزوفرینیا کی کوئی ہلکی سی Wave تھی۔ جس نے اس کی ساری زندگی کو بگولے کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کتنی دراڑیں امرتا کے تن اور من پر آئیں، جب وہ گھر بار ساحر کے لیے چھوڑ کر چل دی تھی۔ چلنے سے پہلے اس نے ساحر کو فون کرنا چاہا، اور بیچ میں آ گیا وہ اخبار جس میں ساحر اپنی نئی دوست سدھا ملہوترا کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ (وہ ساحر اس دنیا میں کہیں آیا ہی نہیں جس کی تم دیوانی ہو۔ اس کے سولہویں سال نے اس کے دل کے کہیں قریب دھڑک کر کہا۔) یہ ایک اور ٹریجڈی ہوگئی۔

تڑکے گھڑے کا سارا پانی بہہ چکا تھا۔

پنجابی کے وہ سارے لفظ، فقرے اور لہجے جن کا بدل دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں، اس

میں سارا رچاؤ امرتا نے بھرا، امرتا نہ ٹوٹتی تو یہ سارے بول جادو نہ بنتے، جادوگر نہ بنتا۔ ساحر بس ساحر ہی رہتا۔

امرتا کی توڑ پھوڑ، ساحر کی بے وفائی، امروز کی پذیرائی ان سب نے مل کر امرتا پریتم کو تخلیق کیا۔
پنجاب کا عاشقانہ لب و لہجہ امر ہو گیا، اور پنجابی کویتائیں گاتی اپنے ساجن پر نثار ہوتی پنجابنیں امر ہو گئیں۔

اَج آکھاں وارث شاہ نوں، کہہ کر وہ جھنگ کی ہیر کی سہیلی ہو گئی۔ اگر کبھی میں امرتا کی ہم عمر ہوتی اور امرتا سے ملی ہوتی تو میں ضرور اس کی بڑی گوڑھی سہیلی ہوتی اور امرتا، افضل توصیف کی بجائے مجھے خط میں لکھتی تیراتن دن دا ملن ہو تر یہہ لا گیا۔ تریہہ میں پیاس سے بھی زیادہ پیاس ہے۔ پنجابی کے اکثر لفظ اپنے احساس میں یوں بھیگے ہوئے ہیں کہ ان کا کسی اور زبان میں ترجمہ تو ہو سکتا ہے بدل نہیں ہو سکتا۔
امرتا نے ایسے لفظوں کو ان کے رس سمیت خواب استعمال کیا ہے یا شاید امرتا کے استعمال نے ان میں رس بھرا ہے۔

عمر کی پختگی کے باوجود، وہ سولہواں سال بار بار رائیڈر ہیگرڈ کی ''شی'' کی طرح ناآسودگی اور تشنگی کے شعلوں میں نہا کر چمکتا ہوا اس کی عمر کے ہر سال میں اس سے لپٹا رہا۔ اس سے ملنے آتا رہا۔ اور اس نے اس میٹھے برس کو خود سے الگ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ سولہ سال کی امرتا، ہر نئے سال میں امرتا پریتم کے بدن میں دراڑیں کرتی اور اس میں رس بس جاتی تھی۔

اس سولہ برس کی امرتا کو امروز نے سنبھالا جو شاید خود اس سے سولہ برس چھوٹا تھا۔

وہ داستاں تھی کسی اور شاہزادے کی
مرا تھا نام فقط زیب داستاں کے لیے

لیکن امروز زیب داستان نہیں تھا۔ بلکہ وہ خود ایک داستان تھا، امروز وہ شاہزادہ تھا، جس نے سلیپنگ بیوٹی کی آنکھیں چوم کر اس کو سو سال کی تکلیف دہ نیند اور اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ خواب سے جگایا۔ اس کے تمام تر ماضی سمیت اس کو دل میں بسایا اور پھر خود اس کے گھر میں رچ بس گیا۔ امرتا کو ہی نہیں اس نے اس کے گھر کو بھی رنگوں سے رنگ دیا۔ امروز کا چاہت بھرا ساتھ زندگی کے آخر تک امرتا کے ساتھ رہا، ایسے کہ جب وہ رخصت ہوئی تو تب بھی وہ سولہ برس کی تھی۔

زاہد حسن

زندگی پروف کی غلطیوں سے بھری ہے!

امرتسر اور لاہور کے درمیان ایک بستی آباد کی گئی، پریت نگر، دُنیا کی یہ بے مثال بستی محبت کی اور امن کی علامت کے طور پر آباد کی گئی تھی۔ یہاں ادیب، شاعر اور فنکار بستے تھے۔ علم کی، اَدب کی، فکر کی اور دانش کی منڈلی جما کرتی۔ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ 1944ء میں یہاں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں ساحر موجود تھے اور جہاں اُمرتا پریتم بھی مدعو تھیں۔ بعضوں کا کہنا یہ ہے کہ اُمرتا کے یہاں اس طرح کے مصرعوں کا آغاز بھی یہیں ہوا تھا:

وے سائیں، تیرے چرخے نے
اج کت لیا کتن والی نوں

محبت کے پگ پہ پاؤں دھرے دانش کا گھڑا سر پہ لیے پنگھٹ اور جانے والی اپنے عہد کی میرا نے اپنی ساری بپتا اپنے ایک سوانحی ناول ''رسیدی ٹکٹ'' میں دل کھول کر بیان کردی ہے۔

ہمارے جدید اَدب میں اَمرتا پریتم جیسی ادیبہ کی دوسری مثال موجود نہیں۔ اُس نے اپنے آرٹ میں عورت کے وہ بھی رنگ بکھیر دیے، جو عورت نے اس کے عہد تک دریافت کیے، اُس نے انسان کی بات کی، محبت کی اور امن کی بات کی، دُنیا بھر میں موجود انسانوں کی آزادی کے گیت گائے۔ 1947ء میں جب وہ اٹھائیس برس کی تھیں، تو اُنھوں نے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم دیکھی، اور اس تقسیم کے نتیجے میں انسانوں کی، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی بے توقیری دیکھی تو پنجابی شاعری کے شاہ کو پکارا:

''اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول''

31 اگست 1919ء میں وہ گوبرانوالہ میں پیدا ہوئیں 31 اکتوبر 2005ء میں دہلی میں وفات پا گئیں، لیکن وہ طویل مدت تک لاہور میں رہیں اور یہیں سے اَدب، فن، آرٹ اور عشق کے ابتدائی نقوش ان

کی رُوح اور وجود پر مہکنے شروع ہوئے۔ اُن کے والد کے ملنے والوں میں ساحر بھی شامل تھے۔ ''جب وہ اٹھ کر چلے جاتے تو میں ایش ٹرے میں اُن کی پی گئی سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹوٹے سلگا سلگا کر اپنے لبوں سے لگاتی۔ اُنھیں پینے کے جتن کرتی، اور اس امر کا اظہار اُنھوں نے کئی بار کیا ہے۔

اظہار کی اور آزدی کی کئی شکلیں ہیں۔ بے شمار صورتیں ہمیں امرتا پریتم کے یہاں ترتیب و تشکیل پاتی نظر آتی ہیں۔ وہ 14 برس تک آل انڈیا ریڈیو پر ستار بجاتی رہیں۔ کہیں دور اس کی مدھم سی لے آج بھی سنائی دیتی ہے۔

اُمرتا، چھیاسی برس اور دو ماہ تک زندہ رہیں۔

اُن کی زندگی کے یہ طویل برس محض برس ہی نہیں خود زندگی کا حسن بن کر سامنے آتے ہیں، ان برسوں کے دوران اُنھوں نے سجاد حیدر، ساحر اور امروز جیسی شخصیات کی ذاتوں میں اپنا اور اپنے فن کا جواز ڈھونڈا۔ پریتم سنگھ۔ اوائل عمری میں ہی جن سے ان کی شادی ہوگئی تھی۔ اس سے امرتا کی علیحدگی جلد ہی ہوگئی تھی لیکن اس کا نام اُمرتا کے اپنے نام میں لفظ ''امر'' کی حیثیت اختیار کر گیا۔

تقسیم کا گھاؤ اتنا گہرا تھا کہ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور بعض دوسرے اہم لکھنے والوں کی طرح اُمرتا کے سینے پر بھی نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اُنھوں نے اسے اپنی شاعری، ناولوں، کہانیوں اور مضامین کا موضوع بنایا۔ ان کا ناول ''پنجر'' اس سلسلے کا ایک اہم اظہار یہ ہے۔ اُنھوں نے اس درد کو یوں سینے سے لگائے رکھا کہ گوجرانوالہ اور لاہور کی آزاد اور خوشبو دار ہواؤں میں سانس لینے والی اُمرتا پریتم نے لکیر کی دوسری جانب جب پاؤں دھرے تو مر کر نہیں آئیں۔ لیکن اُن کے افکار، اُن کے خیالات اُن پر کون بند باندھ سکتا تھا۔ ایک اُن کا ادبی تخلیقی عمل تھا۔ اپنی گائیکی کے شوق کو اُنھوں نے کلاسیکی اور صوفی شاعری سننے میں تبدیل کر لیا تھا۔ 1944ء سے اُنھوں نے اپنا اَدبی رسالہ ''ناگ منی'' شروع کر دیا تھا۔ جس کا ہر شمارہ ایک خاص شمارہ ہوتا۔ یہ ایک ہی موضوع ایک ہی جذبے کی تفہیم ہوتا۔ جس میں تخلیقات کا انتخاب اُمرتا پریتم کرتیں صفحہ بہ صفحہ السٹریشنز اُمروز کی ہوتیں یوں پڑھنے والے بصری حظ بھی اٹھاتے۔ وہ عظیم شاعرہ تھیں، اُن کی نظم میں اپنے عہد کی ساری روح سمٹ آتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ایک بڑا لکھنے والا ہی روح عصر ہوتا ہے۔ جس سے زمانے اپنے زندہ ہونے کی شناخت طلب کرتے ہیں اُمرتا پریتم کی ذات آپ اپنے زمانے کی شناخت ہے۔

اُمرتا دیس دیس پھریں، کئی ملکوں کے اَدب کا ترجمہ کیا۔ خود اُن کی اپنی تخلیقات کے تراجم چونتیس

زبانوں میں ہوئے۔ اُن کے معروف ناولوں میں 'پنجر، چک نمبر چھتی، اور ڈاکٹر دیو، کے علاوہ آہلنا، اشوکا، اک سوال، بلاوا، بند دروازہ، رنگ دا پتہ، اک سی انیتا، دھرتی ساگر تے سپیاں، دلی دیاں گلیاں، ا یکتا تے ایریل، جلاوطن یاتری، جیب کترے، اک دا بوٹا، پکی حویلی، اگ دی لکیر، کچی سڑک، کوئی نہیں جاندا، اوہناں دی کہانی، اک خالی جگہ، تیرھواں سورج، انجادن، کورے کاغذ، ہر دت دا زندگی نامہ اور نہ رادھا نہ رکمنی۔

''نویں رت'' اُمرتا کا وہ شعری مجموعہ ہے۔ جسے جدید پنجابی شعری اُدب میں ایک تخصیص حاصل ہے۔ پاکستان میں اسے پہلی بار پنجابی کے نامور کہانی کار اور ڈرامہ نگار سجاد حیدر نے پیپلز پبلشنگ ہاؤس سے چھپوایا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں لوک شاعری، کلاسیکیت اور صوفیانہ شعری روایت اس شعری مجموعے کی نظموں کے رنگ و آہنگ میں ڈھلی ہے۔ اس کے علاوہ 'ٹھنڈیاں کرناں، اُمرت لہراں، جیوندا جیون، تریل دھوتے پھل، او گیتا والیا، بدلاں دے پلے وچ بجھ دی لالی، نکی جیہی سوغات، لوک پیڑ، پتھر گیٹے، لمیاں واٹاں، مَیں تواریخ ہاں ہند دی، سرگھی ویلا سنیہڑے، اشوکا چیتے، کستوری، ناگ منی اور کاغذ تے کینوس اُن کے شعری مجموعے ہیں، اسی طرح چھبی ورھے بعد، کنجیاں، آخری خط، گوجر دیاں پریاں، چانن دا ہوکا، جنگلی بوٹی اور اجنبی اِن کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ'' کے علاوہ، میرا کمرہ اور بڑے لکھنے والوں کے انٹرویوز پر مشتمل اُن کی کتابیں ہیں۔ ہندی، اُردو، انگریزی، گجراتی، مراٹھی، کنڑ، ملیالم، اڑیا، اسامی، بنگلہ، سندھی، رُوسی، بلغارین، پولش، سرب، سپینش، فرنچ، تامل، تیلگو، کوکنی، ازبک، چیک، مقدونین، ہینگیرین، رومانین، یوکرئین، البانئین عربی، ڈینش، چینی، جاپانی، ویت نامی، جرمن اور نارویجن وہ زبانیں ہیں جن میں اُمرتا کی ناولیں، شاعری اور کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ ہندوستان میں سب سے اہم ''پدم شری ایوارڈ'' سمیت کوئی اہم ایوارڈ نہیں جو انھیں نہیں ملا، اُن کی اَدبی خدمات کا بیرونی دُنیا میں بھی اعتراف کیا گیا ہے اور دُنیا بھر کی اہم یونیورسٹیوں سے اُنھیں اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں ایک سو کے قریب کتابیں تخلیق کرنے والی اُمرتا پریتم کی شخصیت ہمارے لیے کسی معجزے سے کم حیثیت نہیں رکھتی، جو انسانوں سے ہی نہیں، دھرتی اور دھرتی دیوتا سے بھی سوال کرتی ہے۔

''دھرتی..... ات سندر کتاب
چن سورج دی جلد والی
پر خدایا، بھکھ، ننگ، ہم تے غلامی

ایہی تیری عبارت ہے

یاں پروف دیاں غلطیاں؟

پروف کی غلطیاں تو دکھائی دے جاتی ہیں اور درست بھی کی جا سکتی ہیں لیکن زندگی؟ زندگی، اُمرتا کے یہاں درد قرار پاتی ہے۔ جسے وہ کہتی ہیں میں نے سگریٹ کی طرح پیا ہے اور کتابِ عشق جسے وہ عمر بھر رقم کرتی رہیں۔ کتابِ زندگی کی وہی تفسیر تھی جسے بنی آدم اپنے روزِ اوّل سے اپنے پلو کی پوٹلی بنائے اس میں باندھے اپنی آیندہ نسلوں میں منتقل کرتا چلا جا رہا ہے۔ بس صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی کے یہاں اس کی دھج منفرد اور اس کا نکھار اور طرح کا ہوتا ہے اُمرتا پریتم نے بھی امن کے اور محبت کے اس گیت کو نیا آہنگ، نیا ڈھنگ اور نیا اسلوب دیا۔ وہ اسلوب جو ہمارے عہد، ہمارے عہد کے انسان کا اسلوب قرار پایا ہے۔ وہ جو کہہ رہی ہیں۔

چانن دی پھلکاری تو پا کون بھرے؟

انبر دا اک آلا سورج بال گیا

من دی اچی ممٹی دیوا کون دھرے؟

لیکن کسی نہ کسی کو تو من کی اس اونچی ممٹی پر چراغ دھرنا ہی ہے۔ شاید وہ اُمرتا پریتم ہی ہوں گی۔

☆☆☆☆

سلیم پاشا

محبت کی اسیر۔۔امرتا

امرتا پریتم، ادب میں ایک معتبر اور جانا پہچانا نام، ایسی شمع جس کی روشنی سے ایک زمانہ،ایک عہداورایک نسل منور ہوئی۔ اس نے ہجرت کا زہر چکھا۔ذاتی زندگی میں ازدواجی ناآسودگی کو بھی سہا۔باقی زندگی ایک ایسے ہمدرد دوست کے ساتھ گذاری جس کے لئے اس نے کسی قانونی یا سماجی ضابطے یا سند کو ضروری نہیں سمجھا تو پھر اسے سماج کی باتیں بھی لامحالہ سننا پڑیں۔ ایک حساس اور خوبصورت ذہن کا جب ان وارداتوں سے گذر ہوتا ہے تو لامحالہ بہت توانا اور متاثر کن ادب تخلیق ہوتا ہے۔ امرتا نے اس آگ میں جل کر جو کندن بنایا ہے اس کو سارے اہل نظر نے پڑھا اور حد سے زیادہ سراہا بھی۔

لیکن آج جو ہمارا موضوع سخن ہے وہ امرتا پریتم کی ادبی سرگرمیاں نہیں ہیں بلکہ اس کی تخلیقی قوت کو بڑھاوہ دینے والے محرکات یعنی مرتا کی ذاتی زندگی میں آنے والے تین مرد ہیں۔ یہ تینوں مرد ایک دوجے سے مختلف بھی ہیں اور منفرد بھی۔ تینوں کا امرتا سے رشتہ یا تعلق بھی جدا جدا طرز کا ہے۔ اپنے اپنے حصے کے کرداروں کو نبھاتے یہ مرد امرتا کو کس مقام پہ لاتے ہیں اس کیلئے ہمیں ان میں سے ہر ایک کی شخصیت پر نظر ڈالنا ہوگی۔

سب سے پہلے امرتا کی ذاتی زندگی میں جس مرد کی آمد ہوتی ہے، وہ اس کا دھرم پتی پریتم سنگھ ہے۔ یہ وہ نام ہے جس نے امرتا کے نام میں پریتم کے لفظ کا اضافہ کیا۔ اور یہی وہ صاحب جن سے امرتا پہلی بار اپنے گھر کی چاردیواری کے اندر کسی اور مرد سے متعارف ہوتی ہے۔ اس کے والد نے امرتا کی شادی نوعمری میں ہی کرنے کی کوشش میں ایک ایسے گھر کو ڈھونڈا جو کہ کاروباری اور کھاتا پیتا ہے لہور انارکلی میں اس خاندان کی کپڑے کی دوکانیں ہیں گھر میں نوکر چاکر ہیں اور لکشمی دیوی اس گھر پر عاشق ہے۔ امرتا کے والد نے رشتہ طے کرتے ہوئے خواتین والی مخصوص کھوج نہیں کی جو کہ عورتوں کا خاصہ ہوتی ہے خصوصاً رشتے طے کرتے

وقت جو سن گن محلوں گلیوں کی سیاست میں لی جاتی ہے وہ امرتا کے والد سے نہ تو ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہ تو ٹھہرے ایک بھگت اور اللہ لوک انسان۔

پریتم سنگھ ایک نکھٹو، بیکار اور آوارہ قسم کے انسان اپنے تو کیا خاندان بھر میں مشہور تھے۔ پنجابی میں ایسے بندے کیلئے ایک محاورہ بولا جاتا ہے کہ اس نے ''کدی ککھ بھن کے دہرا نہ کیتا'' یعنی عملی زندگی میں فارغ قسم کا شخص۔ گھر والے اس کی نالائقیوں سے نالاں تھے اور جلد از جلد اس سے چھٹکارے کا سوچتے تھے۔ والدین کو بھی وہی اولاد پیاری لگتی ہے جو ان کے لئے مفید ہو یعنی کام کاج کر کے ان کا ہاتھ بٹائے یا کما کر لائے۔ بڑا بیٹا چونکہ والد کے ساتھ برابر کا ساتھ دے رہا تھا اسلئے وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ پریتم کیلئے گھر والوں نے ایک ایسی لڑکی کا رشتہ تلاش کیا جو غریب خاندان سے ہو اور ان کے سامنے کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ سو جلدی جلدی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر کے پریتم سنگھ کے باپ نے بیٹے کو انارکلی میں کپڑے کی ایک دوکان بنا دی اور عملاً اپنے گھر سے علیحدہ کرتے ہوئے یہ آواز بھی لگا دی کہ جاؤ بیٹا جا کر کماؤ اور کھاؤ۔ پھر پلٹ کر اس نئے جوڑے کی خبر ہی نہ لی کہ جیتے بھی ہیں کہ نہیں۔

امرتا ان دنوں ریڈیو پر کام کرتی تھی اور بحیثیت اچھی شاعرہ اپنے آپ کو منوا چکی تھی۔ پریتم سنگھ کا اپنی بیوی سے تعلق صرف بستر تک کا تھا یعنی رات کا رشتہ۔ دن کے اجالے میں ان کی دوستی کبھی بھی گہری نہ ہو سکی۔ کہنے کو میاں بیوی تھے مگر گھرداری کا پریتم سنگھ کے اندر کوئی خیال تک نہ تھا۔ روزانہ صبح امرتا اپنے خاوند کو دروازے تک اسلئے نہیں چھوڑنے آتی تھی کہ محبت بھرے انداز میں رخصت کر سکے بلکہ شوہر صاحب اپنی بیوی کو اس دن کے کھانے پکانے کا خرچہ دس روپے کا نوٹ دوکان پر جانے سے پہلے دروازے پر دیا کرتے تھے۔ ایک روز اپنی بیوی کو موصوف کہتے ہیں'' آج تو اتوار ہے چھٹی کا دن'' امرتا نے کہا ٹھیک ہے پھر رات کو کھانے سے بھی چھٹی کر لینا۔

پریتم سنگھ نے جو بھی کاروبار کیا، اس میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی یا وہ اس طرح پھل پھول نہ سکا جس سے گھر میں خوشحالی آتی، لے دے کے زندگی میں ایک فلیٹ خرید پایا جس کی قسطیں بعد میں امرتا نے اپنی کمائی سے اُتاری تھی۔ امرتا اس کے قرض اتارتے اتارتے اتنا تھک گئی کہ تنگ آ کر اس نے ایک دن پریتم سنگھ کو بھی اپنی زندگی سے اتار دیا۔ پریتم سنگھ کا سب سے بڑا نقص اس کی اپنی ذہنی اپروچ تھی جس سے امرتا جیسی بلند پایہ عورت کا نبھاہ نہ ہونا لازمی بات تھی۔ کہاں ایک بہت بڑی ادیبہ اور قلم کار جو بولے تو ایک ایک

لفظ موتی، اور کہاں ایک دوسرے تیسرے درجے کا کم عقل اور کم فہم دوکاندار جس کی سوچ کا دائرہ اس کی دوکان اور بیکار قسم کے دوستوں سے کبھی آگے تک گیا ہی نہیں۔ امرتا جسے ہندوستان کی طاقتور وزیراعظم کا قرب حاصل ہے اور وہ اس ہستی کو راجیہ سبھا کی ممبر بنانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ پریتم سنگھ اس خوبصورت ذہن کی مالک بیوی کے لائق ہرگز نہیں ہے۔

اب یہاں ایک دوسرے مرد کی آمد ہوتی ہے جو امرتا کے آس پاس ہی کہیں رہتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا رہتا درویش سا انسان ہے۔ جس کا وجود ربّ نے پیار کی مٹی سے گوندکر بنایا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو امرتا کو دل ہی دل میں چاہتا ہے، اس کو دکھ اور مصیبت میں بُرے حالات سے لڑتے ہوئے بھی دیکھتا ہے۔ وہ امرتا کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور خود کلامی میں اپنے حالات کو بہتر کرتے ہوئے امرتا کے مصائب کو کم کرنے کا سوچتا رہتا ہے۔ یہ صاحب مشہور آرٹسٹ امروز ہیں اور اپنے فن سے دنیا کو حسین دیکھنا چاہتے ہیں۔ شمع دہلی رسالے میں بطور آرٹسٹ کام کرتے ہیں اور مبلغ تین سو روپے تنخواہ پاتے ہیں۔

امرتا جلد ہی ان کے وجود کو محسوس کر لیتی ہے اور ان کیساتھ مل کر اپنے دکھ سکھ کو شیئر کرنے لگ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ رفاقت امروز کی کھولی سے نکل کر امرتا کے گھر تک آ جاتا ہے۔ امروز ایک بھلا مانس انسان اب امرتا کے بچوں میں گھل مل جاتا ہے اور پھر امرتا کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں کی ڈیوٹیاں بھی اپنا لیتا ہے۔ ان کو سکول لیجانا اور واپس لانا امروز کے روزمرہ کا معمول، اور جس کے بچے ہیں پریتم سنگھ وہ ان ذمہ داریوں سے بے نیاز۔ شوہر کی بے غرضی اور پھر اس کے قرضوں کا بھار امرتا کو جب شل کر دیتا ہے تو وہ اس کو گھر سے نکل جانے کا بول دیتی ہے۔ پریتم سنگھ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک مشرقی بیوی اپنے شوہر کو گھر سے نکلنے کا کہے گی۔ امرتا نہ تو باقی کچھ عورتوں کی طرح اللہ میاں کی گائے تھی اور نہ کوئی معمولی عقل فہم والی ہستی۔ اس نے جو کچھ کیا، بہت سوچ سمجھ کر اور مناسب موقعے پر کیا۔ چونکہ موجودہ مکان امرتا کی ذاتی کمائی سے تعمیر کیا ہوا تھا سوأسے نکلتے ہی بنی۔ پھر اپنے فلیٹ میں جا کر رہنے لگا اور جب اس کا آخری وقت آیا تو امرتا کا بیٹا نوراج اپنے باپ کی ہمدردی میں ماں سے لڑنے لگا۔ امرتا چپکے سے جا کر پریتم سنگھ کو اپنے گھر میں لے آئی اور پھر قانون اور دھرم سے بالاتر ہو کر ایک طلاق یافتہ بیوی نے سابق شوہر کی تیمارداری کر کے اس کے آخری سفر کو آسان کیا۔

امروز اور پریتم سنگھ کے درمیان ایک تیسرا مرد بھی ہے جو امرتا کی سانسوں اور سوچوں کا محور بھی ہے

اور محبوب بھی۔اس کا تعلق اس دین سے ہے جس کو ہندوستانی اپنی رسوئی میں جگہ نہیں دیتے اور جس کے اس انسانی حق کو واگذار کروانے کیلئے امرتا اپنی نانی سے جھگڑتی ہے کہ ان کے برتن ہمارے برتنوں سے الگ کیوں ہیں۔یہ وہی شخص ہے جس کے پریم میں بندھی امرتا موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی امروز کی کمر پر انگلیوں سے اس کا نام لکھتی رہتی ہے۔جس کے سنگ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے اور اس کے پئے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کو سوغات سمجھ کر سمیٹ لیتی ہے پھر اس کے جانے کے بعد ان بجھے ہوئے ٹکڑوں کو عشق کی آگ میں سلگا کر اپنی پریت کو منور کرتی ہے۔یہ وہی شخص ہے جس سے اس کی سوچوں کی اڑان اور خیالوں کی بلندی ہم رقاب ہوتی ہے۔جو تخیل کی اسی معراج پر اسے بانہیں کھولے ملتا ہے جہاں وہ خود پہنچی ہوتی ہے۔ہاں یہ شخص ساحر لدھیانوی ہے، جس نے رومانوی شاعری میں اپنا لوہا منوالیا ہوا ہے۔جو مشاعروں کی جان ہے۔جو فلمی شاعری میں لوگوں کی زبان پر مچلتا ہے۔یہی وہ شخص ہے جو امرتا کے لفظوں کو عشق، ہجر اور وصل کی لذتوں سے آشنا کرتا ہے۔

امروز سدا کا خدمت گذار اور ملوک انسان، میں نے پوچھا ساحر سے آپ کو کوئی حسد وغیرہ تو نہیں، امروز بولے ''حسد کیسا، میں تو امرتا سے پیار کرتا ہوں اور اس سے بھی جس سے امرتا پیار کرتی ہے۔مجھے خوشی ہوتی تھی جب یہ دونوں اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے تھے۔میں ان کو چائے پانی لا کر دیتا ٹہل سیوا کرتا اور ان کی باتیں سنتا تھا۔اصل میں دو چیزیں ہیں پاشاجی پہلی بات عشق کے حوالے سے ہے اور وہ یہ کہ عشق کبھی مکمل نہیں ہوتا۔یہ چلتا رہے یا ادھورا رہے تو اس کی تپش بندے کو عام انسان سے بھگت یا پتہ نہیں کیا بنا دیتی ہے۔بندہ اپنی ذات کو چھوڑ کر بھی سوچنا شروع کرتا ہے۔اس کا سفر، اس کا راستہ اور اس کی منزلیں سب کچھ بدل جاتا ہے۔شاید ان دونوں کے دل میں بھی کوئی ایسی ہی بات تھی جس کی بنا پر وہ بات کو آگے نہ بڑھا پائے۔لیکن میرے خیال میں امرتا کا ذہن ساحر کے حوالے سے کلیئر تھا، وہ ساحر کے ساتھ زندگی کی شروعات چاہتی تھی مگر جہاں تک تعلق ہے ساحر کا تو اس میں گھر بسانے کا جذبہ تھا ہی نہیں تھا، یا اس نے کبھی اس زاویے سے اپنی زندگی کو دیکھا ہی نہیں تھا۔یہ بات اس کے دوستوں کو بھی پتہ تھی کہ ساحر صاحب امرتا کے ساتھ سنبدھ رکھتے ہیں، لیکن وہ اس معاملے کو بس گفتگو اور ملنے جلنے کی حد تک رکھنے میں راضی تھے۔آپ اسے دل لگی بھی کہہ سکتے ہیں۔ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ ساحر کے دوستوں نے مل کر اسے اور امرتا کو ایک کمرے میں ہی بند کر دیا۔شاید وہ بات کو کسی نتیجے تک پہنچے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔مگر بات وہیں کی وہی رہی اور کچھ بھی نہ

ہوا، امروز نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔آپ نے امرتا کو سب سے پہلے کہاں دیکھا تھا؟ میں نے پوچھا۔امروز بولے، میں بہت چھوٹا تھا لاہور میں پڑھتا تھا تب میں نے امرتا کی تصویر اپنے گھر کے ایک فریم میں لگی دیکھی تھی۔ میرے باپو کو امرتا کی شاعری بہت پسند تھی اور اس نے یہ تصویر پریت لڑی رسالے میں سے کاٹ کر لگائی ہوئی تھی۔ جس میں امریتا کی کویتائیں چھپتی تھیں۔ پھر دہلی میں اتفاق سے میرا فلیٹ امرتا کے گھر کے پاس ہی تھا، یوں اسے روزانہ دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع مل گیا۔

امروز جی! امرتا پریتم کی زندگی میں آنے والے تیسرے مرد آپ ہیں او حقیقت میں آپ ہی وہ شخص ہیں جس کے ساتھ امرتا جی نے زندگی کا سب سے لمبا سفر طے کیا ہے۔ کیا کبھی ایسا نہیں لگتا کہ باقی کے دو مرد ایکسٹرا کا رول ادا کر رہے تھے اور اصل میں اس فلم کے ہیرو آپ تھے؟

واہ پاشا جی کیا خوب کہی آپ نے، یہ بات سن کر تو مجھے بھی اب کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے جو یہ کہ انسان جو چاہتا ہے وہ اسے کم ہی ملتا ہے اور جس کی تمنا نہ ہو وہ اس کے آگے پیچھے ہی رہتی ہے، نظروں کے آس پاس اور اکثر پیروں میں۔ امروز جی اب یوں تو نہ کہیں امرتا نے آپ کے ساتھ کو بہت دفعہ اپنی خودنوشت میں سراہا ہے۔ نہیں پاشا جی آپ بات کو کسی اور طرف لے گئے میں نے یہ نہیں کہا کہ امرتا نے مجھے سویکار نہیں کیا، وہ تو فخر کرتی تھی کہ رب بندے کو پورے جنم میں صرف ایک جوانی دیتا ہے اور مجھے تو امروز کی شکل میں دوسری جوانی بھی دی ہے، یہ پیار نہیں تو کیا ہے۔ اب آپ امرتا کے بعد کیا محسوس کرتے ہیں کیا اب بھی اس سے، وہی چاہت ہے؟ کیوں نہیں امروز بولے میں تو امرتا کی یادوں کی دیپ جائے اس کے گھر میں بیٹھا ہوں اور امرتا مجھ سے جدا نہیں ہوئی، وہ اب بھی میرے پاس ہی ہے، روزانہ مجھ سے ملتی ہے، باتیں کرتی ہے اور میرے ساتھ ساتھ دور تک پیدل چلتی ہے۔ ہم آج بھی سنسان سی سڑک پر چلتے ہوئے تھک کر فٹ پاتھ پہ بیٹھ جاتے ہیں اور کھوکھے سے چائے لے کر پیتے ہیں۔ وہ مجھ سے جدا نہیں۔ کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے کو بھی، ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ ایک ساتھ ہیں۔۔۔۔

ابھی ہم نے امرتا پریتم کی زندگی میں آنے والے تینوں مردوں کے ذاتی کرداروں پر بہت تھوڑی سی نظر ڈالی، یقیناً تشنگی رہ جاتی ہے اگر ہم ان پر سیر حاصل بحث نہیں کرتے۔ مگر یہاں ہمارا مقصود امرتا جی کی ادبی زندگی کا احاطہ کرنا نہیں تھا بلکہ عنوان کے آس پاس رہتے ہوئے امرتا کی ذاتی زندگی میں آنے والے مردوں کے کرداروں کا ہلکا سا تعارف تھا، جنہوں نے اپنے عہد کی بڑی ادیبہ کی داخلی اور خارجی حیثیت کو متاثر

کیا۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو ان تینوں میں سے میرا ووٹ بھی امروز ہی کی طرف ہے جو اپنے آپ کو منفی کر کے کسی اور کیلئے جینے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ جو دکھ سکھ میں برابر کا ساتھی بنتا ہے بنا کسی رشتے کے بغیر کسی تعلق کے۔

☆☆☆☆

شاہدہ دلاور شاہ
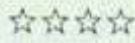
امرتا۔۔۔۔۔ایک تاریخ

جب برصغیر کی سرزمین کے باسی بڑی سرعت سے کمیونزم کی جانب متوجہ ہو رہے تھے اور استعماری ذہنیت انہیں خالصتاً مذہبیت کی طرف دھکیل دینے کے لیے کوشاں تھی۔ ان کا مقصد مُلّا ازم اور شدہ ہندو ازم کا گھیرا برصغیر کے گرد بڑھانا تھا۔ ان ہتھکنڈوں سے آنے والے وقت میں اس خطے پر گرفت کرنا ان کا مطمع نظر تھا۔ اس شدید ہیجانی دور میں 31 اگست 1919 کے دن نند سادھو (کرتار سنگھ) اور راج بی بی کے گھر ننھی کلی امرت کور کے نام سے کھلی۔ کرتار سنگھ گوجرانوالہ کے اعلیٰ مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا شاعر بھی تھا۔ راج بی بی ایک سکول ٹیچر تھیں۔ ابھی امرتا گیارہ سال کی تھیں کہ راج بی بی ملک عدم کوچ کر گئیں۔ کرتار کی ایک اور بڑی بہن تھیں جو سادھن ہو گئیں۔ امرت کور، امرت سے امرتا ہو گئی باپ نے اپنا تخلص ہتکاری رکھ لیا۔ ہتکاری بھی پنج کھنڈ بھسوڑ کے سکول میں ٹیچنگ کرتا تھا۔ وہ لکھاری تھا۔ رات کو لکھتا صبح سکول جاتا اور واپسی پر آ کر سو جاتا۔ گوجرانوالہ کے بعد لاہور میں وہ ایک کالج میں بھی پڑھاتا رہا اور ساہت پرچے ''رنجیت نگارا'' کا ایڈیٹر بھی رہا۔ گھر میں پنجابی کا خوب راج تھا۔ وہ سنسکرت، برج بھاشا اور پنجابی میں شاعری کرتا۔ امرتا پریتم ادبی ماحول میں پلی بڑھی اور 1933 میں اس نے گیانی کا امتحان پاس کیا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلی تھی مگر زندگی کے سمندر میں اسے کچھ انتہائی کڑوے گھونٹ بھی پینے پڑے۔ ابھی چار سال کی تھی کہ منگنی ہو گئی۔ یہ وہ عمر تھی کہ جب بچے کو زمانے کی اونچ نیچ کا بالکل پتہ نہیں ہوتا۔ ماں راج بی بی نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ رشتہ طے کیا وہ اپنا تجربہ نہیں دہرانا چاہتی تھی۔ امرتا پریتم کی ماں ضلع گجرات کے گاؤں مانگا کی رہائشی تھی اس کی شادی وٹے سٹے کی تھی، جس سے شادی ہوئی وہ فوج میں بھرتی ہو کر ایسا گیا کہ پھر وہاں واپس نہ آیا۔ راجن بی بی گوجرانوالہ میں اپنے بھائی کے گھر چلی گئی وہاں اس نے سکول ٹیچنگ بھی کی۔ ایک دن دیال سنگھ کے ڈیرے پر گئی وہاں دیالو جی کے بیٹے نند جی نے راجن بی بی کو اپنا دل جانی

بنالیا۔ دیال جی نے دونوں کا ملاپ کروادیا۔ نند جی نے اپنا نام کرتار سنگھ اور تخلص پپوکھر رکھ لیا۔ دس سال کے بعد اللہ نے ایک بیٹی عطا کی جس کا نام پپوکھ کا ترجمہ کر کے امرت کور اور بعد میں امرتا کر دیا۔ جب ماں مرگئی تو باپ بھی تارک الدنیا ہوگیا۔ امرتا پریتم بغاوتوں کے دور میں پیدا ہوئی اس کے ضمیر میں ماحول اور ارد گرد کی آب و ہوا رچی بسی ہوئی تھی۔

امرتا پریتم نے اپنی زندگی میں پہلی بغاوت تب کی جب ابھی گیارہ سال کی تھی تب ماں کی مرگ کے بعد گھر میں نانی کا طوطی بولتا تھا۔ جب ابھی ماں حیات تھی تب گھر کے کچن میں تین گلاس الماری میں الگ تھلگ رکھے ہوئے تھے یہ باقی برتنوں سے الگ رکھے ہوئے گلاس تب الماری میں سے نکالے جاتے تھے جب باپو جی کے کچھ مسلمان دوست ان کو ملنے کے لیے گھر آتے تھے ان کو لسی یا شربت پلانا ہوتا تھا۔ جب دوست چلے جاتے پھر یہ برتن اگلے مسلمان لوگوں کے انتظار تک الماری میں سے جھانکتے رہتے۔ امرتا نے بغاوت کی کہ اگر ان گلاسوں میں ڈال کر دودھ نانی نہیں دے گی تو وہ دودھ نہیں پیئے گی۔ اس بات کا پتہ جب باپو جی کو لگا تو انہوں نے برتنوں کی تفریق کا قلع قمع کر دیا۔ نانی اس حقیقت سے غافل تھی کہ یہی بچی کل کو ان گلاسوں میں شربت پینے والوں کے سپوت سے عشق کرے گی۔ امرتا پریتم نے باپ کی شاعری پڑھتے پڑھتے خود بھی شاعری لکھنا شروع کر دی اور ساتھ ساتھ قافیہ ردیف کی درستگی کے لیے اصلاح بھی لیتی رہی۔ ذات پات کی تمیز عروج پر تھی جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تو امرتا پریتم ابھی بچپنے کی دہلیز پر تھی۔ اس کے دیو چاچا کو سرکاری سکول سے اس لیے چھٹی کروادی گئی کہ وہ اپنے طالب علموں کو پھانسی کی واردات بتاتے ہوئے رو پڑا تھا۔

اولین ادوار میں امرتا پریتم کی شاعری کو شوقیہ سمجھتے ہوئے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ جب امرتا اپنی عمر کے 17 ویں سال میں داخل ہوئی تو یہ سال اس پر بہت بھاری تھا۔ یہی سال اس کی شادی کا سال تھا اور یہی وہ مبارک سال تھا جس میں اس کی کتاب ''امرت لہراں'' چھپ کر منظر عام پر آئی۔ باپ سنسکرت، برج بھاشا اور پنجابی میں شاعری کرتا تھا اسے ایک مارجن یہ بھی تھا کہ وہ ''رنجیت نگارا'' کا ایڈیٹر تھا اور رنجیت نگارا میں چھپنے والی تحریریں ہر جگہ پڑھی جاتی تھیں۔ باپ سے ہی امرتا نے گورمکھی سیکھی۔ 1933 میں امرتا پریتم نے گیانی کا امتحان پاس کیا۔

1936 میں وہ اپنے پتی کے ساتھ لاہور کا رخ کرتی ہے۔ 1930 سے لے کر 1940 تک لاہور شہر مذہب وملت سے آزاد شہر تھا۔ جہاں ہر رنگ نسل اور مذہب کے لوگ آزادی سے رہتے تھے۔ معاشرتی

ملن اور ہم آہنگی بھی عروج پر تھی۔ 1935 میں اس کی کتاب ''ٹھنڈیاں کرناں'' منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب اتنی سراہی گئی کہ امرتا کو اس نے شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

لاہور میں آ کر امرتا پریتم ایک بڑے ادبی حلقے کا حصہ بنی اور گُربخش سنگھ کے پنجابی رسالے ''پریت لڑی'' سے تعلق جوڑ لیا' امرتا ہر فن مولا خاتون تھیں' موسیقی اور رقص میں قدم رکھا تو باقاعدہ ٹریننگ لی اور آل انڈیا ریڈیو لاہور میں فوک گانے گا کر لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔

امرتا پریتم کی ازدواجی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ شادی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور یہ کاغذی بندھن کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔

امرتا محبت کو انسانیت کی معراج سمجھتی تھی' ساحر لدھیانوی کی محبت میں گرفتار ہوئی تو دل و جان سے اسے چاہنے لگی۔ امرتا سچے جذبوں کے ساتھ ساحر کے سحر میں گرفتار تھی۔ اس پاکیزہ محبت میں تاریخ دانوں کو وہی محبت کا دوام دکھائی دیتا ہے جو عشقیہ داستانوں اور لوک قصوں میں ہوتا ہے۔ ساحر تنہائی پسند اور امرتا روشن خیال تھی۔ اس نے عورت کی آزادی کا علم اٹھایا۔ ساحر سے محبت بھی کی تو ڈنکے کی چوٹ پر۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر 1946 میں امرتا نے ستار بھی بجایا اور ہر ماہ ریڈیو والے اسے ستار بجانے کے لیے بلا لیتے۔ اس نے 1946 تک آل انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن کے لیے نظمیں' گیت فیچر اور کہانیاں لکھیں۔ پاکستان بننے کے بعد انڈیا روانہ ہوئی پھر آل انڈیا ریڈیو کی لکھاری اور اناؤنسر بن گئی۔

امرتا پریتم سیکولر ذہن رکھنے والی اور مضبوط اعصاب کی عورت تھی مگر اس کے باوجود وہ ہندوستان میں ہمیشہ بائیں بازو کی تنظیموں اور مختلف گروہوں اور مختلف رائٹرز کی تنقید کا نشانہ بنتی تھی۔ اپنی موت سے تقریباً بیس بائیس سال قبل ہی اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ اس نے بیشتر وحدت الوجود' مذہب' تعویز گنڈوں اور ہندو کہانیوں سے جڑی ہوئی تحریریں لکھیں۔ وہ خواب' اس کی حقیقت' رُوحانیت' ربی وجود کو بہت ماننے والی تھی۔ امرتا کی فکر پر رابعہ بصری اور منصور حلاج کی سوچ کے اثرات تھے۔ اس کے علاوہ وہ اوشو (رجنیش) کی کتابوں اور فلسفے سے بڑا قریبی تعلق رکھتی تھی۔ وہ کہا کرتی کہ اگر تمہیں گوتم بدھ کو سمجھنا ہو تو پہلے اوشو (راجنیش) کو پڑھنا لازم ہے۔ بہت سے پاکستانیوں پنجابی ادیبوں کی تحریروں اور شاعروں کی تخلیقات کو ہندی اور گرمکھی میں ترجمہ کرایا۔ اس نے ''ناگ منی'' پرچہ بیس بائیس سال ایڈٹ کیا۔ اور جب سے امروز کے اسکیچز اس میں چھپنے لگے تو وہ پاکستان' ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں بھی مشہور ہوا۔ انڈو پاک کے رشتوں میں کئی بار تناؤ

آیا۔ سرحد کے دونوں جانب بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لیے محترم رویہ رکھتی تھی۔ دونوں ممالک کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی رشتوں کے تقدس پر خوشی کا اظہار کرتی۔ پاکستان سے جو جتھے بھارت (دہلی) جاتے چاہے وہ کسی زبان سے بھی تعلق رکھتے ہوں امرتا پریتم سے ملاقات کرنا اپنی خوش بختی سمجھتے تھے۔ اس کے حلقہء احباب میں سے ساحر لدھیانوی' راجندر سنگھ بیدی' دیوندر ستیارتھی' کرشن چندر' عصمت چغتائی' افضل توصیف وغیرہ تھے۔ اس کے دولت کدے میں شاہ حسین' بلھے شاہ' وارث شاہ' بابا فرید' رابندر ناتھ ٹیگور' ساحر' فیض احمد فیض' احمد راہی وغیرہ کی تصاویر لگی ہوئی تھیں جو کہ امروز کی کاوش تھی' بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا کمرہ بلھے شاہ اور سلطان باہو کے مزارات کی چادروں سے بھی مزین تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں ان چادروں سے اٹھنے والی مہک میں صوفیا کا رنگ ہر طرف بکھرا محسوس ہوتا' اس کی کتب کی تعداد سینکڑوں تھی۔

وہ سچی اور کھری عورت تھی۔ ادب کی باریکیوں کو بنظر غائر پرکھنے کا فن جانتی تھی ایک مرتبہ کسی نے ان سے نظم اور نثر کی تفریق کا سوال پوچھا تو کہنے لگی کہ بظاہر نظم اور نثر میں تو کوئی خاص تفریق دکھائی نہیں دیتی مگر شاعری جمی ہوئی برف کے ٹکڑوں کی مانند ہوتی ہے جو ایک ہی نقطے پر کھڑی رہتی ہے جبکہ پگھلی ہوئی برف کو ہم نثر کہیں گے جسے اپنے پھیلاؤ کے لیے بڑے کینوس کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری کو اکٹھا دیکھنا ہو تو اس کو ایک لفظ میں سمیٹ سکتے ہیں جبکہ نظم کو بہت زیادہ پھیلاؤ چاہیے۔

امرتا پریتم نے بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ وہ چھوٹی عمر میں ڈائری بھی لکھا کرتی تھی اور ڈائری لکھ کر چھپا دیا کرتی تھی۔ جب اسے کسی کے دیکھ لینے کا ڈر ہوتا تھا تب وہ اسے تالے میں بند کر کے رکھ دیا کرتی اور وہ بھی الماری کے اندرونی دراز میں تاکہ اگر کوئی تالا کھول کر دیکھ بھی لے تب بھی اسے ڈائری دکھائی نہ دے جب حد سے زیادہ الماری پر قفل گری کی گئی تو الماری دوسروں کی نظروں میں آ گئی پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔۔۔ قفل کھولا گیا۔۔۔ ڈائری پڑھی گئی۔۔۔ پھر ڈائری کے کینوس پر بکھرے ہوئے کئی حصوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی۔۔۔ امرتا نے غصے میں آ کر ڈائری تار تار کر دی اور پھر کبھی ڈائری نہ لکھی۔ کچھ عرصہ بعد یہ پاگل پن برا لگا۔ خود پر غصہ کھا کر پھر سے ڈائری لکھنا شروع کر دی۔۔۔ ڈائری لکھی گئی اور پھر چوری ہو گئی پھر یوں ہوا کہ امرتا نے ڈائری کی بجائے شاعری اور گیت منظر عام پر لانا شروع کر دیئے اس کی شاعری کا جادو اس کے گیتوں اور نظموں میں اور اس کا احساس افسانوں کی زینت بنا۔ اس کی تحریروں اور شاعری میں تڑپ' کرب' کسک' نغمگی' رنگینی' مٹھاس' پیار اور شیرینی یک مشت موجود ہیں اور یہ

سب صفات اس کے من کی سچائی کی توسط سے ہیں۔ وہ ہمارے کئی قد کاٹھ والے مصنفین کی طرح چوری چھپے سگریٹ نوشی نہیں کرتی تھی۔ اس کی تحریر ہی اس کی اصل اولاد تھیں۔ اس نے ایک لاوارث بچے کو پالا۔ جس زمانے میں امرتا پریتم کے ہم عصر اور کالج کے دوست' پروفیسر' سرکاری آفیسر ڈائریکٹر اور جج وغیرہ بنے بیٹھے تھے۔ انہی دِنوں لوگوں نے امرتا پریتم کو تپتی دھوپ میں بسوں کا انتظار کرتے ہوئے سڑک کنارے دیکھا۔ اس زندگی کے دُکھ' غم اور رشک رواں یوں تو شاعری میں جگہ جگہ ملتے ہیں اسی طرح کی ایک زیر نظم میں اس نے سچ کا دروازہ کھولا ہے

میں تیری سیج تے جد پیر دھریا سی
میں اک نہیں ساں ۔۔۔۔۔ دو ساں
اک سالم ویاہی تے اک سالم کاری
سو تیرے بھوگ دی خاطر
میں اوس کنواری نوں ختم کرنا ای
میں قتل کیتا سی
ایہہ قتل جو قانونا جائز ہندے ہن
صرف اوہناں دی ذلت ناجائز ہندی ہے
تے میں اوس ذلت داز ہر پیتا سی
تے فیر پربھات ویلے
اک لہو وچ بھجے میں اپنے ہتھ ویکھے سن
ہتھ دھوتے سن
بالکل اوس طرحاں
جیوں ہی میں شیشے ساہمنے ہوئی
اوہ ساہمنے کھلوتی سی
اوہی' جو اپنی جاچے
میں راتیں قتل کیتی سی

اوہ خدایا

کیہہ سچ دا ہنیرا بہت گاڑھا سی؟

میں کنھوں قتل کرنا سی

تے کنھوں قتل کر بیٹھی۔۔۔(کماری)

بات صرف عام دکھوں پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ عورت ہونے کے ناطے اس معاشرے میں عورت ذات پر ہونے والے ظلم و بربریت کے خلاف بھی آوازِ حق بلند کی۔ وہ نام نہاد بندشوں کے خلاف بھی مزاحمت کرتی رہی۔ کہتی ہے:۔

اج میں اپنے گھر دا نمبر مٹایا ہے

تے گلی دے متھے لگا گلی دا ناؤں ہٹیا ہے

تے ہر سڑک دی دشاواں ناؤں پونجھ دیتا ہے

پر جے تسیں مینوں ضرور لبھنا ہے

تاں ہر دیش دے، ہر شہر دے، ہر گلی دا بوہا ٹھکورو

ایہہ اک سراپ ہے اک ور ہے

تے جتھے وی سُتنتر رُوح دی جھلک پوے

سمجھنا اوہ میرا گھر ہے (میرا پتا)

وہ بہادر، بے باک، باکردار اور باغیانہ کردار کی مالک تھی۔ اگرچہ وہ اپنی تحریروں میں ڈیموکریسی، پراگ اور ڈکٹیٹر شپ اور اس طرح کے موضوعات کا تذکرہ کرتی رہے مگر اس سب کے باوجود اس کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ وہ ایک عورت ہے اور زندگی کو زندگی سے جوڑنے والی عورت ساری عمر خود ٹوٹتی رہی۔ اس کی ساری شاعری انسانیت کی شاعری تھی مگر ساری شاعری میں یوں لگتا ہے کہ عورت کے لیے، عورت نام ہے محبت کا، گویا اس کی ساری شاعری محبت کے نام تھی

اک کولی ڈھپ دی

میں ڈیک لا کے پی لواں

تے اج ٹوٹا ڈھپ دا

میں ککھ دے وچ پا پواں (سیال)

کدے کدے میں اُٹھ۔۔۔سوچاں۔۔۔

ککھ دی لال ندی نوں پاڑاں

اپنا دستخط آپ چھپاواں

اس قرضے توں مکر جانواں (اک گھٹناء)

وہ سماج کی اینٹوں کو ترتیب سے جوڑ کر ایک خوبصورت عمارت بنانے میں لگی رہی

سامراج اک ٹاواں شاہی بوٹا

ہر آدم دی ذات خلل دے وانگ اُگی

حاکم دا حکم اونا ہے

اوہ جناوی کر لوے

تے پر جادی پیڑ اونی ہے

اوہ جنی وی جر لوے (دیکھ کبیرا رویا)

وہ سماج کا دکھ ذاتی سمجھتی تھی۔نجی حادثے تو ثانوی حیثیت رکھتے تھے اس کی نظر میں جو روز نجانے اس کی ذات پر کتنے وارد ہوتے مگر بیرونی حادثے ہی دراصل اس کے حواس پر طاری تھے سب سے بڑا سانحہ ملکی تقسیم کا سانحہ تھا۔ جہاں انسانی لہو سے سرسبز و شاداب سرزمین رنگین ہو رہی تھی وہاں امرتا کا قلم بھی اسی خون کے آنسو رو رہا تھا اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کی پوروں میں پکڑا قلم دکھ کے گھونٹ پی کر لفظ اوراق پر اتارتا رہا۔ایک نظم ''اک گرجے دی موم بتی'' لکھتی ہے

اک گرجے دی موم بتی

روز چھاتی دی اگ نوں، پیراں وچ بال کے میں

گرجے توں باہر جاندی ہاں،

تے جگدیاں بجھدیاں اکھاں چوں گزر کے، میں

اکھراں دے حسن تک پہنچ جاندی ہاں

پر اکھراں دے حسن۔۔۔کاغذ دی اجازت

جد کے کاغذ چوں باہر آوندا اے' دھرتی بدن چھوہندا اے

تاں دھرتی دے لہو وچ بھجدا اے۔۔۔۔

او میرے اج دے مسیحا توں نہیں لبھدا کتے

تے میں ٹمٹماندی جہی' صرف گولیاں تے

بندوقاں دی آواز سُندی

اوس گرجے وچ پرت آوندی ہاں جو حالے

دی کسے دیس وچ نہیں بنیا۔۔۔۔

امرتا پریتم آج کے دور میں پیار محبت اور دوستی کی ایک عمدہ مثال تھی۔ ذات باری تعالیٰ نے جہاں اسے عزت' دولت' شہرت اور فکری آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا۔ وہاں وہ اتنی ہی عاجز اور دوسروں کا خیال رکھنے والی تھی۔ اگرچہ وہ پارلیمنٹ کی ممبر تک بھی رہی وہ چاہتی تو اپنے گھر میں پارلیمنٹیرین کی طرح نوکروں کی قطاریں لگا سکتی تھی مگر شائستگی اور قرینے سے گزر بسر کرنے والی امرتا نے اپنے گھر میں ایک بھی نوکر نہ رکھا اپنے سارے کام بلکہ امروز جو اس کا پرانا ساتھی اور عمر کے آخری دنوں تک کا دوست تھا' کے ساتھ کام کرنا خود پسند کرتی تھی۔ وہ مشرقی پنجاب میں تھی مگر اس کا خوبصورت دل مغربی پنجاب میں دھڑکتا تھا۔ مغربی پنجاب سے جانے والے احباب اور جوئیندگان علم کو مل کر وارث' بلھے' شاہ حسین' سلطان باہو اور خواجہ فرید کی دھرتی اور رہائشیوں کا حال پوچھتی اور باتیں کرتے کرتے سرحد کراس کر کے پاکستان کی دھرتی میں آ بستی۔ سب دکھ سکھ اپنی آنکھوں میں بھر لیتی۔ اگر ماں دھرتی سے محبت کا گُر کسی نے سیکھا ہو تو اس عظیم ہستی سے سیکھے جس کا نام امرتا پریتم ہے۔ اس کی ہر تحریر لوگوں کے دلوں کی دھڑکن ہوتی' وہ لفظ صفحہ قرطاس پر انڈیلتی تو وہ موتیوں کے ہار بنتے جاتے وہ تصنع بناوٹ کو قریب نہ پھٹکنے دیتی۔ اس کی ڈکشن انتہائی رسیلی تھی۔ امرتا پریتم پنجاب سرزمین کا وہ لیجنڈ ہے جسے پنجاب دیش بھی بھلا نہیں پائے گا۔

امرتا کے دور اور تحریر میں اس وقت نکھار پیدا ہوا جب پارٹیشن کے وقت اس نے اپنی آنکھوں سے ظلم کی ہولی دیکھی۔ انصاف مانگتے ہوئے چہرے' لاہور سے دہلی جاتی ہوئی ٹرین میں یہ منظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کانوں میں چیخ و پکار اور باہر کا سناٹا وقت کی کالی تاریخ کی مانند لگ رہا تھا۔ گاڑی کی کانوں میں شاں شاں کرتی ہوئی آواز شائد امرتا کے دور کو لپیٹ رہی تھی۔ گاڑی کے پیچھے بھاگتے ہوئے شجر سانپ

بھیڑیے محسوس ہو رہے تھے۔ اسی حزن میں اس نے ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' لکھی۔ وہ سوچتی رہی کہ وارث شاہ کتنا عظیم ہے جس نے ہیرو کے دکھ کو گیت سنگیت کا رنگ دیا۔ امرتا کو بھی اپنا دکھ شیئر کرنے کے لیے وارث شاہ ہی دردی اور ہمدرد انسان لگا۔ چند دنوں میں یہ نظم جنگل میں آگ کی طرح پہنچتے پہنچتے پاکستان بھی آ گئی جس کو فیض احمد فیض نے اپنے 'دیباچے' میں بھی شامل کیا۔ جہاں امرتا پریتم کی اس نظم کو بہت سراہا گیا وہاں اس بے چاری کو اس کے عوض بہت دُکھ بھی ملے۔ خاص طور پر کئی سکھوں نے اسے مذہبی خانے میں رکھ کر تولا اور کہا کہ امرتا کو وارث شاہ کی بجائے گرونانک نظر کیوں نہ آیا اور اس نے وارث کو پکارنے کی بجائے گرو جی نانک سے التجا کیوں نہ کی۔ سارے سکھ بھائیوں نے مخالفت نہیں کی بس انتہا پسند سکھ گروہ کی طرف سے ہی یہ ردِعمل سامنے آیا جو ویسے بھی امرتا کی شاعری کو پورنوگرافی کہتا ہے۔ انتہا پسند سکھوں کے ساتھ کمیونسٹوں کی مخالفتوں کا بھی امرتا کو سامنا کرنا پڑا۔ کمیونسٹوں کا موقف تھا کہ امرتا کو وارث کی بجائے لینن اور سٹالن دکھائی کیوں نہیں دیئے۔ اس نظم کے ردِعمل پر بہت سے تنگ نظر شاعروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ خداداد صلاحیتوں سے مالا مال امرتا پریتم نے صرف اکیس (21) برس کی عمر میں پنجر ناول تحریر کر کے اپنے ساحر سے عشق اور استقلال کی دھومیں مچا دیں۔ بے اختیاری میں لکھے ہوئے لفظوں کے پھولوں سے میڈیا نے بھی خوشبو چرائی اور ہر جگہ اس کی مہک پھیل گئی۔ بات صرف یہیں تک نہیں تھی امرتا کی ساحر کے لیے لکھی گئی وہ نظم ''تیریاں یاداں بہت دیر ہوئی جلاوطن ہوئیاں'' بھی امر ہو گئی۔

امرتا کی ساحر کے بارے میں نظموں کی ایک کتاب "Sunehra" (سنیہڑے) ہے جو 1955 میں شائع ہوئی۔ امرتا نے پنجابی لٹریچر کو پہلی بار Jnanpith Award اپنی نظموں کے مجموعے کاغذ تے کینوس کی وجہ سے دلوایا۔ اس کے بعد یہ ایوارڈ نرمل ورما اور معروف ناول نگار گردیال سنگھ کو مجموعی طور پر ملا تھا۔ امرتا کو انعام ملنے کے بعد پوچھا گیا کہ کیا وہ اس ایوارڈ پر خوش ہے تو اس نے ایک مصرع پڑھ کر اپنا جواب مکمل کیا کہ

''مان سچے عشق دا اے، ہنر دا دعویٰ نہیں''

امرتا جہاں عزت، شہرت، دولت اور محبتیں سمیٹتی رہی وہاں ایوارڈز بھی چل چل کر اس کی جھولی میں آتے گئے اسے Cyriland Methodious Award بلغاریہ سے ملا اور اس کے علاوہ Ordre des Arts Las Letters فرانس سے دیا گیا۔ دہلی گورنمنٹ نے بھی اسے ملینیم کی شاعرہ کے خطاب سے نوازا اور پھر اسی خطاب کو پنجاب اکیڈمی لاہور، پاکستان نے اسے عطا کیا۔ پاکستانی پنجابی لکھاریوں کے اس خطاب پر وہ

انتہائی خوش تھی جس میں لکھا ہوا تھا کہ

"You are the true daughter of Waris Shah and the waris of our Waris"

1976 میں 'رسیدی ٹکٹ' پہلی بار شائع ہوئی۔ سچ اور حقیقتوں پر مبنی اس تحریر میں وہ تمام اجزاء شامل ہیں جو اسے Dom Morees کی سوانح حیات My sons Father کے برابر لاکھڑا کرتی ہے۔ یہی وہ تحریر تھی جسے Stephen Spender نے کلاسیک کا درجہ دیا۔ امرتا پریتم نے Revenue Stamp کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا نام 'رسیدی ٹکٹ' رکھا۔۔

امرتا نے اپنی والہانہ محبت کے مہیب صدمے سہے نہ صرف خود امر ہوئی بلکہ اپنے ساحر کو بھی امر کر گئی۔ امرتا پریتم کے لکھنے لکھانے کا عمل تقریباً ستر بہتر سال تک جاری رہا وہ 83 سال کے دھانے پر ایک دن اپنے گھر میں گرنے سے چوٹ کھا گئی یہیں سے اس کی ادبی مصروفیات کا اختتام ہونا شروع ہو گیا۔ دیوالی کی سہ پہر کو 31 / اکتوبر 2005 کو وہ مشرقی و مغربی پنجاب کے محبت کرنے والے پنجابیوں کو تنہا روتا دھوتا چھوڑ گئی اسی خزاں رسیدہ شام میں پنجاب ادب پر خزاں مسکراتی رہی۔ اور پنجابیوں کے دل پر ''چُپ'' کے قفل پڑ گئے۔ جیسا کہ محبت کی دیوی اپنی نظم میں کہتی ہے

من دی ایس گھڑونجی اُتے
سوچاں والی گاگر خالی
چپ میری تریہائی بیٹھی
ہوٹھاں اتے جیبھ پھیر دی
دو حرفاں دا پانی لبھے ۔۔۔۔
عشق میرے نے کھوہ کٹھایا
ویہنوں جیس طرح کیہیاں وجن
راتاں جیکر کئی گنیتیاں
ورہے جیس طرح پتھر لٹے
پانی اجے کتے نہ لبھے ۔۔۔۔
من دی ایس گھڑونجی اتے

گاگر بیٹھی موڈھی ہو کے

سبھ کجھ تکے' بول نہ سکے

جیبھ کسے طرح مڑی اکڑی

ہوٹھ کس طرح چپ کھڑے۔۔۔

سبھناں ولوں مونہہ موڑ کے

اک بنے اکوسا بیٹھا

کلا کھوہ جگالی کردا

مٹی چتھے' پتھر چبے۔۔۔۔۔

امرتا محبتوں کو صرف لازوال احساس سمجھتی ہی نہیں اپنے کردار سے جتاتی بھی ہے اور اسی محبت کے رشتے کو اپنی نظم ''رشتے'' میں یوں پرو دیتی ہے۔۔۔۔

باپ' ویر' دوست تے خاوند

کسے لفظ دا کوئی نہیں رشتا

انج جدوں میں تینوں تکیا

سارے اکھر گوڑھے ہوگئے

وہ اس مذہب سے تعلق رکھنے والی ہستی تھی جس کا پہلا سبق مخلوقِ خدا کو خوش رکھنا ہوتا ہے بندے کا دکھ وہ نہیں دیکھ سکتی بات یہیں تک نہیں رہ جاتی جس مٹی سے وہ جڑا ہوتا ہے وہ اس مٹی کو بھی مقدس مان کر پوجتی ہے اس پر آنچ آنے سے پہلے ہی اسے فکر لاحق ہوتی ہے وہ شعوری طور پر کوئی پیشین گوئی نہیں کرتی بلکہ پیشین گوئی اس سے سرزد ہو جاتی ہے۔ اپنی نظم ''رب خیر کرے'' میں کہتی ہے

رب خیر کرے میرے ویڑھے دی

کہ جس تھاں رانجھن ڈیرا کیتا

او تھے دھمک سنیندی کھیڑے دی۔۔۔

اج چارے کندھاں دین دھائیاں

کہ اج ملکی دی بکی وچوں

دودھ دیاں بونداں کہینے چرائیاں نیں۔۔۔

رب خیر کرے میرے ویڑھے دی۔۔۔

اج بیلے دیاں مجھیں روئیاں

کہ اج ایس میری دوہنی دے وچ

کس نے لہو دیاں دھاراں چوئیاں

رب خیر کرے میرے ویڑھے دی۔۔۔

اج ہراک بستہ پچھن آیا

کہ اج میرے مدرسے وچوں

سدا اکھر کہینے چھپایا

رب خیر کرے میرے ویڑھے دی۔۔۔

مار دھاڑ، قتل و غارت، آپا دھاپی اور حقوق کی کھینچا تانی کے دور میں پروان چڑھنے والی نرم نازک اور حساس پرسنیلیٹی اگر چہ ماحول پر سڑتی کڑھتی رہی مگر گھپ اندھیروں میں روشنی کی کرن دیکھنے والی مکمل طور پر تاریکیوں سے مایوس نہ ہوئی بلکہ جینے کے لیے حبس زدہ معاشرے میں نئی راہیں اور نئے موسم تلاشنے کا عزم کرتی ہے اپنی نظم ''نویں رت'' میں کہتی ہے۔۔۔۔

ڈور پیا کوئی گاوے

دھوئیں نال دھوانکھی دھرتی

کولے چانن دا اک پوچا

کون پیا کوئی گاوے

ڈور پیا کوئی گاوے

علم وادب کے میدان میں اس نے مندرجہ ذیل کامیابیاں سمیٹ کر نہ صرف شہرت کمائی بلکہ پنجابی ادب کا دامن بھی رنگا رنگ تحریروں اور اصناف سے بھرگئی۔

☆ 1956 میں ساہت اکیڈمی ایوارڈ حاصل کیا

☆ 1966 سے لے کر 2002 تک ناگ منی رسالہ نکالتی رہی

☆ 1969 میں پدم شری ایوارڈ لیا

☆ 1973 میں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری لی

☆ 1979 میں واپت سارو ایوارڈ حاصل کیا

☆ 1983 میں بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ حاصل کیا

☆ 1983 میں ہی جودھ پور یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی

☆ 1983 میں وشنو بھارتی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری حاصل کی

☆ 1986 میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری لی

☆ 1987 میں حکومت فرانس کی طرف سے ڈگری لی

☆ 1989 میں ایس این ڈی ٹی بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے بھی اعزازی ڈگری حاصل کی

☆ 1990 میں پنجابی اکادمی کی طرف سے وارث شاہ ایوارڈ حاصل کیا

اس کے علاوہ بہت سے اعزازات اور ایوارڈ اور انعامات حاصل کیے

☆☆☆☆

شبنم شکیل

امرتا پریتم کی زندگی کے رَس میں ڈوبی ہوئی باتیں

پچھتر کتابوں کی مصنف وہ جینئس عورت کہ جس کے ہاں تخلیقی اظہار کے وفور کی ایسی شدت ہے کہ کم کم دیکھنے میں آتی ہے جس کی نثر اور شاعری آپس میں اس طرح گھل مل گئی ہیں جیسے پانی میں رنگ۔ جو حرف کی عظمت کی اتنی قائل ہے کہ لفظوں کو سچے موتیوں کا درجہ دیتی ہے۔ ایسی شاندار خاتون سے ملنے کی تمنا عرصہ دراز سے دل میں تھی۔ آخر کار میری یہ تمنا پوری ہوئی اور بہت خوبصورت انداز میں ہوئی۔ وہ یوں کہ 1989 میں Tourism کے حوالے سے پاکستان سے ایک وفد سید یوسف رضا گیلانی صاحب کی قیادت میں کہ جو اس وقت ٹورازم کے وزیر تھے انڈیا کے ایک Festival میں شرکت کے لیے دہلی گیا۔ شکیل ایڈیشنل سیکرٹری ٹورازم تھے۔ چنانچہ مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ دہلی میں پہلی رات وہاں کے ٹورازم والوں نے تاج محل ہوٹل میں بہت ہی خوبصورت ثقافتی پروگرام کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد کھانا تھا۔ کھانے پر دہلی کے بہت سے معززین کو مدعو کیا گیا تھا۔ جس میں شاعر وادیب' موسیقار' ڈانسرز لڑکیاں' لڑکے' وزراء' امراء اور بیوروکریٹس سب شامل تھے۔ غرض یہ کہ ایک رنگ و بو کا طوفان تھا کہ جو کسی خواب کا منظر لگ رہا تھا مگر آپ سے کیا کہوں میری سوئی تو ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''ذہن بار بار یاد دلاتا مجھے امرتا جی کا پتا کرنا ہے'' اچانک اپنی پلیٹ پکڑے ہوئے کنور مہندر سنگھ میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ نور جہاں ثروت نے میرا اُن سے تعارف کرایا میں نے تھوڑی سی گفتگو کے بعد ہی اپنی بے تابی کا اظہار کر دیا۔ وہ بہت ہنسے۔ بولے'' لے اینی جئی گل سی۔ میں تاں امرتا دا جیٹھ آں۔ میں فون کراں گا اوہنوں' کل 11 بجے جا کے مل لے توں۔'' پھر میرے بشاش چہرے کو دیکھ کر اور بھی ہنسے۔ مجھے تمام پتا وغیرہ سمجھایا۔ دوسرے دن گیارہ بجے جب میں امرتا پریتم سے ملنے کے لیے 25' حوض خاص دہلی والی چٹ مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ کر ان کے گھر کی طرف رواں تھی تو ظاہر ہے میرے ذہن نے ان کا ایک پیکر پہلے سے تراش رکھا تھا۔ یہ پیکر ان کی شاعری' افسانے اور سوانح عمری پڑھ کر اور ان کے مداحوں سے ان کی باتیں سن کر

خود بخود بن گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں آج ایک ایسی خوبصورت خاتون سے ملنے جا رہی ہوں جس کا ظاہر اور باطن ایک سا ہے۔ جو لوگوں کے دل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس کا دل انسان دوستی کے جذبے سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ جو جسمانی طور پر کمزور اور نازک سہی لیکن ذہنی طور پر ایک ایسے مضبوط قلعے کی مانند ہے کہ جسے طاقت کے زور پر فتح کرنا تقریباً ناممکن ہے جو ایک طرف معاشرے کی فرسودہ روایات سے باغی ہو کر زندگی گزارنے کا ڈھنگ جانتی ہے اور تن تنہا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہے اور دوسری طرف تتلیوں کے پروں جیسا نرم و نازک دل رکھنے والی ہے کہ جو مذہب کے نام پر کشت و خون ہوتا دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہے اور بے اختیار کہہ اُٹھتی ہے۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

اُٹھ درد منداں دیا دردیا اُٹھ دیکھ اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب

اک روئی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے بین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

اج سارے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اج کتھوں لیایئے لبھ کے وارث شاہ اِک ہور

جب عشق کی بات کرتی ہے تو ایک صوفی کی طرح کہتی ہے

''سپنے جیکن کئی بھٹیاں
ہر ایک بھٹی اگ جھوکدا میرا عشق مجوری کردا''

گاڑی دہلی کے ایک نسبتاً خاموش علاقے میں ایک کوٹھی کے آگے آ کر رکی اور سبز بیلوں سے لدی ہوئی دیواروں نے مجھے اپنی زبان میں خوش آمدید کہا۔ میں نے کال بیل کی۔ ایک چھوٹی بچی نے دروازہ کھولا اور

مجھے گھر کی اوپر کی منزل پر لے گئی۔سادہ سا ڈرائنگ روم جس سے نفاست جھلک رہی تھی میرے سامنے تھے۔ مجھے ایک لمحہ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔دبلی پتلی نازک سی امرتا جی سوتی شلوار قمیص میں ملبوس میرے سامنے کھڑی تھیں۔انتہائی شفیق چہرہ' جیسے ماں کا چہرہ ہو۔میں نے اپنا تعارف کروایا۔اپنا پہلا مجموعہ جو دو برس پہلے شائع ہوا تھا ان کی نذر کیا ساتھ ہی کہا میں انڈیا فقط آپ سے ملنے آئی ہوں۔

وہ ذرا مسکرائیں بولیں۔''پاکستان کے لوگ بھی مجھے بہت پیار کرتے ہیں اور یہ بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔دیکھو نا ابھی کراچی سے نزہت صدیقی ملنے آئی تھی' فخر زمان بھی آئے ہوئے تھے' میرے ہاں ہی ٹھہرے۔تم لوگوں کی وجہ سے وہاں کی کتابیں پڑھ لیتی ہوں۔اچھا بتاؤ کیا تم بھی کراچی کی رہنے والی ہو۔ ''جی نہیں میں ''لاہورن'' ہوں''۔''تو اب تک اردو کیوں بول رہی تھیں''۔انہوں نے پنجابی میں سوال کیا۔ میں چپ رہی۔ ''اچھا یہ بتاؤ کیا پنجابی میں لکھتی بھی ہو؟''۔''کبھی کبھی۔مگر بہت مشکل لگتا ہے۔دراصل شروع سے گھر میں تمام رسالے اور کتابیں اُردو کی ہی آتی تھیں۔وہ پڑھتی تھی۔بس اس طرح۔۔۔۔''مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔وہ ایک دم سنجیدہ لہجے میں بولیں۔''اپنی مادری زبان سے بس بولنے کی حد تک دوستی ہے ہماری۔اب یہاں دیکھو۔انڈیا میں ہندی کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔سب سکولوں میں لازمی قرار دے دی گئی ہے۔اس زبان کی نشوونما کے لیے ہر قسم کی شعوری کوشش ہو رہی ہے حکومتی سطح پر۔مگر پنجابی جو یہاں لاکھوں کی زبان ہے اس کے لیے کچھ نہیں ہو رہا۔مجھے افسوس ہوتا ہے انہی باتوں پر۔اچھا یہ بتاؤ کبھی مظہر الاسلام سے باتیں ہوئیں اس موضوع پر۔کیا کہتا ہے وہ؟ پکا پنجابی ہے۔بہت پیارا انسان ہے۔کیسی خوبصورت کہانیاں لکھتا ہے۔منشا یاد کی کہانیاں بھی میں شوق سے پڑھتی ہوں۔کتنا خلوص ہے اس کی تحریروں میں ہاں احمد داؤد بھی اچھا لکھنے والوں میں ہے۔سب کو میرا پیار دینا۔مظہر سے کہنا کبھی آ کر مجھے ملے''۔''جی ضرور کہہ دوں گی'' میں نے جواب دیا۔(واپس آ کر میں نے مظہر کو ان کا پیغام دیا تھا۔اس نے کہا''شبنم یہ ایک عجیب بات ہے کہ میں بھی امرتا جی کو بطور انسان اور بطور شاعرہ ادیبہ بہت پسند کرتا ہوں۔لیکن آج تک ہم دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی''۔

میں نے اسلام آباد کے ایک دو ادیبوں کا نام لیا اور پوچھا آپ نے انہیں پڑھا؟ خالدہ حسین کا نام خاص طور پر اس وقت ذہن میں آ رہا ہے۔بولیں''کتابیں نہیں ملتیں بس کوئی بھیج دے یا جب کوئی ملنے آئے تو درشن ہو جاتے ہیں وہاں کی کتابوں کے''۔پھر کہا''تم مجھے وہاں سے کتابیں بھجوا دو۔تمہارے لیے آسان

ہوگا کیونکہ ٹورازم کے سلسلے میں سرکاری لوگ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں''۔ میں نے وعدہ کیا اور کسی حد تک نبھایا بھی۔ ''شبنم ویسے کتابوں پر یاد آیا کہ میری سب کتابیں پاکستان میں بغیر میری اجازت کے چھپ رہی ہیں۔ بغیر مجھے دکھائے ہوئے۔ کتنی غلط بات ہے۔ جب وہاں کی چھپی ہوئی اپنی اتنی کتابیں دیکھتی ہوں تو ایک طرف تو خوشی ہوتی ہے کہ وہاں بھی لوگ مجھے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ دوسری طرف بہت رنج ہوتا ہے۔ ان میں سے کتنی چیزیں خواہ مخواہ کاٹ دی گئیں ہیں۔ کئی جگہ تو عبارت بالکل بے ربط ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر میری نظموں کا غلط ملط ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس طرح تو سارا مفہوم ہی ختم ہو جاتا ہے نظم کا۔ کچھ ہونا چاہیے نا اس سلسلے میں؟'' ان کے لہجے میں دُکھ تھا۔ ''امرتا جی'' میں نے کہا۔ ''پاکستانی مصنفوں کی کتابیں بھی انڈیا میں بغیر اجازت کے چھپتی ہیں اور یہی حال ان کا بھی کیا جا رہا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم مگر کہاں رہ گیا وہ کاپی رائٹ ایکٹ۔ جو کسی کا دل چاہے چھاپ لے۔ نہ مصنف کی اجازت نہ پیسہ نہ دھیلا۔ خیر اتنا کرو۔ میری جو کتاب تمہیں وہاں نظر آئے مجھے فوراً بھیجو۔ کہیں راستے میں ہی تو نہیں رہ جائیں گی۔ کتابوں کا تبادلہ بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے'' انہوں نے دو تین مرتبہ دہرایا۔

''آج کل کیا لکھ رہی ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''خواب جو انوکھے ہوتے ہیں ان پر ایک کتاب ''لال دھاگے کا رشتہ'' نام رکھا ہے اس کا۔ کتاب ایک جاپانی بدھسٹ فلاسفر کے نظریات پر ہے۔ جس نے کہا تھا کہ جس طرح بچے کا ماں سے رشتہ اٹوٹ ہے اسی طرح انسان لامکاں سے جڑا ہوا ہے۔

شبنم میں خود کئی مرتبہ ایسے خواب دیکھتی ہوں کہ جس میں میرے پچھلے جنم کا تجربہ نظر آتا ہے۔ خوابوں سے انسان کا کیا رشتہ ہے۔ بس یہی یہ کتاب بتائے گی۔ بہت دلچسپ چیز ہے۔ جیسے ہی لال دھاگے کا رشتہ وہاں شائع ہوئی میں نے فوراً ٹورازم والوں سے کہہ کر منگوالی واقعی بلاشبہ یہ ایک انوکھی کتاب ہے''۔

''امرتا جی اور کیا لکھ رہی ہیں؟''

''نظم اور نثر پر تحقیقی کام بھی کر رہی ہوں اگر درمیان میں اتنی بیمار نہ ہو جاتی تو کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔ مگر لال دھاگے کا رشتہ مجھے خود اپیل کر رہی ہے اس سے میری ذہنی تسکین ہوتی ہے''۔

''امرتا جی یہ بتائیں ادیب کی اپنی تسکین زیادہ اہم ہے یا قاری کی؟''

وہ بولیں۔ ''قاری اہم ہے۔ بہت اہم ہے۔ یہ ایک خوشگوار تجربہ ہے کہ اگر قاری کو آپ کی بات کا ابلاغ

ہو۔ مگر مصنف کی اپنی تسکین کو میں زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ دیکھو اگر ادیب محض قاری کے لیے لکھ رہا ہے تو دولت، شہرت، طاقت، سب کچھ ادیب کو ملتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ سب کچھ سنبھال نہ پائے تو خود اس کا بُت چکنا چور ہو جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنی ظاہری یا خارجی شبیہہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ میرا معاملہ دوسرا ہے میں اپنی باطنی شبیہہ کی قائل ہوں۔ کئی دفعہ اس باطنی یا اندرونی شبیہہ کے حوالے سے مجھ پر افسردگی طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اعلیٰ انسانی معیار پر پوری اترتی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر پھر میرے اندر سے ہی کوئی طاقت مجھے سنبھال لیتی ہے۔ یہ بحث ذرا لمبی ہو جائے گی۔ اور کوئی بات کرتے ہیں۔ کیوں؟'' انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: ''جی نہیں۔ مجھے اس بحث سے دلچسپی ہے۔ دراصل میں تو اسی سلسلے میں آپ سے دو تین سوال کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں ڈر رہی تھی کہ پتا نہیں آپ مجھے اتنا وقت دیں گی یا نہیں''۔ میں نے غور کیا کہ میرے اس جملے پر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی وہ بولیں: ''بات وقت کی نہیں ہے۔ میری صحت کی ہے۔ ابھی طبیعت پوری طرح بحال نہیں ہوئی۔ مگر تم ذرا اپنے سوال دکھاؤ''۔ میں نے پرس میں سے کاغذ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

''ارے یہ تو تمہاری اور میری دونوں کی مشکل حل ہو گئی۔ تمہیں پتا ہے ابھی ابھی سمترا چوہدری نے مجھ پر بہت خوبصورت مضمون لکھا ہے۔ وہ تقریباً میرا انٹرویو ہی سمجھو۔ اس میں تمہیں اپنے تینوں سوالوں کے جواب مل جائیں گے''۔ وہ اُٹھیں اور اندر جا کر بہت سے اخباروں اور رسالوں کے تراشے اُٹھا لائیں۔ ''سمترا کا مضمون، یہ سارا شگفتہ پر میرا مضمون ہے ہاں یہ منٹو پر ہے۔ اس کو ہری شرما نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اور بہت سے ہندی سکرپٹ میں میرے مضامین ہیں سب رکھ لو۔ سب رکھ لو''۔ میں نے جلدی سے سارا خزانہ سمیٹ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچانک وہ قہقہہ لگا کر ہنسیں اور بولیں ''ہندی سکرپٹ تم کیسے پڑھو گی؟ انہیں چھوڑ جاؤ''۔

''امرتا جی شکیل صاحب کی بڑی بہن شاہدہ حبیب پنجاب یونیورسٹی میں ہندی کی کلاسز لیتی ہیں۔ بڑی لائق فائق ہیں۔ وہ پڑھیں گی میں لکھ لوں گی''۔ وہ مطمئن ہو گئیں۔

امروز چائے لے کر آ گئے تھے۔ ''کس قدر خوش مزاج اور مہمان نواز انسان ہیں''۔ میں نے سوچا پھر ان کی خوش مزاجی کو دیکھتے ہوئے فوراً ایک فرمائش کی۔ میری ایک تصویر بنا دیں امرتا جی کے ساتھ۔ ''میں اتنا ایکسپرٹ نہیں ہوں اس معاملے میں اگر کوئی سر پیر نہ آیا تصویر میں تو مجھے الزام نہ دینا'' وہ ہنسے۔ بہر حال انہوں نے تین چار تصویریں بنا دیں۔

فون کی گھنٹی بجی۔ امرتا فون پر بات کرتے ہوئے بہت خوش لگ رہی تھیں۔ ''جانتی ہو کس کا فون تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ''نچلی منزل سے بچوں کا۔ میں اوپر کی منزل میں ہوتی ہوں۔ بچے نچلی میں۔ ویسے ہی فون کرتے رہتے ہیں''۔ وہ ہنسیں۔'' ہاں سنو۔ میں نے تمہیں جو ہندی سکرپٹ دیئے ہیں ان کا ترجمہ بہت اچھا کروانا۔ بہت کم اچھے تراجم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والے معیار برقرار نہیں رکھتے۔ ایسے ایسے ترجمے پڑھنے کو ملتے ہیں کہ بس کیا کہوں۔ جب تک Original کتاب سامنے نہ ہو۔ ترجمے کا سر پیر ہی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں سب آپ کو بھجواؤں گی۔''

''اچھا ایک سوال کا جواب مختصر سا ابھی دے دیں''۔ میں نے ذرا منت کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کل جو ادب ہمارے ہاں اور آپ کے ہاں تخلیق ہو رہا ہے آپ اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟'' ایسے لگا جیسے کسی نے ان کی کسی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولیں۔ ''صرف ادب ہی کی کیا بات کرتی ہو۔ تجارتی سوچ کے اس دور میں فن کے نام پر نچلی سطح کی سوچ کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ مگر خیر دونوں طرف چپ چاپ بیٹھ کر کام کرنے والے موجود ہیں۔ پھر کبھی اس پر بھی تفصیل سے بات کریں گے ابھی تو تم کو بھی ایک تقریب میں پہنچنا ہے'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔

''آپ پاکستان آئیں تو پھر ہی ممکن ہے۔'' میں نے درخواست کی۔ ''آؤں گی ستمبر اکتوبر میں ذرا موسم اچھا ہو اور میری اپنی طبیعت بھی ٹھیک ہو۔''

واپسی پر میں سوچ رہی تھی۔ امرتا نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ زندگی کبھی شیریں ہوتی ہے کبھی تلخ مگر بے ذائقہ کبھی نہیں ہوتی۔ امرتا کی باتیں بھی ایسی ہی ہیں زندگی کے رَس میں ڈوبی ہوئی۔

☆☆☆☆

شبہ طراز

امرتا پریتم۔۔۔بس ایک ہاتھ کے فاصلے پر

'اس وقت میں اپنے بک شیلف کے سامنے کھڑی ہوں اور سارا سے مخاطب ہوں ۔۔۔ دیکھو دوست، اس وقت میرے کتنے ہی عظیم دوست، وشٹھ رشی، اور دید ویاس سے لے کر بان بھٹ، کالی داس، سلطان باہو، وارث، سیفو، چیخوف، غالب، کازان زاکس، آئین رنیڈ، ساحر، فراق اور فیض تک تیرے پاس بیٹھے ہیں ۔۔۔ بس ایک ہاتھ کا فاصلہ ہے، یہ طے ہو جائے گا تو میں تم سب سے بہت باتیں کروں گی ۔۔۔ بک شیلف کے سامنے کھڑی ہو کر نہیں، تم سب دوستوں کے ساتھ بک شیلف میں بیٹھ کر۔۔۔۔''

امرتا پریتم

اور پھر ۔۔۔ یہ ایک ہاتھ کا فاصلہ ختم ہو گیا۔ وہ اب اپنے دوستوں کے ساتھ بک شیلف میں بیٹھی ہے۔ وہ سب اپنے مشترکہ غموں پر ہنس رہے ہیں، ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہے ہیں۔ اُن سب کے تخلیق کردہ کردار قطاروں میں مؤدب کھڑے ہیں۔ ایک میلہ سا لگا ہے۔

ہلکے ہلکے شور اور بحث کی آوازیں رفتہ رفتہ اونچی ہو رہی ہیں۔ میں کان لگا کر سُن رہی ہوں۔ امرتا کے افسانوں کی عورتیں آپس میں بحث کر رہی ہیں۔ ''کیتکی'' دعویٰ کر رہی ہے کہ وہ امرتا کی بہترین تخلیق ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ میں نے ایک عورت، جو میری سہیلی تھی، کے پیار میں اپنی زندگی کی قربانی دی ہے اور عورت کو ایک عظیم درجہ عطا کیا ہے، جس نے اپنی سہیلی کی ادھوری زندگی کو پورا کیا۔ غلط روایات کی بھینٹ چڑھ جانے والی مظلوم عورت کی موت کے بعد اُس کی زندگی کو پورا کرنا بالکل نیا تجربہ تھا اور اُس میں بقول کیتکی کے، وہ کامیاب رہی ہے۔

جب کہ ''ایک ہوک'' کی نہال کور اور ''اندھیرے کا کمنڈل'' کی ودھیا اور مس رائے کا کہنا تھا کہ یہ قربانیاں تو انہوں نے بھی دی ہیں۔ ودھیا اور مس رائے کا جواز یوں اور بھی ٹھیک تھا کہ اُن دونوں نے تو اپنی

اپنی زندگی ہی میں ایک دوسرے کی ادھوری زندگی کو پورا کیا تھا۔۔۔اُن کا کہنا تھا کہ ''کرماں والی'' کا کردار زیادہ مضبوط اور یادرہ جانے والا کردار ہے۔ ''کرماں والی'' جو تقدس کا ٹیکہ لگائے منافقت کی اُس گندی، جنس زدہ زندگی سے نکل آئی تھی جہاں پاکیزگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ وہ تنہا زندگی گزارنے کو اس بات پر فوقیت دیتی تھی کہ اُس کا جیون ساتھی اُس کے ساتھ جھوٹی زندگی گزارے۔۔۔

چھبیلی نائن نے درمیان میں لقمہ دیا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ امرتا کی تخلیق کردہ عورتوں میں سے بیشتر اسی دُکھ سے ہوکر گزری ہیں۔ جندو، مرکی عرف بلاقی، جندرو، مسز کپور، سب اسی دُکھ میں مبتلا تھیں ۔۔۔دہری زندگی کے دُکھ میں۔۔۔لیکن سب نے اس دُکھ کو سہا اور امر ہو گئیں۔۔

''گلیری'' جو ایک مرد کے دل سے نہ بھلائی جانے والی کامیاب محبت تھی، بولی کہ مجھے تو وہ عورتیں زیادہ جان دار محسوس ہوتی ہیں جنھوں نے کسی اور کو چاہتے ہوئے بھی اپنے جیون ساتھی سے بے وفائی نہیں کی ۔۔۔جو اپنے اپنے دلوں میں خاموش محبت کو دفن کر کے بظاہر ایک جیون جیتی رہیں لیکن اپنی عزت کو داغ دار نہیں کیا۔۔۔ مثلاً بھابی مورنی اور تاپی۔۔۔اور۔۔۔یا پھر وہ ''گلیانا'' کتنی مظلوم تھی جو دنیا کے مردانہ نظام کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اُس نے تو ابھی محبت کے زینے پر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ وہ تو صرف آزادی سے دنیا دیکھنے اور دنیا میں گھومنے کی تمنا لئے نکلی تھی۔ وہ اپنی زندگی خود بسر کرنا چاہتی تھی۔۔۔اور مرد سے یہ برداشت نہ ہوا کہ کوئی عورت اُس کی مدد کے بغیر، اُس کو اپنے جسم کا بھتہ دیے بنا یوں بے خوف پھر سکے۔۔۔سو وہ مردانہ درندگی کا شکار ہو گئی۔ کتنا زندہ رہ جانے والا کردار تھی ''گلیانا'' اور اسی طرح ''چھمک چھلو'' کی چھلو جو بچاری دہری درندگی کا شکار ہوئی۔۔۔ایک طرف سوتیلی ماں کا ظلم اور دوسری طرف ایک انسانی درندے کا۔۔۔اور بیچ میں پستی بے چاری چھلو۔۔۔ایک چھلو ہی کیا کتنی لڑکیاں اس اس نام نہاد تہذیبی معاشرے میں ہوس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں اور امرتا بار بار پیدا نہیں ہوتی۔۔۔جو قلم اُٹھائے۔ پھر ''کوکلی'' جیسا کردار جو سماج کے منہ پر ایک طمانچہ ہے جہاں لڑکی کو جذبات سے الگ نکال کر دیکھا جاتا ہے، جہاں صرف اُس کے کنوارے جسم کی وقعت ہے جس پر فتح کے جھنڈے گاڑنا مردانگی۔۔۔اور کتنی کوکلیاں روز فتح ہوتی ہیں، کتنی آرزوئیں روز مرتی ہیں، کتنے درد روز جنم لیتے ہیں۔

گلیری جوش اور جذبے سے بولے ہی جا رہی تھی کہ راج کور سردارنی کی گونج دار آواز نے ایک لمحے کے لئے خاموشی طاری کر دی۔ اُس کا رعب اور دبدبہ ویسے ہی ماحول کو سنجیدہ بنانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔

اُس نے ''تہہ خانے'' کی ''گایا'' اور ''سات پونیاں ستر مڈھے'' کی ''شکنتلا'' کے حق میں آواز بلند کی۔ اُس نے کہا کہ یہ دونوں کردار ہر جنم میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان کو کسی جنم میں بھی نکالا یا بھلایا نہیں جاسکتا۔ یہ محبت کی معراج پر پہنچ جانے والے آفاقی کردار ہیں۔ یہ نام بدل بدل کر دنیا میں آتے ہیں۔ کبھی محبت کو پا لیتے ہیں اور کبھی نہ پانے کی خلش دل میں لئے لئے اگلے جنم میں دوبارہ آنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک درد اور کسک جگا کر۔۔۔ یہ نہ بھولنے والے کردار ہیں۔

کرداروں کی بحث زوروں پر جاری تھی۔ ہلکی آوازیں تیز ہو چلی تھیں، ویسے بھی عورتیں بحث کرتی ہوں تو لڑائی کا گمان ہوتا ہے۔ ہاتھ چلا چلا کر وہ اتنے زور زور سے چیختی ہیں کہ توبہ ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت بھی نرملا، ویرو، سیما، پارو، دیپو، پھول متی، سون متی، فرکی، شیاملی، دھنو اور انگوری سب اپنی اپنی ہانک رہی تھیں، اپنے اپنے پسند کے کرداروں کے بارے میں رائے دے رہی تھیں کہ اچانک ان کرداروں کو چپ کروانے کے لئے ''سارا'' اپنی ''آنکھوں'' سے باہر نکلی اور اپنے تجریدی لفظوں کو ترتیب دیتے ہوئے کہنے لگی ۔۔۔ عورت ازل کی آنت سے اُگلی ہوئی وہ کہانی ہے جسے لکھتے لکھتے آسمان شفق تک پھیل گیا اور جھوٹ اور گناہ کے اندھیرے نے رات کی کالک کی بغل مار لی۔۔۔ عورت کی کہانی کبھی ''پانچ برس لمبی سڑک'' پر چلتے چلتے بوڑھی ہوگئی کبھی ''ایک ضبط شدہ کتاب'' میں ایک دوسرے کے کندھے پر سر ٹکا کر روئی تو کبھی کسی بے کار شے کی طرح ''ایک اندھیرے کونے'' میں غیر محسوس طریقے پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی۔۔۔ وہ زندگی کے ساتھ تھی، وہ موت کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے ہونے کو ثابت کر کر کے ہاری نہیں ہے صرف اُس کے نام بدلے ہیں۔۔۔ ہاں، اُس کے رہنے کے مقام بدل جاتے ہیں۔۔ کبھی وہ مندر سے نکالی جاتی ہے تو کبھی مسجد سے۔۔ کبھی وہ دل میں بسائی جاتی ہے تو کبھی صرف آنکھوں میں۔۔۔ کبھی اُس سے گھر سجایا جاتا ہے تو کبھی محفل۔۔۔ کبھی وہ بہت سستی مل جاتی ہے تو کبھی اُس کی قیمت چکانا مشکل ہو جاتا ہے۔ سارا امرتا کی کہانی ''گروڑ گنگا'' سے ایک اقتباس سنانے لگی:

''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دل کا مندر بھی بدری ناتھ کے مندر کی طرح بڑی دور ہے۔ اپنے دل کا مندر بھی اور کسی دوسرے کے دل کا مندر بھی۔ کوسوں کے کوس چلنے پڑتے ہیں، دھوپیں کاٹنی پڑتی ہیں، سردیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں، چڑھائیوں میں سانس ٹوٹتا ہے، اُترائیوں میں گھٹنے ٹوٹتے ہیں۔ اور کئی دفعہ تھوڑی سی روٹی کے لئے بھی ترسنا پڑتا ہے۔۔۔ لیکن اس مندر میں روحانی دیدار ہوتے ہیں۔ یہ انسانی دل کا مزاج ہے،

کہ اُس کو دیدار کی تمنا ہے۔اس پیاس کی تکمیل کے لئے وہ راستے کی تمام تکالیف برداشت کرتا ہے۔۔۔۔''

(گروڑ گنگا)

پھر سارا نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی، ''کبھی وہ '' کالی مائی'' ہوتی ہے تو کبھی '' سانولی مائی''، کبھی '' الک ننده'' کہلائی جانے لگتی ہے تو کبھی '' بھیل گنگا''، کبھی کرم ناشا، کبھی دھارا، نمود دھارا، ونڈ ود دھارا، رام گنگا، وشنو گنگا اور آ کاش گنگا۔۔۔ آخر وقت اور زندگی کی دھارا میں بہتے بہتے وہ '' گروڑ گنگا'' بن جاتی ہے، جہاں سے اگر ایک پتھر بھی نکال کر اُس کی پوجا کی جائے تو سانپ کا ڈر نہیں رہتا ۔۔۔اور محبت کے ناگ سے ڈسے جانے کے بعد دل پہ اور کسی چیز کا زہر اثر ہی نہیں کرتا۔۔۔ سچی اور پاکیزہ محبت کا زہر زندگی کے کچے پکے راستوں میں ایسی دھند بھری غیر مرئی نیلاہٹیں بکھیر دیتا ہے کہ پل بھر کا سفر صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے ۔۔۔اس نیلی روشنی میں سے کرداروں کے جگنو سمیٹنے والے قلم کار صرف بک شیلفوں میں ہی نہیں لوگوں کے دلوں میں بیٹھ رہتے ہیں۔''

سارا نے اپنا پھیلا ہو سانس سمیٹا اور اپنی '' آنکھوں'' میں واپس اُتر گئی ۔۔۔ بک شیلف میں ایک سکوت طاری ہو گیا۔۔۔ ساحر امرتا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔۔۔ بولا ۔۔۔ حاصل کر لینا ہی تو سب کچھ نہیں امرتا۔۔۔ حاصل نہ کر کے '' گروڑ گنگا'' بن جانا ہی زندگی کا اصل ہے۔۔۔ دل جیتنا جسم جیتنے سے کہیں زیادہ خوش کُن ہے۔۔۔

مجھے اپنی کہی ہوئی بات یاد آ رہی ہے ، '' نہ مٹنے والی پیاس کا نشہ مل جانے والی شراب سے زیادہ ہے۔۔۔

اور میں سوچ رہی ہوں کہ امرتا پریتم کے کردار زیادہ مضبوط تھے یا اُس کی شخصیت ۔۔اُس کے کردار پوری کہانی اس کی شخصیت کے گرد گھومتے رہتے تھے۔ مجھے لگتا ہے امرتا ہر کہانی میں خود داخل ہوتی تھی۔ کرداروں کے ساتھ گھل مل جاتی تھی۔ وہ باہر کھڑے ہو کر اُن کا جائزہ نہیں لیتی تھی بلکہ اُن سے دوستی کر کے اُن کی کہانیوں میں شامل ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے:

'' میں اور کیتکی ابھی ایک دوسری کی واقف نہیں ہوئیں تھیں کہ میری مسکراہٹ نے اُس کی مسکراہٹ کے ساتھ دوستی کر لی۔۔۔۔''

(کیتکی)

'' اس کا منہ دیکھ کر اگر کسی نے ٹوکری خریدنی بھی ہو، تب بھی نہیں خریدتا۔ ذرا ہنس کر کسی سے بات

کرے تو اگلا ایک کی جگہ دو خرید لے۔۔ یہ کوزے جیسا منہ بنا کر کھڑی رہتی ہے۔۔۔'' ماں کرتارو کے سارے بول چھلو کے کانوں میں ہنسیوں جیسا درد کرنے لگے۔۔۔

(چھمک چھلو)

''۔۔۔۔دروازے سے باہر مشعلیں جل رہی تھیں۔
ہوا میں تلی ہوئی مچھلی کی اور تاڑی کی بُو تھی
ڈھولوں کی آواز سے کئی گیت جاگ رہے تھے۔
کوکلی کی آنکھوں میں کئی رنگ چمک رہے تھے۔''

(کوکلی)

''کوکلی مچھیروں کے گھر پیدا ہوئی تھی
اور آج مچھیروں کے گھر بیاہی تھی
لیکن کوکلی کو محسوس ہوا۔۔۔۔۔
وہ ایک لڑکی نہیں، ایک مچھلی ہے
یہ سہاگ کی سیج نہیں، ایک جال ہے
اور اب وہ بیاہ کی کنڈی میں پھنسی ہوئی ہے۔۔۔۔۔''

(کوکلی)

''میں اپنا نام لکھ دیتی ہوں کرماں والیے!۔۔۔ میں نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے نوٹوں پر اپنا نام لکھا ہوگا، لیکن آج میرا جی چاہتا ہے کہ تُو میرے نوٹ پہ اپنا نام لکھ دے !۔۔۔ کہانی کار بڑا نہیں ہوتا، بڑا تو وہ ہے، جس نے کہانی خود اپنے جسم پر جھیلی ہے۔''

(کرماں والی)

''جندرو بھی ایک دیئے کی طرح جل اٹھی۔
ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا جیسے جندرو کی آنکھیں بجھ گئیں تھیں۔ شاید اُسے تیل کے ختم ہونے کا اندیشہ یاد آیا ہو۔ لیکن دوسرے لمحے اپنے دیے میں اپنا ہی تیل ڈالتے ہوئے کہنے لگی'' جب اُس نے گھر بسایا تو سچ مچ میں گھر میں دیے کی طرح جل اٹھی تھی۔۔۔'' (رام جی کے کنویں کی بوکی)

''وہ جس روش بنگلے میں رہتا تھا، اس کا ایک اندھیرا کونہ بھی تھا۔ جس کو کچھ معلوم نہیں تھا اس کو وہ کونہ دکھائی نہیں دیتا تھا، اور جس کو معلوم تھا وہ کبھی اس کونے کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ اس لئے چاہے پچیس برس ہو گئے تھے، لوگوں کو اس بنگلے اور اس کونے کی کہانی معلوم نہیں تھی۔''

(ایک اندھیرا کونہ)

''میرا نام یورنس ہے۔ ایک دن تم نے پانی پینے سے پہلے بتایا تھا۔

میرا نام گایا ہے۔ میں نے تمہارے ہاتھ سے پانی کا خالی کٹورہ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

اور مجھے محسوس ہوا تھا۔۔۔ تمہارے آنے کے وقت ''کچھ'' ہمیشہ پانی کے کٹورے کی طرح بھرا ہوتا تھا اور تمہارے جانے کے بعد وہ ہمیشہ خالی کٹورے کی طرح ہو جاتا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ۔۔۔ تمہارے خشک حلق جیسا ہو جاتا تھا۔''

(تہہ خانہ)

''حیران کن بات تو یہ تھی کہ زندگی نے گلیانہ کو پیدا کیا تھا، لیکن اُس کو پیدا کر کے بالکل بھول گئی تھی۔ لیکن میں حیران نہیں تھی، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ زندگی کی یادداشت عام طور پر کھو جاتی ہے۔ میں نے گلیانا کو بتایا کہ ہمارے دیس میں ایک بوٹی پائی جاتی ہے، جسے برہمی بوٹی کہا جاتا ہے۔ ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ برہمی بوٹی اگر کوئی کچھ دن پی لے تو اُس کی کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آتی ہے اور میرا خیال ہے۔۔۔ کہ زندگی کو برہمی بوٹی رگڑ کر پینی چاہیے۔''

(گلیانا)

امرتا کرداروں کا درد اوڑھ لیتی تھی، کردار اُس کے نظریات کی پناہ گاہ میں آجاتے تھے۔ خود امرتا کی زندگی ایک نظریہ تھی، ایک اصول تھی۔ اُس کی شخصیت، اُس کے کرداروں کی بُنت اور اُس کی زندگی کی فضا میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ سکھ خاندان میں پیدا ہونے والی اور روایتوں کے شکنجے سے آزاد ہو کر ایک خود مختار روح کی طرح زندگی بسر کرنے والی ''امرتا'' اُس وقت کے نقاد کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھی۔ اُسے ٹوکنے، اُسے روکنے، اُسے بجھا دینے، اُسے مٹا دینے کی ہر کوشش کو اُس کے لکھے لفظوں نے مات دی۔ وقت کی عدالت میں اُس کے سارے کردار، ساری عورتیں اُسے اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں۔۔۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بک شیلف میں ہے۔۔۔ دلوں میں ہے۔۔۔ اور مَیں۔۔۔ اپنے بک شیلف کے سامنے کھڑی ہوں۔۔۔ اور امرتا سے مخاطب ہوں۔۔۔

''امرتا۔۔۔! تم نے عورت کو جسم کے سوا جانا ہے۔ تم نے صحیح معنوں میں اُس کے جذبات کو سمجھا

ہے۔تم اُس کے دل میں اندر تک اُتری ہو، اُس کے جسم کی تنہاراہ داریوں میں اُس کے ساتھ دوڑی ہو۔تم نے ویسے تو ہر طبقے کی عورت کے لئے لکھا ہے لیکن اُن مجبور اور اَن پڑھ عورتوں کے دلوں کی دھڑکن بن کر دھڑکی ہو جنہیں سماج عورت تو کیا انسان بھی تسلیم کرتے ہوئے کنجوسی دکھاتا ہے۔تم نے عورت کا ہر روپ دکھایا ہے اور ہر ہر روپ میں اُس کی محبت کو اُجاگر کیا ہے تم نے اُس کی روح کی پرستش کی بھی ہے اور کروائی بھی ہے۔تم نے محبت کو عورت میں اس طرح گوندھ دیا ہے کہ کتنی بھی واجدہ تبسم اور عصمت چغتائی آئیں۔۔۔عورت کی تضحیک کریں۔۔۔اُس کے جذبات کو غلط رنگ دے کر پیش کریں۔۔۔وہ تمہاری دلائی ہوئی عزت ،توقیر اور بہادری اُس سے چھین نہیں سکتیں۔نقاد اسی لئے ابھی تک تمہارے کرداروں کی بات کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔اس سے اِن کرداروں کی آنکھوں میں نہیں جھانکا جاتا۔۔۔وہ آنکھوں کی سچائی کا سامنا نہیں کر پاتا۔۔۔وہ تمہاری زندگی میں تمہاری آنکھوں سے ڈرتا رہا اور اب تمہارے کرداروں سے ڈرتا ہے اسی لئے وہ تمہاری "محبت کے تسلیم کردہ جرم" کو High Light کرتا رہا، حالانکہ محبت کے اس Triangle میں تم تینوں اپنی اپنی جگہ بہت عظیم ہو۔۔۔تم۔۔ساحر۔۔۔اور امروز۔۔۔اور مجھے اپنا یہ بک شیلف بہت عزیز ہے جس میں تم ہو، ساحر ہے، سارا ہے۔۔وارث ہے، باہو ہے چیخوف ہے۔۔۔مہک ہے، توانائی ہے۔۔۔روشنی ہے اور ۔۔۔اور زندگی ہے۔۔۔!!

☆☆☆☆

شمع خالد

امرتا پریتم

گلاب لہجے جھرنوں سے پاکیزہ الفاظ کو شاعری میں پرونے والی شاعرہ امرتا پریتم سے میرا گہرا ناطہ ہے۔اُس نے جس مٹی سے جنم لیا۔وہ مٹی پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کی مٹی ہے۔وہ بھی پنجاب کی بیٹی' میں نے بھی یہاں جنم لیا۔اُس نے بچپن کے ابتدائی دن جس زمین پر کھیل کود کر گزارے میں بھی اُس کے پاؤں کے نشان ڈھونڈتی وہاں سے گزرتی رہی۔لیکن وہ سچ اور انصاف کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتی تھی۔میں سمجھوتوں اور خاموشی کو اوڑھے زندگی گزارتی رہی۔جب اُس نے سارہ شگفتہ کی موت کا نوحہ فضا میں بکھیرا تو میری جیسی ایک عظمیٰ گوہر سلطانہ کی زندگی اور موت کا تمسخر اُڑایا۔۔۔تو میں نے امرتا کو خط لکھا۔اور داد دی۔تو اُس نے جواب دیا۔''میرے خیال میں جو سچ لکھ اور پڑھ نہیں سکتا۔وہ کیسے شاعر اور ادیب ہو سکتا ہے''۔تو میں نے دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے سوچا۔۔ہم تو بھٹو کی پھانسی دینے والے کے بلاوے پر بھاگے چلے گئے تھے۔وہ 1947 کی ہجرت میں کٹ مرنے والوں کے لیے تڑپ اُٹھتی ہے۔اور ہم لال مسجد اور ڈرون حملوں میں مرنے والوں کے لیے دو کلمات احتجاج کے بلند نہیں کر سکتے۔پھر ہم اپنی مٹی کا قرض کیسے ادا کر سکتے ہیں۔31/اگست 1919 میں' میں گوجرانوالہ میں سکھ گھرانے میں پیدا ہونے والی خاتون عورتوں کے لیے ایک لائٹ ہاؤس کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ہمارے گھروں میں ایسے باغی خیالات لیکر پیدا ہونے والی سارہ شگفتہ کو ٹرین کے نیچے کود کر جان دینی پڑتی ہے کہ اپنی مرضی اور من مانی کی زندگی گزارنا صرف مردوں کا حق ہے۔عورت اگر سوچ بھی لے تو اُسے اپنے خیالات کو آبِ زم زم سے دھو کر پاک کرنا پڑتا ہے۔

رسیدی ٹکٹ میں وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں۔''جب میں 11 سال کی تھی تو میری ماں بیمار پڑ گئی۔ایک ہفتے کے اندر اندر وہ ہلدی کی طرح زرد ہو گئی۔سہیلیاں اور رشتہ دار خواتین اُس کے گرد بیٹھی ہیں کہ ماں نے پوچھا میری بنا کدھر ہے۔اُس کی سہیلی پریتم کور نے میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں جب دیا تو اُس پر غشی طاری

ہوگئی۔ ایک عورت نے مجھے کہا ماں کے لیے دعا کرو۔ شاید اُسے ترس آ جائے۔ میں نے اپنے ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کرتے ہوئے خدا سے التجا کی خدایا میری ماں کو مرنے نہ دینا۔۔۔ میں آہستہ آہستہ دعا پڑھتی رہی۔ ماں خاموشی سے چلی گئی۔ میں نے رونے کی آوازیں سنیں تو جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا سب رو رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی خدا بچوں کی دعا ضرور سنتا ہے۔ پر یہ سب کیوں ہوش گنوار ہے ہیں اور اچانک مجھے محسوس ہوا ماں جا چکی ہے۔ خدا کسی کی نہیں سنتا بچوں کی بھی نہیں۔۔۔۔

میں نے اُس دن سے عبادت کرنی چھوڑ دی۔ ابو مجھے سالوں سے جس عبادت کی تربیت دے رہے تھے۔ میں نے اُسے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ خدا یہاں نہیں ہے۔ یہ میرا پختہ یقین تھا‘‘۔۔۔۔

رسیدی ٹکٹ میں نے برسوں پہلے پڑھی تھی۔ لیکن میں آج بھی امرتا کی اُس کیفیت کو محسوس کرسکتی ہوں جو ماں کے آخری وقت اُس کے اندر چل رہی تھی۔ ایک معصوم گیارہ سالہ ذہین لڑکی جسے آنکھ کھولتے ہی خدا کی وحدانیت کا درس دیا گیا۔ سونے سے پہلے کی عبادت اس لیے کی جاتی تھی کہ چاروں طرف سے خدا بڑے وسوسے اور بری چیزوں سے پناہ میں رکھ سکے۔ اُس وقت بھی امرتا ایک جذبے کی کھڑکی ’راجن کے خواب کے لیے کھلی رکھتی تھی۔

امرتا نے زندگی بھر جدوجہد کی۔ 16 سال کی عمر میں اُس کی شادی پریتم سنگھ کے ساتھ ہوگئی جس کے ساتھ منگنی بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔ پریتم سنگھ اگرچہ ایک ادیب اور ایک رسالے کا ایڈیٹر بھی تھا جسے امرتا اپنے ساتھ چلتا ایک سایہ ہی سمجھتی تھی۔ میں نے اس دور میں جو بھی لکھا وہ سب اُس سائے سے متاثر ہو کر لکھا۔ وہ جس نے میرے جسم اور خون کا خراج لیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میری سوچ توانا ہوتی چلی گئی اور میرے اندر ایک پرندے جیسی آزادی کا جذبہ بیدار ہوتا گیا۔ جی ہاں 1960 میں امرتا نے اس سائے سے نجات حاصل کرلی۔ جس نے اُسے دو بچے اور اپنا نام پریتم دیا تھا۔ اسے چھوڑتے ہوئے امرتا کو اپنے اور پرائے دونوں کی تنقید برداشت کرنا پڑی ہوگی۔ وہ خود کہتی ہیں کہ وہ واقعہ جتنا تیس سال پہلے تکلیف دہ تھا آج بھی ہے۔

وہ لکھتی ہیں میں ابھی اپنے Teens سے باہر نہیں نکلی تھی کہ مجھے وہ چہرہ نظر آیا جس کے خواب میں دیکھتی تھی۔ جس کے بارے میں ’میں نے ’آخری خط‘ میں جس آگ میں جھلستی رہی تھی وہ سب میں نے اس میں لکھ دیا۔۔۔ جس پر انہیں (1957 میں اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا)۔ وہ کہتی ہیں خدایا میں نے یہ ایوارڈ کے لیے

نہیں بلکہ اُس کے لیے لکھا تھا جو بچپن سے میرے خوابوں میں بسا ہے۔ اگر یہ اُس نے نہیں پڑھا جس کے لیے لکھا ہے تو پوری دُنیا پڑھ لے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ لکھتی ہیں ۔ ''ایوارڈ کی خبر کے بعد ایک Reporter فوٹو گرافر کے ساتھ میرا انٹرویو لینے کے لیے آیا تو میں نے ایک کاغذ پر ساحر ساحر ساحر لکھ کر بھر دیا۔۔۔۔ دوسرے دن تمام اخباروں میں اس کا تذکرہ تھا''۔

امرتا اسے لیلی مجنوں کے پیار کی طرح سمجھتی تھیں۔ وہ بُت جسے وہ بچپن سے من مندر میں بٹھائے پوجا کر رہی تھیں۔ آج اُسے سب کے سامنے بیان کر بیٹھی تھیں۔ ایک ناول میں دل دیاں گلاں لکھ کر انہوں نے ساحر سے محبت کی سند چاہی۔ لیکن ساحر کی محبت امرتا کے نصیب میں نہ تھی۔ جب وہ ملے تو ساحر کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آ چکی تھی۔ ہاں امروز آج بھی ہمیشہ کی طرح اُس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس وقت بھی جب ساحر نے دُنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ اپنی محبت کے جنازے پر امروز کے کاندھے سے لگی روتی رہی۔

And each man kills the thing he loves.
By all let this be heard
Some do it with a bitter look
Some with a flattering word
The coward does it with a kiss
The brave man with a sword

ساحر کی محبت تو نہ ملی لیکن سجاد جیسا دوست اور امروز جیسا چاہنے والا امرتا کے نصیب میں تھا۔ امروز جس نے زندگی کے چالیس سال امرتا کے پہلو میں گزار دیے' محبت بھی ایک عجب تکون ہے جسے آپ چاہو وہ نہیں ملتا۔۔۔ لیکن جو ملتا ہے اُس سے محبت نہیں ہوتی۔۔۔ ہم جیسی عام عورت ہوتی تو محبوب کی تصویر کو سینے میں چھپا کر صرف اس کے گن گاتی جو اُسے چاہ رہا تھا۔۔۔ امرتا رسیدی ٹکٹ میں لکھتی ہیں کہ ساحر مجھے ٹیلی فون پر اپنی غزلیں سنایا کرتا تھا۔ ایک رات گیارہ بجے' وہ میرے ساتھی خالی جام' کرتا تھا۔ اُسی رات امروز بمبئی میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ اور وہاں بیمار ہوگیا۔ ساحر نے اپنا ڈاکٹر امروز کی دیکھ بھال کے لیے بھجوا دیا۔۔۔ یہ محبت کی تکون ہی تو تھی جو امرتا کے لیے ڈھال بنی ہوئی تھی۔

امرتا پریتم نے لگ بھگ 100 کے قریب افسانے' ناول اور شاعری کی کتابیں لکھیں۔ اُن کی کتابوں کے تراجم انگریزی' ہندی' فرانسیسی میں ہوئے۔ 16 سال کی عمر میں پہلی کتاب امرت لہریں لکھی جو 1939 جیسی کتابیں لکھ کر ادب میں اپنا لازوال حصہ ڈال دیا۔۔۔ امرتا کی بہت ساری کہانیوں اور ناولوں کو

فلمی قالب میں بھی ڈھالا گیا جن میں ''پنجر'' فلم ہمیشہ یادرکھی جانے والی ہے۔

بزرگانِ دین سے انہیں دِلی عقیدت تھی۔ پاکستان کے ادیب جب بھی اس ادیبہ کو ہدیہ پیش کرنا چاہتے وہ کسی نہ کسی مزار کی چادر ہوا کرتی۔ وارث شاہ' بلھے شاہ سے اُسے بے حد عقیدت تھی۔ وہ وارث شاہ سے کہتی ہیں۔ سچ انصاف اور آزادی کے لیے اُٹھو۔ اپنی قبر کی گہرائی سے اُٹھ کر کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑھو۔ تمہارے پنجاب کی بیٹی رورہی ہے۔ اپنے پنجاب کی حالت دیکھو۔ امرتا کی اس چیخ نے تمام پنجاب تمام پاکستان بلکہ تمام دُنیا کے اُن دلوں میں اپنے غم کی انی پرودی جو دوسروں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ''اج اکھاں وارث شاہ نوں'' ایک ایسی پکار ایک ایسا احتجاج بن گئی ہے جو ہمیشہ فضا میں لوگوں سے ہونی والی بے انصافی پر بین کرتی رہے گی۔

اگر کوئی امرتا کے حوالے سے مختصر لکھنا چاہے تو اسے ادب کی جون آف آرک کہہ سکتا ہے یہ جس نے ہجرت کا دکھ لیا اور عورتوں کی بے بسی پر احتجاج کیا ہے۔ آغاز میں اُس کی نظموں میں عام لڑکی کے خواب اور چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش دکھائی دیتی ہے۔ یہ ساری شاعری لڑکپن کی پہچان تھی جوں جوں وہ وقت کی بھٹی میں کندن بنتی گئی تحریروں میں وہ پروگریسو Progressive ادیبہ کے طور پر پہچان بناتی ہیں۔

امرتا کو پنجاب کا پہلا رتن ایوارڈ لینے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور پہلی ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ لینے والی پہلی خاتون بھی مانی جاتی ہے۔

بھارتیہ جنتا ایوارڈ جسے بھارت کا سب سے بڑا ایوارڈ کہا جاتا ہے وہ بھی امرتا کے حصہ میں آیا۔ 1977 میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی انہیں بہت ساری یونیورسٹیوں نے پیش کی۔ اس کے علاوہ بہت سارے عالمی ایوارڈ بھی۔ بلغاریہ اور فرانس کے ایوارڈ بھی اُن کے حصے میں آئے۔

وہ 2004 تک لکھتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ موت نے اپنے ہاتھ اُن کی طرف بڑھانے شروع کیے۔ امروز کی محبت' نینوراج بیٹے کی اور اکا بہو کی نگہداشت اور بیٹی کی توجہ بھی اس جانکنی کے عالم میں بے بسی سے انہیں تک رہی تھی۔ خاتون جس نے زندگی کی ہر مشکل کو بہادری' سچائی کی لگن اور انصاف کی طاقت کے زور پر سہا تھا۔ وہ موت سے ہارتی جارہی تھی۔ 31/ اکتوبر 2005 کو امروز کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے یہ کہتی ہوئی مرگئی کہ میں آئندہ جنم میں صرف اور صرف تمہارا ساتھ چاہوں گی۔

امروز کی چالیس سالہ بے لوث محبت' خلوص' عقیدت کو جواب مل گیا تھا۔ وہ ہاتھ جو برش اس لیے اُٹھاتا

تھا کہ امرتا کی کتاب کو خوب سے خوب رنگ اور انگ دے سکے۔ جو سانس اس لیے لیتا تھا کہ امرتا اس فضا میں سانس لے رہی ہے۔ اُسے یہ عہد یہ وعدہ زندہ رہنے کی نوید دے کر چلا گیا کہ اگلے جنم میں صرف اور صرف میں اور امرتا ہوں گے۔ کوئی اور محبت کی تکون نہیں۔۔۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر صغرا صدف

تخیل کو وجود بنانے والی ساحرہ

میں 2007ء میں امریکہ کے شہر ڈیلس گئی تو پہلے ہی دن کھانے پر ایک پنجابی رائٹر جسویر سے میری دوستی ہوگئی۔ اس نے لنچ کے بعد میرا سامان اُٹھایا اور اپنے گھر لے گئی۔ اس کا گھر بہت خوب صورت تھا۔ گھر کی پچھلی سمت شیشے کی دیواریں تھیں اور دیواروں کے باہر وسیع وعریض خاموش پارک۔ اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی رہتی تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا کسی دوسرے شہر کی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ آج کل اس کے گھر کینیڈا سے اس کی خالہ اوتار آئی ہوئی تھی۔ جو امرتا پریتم کی بہترین دوست تھی۔ اوتار بہت خوبصورت اور ہنس مکھ تھی۔ روزانہ یوگا اور واک کرتیں تھیں اسی لئے بہت ایکٹو تھی لیکن اس کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی اس کی بشاشت تھی۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی اوتار بچوں کی طرح سیر وتفریح، کھانوں کے پروگرام بناتی بہت اچھی لگتی تھی۔ میں دو دن اس خوبصورت خاندان کے ساتھ رہی مگر بے شمار خوبصورت یادیں اور اپنائیت کا احساس لئے واپس آئی۔

جسویر مجھے اپنا گھر دکھانے سب سے پہلے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں اس نے کہا کہ جوتے اُتار کر اندر آنا یہ مندر ہے۔ میں کچھ حیران ہوئی کہ جسویر بہت لبرل اور سیکولر سوچ کی مالک تھی۔ بہر حال مندر کے اندر داخل ہونے پر پتہ چلا کہ یہاں کوئی بھگوان ہے نہ مذہبی پوجا پاٹھ کا اہتمام بلکہ بڑے سلیقے قرینے سے کچھ اشیاء رکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک پرانی چوکی پر ایک پرانی چپلوں کا ایک جوڑا رکھا ہوا تھا۔ جسویر نے بتایا یہ تما چیزیں امرتا پریتم کی ہیں۔ اور وہ میرے لئے بہت مقدس ہستی ہیں اس لیے میں نے اس کمرے کو مندر کا نام دے رکھا ہے۔

اوتار، جسویر سے امرتا کی بے شمار باتیں ہوئیں، بلکہ بیشتر وقت ہم اوتار سے امرتا کی باتیں سنتے رہتے تھے۔ امرتا اور امروز بھی زیرِ بحث رہے۔ میں نے جسویر کو بتایا کہ میں کبھی امرتا پریتم سے تو نہ مل سکی لیکن امروز سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ ایک لمحے کی دیر تھی جسویر نے ایک نمبر ملایا اور فون میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگی ''امروز نال گل کر'' (امروز صاحب سے بات کرو)۔ ایک دم خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول

گئے۔انہوں نے بہت محبت سے بات کی اور دعوت دی کہ میں جب بھی انڈیا آؤں دہلی ان کے گھر ضرور آؤں۔

امرتا پریتم کے لئے پہلے بھی میرے دل میں محبت کے احساسات تھے۔اب عقیدت بھی شامل ہوگئی تھی۔ کئی بار سوچا امرتا پریتم پر کچھ لکھوں لیکن عقیدت کا احساس مجھے اس کی ذات کی کوٹھڑی میں داخل ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔ میں کافی عرصہ باہر ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کر کے میں نے دروازہ کھٹکھایا، پتہ چلا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔ایسے در تو کسی کے لئے کبھی بھی بند نہیں ہوتے میں ناحق باہر سے خالی ہاتھ لوٹ جاتی رہی۔ بہت سی سیڑھیاں تھیں۔ ہر سیڑھی پر علم کے خزانے کا ایک صندوق رکھا تھا۔شرط یہی تھی کہ امرتا سے ملاقات کے لئے اس خزانے کو پھلانگ کر اوپر نہیں جانا بلکہ اس کا لفظ لفظ دل میں اتار کر آگے بڑھنا ہے۔شرط بہت اچھی تھی ۔ بھلا کون خزانے کو نہ کہہ کر ٹھکرائے گا۔ میں نے بھی خزانہ لوٹنے کا سلسلہ شروع کر دیا پہلے صندوق شاعری کے زر و جواہر سے بھرے ہوئے تھے۔ایک ایک لفظ نگینے کی طرح چمکتا اور دمکتا محسوس ہوتا تھا۔میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں اور میں لفظوں کو دل میں اتار نہ سکی۔عجیب صورتحال تھی۔ میں نے محسوس کیا وہ لفظوں کی ساحرہ ہے۔ ہر شے کو منفرد نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔ جذبوں، خیالوں اور سوچوں کو بھی مادی رنگ میں سامنے لا کھڑی کرتی ہے۔کس لفظ کے کیا معنی ہیں، کیا مفہوم ہیں ۔انہیں کس رنگ میں پڑھوں کس طرح دیکھوں یہ سب جاننے کے لئے میں نے امرتا سے دوستی کرنے کی سوچی اور کئی روز امرتا پریتم کو ساتھ ساتھ لئے پھری۔کبھی اپنے بیگ میں کبھی ساتھ والی سیٹ پر اُسے بٹھائے میں منتظر رہی کہ کبھی تو وہ کھلے گی مجھ سے دل کی بات کرے گی۔ میں نے اس سے دوستی کرنے کے لئے اس کی پسند ناپسند اور مزاج کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ سید اختر حسین کا امرتا پریتم نمبر پڑھا۔احمد سلیم کے طویل مضامین پڑھے۔ دیگر دوستوں کے تاثرات پڑھے مگر بات نہ بنی۔پھر چھوٹے سے رسیدی ٹکٹ نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔رسیدی ٹکٹ جیسے اس سارے خزانے کی کنجی تھی۔ابتدائی صفحات پڑھتے ہی ساری اجنبیت کی دیواریں گرنا شروع ہوگئیں۔ کیونکہ اب امرتا نے مجھ سے بات کرنا شروع کر دی تھی۔وہ تو میری اپنی ہی نکلی بہت گہرے مراسم تھے ہمارے زمین کے مٹی کے محبت کے۔ایک ہی مٹی سے ہمارا خمیر اٹھا تھا۔اس کی والدہ راج بی بی مانگہ ضلع گجرات کی تھیں یعنی امرتا کا ننھیال گجرات میری سرزمین تھا۔وہ گجرات جو علم وادب اور محبت کی سرزمین ہے۔اُسی سے امرتا بھی جڑی ہوئی تھی۔علم وادب اور عشق ومحبت اسے نانک والی میں بھی ملے تھے اور اس کی سرشت بھی انہی کی

مرکب تھی۔ یوں سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ امرتا کی والدہ کا بیاہ گوجرانوالہ میں ہوا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی شوہر فوج میں کام آ گیا۔ یوں دل کا دل سے رابطہ ہوا نہ وہ شوہر کے رنگ میں رنگ سکی۔ شاید قدرت نے کسی اور شخص کے دل کو اس کے حُسن کے چراغ سے روشن کرنا تھا۔ راج بی بی کا بھائی بھی فوت ہو چکا تھا۔ بیوہ بھابی اور راج بی بی دونوں سکول میں پڑھاتی تھیں۔ جب تنہائی اور دکھ کی بہتات ہو اور کوئی دنیاوی آسرا نہ ہو تو انسان اَن دیکھے خدا کا سہارا تلاش کر کے خود میں حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ یہ نند بھابی بھی سکول جانے سے قبل اکثر سنت دیال کے ڈیرے پر گھڑی بھر کے لئے ماتھا ٹیکنے رُک جاتیں۔ ان دنوں وہاں ایک نوجوان نند راج اپنے گھر بار اور مال و دولت کو تج کے اور عیش و عشرت کے پیرہن اتار کر گھیروے کپڑے پہن کر سادھو بن بیٹھا تھا۔ ہر وقت آنکھیں بند کئے گیان کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ ایک دن بارش کی وجہ سے راج بی بی اور ان کی بھابی کو مجبوراً وہاں رُکنا پڑ گیا۔..... کی فرمائش پر شعر پڑھتے ہوئے نند سادھو۔ نے آنکھیں کھولیں تو سامنے راج بی بی بیٹھی ہوئی تھی اس سے آنکھیں کیا چار ہوئیں گیان اور دھیان کی دنیا تہس نہس ہو گئی۔ محبت نے نند سادھو کے اپنی تحویل میں لے لیا کہ اس نے گھیرا چولا اتار کر چاہت کا لباس زیب تن کر لیا اور راج بی بی کے ساتھ ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ امرتا راج بی بی اور نند سادھو کی اکلوتی اولاد ہے۔ والد بھی شعر کہتے تھے امرتا کی پیدائش پر انہوں نے اپنے تخلص بیراگ کو تجسیم کر کے وجود عطا کیا اور امرت نام رکھا۔ امرتا کا وجود محبت کے احساس سے بنا تھا۔ اس لیے وہ نفرت، بغض اور بے انصافی کی فضا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ انسان اپنے وجود اپنے دل اور ذہن سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ اس کا ذہن صاف تھا دل صاف تھا۔ اسے حقیقت کا علم تھا کہ یہ دنیا ایک خالق کی تخلیق ہے اور تمام مخلوق ایک خاندان کی طرح ہے۔ اس نے محسوس کر لیا کہ خالق تو انسان کے اندر بستا ہے اور ہر شخص اس سے منفرد تعلق جوڑتا ہے۔ امرتا کو بھی ہر جگہ وہ دکھائی دیتا تھا۔

صدق سی کجھ انج دا

جتھے وی سر جھکا لیا دہلیز جا پی اوس دی

ناموں یا کاموں سے فرق نہیں پڑتا دل کے اس سبق کو اس نے کبھی فراموش نہ کیا۔ اور ساری عمر مذہب کے نام پر جھوٹ اور نفرت کی دیواروں کو مسمار کرتی رہی۔

شعور کی آنکھ کھولتے ہی اس نے دیکھا کہ ارد گرد تو عجیب کھیل جاری ہے۔ مخلوق کئی خانوں میں منقسم ہے۔ 12 سال کی عمر میں اس نے جو علم بغاوت بلند کیا اسے تا حیات سر بلند رکھا۔ بغاوت کا سلسلہ اس نے گھر سے

شروع کیا۔ اس کی نانی اس کے والد کے مسلمان دوستوں کے کھانے پینے کے لئے برتن الگ رکھتی تھی کم عمر امرتا کے لئے یہ قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ اس نے ہڑتال کردی اور ان ہی گلاسوں میں پانی پی کر رہی۔ کمٹ منٹ پر قائم رہنا اس نے بچپن سے ہی سیکھ لیا تھا۔ وہ ساری عمر انحراف کے راستے پر چل کر خود کو بھی منواتی رہی اور معاشرے کے بنائے ہوئے رسم و رواج کو بھی ٹھکراتی رہی جو انسان کی تذلیل کرتے ہیں۔ اس کی زندگی کا بہترین حصہ لاہور میں گزرا۔ لاہور کی علمی ادبی فضا نے اس کے جوہر کو خوب سنوارا۔ اسے فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ رقص سے محبت تھی۔ لاہور میں تارا چوہدری سے اس نے باقائدہ رقص کی تعلیم حاصل کی۔ ستار بجانے کا شوق ہوا تو باقائدہ ماسٹر رام رکھا اور سراج احمد سے ستار سیکھا۔ لاہور لارنس گارڈن کے عقبی باغ میں ٹینس سیکھی۔ تقسیم کے وقت درد سے دل بجھنے لگا تو بابا گرونانک یا کسی اور ہندوستانی ادیب شاعر کی بجائے وارث شاہ کا نام لے کر روئی۔

اس نے محبت کی تو ایک مسلمان شاعر سے جو بالکل حسین نہیں تھا۔ مگر امرتا کو وہ پوری دنیا میں خوبرو دکھائی دیتا تھا۔ وہ کبھی اپنے فیصلوں سے پیچھے ہٹی نہ پچھتائی۔ اندرجیت اس کی زندگی میں آیا تو اس نے اسے امروز کا نام کا دیا۔ برسوں لوگ امروز کو مسلمان سمجھتے رہے۔ اور شاید یہی امرتا چاہتی تھی۔ سکھ مت میں سگریٹ پینا گناہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے امرتا نے نہ صرف سگریٹ پیا بلکہ بہت ساری نظموں سے اعلانیہ اس کا اظہار بھی کیا ایک اپنے نام کے ساتھ اپنی مختصر داستان رقم کی وہ بھی سگریٹ کی مثال دے کر۔ ہمیشہ سچ لکھ کر اس نے مروجہ نظام سے بغاوت کی۔

چھوٹی عمر میں والدہ کے فوت ہو جانے کی وجہ سے امرتا شدید تنہائی کا شکار ہوگئی۔ مگر اس تنہائی میں اس نے ایک ساتھی کی شبیہہ تراش لی۔ جو اس کی باتیں سنتا تھا۔ اور وہ اس سے اپنے دل کا حال کہہ سکتی تھی کیونکہ وہ اس جیسے خیالات رکھتا تھا۔ یہیں سے اس نے تخیل کو وجود عطا کرنے کی مشق کرنا شروع کردی تھی۔ ذات کے اندھیرے قلعہ میں قید نے اسے انگلیوں سے ٹٹولنے اور محسوس کرنے کی عادت ڈال دی اور وہ ساری عمر یہی کرتی رہی۔ امرتا نے جب لکھنا شروع کیا تھا اس وقت پنجابی ادب پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ ہر جذبے ہر خیال کو حقیقی معنوں میں دیکھا جاتا تھا۔ مجاز کا رنگ زیادہ پسندیدہ نہیں تھا۔ امرتا نے مجاز کو ہی اصل سمجھا کیونکہ مجاز کا تعلق بدن سے ہے وجود سے ہے۔ اور انسان اس بدن کے ذریعے ہی تمام احساسات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ روحانی تجربہ بھی بدن کے بغیر ممکن نہیں۔ محبت دو جسموں کو ایک کرتی ہے۔ تو روحانی تجربہ ممکن ہوتا ہے۔

روحانیت کو بدن سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مٹی کا بدن کئی تقاضے رکھتا ہے۔ خون میں اُگنے والے جذبے اپنا اظہار چاہتے ہیں انہیں خوشبو کی طرح پھیلنا اچھا لگتا ہے۔ اس نے کائنات کی ہر شے کو جسم عطا کیا جس کو چھوا جا سکے۔ جس کو محسوس کیا جا سکے وہ خود لکھتی ہے

''میرے لئے غیر جسمی کچھ نہیں ہر شے کا وجود گوشت پوست کی طرح ہے جس کو ہاتھ سے چھو سکتی ہوں۔'' (ص 114 رسیدی ٹکٹ)

پتھر کے دیوتا سے امرتا کو شکوہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کئے صدیوں سے میٹھی نیند سو رہا ہے۔ حسین دوشیزائیں سولہ سنگھار کئے اس کے در پہ آتی ہیں۔ اس کے قدموں پر اپنا ماتھا رکھتی ہیں۔ اپنے سانس نچھاور کرتی ہیں۔ مگر ان کی سانسوں کی خوشبو، ان کے لمس کی گرمی سے اس پتھر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ کبھی ان کا جواب نہیں دیتا۔ جبکہ محبت جواب مانگتی ہے۔ محبت دو طرفہ ہوتی ہے۔ امرتا ایسی محبت اور پوجا کے خلاف ہے جہاں دوسرا فریق احساسات سے عاری ہو۔ اسکے دل میں حرارت پیدا نہ ہو۔ اس کے احساسات میں طوفان نہ اٹھے اس کے لہو میں جذبے نہ اُگیں۔ اس کی خواہشیں رقص نہ کریں۔ وہ وجود کو اہمیت دیتی ہے لیکن انسان اور جانور میں فرق بھی اسے معلوم ہے۔ بدن جب تک محبت کے رنگ میں پوری طرح بھیگ نہ جائیں ان کے درمیان ہر رشتہ جھوٹا ہوتا ہے۔ بھلے وہ دنیاوی حوالے سے جائز ہی کیوں نہ ہو۔ ''ویوپار'' نظم میں امرتا نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ جسموں کے بیوپار کے کئی بازار ہیں ایسی شادی بھی ایک بیوپار ہے جس میں فریقین کے درمیان محبت نہ ہو۔

ویوپار

جسماں دا ویوپار
تکڑی دے دو چھابیاں وانگر اک مرد اک نار
روز تولدے ماس روز دیچدے لہو
تے آخر کارے وٹ لیندے نیں
لہو مٹی دے نِکے نِکے سکے دو...... ترے...... چار
مہنگے مہنگے نقشاں پچھے کدے کدے کوئی قدر دان آ
لمی چوڑی، داج، وری، دی بولی دیندے تار......

دنیا مادہ پر یقین رکھتی ہے جو احساس سے عاری ہے، اسلیئے امرتا اُسے ''ماس دا شجرہ'' کہہ کر پکارتی ہے جہاں سپنا، پھل پھول نہیں سکتا۔

دنیا نرے ماس دا شجرہ ، سُپنا بے اولادا وے

ایس دنیا نوں کہیہ کجھ کہیے جیہڑی ایس موت تے ہسے

''گرچہ ہر شے گوشت پوست کی ہے لیکن اس میں سپنا اور احساس بھی ہونا چاہیے وہ سپنے کی موت برداشت نہیں کرتی۔'' کیونکہ سپنا، احساس اور خواب سے جُڑا ہوا ہے اور احساس اور خواب کے بغیر انسانی جسم صرف مادی شے بن جاتا ہے۔ لیکن جسم کو مادہ نہیں بننا چاہیے کیونکہ اس مادی جسم کو روح، سانس، خوشبو اور آہ نے کس کے باندھا ہوا ہے اور یہ گرہ کسی سے نہیں کھلتی۔

گنڈھ

ہوٹھاں دا کپڑا پاٹ گیا
پر گنڈھ نہیں کُھلدی ساہواں دی......

ایہہ گنڈھ ساڈیاں روحاں دی
ایہہ گنڈھ ہے دو خوشبواں دی
ایہہ گنڈھ ہے تتے ہوکیاں دی
ایہہ گنڈھ ٹھنڈیاں آہواں دی......

ایہہ گنڈھ جسم دے نھیرے دی
ایہہ گنڈھ جسم دے چانن دی
ایہہ گنڈھ ہے دو عرضوئیاں دی
ایہہ گنڈھ ہے دو درگاہواں دی......

یعنی دو وجود جب ایک ہوتے ہیں تو ان کی روحیں، خوشبوئیں، احساسات، اچھائی برائی، سب ایک ہو جاتے ہیں۔

امرتا کو اپنے دیرینہ دوست سے شکوہ ہے کہ وہ دل کے باغوں میں اُگنے والی ہری چائے کی پتیوں کی طرح

باتوں کو فوراً توڑ کر اور چھپا کر خشک ہونے کے لئے رکھ دیتا ہے تو دل کا نگر اداس ہو جاتا ہے اور اس کی حرارت دھیمی ہو کر بجھنے لگتی ہے۔ امرتا کو یقین ہے کہ جذبوں کی بجھی لکڑیوں کو پھونک مار کر جلایا جائے تو عشق کی حرارت بول پڑے گی اور میرے جسم کی دیگچی میں دِل کا پانی کھول اُٹھے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے یہ پوٹلی تو کھولو، خشک کی ہوئی پتیوں کو نکال کر برتن میں ڈالو اور گرم گرم گھونٹ ہم دونوں پی کر دیکھیں ورنہ عمر گزارنی مشکل ہے۔ عشق کی یاد میں سارا بدن وتری مٹی کی طرح ملائم ہو جاتا ہے۔ اور لفظ اس مٹی میں بیج کی طرح گرتے تو پھول بن کر کھلتے ہیں تو وجود مہک مہک جاتا ہے۔ وہ تمام کائنات کو جادو کے عمل سے دل کے صحن میں لے آئی ہے۔ وہ اس سے باتیں کرتی ہے۔ زمین آسمان، سورج چاند ستارے، پھول درخت پہاڑ وجود رکھتے ہیں۔ مگر امرتا نے انہیں احساس اور زبان بھی عطا کر دی ہے۔ وہ سب اس سے باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ نظر نہ آنے والی چیزیں بھی مجسم ہو کر سامنے آتی ہیں۔

عشق پچھیند ادس نی جندے کیکن دے نہہ گزارے؟
جند کہے ''میں سُپنے تیرے مہندی نال شنگارے''

عشق پچھیند ادس نی جندے کیکن نین روندے؟
جند کہے ''میں لکھاں تارے زُلف تیری وچ گندے''

جہاں وہ تجسیم کے فن میں ماہر ہے۔ وہاں وہ تحلیل کرنا بھی جانتی ہے۔

گھول کے سورج اساں
دھرتی نوں ڈوبا دے لیا
تاریاں دے نال کوٹھا
گگن دا لنبیا اساں

سپنے کو گھونسلہ کہنا بھی امرتا کا کمال ہے

سُپنیاں دے آلھنے وچ رات بھر کوئی رہ گیا
گل سی نروان دی پر جسم خاکی کہہ گیا

دھرتی اور آسمان بھی ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں

ہوٹھ کجھ اسمان دے ہلدے پئے
کول ہو کے سُن ذرا اج دھریئے
رات دی بھٹھی نوں کس نے بالیا
کھولدی ہے دیگ سورج دی کیویں
بات ہے دنیا دی دنیا والیو
دیگ وچ پھر بھنا ہے عشق نے

تاثر میں شدت پیدا ہوگئی ہے

رات میری جاگدی تیرا خیال سوں گیا
سورج دا رُکھ کھڑا سی کرناں کسے نے توڑیاں
تے چن دا گوٹا کسے نے انبر توں اج اُدھیڑیا
کیوں کسے دی نیند نوں سُپنے بلاوا دے گئے
تارے کھلوتے رہ گئے انبر نے بوہا ڈھو لیا

*

جس رات دے ہوٹھاں نے کدے سُپنے دا متھا چُمیا
سوچاں دے پیریں چھنکدی اک جھانجھر جیہی اوس رات دی

*

ہجر دی اس رات وچ کجھ روشنی آوندی پئی
پھیر بتی یاد دی کجھ ہور اُچی ہو گئی

*

اج اساں انبر دے گھڑیوں
بدل دی اک چپّی لاہی
گُھٹ چاننی پیتی
ڈاڈھی اُچی کندھ وقت دی

انبر عاشق اوندھی پائی

بیٹھا دھند دا حقا پیوے

پورب دی اج منجی خالی

کوئی سویر بہن نہ آئی

احساسات کی دنیا وسیع ہے مگر امرتا کیلئے کائنات ایک مکان میں سمٹ گئی ہے، کبھی وہ چاند سورج کا گولہ پکڑ کر کھیلتی ہے، کبھی سورج مکھن کا پیڑا بن جاتا ہے اور کبھی چوکی پر رکھے آسمان سے گر گر چکنا چور ہو جاتا ہے اور اس کے کنکر جذبوں کی آنکھوں کو لہولہان کر دیتے ہیں۔

اچن چیتی پا واٹھا

انبر دی ایس چونکی اتوں

ڈِگ پیا شیشے دا سورج

روح امرتا کے نزدیک ایک آگ کا نام ہے۔ جو پتھر وجود میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ انسان کی ہستی ذہن، دل اور روح کی ہم آہنگی کا نام ہے۔

سوچاں دے سرور ہتھاں نوں دھوتا

متھے وا دیوا میں تلیاں تے دھریا

تے روح دی اگ چھوہائی......

اسے سورج روشنی زندگی اور امن سے پیار ہے، مگر اس کا سورج بادلوں کے محل میں گہری نیند سو رہا ہے جہاں نہ کھڑکی ہے نہ دروازہ ہے نہ سیڑھی اندھیرا اس کے سینے میں صلیب کی طرح چبھتا ہے لیکن وہ بے شمار دکھوں کے باوجود کبھی زندگی کو نہ نہیں کرتی، ہمیشہ کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر کے زندگی کو ہاں کہتی ہے اور اس کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ غور کیا جائے تو وہ تمام عمر سچ اور جھوٹ کے درمیان گوشۂ عافیت تلاش کرتی رہی۔ منافقت کے دور میں ایسی جگہ جو سچے انسان کے لیے رہنے کے قابل ہو۔

چل! چھناں دے سر تے اک چھت پائیے!

دیکھ! اوہ...... ساہمنے، پرانہہ، اودھر......

سچ اتے جھوٹھ دے وچکار کجھ جگہ خالی ہے......

حقیقت کا بیان امرتا پر ختم ہے۔ خوف تو اس کی سرشت میں ہی نہ تھا اور کسی بھی سچے انسان کی خوف سے دوستی نہیں ہو سکتی۔ مگر عورت ہوتے ہوئے اس نے خواہ مخواہ کی دکھاوے کی چادر نہیں اوڑھی بلکہ ایک مکمل انسان کی طرح تمام دکھ سکھ خوشیاں غم انسانی فطرت کی خوبیاں خامیاں اور دل کی خواہشیں لئے کھڑی ہے۔ اس کی شاعری تو ایک بازار ہے جس میں اس کی حیاتی کا ہر روپ موجود ہے۔ جو اس کے دل پر بیتتی ہے۔ جو اس کی روح اور دل محسوس کرتے ہیں جو اس کا بدن جھیلتا ہے سب رقم کر دیا ہے۔ اور سب کو بتا دیا ہے کہ یہ غم اس معاشرے میں ایک انسان کا نہیں ساری دنیا کا ہے، کبھی وہ دنیا کی نمائندگی کرتی ہے اور کبھی تمام دنیا اس کے غم میں شریک ہو جاتی ہے۔ ہر محاذ پر دونوں کا دکھ ایک رہتا ہے۔

دیکھ لفظاں دا کھڑاک نہ کریئے!

کہ تیری عمر دے کنے ہی ورھے، میرے بدن وچ ستے پئے......

اوہ جاگ اٹھے تاں کیکن کہاں گی

کہ کسے جان والے نوں، پچھوں وی واج نہیں ماری دی......

کسی پرانے دوست سے ملاقات کا احوال لکھتے ہوئے جو کئی بار بلانے پر نہیں آیا امرتا خوشی سے نہال ہو گئی ہے۔ اس کے ہونٹ گملے بن گئے ہیں جن میں خوبصورت پھول کھلتے ہیں۔ امرتا شیشے کی صراحی میں خیالوں اور نظروں کی شراب بھر کر جام بناتی ہے اور سب پیتے ہیں۔ اسے وہ گھڑی بھی یاد ہے جب اس کے محبوب کی اچانک آمد پر کمرے میں وقت حیران کھڑا رہ گیا تھا اور اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اس نے گھبرا کر کھڑکی سے چھلانگ لگا دی تھی تو اس کے گھٹنوں سے جو خون نکلا وہ آج تک امرتا کی یاد کی کھڑکی میں جما ہوا ہے۔

پر اوس دن وقت نے جد باری چوں چھال ماری سی

تے اوس دے گوڈیاں وچوں جو لہو سمیا سی

اوہ لہو

میری باری دے تھلے اجے تک جمیا ہویا ایہہ

اسی طرح کبھی کبھی کوئی پرانی ملاقات بھی تجسیم ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے تو بہت حیرانی ہوتی ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے دی ملاقات

اج سا ہمنے اوس چوک وچ اک سنتری وانگوں کھڑی

تے میریاں سوچاں دا لانگھا اوس ہتھ دے کے روک دتا ہے

جانے خدا میں کیہ آکھیا سی تے جانے خدا تو کیہ سُنیا ہے

مرد اور عورت کی محبت کی حیوانی سطح کا رومانس جس میں بدن کا لہو بدن کی بُو سونگھتا، جنگلی جانور کی طرح چنگھاڑتا اپنے دانتوں اور پنجوں سے کھال اُدھیڑتا ہے اور پھر اک دن پالتو کتے کی طرح شریانوں میں بیٹھ کر دُم ہلاتا ہے۔

''میں'' بنا میرا جسم

پُن دی تھالی وچ اپرادھ دا اک سِکن اے

ماس دے وچ قید ہویا ماس دا اک چھن اے

گوشت پوست کے وجود کا سب سے بڑا سرمایا محبت کا جذبہ ہے وہ وصل کے لمحات کو کس خوبصورتی سے تجسیم کرتی ہے۔

اج ماگ دی راتے میں ندیئے پیر پایا

بڑی نگری راتے ایہہ ندی کوسی سی

گل انہوئی......

پانی نوں انگ لایا تاں ندی دودھ دی ہوئی

کوئی ندی کراماتی، میں دودھ وچ نہاتی

ایس تکونڈی ایہہ کیہی ندی؟ کیہا سُپنا؟

تے ندی وچ چن تردا سی

میں تلی اُتے چن دھریا، گھٹ بھریا

تے ندی دا پانی میری رت وچ گُھلدا پیا

تے اوہی چانن میری کُکھ وچ ہلدا پیا......

دنیا میں کئی دیواریں راستہ روکے کھڑی رہتی ہیں دیوار کے ساتھ سائے اور چھت کا ساتھ بھی ہے مگر زیادہ تر رکاوٹ ہی مفہوم لیا جاتا ہے پتل، لوہے، چندن کی دیوار کی طرح گوشت کی دیوار ہے......

تے اک ماس دی ایہہ کندھ سی، ہن وی ہے

تے ایہدے پچھوں سپیاں دا نیلا رنگ دِسدا سی

ہن وی وسدا ہے

اوہ چھاتی دے تراں نال کندھ نوں بھندی رہی

پر ماس دی ایہہ کندھ...... محبت دی کندھ

کدے وی کھلدی نہیں

*

دھڑ ایک درخت ہے، جس پر گوشت کے پھول کھلتے ہیں

دھرتی دیاں ٹاہنیاں اُتے

روز ماس دے پھّل کھڑدے نیں، ماس دے پھّل جھڑدے نیں......

پر اک پھّل کیہا کو کھڑیا، پر اک پھّل کیہا کو جھڑیا

دھرتی اجّ کدے نہ ہسّی، دھرتی اجّ کدے نہ روئی

کہیو جیہی ایس دی خوشبوئی، پھّل مویا پر مہک نہ موئی......

وجود ایک حقیقت ہے، گوشت پوست مادہ ہے مگر وہ پتھر کی طرح ساکت نہیں بلکہ ہر لمحہ اس میں آگ کی بھٹی جلتی رہتی ہے۔ جبکہ پتھروں میں نہ آگ ہے نہ لمس ہے۔

پتھر دے دیوتا، پتھر دے پجاری

وصل انگ نہ چھوہندا

تے برہا بھنگ نہ ہوندا

پر پتھراں دی نگری کوئی اُگ نہ پالے

چھاتیاں دے چُلھے کوئی اُگ نہ بالے

متھیاں دی بھٹھی کوئی اُگ نہ سیکے

امرتا جب بھی تن کی بات کرتی ہے من کو بھی ساتھ رکھتی ہے۔ تن اور من کے تقاضے مختلف نہیں

نی مائے......

نی مائے! دس کیہڑیاں رُتاں، میرے متھے وچ پھل کھڑیا
میرے تن دی تے من دی مٹی، گلابی جیہا رنگ چڑھیا......

☆

تن من پر جب بہار رُت آتی ہے تو ماتھے پہ پھول کھلتا ہے۔ تن من کی مٹی گلابی ہو جاتی ہے۔ ہر طرف جھانجھر کی مدھر آواز سماعتوں میں رس گھولتی ہے اور رقص خون میں شامل ہو کر پورے وجود کو محبت کی ایسی لے عطا کرتا ہے کہ انسان جو قدم اُٹھاتا ہے، جھومتا ہے۔ بغیر محبت کے جنسی رشتہ بھی مکینکی زندگی کا حصہ بن کے رہ جاتا ہے۔ انسان بے شمار کاموں میں اُلجھ کر اس جذبے سے بھی لاتعلق ہو جاتا ہے اور لمحاتی تعلق باقی رہ جاتا ہے۔ جسم کو کاموں کی فیکٹری کہتے ہوئے امرتا لکھتی ہے۔

میں اپنے مردنوں مِلدی
جیویں پیلیاں چوں اک گاجر
جاں مولی نوں توڑ کے
کوئی بُھکھ نوں اک ٹھلھ پاندا اے

اگر چہ امرتا ہر شے کو کنکریٹ حالت میں دیکھتی ہے۔ مگر کبھی کبھی ٹھوس چیزیں بھی خیال بن جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ وجود بھی وہم اور سایہ محسوس ہونے لگتا ہے۔

میں چھاواں دے اندر ڈولدی اک چھاں سال
تے شاید توں وی اک خاکی جہیا سایہ

نظم ''وشواس'' میں امرتا نے خیال، جذبے اور احساس کی طرح افواہ کو بھی ایک مادی وجود اور زندگی کی حرارت بخش دی ہے۔ وہ حرکت کرتی ہے، دیواروں کو ٹکریں مارتی ہے، سوراخوں اور سرنگوں میں گزرگاہ تلاش کرتی ہے، تاکہ امرتا تک پہنچ سکے مگر امرتا نے کانوں میں عشق کی روئی ٹھونس کر بیرونی دنیا سے رابطہ ختم کر رکھا ہے۔

اک افواہ بڑی کالی
اک چام چٹھ وانگوں میرے کمرے چ آئی ہے
کندھاں نوں ٹکراں ماردی

تے کُھڈاں موریاں تے سرنگاں لبھدی
پراکھاں دیاں کالیاں گلیاں
میں ہتھاں نال ڈھک لئیاں، ہن
تے تیرے عشق دا میں کناں چ رُواں دے لیا ہے......

امرتا کا جسم ''میں'' جو ''تو'' سے مل کر وجود بنتا ہے۔ ''میں'' پانی کا روپ ہے اور ''تو'' آگ جو روشن بھی کرتی ہے حرارت بھی بخشتی ہے زندگی کی علامت ہے اور من سے خیال غیر کا سارا مواد جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

امرتا جب میں اور تو کی بات کرتی ہے تو صدیوں پرانے یونانی فلسفے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کہ شروع میں مرد اور عورت ایک وجود کا حصہ تھے اور بعد ازاں ایک دیوتا نے ان کی کسی غلطی کی وجہ سے انہیں کاٹ کر علیحدہ کر دیا۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کی طرف غیر شعوری اور غیر اختیاری کشش رکھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے سے ہستی کی تکمیل ہوتی ہے۔

ایہہ میں دی مٹی دی تریہہ سی
کہ اوس نے توں دا دریا پیتا،
ایہہ میں دی مٹی دا ہرا سپنا
کہ توں دا جنگل اوس لبھ لیتا
ایہہ میں دی مٹی دی واشنا
تے توں دے انبر دا عشق سی
کہ توں دا نیلا جیہا سپنا
مٹی دی سیج تے سُتا!

دو الگ جسموں میں قید انسان تمام عمر ایک دوسرے کو آوازیں دیتے رہتے ہیں۔ جب دو جسم ایک وجود بن جاتے ہیں تو پتھروں کی سیج بھی پھولوں میں بدل جاتی ہے۔ آنکھیں ہونٹ، انگلیاں، پوٹے دو بدنوں کے اکھر بن جاتے ہیں۔ جو محبت کی داستان لکھتے ہیں

ایہہ میرا تے تیرا میل سی
اسیں پتھراں دی سیج تے سُتے،

تے اکھاں، ہونٹھ، انگلاں، پوٹے

میرے تے تیرے بدن دے اکھر بنے

''میں''اور''تو'' کی دوستی اور''میں'' کو''تو'' کی پہچان ہی اصل حقیقت ہے۔ یہی محبت ہے۔ یہی عبادت ہے یہی ریاضت ہے۔''میں''اور''تو'' کے ملاپ سے قبل دو جسم جذبوں، احساسات سے عاری تھے۔ روح سے بے خبر تھے۔ روحانی ترقی بھی دو کی ایک میں ضم ہونے سے ممکن ہوتی ہے۔

میں نے جد توں نوں پہنیاں

تاں دوویں ہی پنڈے انتر دھیان سن،

انگ پھلاں دی طرح گند ھے گئے

تے روح دی درگاہ تے ارپے گئے......

ویسے تو''میں'' کے تصور میں''تو'' کا تصور پیدائشی ہوتا ہے مگر جب جسم کو اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے اس کے احساس میں پھول کھلنے کا موسم آتا ہے، لفظ سے ذہن روشناس ہوتا ہے اور لب ادائیگی کا ہنر جانتا ہے۔ تو اس کی نظر کے سامنے سب سے پہلے''تو'' کا اکھر لہراتا ہے۔

میں دی جدرت مولی سی

ماس دے بوٹے نوں بور آیا سی

پون کنیں مہک بجھی سی

توں دا اکھر لہلہایا سی......

امرتا کی نظم''نِیل'' دو جسموں کے ملاپ نہیں روح اور جسم کے ایک ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ جسم یہاں روح کے تابع ہے۔

تے ایس توں پہلاں

کہ کجھ وتھ تے کھلو تے اسیں مک جائیے

چل! کھنگر اں جیہے پنڈے پانی تے وچھایئے!

توں اپنے پنڈے تے پیر رکھیں،

تے ادھے دریا نوں لنگ آویں!

میں اپنے پنڈے تے پیر رکھاں گی

......تینوں اگوں دی ملاں گی

یعنی بدن تو ٹھنگر پتھر کی طرح ناکارہ ہے۔ اس لئے اس بدن کو کشتی بنا کر چلیں تو محبوب سے ملن ممکن ہوتا ہے۔ یہاں بدن مقصد نہیں مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہاں امرتا بدن سے آگے کسی منزل کی بات کرتی نظر آتی ہے۔

میری سیج حاضر ہے......

پر جُتی تے قمیض وانگن

توں اپنا بدن وی اتار دے

پرانہہ مُوڑھے تے رکھ دے

کوئی خاص گل نہیں......

ایہہ اپنے اپنے دیس دا رواج ہے!

انسان کا وجود روحانی اور مادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلنے سے ہی وجود مطمئن ہو سکتا ہے۔ خالص مادی یا خالص روحانی دونوں غیر انسانی ہیں۔ مادہ حقیقت ہے اور روح مادہ کے اندر ہے تو حقیقت ہے ورنہ ہمیں اس کا ادراک ہے نہ شعور، جسم اور روح الگ الگ تو نہیں، ان دونوں کے ملاپ سے ہی وجود بنتا ہے۔ اس لئے جب جسم کی بات کی جاتی ہے تو روح کو دیس نکالا نہیں مل جاتا بلکہ اس میں روح بھی شامل ہوتی ہے روح کے بغیر تو جسم صرف مٹی کا پتلا رہ جاتا ہے۔ ہاں روح اور جسم کی دوستی کی مختلف سطحیں ہیں۔ امرتا کے نزدیک بھی جسم سے مراد ایسا مکمل وجود ہے جہاں روح اور بدن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوں۔ ان میں مکمل ہم آہنگی ہو۔ لیکن روح کی بات کرنا جسم کے تقاضوں سے دستبردار نہیں ہونا ہے۔

امرتا پریتم ایک ہستی کا نام ہے۔ لیکن اس کا دل ایک ایسا محل ہے جس میں سسّی سوہنی، پورن، سندراں اور ہیر نے بسیرا کیا ہوا ہے۔ اس نے ان سب کے خیالات بُن کر حیاتی کا جوڑا بنایا ہے۔ اور جب بھی وہ یہ لباس زیب تن کرتی ہے تو وہ سب اسکے محسوسات میں در آتی ہیں۔ چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اپنی اپنی بولنے لگتی ہیں۔ اور امرتا قلم بن کر لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔

خدا نے جب انسان کی تخلیق کی تو آگ، پانی، مٹی اور ہوا کے مرکب میں اپنی روح ڈال کر زندگی بخشی۔

اب امرتا کا کمال دیکھیے روح کا یہ قصہ کس طرح تجسیم کر کے بیان کرتی ہے اور ربّ کے روحانی وجود کو بھی لفظوں کے چولے پہنا دیتی ہے۔ درخت انسانی جسم ہے اور رب روح ہے۔

رب جی! توں میرے رُکھ تے آ کے

اک دن منت منی

تے چولے نالوں پاڑ کے گنی

رُکھ دی نا ہنی بنھی

خدا نے اس جہان میں ہر انسان کو مختلف ذمہ داریاں سونپی تھیں امرتا کے ذمے سچ لفظ لکھنا تھے۔ وہ اس نے لکھے اگر چہ اس کے عوض اسے کبھی انہی سوچوں کی سولی پر لٹکنا پڑا، کبھی زمانے کی مخالفت سہنی پڑی مگر وہ سرخرو ہے اب خدا اپنی روح کو واپس بلا لے۔

آ ورب جی رُکھ نالوں

ہن نا کی کھولن آؤ

تے روح دا اک اخیری اکھر

اپنی جھولی پاؤ

وصال کے بعد خیال اس کے ذہن میں نہیں کوکھ میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ انہیں اولاد کی طرح جنم دیتی ہے۔

کہ اک انبری سپنا

مری لکھ وچ آیا

تے بیا سی دناں تک

میری لکھ وچ بیٹھا رہیا

لفظوں کو برتتے انہیں نئے مفہوم دینے، خیال کو جسم کا لباس پہنانے کے ہنر جاننے والی امرتا کہتی ہے کہ میرا وجود تو چپ کا درخت ہے اور میں نے اس درخت سے ارادتاً کوئی لفظ نہیں توڑا مگر جو خود بخود جھڑ کر میری جھولی میں آن گرے میں انہیں جمع کرتی رہی۔ اس کے کان کوئی آواز نہیں سنتے مگر جو حرف اس کے لہو میں بولتے ہیں وہ صرف انہیں سنتی ہے کیونکہ وہ سچے حرف ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے روزمرہ حالات کو ذات کی

کھڈی پر بُن کر کہانی بنائی ہے اور ذات کے درخت سے جھڑنے والے لفظوں کو امرتا نے انگلیوں کا لمس، دل کا درد اور لہو کی حرارت عطا کر کے زندہ کر دیا ہے اور زندہ لفظ کبھی نہیں مرتے۔

نہیں...... چپ دے ایس رُکھ توں
میں اکھر نہیں توڑے
ایہہ تاں جو رُکھ نالوں جھڑے سی
میں او ہی اکھر چُنے ہن......

امرتا گوشت کے بدن کو ایش ٹرے کہتی ہے۔ جس میں وجدان اور الہام بھی راکھ بن کر گرتے ہیں۔

تے میں آدم...... اخیر وچ بندا ماس دی اک ایش ٹرے
الہام دے دھوئیں توں لے کے سگریٹ دی راکھ تک

کائنات کا سارا قصہ ''میں'' اور ''تو'' کا قصہ ہے، ''میں'' کے ساتھ ''تو'' کا تصور وابستہ بھی ہے اور لازم و ملزوم بھی۔ ''میں'' کے جسم میں ''تو'' سانس کی طرح رہتا ہے۔

میں وی جو سوچاں پیتیاں
اونہاں دی راکھ جھاڑی سی
تُسی وی جھاڑ سکدے او

امرتا کے لئے سوچ سگریٹ کی طرح ہے۔ وہ سوچ کو سگیٹ کی طرح پیتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کا من، احساس اور جذبہ سگریٹ کی طرح سُلگ سُلگ کر راکھ بنتا ہے۔ لیکن یہ راکھ بہت قیمتی ہے اسی لیے امرتا اسے نظم کے صندوق میں سنبھال دیتی ہے۔ نظم ''اگ دی بات میں'' امرتا نے جسم میں جان کی صورت سلگنے والی سگریٹ کی بات کی ہے۔ جو محبوب نے سُلگائی تھی۔ سگریٹ جل گئی مگر عشق کی مہک محبوب کی سانسوں اور ہوا میں ہمیشہ کے لیے رچ گئی۔ امرتا کو زندگی کی پرواہ نہیں عشق کی آگ کی پرواہ ہے۔ کیونکہ عشق کی آگ جلتی رہنی چاہیے۔

اگ دی اِک بات ہے توہیں ایہہ بات پائی سی
اوہی سگریٹ جند دی جو توں کدے سُلگائی سی

ایس میرے جسم اندر ساہ تیرا چلدا رہیا
دھرتی گواہی دے گی دھواں نکلدا رہیا

ویکھ ٹوٹا آخری اُنگلاں دے وچوں چھڈ دے
سیک میرے عشق دا پوٹا نہ تیرا چھوہ لوے

راکھ کب بنتی ہے پتے کب گرتے ہیں درد کے سگریٹ سے جھڑنے والی راکھ نظموں کی صورت کب اختیار کر جاتی ہے۔ جب وجود ریاضت اور تپیا کی بھٹی میں جل کر نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اِک درد دی......
جو سگریٹ دی طرح میں چُپ چاپ پیتا ہے
صرف کجھ نظماں ہن......
جو سگریٹ دے نالوں میں راکھ وانگن جھاڑیاں......

اس نے اپنے پورے وجود کو قلم بنالیا تھا۔ یا اس کے دل میں اتنے جذبے اتنے احساسات تھے کہ ان کو رقم کرتے کرتے پورا وجود قلم میں ڈھل گیا تھا لیکن اس نے کبھی اپنے فن اور ہنر پر مان نہ کیا۔ اگر مان کیا تو سچ لکھنے پر۔ اسے فخر تھا تو صرف اس بات پر کہ وہ عشق کی ہر آزمائش میں سرخرو ہے۔

اُسے ناز تھا اپنی انفرادی سوچ اور مسلک پر کہ وہ چھاؤں بھرے رستوں پر چلنے کی بجائے کانٹوں پر چل کر نئی راہیں بناتی رہی۔ زندگی میں بے شمار مخالفتوں کا سامنا کرنے والی حساس امرتا مر کر امرت ہو گئی کیونکہ علم و ادب سے محبت کرنے والوں نے اسے دل کے تاج محل میں سجالیا اور اس دنیا میں دل کے تاج محل سے اعلیٰ کوئی جگہ نہیں۔ اپنے محبوب کو اس نے اپنے گیتوں کا حصہ بنا کر ذات کا حصہ بنالیا۔ اس کی باتیں اس کی شاعری اس کی زندگی الگ نہیں۔

مان سُچے عشق دا ہے، ہنر دا دعویٰ نہیں
قلم دے ایس بھیت نوں کوئی علم والا پائے گا......

عشق دی دہلیز تے سجدہ کرے گا جد کوئی

یاد پھر دہلیز نوں میرا زمانہ آئے گا......

امرتا پریتم امن کی دیوی ہے اس کی شاعری امن کا عہد نامہ ہے۔ کائنات ایک ہے، سب لوگ انسان ہونے کے ناطے ایک ہیں اس لئے سب کے لئے اس کی پابندی ضروری ہے۔ اپنی نظم عہد نامہ میں لکھتی ہے کہ زبانی باتیں بہت ہو چکیں۔ اب قلم میں عمل کی سیاہی بھر کر اس عہد نامے پر دستخط کرنا ہوں گے۔ یہ نظم اقوامِ عالم سے خطاب ہے۔ جس میں علم اور قلم کی قدر کرتے ہوئے ہر طبقہ فکر کے لوگوں سے دستخط کی استدعا کی گئی ہے۔

امن دا ایہہ عہد نامہ، آؤ دنیا والیو دستخط کرو!

کاغذ ہے ایہہ تقدیر دا، تے قلم ہے تدبیر دی
اَج قلم دے وچ عمل دی سیاہی بھرو! دستخط کرو

وہ چاہتی ہے کہ ساری دنیا کے لوگ ایک رشتے میں بندھ جائیں۔ انسانیت کے رشتے میں رواداری کے رشتے میں۔ بھلے ان کے دِلوں میں محبت کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر نہ ہوں۔ تمام گلے شکوے رکھتے ہوئے چھوٹی بڑی غلط فہمیاں ناراضگیاں ہوتے ہوئے وہ فیملی فوٹوگراف میں تو اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ کتنی معصوم خواہش ہے۔

اسیں دے سارے...... ہندو تے مسلمان، گورے تے کالے، عربی تے یہودی،
چیک تے روسی، امریکی تے ویت نامی
تے پرانہہ...... پِٹھ موڑ کے بیٹھے ہوئے چینی بھرا
ایس طرح اک تصویر تے کھچا سکدے ہاں
تے جدوں فوٹوگرافر کہے گا...... ناؤ پلیز سمائل!
اسیں سارے اکو وار مسکراواں گے......
کاش ایسا ہو سکے۔

☆☆☆☆

صوفیہ بیدار

پریت کی شہزادی

کبھی کبھی وقت کی سخاوت امیر لمحوں کو جنم دیتی ہے انہی لبریز لمحوں میں سچائی کی افزائش ہوتی ہے جوان کی دھڑکنوں کا ''ست'' پی لیتے ہی ''امر'' ہو جاتے ہیں۔۔۔وقت کا ساحر انگلیوں میں جادو بھر دیتا ہے پوروں سے رس ٹپکتا ہے۔۔۔سورج کہتا ہے میں ''امروز'' ہوں اور مجھے امشب میں ڈھلنا ہے مگر پورے یقین اور وقار کے ساتھ۔۔۔

امرتا جب پریت کی گلی سے گزرتی ہے تو ''بنیروں'' سے جھانکتی آنکھیں نسوانی سرگوشیاں اور ٹاٹ کے پردوں سے لگی بندی کا جل گہنے گجرے میں اسیر مخلوق کو اپنا ''حق'' یاد آ جاتا ہے وہ اس برصغیر کی اسیر عورت کو پاؤں کی ''اڈی'' مار کر جگا جاتی ہے جو صرف درد کی منتقلی اپنی بیٹی کو کرنے پر مامور ہے۔

پنجاب کے سینے پر چلتی ٹرین بے کاری کا روگ آتے جاتے جنکشن ویران سٹیشن اندھیرے راستوں کا سفر اور دھرتی کی ''تریڑ'' سے پھوٹتی آواز

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

اتنا ظلم کرنے والے مردوں نے نہیں ڈھایا جتنا وارث نے عورت کو مکمل انسان سمجھ کر اس کے ''اقرار'' کو جگہ دے کر کیا ہے کھونٹے سے بندھی مخلوق رسی تو تڑوا بیٹھی مگر بے سمت راستوں پہ مخالف ہواؤں سے نبرد آزما ہے دل نفرت کو پی جاتے ہیں مگر محبت برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔نفرت وجود کو جوڑ کر کھڑا رہنے کا حوصلہ دیتی ہے مگر محبت میں بدن سیال ہو جاتے ہیں وارث جب پنجاب کی عورت کو اس کی مرضی کا ''بر'' بخشتا ہے تو آنکھیں پگھل جاتی ہیں امرتا کی پکار اس سچ پر مہر ثبت کرتی ہے کہ پنجاب کی عورت جب بھی حق مانگے گی تو کسی حکمران پردھان سے نہیں صرف اور صرف وارث شاہ سے وہ کہتی ہے۔

اک چپہ چن تے مُٹھ کو تارے

ساڈا مل بیٹھے اَسمان۔۔۔

یہ فلسفہ ذات کے اجارہ داروں سے دراز ہوتا ہوا ایوانوں کی حاکمیت تلک طمانچہ ہے ہماری زندگیوں کے آسمان پر چند رشتوں کے ستارے اور مقدر کا چاند حکمرانی کرتا ہے شکیب نے کہا تھا

گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا

گوجرانوالہ سے دہلی تلک یہی نارسائی اسے بھی لاحق تھی ایک عورت جو گھر بساتی ہے جس کی کوکھ آباد ہوتی ہے جس کے آنگن میں قلقاریاں گونجتی ہیں جو انگلیوں میں قلم تھام کر بھی چولہے کی آگ کو سلگائے رکھتی ہے جو محبت کا بھرم بھی نبھاتی ہے اور کرم دھرم پر بھی پورا اُترتی ہے جو سوچتی ہے جو کھوجتی ہے بچے خاوند دوست' یار' عاشق بنتے ٹوٹتے کاغذی رشتے محبت کی پسپائی' دوستی کی فتح' اور ہاتھوں کی کاوش۔۔۔ کیسی بھری بھری عورت ہے امرتا کتنی لبریز۔۔۔ کینوس پر پنجاب کے نقشے سے امرتا کا سراپا اُبھرتا ہے جو نہ ہندو ہے نہ مسلم نہ سکھ نہ عیسائی جو صرف عورت ہے مکمل عورت۔۔۔

اس کے قلم کی سچائی اس کی زندگی کی سچائی سے جڑی ہوئی ہے اس نے دکھ سہنے قبول کیے مگر دروغ گوئی کا نوالہ نہیں چکھا زندگی کو جیسا سوچا ویسا ہی برتا۔ زندگی سے اپنا حق مانگا تو اس کی پوی قیمت ادا کی۔۔۔

لمحہ آخر کو سامنے رکھ کر ہر ہر لمحے کا شہد کشید کیا کہتی ہے

دے میں تڑ کے گھڑے دا پانی

کل تک نہیں رہنا۔۔۔

چناب میں ڈوبتے چاند اور کچے گھڑے کی خوشبو عشق کی معراج ہے۔۔۔ یہ دفینے فنکار کے فن کو اُجالتے ہیں امرتا کو تیرنا آتا ہے تو ڈوبنا بھی آتا ہے اس نے اپنی ذات کے منکشف لمحوں کی کھڑکیاں کبھی بند نہیں کیں۔۔۔

اپنی نظم خالی جگہ میں آخری حصہ ہے

میں کنا ہی چر

پنڈے دے مینہہ وچ گلدا ہار

پھر عمراں دے موہ نوں

اک زہر دا نگ پی کے

اہدے کمبدے ہتھ نے میرا ہتھ کڑیا

چل چھناں دے سرتے ایک چھٹ پائیے

اودیکھ پراں۔۔۔ساہمنے اوتھے۔۔۔

سچ اتے جھوٹھ دے وچکار۔۔۔کجھ جگہ

خالی اے۔۔۔

انہی دو انتہاؤں کے بیچ زندگی بنتی ہے اطراف میں ابنارملٹی abnormality ہے مگر توازن سے عدم توازن تک کا سفر فن کا سفر ہے اپنی نظم ''جان والے'' میں کہتی ہے

میری مُٹ رہی آواز

کیوں ہے تیری مہر میری منت دی محتاج

وفانوں کہہ اج واسطہ پانا پوے گا؟

شاید مشکل ہی ملدا اے وفا داصلہ

کنے ارغوانی سال

میں انجائیاں ہنگال سٹے

صوفیا نے اسی ''رایئگانی'' کو قلمبند کیا ہے مگر اس احساس کے ساتھ کہیں بھی احساسِ زیاں نہیں ہے بلکہ جب شاہ حسین کہتے ہیں ''ایویں گئی وہائے'' او پس پردہ یہی بے لطف بے بساط بسر کی گئی ساعتیں ہیں۔۔۔بشر وقت بسر نہیں کرتا بلکہ وقت بندے کو ''برت'' لیتا ہے انسانوں کی طویل پروئی ہوئی تسبیح کے دانے خاموش رہتے ہیں۔ وقت کا لمس ایک ایک موتی ''کیرتا'' رہتا ہے اس طویل چپ میں ارتعاش تب پیدا ہوتا ہے جب کوئی کوئی موتی بغاوت کر کے ڈوری کو چھوڑتا ہوا چھن سے احتجاج کرتا ہے۔۔۔امرتا بھی انہی باغی موتیوں میں سے ایک ہے۔

☆☆☆☆

طاہرہ اقبال

امرتا پریتم ___ محبت کا غنائی اِستعارہ

کالجوں، اسکولوں میں منعقد ہونے والے پنجابی ناکروں کے آغاز یا اختتام پر امرتا پریتم کی یہ نظم اِک لازمہ سا ہوگئی ہے۔

"اَج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول"

یہ اشعار اتنے تواتر اور اِتنی مدت سے تقریروں کی زینت بنتے چلے آرہے ہیں کہ لگتا ہے آخر ایک روز وارث شاہ تنگ آ کر قبراں وچوں بول ہی پڑیں گے۔ وارث شاہ کو بولنے پر مجبور کرنے والی امرتا پریتم کہتی ہیں کہ اُن کی زندگی کے حالات و واقعات تو بس رسیدی ٹکٹ جتنی وسعت اور تنوع رکھتے ہیں لیکن اُن کی تخلیقی زندگی کی جہتیں اُسی قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں، لیکن میری وسعتِ نگاہ اُن کی ایک جہت افسانہ نگاری تک ہی محدود ہے۔

امرتا ایک شاعرہ ہیں۔ شاید اسی لیے اُن کا افسانہ بھی اِکسدا بہار گیت ہے لیکن طربیہ نہیں غنائیہ ہے۔ ایسا غنائیہ جو سماعتوں میں رس گھولتا اور دِل و رُوح میں اسرار بھری آسودگی اُنڈیلتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے اطوارِ زندگی اور فطرت میں عجب ہم آہنگی رکھتی تھیں۔ اس لیے اُن کی تخلیق کی آنچ جبلتوں، جذبوں اور فطرتوں کو آئینہ سا نکھار دیتی ہے۔ اُس کی تخلیق سچ کی مٹھاس ہے جس کی کڑواہٹ وہ محبت کے دو بول سے چن لینے کا فن جانتی ہے۔ یہ تلخیاں سَتی کی وہ ہوک ہیں، جو سندر کے وجود میں پارو کی یاد بن کر سدا بجتی رہتی ہے۔ "وے میں بھل گئی موڑتے آکے اِک سیٹی مار مترا۔" اُس نے افسانہ دِل والی بولی میں لکھا ہے۔ یہ حکایتِ دِل ہر افسانے کا مرکزی نقطہ ہے۔ سماج ظالم ہے۔ رسوم ورواج کی جکڑ بندیاں اور معاشرتی ناانصافیاں کڑی ہیں۔ جس کی سیاہ روی کوری ہانڈی کو سیاہ بھوتنی بنا دیتے ہیں لیکن اُس کے کورے بدن کی کالک کو نرم ہاتھوں سے

کھرچ مانجھ کر صاف کرنے والا منکا بہر حال موجود رہتا ہے، جو کہتا ہے ''اب میں اسے دھو کر ہانڈی بنالوں گا۔ ماں جواب دیتی ہے مگر اُس کو جادو کیا ہوا ہے۔ ابھی میں اس کا جادو اُتاروں گا۔ جادو کہاں ہے۔ صرف کالک تھوپی ہوئی ہے۔ میں ساری کالک اُتاردوں گا۔'' منکے کے جواب میں امرتا کا فلسفہ حیات پوشیدہ ہے۔

امرتا کے افسانے میں محبت نارسا نہیں ہے اور دِل کی حاکمیت کے سامنے ہر طاقت پسپا ہے لیکن نہ وہ عمر بھر کے ساتھ کی پابند ہے اور نہ ہی جسمانی قربت کی خواہش مند۔ وہ تو پل بھر میں دولت دِل سے سیر ہوتی اور پھر سدا اسی سحر میں مقید رہتی ہے۔ کیونکہ یہ دِل والا جام ہے، جس سے من کبھی بھرتا ہی نہیں نت نئے جام پینے کا عادی مصور سمیش نندا ایک بار اس دِل والے جام کو لبوں سے لگاتا ہے تو پھر عمر بھر وہ ختم ہونے کو ہی نہیں آتا۔ کیونکہ ''ایک لڑکی ایک جام'' کی ٹونی نے کہا تھا۔

''ایک بار جام بھر لو اور جب تک میرے دِل کا یہ جام ختم نہ ہو جائے۔ تب تک کسی اور جام سے اپنے ہونٹ نہ لگانا۔''

سمیش نندا کہتا ہے:

''مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اب تک جتنے جام پیئے تھے وہ اجسام کے جام تھے۔ دِل کے جام نہیں تھے اگر کوئی ایسا ہوتا تو پھر جب تک اُس کی شراب ختم نہ ہو جاتی تب تک میں کسی دوسرے جام سے منہ نہ لگا سکتا۔ شاید دِل کے جام کی شراب کبھی ختم نہ ہوتی۔''

یہ دِل کے جام کی تاثیر ہی ہے کہ امرتا کے ہاں اِک مثبت عمل اِک راست رویہ منفی حالات اور کرداروں میں بھی جاری رہتا ہے۔ اس جذبہ محبت کو اُبھارنے استوار کرنے اور پھر اَمر کر دینے والی ذات بالعموم عورت کی ذات ہے۔ جس کے اندر سے اُمڈتا چھلکتا یہ من کا بھرا پیالہ جنسِ مخالف کو ایسا ذائقہ عطا کرتا ہے کہ پھر عمر بھر اس الوہی ذائقے کو نہ بھلا پاتا ہے اور نہ ہی ہل من مزید کی طلب کرتا ہے۔ کیا زندگی اتنی ہی محبت بھری اتنی ہی شانت ہے، جتنی امرتا پیش کرتی ہیں۔

تجھ سے بھی حسین ہیں غم روزگار کے

جیسے فلسفے کا کہیں گزر کیوں نہیں ہوتا۔ امرتا کا ماحول اور معاشرہ بھی تو یہی کٹھور سماج ہے۔ جیسا ہمارا اُس کے گرد بسنے والے انسان بھی تو ایسے ہی دوغلے اور بد دیانت ہیں جیسے ہمارے گرد، لیکن فرق یہ ہے کہ امرتا

ان خرابیوں کو دست پناہ سے چن چن کرنہیں دِکھاتیں۔ معاشرے کے ناسور دھوپ میں ڈال کراُن کی سڑاند سے نفرت پیدا نہیں کرتیں۔ ہم جن کوڑھوں کو چنتے اوران کی غلاظتیں دِکھا دِکھا کر داد چاہتے ہیں کہ کیسے بدبودار زخموں کی ہم نے چیڑ پھاڑ کی ہے۔ امرتا کا رویہ ان کے لیے بھی ماں دھرتی جیسی پوشیدگی اور شفقت کا ہے جو اپنے تھوڑ جیسے بچے کو بھی اپنی کوکھ میں رکھ لیتی ہے۔ امرتا اگر کوئی منفی کردار دِکھاتی بھی ہے تو اس کے مقابل کھڑے معصوم شانت اور مثبت کردار کا رنگ اتنا چوکھا ہوتا ہے کہ برائی کی سیاہ سطح اُبھرنے نہیں پاتی۔ اُس پر کئی لال گلابی پھول کھل آتے ہیں۔ امرتا اچھے برے کا موازنہ نہیں کرتی نہ اچھائی کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالتی ہے۔ نہ برائی سے نفرت پیدا کرنے کو موازنے کی تکنیک اپناتی ہے۔ وہ تو بس دِل والا راگ چھیڑ دیتی ہے۔ جس کی تاثیر اور آہنگ میں سب پایاب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ''یہاں انھوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈا تھا۔ انھیں لگا جیسے ہر ایک پتھر آج دیوتا بن آ گیا ہے اور اُنھوں نے پھولوں سے بھری مٹھیاں چاروں طرف بکھیر دیں جو کچھ انھوں نے ایک دوسرے سے حاصل کیا تھا تو نہ اُس سے مزید حاصل کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی حاصل کیا ہوا گم ہوسکتا تھا۔ اس لیے پھر راج اور رالگ کبھی نہ ملے۔'' امرتا کا بنیادی فلسفہ اثبات اور استغنا کا ہے۔ زیادہ کی ہوس اور حصول کی خواہش پر اس جذبے یا فلسفے کی پاسداری مقدم ہے۔ اس لیے تو اس کی محرومیاں بھی حزنیہ جیسا مزا دیتی ہیں۔ مجھے کبھی لگتا ہے کہ امرتا کی کہانی وہ تعویذ ہے جسے محبت کرنے والے منڈھا کر گلے میں پہن سکتے ہیں یہ تعویذ چھوٹی سی پڑیا میں سما سکتا ہے اور پوری زندگی کو خود میں سمو سکتا ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ منفی رویوں کے خلاف کہیں غصہ کہیں جھنجھلاہٹ کیوں نہیں اُبھرتی؟ نہ مصنفہ میں نہ متاثرہ کرداروں میں ''ہیرے کی کنی کی جندو اس کا جواب دیتی ہے۔ اپنی موت کے محرک پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔

''تم کہتی تھیں نا کہ تمہارا بیٹا ہیرے کی کنی ہے۔ میں نے وہی ہیرے کی کنی کھالی ہے۔''

ہیرے کی کنی نگلتے ہوئے نہ جندو کے لبوں پر شکوہ ہے اور نہ ہی مصنفہ اعصاب شکن کرب ناک منظر پینٹ کرتی ہے۔ امرتا کے ہاں ہر زہر کا تریاق محبت ہے۔ یہ محبت نہ مشتعل ہوتی ہے نہ انتقام پر اُترتی ہے۔ امرتا کے حوصلے اور بڑے دِل پر بعض اوقات تو حیرت ہوتی ہے وہ سب کچھ خود میں سمو لیتی ہے اور بس۔ ایک ہی احساس کشید کرتی ہے۔ احساسِ محبت۔

کیونکہ امرتا کا بنیادی فلسفہ اثبات، محبت اور استغنا کا فلسفہ ہے۔ وہ حادثے کی شدت یا واقعات کی پیچیدگی میں نہیں اُلجھتی بلکہ روزمرہ کے معمولات اور بنیادی انسانی فطرتوں اور جذبوں سے وہ افسانے کا

تار و پود بناتی ہے۔ نہ تو منٹو کی طرح لرزا دینے والے انجام سے حیرت زدہ کرتی ہے نہ بیدی کی طرح تلخیٔ حیات کو گھول کر افسردہ بناتی ہے، نہ عصمت کی طرح اندر کے راز باہر نکال کر انسانی جبلتوں سے ہمیں شرمسار کرتی ہے۔ نہ علامتوں کا پردہ اور نہ ایمائیتوں کا اسرار۔ اُس کی ہر کہانی محبت کے راست رویوں کی کہانی ہے لیکن کسی کا انجام وصل نہیں ہے جس سے جسمانی ملاپ ہے۔ اُس سے دِل نہیں ملتا اور جس کے سنگ دِل دھڑکتا ہے وہاں بدن کبھی مخل نہیں ہوتا۔ یہ فلسفہ امرتا کے افسانوں کی مضبوط اکائی ہے۔ عموماً ہیروئین اور کبھی کبھی ہیرو جہاں جسمانی طور پر رہتے بستے ہیں وہاں اپنے فرائض پر قربان ہیں لیکن چپکے چپکے اک من مندر الگ بسا رکھا ہے اور اسی من مندر کی حکایت ہی کہانی کا اصل تھیم ہے۔ من مندر کی اقلیم وسیع سہی لیکن تنوع نہیں رکھتی یہ کمی امرتا اپنے خوبصورت اسلوب سے پوری کرتی ہیں۔ لفظوں کو ایسے چنتی اور افسانے میں پروتی ہے جیسے موسیقی میں لرک جو افسانے کی تکنیک پر بجتے ہیں۔ یہ ایسی مصنفہ ہے جو لفظوں کی بندش میں کھلتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے فلسفے اور دانش کے اسرار بھر دیتی ہے۔ اس کے فن کی کلید یہی دانش افروز نپے تلے جملے ہیں۔ واضح صاف لیکن پرتاثیر اور منفرد کہ نوکِ دِل سے لکھے گئے ہیں۔ مندر کی پجارن کے اشلوک کہ برہا کی ماری کے گیت۔ لیکن غزل کے عاشق جیسی بے صبری اور کم ہمتی ہرگز نہیں ہے۔

امرتا اک الگ طرزِ حیات اور منفرد طرزِ بیان کی افسانہ نگار ہے۔ طرزِ حیات میں اُس کا طرزا گر محبت، استغنا اور متاعِ سرمایۂ دِل ہے تو طرزِ بیان میں انھی زمینوں کے خدوخال نکھارنے کو ایسی کشیدہ کاری اور مصوری کہ لفظوں کے دِل بھی دھڑکنے لگیں۔

امرتا معمولی مٹی کو خدا بنا دینے کا فن جانتی ہے۔ بس اسی فلسفے کو اُس نے رُخ اور زاویے بدل بدل کر لکھا ہے۔ ایسے ہی جیسے کوئی مغنیہ محبت کا کوئی گیت الاپتی ہے تو سماعتیں مسحور اور دِل مسرور ہو جاتے ہیں۔ امرتا کا افسانہ بھی اسی سحر اور طمانیت سے بھرا ہے۔

☆☆☆☆

ظفر اقبال
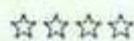
امرتا پریتم' ایک زندہ لیجنڈ

نقاد' شاعر اور میرے ایک کرم فرما ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ایک سوالنامہ پچھلے دنوں بھیجا تھا جس میں مضافاتی ادیبوں کی کارگزاری کے بارے میں پوچھا گیا تھا' نیز یہ بھی کہ کیا میں اس اصطلاح سے اتفاق کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اُن سے اتفاق نہیں کرسکتا کیوں کہ یہ براہ راست ادیبوں کو خانوں میں بانٹنے والی بات ہے جس سے یہ بھی شبہ گزرتا ہے کہ آپ مضافات میں رہنے والے ادیبوں کو شہری ادیبوں کے مقابلے میں ''پینڈو'' ادیب سمجھتے ہیں جو کہ بعض ادیبوں کے نزدیک اشتعال انگیز بھی ہوسکتا ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی ادیبوں کو تقسیم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں مثلاً پاکستانی ادب اور بھارتی ادب کا نام دے کر۔ کارِ خیر سرانجام دیا گیا ہے حتیٰ کہ ہمارے دوست ڈاکٹر انیس ناگی نے تو ''پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ'' کے نام سے پوری ایک کتاب لکھ ماری جس پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک محفل میں ان کے ساتھ ہاتھ ملانے سے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ آپ ایک متعصب ادیب ہیں۔ اس کتاب میں زبان و بیان اور صرف ونحو کی کم وبیش 150 غلطیاں تھیں جن کی میں نے مثالیں دے دے کر نشاندہی کی تھی اور مجھے کہنا پڑا کہ ڈاکٹر انیس ناگی کو کم ازکم اُردو تو سیکھ لینی چاہیے!

واضح رہے کہ ادب کا تعلق ملک یا علاقے سے نہیں بلکہ اس زبان سے ہوتا ہے جس میں وہ تخلیق کیا گیا ہو۔ چنانچہ اُردو ادب خواہ بھارت' پاکستان یا دنیا کے کسی بھی ایسے علاقے میں تخلیق کیا گیا ہو جہاں یہ زبان بولی' پڑھی یا لکھی جاتی ہو' وہ اُردو ادب ہی کہلائے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود اُردو ایسی زبان ہے جس نے یہ تفریق اور تقسیم ختم کردی ہے کہ اس میں ہر زبان کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی اہلیت اور پوری پوری گنجائش موجود ہے کیوں کہ اس کی ابتداء اور ہئیت کِذائی ہی ایسی ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی کو چھوڑ کر دنیا بھر میں اسے

رابطے کی غالباً سب سے بڑی زبان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

چنانچہ اس حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کو بھارتی ادیب نہیں کہا جا سکتا جبکہ فیض احمد فیض، منیر نیازی، منٹو، شوکت صدیقی اور انتظار حسین کو پاکستانی ادیب کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ان کی بنیاد ایک ہے اور وہ اُردو زبان ہے۔ ادب کی کوئی سرحدیں نہیں ہوتیں، نہ ہی اسے مختلف علاقوں اور زمینوں میں محدود کیا جا سکتا ہے۔ اور دنیا جس تیزی سے سمٹ رہی ہے اس حساب سے تو یہ امتیازات ویسے بھی باقی نہیں رہ سکتے۔

بلکہ اکادمی ادبیات نے تو اس سے بھی دو قدم آگے جا کر یہ انقلابی اقدام اُٹھایا ہے کہ پنجابی کی ایک ادیبہ کو یہ اعزاز دیا ہے بلکہ یہ اعزاز خود بھی حاصل کیا ہے کہ امرتا پریتم نمبر نکالنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے حالاں کہ ''ادبیات'' میں صرف اُردو کی تحریریں جگہ پاتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے تراجم شائع کر دیے جاتے ہیں جنھیں فخر زمان بجا طور پر قومی زبانیں قرار دیتے ہیں۔ اس کا ایک جواز یہ بھی رہا کہ پنجابی پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کی بھی زبان ہے اور مشرقی پنجاب کی بھی۔

جہاں تک ''مضافاتی'' ادیبوں کا تعلق ہے تو آخر اُن ادیبوں کو کیا نام دیا جائے گا جنھوں نے اپنی ابتدا تو کسی مضافاتی علاقے سے کی اور اپنے ادب کا بیشتر حصہ بھی وہیں تخلیق کیا لیکن بعد میں بڑے یا مرکزی شہروں میں شفٹ ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ان کا وہ ادب مضافاتی شمار ہو گا جو مضافات میں تخلیق کیا گیا اور بعد ازاں یعنی شہروں میں آ کر تخلیق ہونے والا ادب مضافاتی نہیں رہے گا اور شہری قرار پائے گا، اور ایسا ادیب بھی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بن کر رہ جائے گا۔

شروع شروع میں میرا تعارف امرتا پریتم کے ساتھ اس حوالے سے ہوا تھا کہ اس وقت کے مشہور شاعر ساحر لدھیانوی اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتے تھے۔ ادھر ہمارے ایک مقبول پنجابی شاعر احمد راہی کا بھی یہی حال تھا جنھوں نے اپنی وہ خوبصورت نظم لکھی جس کا پہلا مصرع یہ تھا۔

اک لغراں جیہی مُیار گوری جیدھا منڈیاں ورگا ناں

لیکن افسوس کہ اس نے مصور امروز کے ساتھ گھر بسا لیا اور یہ دونوں دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک زمانے میں منیر نیازی قرۃ العین حیدر کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے لیکن مرحومہ نے پوری

زندگی کنوار پن میں گزار دی۔

قرۃ العین حیدر کے بارے میں مختلف افسانے مشہور ہیں کہ مثلاً وہ تند مزاج تھیں اور ہما و شما سے ملنے سے انکار کر دیتی تھیں جبکہ بعض ادیبوں کے نزدیک وہ انتہائی ملنسار واقع ہوئی تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں پاکستان بھی آئیں اور ریڈیو کے علاوہ مختلف جگہوں پر ملازمت بھی کی اور یہاں ان کا مستقل قیام کا ارادہ بھی تھا جو انہیں بعد میں تبدیل کرنا پڑا اور وہ واپس بھارت سدھار گئیں۔ بہرحال امرتا پریتم کے بعد وہ بھارت کی دوسری خاتون تھیں جنہیں بے پناہ عزت اور شہرت نصیب ہوئی۔

میں گورمکھی سکرپٹ نہیں پڑھ سکتا' اس لیے امرتا کی بعض شاہ مکھی میں اتاری گئی تحریریں ہی میری نظر سے گزری ہیں۔ زبردست اور انقلابی شاعرہ تو وہ تھیں ہی' انہوں نے فنِ افسانہ نگاری کو بھی نقطہء کمال تک پہنچا دیا۔ واضح رہے کہ وہ کوئی ایسی شدت پسند انقلابی یا مزاحمتی شاعرہ نہیں تھیں بلکہ ان کی شاعری میں وہ لوچ' تاثیر اور تازگی بھی دستیاب ہے' جس کی مثال صرف فیض احمد فیض سے دی جا سکتی ہے جبکہ سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر ان کے فن کا دل کھول کر اعتراف کیا گیا۔ انہیں بلاشبہ ایک زندہ لیجنڈ کا درجہ حاصل تھا' اور رہے گا۔ حتیٰ کہ ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' جیسی لازوال نظم ہی انہیں تا دیر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

اگرچہ بلونت سنگھ' کرتار سنگھ دگل اور راجندر سنگھ بیدی بھی پنجابی ہیں لیکن ہمارا دل ان کے لیے اس طرح نہیں دھڑکتا جس طرح امرتا پریتم کے لیے دھڑکتا ہے کیونکہ وہ پنجابی زبان کی شاعرہ ہے اور زبان کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے بزرگ تو قبل از تقسیم ضلع اوکاڑہ میں آباد تھے جہاں چک بیدیاں کے نام سے ان لوگوں کا گاؤں اب بھی موجود ہے۔ پھر اہلِ پنجاب کے ساتھ ہمارے اور رشتے بھی ہیں۔ مثلاً ہماری ثقافت' ہمارے گیت اور بولیاں تک ایک ہیں' نیز سکھ طبقہ ہماری ہی طرح سے توحید پرست بھی ہے۔

ہمارے ایک بزرگ اور ایک قومی روزنامہ کے ایڈیٹر نے اگلے روز کہا تھا کہ بہت جلد بنگلہ دیش پاکستان سے آ ملے گا۔ بنگلہ دیش کا تو میں کہہ نہیں سکتا البتہ مشرقی پنجاب زیادہ دیر تک مغربی پنجاب کے بغیر شاید ہی رہ سکے کیونکہ ثقافتی اشتراک کے علاوہ سکھوں کے مقدس مقامات جن میں ننکانہ صاحب بطور خاص شامل ہے' مغربی پنجاب میں واقع ہیں۔ میں خود ذاتی طور پر کنفیڈریشن کے نظریے میں یقین رکھتا ہوں اور بھارت' پاکستان' بنگلہ دیش' ایران' افغانستان اور ترکی وغیرہ کی یکجائی کا حامی ہوں لیکن خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔

چناں چہ امرتا پریتم کے ساتھ ہماری ادبی جڑت کی بڑی وجہ ماں بولی بھی ہے جو دونوں جگہوں پر مشترک

ہے۔ یہ دونوں حصے جذباتی طور پر مزید قریب ہو سکتے تھے لیکن گورمکھی رسم الخط ہمیشہ سے اس کے آڑے چلا آرہا ہے جب کہ اہلِ مشرقی پنجاب کے لوگوں کے لیے شاہ مکھی رسم الخط اتنا ہی آسان ہے جتنا مشکل ہم لوگوں کے لیے گورمکھی سکرپٹ ہے کیوں کہ اُردو کے ساتھ معمولی شناسائی رکھنے والا شاہ مکھی کے حوالے سے کسی دقت کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس سلسلے میں کچھ کام ہوا ہے لیکن کوئی ٹھوس نتیجہ اب تک برآمد نہیں ہو سکا ہے۔

اگر یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح سے سر ہو جائے تو مشرقی پنجاب کا پنجابی ادب کم و بیش سارے کا سارا اہلِ مغربی پنجاب کی دسترس میں آ سکتا ہے جس سے ہر قسم کی دوریوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہو سکتی ہے اور یہ دونوں خطے الگ الگ رہتے ہوئے بھی ذہنی اور انٹیلیکچول سطح پر ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ سکتے ہیں۔

امرتا پریتم سرحد پار سے غالباً واحد ادیبہ ہیں جن کی وفات پر ہمارے ہاں بھی پورا سوگ منایا گیا جیسے واقعی کوئی اپنا مر گیا ہو۔ ورلڈ پنجابی کانگریس کی طرف سے لاہور میں منعقدہ ادبی ریفرنس اس سلسلے کی سب سے زوردار تقریب تھی۔ انگریزی' اُردو اور پنجابی اخبارات و رسائل نے کھل کر انہیں نذرانہء محبت پیش کیا۔ مضمون باندھے گئے' کالم لکھے گئے اور ان کی یاد میں نظمیں لکھی گئیں۔ اپنائیت کا یہ ایک بہت بڑا مظاہرہ تھا۔

امرتا ایک عجیب اور عظیم خاتون تھیں۔ پروفیسر افضل توصیف ایک جگہ لکھتی ہیں کہ طویل علالت کے آخری دنوں میں ایک نوجوان کہیں سے انہیں ملنے کے لیے آیا۔ امرتا نے اُسے اندر بلا لیا' بٹھایا' نام پتہ اور حال چال پوچھا اور بولیں'

''کیسے آنا ہوا؟''

''مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ یہ سن کر امرتا بیڈ پر سے اُٹھیں' اس کے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ ''مجھے بھی تم سے محبت ہو گئی ہے''۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

''برکی'' جیسی نظم اور ''رسیدی ٹکٹ'' جیسا افسانہ لکھنے والی امرتا پریتم اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ایسے لازوال لوگ، مر کر بھی مرا نہیں کرتے بلکہ اپنے محبت کرنے والوں کے دِلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

رفتید و لے نہ از دلِ ما

فرزند علی

ایک ملاقات

ستمبر 1965 کی جنگ جو پنجاب کی سرحد پر اچانک پھوٹ پڑی تھی عام لوگوں کو اپنا گھر بار مال اسباب سب چھوڑ چھاڑ کر نکلنا پڑا تھا۔ جنگی علاقے سے دور کہیں پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ جنگ کے بارے میں خبریں بہت خوفناک آ رہی تھیں۔ دونوں طرف کے لوگ مر رہے تھے۔ اپاہج ہو رہے تھے۔ کئی اپنوں سے بچھڑ گئے تھے۔

اُن سرحدی علاقوں کے لوگوں میں سے کچھ ہمارے گاؤں میں بھی اپنے رشتے داروں کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اُن پناہ گزینوں میں ایک بابا سراجدین بھی تھا جس نے 1947 کی قتل و غارت اور توہین انسانیت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی تھی اور آج تک خوفزدہ سا دکھائی دیتا تھا جب سراجدین سے میری ملاقات ہوئی تو وہ درد بھری آواز میں

''اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول''

بول رہا تھا۔ میں نے پہلی بار یہ نظم سُنی تو میرے دل میں اترتی چلی گئی۔ پھر بابا سراجدین کی زبان سے نظم کی ادائیگی ۔۔۔ ایک ایک لفظ کے معنی واضح ہوتے چلے گئے۔ جنگ ختم ہوگئی۔۔ بابا سراجدین اپنے کنبے کے ساتھ واپس چلا گیا۔ لیکن میرے لیے درد کی کسک چھوڑ گیا۔۔۔ جب بھی میں بابا سراج سے سنی ہوئی نظم جو مجھے ازبر ہو چکی تھی، دہراتا تو میری عجیب کیفیت ہو جاتی۔

نظم کے خالق کو میں ملنا چاہتا تھا۔ مگر نہ تو بابا سراج کو نظم کے خالق کے بارے میں معلوم تھا اور نہ مجھے۔۔۔ شاعر سے ملاقات کا شوق میرے اندر پلتا رہا۔ بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ نظم کا خالق مرد نہیں عورت ہے امرتا پریتم۔۔ جو اسی پنجاب کے رہنے والی تھی اور اب دلّی میں ہے۔

میرے لیے حیرانی کی بات تھی کہ ایک عورت نے اس سطح کی نظم کہی ہے۔ یہ عورت نہیں پنجاب کی رُوح ہے جو صدیوں سے زخمی ہے لُٹ رہی ہے اور بین کر رہی ہے۔۔۔امرتا پریتم جی کے لیے میرے دل میں اور بھی احترام پیدا ہوا اور ملنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔

بُلھے شاہ نے بھی پنجاب کے لٹنے اور بربادی پر بین کیے تھے

در کھلا حشر عذاب دا

بُرا حال ہویا پنجاب دا

ڈر ہاویے دوزخ ماریا

سانوں آمل یار پیاریا

پنجاب کے وارث شاہ نے ہیر (جو پنجاب کی رُوح ہے) کو علامت بنا کر پنجاب کے دکھ درد کو ایسے بیان کیا کہ اہل درد کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ امرتا پریتم جی نے جو وارث شاہ کو پکارتے وقت ''بین'' ڈالے ہیں۔ اس سے اُس نے اپنے آپ کو پنجاب کی سچی بیٹی ثابت کر دیا۔

بُلھے شاہ اور وارث شاہ کی طرح پنجاب کے دکھ درد پر آپ بھی روئی ہے اور اہل درد کو بھی تڑپایا ہے۔

پنجاب کی اس سچی بیٹی کو ملنے کے لیے میں بے تاب ہوں لیکن کوئی چارہ نہیں۔ دلی جاؤں تو جاؤں کس طرح۔۔۔آخر مارچ 1985 کو مجھے اپنے دو دوستوں کے ساتھ دلی جانے کا موقع مل ہی گیا۔۔

اوائل عمر کا شوق اب پکی عمر میں پورا ہونے جا رہا تھا۔۔۔میرے دوست تو دلی دیکھنے اور سیر و تفریح کرنے جا رہے تھے' مگر میں پنجاب کی سچی بیٹی کے درشن کرنے۔

امرتا پریتم کی میں اور تحریریں بھی پڑھ چکا تھا جو ادھر اُردو میں چھپتی رہتی تھیں۔ دلی پہنچتے ہی میں امرتا پریتم جی سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر دوستوں نے سمجھایا کہ پہلے ضروری قانونی تقاضے پورے کرنا ہوں گے۔ تھانے جا کر اپنی آمد درج کروانا ہوگی۔ سب سے پہلے کہیں ٹھہرنے کا انتظام کرنا ہوگا۔۔۔اگلے دن تھانے میں اپنی آمد درج کروائی اور دوستوں نے سیر و تفریح کا پروگرام بنالیا' لیکن میری حالت تو۔۔پیر مہر علی شاہ والی تھی

اج سک متراں دی ودھیری اے

امرتا پریتم جی کو فون کیا اور کہا میں لاہور سے آیا ہوں اور آپ کے درشن کے لیے دلی پہنچا

ہوں ۔۔۔ مسکراتی آواز میں جواب ملا ۔ ’’آ جاؤ ۔۔۔ میں گھر ای آں‘‘ اجازت ملتے ہی میں نے دیر بھی نہ لگائی اور حوض خاص پہنچ گیا ۔ امرتا پریتم جی بہت محبت سے ملیں ۔ امروز سے تعارف کروایا ۔۔ باتیں شروع ہوئیں تو پھر ہوتی چلی گئیں ۔ زبان وادب کے بارے میں' لاہور کے بارے میں ۔۔ باتوں باتوں میں بھی میں نے کہا ۔۔۔ کہ پنجاب کی دھرتی صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کے پاؤں تلے ہے جو میں حملہ آور آیا اُس نے پنجاب کی رُوح کو کچلنے ختم کرنے کی کوشش کی ہے پنجاب کی زمین زخم زخم ہوئی مگر اس کی رُوح ابھی زندہ ہے جس کا ثبوت آپ کی نظم ہے جس میں امرتا پریتم ہی پنجاب کی زخمی رُوح ’’بین‘‘ ڈال رہی ہے ۔

میری اس بات پر امرتا پریتم نے چند لمحے مجھے غور سے دیکھا اور کہا:

’’ہائیں وے توں کون ایں اپنا پورا تعارف ۔ تے کروا' ایہہ گل کتھوں کڈھ لیا یا ایں ۔‘‘

پھر میں نے اپنا تعارف استاد دامن کے حوالے سے کروایا ۔۔۔ تو امرتا جی استاد دامن کے بارے میں باتیں کرنے لگیں ۔ اُن کے کہنے کے مطابق استاد دامن عشق درگاہ کے شاعر تھے ۔۔۔ استاد دامن کے بارے میں انہوں نے بہت سوال کیے اُن کی زندگی کے بارے میں بہت پوچھا ۔

پنجابی کے دوسرے ادیبوں سے زیادہ باتیں استاد دامن کے بارے میں ہی ہوتی رہیں ۔ اس دوران جو امرتا پریتم جی کی طرف سے خلوص محبت اور مسکراہٹیں مجھے ملیں' میں ان سے متاثر ہوا ۔۔۔ میرے دوستوں کے تو کئی اور پروگرام تھے ۔۔۔ وہ آگرہ جانا چاہتے تھے مگر میرا دل تو دل کے حوض خاص میں ہی رہنے کو کر رہا تھا ۔۔ امرتا پریتم جی نے بہت اصرار اور مان سے کہا کہ

’’توں ایتھے ای رہو میرے کول' مہینہ دو مہینے‘‘ ویزہ بڑھا لیتے ہیں ۔ استاد دامن کے بارے میں تفصیل کے ساتھ مجھے لکھ کر دے ۔ میں استاد دامن کے بارے میں بہت کچھ اپنے رسالے ’’ناگ منی‘‘ میں چھاپنا چاہتی ہوں ۔

افسوس میں ایسا نہ کر سکا ۔ مجھے فیکٹری سے صرف پندرہ دن کی چھٹی ملی تھی ۔ میں ان کے پاس نہ رکنے پر بار بار معافی مانگ رہا تھا ۔۔۔ اور پھر دوبارہ آ کر زیادہ دن رہنے کا وعدہ کر کے آیا ۔ شائد میری قسمت میں دوبارہ جانا نہیں تھا میں نہ جا سکا مگر اُن کی باتوں سے مجھے استاد دامن کے بارے میں ایک ناول لکھنے کا حوصلہ ملا جو ’’بھبل‘‘ کے رُوپ میں چھپا تو میں نے بہت معذرت کے ساتھ امرتا پریتم کو ناول بھیج کر لکھا ۔

شرمندہ ہوں دوبارہ نہیں آ سکا ۔۔ مگر اداس ہوں صرف ایک ملاقات ہی ہو سکتی ہے پنجاب کی سچی بیٹی

آج بہت یاد آتی ہے۔

قاضی جاوید

امروز

سارک ادیبوں اور ادب کی فاؤنڈیشن کی طرف سے تصوف اور اس کے فلسفہ اور شاعری کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس 20 مارچ 2006 کو نئی دہلی کے انٹرنیشنل سنٹر کے لان میں شام کی چائے کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔ دوسرے دن پاکستان اور بنگلہ دیش کے مندوبین ریل کے ذریعے سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مزار شریف پر حاضری دینے کے لیے اجمیر شریف جانے والے تھے۔ ایران' افغانستان' ترکی' ازبکستان اور اٹلی وغیرہ سے آنے والوں کو شاید اس دورے میں دلچسپی نہ تھی۔ خیر' میں نے سوچا کہ اجمیر میں وہی تکلیف دہ مناظر ہوں گے جو میں نے گزشتہ شام دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے اندر اور باہر دیکھے تھے۔ اس لیے وہاں نہ جانا ہی بہتر ہوگا۔

یہ درگاہ نئی دہلی کی بستی نظام الدین میں واقع ہے۔ یہ درجنوں تنگ و تاریک ٹیڑھی میڑھی اور بے حد غلیظ گلیوں پر مشتمل مسلم اکثریت کی آبادی ہے جس کے کم و بیش سبھی مکین بھکاری ہیں۔ ایسی بستی میں حضرت امیر خسروؒ اور مرزا غالب سمیت کئی ممتاز ہستیاں پیوند خاک ہیں۔

آٹھ صدیوں سے پورے ہندوستان سے ان علاقوں سے بھی جو اب پاکستان اور بنگلہ دیش میں شامل ہیں' ہر روز سینکڑوں لوگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر آتے ہیں۔ ان میں مسلمان ہوتے ہیں اور ہندو بھی اور وہ ہزاروں لاکھوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ یہ ساری رقم کہاں جاتی ہے؟

درگاہ کے سجادہ نشینوں' متولیوں اور کارندوں نے ان صدیوں میں یہاں کوئی ادارہ نہیں بنایا' کوئی شائستہ بندوبست نہیں کیا' زندگی میں کوئی خوبصورتی' کوئی ترتیب اور کوئی تہذیب پیدا نہیں کی۔ بس بھیک منگے پیدا کیے ہیں جو ہر آنے جانے والوں کو اپنی لغو فریادوں اور دعاؤں سے گھیر لیتے ہیں۔

اس بستی کو جنوبی ایشیاء کی مثالی بستی ہونا چاہیے تھا مگر آپ اس کو ہمارے خطے کی سب سے گندی بستیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ وہاں کے مکین بھی نہ صرف ذہنی اعتبار سے بلکہ شکل وصورت' لباس' رہن سہن اور گفتگو کے لحاظ سے بھی تاریک صدیوں کے شہری محسوس ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ ہے وہ کلچر جو تصوف نے پیدا کیا ہے؟

اس قسم کے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور راج گھاٹ کے انٹرنیشنل گیسٹ ہاؤس کے لاؤنج میں رکھے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ڈنر کے بعد ہم لوگ یہاں پہنچے۔ مادام افضل توصیف پانی کی بوتل کی تلاش میں وہیں آ گئیں۔

''آپ صبح اجمیر جا رہی ہیں؟'' میں نے ان سے پوچھا۔ گزشتہ روز سے وہ مجاوروں سے خوش نہ تھیں۔ ہوا یہ کہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سجادہ نشین خواجہ حسن نظامی ثانی صاحب نے تصوف کانفرنس کے مندوبین کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ کھانے سے پہلے 'خواجہ ہال' میں صوفیانہ موسیقی کا پروگرام ہوا اور پھر ہم کو درگاہ پر لے جایا گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ خواتین کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور امیر خسروؒ کے مزار کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ باقی خواتین تو یہ جان کر چپ رہیں اور باہر سے ہی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے لیکن مادام افضل توصیف کو آپ جانتے ہیں۔ وہ بے انصافی اور اونچ نیچ کے خلاف احتجاج کیے بغیر نہیں رہتیں۔

''نہیں۔۔۔ میں اجمیر شریف نہیں جاؤں گی'' مادام نے جواب دیا۔

''میرا ارادہ بھی نہیں ہے'' میں نے ان کو بتایا۔

میں تو کل صبح امرتا جی کی تعزیت کے لیے ان کے گھر جاؤں گی اور شاید ایک دن وہیں رہوں گی۔

مجھے معلوم تھا کہ امرتا پریتم پاکستانی ادیبوں میں سب سے زیادہ افضل توصیف کو چاہتی تھیں۔ لہٰذا ممکن نہ تھا کہ وہ دہلی آئیں اور امرتا پریتم کی تعزیت کے لیے نہ جائیں۔ کل دوپہر کو پٹیالہ یونیورسٹی کے رجسٹرار مادام افضل توصیف سے ملنے آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مادام کے پاس امرتا پریتم کے جو خطوط' تصاویر اور دوسری چیزیں ہیں' وہ ان کی یونیورسٹی میں قائم ہونے والے 'امرتا پریتم میوزیم' کے لیے دے دی جائیں۔ ایسا ہی میوزیم امرتسر کی گورونانک یونیورسٹی بھی بنا رہی ہے۔ اس نے بھی اس سلسلے میں مادام افضل توصیف سے رابطہ کر رکھا ہے۔ یوں وہ الجھن میں تھیں کہ امرتا پریتم کی امانتیں کس کو سونپیں۔

''امرتا جی کے گھر! تو کیا آپ دس پندرہ منٹوں کے لیے مجھے ساتھ نہ لے جائیں گی؟''

دوسرے روز ہم گیسٹ ہاؤس سے صبح دس بجے نکلے۔ یہ گیسٹ ہاؤس مہاتما گاندھی کی سمادھی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع وعریض پارک میں واقع ہے۔ پارک کے اس حصے کو ''گاندھی درشن'' کہتے ہیں۔ وہاں مہاتما گاندھی کی یادگاروں کے لیے ایک میوزم بھی بنا ہوا ہے۔ جونہی ہم باہر آئے تو معلوم ہوا کہ پارک کا گیٹ بند ہے۔ بنگلہ دیش کی وزیراعظم خالدہ ضیاء مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پھول چڑھانے آئی ہوئی تھیں اور سکیورٹی کے تقاضوں کے تحت گیٹ بند تھے۔ خیر' یہ مرحلہ دس پندرہ منٹوں میں طے ہوا اور ہم رکشہ لے کر نئی دہلی کے متوسط طبقے کی بستی' حوض خاص، K-25 کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ درختوں اور بیلوں میں چھپا ہوا ایک اُداس سا گھر تھا۔ گیٹ سے گزر کر جب میں نے گھنٹی بجائی تو القاء نے دروازہ کھولا اور مادام سے لپٹ کر رونے لگیں۔

پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

''آیئے۔۔۔اندر آجایئے'' میزبان نے دعوت دی۔

''قاضی صاحب'' مادام نے کہا ''یہ امرتا جی کی بہو ہیں۔۔۔القاء''۔

''بہت پیارا نام ہے۔ روسی ہے شاید'' میں نے کہا ''اس گھر کے سب لوگ ہمارے جانے پہچانے کردار ہیں۔ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہم نے بالائی منزل پر جانا ہے۔ امروز ہم کو وہیں ملیں گے۔''

امروز یہ باتیں سُن رہے تھے۔

''ہاں! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا'' امروز نے خوش دلی سے کہا۔ معلوم ہوا کہ مادام نے ان کو مطلع کر دیا تھا۔

ہم راہداری میں کھڑکی کے ساتھ لگی کھانے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ امروز نے بتایا کہ امرتا پریتم ہمیشہ اس میز پر کھانا کھایا کرتی تھیں۔ بے تکلف دوستوں سے باتیں بھی یہیں ہوا کرتی تھیں۔

''خوب! بے تکلف دوستوں کا اعزاز ہم کو بھی مل گیا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور امروز کی طرف دیکھا۔ وہ مصور جس نے پنجابی ادب کی ہزار سالہ تاریخ کی سب سے بڑی شاعرہ کے ساتھ' چالیس پینتالیس سال گزارے۔ اس کی سینکڑوں تصویریں بنائیں اور اپنا تعلق یوں نبھایا کہ جہاں امرتا کا نام آتا ہے' وہاں اس کا بھی نام لیا جاتا ہے۔

پنجابی کُرتا(کانفرنس میں شرکت کرنے والے بنگلہ دیش کے پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ زمان عباسی نے ہم کو بتایا کہ بنگال میں کُرتے کو''پنجابی'' کہتے ہیں) پتلون اور جوگرز پہنے ہوئے امروز تھوڑی دیر کے بعد مجھے بتانے لگے تھے کہ وہ زندگی کے 80 سال گزار چکے ہیں۔ (وہ امرتا پریتم سے چھ سال چھوٹے تھے) دیکھنے میں وہ 65 سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ سادہ' شائستہ' مہذب اور سراپا محبت اور ہاں بے حد منکسر المزاج بھی۔

انہوں نے خود ہی بات شروع کی:

''بچپن میں کوئی میرا نام پوچھتا تو میں جواب میں'لوک گیت' بتاتا۔ اصل میں لوک گیت کسی کا نہیں ہوتا' مگر سب کا ہوتا ہے۔ ابھی میں دس سال کا ہی تھا کہ والدہ فوت ہو گئیں (امرتا گیارہ سال کی عمر میں والدہ کی شفقت سے محروم ہوئی تھی) مجھے ماں کی تلاش تھی۔ مجھے امرتا مل گئی۔ ہم دونوں مل کر گھنٹوں آوارہ گردی کرتے' سارا وقت اکٹھے گزارتے۔ بہت سا سمے بیت گیا۔ تب ایک روز اس نے مجھے کہا کہ ہم دن بھر اکٹھے رہتے ہیں' کیوں نہ اکٹھے ہی رہیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض تھا۔ ہم اکٹھے رہنے لگے۔ ان دنوں امرتا اپنے پہلے خاوند سے الگ ہو چکی تھی۔ اصل میں وہ لاہور میں قیام کے زمانے سے ہی اس سے نالاں تھی اور طلاق مانگتی تھی۔ ایف سی کالج کا پروفیسر لطیف اس کا دوست تھا۔ امرتا اس کو سب باتیں بتایا کرتی تھی۔ اس نے مشورہ دیا کہ اس سماج میں عورت کا اکیلے رہنا آسان نہیں۔ لہٰذا پہلے کوئی سہارا ڈھونڈو' پھر طلاق لو۔ امرتا نے ساحر (لدھیانوی) کا سہارا لینا چاہا لیکن وہ کمزور آدمی تھا۔ امرتا کو آگے بڑھتا دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔''

امروز کو معلوم تھا کہ جو کوئی ان سے ملنے آتا ہے' وہ ان کی اور امرتا کی زندگی کے حالات میں دلچسپی رکھتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ اُنہوں نے امرتا پریتم کے ساتھ لگ بھگ نصف صدی کا عرصہ کیونکر گزارا تھا۔

القاء نے مشروبات سے ہماری تواضع کی تھی۔ وہ میز سے خالی گلاس اُٹھانے لگیں تو میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تیس منٹ گزر چکے تھے۔

''خدایا!'' میں نے کہا''مجھے اجازت لینی چاہیے۔''

مادام افضل توصیف سے میں نے پندرہ منٹ ٹھہرنے کی بات کی تھی۔

''قاضی جاوید'' امروز نے کہا'' کھانے سے پہلے آپ نہیں جاسکتے۔''

''ہاں بھائی صاحب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کھانے کے بغیر چلے جائیں۔ میں بنا رہی ہوں۔ بس تھوڑی دیر میں تیار ہو جائے گا'' یہ القاء کی آواز تھی۔

دونوں کے لہجے میں خلوص تھا' اپنائیت اور محبت تھی مگر میرے پاس اس شہر میں رہنے کے لیے صرف دو تین دن تھے اور یہ شہر بہت بڑا تھا۔ بہت کچھ تھا وہاں دیکھنے کے لیے۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے اُٹھوں اور ٹیکسی لے کر سیدھا پرانے شہر کی کسی گلی کی نکڑ پر اتر جاؤں اور پھر شام تک آوارہ گردی کروں۔ دِلّی کی گلیاں دیکھوں۔۔۔ان کوچوں سے گزروں جو میر صاحب کو اوراق مصور دکھتے تھے اور دوپہر کا کھانا جامع مسجد کے سامنے والی گلی میں واقع 'کریم ہوٹل' میں کھاؤں جس کی دھوم تھی۔ دوسرے دن دوپہر کا کھانا گجرات کے ڈاکٹر اظہر محمود اور پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد سعید خواجہ کے ساتھ میں نے اسی ہوٹل میں کھایا۔ مگر وہ اپنی شہرت کے برعکس بس یونہی سا تھا۔ البتہ اس سے اگلی رات احسان اکبر' احمد سعید ہمدانی اور میں نے جامع مسجد کے دروازے کے سامنے کباب کھائے جو واقعی مزیدار تھے۔ خیر' پروگرام اب الٹ پلٹ گیا۔ میں ان نیک رُوحوں کی بات کیسے ٹالتا۔ مادام نے بھی اب ان کی تائید کی تھی۔

امروز نے دوبارہ بات شروع کی:

''میں فیصل آباد میں پیدا ہوا تھا اور لاہور کے میو سکول آف آرٹس میں تعلیم پائی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد میرا خاندان امرتسر کے ایک نواحی گاؤں میں آباد ہو گیا۔ یہ گاؤں امرتسر سے پانچ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ جب میں اور امرتا مل کر رہنے لگے تو میں نے اپنے ماں باپ سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ میرے حصے میں جو آبائی زمین آئی' وہ میں نے اپنے بھائیوں کو دے دی تھی۔۔۔ وہ خوش تھے۔ ماں باپ کی تو بات ہی اور ہے۔''

امروز نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نیچے صحن میں لگی ہوئی بوگن ویلیا کی دو بیلوں کی شاخیں سامنے کی دیوار سے لپٹی ہوئی تھیں۔ مارچ کے تیسرے ہفتے میں دہلی میں گرمی کا ہلکا سا احساس ہونے لگا تھا۔ وہاں کا درجہ حرارت عموماً لاہور سے زیادہ رہتا ہے۔ (مثلاً 14 اپریل کو لاہور میں درجہ حرارت 12 اور 34 درجے سینٹی گریڈ تھا جبکہ دہلی میں 22 اور 37 تھا)

''میرے گھر والے امرتا سے نہ ملے تھے'' امروز نے بات جاری رکھی ''تین چار سال گزر گئے۔ پھر ہم دونوں ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے امرتسر گئے تو میں نے امرتا سے کہا کہ چلو ہم ان لوگوں سے مل آئیں۔ ہم گئے تو وہ سب خوش ہوئے۔ امرتا سب کے دل کو بھائی تھی اور میں تو تھا ہی ان کا لاڈلا۔۔۔ میری دادی زندہ تھی۔ وہ اوروں سے زیادہ خوش ہوئی۔ کہنے لگی کہ امروز جو کرتا ہے' اچھا کرتا ہے۔''

ہم دنوں ۔۔۔۔ مادام اور میں ۔۔۔ یہ باتیں دلچسپی سے سُن رہے تھے ۔ یہ سیدھی سیدھی باتیں تھیں اور سچی بھی ۔ القاء اب باورچی خانے میں تھیں اور باورچی خانہ میرے پیچھے تھا۔ سنگترے، کیلے اور کالے انگور رکھے تھے (جی ہاں، مارچ میں امرتسر اور دہلی میں ہر جگہ انگور دستیاب تھا مگر سرحد کے اس پار پھل نہ تو لاہور کی طرح بہتات سے ہوتا ہے اور نہ ہی لاہور جیسا خوش رنگ اور خوش ذائقہ)۔ میں نے دو سنگترے اُٹھائے ۔ ایک مادام کو پیش کیا اور دوسرے کو چھیلنے لگا۔ کمرے میں سٹینڈ پر آویزاں درجنوں تصاویر پر میں نے نگاہ دوڑائی اور پھر کھڑکی سے باہر بوگن ویلیا کی بیلوں کو دیکھنے لگا جو سرسبز تھیں مگر ان پر پھول نہ تھے ۔

''یہ گھر'' امروز نے موضوع بدلا۔ ہم نے 1962 میں بنایا تھا۔ اس سال امرتا کی ایک کتاب پر ساہتیا اکادمی کی طرف سے چھ ہزار روپے کا انعام ملا تھا (مجھے خوشونت سنگھ یاد آئے ۔۔۔ وہ امرتا کے پرانے دوست ہیں، امرتا کی وفات پر انہوں نے اپنے ایک مختصر مضمون میں لکھا تھا کہ ''امرتا پریتم نے یہ انعام زبردستی حاصل کیا تھا۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ انعام کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی کی رکن تھیں ۔ کمیٹی کے اجلاس میں ان کی کتاب کی حمایت اور مخالفت کرنے والے ارکان کی تعداد برابر تھی ۔ اس پر امرتا نے اپنا ووٹ اپنی کتاب کے حق میں دے کر انعام حاصل کر لیا تھا)

''انعام کی رقم ملی تو ہم نے یہ پلاٹ خرید لیا'' امروز ہم کو بتا رہے تھے''پھر ایک ایک پیسہ جوڑ کر مکان بنانے میں جت گئے ۔''

''یہ اچھا گھر ہے ۔ آبادی بھی صاف ستھری ہے ۔''

"And the neighbours must be proud of the residents of this house."

''نہیں جی! فخر کہاں کرتے ہیں! پہلے یہاں اور قسم کے لوگ رہتے تھے اور یہ جگہ بھی کبھی ویران تھی بلکہ سامنے پرانا کنواں بھی تھا۔ اب چاروں طرف لوگ ہی لوگ ہیں اور سب نو دولتیے ہیں ۔ ان کو بھلا ادب اور مصوری سے کیا دلچسپی ۔ ہم پر ناک منہ چڑھاتے ہیں ۔ بعض تو اتنے بدتمیز ہیں کہ کوڑا ہمارے گیٹ کے آگے پھینک جاتے ہیں ۔''

''مکان کی ایک منزل بن گئی تھی ۔ ہم یہاں رہنے لگے ۔ ہمارے دونوں بچے سکول میں پڑھتے تھے ۔ میں ان کو سکوٹر پر لے جاتا ۔ یہیں ایک ہفتے میں دو بار چالان ہو گیا کیوں کہ سکوٹر پر صرف ایک بچے کو بٹھانے کی اجازت ہے ۔ آخر تنگ آ کر میں نے امرتا سے کہا کہ کیوں نہ ہم موٹر خرید لیں ۔ موٹر دس ہزار روپے میں آتی

تھی۔ پانچ ہزار اس نے ڈالے پانچ ہزار میں نے۔ پر ہم دونوں نے یہ رقم بڑی مشکل سے اکٹھی کی تھی۔''

زندگی کے سفر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کے نمایاں مرحلوں کو امروز دل جمعی کے ساتھ بیان کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب محبوب شریک حیات 80 سال کی عمر میں اکیلا چھوڑ جائے تو وہ ناسٹلجیا میں جیئے گا۔

مادام افضل توصیف نے گزشتہ روز پٹیالہ یونیورسٹی کے رجسٹرار سے ہونے والی ملاقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ پٹیالہ اور امرتسر دونوں شہروں کی یونیورسٹیاں ان سے امرتا پریتم کے خطوط' تصاویر اور دوسری اشیاء مانگ رہی ہیں' وہ کس کو دیں' کس کو مایوس کریں۔ امروز کی رائے یہ تھی کہ وہ ایک یونیورسٹی کو اصل چیزیں دے دیں اور دوسری کو نقل فراہم کر دیں۔''

''بس یہی ایک طریقہ ہے دونوں سے نپٹنے کا۔'' انہوں نے کہا تھا۔۔۔ میں نے تائید کر دی۔

امروز اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے اور امرتا کی ایک فریم شدہ تصویر لے کر آئے جس پر ان کی مشہور نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' گورمکھی سکرپٹ میں لکھی ہوئی تھی۔ مادام شاید یہ سکرپٹ پڑھ لیتی ہیں۔ میں اس معاملے میں بالکل کورا ہوں۔ نظم کے چند مصرے امروز نے پڑھ کر سنائے۔

''واہ کیا نظم ہے'' میں نے کہا۔۔۔ ''اس نے اپنے خالق کو ابدیت بخش دی ہے۔''

''ہاں! لیکن اس پر اعتراض بھی بہت ہوئے ہیں'' امروز دوبارہ ماضی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

''بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ امرتا نے اس میں صرف چناب کی بات کی ہے' بیاس کا نام کیوں نہیں۔ وہ بھی تو لہو رنگ ہوگئی تھی۔ چناب کا نام لے کر امرتا نے غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والے ظلم کی دہائی دی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والا ظلم بھلا دیا ہے۔ خیر' یہ لوگوں کی باتیں ہیں۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ کئی سکھ بھی اس نظم سے خوش نہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ امرتا نے ظلم کی دہائی دینے کے لیے وارث شاہ کو کیوں پکارا ہے۔ گورونانک جی کو آواز کیوں نہیں دی؟''

''لوگ کسی بات سے مطمئن نہیں ہوتے۔ یہ نظم جیسی ہے لاجواب ہے'' مادام نے رائے دی۔

''امرتا کہتی تھی کہ اب یہ نظم اس کی نہیں رہی' پنجاب، کے لوگوں کی ہوگئی ہے۔ بمبئی کے ایک ڈائریکٹر نے امرتا کے ایک ناول پر فلم بنائی تھی۔ ایک دن اس نے فون پر امرتا سے یہ نظم بھی فلم میں شامل کرنے کی اجازت طلب کی اور یہ بھی پوچھا کہ وہ اس کا کتنا معاوضہ لیں گی۔ امرتا نے جواب دیا کہ یہ نظم اب اس کی نہیں رہی' سب کی ہوگئی ہے۔ اور جو شے سب کی ہو' اس کا معاوضہ نہیں ہوا کرتا۔ اس فلم میں زہرہ نگاہ کی ایک نظم بھی شامل

ہے۔اس کے لیے ڈائریکٹر نے زہرہ نگاہ سے رابطہ کیا اور معاوضے کی بات کی۔ زہرہ نگاہ نے جواب دیا کہ یہ فلم امرتا جی کے ناول پر بن رہی ہے۔ میں اس میں اپنی نظم کا کوئی معاوضہ نہ لوں گی۔''

سکھوں کی بات پھر سے ہونے لگی۔ میں نے کہا کہ سکھ امرتا جی پر فخر کرتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ پنجاب کی دو یونیورسٹیاں ان کی یادگار بنا رہی ہیں اور ان کے کام کو محفوظ کر رہی ہیں۔ ہمارے ہاں تو کسی کو مثال کے طور پر فیض صاحب کی کوئی شے محفوظ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

''ٹھیک ہے، سکھ امرتا پر فخر کرتے ہیں'' امروز نے جواب دیا۔ وہ خود بھی مونے سکھ ہیں۔

''پہلے لڑتے بھی تھے۔ چالیس سال پہلے جب بابا نانک کا پانچ سو سالہ جنم دن منایا گیا تو انہوں نے امرتا سے اس موقع کے لیے نظم لکھنے کو کہا۔ امرتا نے جواب دیا کہ وہ آرڈر پر نظم نہیں لکھ سکتی مگر پھر ایک واقعہ ہوگیا۔ اصل میں ان دنوں ہمارا بیٹا (نوراج جس کو گھر میں شیلی کہتے ہیں) برودہ گیا ہوا تھا اور اس نے اپنی خیریت کی اطلاع نہ دی تھی۔ امرتا سخت پریشان تھی۔ بار بار برودہ فون کر رہی تھی۔ وہ تین دن اسی الجھن میں گزر گئے۔ پھر ایک رات نوراج کا فون آ گیا۔ 'ماں' کا لفظ سنتے ہی وہ اچھل پڑی۔ بعد میں کہنے لگی کہ مجھے اپنے بیٹے کا اس قدر خیال ہے تو نانک کی ماں کو کتنا ہوگا۔''

''تب اس نے نو حصوں پر مشتمل نظم لکھی جس میں بابا نانک کے Concieve ہونے سے لے کر ان کی والدہ کے دردزہ تک کی کیفیات بیان ہوئی ہیں مگر سکھوں نے اس نظم کو پسند نہ کیا۔''

''شاید وہ اس نظم کو غیر ضروری طور پر شوخ یا گستاخ سمجھ رہے ہوں گے'' میں نے بات بڑھائی۔

امروز نے بات جاری رکھی۔

''پرانے خیال کے سکھ اب بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ امرتا سگریٹ پیتی اور بال کٹواتی تھی۔''

مادام نے یاد دلایا کہ امرتا جی کے والد کے ساتھ بھی ایک مرتبہ اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔

''ہاں'' امروز کو نیا موضوع مل گیا۔ ''وہ مشہور واقعہ ہے۔ اصل میں امرتا کے پتا جی سکھ مبلغ تھے اور سلائیڈوں کے ذریعے بابا نانک کی زندگی اور فکر کی تعلیمات بتایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ ننھی امرتا کو ساتھ لے کر ایک گوردوارے میں گئے اور سلائیڈیں دکھا رہے تھے کہ ایک وہاں آ نکلا۔ اس کو بڑا غصہ آیا۔ چلا کر کہنے لگا ''بند کر یہ تماشا۔۔۔ یہ سینما یہاں نہیں چلے گا'' اس پر امرتا کے باپ نے اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے

آ گئے۔ اس کے بعد نہ کبھی وہ کسی گوردوارے گئے اور نہ ہی تبلیغ کی۔ وہ کہتے تھے کہ ''ان کم بختوں کو کوئی تعلیم نہیں دے سکتا۔''

القا پلیٹیں اٹھائے آئیں اور میز پر رکھنے لگیں۔ کھانا اب سرد ہونے کو تھا۔ ایک بج چکا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد میزبان سے رخصت مانگنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ لیکن آج میرا ارادہ یہی تھا۔ اس لیے میں نے گفتگو کا رُخ انجام کی طرف موڑنا چاہا۔ مادام افضل توصیف بظاہر اطمینان سے بیٹھی تھیں لیکن مجھ کو معلوم تھا کہ ان کے دل میں اس گھرانے کے مستقبل کے بارے میں کئی وسوسے ہیں۔ وہ کئی باتیں کہنا چاہتی تھیں اور کئی باتیں سننا چاہتی تھیں مگر فی الحال خاموش تھیں۔

''اب امرتا جی نہیں رہیں تو آپ کو کیا لگتا ہے؟'' میں نے اس مصور سے پوچھ لیا جس نے زندگی اس شاعرہ کے لیے وقف کر رکھی تھی اور اب امرتا کی وفات کے ساڑھے چار ماہ بعد ان کی یادوں کے ہجوم سے نکلنے کی راہ نہ پا سکا تھا۔

''کوئی تبدیلی نہیں آئی۔۔۔ لگتا ہے کہ وہ یہیں ہے۔۔۔ پہلے کی طرح۔''

''گویا ان کی Physical Presence ضروری نہ تھی؟''

''نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اب بھی یہیں ہے۔''

القاء میز پر چھریاں کانٹے رکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے سر کی بات کی توثیق کی۔ ''ہمیں تو لگتا ہی نہیں کہ وہ چلی گئی ہیں۔۔۔ وہ یہیں ہیں جی۔۔۔ ہمارے پاس۔''

''بالکل'' امروز نے لقمہ دیا ''اس نے کہا تھا کہ مجھے مرنے کے بعد نہلانا مت۔ نہ ہی کوئی مذہبی رسم ادا کرنا۔ وہ ہر وقت پاک صاف رہتی تھیں۔ بھلا اس کو نہلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے ایسے ہی کیا۔ دوست پوچھتے تھے کہ اس کی بعد از مرگ رسوم کب ادا ہوں گی۔ میں ان کو جواب دیتا کہ زندگی میں وہ کونسی رسوم ادا کرتی تھیں جواب ہم اس کی رسمیں ادا کریں گے۔ اس کی موت پر جلسے ہوئے۔ میں نے وہاں کہہ دیا کہ جلسے میں کوئی افسوس نہ کرے گا۔''

اس موقع پر مادام افضل توصیف نے امروز کو امرتا کی وصیت یاد دلائی اور پوچھا کہ آیا اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں۔ امرتا نے وصیت یہ کی تھی کہ جب اس کا کریا کرم ہو تو اس کا قلم بھی ساتھ رکھ دیا جائے۔ امروز کو یہ بات یاد نہ رہی تھی۔ گویا اس پر عمل نہیں ہوا تھا لیکن القاء نے مداخلت کی اور بتایا کہ اس کو یہ وصیت یاد تھی اور جب

امرتا کے مردہ جسم کو گھر سے لیجانے لگے تھے تو اس نے اپنے بیٹے کے ذریعے قلم ڈیڈ باڈی کے ساتھ رکھوا دیا تھا۔

القاء سوپ لے کر آئی تھیں۔ سبزیوں کا سوپ جو گلاسوں میں پیش کیا گیا۔

''آج کل کیا مصروفیات ہیں؟'' میں نے امروز سے پوچھا۔

''جب سے امرتا گئی ہے، میں نے نظمیں کہنا شروع کر دی ہیں۔ بہت سی نظمیں ہو گئی ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ پریس میں ہے۔ میں نے اس کا عنوان 'جشن جاری ہے' رکھا ہے۔''

''خوب! آپ شاعر ہو گئے۔ کتاب کب آ رہی ہے۔۔۔ کیا دو تین مہینوں میں؟''

''نہیں مہاراج۔۔۔ بس ایک دو ہفتوں میں آ جائے گی۔''

ہم تینوں سوپ پینے لگے۔ پھر القاء نے کھانا چن دیا۔ دال' سبزی' رائتہ اور دہلی کی چھوٹی چھوٹی روٹیاں' نیسلے کا دہی۔

امروز کو اپنی نظموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے دو تین نظمیں سنائیں۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ ''امرتا کو خبر نہیں کہ میں شاعر بن گیا ہوں۔ ان کے لہجے میں ولولہ تھا اور تاسف بھی۔''

''تو کیا پینٹنگ کا قصہ تمام ہوا؟''

''نہیں۔۔۔ نہیں'' امروز نے جواب دیا'' ہاں پہلے سا جوش نہیں۔ بہت سال ہوئے امرتا نے ایک بار کہا تھا کہ امروز تم عورتوں کی تصویریں بناتے ہو' لیکن صرف ان کے بدن کا حسن دکھاتے ہو۔ Woman with mind تم نے کبھی پینٹ نہیں کی۔ اس کے بعد سے میری تصویروں میں نسوانی جسم کا حسن ہے تو سہی لیکن Mind زیادہ اہم ہو گیا ہے۔''

مادام نے اور میں نے کھانے کی تعریف کی۔

امروز کہنے لگے کہ امرتا پریتم ہمیشہ خود کھانا پکایا کرتی تھیں۔ گھر میں کوئی ملازم نہ تھا۔ البتہ' شادی' سے پہلے انہوں نے خود کبھی نہ پکایا تھا۔ بعد میں انہوں نے ہم کو ایک تصویر دکھائی جس میں امرتا نے پہلی بار کھانا پکایا تھا اور دونوں مل کر کھا رہے تھے۔ ان کو ماضی کا ایک واقعہ بھی یاد آ گیا۔ دونوں بمبئی کے تاج محل ہوٹل کی ایک دعوت میں شریک تھے۔ کھانا جاری تھا۔ ایک کے بعد دوسرا کورس شروع ہو رہا تھا۔ ہم بور ہو گئے۔ میں نے امرتا سے کہا کہ آؤ گھر چلیں اور بھنڈیاں کھائیں۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو امروز ہم کو امرتا کے کمرے میں لے گئے۔ یہ کارنر میں بنا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دس فٹ لمبائی چوڑائی کے اس کمرے میں پرانے طرز کا ایک پلنگ تھا۔ ایک صوفہ اور دیوار میں ایک الماری تھی جس میں چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ایک کھڑکی تھی۔

مادام افضل توصیف کے لیے یہ ایک ہیجانی لمحہ تھا۔ وہ اس کمرے میں کئی بار سارے پنجابیوں کے دل پر راج کرنے والی امرتا پریتم سے مل چکی تھیں۔ وہ امرتا جو خود مادام کی زبردست مداح تھیں۔ انہوں نے مادام پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

مادام کی جذباتی کیفیت کو بھانپتے ہوئے میں نے کمرے میں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کو لے کر ملحقہ ڈرائنگ روم میں آ گیا جو گھر کے دوسرے کمروں کی طرح امرتا کی تصویروں سے اٹا پڑا تھا۔

''امروز جی! بے حد شکریہ اس محبت اور مہربانی کا جو آپ نے دی۔ میں اب رخصت چاہتا ہوں۔''

''مہربانی آپ نے کی جو یہاں تک چلے آئے ہیں لیکن ایک منٹ رکیے۔ میں آپ کو اپنی چند نظمیں دینا چاہتا ہوں۔''

وہ دوسرے کمرے میں گئے اور پانچ منٹ بعد لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر اُردو میں چار پانچ نظمیں لکھی تھیں۔ انہوں نے یہ کاغذ میری طرف بڑھایا۔

یہ نظمیں ہیں جو میں نے 30 اکتوبر 2005 کو امرتا کی وفات کی شام لکھی تھیں۔

اس انمول یادگار کے لیے میں نے امروز کا شکریہ ادا کیا اور الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر امروز مجھے وہیں سے رخصت کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ''میں آپ کو نیچے تک چھوڑ کر آؤں'' انہوں نے کہا۔ میں نے الفقاء اور مادام کو خدا حافظ کہا۔ مادام ابھی وہیں ٹھہرنے والی تھیں۔

میں امروز کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا مگر وہ مانے نہیں۔ ہم دوسری منزل سے نیچے آئے۔ میں نے مصافحہ کے لیے دوبارہ ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور ہم چلتے ہوئے گیٹ سے باہر آ گئے پھر ہم چلتے ہوئے تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر شاہراہ پر پہنچے جہاں سے مجھے رکشہ یا ٹیکسی مل سکتی تھی۔

''آپ کہاں جائیں گے؟''

''اب تین بجنے کو ہیں۔ اس لیے راج گھاٹ کے گیسٹ ہاؤس جاؤں گا۔''

رکشے میں بیٹھنے سے پہلے ہم گلے ملے۔

''یہ ملاقات''میں نے امروز سے کہا۔۔۔''مجھے یاد رہے گی۔''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

امرتا پریتم

امرتا پریتم اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ادیبہ ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ خاص طور پر تقسیم ہند پر اپنی نظم 'اج آکھاں وارث شاہ نوں تو قبراں وچوں بول' کی اشاعت کے بعد وہ ادب کے آسمان پر ایک ستارہ بن کر چمکیں۔ یہ نظم تقسیم کے فسادات میں ہونے والے خون خرابے میں عورتوں کی حالت زار کی عکاسی کرتی ہے۔ اصل میں امرتا نے وارث شاہ اور دوسرے عظیم پنجابی شاعروں کی روح سے خطاب کیا کہ انھوں نے رومانی داستانوں کے ہیروؤں کی تکلیف کو محسوس کیا اور اس پر غم و غصے کا اظہار کیا لیکن یہاں تو ایک پوری نسل انسانی ذبح کر دی گئی۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنی قبروں سے باہر آئیں اور پنجاب کی مظلوم بیٹیوں کی فریاد سنیں۔ یہ نظم انڈیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں ترجمہ ہوئی اور راتوں رات کلاسیک کا درجہ حاصل کر گئی۔ امرتا پریتم کا ایک کے بعد دوسرا مجموعہ شائع ہوتا رہا اور وہ ایک ثقافتی علامت کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

امرتا ایک سادہ اور منکسر المزاج انسان تھیں، بہت شائستہ اور دبلی پتلی، لیکن اندر سے شخصیت بہت مضبوط اور دلیر۔ انھوں نے ایک ساتھ بہت سے محاذوں پر جنگ لڑی اور کسی بھی جگہ اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ انھوں نے شاعری اور نثر دونوں ہی میدانوں میں بہت لکھا اور اپنے رسالے 'ناگ منی' سے پنجابی لکھاریوں کی ایک نسل کو متاثر کیا۔ عورتوں اور مظلوم طبقات کے لیے جنگ کرنے والی امرتا پریتم نے جس بہادری اور نڈری سے ساحر لدھیانوی کے ساتھ اپنے عشق کا اعتراف کیا، وہ ایشیائی عورت کی آزادی اور آزاد ارادے کے حوالے سے ان کے حوصلے اور بلند ہمتی کی دلیل ہے۔ وہ اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی روایت باقی رہے گی۔

☆☆☆☆

محمد منشا یاد

امرتا پریتم کی یاد میں

اکتوبر ۰۵ء کی آخری شام پنجابی کی مہان شاعرہ امرتا پریتم کی زندگی کی بھی آخری شام تھی۔

امرتا پریتم صرف پنجابی کی شاعرہ اور ادیبہ نہیں تھیں ان کی تقریباً ساری کتابیں اُردو، ہندی اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہیں اور وہ ایسی شاعرہ تھیں کہ ان کی نظمیں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر بھی اپنا تاثر برقرار رکھتی ہیں۔ دنیا بھر میں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پاکستان میں بھی ایسا کون سا پڑھا لکھا اور صاحبِ ذوق شخص ہوگا جو امرتا پریتم کے نام، مقام اور ان کے وارث شاہ کو مخاطب کر کے کہے ہوئے اشعار سے ناواقف ہو۔ سن سینتالیس کی تقسیم کے فرقہ وارانہ فسادات پر ہر شاعر، ادیب اور حساس تخلیق کار نے اپنے رنج اور دکھ کا اظہار کیا مگر امرتا پریتم کا انداز اور لہجہ سب سے جدا تھا۔ ان کی درد بھری آواز ہر دل میں اتر گئی اور ہمیشہ کے لئے امر ہو گئی۔ ان کی اس طویل اور مشہور نظم کا عنوان ''تواریخ'' اور ذیلی عنوان ''پنجاب دی کہانی'' تھا اور یہ ان کے مجموعہ نویں رت میں شامل تھی اور اس کا وہ ٹکڑا جہاں وہ وارث شاہ کو مخاطب کرتی ہیں تاثر کے اعتبار سے دنیا بھر کی پر تاثیر شاعری کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

گلیوں مٹے گیت پھر ترکلیوں ٹٹی تند
ترنجنوں ٹٹیاں سہیلیاں چرخڑے گھوکر بند
سنے سیج دے بیڑیاں لڈن دتیاں روہڑ
سنے ڈالیاں پینگ اج پپلاں دتیاں توڑ
جتھے وجدی سی پھوک پیار دی او وہ ونجھلی گئی گواچ
رانجھے دے سب ویر اج بھل گئے اسدی جاچ
دھرتی تے لہو وسیا قبراں پیاں چون
پریت دیاں شہزادیاں اج وچ مزاراں رون

اج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور

اج کتھوں لیایئے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول

تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

اک روئی سی دھی پنجاب دی، توں لکھ لکھ مارے وین

آج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن

اٹھ دردمنداں دے دردیا، اٹھ تک اپنا پنجاب

اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب

امرتا پریتم پر ہندو اور سکھ شاعروں اور گروؤں کو مخاطب کرنے کی بجائے ایک مسلمان شاعر سید وارث شاہ کو مخاطب کرنے پر اعتراضات بھی کئے گئے۔ مگر امرتا پریتم نے ہمیشہ وہی کیا جسے سچ سمجھا۔ ان کے قلم میں بڑی جرأت تھی اور انہوں نے سچ کے سوا کبھی کچھ نہ لکھا۔ وہ ذاتی زندگی اور رویوں میں بھی سچائی سے کبھی دور نہ ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی اوائل عمری کی شادی انہیں کوئی خوشی نہیں دے رہی تو انہوں نے نہایت دوستانہ طریقے پر اپنے شوہر کو علیحدگی پر آمادہ کر لیا اور ایک مقررہ تاریخ پر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ امروز ان کی زندگی میں آیا اور وہ سماج کے روایتی بندھنوں سے آزاد رہ کر زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہے۔ انہوں نے ساحر سے محبت کی مگر کبھی اس کے اعتراف میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ نہ ہی امروز یا کسی اور سے کچھ چھپایا۔ ایک بار ان کے بیٹے نوراج نے جب اس کی عمر تیرہ برس کی تھی پوچھا:

''ماما ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتا دو گی؟''

''ہاں''

''کیا میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں''

''نہیں''

''اگر ہوں تو بتا دیجئے۔ مجھے ساحر انکل اچھے لگتے ہیں''

''ہاں بیٹا۔ مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سچ ہوتا تو میں تم کو ضرور بتا دیتی''

امرتا کہتی ہیں کہ سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ میرے بچے کو یقین آ گیا۔

ساحر لدھیانوی سے ان کی محبت کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں مگر سچ وہی تھا جو امرتا نے خود بیان کیا ہے۔ رسیدی ٹکٹ میں ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

''لاہور میں جب کبھی ساحر ملنے کے لئے آیا کرتا تھا تو گویا میری ہی خاموشی میں نکلا، خاموشی کا ٹکڑا ،کرسی پر بیٹھتا تھا اور چلا جاتا تھا وہ چپ چاپ صرف سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ قریب آدھا سگریٹ پی کر راکھدانی میں بجھا دیتا اور پھر نیا سگریٹ جلا لیتا اور اس کے جانے کے بعد صرف سگریٹوں کے بڑے بڑے ٹکڑے کمرے میں رہ جاتے تھے۔ کبھی ایک بار۔۔۔ اس کے ہاتھوں کا لمس لینا چاہتی تھی لیکن میرے سامنے میرے ہی رواجی بندھنوں کا فاصلہ تھا جو طے نہیں ہوتا تھا''

ملک کی تقسیم سے پہلے جب امرتا لاہور میں ریڈیو پر ملازم تھیں تو ان کے اور معروف ڈرامانگار اور براڈکاسٹر سجاد حیدر کے بارے میں بھی بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں۔ لیکن ان کی دوستی ہر طرح کی آلائشوں سے پاک صاف تھی۔ وہ سجاد حیدر کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

''دونوں ہاتھوں سے تلخیاں بانٹتی ہوئی سب ملاقاتوں میں صرف سجاد کی اس قسم کی ملاقات تھی جو پہلی تھی اور جس کے ساتھ دوستی لفظ آنکھوں کے سامنے جھلملا جاتا تھا۔ جب لاہور میں تھی تو اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ کسی ملاقات کے دوران ہونٹوں پر کوئی شوخ لفظ نہیں آیا تھا۔ وہ ملنے آتا تھا تو ایک ادب اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ لاہور کی کسی دعوت میں سجاد کے ایک دوست کی بیوی نے مٹھائی بانٹتے وقت سجاد کو بار بار امرتی پیش کی۔ سجاد نے دو ایک مرتبہ تو ہنس کر بات ٹال دی مگر پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا'' بھابی اس کے نام پر آج تو آپ نے مجھ سے مذاق کیا ہے پھر کبھی نہ کرنا تجھے معلوم نہیں کہ میری محبت میں اس کے لئے پرستش بھی شامل ہے''

امرتا پریتم نے اپنی نظموں ،افسانوں اور ناولوں میں زندگی اور معاشرت کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کا اسلوب نہایت دلکش اور شاندار تھا۔ ان کی فکر روشن تھی اور وہ زندگی کی ترقی پسندانہ اقدار پر یقین رکھتی تھیں۔ ان کی تحریروں میں رنگ، نسل اور عقیدے سے بالاتر ہو کر انسانی معاملات اور خاص طور اپنے عصر کی عورت کے مسائل اور دکھوں کی ترجمانی کی گئی۔ ان کی نظموں میں گیتوں کی مٹھاس اور گیتوں میں غزل کا سا

حسن اور سوز ہوتا۔ اور ان کی نثر بھی شاعرانہ اور پرتاثیر تھی۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کے دنیا کی ہر زبان اور اردو میں بھی تراجم ہو چکے ہیں۔ بعض ناولوں پر فلمیں بھی بنیں۔ برصغیر کی تقسیم اور فسادات کے پس منظر میں لکھے ہوئے ان کے ناول ''پنجر'' پر بنی فلم نے حالیہ برسوں میں بڑی کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ ان کی کتابوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ وہ دہلی سے ایک بہت معیاری پنجابی رسالہ ''ناگ منی'' نکالتی تھیں اور پاکستانی ادیبوں کی تحریروں کو اس میں خاص طور پر شائع کرتی رہتی تھیں حالانکہ یہ بہت محنت طلب اور مشکل کام تھا کیوں کہ وہ خود شاہ مکھی یعنی اردو رسم الخط لکھ پڑھ نہیں سکتی تھیں۔ غالباً امروز پڑھتے جاتے تھے اور وہ ساتھ ساتھ پنجابی گورمکھی میں ترجمہ کرتی جاتی تھیں۔ انہیں بہت سے قومی اور بین الاقوامی ادبی ایوارڈز ملے اور ایک صوبائی زبان پنجابی میں لکھنے کے باوجود ان کا شمار دنیا کے بڑے ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا تھا۔

امرتا پریتم ایک کشادہ نظر اور فراخ دل لکھاری تھیں۔ اپنے جونیئرز سے ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ رہا۔ پاکستان کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو جن سے وہ شفقت اور محبت روا رکھتی تھیں اور جن میں حوصلہ افزائی کے لفظوں کا دان پن کرتی رہتی تھیں، ان کی رحلت، اپنا ذاتی دکھ محسوس ہوا۔ میں بھی ان کے سوگواروں میں شامل ہوں۔ میرے ساتھ بھی وہ بہت شفقت برتتی تھیں۔ 1980ء میں جب میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''ماس اور مٹی'' شائع ہوا۔ تو میں نے منیر احمد شیخ کے ذریعے جو ان دنوں دہلی میں پاکستان سفارت خانے میں متعین تھے انہیں اپنی کتاب بھجوائی۔ ایک تو میری کتاب اردو میں تھی دوسرے پتہ چلا تھا وہ اردو رسم الخط نہیں پڑھ سکتیں مجھے خط کی رسید کی بھی توقع نہ تھی مگر کچھ دنوں بعد ان کا بہت ہی خوبصورت اور حوصلہ افزائی کا خط آیا۔ پھر کچھ دنوں بعد انہوں نے میرے بہت سے افسانوں کا پنجابی میں ترجمہ کر کے ناگ منی کا ماس اور مٹی نمبر شائع کر دیا۔ ان کے ساتھ ان کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل تھا جو ہمیشہ میرے لئے حوصلہ افزائی اور تخلیقی توانائی کا منبع رہا ہے۔ انہوں نے لکھا:

''محمد منشا یاد کی کہانیاں جاگتے ہوئے باشعور ذہن کی کہانیاں ہیں اس لئے ان کہانیوں نے اچیت (سوئے ہوئے، لاشعوری) من کے طے شدہ وقت کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ اور اپنے لئے چڑھتے سورج کی لالی کا وقت مقرر کیا ہے۔ تاکہ انسان کے لئے جو کچھ بھی دن کی روشنی میں ممنوع ہے وہ اسکے چھپے ہوئے اسباب کی جڑیں تلاش کر سکے۔ خواہ وہ ہدایتوں اور روایتوں کی قابل پرستش جڑیں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ کہانیاں ایک سان ہیں جن کے لفظ لفظ پر چڑھ کر انسان کی نظر تیکھی ہوتی ہے میں محمد منشا یاد کی کہانیاں پڑھنے

والے قارئین کی نظر کو سان مبارک کہنا چاہتی ہوں''

اس کے بعد بھی وہ اکثر میری کہانیوں کو گورکھی پنجابی میں ترجمہ کر کے ناگ منی میں چھاپتی اور ہندوستان کے ادبی حلقوں میں مجھے متعارف کرتی رہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات 30 دسمبر 1987ء کو حوض خاص دہلی میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں ان کے مخالفین کی دعوت پر ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے دہلی گیا تھا۔ کانفرنس کے اگلے روز میں نے انہیں فون کیا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور بولیں۔ میں نے تمہاری آمد کے بارے میں اخبار میں پڑھا اور صبح سے انتظار کر رہی ہوں مجھے یقین تھا تم کانفرنس سے فارغ ہو کر مجھے فون کرو گے اور اس وقت مجھے ملنے آ رہے ہو گے۔ فوراً آؤ میں انتظار کر رہی ہوں۔ میں ان کے گھر پہنچا تو وہ اتنی محبت اور خلوص سے ملیں اور اتنے کھلے دل سے میری کہانیوں کی تعریف کی کہ میں آج تک سرشار ہوں۔ ان کے ساتھ اتاری ہوئی تصویریں، ان کے اپنے دستخطوں کے ساتھ دی ہوئی کتابیں، ان کی نظموں اور گیتوں کے کچھ ریکارڈز اور ان کے شفقت و محبت سے کہے ہوئے الفاظ میری زندگی کی نہایت قیمتی متاع ہیں۔

میں نے امرتا پریتم کی تحریروں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں جب بھی زندگی میں پریشان ہوتا ہوں یا کسی ناکامی سے دوچار ہوتا ہوں تو رسیدی ٹکٹ کی یہ سطریں میری ہمت بڑھاتی ہیں۔ آپ بھی سن لیجئے شائد آپ کے بھی کام آئیں۔ لکھتی ہیں:

''ان دنوں دل کی عجیب، حالت تھی۔ تنہائی کا شکار تھی۔ جب پہلی مارچ 1961ء کو ویت نام سے مجھے ہوچی منہہ کی تار آئی۔ تو دل کی رو کچھ بدلی۔ ساتھ ہی ایک وہ انگریزی فلم یاد آنے لگی جس میں ملکہ الزبتھ ایک حسین نوجوان کو دل ہی دل میں پیار کرتی ہے۔ اس کو جب بحری جہاز دے کر ایک فرض سونپتی ہے، تو دور سے دوربین کے ذریعے جاتے ہوئے جہاز کو دیکھ کر پریشان ہو اُٹھتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ اس نوجوان کی محبوبہ بھی جہاز پر اس کے ہمراہ ہے۔ وہ دونوں ڈیک پر کھڑے ہیں۔ اس وقت ملکہ کو پریشان اور آزردہ دیکھ کر اس کا ایک خیر خواہ کہتا ہے۔ ''میڈم! لک اے بٹ ہائر'' اوپر اس نوجوان اور اس کی محبوبہ کے سروں سے اوپر، ملکہ کی حکومت کا پرچم لہرا رہا ہے ۔۔۔۔ اور میں اپنے آپ کو خود ہی کہتی ۔''امرتا! لک اے بٹ ہائر'' اور میں زندگی کی ساری شکستوں اور پریشانیوں سے اوپر دیکھنے کی کوشش کرنے لگتی۔ جہاں میری تحریر تھی ،میری نظمیں، کہانیاں، میرے ناول۔''

میں سمجھتا ہوں امرتا مری نہیں۔ اس نے صرف اپنا پتہ تبدیل کیا ہے۔ جو اس نے اپنی ایک نظم
''اپنا پتہ'' میں پہلے ہی بتا رکھا تھا:

۔''آج میں نے اپنے گھر کا نمبر مٹایا ہے
اور گلی کے ماتھے پر لگا گلی کا نام ہٹایا ہے
اور ہر سڑک کی سمت کا نام پونچھ دیا ہے
لیکن اگر آپ نے مجھے پانا ہے
تو ہر دیس کی، ہر گلی کا در کھٹکھٹاؤ
اور جہاں بھی، آزاد روح کی جھلک پڑے
سمجھنا وہ میرا گھر ہے''

☆☆☆☆

نبیلہ کیانی

اُمرتا پریتم

اسکر وائلڈ نے لکھا کہ اگر دُنیا کے نقشے پر Utopia نہ ہوتو دُنیا کا نقشہ جغرافیے والوں کے لیے ہوگا مگر فن کاروں اور فلاسفروں کے لیے بے کار ہے۔ Utopia ہی تو ہے جس کے حصول کے لیے انسان کی جدو جہد ہے اور جب اس جزیرے پر پہنچ جاتا ہے تو نئے Utopias کی تلاش میں اپنے بادبان کھول کر پھر سے عزم سفر ہوتا ہے۔

اُمرتا پریتم نے زندگی یوں بسر کی کہ جیسے یہ پنجاب میں رہنے والی ایک خاتون کی دُکھ بھری داستان نہ ہو بلکہ کسی بھی انسان کے لیے زندگی کا خواب ہو، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ ہو اور مستقبل کا Vision ہو۔

کچھ دن پہلے ایک دوست نے جو کھٹمنڈو سے ہو کر آیا تھا، بتایا کہ وہاں بدھسٹ (Bhuddist Painters) کا ایک ایسا گروپ ہے جو اپنی پینٹنگ بنا کر دریا میں بہا دیتے ہیں تو تخلیق کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر معاشرتی اور روایتی آنکھ کے جبر اور خوف سے آزاد کرلیا جائے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ فارمولا بڑے آرٹ اور ادب کی تخلیق میں بہت بڑی روکاوٹ ہے اور پولیس کا خوف تو ادب اور آرٹ کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا ہے۔

اُمرتا پریتم نے اپنی زندگی اور فن دونوں کو اِن دونوں جبر سے آزاد کرنے کی جرأت کی اور زندگی بھی شاندار بسر کی اور بڑا اُدب بھی تخلیق کیا۔

بڑے اُدب کی ایک بڑی Dimansion اس کا مستقبل سے ہم آہنگ ہونا بھی ہے اور مستقبل سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اُدیب کو کچھ پُر اُمید بھی رہنا ہے اور اُمید کے لیے کچھ ایسی قدریں اور اصول دریافت کرنے ہوتے ہیں جو قاری کو بھی مایوسی کی تاریکی سے نکالے اور اور ہم عصر احساس بھی خوف اور نامرادی کی جکڑ سے نکلے۔

اُمرتا پریتم نے اپنی شاعری اور فکشن میں سوچ کی ہر اُس روایت کو جو معاشرتی طور پر کتنی ہی Qlorified کیوں نہ ہو پیش کیا جو انسان کی آنکھ کو دُکھ اور غم کے آنسوؤں سے بھر دیتا ہے۔ اُنھوں نے وارث شاہ کو بھی عظیم شاعر اسی لیے کہا کہ پنجاب کی ایک بیٹی روئی تو اُنھوں نے ایک ضخیم کتاب اُس کی آہ و بکا پر تحریری کر دی اور ثابت کر دیا کہ یہ شاعر و ادیب ہیں جو آنسوؤں کے محقق ہیں جو آنسوؤں کی تحقیق اور تفتیش میں مصروف ہیں اور یہ فن کار ہی ہے جو ایک فرد کے دُکھ سے بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ وقت کے گال پر آنسو کا ایک قطرہ گرا تو اس نے تاج محل جیسا شاہکار تخلیق کیا۔ تخلیق کار یہی ثابت کر رہے ہیں کہ آنسوؤں کی تخلیقی طاقت بے انت ہے اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔

برصغیر کے معاشرے میں شاید فرد کے دُکھ سے لاتعلقی پائی جاتی ہو لیکن برصغیر کے فنکار میں بے حس لاتعلقی نہیں ہے۔ اسی لیے اُمرتا پریتم نے فکشن بھی لکھا چناں چہ ناول ہو یا افسانہ فرد کے بارے میں ہے افراد کے بارے میں نہیں۔

اُمرتا پریتم برصغیر کی وہ نمائندہ لکھاری ہیں جہاں ہمیشہ یہ کوشش کی گئی کہ نئے سوچنے کے ڈھنگ دریافت کیے جائیں۔ جہاں جینے کو ہر دم نئی امنگوں اور نئے خوابوں نے معنی دیے۔ جہاں گوتم بدھ نے باقاعدہ سوچنے کے نئے ڈھنگ دریافت کرنے کے اُسلوب بتائے۔ جہاں Ideology کا لفظ گھڑا ہی نہیں گیا۔ شاید اس لفظ کی پیدا کی ہوئی گھٹن سے برصغیر کے ذہن نے اپنے آپ کو آزاد رکھا۔

پنجاب محبت کرنے والوں کی دھرتی ہے اور محبت وہ جذبہ ہے جو انسان کو آزدی سے جینے کا حق دیتا ہے محبت یہ نہیں دیکھتی کہ اُس کو کسی کی تائید حاصل ہے یا نہیں۔ محبت صرف حسن کی دریافت کا نام ہے۔ حسن کی تخلیق کا نام ہے اور اپنی دریافت اور تخلیق سے پُر اعتماد رشتے کا نام ہے۔ اُمرتا پریتم نے ایسے کردار تخلیق کیے جو حسن کی دریافت اور تخلیق کے اس عمل میں سرگرم عمل ہیں اور اسی لیے اُنھوں نے عظیم کرداروں کی ایک Gallaxy تخلیق کی۔

دُنیا میں ہر جگہ یہ کوشش رہی ہے کہ عورتیں اور بچے ظلم کی چکی میں پسنے نہ پائیں۔ اُن کے دُکھ میں کمی کی جا سکے اُمرتا پریتم اپنے فکشن میں اس کوشش کا حصہ نظر آتی ہیں۔ وہ ایسی دُنیا کا خواب دیکھتی نظر آتی ہیں جہاں آنسوؤں کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جہاں گھروں سے آہ و بکا کی آوازیں نہیں اُٹھ رہی ہیں بلکہ امن و شانتی سے رہنے کے سلیقے سکھائے جا رہے ہیں۔ جہاں انساں کی بہتری کے لیے تخلیقی کاوشیں ہو رہی

ہیں۔

اُمرتا پریتم کے افسانوں اور ناولوں میں ایسی خواتین کی Gallaxy ہے جو علم دوست ہیں۔ امن اور آسودگی کے لیے کوشاں ہیں، جو اس دُنیا کی تخلیق میں مصروف ہیں جہاں انسان اُن روکاوٹوں کی شناخت کر رہا ہے۔ جو امن، محبت اور تخلیق کی راہ میں حائل ہیں، جو قدرت کی شاہکار تخلیق انسان کے دماغ کو ضائع کر دیتی ہیں اور پوری زندگی کو بے ثمر کر دیتی ہیں اور اُن کے کردار دُنیا سے رخصت ہوتے وقت صرف احساس زیاں لے کر جاتے ہیں اور زیاں کا احساس اُمرتا پریتم کے چند کرداروں کو اس وقت زیادہ محسوس ہوتا ہے جب وہ چاہنے کے باوجود اپنے علم اور عقل کی روشنی میں اپنی ہی زندگی کو ترتیب نہیں دے سکتے اور ایسے معاشرتی ماحول میں سانس لینے پر مجبور ہیں جو اُنھیں مایوسی کے اندھیرے اپنانے پر مجبور کر رہا ہے۔ اُمرتا پریتم نے ایسے ماحول کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔ جو انسانوں کو مجبور کر رہا ہے کہ مایوسی کو عادت سمجھ کر اپنالو۔ اُنھوں نے مایوسی کو انسانی ذہن کی عادت نہیں بننے دیا۔ انسان کا یہ اعتماد کہ وہ چاہے تو بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ اس کا تبدیلی اور ارتقاء کے صدیوں پرانے قانون پر اعتماد اس کے فہم وبصیرت کا حصہ ہے اور یہ فہم وبصیرت اُمرتا پریتم کی اپنی شخصیت کا حصہ بھی ہے اور ان کے افسانے اور ناول کے اکثر کردار کا بھی۔

اُمرتا پریتم نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''رسیدی ٹکٹ'' میں بھی اپنے قاری کو یہی پیغام دیا کہ اس دھرتی پر وہ سب کچھ موجود ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن فرد بھی خالی ہاتھ نہیں ہے وہ بھی اپنی ذہانت کی توہین کا بدلہ لے سکتا ہے۔ وہ خوابوں اور امنگوں کو تخلیق کر سکتا ہے۔ اُنھیں حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ وہ ایک سنگ تراش کی طرح پتھروں کو بھی طاقتِ اظہار دے سکتا ہے وہ ایک موسیقار کی طرح ارد گرد بہتی ہوا کا ایک گھونٹ منہ میں رکھ کر باہر نکالے تو وہ گیت ہوتی ہے۔ لفظوں اور آہنگ کا شاہکار۔ عام سے چلنے پھرنے میں وہ آہنگ اور ترتیب شامل کرے تو انگنت رقص وجود پا جاتے ہیں اور رنگا رنگ رنگوں کی ترتیب بدل دیے تو وہ شاہکار پینٹنگ ہوتی ہے اور اِنسان کے ذہن کی یہ قوت وصلاحیت کہ وہ اُن چاہ بدل سکتا ہے اپنے اندر کا بھی اور اپنے ارد گرد کا بھی، اسی پر امرتا پریتم کا اعتماد ہے اور یہی ان کی نوید اُمید ہے۔

☆☆☆☆

نسرین انجم بھٹی
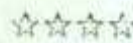
امرتا پریتم مجھے کہاں ملی؟

دراصل امرتا پریتم کو امرتا پریتم کے سامنے لانا بہت مشکل کام ہے خصوصا ہم جیسے لوگوں کے لئے جنہوں نے تاریخ کو پڑھا ہے، دیکھا نہیں جھیلا نہیں، برتا نہیں۔ لیکن ہاں ہم بھی تین مارشل لاؤں اور بہت سی قربانیوں کے بعد جھیلنے والوں میں تو ہیں نا۔ امرتا پریتم سرحدوں کی تقسیم سے بھی تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ہوتی جاتی ہے؛ شخصیتوں کے درمیان ایسے اچرج فارمولے بھی ہوتے ہیں جو ہو ہی نہیں چکتے۔ امرتا پریتم پاکستان بننے کے بعد اس کے اندر وارث شاہ کے حوالے سے بھی زندہ ہوئی تھی اب وہ مرنے کے بعد بھی ہمارے اندر دوبارہ زندہ ہو رہی ہے، بڑے عجیب طریقے سے۔ شائید ملکوں کی تاریخوں میں جب، عورت جاتی زندہ ہوتی ہے تو امرتا پریتم، امرتا شیر گل اور سروجنی نائدو، عطیہ فیضی اور اینا مونکا جیسی عورتیں پھر پھر زندہ ہوتی ہیں۔ امرتا پریتم دراصل ہندوستان ہے، پنجاب ہے، راوی ہے، گوجرانوالہ ہے۔ کچا صحن۔ ہے صحن میں کھڑی دھریک ہے، چرخہ ہے ہاتھ میں چھبی چھلتر ہے، ٹوٹی ہوئی چوڑی ہے، آل مال تھال ہے، کیا کیا نہیں ہے؟ بڑے روپوں والی امرتا پریتم مجھ سے جڑتی ہے اپنی اونچائی کی وجہ سے بھی اور اپنی آواز کی اونچائی کی وجہ سے بھی۔ وہ ایک اونچی آواز ہے جو سب عورتوں کی طرف سے بولتی ہے اور للکارتی ہے تو جنرل ڈائر کو نہیں، وارث شاہ کو جو اس کے لئے متعلقہ Relevent ہے۔ دراصل بات ساری Relevence کی ہوتی ہے۔

امرتا پریتم سے میں نہیں ملی؛ جو لوگ ان سے ملے ہیں میں ان سے ملی ہوں، میں تو چی گویرا سے بھی نہیں ملی اور اس ماں سے بھی نہیں ملی جس نے ذوالفقار علی بھٹو جیسے سورج بیٹے کو جنم دیا مگر یہ لوگ اپنی آواز اور ارادوں کے ساتھ میرے من کے اندر رہتے ہیں؛ اگر شو کمار بٹالوی نصرت فتح علی میں سما سکتا ہے تو یہ سب لوگ کیوں مجھ میں نہیں سما سکتے؟

امرتا پریتم مجھے بہت پہلے ریڈیو لاہور کے سٹوڈیوز میں موسیقی کے ایک پروگرام میں ستار بجاتی ہوئی

ملی، بہت دیر بعد ریڈیو پاکستان کے ایک ماہنامہ رسالے آہنگ میں ان کی تصویر چھپی تھی ستار بجاتے ہوئے۔ نہائت من موہنی صورت۔ اس کے بعد ہی انکی آپ بیتی پڑھنے کو ملی تو رسیدی ٹکٹ کا اصل مطلب سمجھ میں آگیا کہ اسکے بغیر کام رک جاتے ہیں۔ لیکن کاش یہ بڑی شخصیت ایک رسیدی ٹکٹ میں سماسکتی اور کتنا برعکس ہوا کہ یہ شخصیت ڈاک کے لفافوں، ڈاک بابو کے تھیلوں اور ڈاک ٹرین کے ڈبوں بلکہ برسوں کے چہروں پر مہر ہوگئی، اس کے لئے پاکستان ہندوستان اور کوئی استھان اہم ہی نہ رہے۔

امرتا پریتم ایک سیکولر روح تھی جو عورت سے زیادہ انسان تھی اور اپنے چاروں طرف بھی انسان دیکھنا چاہتی تھی۔ رشتوں کے آنگن میں قلم اور کاغذ کا کھیل کھیلتی تھی۔ نظموں کی خوبصورت کشتیاں بناتی تھی ؛ آٹے کی چڑیاں اور چڑیاں اور چڑیوں کے گیت لکھتی تھی۔

گیت لکھتی تھی عشق اور موت کے اور ذرا برابر نہیں ڈرتی تھی، عشق کو سچ مانتی اور سچ مان کر عشق کرتی تھی۔ مذہبوں، ذاتوں، براتوں سے بالاتر ہو کر اگر عشق کرنا کفر تھا تو کفر کرتی تھی- بقول میر،

سخت کافر تھا وہ جس نے پہلے میر

مذہب عشق اختیار۔۔۔۔کیا

اس کے عشق میں انسان ذات کے عشق کے ساتھ، اپنے دیس اور دھرتی کا عشق، اپنے دریا اپنے راوی اپنے گھر سے وچھوڑے کا عشق، اپنے گھر واپس نہ آسکنے کا روگ اس عشق کی اعلیٰ منزلوں سے جوڑتا چلا گیا وہ پھر کبھی گوجرانوالہ نہ آسکی۔ ہندوستان کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پاکستان میں نہ آسکی۔ کوئی رکاوٹ تو نہ تھی شائد صبر توڑ منزل پر تھی، وہ اپنی چھوڑی ہوئی دہلیز سے ناراض ہوگئی تھی۔ امرتا پریتم گیان دھیان اور شعر کے ساتھ کہانیاں لکھتی تھی، کہانی کار امرتا پریتم، شاعرہ امرتا پریتم، ستار نواز امرتا پریتم، گوجرانوالہ کی بیٹی امرتا پریتم، زرم خو کمیونسٹ سیاستدان امرتا پریتم، اسمبلی کی سیٹوں سے اندرا گاندھی کی دوستی تک امروز کی تصویروں کا موضوع امرتا پریتم، ناگ منی کی ایڈیٹر، اور نواسے نواسیوں کے آنگن میں رنگلی پیڑھی پر بیٹھی پنجابن امرتا پریتم ہمیشہ ایشیا سرخ ہی لکھتی رہی۔

ایک بار جب ہم نے یہ بھی سنا کہ امرتا پریتم لاہور میں تھی۔ امرتا راوی تھی تو یہ بات میں اپنے ایک سٹیشن ڈائرکٹر سجاد حیدر صاحب سے پوچھنے گئی۔ انہوں نے بھی رسیدی ٹکٹ کے برابر جواب دیا۔ وہ بہت شفیق خاتون تھیں جبکہ امرتا جی نے بھی سجاد صاحب کے لئے اتنا ہی لکھا ہے کہ وہ بہت شرمیلے دوست تھے۔

میں نے امرتا پریتم کی تصویریں بھی دیکھیں ہر عمر ہر انداز کے ساتھ نہائت خوبصورت اور Gracefull خاتون تھیں ہر عمر میں۔ان کی کہانیاں بھی پڑھیں، انکی گفتگواور لہجہ ان کے خدو خال سے سمجھ میں آیا۔ناگ منی کے اوراق سے انکے مسائل بھی۔وہ ایک بہادر خاتون تھیں آپا افضل توصیف بتاتی چلی جاتی ہیں ۔فخر زمان لکھتے ہیں تو لکھتے چلے جاتے ہیں۔تب ہمیں یقین ہوتا ہے کہ امرتا پریتم واقعی راوی تھی جو کبھی نہیں سوکھتی جو کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، مڑ مڑ کے جنم لیتی رہتی ہے۔تاریخ جب عورت جاتی کی دارتا لکھے گی تو اسے عورت نہیں انسان لکھے گی۔جس کے لئے حدوں اور سرحدوں کی قدغن نہیں ہونی چاہیے۔محبتوں کو سیاستوں کی نذر نہیں ہونا چاہیے۔ہم سب بھی، کرشن چندر، کرتار سنگھ دگل، امرتا پریتم اور امروز، پاش اور شیو کمار بٹالوی جیسے لوگوں کو پڑھنا یا ان کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے ملک میں مواد بہت کم ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ان پر ہماری یونیورسٹیاں تھیسس کرنے کی اجازت نہیں دیتیں؛ان کا ذکر ہم اپنے میڈیا پر نہیں کر سکتے۔ہم ان کے قریب نہیں جا سکتے جن سے ہماری ذہنی قربتیں ہوتی ہیں تو ہم ان کے بارے میں کیا لکھیں گے؟ کیا لکھ سکیں گے، کہاں اور کیسے ان سے مل سکیں گے۔ہماری یہ ادبی قرابت داریاں ہماری ہی سوچ اور سانس کا حصہ ہیں۔ بھلا ہو فخر زمان صاحب کا وہ حکومت میں ہوں یا نہ ہوں، ثقافتی ادبی رشتوں کے تانے بانے جوڑنے میں لگے رہتے ہیں۔انہی کی کوششوں سے ہم سرحد پار کے قلم کاروں سے ملنے لگے ہیں اور ان کے شبھ نام اور بڑے کام کو دیکھنے کی خواہش جاگنے لگی ہے۔جن پر امرتا جی سمیت بہت کام کیا جانا باقی ہے یہ بات اور یہ کام اگلی نسل کے کندھوں پر اور ان کی جھولی میں ابھی سے ڈال دینا چاہیے، ورنہ ادبی کم مائیگی تو ہے ہی۔

☆☆☆☆

احمد سلیم

دردو چھوڑے دا حال........

(1)

امرتا پریتم......اک ناں یاں اک نظریہ یاں اک ساگر پیار دا، گیان دا، انسانیت دا۔ تے امرتا ورگی ہور کون سی؟ پریم دیوانی میرا؟ کشمیر دی للیشوری یاں للہ عارفہ؟ مغل شہزادی زیب النساء مخفی؟ ایران دی قراۃ العین طاہرہ؟ یاں گلاب داس دے ناں نال جڑی اپنے لہور دی پیرو پریمن؟

تے اوہ کیہڑا اپینڈا سی جیہڑا امرتا پریتم نے جھا گیا؟ گوجرانوالہ توں لہور دا؟ لہور، جیہدے گمٹی بزار نوں اوہ ہمیش یاد کردی رہی؟ 1947 وچ لہودی بھری چناب نوں جھاگدیاں اوہنے وارث شاہ نوں پکاریا سی تے 31 اکتوبر 2005 نوں وارث شاہ اوہنوں پکار اُٹھیا!

وارث موئے تے وچھڑے کون میلے

پر امرتا نہ موئی اے تے نہ وچھڑی اے۔

31 اکتوبر نوں میں اوتھے ساں، دلی وچ۔ گوروگرنتھ صاحب بارے اک کانفرنس ہورہی سی۔ بھائی ویر سنگھ سدن دے بُلاوے اُتے میں "گوروگرنتھ صاحب تے بابا فرید" دے سرناویں ہیٹھ اک پرچہ پڑھنا سی۔ 29 اکتوبر نوں شامیں میں لہوروں دلی اپڑیا سی۔ ائرپورٹ توں ہوٹل جاندے ہوئے اک، حادثہ واپر گیا۔ بم دھماکیاں وچ کنے ہی جی مارے گئے سن۔ ہوٹل وچ وی ہاہاکار مچی ہوئی سی پر میں نکل کے امرتا جی ول جانا چاہوندا ساں پر باہر اک پاکستانی لئی حالات چنگے نہیں سن تے ہوٹل والیاں نے مینوں ہوٹل وچ ہی رہن دی صلاح دتی سی۔

1983 توں میرا ایہہ طریقہ سی۔ جدوں وی دلی اپڑدا، سدھا امرتا جی تے امروز ول پہنچ جاندا۔ کئی کئی دہاڑے اوہناں ول ٹھہردا۔ وِتی جاندیاں کدی سوچنا نہیں سی پیندا کہ اوتھے جا کے ٹکانا کتھے ہووے گا پر پچھلے دو تن ورھیاں توں امرتا جی ڈاڈھے بیمار رہے سن، میں ٹکانا تے ہوٹل وچ کرن لگ پیا ساں پر جیس پل

میں دلی اپڑدا، سامان ہوٹل وچ چھڈ کے 25۔ حوض خاص اپڑ جاندا۔ گھنٹیاں بدھی امروز تے امرتا جی نال گلاں کردا، سیال دیاں شاماں امرتا جی لئی بہت اوکھیاں ہوندیاں سن پر دنے اسیں اُپّر چھت تے ڈھپے بیٹھے رہندے تے شاماں پین توں پہلاں تھلے آجاندے۔ پچھلے ڈیڈھ دو ورھیاں توں امرتا جی سُرت وچ وی نہیں سن رہے پر اوہناں نوں ویکھ کے تے امروز جی نال گلاں کر کے جاپدا، امرتا جی نوں وی مل لیا اے، اوہناں نال گلاں وی کرلئیاں نیں۔

اوتھے ہی دوتن واری امیہ کنور نال وی میل ہویا سی۔ ایہہ بی بی امرتا جی بارے لکھیاں نظماں دی کتاب مرتب کر رہی سی تے اوہنے میری اک نظم وی ایس مجموعے وچ شامل کیتی اے۔ 30 اکتوبر نوں اوہناں نال بھائی ویر سنگھ سدن دی کانفرنس وچ میل ہو گیا۔ اوہناں خوش ہو کے دسیا کہ امرتا جی بارے نظماں دی کتاب چھپ گئی اے تے اوہ میرے لئی اک کاپی سویرے لیان گیاں۔

میں آکھیا ''میں کل شاماں دا آیا ہویا واں۔ شہر دے حالات چنگے نہیں۔ مینوں امرتا جی کول لے چلو۔''

امیہ جی کہن لگیاں۔

''اج میں بچی نوں رکتوں پک کرنا اے۔ میں کل فیر ایتھے کانفرنس وچ آونا اے، تہانوں کل لے چلاں گی۔''

آکھ سکدا واں کہ میں دلی وچ ساں۔ دودناں توں ساں پر امرتا جی نوں نہ مل سکیا۔ اج پہلاں تے کدی نہیں سی ہویا۔ کیہ کوئی انہونی ورت جاوے گی۔ میں سوچیا اج شامیں میں آپے امرتا جی ول جاواں گا۔ کانفرنس توں ہوٹل پرتیا تاں ہوٹل دی انتظامیہ نے دسیا کہ علاقے دے تھانے توں فون آرہیا اے، میں جدوں وی پرتاں، اوہناں نوں فون کرلواں۔ ہوٹل والیاں نے گل کرا دتی۔ پولیس افسر ''وچاروتا ندرے'' لئی مینوں ملنا چاہوندا سی۔ میں اوہنوں دسیا کہ میں اوس کانفرنس وچ آیا واں جیہدا افتتاح تہاڈے وزیر اعظم صاحب نے کیتا اے۔

ہن میں لابی وچ بہہ کے ہی تھانیدار صاحب نوں اڈیکن لگ پیا۔ شاماں ڈونگھی رات وچ بدل گئیاں پر اوہ نہ آئے۔ ہن میں سوچدا واں، خورے اوہناں نے آونا ہی نہیں سی۔ فون تے ہی اوہناں دی تسلی ہو گئی ہووے گی تے مینوں ہوٹل توں نہ نکلن لئی اوہناں آون دا کہہ دتا ہووے گا۔ نہ آون دا کارن جو وی

ہووے، میں امرتا جی ول نہ جا سکیا تے ساری رات ٹی وی تے حادثے نال مرن تے پھٹڑ ہون والیاں بارے تے آون توں پہلاں ہی اُداسی گئی دیوالی بارے ٹی وی تبصرے سُند ا رہیا۔

31 اکتوبر آ گئی۔ کانفرنس وچ امیہ جی کتاب لے کے آئیاں سن۔ اوہناں دسیا کہ اج میرا پرچہ پڑھے جاون مگروں اوہ مینوں امرتا جی ول لے جان گیاں۔

''میں امروز جی نوں وی دس دتا اے کہ میں احمد سلیم ہوراں نوں لے کے آواں گی۔''

دوپہر مگروں تیجا سیشن شروع ہویا۔ مینوں سٹیج توں بلاوا آ گیا۔ اجے میں اپنا پرچہ پڑھنا سی، جدوں میں ویکھیا، امیہ جی چھیتی چھیتی میرے ول آ رہیاں سن۔ کول اپڑ کے اوہناں میرے کناں وچ آکھیا:

''امرتا جی پورے ہو گئے'' تے ایہہ کہندے ہوئے اوہ چھیتی چھیتی باہر ول نوں ٹر پیاں۔

مینوں جاپیا، جیویں میں کجھ نہ سنیا ہووے۔ میں ایدھر اودھر نظر ماری، پروگرام دے کرتا دھرتا تے بھائی ویر سنگھ سدن تے ڈائریکٹر مہندر سنگھ جی کدھرے نظر نہیں سن آ رہے۔ میں سٹیج توں اٹھ کے جا وی نہیں سال سکدا۔ چانچک پرچہ پڑھن لئی میرا ناں پکاریا گیا۔ مینوں کجھ سمجھ نہیں سی آ رہی کہ میں کیہ بولنا اے تے کیوں بولنا اے۔ پہلاں توں لکھیا ہویا پرچہ میں بوجھے وچ پا لیا۔ میری واج کنب رہی سی۔ میں آکھیا۔

''دو دن پہلاں دلی آیا ساں تے اک انہونی ورتی سی، سڑکاں تے بزار لہو نال لبڑ گئے سن۔ ہنے ہنے کجھ چر پہلاں اک ہور انہونی ورت گئی اے ایس لئی میں اپنا پرچہ نہیں پڑھاں گا بس کجھ گلاں کراں گا۔ دوہاں دیساں دے۔ سانجھ دیاں گلاں، بابا فرید تے گورو صاحبان دی سانجھ دیاں گلاں، وارث شاہ۔ تے امرتا پریتم دی سانجھ دیاں گلاں..........''

ہن مینوں یاد نہیں میں ہور کیہ کجھ بولیا سی۔ بس جدوں مڑ گھُکومڑ ھکی میں سٹیج توں لتھا تاں مہندر سنگھ جی خوش ہو کے آکھیا۔ ''تسیں بہت چنگا کیتا، دل دیاں گلاں کیتیاں ساریاں نوں بہت چنگا لگیا۔ تہاڈا پرچہ تاں لوکی اگے وی پڑھ لین گے۔''

میں کیہ آکھدا، اک کاغذ اوہناں ول ودھا دتا۔ اوہدے اتے میں انگریزی وچ لکھیا سی!

"AMRITA PRITAM IS NO MORE"

اوہناں پرچے تے نظر ماری، پریشان ہو کے میرے ول ودھے۔

''تہانوں کیویں پتہ چلیا؟''

میں ساری رام کہانی سنادتی۔تھوڑے چر وچ اوہ سٹیج توں اعلان کرر ہے سن۔

''اج امرتا جی پورے ہو گئے۔''

میں اوہناں نوں آکھیا''میں اوتھے پہنچنااے،مینوں آ گیا دیو۔''

میں باہر نکل کے امیہ جی نوں اوہناں دے موبائل اتے فون کیتا۔اوہ دس رہے سن۔

''اسیں امرتا جی دے انتم سنسکاراں لئی نکل رہے آں۔''

میں پہنچیا تے 25۔حوض خاص چان بھان کرر ہیا سی۔گھر دے سارے جی،امرتا جی نوں لے کے گئے ہوئے سن تے گھر دے باہر میڈیا کٹھا ہور ہیا سی۔

شاماں ڈونگھیاں پے گئیاں،جدوں امروز جی،امرتا جی دا پتر،اوہناں دی دھی،اوہناں دی نونہہ تے اگوں اوہناں دے بچے امرتا جی دے بناں گھر پرتے۔امروز جی،مینوں گلوکڑی پا کے اندر گھر ول نوں ٹر پئے۔میڈیا نے اُتے تھلّے پورے گھر اُتے ہلا بول دتا سی پر امروز جی شانت سن۔

ریڈیو،ٹی وی تے اخباراں والے دگڑ دگڑ کرر ہے سن۔امرتا جی دے گھر والے اوہناں نوں بڑی نمرتا تے حلیمی نال مل رہے سن۔میں پچھلے کئی گھنٹیاں توں میڈیا والیاں دیاں گلاں سن رہیا ساں،جیہناں وچ سکینڈل ورگی بوکھنڈری ہوئی سی۔امرتا جی اُتے مقدمے دیاں گلاں،اوہناں دے تے امروز جی دے سنبدھ بارے گلاں۔

اک پتر کار نے جدوں زور دے کے پچھیا کہ امرتا جی نال بناں کسے قانونی بندھن دے رہن بارے،اج اوہ کیہ محسوس کر دے نیں تاں امروز جی نے بڑے نرم سبھا پر کرڑے لفظاں وچ آکھیا۔

''تہاڈے قانونی بندھن والے ایتھے چالی دن کٹھے نہیں گزار سکدے،اسیں قانون دا سہارا لئے بناں چالی ورھے کٹھے گزار لئے نیں۔''

اک ہور سوال سی:

''امرتا جی دے بناں اج کیویں محسوس کر دے او؟''امروز جی اوسے شانت لہجے وچ آکھن لگے۔

''امرتا ایتھے ای اے ایہناں کمریاں وچ،اوہدا جسم بس وداع ہویا اے............''

مگروں امروز جی نے اپنے ایہناں احساساں بارے ان گنت نظماں وی لکھیاں تے اک اخبار لئی مضمون وی لکھیا:امروز دے لفظ سن۔

''امرتا کِتے نہیں گئی، اوہ میرے کول ای اے، اوہدا جسم بے شک ایتھے نہیں اے۔ پہلاں وانگر میں روز ایہہ سوچ کے گھر مڑداواں کہ اوہ مینوں اڈیک رہی ہووے گی۔ گھر وچ اوہدی ہوندا احساس اج وی اے..... جیس دن توں اوہ بیمار پئی۔ میں ودھ توں ودھ اوہدے کول رہن لگ پیا ساں۔ اوہ نال رہن تے کول بہن لئی کہندی سی۔ دوجیاں دی مدد نہیں لینا چاہوندی سی۔ اوہدا چلانا کرنا موت نہیں وداعگی اے۔ مرن توں پہلاں، اپنی بیماری دے دناں وچ اوہنے جیہڑی اخیری نظم لکھی، اوہدے وچ وی اوہنے ''الوداع'' ہی آکھی سی۔ میں تینوں فیر ملاں گی، دو تن دناں...... مگروں میں مڑ کے امروز جی کول گیا اوہناں کوئی درجن بھر نظماں لکھیاں ہوئیاں سن۔ میں سوچیا، امرتا نے جتھے لکھنا چھڈیا اوتھوں امروز نے شروع کردتا۔ فیر اوہ اخیری نظم تے نہ ہوئی۔

اسیں گھنٹیاں بدھی امرتا جی بارے گلاں کردے رہے۔ اوس دن وی کسے رسالے دی ایڈیٹر امروز جی دا انٹرویو کرن آئی ہوئی سی۔ اوہ میرے نال وی سوال جواب کرن لگی پئی۔

اٹھن توں پہلاں میں آکھیا۔

''اسیں پاکستان وچ'' کاغذ تے کینوس'' چھاپنا چاہوندے آں۔ امرتا جی دا اپنا مرتب کیتا ہویا مجموعہ، تسیں ایہدے لئی کجھ لکھ دیو۔''

اوہناں اوتھے ہی بیٹھے بیٹھے چار اکھر لکھ دتے جیہڑے امرتا جی دی کتاب دا مکھڑا بن گئے نیں۔

ہوٹل واپس آکے میں راتیں امروز جی دیاں نظماں پڑھدا رہیا۔ اک نظم دے بول سن۔

پیار وچ
من کوئی ہو جاندا اے
پر ایہہ کوئی
کوتا لکھدا نہیں
کوتا جیوندا اے

تے آکھ سکدا واں کہ اج امروز جی وی نظماں لکھ نہیں رہے، نظماں جیوں رہے نیں۔ اپنیاں نظماں وی تے امرتا جی دیاں نظماں وی۔

(2)

جتھوں تیک امرتا پریتم جی دی شاعری دا سبندھ اے، اوہدے بارے میں کیہ آکھاں۔ میں کیہ تے میری نظر کیہ۔ صرف اینا آکھ سکدا واں کہ امرتا جی دی اپنی شخصیت وانگوں، اوہناں دیاں نظماں دی من وچ آہلنے پالیندیاں نیں۔ ایہہ نظماں پیار دیاں نہیں، پیار دی سُوجھ دیاں نظماں نیں۔ اوہناں وچلی پیڑ، پیڑ دی سُوجھ دیندی اے۔ اوہناں وچلا اکلاپا، اکلاپے دی سُوجھ دیندا اے۔ اوہناں وچلی صنفی ٹوک، مرد عورت وچکار جھیڑے دا روپ نہیں دھاردی، سگوں ظلم دے اوس نظام دی سُوجھ دیندی اے جیہڑا ایس جھیڑے دا اصلی کارن اے۔ سُوجھ اوہناں دی شاعری دا مکھ کردار اے۔

پاکستان وچ امرتا پریتم دی پچھان، اج وی ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' توں اگانہہ نہیں ودھی۔ ایہہ کتاب پڑھن والیاں دی پچھان اوس امرتا نال کراوے گی جیہنے 1960 دی دہائی وچ ہی نویں شعور نال سانجھ پالئی سی۔ تے فیر اوہ شاعری ساہمنے آئی جیہنے اج آکھاں وارث شاہ نوں، تے سُنیہڑے، دیاں نظماں نوں اک نواں رنگ روپ بخشیا۔ اک نویں نظر، اک نویں پچھان۔ ایہہ مجموعہ، امرتا جی نے آپ اپنے کل کلام دا نمائندہ کلام کر کے چھاپیا سی ایس لئی اسیں ایس نوں بناں کسے گھاٹے وادھے دے چھاپ رہے آں۔ مینوں زندگی وچ امرتا جی نے اپنیاں لکھتاں پاکستان توں چھاپن دی کئی وار لکھ کے آگیا دتی سی۔ ہن اوہ وداع ہو گئے نیں تے امروز جی نے مینوں پاکستانی ایڈیشن دی اجازت دیندے ہوئے، ایس ایڈیشن لئی چار اکھر وی لکھ دتے نیں تے ہن ایہہ کتاب تہاڈے ہتھاں وچ اے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را

☆☆☆☆

افضل توصیف

میرا تیرا کیہ رشتہ؟

ساڈا میل بچھوڑے دی لیہہ تے ہویا۔ جے کتے اُجاڑے نہ پیندے، پنجاب آپ سالم رہندا تاں کیہ ہوندا؟ اُمرتا لہور ای رہندی۔ مَیں کدے وی لہور نہ آوندی جے آوندی تاں وی کیہ۔ اوہنے تاں مُہان ای ہونا سی۔ میرے ورگی جونیئر نوں ایڈی وڈی شاعرہ کیہ جانے کیہ سمجھے۔

پہلی واری اُمرتا پریتم داناں سُنیا، کوئٹہ کالج وچ لاہور دی پرنسپل دے گھر گُج پنجابی آئے سی، اوہناں دو نظماں سُنائیاں۔

''اج اکھاں وارث شاہ نوں....''

دوجی نظم موہن سنگھ دی رب بارے سی'' ربّ اِک گُنجل دار بُجھارت''، کھانے پچھوں سویٹ ڈیش! مینوں تاں اوہ چُوری یاد آ گئی۔ مکّی دی رُوٹی، تازہ مکھن، نویں شکر۔ عجیب گل اے پنجاب دی بولی وچ کئی لفظ مکّی دی روٹی ورگے، کئی مکھن جہیے تے کئی تازی شکر ورگے وی سن۔ پر مینوں کیہ پتہ۔

ستر (۷۰) دی دہائی وچ مَیں لہور آ گئی۔ انگریزی، اُردو ادب لٹریچر ایجوکیشن ٹیچنگ وتھیرا گُنج۔ پر مکّی، مکھن تے شکر ورگے مزے دی بولی کتھے؟ اُمرتا پریتم'' وارث شاہ نوں قبراں وچوں بلا کے کیہ کہنا چاہوندی سی۔؟ اوہ آپ کہنی جہی سی، کتھے رہندی اے اج کیہ کہندی اے۔

بہت وڈی شاعرہ اے، بہت وڈے شہر وچ رہندی اے، پر لہور آوندیاں ڈردی اے۔ اُمرتا پریتم نوں لبھنا شروع کر دِتا۔ جدوں اوہدا پتہ لبھیا۔ تاں میرا آپنا پتہ گواچ گیا۔ اوہ زمانہ جدوں ایتھے جمہوریت دی جنگ زوراں تے آئی۔ ساڈا لیڈر ماریا گیا۔ ساڈے لئی دھرتی تنگ، آسمان دُور ہویا۔ مینوں لگا ویلے دا گواہ کوئی نہیں۔ گواہ نوں معتبر وی ہونا چاہی دا اے۔

اُوس کلجگ وچ میرے کول کجھ لفظ تے اِک گھر دا پتہ ہے سی۔ اُوس پتے اُتے اوہ لفظ اپڑ گئے۔ اُمرتا

پریتم نے سمجھ وی لئے، تے سانبھ کے رکھ وی لئے۔ اوہ شاعرہ سارے انقلاب دی ہسٹری توں واقف سی۔
اوہ پاکستان تو واقف سی۔ اوہنے مینوں پچھان لیا۔

پچھلے جنم اوہ میری ماں سی۔ ایہہ سچ اے۔ رُوحاں اِک دوجی نوں جنم دیندیاں۔ ایہہ گل وی اوہنے آکھی
سی، سگوں خط وچ لکھی وی۔ اوہ خط میرے کول ہیگا۔ اُمرتا پریتم دے ہور کِنے لفظ میرے لئی..... اِک پوری
کتاب میرے لئی، اِک خطاب میرے لئی...... ''سچی دھی پنجاب دی''۔

اک ہور رشتہ: بڑے مان نال اوہ مینوں لہور دی اُدیہ کہندی سی۔ ہُن اوہ مان میرا سی کہ شہر لہور دا؟ اُمرتا
پریتم دا شہر لہور چھڈیا میرا وی ہو گیا۔ مَیں اوہناں نوں مِلن جاندی تاں دُونی خوشی ایس کر کے پئی افضل
توصیف اہدے لہوروں آئی اے۔ آپنے شہر دا حال پُچھن دا طریقہ وی اُمرتا پریتم دا آپنا ای سی۔

اِک واری جا کے بیٹھی تاں میرے نال پہلی گل ایسطراح کیتی ''اِک گیت ہوندا سی:

اُچے بُرج لہور دے

ہیٹھ وگے دریا

مل مل نہاون گوریاں

لین گراں داناں

کیہ بنیا اُوس گیت دا

تے گراں دا۔۔۔؟

فیر دوجی گل پُچھی:

اک رفو گر ہوندا سی

پاٹیاں دھرتیاں نون گنڈھدا اتر پدا

اوہ منٹو

تے اوہ فیض جو

نیم تاریک راہواں تے مارے جان

والیاں دی گل کردا سی۔۔۔؟

اُوس گیت دا کیہ بنیا۔۔۔؟

اوہ دریا تے ،گراں۔۔۔؟

اوہ گاؤن والیاں گوریاں۔۔۔؟

شاعر تے کہانی والا۔۔۔؟

تے اوہ شہراں دا شہر

لہور جس داناں۔۔۔؟

میں کہنا چاہوندی سی: دریا سُک گیا۔ گیت اُداس ہو گئے، سونیاں ڈُب گئیاں۔ شاعر مر گیا، کہانی گواچ گئی، تے گراں داناں لینا کفر ہویا۔

ہیں؟ ایہہ کیویں ہویا؟

کدے ،گراں داناں لیناوی کفر ہویا۔۔؟

تے شہر آپے کیہ کہندا۔۔۔؟

شہر تاں بس چُپ رہندا

اُمرتا پریتم دی نظم بولدی رہی۔ آپنے سوالاں دا جواب آپے دیندی رہی۔ مَیں اُونہاں دے سامنے کرسی تے بیٹھی گرم چاہ دا گھُٹ لیندی رہی۔

شاعرہ بولے تاں ہور کون بولے۔

فیر آیا نظم دا اخیرلا حصہ تاں شاعرہ اپنے آپ نال ہم کلام ہوئی۔

''پر جدوں توصیف نے شہر خاموشاں دی گل کیتی

تاں کِتے میرے اندر کر کے

کُجھ دیوے بلن لگ پئے

خبرے کُجھ قبراں تے رکھن لئی!

دیوالی دی رات اُمرتا پریتم اپنے بنیرے تے بہت سارے دیوے بال کے رکھدی سی۔ اونہاں وچوں کئی دیوے لہور والیاں لئی ہوندے۔ اوہ کسے شاعر، ادیب کسے متر میر نوں مُویا نہیں سی من دی۔

پوری دُنیا دے اُدیب، شاعر فریڈم فائیٹرز امن تے عوام لئی لکھن والے، امن تے عوام دشمن نال لڑن

والے، اُمرتا دے میر مُتر سن۔ اوہ گمنام راہوں تے مارے جان والے فریڈم فائیٹرز دے ناں دا دیوا وی بال کے آپنے بنیرے تے رکھدی سی۔ ۱۹۴۷ء وچ پنجاب دی پارٹیشن ویلے پنجابی عورت نال جو گُھج ہویا، جو اُوہنے بُھگتیا۔ اُوس عورت لئی اُمرتا نے قلم چُکیا تے ہر سال دیوا بالیا۔ اُمرتا دے بنیرے بڑے دیوے بلدے سی اوہدا گھر اِک آرٹ پیس۔ اِک رُوشن دان جیہا اَدب محل دا تخلیقی جہان دی کھڑکی سی۔ کتاباں، تصویراں، سوچ، پُھل، روشنی، ہریالی...... تخلیق دے عطر دی خوشبو نال مہکدا اِک گھر.....بس اِکو اِک.....اُوسے گھر دی مَیں زیارت کیتی، اُوسے کمرے وچ جا کے بیٹھی جتھے تخلیق دی دیوی دے منہ توں پُھلاں وانگ شعر کردے سی۔

اُمرتا جی کولوں مینوں کیہ ملیا، کنا کو ملیا؟ بے حساب؟ اَن مول.....اُونہاں میری تصدیق کیتی۔ میری اصل نوں منیا۔ دِلی وچ چھپی میری کتاب دا فلیپ اُمرتا جی نے لکھیا:

"جس دن جمی صاحباں

وقت دے کلیجے رُگ بھر کے

وقت دے کلیجے رُگ بھر کے کسے نیں کہیا سی:

جس دن جمی صاحباں ہور نہ جمیا کوئی

تے صحیح اکھراں وچ صاحباں کال کدے بیتیا کال نہیں ہوندا۔

کوئی صاحبان جدوں جمدی اے۔ اودوں وقت دے کلیجے رُگ بھریا جاندا اے"

تے

ہونیاں دے ہوٹھاں تے آ جاندا اے:

جس دن جمی صاحباں ہور نہ جمیا کوئی!

اَج دے کال وچ صاحباں دا اِک ناں توصیف وی ہے۔

توصیف جیہدے مرزے وَرگے تخیل نے وقت دے ویراں شمیراں اَگے واہراں چاڑھ دیتاں۔ اوہ توصیف جینے ویلے دے سارے قہر جھل لئے پر احساس مندی دا سر اُچا رکھیا۔

تے چیناں سر وی مان متا ہو گیا........"

ایہہ حوالہ اے اُوس جدوجہد دا، اُوس جنگ دا جو مَیں تے میری جنریشن دے ساتھیاں نے پاہودا ہا لڑلئی سی۔

اِک وڈے سامراجی ڈکیٹیٹر دا زمانہ سہی چارے پاسے نیھرے دا عمل جمہوریت دا لیڈر موت کوٹھڑی دے اندروں اپنا حصہ پا رہیا سی۔ باہروں ورکر کوڑے کھاندا تھکدا نہیں سی۔

اگنی جشن وی ہویا۔ لکھے لفظ اُتے سنسر لگائی۔ پروگریسو اَدب تے شاعری نوں سیم تھور آکھیا گیا۔ سارا مُلک مصلوب ہویا، تاں مَیں وی اپنا حصہ پایا۔ اسیں بہت سارے سال جو بُزدلی دے جیون توں باغی ہو کے موت ول نس پئے۔ بن سوچ سمجھے پا ہو داہ، پا ہو داہ!

سامراج دی طاقت نوں دُرلعنت کر کے اُسان قلم چُک لئے۔ اُساں بندوقاں وی چُک لیاں۔ اُساں جنگ کہتی امن واسطے، جمہوریت واسطے۔ کتاب واسطے لکھے لفظ دی حرمت واسطے اُساں جنگ چھودتی۔ ڈکٹیٹر دا ظلم، سامراج دا قہر بڑا بڑا کمینہ! سانوں بہتا پتہ نہیں سی ظلم کمینہ دی ہووے تاں کِبھی ہوندا۔

پر اُمرتا نوں پتہ سی۔ اوہ دُنیا دے سامراجاں تے ڈکٹیٹراں نوں جاندی سی۔ ایسے کر کے اُوہنوں فکر بڑی سی۔ ایسے کر کے اوہنوں ساڈی بڑی قدر روی سی۔ اُوہدی اپنی قدر بہت وَڈی سی۔ ہو چی مِنہ وَرگے عظیم فریڈم فائٹر نے اِک واری شاعرہ اُمرتا دا متھا چُم کے آکھیا سی۔ یو آر گریٹ اُمرتا۔۔۔

With your pen and poetry you are doing the same job, Which I am doing with my gun.

اُوس ویلے آزادی عوام دا لشکر اپنیاں قلماں نال تے بندوقاں نال ساری دُنیا مشرق تے جنوب وچ کھلریا ہویا سی۔ اُمرتا ہرتھاں گئی۔ پر مڑ کے پنجاب آ گئی۔ اوہ اوّل وآخر پنجابن سی۔ پنجاب لئی اوہدا پیار۔ پنجابی اَدب وزبان لئی اُوہدا مان۔ دُنیا دے سارے شاعر اُوہدے آپنے۔ پر وارث شاہ اُوہدا اوجودی۔ خالق تے تخلیق کار۔۔۔۔۔

ایس معاملے وچ اُمرتا پریتم تھوڑی سکھا شاہی وی کردی سی ایہہ جاندے ہوئے وی کہ مینوں بلوچستان نے پالیا، پڑھایا، سمجھ سوجھ، علم عقل دا رستہ دِتا۔ اُمرتا جی نوں پتہ سی میرا بہتا کم اُردو وِچ ہے گا۔ اوہناں مینوں ''سچی دھی'' پنجاب دی لکھیا......کیوں جو مَیں پنجاب نوں لکھیا۔ اَج کیہ اے اُمرتا پریتم دی برسی۔

کیہ فرق ہے؟۔

کوئی مرجاندا کوئی اُمر ہو جاندا اے، کوئی اگلا جنم لیندا اے۔

خبر چھپی:

''اُمرتا پریتم نے دُنیا سے رخصت لی۔

کیا کچھ چھوڑا ہے۔ کیا کچھ دُنیا کو دے کر گئیں۔ میں تو اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔ امروز جی کو کچھ اندازہ ہے۔ اُنھوں نے ٹیگور کی مثال دے کر کہا: جب وہ (ٹیگور) بیمار تھے اور بستر مرگ پر اُداس لیٹے تھے تو کسی نے کہا: ''تسلی کی بات ہے کہ آپ نے دُنیا کے لیے تھے۔ چھ سو (۶۰۰) گیت لکھ پائے''۔ ٹیگور نے کہا وہ جو لکھا ہے، سازوں کے ساتھ ٹھک ٹھک کرنے والی پراکٹس تھی۔ ابھی تو سازوں پہ سُر لگائے ہیں۔ گیت تو ابھی مجھے گانے ہیں''

سو امرتا جی تُسیں اپنے پنجاب نال وسدے رہو! میں تہاڈے ناں دا جو دیوا بالیا۔ روشنی میری اے۔ میں جو لفظ لکھے برکت میری اے۔ پر تُسیں جو گُج مینوں دے کے گئے او وہ میرا اعتبار اے۔ ساری انسانیت دا بھرم، انسان دا گیت اے۔ تُسیں کہیا سی:

''ہتھوں قلم نہ رکھیں۔ دُنیا نال ناراض نہ ہوئیں۔''

ٹھیک اے اُمرتا جی تہاڈی گل وَڈی اے!

مَیں پنجابی پاس ہاں!

تہاڈی دِتی سند!

مینوں معتبر بناؤندی اے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر امیا کنور

نیاز بو جہی شخصیت

امرتا جی دے سنگ ساتھ رہن والے اوہناں دے جیون ساتھی امروز، نُونہہ، دھی، پتر، اوہناں دے بچے، امرتا جی دے نزدیکی دوست اوہناں دی شخصیت دی مہک نال مہکدے تاں رہندے ہی ہن پر اوہناں توں دُور پار رہندے، اوہناں نوں پیار کرن والے لوک وی ایس الوکار (معجزاتی) نیاز بو جہی شخصیت توں سکھنے نہیں رہ سکدے۔

ایس نیاز بو شخصیت نوں نیڑیوں، جاندیاں قریب چودھاں سال ہوگئے ہن۔ حالانکہ اوہناں دیاں کتاباں راہیں تے کدے کدائیں کسے سیمینار وچ اوہناں نال میل ایس توں پہلاں وی ہوندا رہیا۔ اک دن فون آیا۔ میں امرجیت جی نال گل کرنی اے۔ کہیا : بول رہی ہاں۔ دُوجے پاسیوں آواز آئی۔ میں امرتا پریتم بول رہی ہاں۔ سنیا اے تہاڈی پنجابی اتے ہندی دوہاں بھاشاواں اتے برابر دی کمانڈ اے۔ مینوں آپنے لئی اک انوادک دی کدے کدائیں لوڑ پیندی ہے۔ سریر دا روم روم ساہ لین لگ پیا۔ اک چھن لئی جویں دل دھڑکنا بند ہو گیا تے فیر اوہدی رفتار اینی تیز ہو گئی کہ لگیا بس ہُنے ای۔۔۔۔ اوس شخصیت دی آواز سننا جھوں میں ستویں اٹھویں جماعت توں دیوانیاں وانگ پڑھدی آ رہی ساں۔ اوودوں جدوں میرے گھر نیڑے پنجابی دیاں کتاباں نہیں ملدیاں سن۔ اوودوں ہندی وچ سبھ توں پہلی کتاب پڑھی ''کالا گلاب''۔ اوس کچی عمر وچ جدوں اینیاں گہریاں گلاں سمجھ وچ نہیں آوندیاں، ''کالا گلاب'' دل و دماغ اتے پتا نہیں کیہ اثر کردا گیا کہ میں دیوانا وار اوس وچلیاں دِل نوں چھوہن والیاں سطراں

نوں لکیردی گئی۔ تے فیر ''اک دا بوٹا''، ''پنجر''، ''ڈاکٹر دیو''، ''دلی دیاں گلیاں''، ''اک سی انیتا''، پڑھیاں۔ جس گپتا بک شاپ توں اک رُپے تے دو کتاباں کرائے تے لے کے آوندی ساں، اوس نوں ہور کتاباں لیاون نوں کہندی۔ جدوں مینوں مہینے دا جیب خرچ ملدا تے گپتا کتاباں والا وی اوس کتاب نوں کرائے تے دے دے کے کافی پیسے کما چکا ہوندا تاں میں ادھا مُل دے کے اوہ کتاب خرید لیندی۔ اودوں توں ای میری نکی جہی لائبریری دا آغاز ہویا۔ اوہ کتاباں اج وی میری نجی لائبریری دا شنگار ہن۔ اوس وچ بہت وڈا اضافا ہویا امرتا جی ولوں ملیاں پنج چھے سو کتاباں نال۔ فیر میں ''ناگ منی'' لینی شروع کیتی۔ امرتا امروز دے وچاراں دی قائل ہوندی گئی۔ ہولی ہولی سبھ نوں امرتا جی پرتی میری کریز دا پتا چلدا گیا۔

خیر پچھل جھات توں اگے آئیے۔ فون دے دوجے پاسیوں امرتا جی بول رہے سن۔ ''کل میرے گھر آ سکدے او؟ میرا پتا ہے۔۔۔۔۔'' میں ہس پئی، ''تہاڈا گھر میں ویکھیا ہے۔ کئی وار راتیں سیر کردیاں تہاڈے گھر دے کولوں لنگھی ہاں۔ (بہت پہلے دو وار اوس گھر وچ جا وی چکی ساں اک وار پرشنسک دے طور تے اتے اک ویر جوگی دیدی (دیو دی پتنی) دا کوئی میسیج لے کے) سو کہیا 'کل آواں گی' فون بند ہو گیا پر جویں یقین نہیں آ رہیا سی۔ آپنی نوکری تے جد اگلے دن گئی تاں بار بار دوستاں نوں کہندی، کسے نے مینوں مورکھ تاں نہیں بنایا، جو جاندا ہووے کہ میں امرتا جی دی سنک دی حد تک پرشنسک ہاں۔ پر دوستاں دا کہنا سی، جو وی اے، تینوں اک ویر ضرور جانا چاہیدا ہے۔ فیر جدوں اوہناں کول گئی تاں آوݨ جان دا اجیہا سلسلا قایم ہویا کہ اج تیک برقرار اے کئی ویر پریوارک اتے سماجک کھچکناں کارن وتھ آ جاندی اے پر وقت دی سوئی نوں ایدھر اودھر سرکا کے امرتا جی کول جان لئی سما کڈھ ای لیندی ہاں۔ جدوں وی اوہ مینوں یاد کردے ہن، یاں مینوں اوہناں دی یاد آوندی ہے، یاں اوس نیاز بو دی مہک وچ گواچ کے آلے دوالے پھیلے ہوئے پردوشن توں مکت ہونا چاہندی ہاں۔

بہت سارے یادگاری چھن ہن۔ امرتا جی تے میں، کئی طرحاں دے بھیت سانجھے کیتے ہن۔ دوستاں دے، کولیگاں دے، لیکھکاں دے، پروار دے، عشق دے۔ اوہناں نال جڑیاں کئی موہ بھریاں سمرتیاں میری زندگی دا انکھڑواں حصہ ہن۔ کئی ویر اچانک کوئی پرشن، کوئی وِشا، کوئی فیچر امرتا جی میرے ہتھ پھڑا دیندے۔ ایس طرحاں ملو ملی چراں دا انترمن دے بھوریاں وچ پیا پتا نہیں کنا کجھ باہر آ جاندا۔ 'اک پرشن' 'دس قدم'، 'پنج باریاں' جیہے لیکھ ایسے دا پرمان ہن۔ بہت بیمار ہون دے باوجود میری کتاب دے چھپن وچ پوری دلچسپی لینا، بھومکا لئی موہن جیت دا ناں جھاونا(جو اک کتاب دا سبھ توں خوبصورت حصہ اے) کتاب دے فلیپ لئی لکھیاں امرتا جی دیاں چار سطراں ایس کتاب دا جیونت احساس ہن۔ ایس کاو سنگریہ''چھناں دی گاتھا'' دا نام کرن وی اوہناں کیتا۔ میری بیٹی دا میرے گھر آونا وی اوہناں دی پریرنا صدقا ای ہے۔ جدوں اوہناں نوں فون کر کے ایہ خوش خبری دتی، اوہناں نے اوس نوں ویکھنا چاہیا تاں کہیا کسے دن لے کے آواں گی۔ کہن لگے، نہیں، اوہنوں دھپ چ نہ لیاویں۔ میں خُد ویکھن آواں گی۔ اوہنیں دنیں وی اوہناں دی طبیعت ٹھیک نہیں سی پر ایس دے باوجود جدوں اوہ امروز جی دے مونڈھے دا آسرا لے کے میرے گھر دیاں چار پوڑھیاں چڑھ کے آئے تاں میں آپنے آپ اتے رشک کر اٹھی تے اوہناں پلاں چھناں نوں آپنے کیمرے وچ قید کر لیا۔ اج وی مینوں اوہ سبھ توں اَمُل تحفا لگدا ہے جہڑا اوہناں میری بچی نوں دتا سی۔ امرتا جی ولوں ملیاں اوہناں دا دتا اک اک تحفا سانبھ رکھیا ہے۔ چاہے اوہ کتاباں ہون، پہنن والے سوٹ ہون (جو ہُن تنگ تے چھوٹے ہو گئے ہن پر اوہناں نوں کسے نوں دین دا من نہیں کردا) چھٹ پٹ ٹوماں ہون، کجھ ہور نِک سک ہووے یاں فیر ملینیم ایوارڈ تے دتا گولڈ نیکلس ہووے۔ فیر پچھے میرے سوٹ دے رنگ نوں ویکھ اوہناں الماری چوں کڈھ کے چیکوسلواکیا توں لیاندا اک خوبصورت قیمتی برسلیٹ میری وینی تے بنھ دتا سی۔ ایہ سبھ بیش قیمتی تحفے میریاں یاداں نوں ویاپک بناؤندے ہن۔

امرتا جی، مہان لیکھکا ہون دے نال نال اجہی ہنداس شخصیت ہن، جس نے جویں چاہیا جیویا ہے میں اک معمولی، ادنا جہی شاعرا ہاں پر کجھ گلاں وچ اوہناں نال سانجھ ہے۔ ساڈے دوہاں دا ای پہلا عشق کتاباں ہن۔ چاہے اوہ کہندے ہن۔ ''مان سچے عشق دا ہے، ہنر دا دعوا نہیں۔۔۔۔'' چنگے انساناں، پھلاں، کتاباں بارے گل کردیاں، اوہناں دی چنگیائی دا مان دوہاں دے چہریاں تے ہوندا ہے۔ پورے سنسار وچ کسے نال وی ہوندی ناانصافی تے ساڈے دوہاں دا من بھر آوندا ہے۔ جتھے اوہ ایس ناانصافی لئی امروز جی نال گل کر لیندے ہن، اوتھے میرے کول اجہیا کوئی مکمل مرد نہیں۔ امرتا جی نوں ایتھے ایس گل دی عمر جنی طویل سنتشٹی ہے کہ اجہیا پورن مرد اوہناں دا حاصل اے۔ اوتھے کئی وار اوہناں نوں اک کسک وی ہوندی ہے کہ دنیا دیاں ہور عورتاں نوں ایہ پراپتی کیوں نہیں ہوندی۔ اوہ کئی وار جدوں اپنا رستا چننا چاہندیاں ہن تاں سارے رستے بند کیوں ہو جاندے ہن۔ اوہ بہت وار 'ناگ منی' وچ پاٹھکاں ولوں کیتے گئے پرشناں دے امروز ولوں دتے جواباں تے سویمان نال بھر جاندے ہن۔ اک وار کسے نے سوال کیتا 'عورت مرد دا رشتا اینا الجھیا ہویا کیوں ہوندا ہے؟' امروز جی دا جواب سی، ''کیوں کہ اجے تیک مرد نے عورت نال سونا ای سکھیا اے، جاگنا نہیں سکھیا۔۔۔۔'' ایہ ہے اک مکمل مرد دا جواب۔ پر امروز جی دی گل چ اضافا کرنا چاہندی ہاں ایہ کہہ کے ''اجے بہتیاں مرداں نے صحیح معنے وچ عورت نال سونا وی نہیں سکھیا۔''

پچھے جہے بوٹیاں، پھلاں دی گل چل رہی سی تاں میں کہیا دیدی! پتا اے اک بوٹے دا ناں لیلا مجنوں اے۔ حالاں کہ کتاباں وچ واڑ دی اک قسم دا ناں مجنوں آوندا ہے۔ میرے گھر جنے وی مالی میہنے، دو مہینے بعد میری پسند دے، عام اتے گھٹ نظر آون والے ورلے بوٹے دے جاندے ہن اوہ سبھ ایس نوں لیلا مجنوں ای کہندے ہن۔ امرتا جی کہن لگے لیلا مجنوں ای ہونا اے۔ اک دم بچیاں ورگی جگیاسا سی اوہناں دی آواز وچ، اوس بوٹے نوں ویکھن دی۔ فیر میں اوہناں نوں لیلا مجنوں دا بوٹا دے

کے آئی۔ اوس دن جو وی ساہمنے آئے، الکا، راجیش، امرتا جی اوہنوں کہن، ایہ امیا جہڑا بوٹا لیائی اے، پتا اے ایہدا کیہ ناں اے۔ لیلا مجنوں" اوس بوٹے دے پتیاں دا اتلا پاسا سبز اتے ہیٹھلا سرخ لال ہوندا اے، اک پتے دی سدھ پُٹھ دو رنگی ہون کارن ای شاید ایس نوں لیلا مجنوں کہندے ہون۔ ایس نوں کسے اُچی تھاں رکھو تاں لگدا جویں دو سِرے ابھید ہوئے ہون۔ خیر اوس دن توں بعد ہن جد وی ملیے ہسدے ہوئے کہن گے، امیا! کسے بوٹے دا ناں "ہیر" وی ہے اے کہ نہیں۔ پتا کر۔ پچھے جہے نیاز بو دا بوٹا چاہیدا سی۔ اوہناں اگے گل کیتی، کہن لگے۔ نیاز بو دا بوٹا جس گملے وچ لگیا ہووے، اوہدے نال جوڑ کے دوجا گملا رکھ دیوو، اوس نال دے گملے وچ اوہدے بیج ڈگدے ہن تے نواں نیاز بو دا بوٹا پنگر آوندا اے۔ میں اوہدے نال گملا رکھوا دیندی ہاں۔ کجھ دناں بعد جدوں میں فیر اوہناں ول گئی، کہن لگے، اوہ آپنا نیاز بو دا پودا لے جائیں۔ میں کہیا " 14اگست نوں ایہ بوٹا وی لواں گی تے امروز جی دی بنائی پینٹنگ وی جس دی اک مہینا پہلاں فرمائش کیتی سی (ایس دن میرے کسے نال دوستی دے 25 سال پورے ہو جان گے تے ایس پینٹنگ وچ اوس چھن قید ہے جدوں امروز جی نے پہلی وار امرتا جی دے پٹیل نگر والے گھر وچ اوہناں دے ہتھوں پروسیا کھانا کھادا سی۔ پتّل دی تھالی، اک روٹی، اک سبزی۔ ساہمنے پیا پتّل دا پتیلا۔ سادگی، سہج، سہج، تے خوبصورتی دا دِو سمیل) 14 اگست نوں میں اوہناں ول گئی، ہیٹھاں ویڑھے وچ لیا کے دھرے نیاز بو دے گملے نوں چک کے گڈی وچ رکھیا تے پینٹنگ لین لئی اتے ول نوں جان نوں مڑی ای ساں کہ الکا کہن لگی۔ اُتے کوئی نہیں۔ امی جی ہاسپٹل ایڈمٹ ہن۔ بابا جی وی اوتھے ہن۔ امی جی دا بلڈ پریشر بہت ودھ گیا سی۔ اوہناں نوں ویکھن گئی۔ اوہناں دی کمزور صحت، مُندیاں مُندیاں اکھاں ویکھ کے رہ رہ اکھاں بھر آوندیاں تے بار بار رب اگے ارداس کراں۔ پروردگار! امرتا جی نوں تندرست کر۔ اجے کئی ورھے اوہناں دی سانوں، ساڈے سماج نوں لوڑ ہے۔ اوہناں دیاں کتاباں نے اجے ہزارں لوکاں دی نمائندگی کرنی اے۔ راہ روشن کرنا اے۔ ایہو جہیاں ہستیاں تاں ربا توں وی صدیاں بعد

بھجدا ایں۔ ایہناں نوں کسے وی طرحاں دی تکلیف توں بچا۔ ایہناں دا نگھ ہمیشا ملدا رہے۔ کئی وار اوہناں نوں میرے اتھرو پونجھے ہن، مینوں گلوکڑی وچ لیا ہے، ڈھارس بنھایا ہے۔ پچھے جہے دنیش دیودی ہوری آئے وئے سن۔ راجیش وی اوتھے سی تے گل چل پئی بھگت سنگھ دی۔ امرتا جی نے کوئی کتاب لبھی اوس وچوں مسعود منور دی لکھی بھگ سنگھ دی گھوڑی پڑھ کے گاؤن لگے۔ ہولی ہولی اوہناں دی اواز اتھرووااں وچ بھجدی گئی تے میں ایس احساس مند شاعرا، حساس دل عورت دیاں بھاوناواں اگے سیس نواؤندی گئی۔ کہن لگے پتا نہیں کیوں جد وی بھگت سنگھ دی گھوڑی نوں گاؤندی ہاں میرے اتے ایہی عالم طاری ہوندا اے۔ اوس دیاں قربانیاں نوں لوکی بھلی بیٹھے ہن۔ ایسے طرحاں میری امرتا دے بہت چاہن والے ہن پر اجے وی اوس دی دین دی صحیح قدر نہیں پئی۔

اج سویرے سویرے امرتا جی نوں ملن گئی۔ اوہناں نوں اوہناں دے پرانے روں وچ ویکھ کے من کھڑ اٹھیا تے رات بھر ہوٹھاں وچوں نکلدی دعا نوں پورے ہوندے ویکھ اوس پروردگارشکریا ادا کیتا۔ ایس ویلے امروز جی ولوں دتی امرتا جی دی پستک ''اشو رنگ مجیٹھڑا'' میرے ہتھاں وچ ہے۔ امرتا جی دے ایسے نویں مجیٹھڑے رنگ وچ میں رنگی جا رہی ہاں۔ اپنا آپا بھلدا جا رہی ہاں۔ جتھے امرتا جی ایہنوں لکھن ویلے اوشومئی ہو گئے، میں امرتامئی ہوندی جا رہی ہاں۔

(لپی انتر : جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

ڈاکٹر بلوندر کور دھیر

امرتا پریتم دی کاوسمویدنا

پنجابی کاوچنتن وچ امرتا پریتم دا رچناتمک بمب اک ااجیہا سمویدن شیل لیکھکا دا ہے، جس نے اپنی کرتاری قلم راہیں عورت دی بے بسی نوں وِبھنّن پرتاں اپرسنگاں وچ چتویا اتے چتریا ہے۔ اس دی کاو سمویدنا دا مول سروکار عورت دی تراسد ستھتی دا پرمانک بودھ کرواؤنا ہے۔ اس دی کچی ساتجک یاترا دے آپار عورت دیاں دراسد ہونیاں 'دا' لیکھ ہے۔ امرتا اوہ قلمکار ہے جس نے خود عورت دی بے بسی اتے سنتاپ نوں اپنے تن من اُپر ہنڈایا ہے۔ اس دی کاوسمویدنا دی پرمانکتا دا رہس ہی ایہ ہے کہ اوہ تن جھاگے انوبھواں نوں بولی دین والی کوتری ہے۔ اس دی قلم دی شکتی ایہ ہے کہ اوہ بے باک اتے سمکالی ستھتیاں تے انتر وروودھ پچھاندی ہے۔ اوہ اس سماج دی سازشی لیلا نوں جان دی پچھاندی ہے، جس وچ عورت نوں دیوی مَن دا بھرم پالیا جاندا ہے۔ اسے دیوی نوں جدوں ایہ سماج 'بھوگ دی گڈی' بناؤندا ہے تاں اودوں امرتا دی قلم اجہیاں منفی شکتیاں وروودھ تکھی سروچ رچناتمک بول اچاردی ہے۔ امرتا دے ایہناں کاوبولاں وچوں امانوی شکتیاں دا داغی اتے کالا چرتر جگ ظاہر ہندا ہے۔ امرتا دی کاوسمویدنا دی شکتی ایہ ہے اس وچ دھرتی جائی دھی دے سنتاپاں نوں آواز بن کے ارتھ دتا گیا ہے۔ اوہ اوہناں پرستھتیاں دا کاوو یک اُساردی ہے۔ جو عورت نوں ان ہویاں بنا دیندیاں ہن۔ ایہناں منفی ستھتیاں وروودھ جاگروک قلم نوں پچھاندیاں ہی امرتا دی کاوسمویدنا دھرتی دی چیتنا بنی ہے۔ اسے نے ہی امرتا نوں عورت دی بلند آواز بنایا۔ ایہناں ارتھاں وچ اس نوں جیوندے بولاں والی کوتری منیا گیا ہے۔

ایہ تتھ تاں سپشٹ ہے کہ پنجابی ساہت ہی نہیں، کسے وی بھاشا دے ساہت وچ ناری دی سمویدن شیلتا دی ابھیویاکتی کوئی لیکھکا ہی ودھیرے خوبصورتی اتے تیکھنتا نال کرسکدی ہے۔ پنجابی ساہت جگت وچ امرتا توں پہلاں استری دی گل مرد لیکھکاں نے ہی کیتی پر اس وچ اوہ دم نہیں سی، اوہ گمبھیرتا نہیں سی، اوہ

ہمدردی وی نہیں سی جو امرتا دیاں لکھتاں وچ ہے۔ اپنے ہنڈائے دکھاں کارن عورت ہی عورت دیاں تکلیفاں اتے تراسدیاں بارے ودھیرے محسوس کردی ہے۔ عورت دی عورت نال ہمدردی سچی تے سبھاوک ہندی ہے جد کہ مرد لیکھکاں ولوں دکھائی گئی ہمدردی دکھاوے والی جاں اوپری جاں اپچارک ہی لگدی ہے۔ اسے لئی امرتا دیاں رچناواں ودھیرے جیوندیاں جاگدیاں جاپدیاں ہن۔ اوہ انسان دی روح اندر دور تک جھاکدی ہے تے فر اوہناں انتریو جذبیاں نوں کاغذاں اتے پھلاں وانگ کھلار دی ہے، بھانت بھانت دے پھل، خوشگوار پھل، پریم بھجے پھل، رنگ برنگے پھل، ہسدے پھل، روندے پھل اداس پھل، سجرے پھل، مرجھائے پھل، طرح طرح دے پھل۔ اک مہان لیکھکا اک اجہی شاعرہ جس دا اجے تک کوئی ثانی نہیں کیونکہ امرتا امرتا ہے تے اس ورگا کسے ہور دا ہونا بڑا کٹھن ہے۔

انج تاں ساہت دے ہر روپ نوں امرتا نے بہت کجھ دتا۔ بھاویں کہانی ہووے جاں ناول، سفرنامہ ہووے جاں ہور وارتک پر کوتا نوں جو نکھار تے حسن امرتا نے بخشیا اس دی مثال اوہ آپ ہی ہے۔ انوواد تے سمپادنا دا خیر وی نہیں چھڈیا۔ پر اس دی اصل پہچان اک بہت وڈی کوتری وجوں ستھاپت ہوئی۔ اس نے شروعات وی کوتا لکھن نال ہی کیتی جد اوہ کیول گیارہ ورھیاں دی ہی سی۔ امرتا نوں 'استری دی آواز' کر کے جانیا جاندا ہے۔ اس دیاں رچناواں دا مول دھرا استری ہے جو کچے سنسار تے سماج دے ہتھاں ستائی جاندی ہے۔

صدیاں توں مرد پردھان سماج وچ استری گلیاں سڑیاں قدراں قیمتاں دا انوسرن کردی رہی ہے تے کچی سماجک وستھا دے تحت مرد دیاں ودھیکیاں نوں اپنی ہونی سمجھ کے بھگتدی رہی ہے۔ اتہاسک سومیاں دے انومان انوسار پورو ویدک کال وچ تاں استری دا سماج وچ درجہ سنتو کھجنک دسیا جاندا ہے۔ ویدک کال دے شروع شروع وچ وی حالات ٹھیک ہی سن پر ہولی ہولی ناری نال انیاں تے جبر ودھن لگا تے اس دا سماج وچ درجہ نگونا جیہا بن کے رہ گیا۔ مرد پردھان سماج وچ ہور وستواں دان کرن وانگ استری نوں وی دان وچ دین دی پرتھا چل پئی۔ اوہ اینی بلہین ہو گئی کہ گاواں مجھاں وانگ ماس دا ایہ بت خریدیا ویکھیا جان لگا۔ امرتا پریتم نے عورت دی اس تراسدی نوں جس شدت نال اپنیاں کوتاواں وچ چتریا ہے۔ اوہ اپنے آپ وچ مثال ہے۔ 'کنیا دان' کوتا وچ امرتا نے ناری دی اسے حالت نوں پیش کر دیاں لکھیا سی:

ماس دی بوٹی

ککھ دی بوٹی

واہ واہ دانی

واہ واہ داتے

کدے کرم کمان

جیہڑے جھولی تکن

اوہی ہی پروان

کنیادان کنیادان

ہوئے کلیان......

کنیادان مہان کلیان

امرتا پنجابی ساہت جگت دی اوہ عظیم کوتری ہے جس نوں وڈے وڈے شاعراں، کویاں، ساہتکاراں نے وکھ وکھ وشیشناں نال نال نوازیا ہے۔ اردو دے پرسدھ شاعر محمد اقبال نے امرتا نوں دب درشٹی والی اکھ، مدھر گیت گاؤن والی بلبل کہہ کے سنمانیا ہے۔ جیت سنگھ سیتل نے اس نوں ساہت گگن دا چندرما تچڑھدے پنجاب دا تیز سوی سورج کیہا ہے۔ امرتا دا درد جد چرم سیما تے پہنچدا ہے تاں ایہ لوک آواز بن جاندا ہے۔ اس دے لوک گیتاں اتے کوتا دے بولاں وچوں اس دی آلوچناتمک درشٹی جھلکدی ہے۔ سماجک تے اتہاسک پچھوکڑ دی دھرتل تے اس دیاں کوتاواں دے بول پھٹدے ہن۔

امرتا عورت دی آواز دی چاہوان ہے پر اس دے وچار انوسار آدمی دی سوچ نوں پہلاں بدلنا پوے گا۔ اس دا اپنا ایہ کہنا ہے، ''ہن تک آدمی کیول عورت دے سریر دے سوادنوں ہی جان دا آیا ہے۔ اس نے عورت دے من دی دنیا چ جان اتے اس دی سندرتا نوں پچھانن دی کدے وی کوشش نہیں کیتی، اس لئی مانو ناری دی آزادی دی تھاں آدمی دے من نوں سنسکار دین اتے دو یک شیل بناؤن بارے کجھ وددھیرے ہی سوچنا چاہیدا ہے اتے اس کھیتر وچ ٹھوس قدم کرنا چاہیدا ہے''

امرتا دا کاو سفر اصل وچ 'ٹھنڈیاں کرناں' (1935) توں شروع ہویا تے کاو سنگریہاں دا ایہ قافلہ 'امرتا لہراں' (1936)، جیوندا جیون 1939، تریل دھوتے پھل 1947، اوہ گیتاں والیا 1942، بدلاں دے پلے وچ 1943، سنجھ دی لالی 1943، نکی جہی سوغات 1944، لوک پیڑ 1944، پتھر گیٹے 1946،

لمیاں واٹاں 1947، میں تواریخ ہاں ہندی دی 1950، سرگھی ویلا 1951، سنیہڑے 1955، اشوکا چیتی 1957، سکتوری 1959، ناگ منی 1964، کاغذ تے کینوس 1970، میں جمع توں 1977 آدِ نال تر دا گیا۔

شروع شروع وچ اس دیاں کوتاواں اپھاوک تے روایتی قسم دیاں سن پر ہولی ہولی اوہ۔تھارتھ وادی ہوگئی تے جیون نوں بہت نیڑیوں ہو کے ویکھن لگ پئی۔ 'پتھر گیٹے' نال اس نوں بہت پرسدھی حاصل ہوئی۔اس سنگر یہ وچ نراشا ہے بھٹکن ہے۔دراصل ایہہ دنیا ہی مرد دی دنیاں ہے جس وچ آرتھک وسیلیاں اتے اسے دا قبضہ رہیا ہے۔سمبندھاں دا آدھار آرتھکتا ہون صدقہ عورت سدا ہی مرد اتے نربھر رہی۔اسے لئی صدیاں توں مرد اس نوں اپنی جائداد، جاں ورتوں دی اک وستو وانگ سمجھدا آیا تے عورت اس دے رحم کرم تے جیوندی رہی، اوہی عورت داان داتا سی۔اس ان داتے اتے ویانگ کردی کوتری نے لکھیا سی:

ان داتا میری جیبھ تے تیرالون ہے
تیراناں میرے باپ دیاں ہوٹھاں تے
تے میرے اس بت وچ میرے باپ داخون ہے
میں کویں بولاں، میرے بولن توں پہلاں
بول پیندا ہے ان تیرا............

امرتا پریتم نوں 'چم دی گڈی' تے ان دی برکی داذکر کر کے ناری دے سنتاپ نوں گہرائی بخش دی ہے۔عورت دی ترس جوگ حالت درساؤن لئی اس نے 'گیوشالا' کوتاوچ اس دی تلنا گیونال کیتی۔

ویاہ ورگے پوتر بندھن انوساروی ناری نوں کنا کو سنمان پراپت ہے، اس دی کوتا 'ویوپار' اس بارے ویانگ کردی ہے:

جسماں داویوپار
تکڑی دے دو چھابیاں
تکڑی دے دو چھاپیاں واکر
اک مرد اک نار
اک بازارتاں گاوجاکے

اشٹ دیودی مٹھ تار کے

سودے تے اک سوہر لوا کے

دن دیہاڑے ویچن دے وی

ہو جاندے حقدار

پیار محبت ورگا خوبصورت جذبہ رکھن دا عورت نوں ایہ سماج ادھیکار نہیں سی دیندا۔ امرتا 'را کھے' اوہناں دوغلے لوکاں اتے تیر چلاؤندی ہے جو پیار دے تاں دشمن ہن تے پیار کرن والیاں اتے کوڑی اکھ رکھدے ہن۔ اوہ ناری دے اندر چیتنا پیدا کرن لئی جتن شیل رہی ہے تے طرح طرح نال اس نوں ہلوندی رہی ہے۔ اوہ چاہندی سی کہ عورت نوں وی صحبت ورگا خوبصورت احساس پر گناؤن دا حق ہووے تے عورت وی آزاد ہو کے اسمان وچ خوبصورت پنچھی وانگ تاریاں لا سکے۔

امرتا دی کوتا وچ دکھ وکھ سماجک سروکاراں دی پیشکاری ہے۔ مثال بھاویں عورت دی برابری دا ہووے جاں انسان انسان دی برابری دا، پر اس درشٹی کون نوں اوہ بہت گمبھیرتا نال لیندی ہے۔ 'پتھر گیٹے'، 'لمیاں واٹاں'، 'نفرت' تے 'جھگیاں' ورگیاں رچناواں اس دی مایوسی نوں سنجیدگی نال پیش کر دیاں ہن۔ سماجک بے انصافی دے خلاف امرتا نے 'سنیہڑے' وچ بلند آواز اٹھائی۔ اس دا نجی غم مانوتا دا درد بن کے ابھردا ہے۔

اپنے دیش دی دردناک ونڈ دے ڈراونے درش تے ہو کے اس دی سروشیرشٹ کوتا وچ اج وی اسیں اسے شدت نال سن سکدے ہاں۔ جس وچ اوہ وارث شاہ نوں مخاطب ہندی ہے......

اک روئی سی دھی پنجاب دی

توں لکھ لکھ مارے وین

اج لکھاں دھیاں روندیاں

تینوں وارث شاہ نوں کہن

'پتھر گیٹے' وچ سماجک اتیاچار دے عام پر بھاو دا بل نجی انوبھو وچوں گربھن کیتا ہویا ہے پر 'لمیاں واٹاں' وچ ایہ دکھ آس پاس پھیلے دکھ توں جاگرت ہویا ہے۔ 'لمیاں واٹاں' پنجاب دی ونڈ کارن پیدا ہوئے سنتاپ نوں لہو نال بھجی قلم نے درد دے شعریاں اتے ہندا ہے عورت۔

ستھاپت قدراں قیمتاں پرتی کوتری بھاویں نراش وی ہے، دکھی وی ہے، وِدروہ وی کردی ہے پر نال ہی اس نوں بھروسہ ہے مانوی سبھاء دی چنگیائی وچ اوہ آسوند ہے کہ منکھ دے حالات بدلن گے۔ اس دا پیار وچ بھروسہ ہے۔ 'سنیہڑے' دیاں سندر کوتاواں وچ رتاں نوں مناؤن تے ایہناں دی سندرتا دا چتارن ہے جس وچ آشا تے نراشا دوہاں دا انوبھو ہندا ہے۔ اس وچ سماجک سنیہا ہے، اس وچ آس ہے۔ 'اشوکا چیتی' دا پھل ہے پیار دے پرتیک دا۔ امرتا دی شاعری وچ ٹیگور وانگ صحبت دے جذبے نوں پروان کیتا گیا ہے۔ کیونکہ ایہی جذبہ انسان نوں انسان بناؤندی ہے۔ امرتا عورت نوں تیار کردی ہے کہ اس پیار دی بھکھیا نہ منگے سگوں اپنے حق پراپت کرن لئی سنگھرش کرے اتے حاصل کرکے رہے۔ اس دیاں کوتاواں کیول رمانچک ہی نہیں ہن اوہناں وچ اک روحانی گن وی ہے تے یتھارتھ دی روح وی۔ اوہ پیار بارے کہندی ہے، 'پیار میرے لئی سدا کاہل بن کے آیا، اک شکتی جس نے مینوں پریریا ہے، مینوں جگایا ہے۔ جویں وویکانند جی کہندے ہن: سرب گیان تہاڈے اندر ہے۔ پر تہانوں اک ہور گیان دی لوڑ ہے جس دی روشنی وچ تسیں اپنی روشنی دی پرکھ کرسکو۔"

کوتا وانگ امرتا دیاں کہانیاں تے ناولاں وی عورت نال ہندے انیاں، ظلم تے اس دیاں تکلیفاں دی گاتھا بڑی بلند آواز وچ سناؤندے ہن۔ سماجک کوریتیاں تے دھارمک فساداں دے دکھانت نوں بڑیاں تیکھتا نال پیش کردے ہن۔

امرتا پنجابی ساہت جگت لئی اک بہت وڈا اوردان ثابت ہوئی اتے منکھتا لئی اک چانن منارا سی۔ پیار دے گیتاں دی مہان کوتری نے پیار نوں سروشریشٹ منیا، پوجیا تے نبھایا۔ اس انوسار پیار زندگی دی صحیح ارتھاں وچ تلاش ہے تے پیار ہی منکھی جیون دا سبھ توں وڈا قانون وی۔ تے اسے قانون وچ رہ کے اس نے اپنا سارا جیون بتایا۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

پال کور
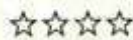
''رسیدی ٹکٹ'' دا لکھن جگت

لیکھک دی شخصیت دے بہت سارے پکھ تاں پرتکھ تے اپرتکھ روپ وچ اوہدیاں لکھتاں وچ ہی پئے ہندے ہن۔ پر فیر وی لیکھک دا بہت سارا نج ان کیہا رہ جاندا ہے۔ لیکھک دی زندگی دے اوہناں پکھاں تے پرناواں وچ پاٹھکاں دی اُتسکتا وی بڑی ہندی ہے۔ جیہڑے اوہدیاں لکھتاں دے پچھے کم کردے ہن۔ بھاویں بہت سارے لوک سوے جیونیاں نوں ایہ کہہ کے نکار دیندے ہن کہ ایہ تاں لیکھکاں دے نجی برتانت ہن۔ پر چرچت دے ستھاپت لیکھکاں تے دیا کتیاں دا نج وی نج نہیں رہ جاندا۔ ایہ گل بڑی مہتوپورن ہندی ہے کہ سماج دے کیہڑے حالات، اوہناں نوں بھیڑ وچوں کڈھ کے باہر لیائے، کتھے کتھے سماج دے حالات اوہناں دے پیراں دیاں بیڑیاں بنے تے اوہناں اس درد نوں اپنیاں لکھتاں وچ اتاریا اتے کنہاں حالاتاں نال اوہناں ٹکر لئی تے سماج نوں اوہدا درپن وکھاؤندے ہوئے، اوہناں اگلیاں پیڑھیاں لئی نویں راہ تلاش کیتے۔ اس لئی سوے جیونی ساہت جگت وچ ایہ گل ستھاپت کردی ہے کہ لیکھک تے لکھت دوویں مہتوپورن ہن۔ ویلیاں نوں، سماج نوں چاہیدا ہے کہ ایہناں نوں بُجھن اتے سنبھال کے رکھن۔ جدوں کسے لیکھک دی سوے جیونی اوہدیاں لکھتاں وانگ ہی چرچت ہندی ہے تاں اس سنبھال دی لوڑ ہور وی ودھ جاندی ہے۔

امرتا دی سوے جیونی 'رسیدی ٹکٹ' ایہناں ساریاں گلاں کرکے مہتوپورن ہے۔ 'رسیدی ٹکٹ' پہلی واری 1976 وچ چھپی سی، فر اس دے تن ایڈیشن ہور چھپے اتے پنجویں وار 1997 وچ امرتا نے اس نوں نویں ترتیب وچ 1997 تک دی زندگی تک لے جا کے پرکاشت کیتا۔ 1997 دی اس نویں ترتیب والی 'رسیدی ٹکٹ' ہی میری چرچا دا آدھار ہے۔ پہلی 'رسیدی ٹکٹ' وچوں اوس نے کجھ حادثے ورقے کڈھ دتے اتے اگلی زندگی دی یاترا نوں وچ شامل کردتا۔ ایہ اوس نے بہت سچیت روپ وچ پہلے صفحے اُپر ہی لکھیا ہے:

کئی حادثے جدوں واپر رہے ہندے ہن

ہنے ہنے لگے زخماں ورگے

تاں اوہناں دی کوئی چیس اکھراں وچ اتر جاندا ہے

پر ویلا پا کے احساس ہندا ہے کہ

ایہناں گلاں نے لمبے سمے لئی ساہت نوں کجھ نہیں دینا

ایہ وقتی واءورولے ہندیاں ہن............

اس 'رسیدی ٹکٹ' وچ شخص امرتا وی ہے، لیکھک امرتا وی، اوہ امرتا وی ہے، جو اپنیاں نظماں، ناولاں، کہانیاں، وارتک تے 'ناگ منی' وچ موجود ہے اتے اوہ امرتا وی، جو ایہناں لکھتاں توں باہر رہ گئی۔ اس وچ سچیت امرتا وی ہے، اتے امرتا دا اچیت وی، جو اوہدیاں لکھتاں تے جیون دا آدھار بنیا۔ پنجابی وچ بہت سارے پرسدھ لیکھکاں نے اپنیاں سوے جیونیاں لکھیاں ہن، پر اک عورت لیکھک دی سوے جیونی ہون کر کے، وکھریاں جیون پرستھتیاں، سماج دے ستھاپت پر پر بندھ نال ٹکراؤندیاں اک وکھری جیون شیلی اپناؤن دی جرات کرن کر کے اتے اک نویکلی کاوک شیلی کر کے 'رسیدی ٹکٹ' دی دنیا بڑی وِلکھن ہے۔

سوے جیونی وچ لیکھک دا ہندا تاں نج ہی ہے، پر کوئی لیکھک جناچر اپنے آپ توں وتھ تے کھڑا نہیں ہندا، اوہ کوئی وی لکھت تے سوے جیونی وچ نہیں لکھ سکدا۔ سوے جیونی وچ لیکھک اکو ویلے اپنے جیون دے دریا وچ اتریا وی ہندا ہے اتے کنڈھے تے وی کھلوتا ہندا ہے۔ امرتا سوے جیونی دے اس سدھانت پرتی بہت سچیت سی۔ اوہ لکھدی ہے:

''سوے جیونی نوں اکثر چلکدی چلکدی اکواسی سچائی سمجھیا جاندا ہے، سوے شلا گھا دا بنڑی مادھیم۔ پر بنیادی سچائی نوں لیکھک دی اپنی لوڑ من کے میں اپنی چاہونگی ایہ سوارتھ توں یتھارتھ تک پہنچن دا اصل ہے۔

اک کجھ اوہ ہندا ہے جو ساہویں، بناں کسے تردد دے نظریں پے جاندی ہے، تے اک صرف نجھ لایاں دسدا ہے، تے اک سوچاں نوں چھان چھان لبھدا ہے۔ یتھارتھ اوہ وی ہندا ہے، اوہ وہ تے اوہ وی۔

ہرکلا، اُساری وچوں مڑ اُساری داناں ہے۔ ایہ یتھارتھ دی مڑ اُساری وی یتھارتھ ہے۔ سچائی دی لکھ وچ پے کے فیر اوس لکھ وچوں نرلی ہوئی سچائی۔ یتھارتھ دی مڑ اُساری، یتھارتھ توں یتھارتھ تک

پہنچن دا اصل ہے۔'' (پنا100)

اپنی گل نوں اگے توردیاں امرتا سوے جیونی وچ لیکھک تے پاٹھک دے رشتے پرتی ایمانداری پرگٹاوندی ہے:

''ناول کہانی دا پاٹھک، پاتراں دے مونہاں نوں قیاس دا ہے، اوہناں دے دلاں دی ہلچل توں اوہناں دے نقش چتودا ہے، پر کسے سوے جیونی دا پاٹھک اپنا سارا دھیان اکو تے جانے ہوئے منہ اتے کیندرت کردا ہے۔ایہدے وچ لیکھک تے پاٹھک سنمکھ ہندے ہن۔ایہ لیکھک دا اپنے گھر وچ پاٹھک نوں نجی بلاوا ہندا ہے، سنگ سنکوچ دی دہلیز توں اندروار۔ تے ایہ صرف اودوں سمبھو ہندا ہے جدوں لیکھک دا جیرا اوہدے کسے سچ نالوں اونا نہ ہووے۔ایہدے وچ کوئی جھوٹھ، مہمان دی نہیں، میزبان دی اپنی ہتک ہندی ہے۔'' (پنا 100)

امرتا 'رسیدی ٹکٹ' دا ارنبھ لیکھک تے لکھت دے اک ہون توں کردی ہے، ''جو کجھ واپریا، من دیاں تیہاں وچ واپریا، تے اوہ سارا کجھ نظماں تے ناولاں دے حوالے ہو گیا، فیر باقی کی رہیا؟ فیر وی کجھ سطراں لکھ رہی ہاں، کجھ انج، جویں زندگی دے لیکھے جوکھے دے کاغذاں اتے نکی جہی رسیدی ٹکٹ لا رہی ہوواں۔نظماں تے ناولاں دے لیکھے جوکھے دی کچی رسید نوں پکی رسید کرن لئی۔'' (پنا9)

سوے جیونی دا ایہ سوتر سچیت ہے جاں اچیت، پر پوری 'رسیدی ٹکٹ' وچ پھیلیا پیا ہویا ہے۔اس وچ امرتا دی جیون یاترا، شخصیت دے وکاس اتے لکھت یاترا دے دو بمب ابھردے ہن، جیہڑے اوہدی زندگی، شخصیت اتے لکھتاں دے پیراڈائم بن دے ہن:

''لوک آکھدے نیں، اوس عورت نے جیہڑے محبت دے گیت لکھے، اوہ لال رنگ دے گلاب بن گئے نیں، تے جیہڑے درداں دے گیت لکھے، اوہ گلاب کالے رنگ دے ہو گئے نیں، تے جیہڑے اوہنے منکھی پیار دے گیت لکھے، اوہ چٹے گلاب دے پھل بن گئے نیں۔'' (پنا 41)

ایسے طرح اوہ اپنی مانسک اوستھا دے چار پڑاواں دی گل کردی ہے:

''پہلا پڑاء سی اچیتنتا۔ایہ اک بال بدھ وانگ سی، جس نوں ہر چیز اچنبھا لگدی ہے۔جس نوں چھوٹی توں چھوٹی چیز وچ وڈی توں وڈی دلچسپی جاگ پیندی ہے تے جیہڑی جھٹ ولک اردی ہے تے جھٹ ورچ جاندا ہے۔

دوسرا پڑاء سی چیتنتا۔ اک اک موکلے انگاں والی تے ہنڈھیل جوانی وانگ سی، جس دا ہور بڑا تگڑا ہندا ہے، بڑا رتا۔ جیہڑی، زندگی دیاں غلط قیمتاں نال جدوں رس بہندی ہے، مَن وچ نہیں آوندی۔ تے جیہڑی اک متھ وانگوں نفرت نوں منی سمجھ دے اپنے متھے وچ سانبھی رکھدی ہے۔

تیسرا پڑاء سی دلیری۔ ورتمان نون ادھیڑن والی تے بھوکھ نوں سیؤن والی دلیری۔ سپنیاں نوں تاش دے پتیاں وانگوں رلا کے، تے ونڈ کے کوئی کھیڈ کھیڈن والی دلیری، جس دی کوئی وی ہار سدیوی ہار نہیں ہندی جس دے پتے مڑ رلائے جاسکدے ہن، تے جت دی آس مڑ کے نہی جاسکدی ہے......

تے ہن چوتھا پڑ ہے اکلتا...... (پنا 44)

ایہناں بماں دے آدھار تے 'رسیدی ٹکٹ' وچوں لیکھکا دا جو پہلا روپ ابھردا ہے، اوہ اک دردمند کڑی دا ہے۔ بچپن وچ ہی ماں نوں گوا بیٹھی ایہ کڑی، پتا دے دھرم آدرش اتے اپنے کچے پکے سپنیاں وچالے گھر جاندی ہے۔ پتا اوس نوں دھارمک، سماجک سنسکاراں وچ پالنا چاہندے سن، پر جوان کڑی دے سپنے اس آدرش جڈے نہیں ہوسکدے۔ پتا دھرم اتے پاٹھ دا سرکھیا دا کلا اوہدے دوالے اُسار دے اتے کڑی جان بجھ کے اوس وچوں میریاں کر کے اپنے سپنیاں دے نائیک نوں اندر داخل کرلیندی۔ پتا چاہندے سن کہ دھی دھارمک کوتا لکھے، پر دھی اپنے سپنیاں دے نائیک نوں سمبودھت سی۔ چار سال دی عمر وچ نیڑلی رشتے داری وچ منگی اس کڑی دا سولاں سالاں دی عمر وچ ویاہ کر دتا گیا۔ پر ویاہ دا ایہ پربندھ اوہدے من اتے سپنیاں دے میچ نہ آیا۔ اس لئی سولھواں ورہا اوہدے اندران ہنڈایا رہ گیا۔ تے اس نوں اوہ اپنیاں لکھتاں وچ اتارن لگی۔

'رسیدی ٹکٹ' وچوں لیکھکا دا دوجا روپ اوس دردمند عورت لیکھکا دا ابھردا ہے، جس نے بھر جوانی دے ورھے تیبرے درددے سنگ ہنڈائے۔ سپنیاں دا نائیک ساہمنے آ کھلوتا، پر اپنپچ ہوگیا، ان چاہیا ویاہ اوہدی مجبوری بن گیا اتے ان چاہے چاہن والے اوہدی نفرت بن گئے۔ پر امرتا نے مجبوری تے نفرت نوں اپنی زندگی وچ ٹھہرن نہیں دتا اتے اپنے احساس تے لکھتاں محبت نوں سمرپت کر دتیاں:

رل گئی سی اوس وچ اک بوند تیرے عشق دی
ایس لئی میں عمر دی ساری کڑتن پی لئی۔

ساحر دی محبت دے دردنوں اوس نے امروز دی محبت وچ بھلا دتا۔ اوہ امروز دے درویشی امبراں

وچ اڈان بھرن لگی۔

'رسیدی ٹکٹ' وچوں لیکھکا دا تیجا روپ اک جرت والی عورت لیکھکا دا ابھردا ہے، جس نے ادھوری محبت دے دردنوں وی پار کیتا، فر مجبوری دی پنجابی لاہ کے امروز ورگے من دے ساتھی نوں جیون ساتھی بناؤن دی جرات کیتی اتے اوہدی جیون شیلی تے لکھتاں اُپر لگاتار لگدے الزاماں نوں پار کردیاں اپنے سچ اتے لکھت دے سچ نال ایمانداری نال، وچاہد ہندی، صرف پنجابی ہی نہیں، انیکاں ملکاں اتے بھاشاواں دے ساہت جلت اُپر ستروریھیاں تک چھائی رہی۔

'رسیدی ٹکٹ' وچوں لیکھکا دا اک روپ نجاتیت لیکھکا تے زخم دا ابھردا ہے، جو اپنے دردنوں لوکائی دے درد وچ وی گھول لیندی ہے اتے اپنے دردنوں پار کردیاں، اپنے جہے سمویدن شیل لوکاں دے درد نال جڑدی، منکھی مسئلیاں نوں سماجک، راج نیتک اتے دھارمک سندربھاں وچ سمجھدی، راشٹری انتر راشٹری پدھر اوپر، منکھی سمویدنا نال سانجھ پاؤندی ہے۔قریباً20-15 دیشاں وچ گھمدی امرتا اوتھوں دے لوکاں دی سمویدنا نال سانجھ پاؤندی۔ اوتھوں دے ساہت، لیکھکاں، چنتکاں اتے آگوواں نال شاعری تے چنتن دیاں گلاں کردی۔ ہر ملک دی شاعری دا پنجابی وچ ترجمہ کردی۔ ویتنام دے لیکھکاں نال گل کردی امرتا دعا کردی ہے،

''کاش ساری دنیا دیاں خوبصورت نظماں رل جان تے اوہ ویتنام دی راکھی کر سکن......'' (پنا 65)

''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' ورگی نظم اتے ''رب خیر کرے میرے ویڑھے دی۔'' گاؤن والی امرتا نے کتے وی بولدیاں لکھدیاں اپنی کاوشیلی نہیں چھڈی۔1986 وچ اوس نوں ملکھ منتریاں دی اک کانفرنس وچ غیر سرکاری بلارے وجوں شامل ہون دا موقع ملیا تاں اوس آکھیا:

''اک ویلا سی جدوں کیرل وچ جاتی واد دی بھیانکتا نوں ویکھ کے سوامی وویکانند نے کیہا سی کہ کیرل، بھارت دا پاگل خانہ ہے۔اج میں بھریاں اکھاں نال کہنا چاہندی ہاں کہ اسیں ہر پرانت نوں بھارت دا پاگل خانہ بنا رہے ہاں۔'' (پنا 117)

اس توں بعد اوس نوں راج سبھا دی ممبر نامزد کیتا گیا۔ سنسد وچ وی اوس نے بھارت پاک سمبندھاں تے انتر گت شاعراں، ادیباں دیاں مشکلاں، وپاریکرن، آسام دے ویشنو مٹھ وچ عورتاں دے

داخلے تے پابندی، قانون وِوستھا نال سمبندھت اتے لیکھکا دیاں کئی سمسیاواں نال سمبندھت مدّے اٹھائے ،جنھاں داذکر اوس نے 'رسیدی ٹکٹ' وچ کیتا ہے۔

'رسیدی ٹکٹ' وچ لیکھکا دی شخصیت دا اوہ روپ وی اجاگر ہندا ہے، جو سارے حادثیاں، گلے شکوے، درد، سموید نا تے سوالاں توں پار جاندا ہے۔ امرتا اس نویں 'رسیدی ٹکٹ' وچ پہلی 'رسیدی ٹکٹ' والے گلے شکوے تے درد دا ذکر منفی کر دیندی ہے۔ کیونکہ نہ تے تھاں صرف کہانیاں تے اتہاس بن دے ہن، حادثے تے دکھ دین والے داناں کوئی وی ہوسکدا ہے، تھاں کوئی وی ہوسکدا ہے، پر اوہ اوہناں ناواں تھاواں نوں چھڈ کے سیاہ طاقتاں دے سارتک نوں پچھان دا جتن کردی ہے۔ زندگی دے سچ سویکار نوں پچھاندی پرشناں توں پار جان دی اچھا اُر اپنی گل سمیٹدی ہے۔ درد دی سموید نا توں سچ تے سچ ول یاترا کردی امرتا ادھیاتمک سچ وچ جا اتردی ہے۔ اک ادھیاتمک ورثے وچ پیدا ہوئی امرت کور، جو پہلاں اوس ورثے دے بندھناں وروُدھ بغاوت کردی ہے، پر ہولی ہولی سچ سویکارتوں بعد اوسے طرح دی ادھیاتمک چیتنا وچ اتر جاندی ہے۔ جویں امرتا دی لکھت دیشاں تے بھاشاواں دیاں حداں توں پار جاندی ہے، اوسے طرح امرتا دی چیتنا وی دھارمک ولگناں توں پار جاندی ہے۔ بچپن دیاں نکیاں نکیاں گلاں اوہدے اچیت وچ اتر گئیاں تے فر اوہدی راہبری کردیاں رہیاں۔ 'رسیدی ٹکٹ' وچ سپنیاں دا شکار تے دیا کھیا وی اوہ اپنے اوچیتن وچ اترن واسطے کردی ہے۔ اس سوے جیونی وچ اوس نے اپنی ساری یاترا دے گاوہ روپ وچ اپنیاں نظماں دے نال نال، اپنیاں کہانیاں تے ناولاں دے پاتراں نوں پیش کیتا ہے۔ امرتا نے اپنے بارے جو کیہا، اوس نوں پرتی بمبت کرن لئی اوہ حادثے، اپنے پاتر، سپنے تے خیال..... سبھ نوں درپن وجوں پیش کردی ہے۔ ایہ سارے درپن سانوں امرتا نوں ہور سپشٹ ویکھن وجھن لئی وی اتے اوہدی لکھتاں وچ وی ہور چنگی طرح اترن لئی مدد کردے ہن۔

'رسیدی ٹکٹ' امرتا دا اپنے سمکالیاں تے پنجابی لیکھکاں پرتی اک الاہما وی ہے۔ بھاویں اوہناں وچ اوس دے چاہن والے سن، بھاویں کہانیاں گھڑن والے تے بھاویں اوس دیاں لکھتاں لئی ایرکھاں وجوں وروُدھتا کرن والے۔ اصل وچ جدوں ساڈا کتے کوئی پرشنسمک پیدا ہندا ہے، اوسے ویلے کتے ساڈا کوئی وروُدھی وی ضرور پیدا ہندا ہے۔ ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' کو تالئی جتھے اوس نوں بھارت تے پاکستان وچ بہت پرسدھی تے پیار حاصل ہویا اوتھے بہت ساری وروُدھتا وی ہوئی۔ ہور وی کئی لکھتاں اُپر

مقدمے تک دائر کردے گئے۔ اپنے سمکالیاں لئی اوہ گلے نال بھری اوہناں نوں ویر شمیر کہندی ہے تے:

میرا پنجاب - میرا کھیوا کھان بابل

میرے ویر شمیراں نال رل گیا۔ (پنا 105)

پر سمکالیاں پرتی اس الانبھے نوں اوہ نویاں پیڑھیاں توں اک امید نال دور کر دیندی ہے:

''میرے کول جو کجھ سی، جو اج برف وچ دبیا گیا ہے، تاں ایہ برفاں جدوں پگھرن گیاں، ایہدے ندیاں نالے اوہ ہون گے، جو ایمان نال ہتھاں وچ نویاں قلماں پھڑن گے تے اوہناں قلماں دی شدت وچ، میرا اوہ کجھ وی رلیا ہووے گا، جو اج چپ دی برف وچ دبیا گیا ہے۔'' (پنا 100)

'رسیدی ٹکٹ' وچ امرتا نے کال کرم دی شیلی نہیں اپنائی۔ اوہ انج وی اتہاس بنن وچ یقین نہیں رکھدی سی۔ اوس نے سوے جیونی نوں گھٹنا کرم اتے باہری تے انتریاترا دی ترتیب وچ پیش کیتا ہے۔ بھاویں 1997 وچ چھپی 'رسیدی ٹکٹ' وچ امرتا، امروز دے اپنے جیون وچ آون دے پریوارک اتے سماجک پرتیکرم نوں اتے ۔تھارتھک پکھ نوں پیش کر دی سی۔ ناگ منی راہیں، جو اوس نے پنجابی لیکھکاں دیاں تن پیڑھیاں پریت کیتا، اوس دے ساکارتمک پکھ پیش کر سکدی سی۔ پر ہو سکدا ہے، اس سمبندھی 'ناگ منی' وچ بہت کجھ لکھ لین کر کے، اوس نے دہراؤن ٹھیک نہ سمجھیا ہووے۔ پر کسے سوے جیونی وچ، لیکھک جو کہندا ہے اتے جو جیوندا ہے، اوس وچ وتھ نہیں ہونی چاہیدی اتے ایہ وتھ 'رسیدی ٹکٹ' وچ نہیں ہے۔

'رسیدی ٹکٹ' امرتا اتے اوہدیاں لکھتاں دی پنر سرجنا ہے۔ سنت اگستین دی کتاب Confession نوں پہلی سوے جیونی منیا جاندا ہے۔ اوہ لکھدا ہے:

''میرا من کتھے کوئی پناہ لبھ سکدا سی؟ جتھے وی میں جاندا ساں، میرا آپا فر وی پچھے چھٹ جاندا سی۔ ہے کوئی ایسی تھاں، جتھے میں اپنے آپے دا شکار نہ ہوواں۔''

'رسیدی ٹکٹ' وچلی یاترا وی اپنے اندروں باہر، باہروں اندر، اپنے آپ تک دی اتے فر اپنے آپ توں وی پار جان دی یاترا ہے۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

امرتا پریتم دا رچناتمک راہ

امرتا پریتم نے تیجے دھاگے دے انتر وچ ساہت دی دنیا وچ پرویش کیتا۔ اس سمبدھ وچ لیکھکا امرتا پریتم دی اُساری دے سمے دے واستوک حالات اتے اک نگاہ مارنی ضروری ہے۔ اس لئی اس سمے دے سماجک اتے اتہاسک حالات اتے تیجے دھاکے بھارتی ساہتک ورتارے اتے وشیش طور تے پنجابی ساہتک عملاں اتے امرتا پریتم دی پیڑھی دے لکھیاریاں دے ساہمنے کھڑھے سوالاں نوں سمجھنا وی اوشک ہے۔

کجھ اجہیاں باہرلیاں گھٹناواں ہن جنہاں نوں بھارتی اتہاس دے وکاس تے پورا پربھاو پایا۔ ایہناں وچوں پرسکھ سن 1928 دا سامراج وادوچ پیا بھتوں گہرا سنکٹ، بستی واد پر بندھ دا کھیرنوکھیر نو ہونا اتے سماجوادی دیشاں دا ودھدا اجماؤ۔ 1933 وچ جرمنی وچ فاشٹ سرکار بنی اتے سارے وشو وچ نازی واد دے خلاف بیان ودھ گئے۔ 1939 وچ چھڑے دوجے وشویدھ نے بھارت نوں وی جنگ وچ کھچ لیا۔ بھارتی جنتا دی اچھا دے وردھ انگلینڈ نے بھارت نوں وی جنگ وچ شریک دھر قرار دے دتا اتے فاشٹ جرمنی نال یدھ وچ بھارت دے منکھی اتے مالی سادھناں دی ودھ توں ودھ ورتوں دی کوشش کیتی۔ بھارتی سماج دے ہر حلقے وچ اس دے خلاف وردھ پرگٹ کیتا گیا۔

تیجے دھاکے دے بھارت وچ آزادی لئی سنگھرش کردی جنتا اتے سامراج وادی طاقتاں وچ ٹاکرا ہور تکھا ہو گیا۔ 1933-1929 دے سنسار آرتھک سنکٹ دا بھارت دے کرتی جن سموہ اتے بڑا ماڑا اثر پیا اتے اس دے نتیجے وجوں باستی وادیاں اتے سوتنترتا دے اچھکاں دے وچکار وردھ ہور وی تیز ہو گیا۔ 1928 وچ بھارت وچ سوتنترتا سنگرام دی اک نویں لہر اٹھی۔ کساناں دی مہم نے تیزی پھڑی اتے بھارتی پرولتاری نے اپنے اندولن نوں سرگرم کر دتا و دھیرے بیاناں وچ ہندوواں، سکھاں اتے مسلماناں اتے دوجے

دھرماں دی ایکتا دی جھلک پیندی سی۔ پنجاب وچ سامراج وِرودھی لہر کرانتی کاری سنگھرش دا روپ دھارن کر رہی سی۔ سماج دے سارے ورگاں نے بورژوازی، بدھی جیویاں نکے تے وڈے زمینداراں اتے کساناں نے آزادی دی منگ دے نعرے دا، سول انا گیا کاری لہر دے آرتھک نکتیاں دا اتے سرکاری اتیاچاراں نوں روکن دی کانگرس دی سنگ دا زوردار سمرتھن کیتا۔ ویہویں صدی دے پورے تیجے دہاکے وچ پنجاب دی اکالی لہر دے مکھ نعرے بھارت دی بستی وادی غلامی توں مکتی اتے اس نوں اک سوتنتر دیش بناؤنا سن۔

انگریز بستی واداں دی نیتی دھارمک اتے ذات پات دے بھید ورگیاں مدھ کالین پرمپراواں نوں بھڑکاؤن دی سی۔ اس دے نتیجے وچوں ایہہ بھید ہور ڈونگھیرے ہو گئے۔ انگریزاں دی پوری کوشش سی کہ ہر دھرم دے پڑھے لکھے لوک صرف اپنی ساہتک بھاشا تک ہی سیمت رہن: مسلمان اردو ورتن، ہندو ہندی اتے سکھ کیول پنجابی۔ اس کر کے پنجاب دی سنسکرتک ایکتا نوں بھاری سٹ وجی۔ اک پرمکھ سماجک اتے راجنیتک طاقت ہندیاں ہویاں دی سکھ راج نیتی وچ سرگرمی نال حصہ لین توں وانجھے رہے۔

پنجابی ساہت وچ ایہہ اُبال دا اتے پچھڑ کے آئے بودھ دا سماں سی۔ جیکر بنگالی ساہت وچ بودھ دا ارمبھ انیہویں صدی دے پہلے چوتھائی حصے وچ اتے اردو ساہت وچ تیجے چوتھائی حصے وچ ہویا، تاں پنجابی ساہت وچ بودھ وہروی بعد وچ آیا۔ ایہہ بھارتی اتہاس دا اوہ دوری جدوں کہ ٹیگور دے شبداں وچ ''قومی چیتنا پچھمی ساہت دی جادوئی چھوہ دے اسر ہون بیہوشی توں جاگ رہی سی۔''

اس طرح پنجاب دے سماجک راجنیتک اتے سنسکرتک جیون اتے بودھ دے آدرشاں دی ستھاپنا اتِ انت کٹھن حالتاں وچ ہوئی۔ ایہہ دیش دے دوجے حصیاں دیاں حالاتاں نالوں بالکل وکھ سن۔ ''اس سبھ کر کے پنجاب دے بورژوا راشٹروادنے کئی گنجھلدار روپ دھارن کیتے جیہڑے اپنی ہوند دے باوجود کل بھارت دی سامراج وِرودھی لہر نال سدا اک مٹھ ہو کے نہیں رہے۔'' کجھ حد تک اس سبھ دا اسر پنجابی ساہت اتے وی پیا۔ تیجے دہاکے دے انت وچ سماج وادی وچاردھارا نے پنجابی ساہت دیاں مول شیلیاں دے وکاس اتے اپنا اسر پایا۔

پنجابی لیکھکاں دیاں رچناواں وچ سکھ، ہندو اتے مسلم ایکتا دے وچار نے اک وڈا رول دھارن کرنا شروع کیتا۔ سکھاں دے بدھی مان ورگ وچوں لیکھکاں اتے پترکاراں دا اک سموہ انبھیا پدیا ہویا جس نے پنجابی راشٹروادی ساہت دے وکاس وچ اک وڈملا حصہ پایا۔ ایہہ سن: بھائی ویر سنگھ اتے کانھ سنگھ جہے

وددان۔

پنجابی لیکھاں اتے کویاں نے سماجک جیون وچ اپنے وددھ دے آگورول دی چیتنا دا پرگٹاء تیجے دھاکے دیاں پرمکھ ساہتک پتر کاواں (پریتم، پھلواڑی، موجی آدِ) وچ کیتا۔ ایہ پرچے پنجابی ساہت دے جنوادی دھڑے دی پرتیندھتا کردے سن۔ 1939 وچ شروع ہوئے لوک راجی طاقتاں دے جرمن اطالوی فاشزم دے وروددھ یدھ اتے خاص طور تے سوویت لوکاں دے فاشسٹ حملے دے خلاف ویرتا پورن سنگھرش نے بھارتی اتے پنجابی ساہت وچ اک نویں وشاوستونوں لے آندا۔

تیجے دھاکے دے لیکھکاں دے کلاتمک سادھنا دا سوماں کلاسیکی اتے سمکالی انگریزی ساہت، امریکی اتے روسی کلاسیکی ساہت سن۔ سوویت لیکھکاں دیاں رچناواں نے پرگتیوادی وچاردھارادی ستھاپنا وچ وڈا حصہ پایا۔ سماج وادی وچار اتے مارکس وادی وچار دھارا نے بہت سارے قلم دے ماہراں نوں آکرشت کیتا۔ پرگتیوادی لیکھکاں نے دنیاں دے سماجی آرتھک سمبندھاں نوں سمجھن دی کوشش وچ مارکس وادی وچاراں نوں اپنایا۔ مدھ ایشیا اتے فرانس کا کیشیا وچ سماج وادی جت دی اس وچ سہائی ہوئی۔

آلوچناتمک یتھارتھ واد دی ستھاپنا لئی گھول تیجے دھاکے دے ساہت وچ جنوادی لہر دا سوہجاتمک آدھار بنیا۔ ''تیجے دھاکے دے بھارت وچ مکھ سوہجاتمک وچاراں دی بنتر پرگتیوادی لیکھکاں اتے کلاکاراں دے اس سمے دی رچناتمک پرتھادے سدھانتاں نوں سمجھن دے جتن نال ہوئی۔ ایہناں وچ سبھ توں پرمکھ بھارتی پرگتی شیل لیکھک سنستھا نال سموبدھت لیکھکاں دیاں رچناواں سن۔ اس توں علاوہ کلاکاراں دے جتن سن نویں حالات وچ بھارتی لیکھکاں دیاں بھرپور سنسکرتک پرمپراواں دا وکاس کرنا، دھارمک پنڈ تاؤں اتے سماجوادی دیس وچ جمے پرمکھ اتے چنگے سوہجاتمک وچاراں نوں بھارتی آدھار دینا۔'' اس سنستھانوں جتھے بند کرن وچ اتے اس دے کم وچ پنجابی لیکھکاں ملک راج انند، اقبال سنگھ، کرتار سنگھ دُگل، موہن سنگھ آدِ نے سرگرمی نال حصہ لیا۔

اس طرح نال چوتھے دھاکے دے لیکھکاں دی وچار دھارا ستھاپنا وچ سنتنترتا لہر دا پھیلاؤ، بستی واد دا کھیرنو کھیرنو ہونا اتے ساریاں جنوادی طاقتاں دا فاشزم اتے پچھانہ کھو طاقتاں دے خلاف اک مٹھ ہونا سہائی ہووے۔ اس پیڑھی دے ساہمنے کئی جٹل سمسیاواں سن، جویں کہ اک ساہتک بھاشا دا وکاس، ورتمان پنجابی ساہت دی ستھاپنا وکھ وکھ ساہتک شیلیاں دا وکاس اتے سدھار، ساہت نوں پنجاب دے لوکاں دے ہتاں

دے نیڑے لیاؤنا آدِ۔

چوتھے دھاکے دے لیکھکاں نوں ایہناں سبھ مسلیاں نوں سمجھن اتے اپنی پوزیشن نوں صاف نسچت کرن دی لوڑ سی۔ ایہ محسوس کردیاں کہ اوہ پچھڑ گئے ہن، پنجاب دے لیکھکاں دی کوشش بھارت دے پرکھ لیکھکاں دے برابر آون دی سی۔ گربخش سنگھ دے لفظاں وچ ''اوہناں کول اپنے دس حدے وددھاؤن دے وسیلے تاں سین، پر گہرائی وچ جان لئی بہتا سماں نہیں سی۔'' ایہ سبھ کارن چوتھے دھاکے دے لیکھکاں دی چیتنا دا آدھار بنے۔ ایہناں لیکھکاں وچوں اک ہے امرتا پریتم۔

امرتا پریتم دا جنم 31 اگست 1919 وچ گوجرانوالہ وچ ہویا۔ پنجاب دے اتہاس اتے سنسکرتی وچ بہت کجھ اجہیا ہے، جس دا سمبندھ اس علاقے نال ہے جس وچ امرتا پریتم نے جنم لیا۔ اس داناں امرتا اس دے پتا سردار کرتار سنگھ ہتکاری نے، جو کہ مشہور اتہاس کار، کوی اتے سکھ دھرم ساہت دے چنگے جانوسن، نے رکھیا۔ گوجرانوالہ توں بعد لاہور وچ اوہ کالج وچ پڑھاؤندے سن اتے ساہتک پرچے 'رنجیت نگارا' دے ایڈیٹر سن۔ گھر دا واتاورن ساہت اتے پنجابی بھاشا نال بھرپور سی۔ امرتا دے کوی پتا سنسکرت برج بھاشا اتے پنجابی وچ دھارمک کوتاواں لکھدے سن۔ اوہناں نے ہی بیٹی دے من وچ کوتا لئی پیار پیدا کیتا اتے امرتا نے پہلے ساہتک قدم اوہناں دی دیکھ ریکھ وچ ہی آٹھائے۔ ''بچی دی کلپنا شکتی نوں چھوٹی عمر توں ہی پنجاب دی بھرپور لوک دھارا، پراتن ویر گاتھاواں اتے مہاں کاواں، لوک جیون سمبندھی گیتاں اتے ناچاں خشیاں اتے غماں اتے پنجاب دی نت دی زندگی دی خوراک ملدی رہی۔

امرتا پریتم نے آپ سدا اپنے سنسار درشٹی کون دی ستھاپنا وچ اتے کلاتمک رچناواں اتے اپنے پتا دے وڈے اثر دا ذکر کیتا ہے۔ امرتا پریتم دی سکھیا سکھ دھارمک اتے دارشنک سنسکاراں دے آدھار تے ہوئی۔

سکھاں دی دھارمک پستک آدِ گرنتھ ہے جو کہ پنجاب اتے اتری بھارت دے تیرھویں توں سولہویں صدی تک دے لوکراجی کویاں دیاں رچناواں دا سنگریہ ہے۔ امرتا نے آدِ گنرتھ، دسویں گرو گوبند سنگھ، جو کہ چنتک اتے کوی سن، دی بہادری بھرپور پستک 'دسم گرنتھ'، ستارھویں اتے اٹھارویں صدی دی کاور چنا اتے دیانگ ساہت، اتے انیھویں صدی دیاں دیش بھگتی پورن ویر گاتھاواں نوں جانیا اتے سمجھیا۔

اس ساری بھرپور ساہتک وراثت وچوں کالی داس، وارث شاہ اتے شرت چندر چٹوپادھیائے امرتا

لئی سبھ توں زیادہ عمر پاؤن والے ثابت ہوئے۔ خود امرتا پریتم نے کیہا ہے کہ ایہناں لیکھکاں دا عمر اس دی رچنا تے سدھانتہ ہو کے اپرگٹ ہے۔ اپنے رچناتمک مارگ دے ارنبھ وچ امرتا پریتم اتے روندر ناتھ ٹیگور دے دیا کتنوا تے رچناواں دوہاں دا ہی بڑا گہرا اثر پیا۔

اوس دی ماتا جلدی ہی اس توں وچھڑ گئی اتے اس دا پالن پوسن اپنے پتا دی دیکھ ریکھ وچ ہویا۔ اس دی ساہتک پرتبھا چھوٹی عمر وچ ہی ابھری۔ اپنی پہلی کوتا اس نے 11 ورھے دی عمر وچ لکھی۔ 1935 وچ اس دا پہلا کاوسنگر یہ 'ٹھنڈیاں کرناں' چھپیا۔ 1936 وچ امرتا پریتم دا اگلا کاوسنگر یہ 'امرت لہراں' دے ناں ہیٹھ پرکاشت ہویا اتے اس توں اپرنت کاوسنگر یہ 'جیوندا جیون' چھپیا۔ عمر دے پہلے کاوسنگر یہاں وچ دھارمک پریم دا انش سی جو کہ اس دی ساہتک پرتبھا دی ستھاپنا دے واتاورن نوں ویکھدیاں سبھاوک ہی ہے۔ کرتار سنگھ ڈگل نے صحیح لکھیا ہے کہ اک مٹھ دھارمک فرقے دی ہوند جو کہ صرف اک گرنتھ دے انوسار ہی چلداسی، دا نتیجہ ایہ ہویا کہ بہت سے تک پنجابی ساہت زیادہ تر دھارمک ہی رہیا، جد کہ غیر مذہبی ساہت دا وکاس پنجاب دیاں دو جیاں بھاشاواں بھاو ہندی اتے اردو وچ ہندا رہیا۔

سکھ دھرم دے موڈھی گرو نانک نوں امرتا پریتم نے سمپورن منکھتا دے سبھ توں بدھی مان جیاں وچوں اک منیا ہے۔ اس دے نال نال امرتا پریتم دے شروع دے کاوسنگر یہاں اتے بھائی ویر سنگھ دی کوتا دی چھاپ ہے۔ بھائی ویر سنگھ پنجابی دی نوین کوتا دے آگوواں وچوں اک سن۔ سن 1941 وچ امرتا پریتم دی نویں پستک 'تریل دھوتے پھل' چھپی۔ اس سنگر یہ وچ اس دی کوتا دا مکھ وشا ناری پریم، پریم دے غم اتے خشیاں ابھر کے ساہمنے آئے۔ اس نے پریم وچ ولاپ کردیاں، اداس ہندیاں، ہسدیاں اتے خشیاں نال ڈلھ ڈلھ پیندیاں عورتاں بارے لکھیا ہے۔ ایہ اوہ عورتاں ہن جنہاں دے نیناں وچ اگ ہے اتے جنہاں کول ماں ورگی ممتا دین والا دل ہے۔ اس دی کوتا وچ پرمکھ ستھان اس ناری دا ہے جس دے نصیب وچ بھارتی سماج وچ موجود سارے انتر وروده دسدے ہن۔ پنجاب دی بیٹی امرتا پریتم نے اوہناں پیڑاں، گربیاں اتے بھکھاں نوں محسوس کیتا ہے جو کہ انگریزاں کارن پنجاب دے لوکاں نے سہیاں۔ اتے سبھ توں زیادہ دکھ ناری نوں ہی سہنے پئے۔

رومانس وادی کوی پیڑت ناری دے ہردے نوں بہت اچا کر کے چتردے سن۔ لیکن امرتا عورت وچ سوئے مان دی اتے ہیتا وروده روس پرگٹ کرن دی بھاونا نوں جاگرت کرن دی کوشش کردی ہے۔ اس

دور وچ شاعرہ نے لاہور وچ ریڈیو تے کافی کم کیتا۔ اس وچ ادبی چنتن لکھنا ستار وجاؤنا شامل سن۔ اس سبھ نال اس دی رچناتمک درشٹی وچ وستھار اتے وادھا ہویا۔

سن 1942 وچ اگلا کاوسنگریہ 'او گیتاں والیا' اتے اس توں اپرنت 1943 وچ 'بدلاں دے پلے وچ' ناں ہیٹھ کاوسنگریہ پرکاشت ہوئے۔ اس دور نوں (1943 تک دے سمے نوں) کوتری امرتا پریتم دی ستاچیناد ادور کیہا جاسکدا اے۔ خود امرتا نے لکھیا ہے کہ "اس شروع دے عرصے وچ میں ہر چیز نوں حیرانی نال ویکھدی ساں۔" امرتا پریتم دی کاورچنا وچ حالاں ناری نوں اک ٹھوس اتے وکھری شخصیت دے روپ وچ نہیں سی چتریا گیا۔ ناری بمب دی وکھری ہوند نہیں سی سگوں اس نوں عورت دیاں پیرمی ول بھاوناواں راہیں اسدھے طور تے درسایا گیا سی۔

ویہویں صدی دا چوتھا دہاکا بھارتی لوکاں واسطے بہت کٹھن دور سی۔ دوجا وشو یدھ جاری سی۔ وکھرے پاکستان دی منگ لئی ودھدی لہر کر کے پنجاب دے لوک بہت ہی چنتت ہوئے کیونکہ پنجاب اک مسلمان علاقے دے طور تے جانیا جاندا سی اتے پنجاب دی قسمت اس گل تے ہی نربھر سی۔ پنجاب دی ونڈ جاں بھارت توں وکھ کیتے جان دے خطرے نے کجھ سمے لئی دھارمک (اکالی) اتے راج نیتک سنستھاواں جویں کہ چیف خالصا دیوان نوں اک مٹھ کر دتا۔ سوتنتر تا سنگرامیاں لئی ایہ کرڑی ازمائش دا سماں سی۔ امرتا لئی وی ایہ اپنے درشٹی کون نوں نسچت کرن دا اتے رچناتیم سارگ نوں متھن دا سماں سی۔ کرڑی واستوکتا نے اس نوں اپنے نجی کشٹاں دے پرم پراگت گیت گاؤن تک سیمت نہیں رہن دتا۔

اس دور وچ اس دی رچنا زیادہ واستووادی ہو کے آلے دوالے دی دنیاں نوں چھوہن لگ پئی اتے ایہ کوئی بہتی گھٹنا نہیں سی سگوں تیجے تے چوتھے دہاکے وچ پرگٹ ہوئی ساہتک رچی پرگتی وادوا اک انتریو انگ سی۔ اس رچی دا وڈا چنھ ساہت اتے سماجک۔ تھارتھ دا اک دوجے نال زیادہ ڈونگھا میل سی۔ پرگتیوادی کوتا دی ستھاپنا مارکس وادی ندھانتاں دے اثر ہیٹھ ہوئی اتے ایہ بھارتی اتے پنجابی ساہت وچ اک مہتو پورن دھارا سی۔ وشیش گل ایہ ہے کہ اس پرگتیوادی دھارا دا اگلیر وکاس امرتا پریتم دیاں رچناواں وچ ہویا۔

اس دیاں رچناواں وچ سامراج ورودھی دت دکھائی دین لگدے ہن (کاوسنگریہ 'سمجھ دی لالی'، سن 1943)۔ اس دور دی اس دی کاورچنا دی خاص گل ناری دے پرشن نوں زندگی دے مطلب دی اپنی کھوج نال جوڑنا سی (لوک پیڑ، سن 1944)۔ ہولی ہولی امرتا پریتم ساہت دیاں اصلی سمسیاواں اتے مچیاں اتے

لیکھک دی ساہت وچ صحیح تھاں دی پوری سوجھ تک پہنچدی ہے۔

اس توں اگلے چھ سالاں نوں لیکھکا دا نواں رچناتمک دور کیہا جاسکدا ہے۔ اس سمے دیاں تناؤ بھریاں گھٹناواں، جویں کہ دوجا وشو یدھ، آزادی دی لڑائی دا تکھیرے ہونا (خاص دور تے پنجاب وچ، جتھے سکھاں دے سارے راج نیتک اتے دھارمک گٹ بھارت دی ونڈ دے خلاف سن)، بنگال دا کال آدِ گھٹناواں اس دی کاو رچناوچ پرتی بندھت ہویاں اتے اوہناں نے پاٹھک نوں جھجھوڑیا۔

لیکھکا صاف طور تے ایہ سمجھدی ہے کہ نویں کال وچ کلاتمک رچنا دے نویں جائزے دی اتے نال ہی نال نویں ساہتک روپ دی لوڑ ہے۔ لوک پیڑ اتے سمے دی منگ دے انوسار اوہ زیادہ آدھونک روپ..... نوں چن دی ہے۔ 'لوک پیڑ تے پتھر گیٹے' وچ۔

دوجا وشو یدھ سماپت ہویا۔ اس نے امرتا پریتم نوں اپنے درشٹی کون نوں بدلن دے مجبور کیتا اتے ملک دی ونڈ نے اس نوں بری طرح نال جھجھوڑ دتا۔ پنجابیاں اتے ونڈ دے دردناک نتیجیاں دا سبھ توں زیادہ اثر ہویا کیونکہ پنجاب دا اک حصہ بھارت وچ رہ گیا اتے دوجا پاکستان کول چلا گیا۔ انگریزاں دے اکساوے نے ونڈ دے سمے مسلماناں، ہندوواں اتے سکھاں وچکار سخت کونی ٹکرا ہوئے۔

بھارت دا اک وی کوی اس گھٹنا توں بودل نہیں سی رہ سکدا اتے خاص طور تے پنجاب دی شاعرہ۔ پنجاب دی ونڈ تے اس نے آکھاں وارث شاہ نوں لکھی۔ اس کوتا وچ اس نے پنجاب دیاں عورتاں دے سارے دکھاں دا سپشٹ ورنن کیتا ہے۔ ایہ کوتا ساریاں دی زبان تے سی اتے لوکاں نے اس دی ہتھ نال اک دوجے لوکوں نکل کیتی۔ اس کوتا نال امرتا پریتم دی کاو رچنا دا سماجک دور ارنبھ ہندا ہے۔ سن 1947 توں بعد امرتا پریتم دلی آگئی۔ سن 1947 امرتا دے رچناتمک وکاس وچ اک سیما بن گیا۔ اوہ پنجاب دی سچی آواز بن جاندی ہے جو کہ عام لوکاں دیاں بھاوناواں دا پرگٹاء کردی ہے۔ اس کوتا وچ اس دا پنجاب دی ساہتک پرمپرا اتے لوک دھارا نال ڈونگھا اتے پکا سمبندھ ستھاپت ہندا ہے۔ ڈونگھے سوجھوادی وچاراں کارن اس نوں لفظی دکھاوے توں نفرت ہو جاندی ہے۔ اس دیاں کوتاواں نوں سرل اتے بناوٹ رہت طریقے نال پیش کردی ہے۔ اس دیاں کوتاواں لوکاں دے ہردے وچ سبھ توں کومل تھاں نوں چھوہ جاندیاں ہن۔

بھارت دی ونڈ دا اثر پنجاب دے آرتھک وکاس تے ہویا۔ سنچائی دے بہت سارے پربندھ اتے کپاہ دی کھیتی والے مدل علاقے پاکستان وچ رہ گئے۔ دوجے پاسے پنجاب توں آئے پناہ گیراں دا سوال سی۔

سن 47-1946 وچ پنجاب وچ 80 لکھ دے قریب لوک آئے۔
بہت ساریاں مشکلاں کھڑیاں ہویاں جو کہ آرتھک اتے سبھیاچارک پرکاردیاں سن۔ لوڑ سی قومی سوال نوں، بھاشا دے سوال نوں سلجھاؤن دی، عام جنتا دی سبھیاچارک پدھر نوں ودھاؤن دی۔ بھاشا دا سوال پنجاب وچ کافی مشکل سی کیونکہ وقتی بھاشا دے طور تے پنجابی نوں پورا مقام حاصل نہیں سی۔ سکولاں اتے دفتراں وچ وی ہندی اتے اردو نوں پہل دتی جاندی سی۔
پنجابی ساہت وچ ایہ سبھ کجھ نویاں سمسیاواں دے روپ وچ ساہمنے آؤندا ہے۔ ایہ ہن قومی ایکتا، سماجک نیاں اتے امن دیاں سمسیاواں۔
موہن سنگھ، کرتار سنگھ دُگل اتے دوجے لیکھکاں دے نال نال امرتا پریتم نے پنجاب دی ونڈ دے بعد دیاں اتے نویں جیون دیاں سمسیاواں نوں اپنیاں رچناواں سمرپت کیتیاں۔ ایہ رچناواں ہن لمیاں واٹاں (کوتاواں، سن 1949)، پنجر (ناول، 1950)، سرگھی ویلا (کوتاواں، 1951)، پنجاب دی آواز (لوک گیت سنگریہ، سن 1952)، سنیہڑے (کاو سنگریہ، 1955)۔ اس ویلے اوہ بڑے غصے نال اوہناں لوکاں بارے لکھدی ہے جنہاں نے اپنے حالات نال سمجھوتا کرلیا ہے (کوتا جگیاں) ناری دا سوال وی نویں طور تے ابھردا ہے۔ سماجک انیاں دے خلاف آواز کاو سنگریہاں 'سنیہڑے'، 'کستوری' اتے 'لمیاں واٹاں' وچ سنائی دیندی ہے۔ کوتاواں 'جی' اتے 'دعوت' آدِ وچ اک ایسی عورت دی آواز سنائی دیندی ہے جو کہ سمجھدی ہے کہ بیتے دی رہند کھوندے خلاف لڑائی راہیں ہی خشیاں دی رکھیا کیتی جاسکدی ہے۔ سماجک انتر وردھاں نوں بےنقاب کردیاں امرتا پریتم بھارتی سماج وچ نویں اخلاقی نیم تھاپت کرن دے حق وچ ہے۔ اپنیاں کوتاواں وچ اوہ امرت دی شخصیت دے اوہناں پکھاں اتے زور دیندی ہے جو کہ اس دے اپنے سنسار درشٹی کون نوں درساؤندے ہن۔ انسان وچ سبھ توں وڈی چیز اک سرگرم شخصیت ہے۔ ایہ نظریہ قلم دی کلاکار نوں گھٹناواں دے وچ سرگرم حصہ لین لئی مجبور کردا ہے۔ چوتھے دہاکے دا انت امرتا دی کلا دی پرپھلتا دا سماں ہے۔ ہر سل نویں کاو سنگریہ، ناول اتے گیت سنگریہ چھپدے ہن۔ پنجاب دی ساہتک زندگی دے کیہڑے پکھ سن، جنہاں کر کے ایوں ہویا؟
سبھ توں پہلی گل ایہ ہے کہ پنجاب وچ کئی ساہتک سنستھاواں نے سرگرمی نال کم کرنا شروع کیتا۔ ایہناں وچوں سبھ توں مہتوپورن سنستھاواں پنجاب سرکار دا بھاشا اتے ساہت وبھاگ، پنجابی بھاشا اتے

ساہت اکادمی اتے پنجابی لیکھک یونین سن۔ ایہناں سنستھاواں دے تحت کئی کانفرنساں، میٹنگاں، سبھاواں اتحاد ہویاں شروع ہویاں، جنہاں دے سٹے وچوں نہ صرف پنجابی بلکہ ہندی اتے اردو وچ لکھن والے لیکھکاں وچکار وی میل جول کافی ودھ گیا۔ صاف دل امرتا نوں کافی اوکڑاں آیاں۔ لکھاریاں اتے اخبار نویساں دی ایرکھا دا ساہمنا کرنا پیا۔ پر جدوی اس نوں سماں زیادہ مشکل لگدا، اوہ کوتا لکھدی۔ پہلا انسان، جس نے امرتا پریتم دا سمرتھان کیتا اوہ لیکھک اتے آلوچک تیجا سنگھ سی۔ ''تیجا سنگھ جی نے میریاں ساریاں پستکاں دا ذکر کیتا، میرے اندر لے شاعر نوں پچھانیا۔''

سن 1947 توں بعد دا سماں (چوتھے دھاکے دا انت اتے سارا پنجواں دھاکا) امرتا پریتم لئی رچناتمک پکھوں اک سارتھک دور سی۔ اسے دور وچ ہی اس دے سماجک، راج نیتک اتے سوہجاتمک درشٹی کون دی ستھاپنا ہوئی۔ اس سبھ دی جھلک اس دے بعد دی وارتک یان ناولاں تے آلوچناتمک لیکھکاں آدِ وچ ملدی ہے۔

'کالا گلاب' وچ اس نے 'میں' دی ورتوں کر کے ہزاراں بھارتی عورتاں دیاں بھاوناواں نوں پرگٹ کیتا ہے اتے پیار بارے اپنے ڈھنگ نال کھلے طور تے لکھیا ہے۔ اس سنگریہ وچ اس دی اک نویں شیلی ہے۔ شاید ایہ کہنا اتک تھنی نہیں ہووے گی کہ پنجابی کوتا دے اتہاس وچ پیار سمپورن طور تے بناں کسے رہسمئی آدرشواد دے موہن سنگھ دی کاورچنا وچ ستریا گیا ہے۔ امرتا نے پریم دیاں ایہناں منکھی بھاوناواں نوں اک نویاں پاسا پردان کیتا۔ ایہ اس دی اندر دی پیڑ ہے، اس دا بے پردہ دل ہے، اس دا ناری داوشا ہے۔ لیکن نجی احساس راہیں اوہ سمپورن منکھی بھاوناواں پرگٹ کردی ہے۔

امرتا نے بڑی واری ودیش یاترا کیتی اوہ سوویت یونین وی گئی۔ ایہناں یاتراواں دے اثر وجوں اس دی کاورچنا وچ وکھ وکھ طرح دے وشے شامل ہوئے۔ سن 1961 وچ امرتا پریتم نے سوویت لیکھ یونین دے صدے تے سوویت یونین دا دورہ کیتا۔ اوہ ماسکو، تاشقند، سمرکند اتے باکو آدشاعراں وچ گئی اتے اس نے رابندر ناتھ ٹیگور دے سوسالا جنم دن دے سلسلے وچ ہوئے سماگم وچ وی حصہ لیا۔ سن 1966 وچ اوہ فیر سوویت یونین گئی۔ سن 1967 وچ اوہ جارجین کوی شوتا رستاویلی دی 800 سالا ورھے گنڈھ دے سماگم وچ حصہ لین گئی۔

سوویت یونین وچ اس نوں ہر چیز بہت بھائی اتے اس نے اس دا کھلا پرگٹاء کیتا۔ امریکی پرچے

'محفل' دے پترکار نال اک انٹریو وچ اس نے کیہا، 'سوویت یونین اتے دوجے سماجوادی ملکاں وچ ہویاں تبدیلیاں مینوں بہت چنگیاں لگیاں..... کل ملا کے ایہ سماجوادی ڈھانچا سارے ملکاں لئی بہت چنگا ہے۔ اوتھے ہر اک کول چنگی روٹی، کم اتے کپڑے ہن۔

سوویت یونین توں اس نے اپنے بچیاں نوں بڑیاں صاف اتے سچیاں چٹھیاں لکھیاں جو کہ اک پستک دے روپ وچ پرکاشت ہن۔ پستک، جس دا ناں 'باریاں جھروکے' ہے۔ اس دی بھومکا وچ اوہ لکھدی ہے کہ ایہ باریاں دے گوانڈھی گھراں دیاں، دو دوست ملکاں بھارت اتے سوویت یونین دیاں ہن جو کہ چنگے گوانڈھیاں واسطے سدا کھلیاں ہن۔ ساہتک پرچے 'آرسی' دے مطابق 1961 وچ 'کرمچی لکیراں' پنجابی لیکھکاں دا سبھ توں اتم سنگریہ سی۔

آرمینیا، ازبکستان اتے سوویت یونین دے ہر کونے وچ سوویت لوکاں نے اس نوں اپنی خش مزاجی اتے اپنے لوکاں دی انتی لئی جیا توڑ محنت کرن دی چاہ نے موہ لیا۔ اپنی پستک 'اتیت کی پرچھائیاں' وچ امرتا نے فرغانہ دی وادی نوں 'خوابیدہ حسینہ' کیہا ہے، جس نوں کہ سوویت لوکاں دی محنت نے کپاہ نال بھرپور علاقے وچ تبدیل کر دتا۔

ایہ سنگریہ ازبکستان دی مشہور شاعرہ اتے لوک ہستی زلفیا نوں سمرپت ہے اتے ایہ کوئی سہجی گل نہیں۔ زلفیا اتے امرتا وچکار گہری دوستی ہے۔ اوہ کدی حیرانی اتے کدے اتشاہ نال ازبک عورتاں دی کامیابی بارے لکھدی ہے۔ 'کپڑا ملاں دیاں ڈھائی ریکٹر عورتاں سن.... اتے فرغانہ شہر دی کارج سادھک کمیٹی دی پردھان وی عورت سی۔ اس توں بعد میں کلکیکو فارم 'اوکا کھون' دی پردھان نوں ملن جس ہیٹھ ڈیڈھ ہزار لوک کم کردے سن۔

امرتا پریتم زلفیا بارے، بھاو پورب دی اس عورت بارے لکھدی ہے جیہڑی کہ آپ کجھ چر پہلاں چاردیواری وچ بندی سی، جس کول اپنے چہرے توں برقع لاہن دا حق نہیں سی جیہڑی کہ اپنے ہی گھر چوں پیسیاں بدلے ویچی جاندی سی، اس عورت بارے جیہڑی کہ ہن آپ اک نویں آزاد زندگی دی گایکا بن گئی ہے۔

مئی 1968 وچ امرتا پریتم دیاں چٹھیاں اتے سفرنامیاں دا سنگریہ 'اکی پتیاں دا گلاب' چھپیا۔ اس وچ لیکھکا اوہناں گھٹناواں ملاقاتاں اتے چیزاں بارے لکھدی ہے جنہاں نے اس نوں سماجوادی ملکاں دے دورے سمے خاص طور تے پربھاوت کیتا۔ ایہناں وچ سوویت یونین دی تیجی یاترا، بلغاریہ، رومانیہ اتے پوربی

جرمنی دے دوردا اُلیکھ ہے۔ سوویت یونین وچ جو دھیان وڈے لیکھکاں دی یاد ول اتے جو سنبھال اوہناں نال سمبندھت استھاناں دی کیتی جاندی ہے بھاویں اوہ لیوٹالسٹائی نال سمبندھت یاسنایاپولیاناہووے، جاں ماسکو، ریوان جاں تاشقند شہر ہووے، اس نے امرتا دے ہردے نوں ٹُنب لیا۔

امرتا پریتم میکسم گورکی، انتون چیخوف، لیوٹالسٹائی، پشکن اتے مایاکووسکی دیاں رچناواں نال چنگی طرح پرچت ہے۔ دنیا دے ساہت دیاں پراپتیاں داادھیین رکھدیاں امرتا نے کافی دھیان سوویت یونین دیاں بھاشاواں دے وچ رچت ساہت دے انو بھواتے پراپتیاں ول دتا ہے۔

لیکھ اتے چٹھیاں امرتا دیاں رچناواں دا اک اہم حصہ بن گئے۔ امرتا پریتم دا اپنیاں رچناواں وچ سوویت یونین دے وشے نوں اجیہاں کوتاواں جویں کہ 'یوری گاگارن' وچ چھوہنا سوویت یونین وچ استریاں دی آزادی بارے لکھنا، کرت ول وتیرے نوں درساؤنا اتے ہور بہت سارے سوالاں نے اس دیاں رچناواں وچ اک نواں رنگ لے آؤنا، اتے اس دے مولک اتے کومانتری درشٹی کون نوں ابھاریا۔

امرتا پریتم دیاں رچناواں وچ سمسیاواں دے دستھار دا سدھا سمبندھ اس دی اک اپنی مولک کلاتمک شیلی دی بھال نال ہے۔ سوویت ناری دے چرتراں نال امرتا پریتم دی کوتا اتے وارتک شیلی دا وستھار بندا ہے اتے گیتمئی سمبندھاراہیں زندگی دے انش اتے نرکھن چنگیری طرح ابھردے ہن۔ لیکھکاں اتے چٹھیاں دی ات انت کاومئی شیلی اوہناں نوں اک وکھری رنگت پردان کردی ہے اتے سوجھ دی بھاوکتا اس لئی ودھ جاندی ہے کہ امرتا پریتم نہ کیول اک شاعرہ اتے وارتاکار سگوں اک عورت دے طور تے وی تکھی سوجھ نال اتے اپنے مٹھے ڈھنگ نال وی لکھدی ہے۔

سبھیاچارک وٹاندرے دے پروگرام دے تحت بھارتی سرکار نے امرتا نوں 1967 وچ یوگوسلاویا، ہنگری اتے رومانیہ بھیجیا۔ ایہناں سارے دیشاں وچ تن تن ہفتے بتاؤن توں بعد اوہ بلغاریا، پچھمی جرمنی اتے تہران گئی۔ سن 1969 وچ اس نے نیپال یاترا کیتی، اتے سن 1972 وچ مڑ یوگوسلاویہ دا دورا کیتا۔ اس توں اپرنت اس دیاں یاتراواں دی سوچی وچ چیکوسلواکیہ، فرانس، انگلینڈ، اٹلی، اتے ایجپٹ وی شامل ہوئے۔

امرتا پریتم لئی ہر دیش اک ادبھت کوتا دی طرح ہے جو کہ دوجیاں نالوں وکھ ہواتے اوہ وارتک روپ وچ بھاو دنیا دے اتنے سارے ملکاں دے سفرنامے دے روپ وچ کوتاواں لکھدی ہے۔ ایہناں وچ ہر

قوم دیاں ادھیاتمک پراپتیاں اتے قدراں قیمتاں دے ورنن دے نال نال اوہ اوہناں سبھیاچارک قیمتاں اتے پچھانہ کھوطاقتاں دا کلاتمک چتر الیکدی ہے، جیہڑیاں کہ ویاکتی نوں غلام بناؤندیاں ہن۔

وجودیت، انسانیت آدِ ول قوماتی رویاں اوہناں خاکیاں وچ وی دیکھن نوں ملدا اے۔ جو کہ اس نے کجھ لیکھکاں، کویاں، راجسی اتے قومی ہستیاں دے کھچے ہن: ایہناں وچ ازبک شاعرہ زلفیا بکو دا شاعر رسول رضا، بلغارین اتے ویتنامی لیکھک، ایتھوپیا اتے جاپاندے کوی، ویتنام داپردھان ہو چی من شامل ہن۔ پردھان ہو چی من دی شخصیت نے لیکھکاں تے اتنا اثر پایا کہ اوہ کوتا لکھے بنا نہ رہ سکی (ہو چی من)۔ ہو چی من نے اس نوں کیہا،'اسیں دوویں سپاہی ہاں جو دنیا دیاں غلط قیمتاں دے خلاف لڑ رہے ہاں۔ میں تلوار نال، توں قلم نال۔ اس وچار دی پشٹی شاعرہ دیاں ساریاں رچناواں وچ ملدی ہے، اس دیاں رچناواں وچ ناری دی سبھ توں پراتن منگ۔۔امن دی منگ سنائی دیندی ہے۔

امرتا پریتم دی سرجناتمک زندگی وچ چھیواں دھاکا جس وچ اوہ نال نال کوتا اتے وارتک تے کم کر رہی سی، خاص طور تے پھلدا ئیک سی۔ اس عرصے وچ اوہ اپنیاں ودیش یاتراواں اتے لیکھکاں آدِ نال ملاقاتاں دے اثر ہیٹھ سی۔ زندگی دے بنیادی سوالاں دے جواب دی بھال اتے دیش دے سبھیاچارک وکاس وچ ہندیاں تبدیلیاں نوں سمجھن دی کوشش وچ امرتا پریتم نے وارتک دی ورتوں کرنی شروع کیتی جس دا کینوس زیادہ وڈا سی اتے جو حقیقت دی بہوپکھی گنجھلدار اتے زیادہ ترانتر ورودھی تصویر داورنن کر سکدا سی۔

''رچناتمک عملاکو ہے، حالانکہ بیان دے سادھیام وکھرے ہن۔'' امرتا پریتم بیان دے نویں ڈھنگ اتے راہ ڈھونڈی ہے اتے اوہناں نوں لبھ لیندی ہے۔''اس دیاں گلپ کار رچناواں وچ وی اوہدی احساس مندی اتے مہارت ہے۔جہناں نے اس نوں اک اچے درجے دی شاعرہ بنایا ہے۔''

چھیویں دھاکے دے بھارت وچ پورب دے دوجے دیشاں دی طرح آرتھک، سماجک اتے راج نیتک وکاس نال سمبندھت انتر ورودھ اتے وچاردھارک ٹکراء ہور تکھے ہو جاندے ہن۔ سبھ توں وڈی گل ایہ ہے کہ آزادی دی لڑائی دے سے ستنترتا پراپتی نال جوڑیاں گئیاں امیداں پوریاں نہیں ہویاں۔ اسے وجہ کر کے دیش وچ نراشاوادی منوادستھا دوادھا ہویا۔ بھارتی عملیت نوں اتے سماج دے پتن دے اصلی کارناں نوں سمجھن دا جتن کر دیاں امرتا پریتم ایہ کہندی ہے کہ بورژوا راج نیتک دی گل بات نوں وکھ کے اوہ چپ رہنا چاہندی ہے۔ اس دیاں کوتاواں 'چپ' 'اک مٹی دی ڈھیلی' 'راج نیتی' آدِ وچ نراش وادتت

جھلکدے ہن۔ شاعرہ اپنیاں رچناواں وچ جھلکدے نراش وادی دی آپ آلوچنا کردی ہے، تے کہندی ہے کہ اس دیاں رچناواں وچ آشاوادی سطراں زیادہ ہن اتے اوہ زیادہ شکتی وان وی ہن۔

سن 1968 وچ امرتا پریتم نوں پنج سالاں لئی ساہت اکادمی صلاح کار کمیٹی دا ممبر چنیا گیا۔ صاف دل اتے سدا ہاسادی پکی امرتا سبھ توں پرتھا شالی لیکھکا اتے مولک رچناواں دا ہی پکھ لیندی سی۔

امرتا نے اداسی نے اداسی نال بھجی کوتا 'الوداع' اس سمے رچی جدوں اوہ کجھ اخباراں دی کیتی سکھت آلوچنا کارن بیمار ہو گئی سی۔ شاید ایہناں حالات اتے چھویں دھاکے دی اس دی عام نراش وادی سنو اوستھا دا ہی نتیجا سی کہ اس دور وچ امرتا زیادہ تر اداس اتے اکلی سی۔ نہ تے پچھانہہ کھوتتاں اتے نہ ہی پرگتیواد وردھی تتاں دے کٹھن امرتا پریتم نوں سچ اتے نیاں دے مارگ توں ہٹا سکے جاں اس دیاں رچناواں دے عملی ارتھ نوں وکرت کر سکے۔

جیکر اک اجیہی رچنا دی بھال کیتی جاوے جو اک شاعرہ دے سبھ توں اندرونی وچاراں اتے احساساں نوں درساؤندی ہووے اتے بھارت دی انتی دی راہ وچ روڑا بنن والیاں سمسیاواں بارے اس دے وچار دسدی ہووے، تاں 'دلاں دے بھیت' نوں اجیہی رچنا کہا جا سکدا اے۔ پنجابی ساہتکار ہربجن سنگھ نے صحیح کیہا ہے کہ ایہہ کوتا امرتا پریتم دی نرنتر ودھدی مہارت دی پرتیک ہے۔

اس نظم وچ امرتا نے ماں (جو کہ پنجاب دے اتہاس دی پرتیک ہے) اتے دھی (جوانی) دے اپنے صحیح اتے ٹھوس اتے نال ہی نال بڑے ویاپک چتر تاں راہیں بڑے رانگلے ڈھنگ نال پنجاب دے پنج ہزار سال دے اتہاس دا ورنن کیتا ہے۔

اپنے آلے دوالے دی حقیقت دے بیان دی کوشش نے امرتا دی کاوشیلی اتے شبداں دی چون وچ وی فرق لے آندا اتے اس نے کئی طرح دے کاوروپاں دی ورتوں شروع کیتی، جہناں وچ آزادی نظم، لوک گیتاں دے اتے ناچاں دے تال (بھنگڑا، گدھا) وی شامل سن۔ ایہناں نویں روپاں دی چون اس نے لوک دھارا وچوں ہی کیتی۔

دوجے عالمی جنگ توں بعد بھارت، جس نے کہ بستی واد دے اتے جنگ دے کشٹ سہے سن، وچ پرگتیوادی ساہت دا وکاس ہویا۔ سجاد ظہیر، یشپال، ملک راج انند، گربخش سنگھ، گرمکھ سنگھ مسافر دے نال امرتا پریتم وی امن لئی جدوجہد کرن والیاں وچوں اک سی۔

امن داوشا پہلاں اس دی کاور چناوچ اتے اس توں بعد وارتک وچ کئی سالاں دی سوچ وچار:
بھال، سندیہاں اتے کئی سالاں دے تجربے توں بعد آیا۔

سوکھم نظراتے احساس مند ہون دے نال نال امرتا پریتم امن، لوک راج اتے منکھتاواد دی حامی
دی ہے۔ اس دیاں نظماں' میں گیت لکھدی ہاں'، 'برف لگاتار پیندی پئی' وچ پریمکا، ماں اتے بھین دی امن لئی
منگ سنائی دیندی ہے۔

سن 1973 وچ اوس نے ماسکو وچ وشوامن کانگرس وچ حصہ لیا۔ اوتھے سنیاں تقریراں دے
سدھے اثر ہیٹھ اوس نے 'برف لگاتار پیندی پئی' ناں ہیٹھ نظم لکھی۔

ستویں دہاکے وچ اوس دی رچناتمک تلاش دا خاص پکھ ایہ ہے کہ اوہ ساہت وچ اوہناں سماجک
اتے آرتھک تبدیلیاں نوں درساؤنا ضروری سمجھدی ہے جو بھارت وچ ہورہیاں سن۔ اس دی وجہ ایہ ہے کہ
اکتوبر کرانتی نال جڑے وچاراں نوں اک نویں ساہتک دِشا ملنی شروع ہندی ہے۔ تقریباً سارے پنجابی لیکھک
امن لئی ہورہی جدوجہد دے حق وچ سن اتے سماج وادی وچاراں دی حمایت کردے سن اتے اوسدے جد دنیا
دے سارے اگانہ ودھولوک لینن دی سوسالہ ورھے گنڈھ منارہے سن، امرتا پریتم نے مہان آگو دے اتہاسک
رول بارے کوتا لکھی ہے۔

اوسدیاں ستویں دہاکے دیاں رچناواں (کاونسگرہ' کاغذ تے کینوس' اتے ناول' جیب کترے')
وچ بھارتی سماج اتے ساہت وچ پرانیاں ہندیاں ساریاں چیزاں دے خلاف ودھدا روس دکھائی دیندا ہے۔

امرتا پریتم نے 1966 وچ ساہتک پرچہ' ناگ منی' کڈھنا شروع کیتا اتے اوس وچ سوویت
کویاں، دوجے سماج وادی ملکاں دے کویاں اتے پچھمی ملکاں دے پرگتیوادی کویاں دیاں رچناواں دا ترجمہ
چھاپنا شروع کیتا۔ اس نال پنجابی پاٹھک دے من وچ اجکل دی دنیا دے نال سانجھ دے احساس وچ کافی
وادھا ہویا۔ اس پرچے وچ اجیہے مشہور پنجابی لیکھکاں جویں کہ اجیت کور، ہربھجن سنگھ، بلدیو سنگھ اتے نال ہی
جوان لیکھکاں جسبیر بھلر، جوگا سنگھ، ستی کمار، جگتار اتے سکھبیر آد دیاں رچناواں چھپیاں۔ پچھلے پنج سالاں وچ
پرچے وچ چھپن والیاں چیزاں دا گھیرا ودھ گیا ہے۔ ساہتک سوالاں دے نال نال اج سماجک اتے رچناتمک
سوالاں دا وی چرچا ہون لگ پئی۔ اس پرچے وچ مشہور سائنسداں کلاکاراں نال انٹرویو چھپدے ہن اتے
راج نیتی اتے سماجک ڈھانچے وچ موجودہ کمیاں دا ذکر کیتا جاندا ہے۔ پچھلے کجھ سالاں وچ دوجے ملکاں دے

ساہت نوں سمرپت سپیشل پرچے وی نکلن لگ پئے ہن ۔ پر ایہ اک اجیہا پرچہ ہے جس وچ لیکھکاں لئی بڑے اہم مسئلیاں بارے لکھیا جاندا ہے۔ نوجوان لیکھکاں دیاں رچناواں وی چھپدیاں ہن اتے پاٹھکاں نوں دوجے دیشاں دی سمکالی کاورچنا نال جانکاری وی ملدی ہے۔

ناگ منی دے پرکاشک نوں بھیجیاں چٹھیاں وچ پاٹھک لکھدے ہن کہ اس پرچے نوں اکو واری نہیں پڑھیا جاسکدا، اس نوں کئی واری پڑھنا پیندا ہے جدکہ دوجے پرچیاں نوں اک واری وچ ہی پڑھیا جا سکدا ہے۔ اس گل توں پرچے وچ چھپن والے لیکھکاں اتے رچناواں دی ڈونگھیائی دا پتا لگدا ہے۔

15 مئی 1973 نوں دلی یونیورسٹی نے امرتا پریتم نوں ساہت دے ڈاکٹر دی پدوی نال سمانیا سن 1975 وچ لیکھکاں دی ساہتک کانفرنس وچ ناگپور شہر وچ امرتا پریتم نوں پنجابی ساہت وچ یوگدان وجوں سمانیا گیا۔

اس شاعرہ نے بہت ساریاں انتر راشٹری ساہتک کانفرنساں، گوشٹیاں آدِ وچ حصہ لیا۔ اوسدے ساتھیاں اتے متراں وچ فیض، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، کرتار سنگھ دُگل اتے دوجے قلم دے ماہر ہن۔ لیکھکاں اتے کویاں بارے لکھے لیکھاں وچ ایہ صاف دِسدا ہے کہ امرتا دا سرجناتمک وچار دھارا والے لوکاں اتے اپنے دوالے دی حقیقت نوں اپنے کماں اتے لفظاں نال بدل دین دی کوشش کرن والے لوکاں ول کناں جھکاؤ ہے۔

امرتا پریتم پنجابی ساہت دے سیمت دائرے وچ ہی بند نہیں اوس نوں بنگالی اتے ہندی دیاں ساہتک پراپتیاں وی پیاریاں ہن، کیرل دا ساہت وی پسند ہے۔ بھاو ایہ ہے کہ لیکھکا دی دلچسپی دا دائرہ کُل بھارتی ساہت ہے اتے بھارتی ساہت دے آپسی میل جول اتے پربھاو بارے وی لیکھکا دی اصولی رائے ہے، ''تیسرا پڑاء ہندا ہے، دلیری، ورتمان نوں اُکھیڑن والی تے بھوِکھ نوں سیون والی دلیری۔ سپنیاں نوں تاش دے پتیاں وانگ رلا کے ونڈ کے کوئی کھیڈ کھیڈن والی دلیری جس دی کوئی ہار سدیوی ہار نہیں ہندی.........

امرتا پریتم دے درشٹی کون اتے اخلاقی نظریے نوں سمجھن لئی اتے کُل بھارتی ساہتک ورتارے وچ اوسدی تھاں نوں سمجھن لئی اوسدے اپنے بارے اپنی کاورچنا اتے اوس دے مچھیاں بارے نظریے نال واقفیت ہونی ضروری ہے۔

اپنیاں کوتاواں، ناولاں اتے لیکھاں دتے وچ امرتا پریتم کلاکار دی ذمے واری، اوس دی کلا دی سماجک لوڑ اتے وقت دی آواز ورگے فوری اہمیت والے سوال اٹھاوندی ہے۔ اوہ کہندی ہے کہ کوی نوں اپنے پیر زمین تے ٹکا کے رکھنے چاہیدے ہن اتے ڈونگھے تے لوک کلا والے سوے لبھنے چاہیدے ہن۔ آپ اوہ لوک دھارا وچوں بہت کجھ لیندی ہے (دلاں دے بھیت، کنکاں دا گیت)۔ کئی بھارتی آلوچکاں نے امرتا پریتم دیاں رچناواں دے لوک کلا نال ڈونگھے سمبندھ ول دھیان دوایا ہے۔

اوس نوں پورا یقین ہے کہ کسے وی کوتا وچ بھاویں اوہ کسے وی زبان وچ لکھی گئی ہووے، اوس وچ اک عالمی سانجھ، اُچا چنتن تے چنگے کل وچ یقین ہونا چاہیدا ہے۔ کوی نوں لوکاں دیاں ضرورتاں بارے لکھنا چاہیدا ہے اتے بھوکھ دا دُوت بنن دا پورا جتن کرنا چاہیدا ہے۔ پنجابی آلوچک بی۔ سی۔ گوئیل دے کتھن مطابق ''امرتا پریتم نہ صرف کرت وچ یقین رکھدی ہے، اوہ صاحت دے سماجک ورودھ پرگٹ کرن دا مادھیام ہون وچ وی یقین رکھدی ہے۔'' لیکن ایہ جانن دی کوشش کردی ہے کہ سوہجاتمک اتے سنووگیاتک پکھوں اک کلاکار دی شخصیت دا اس دی رچنا نال کس طرح دا سمبندھ ہے۔ اس طرح نال امرتا پریتم سوے ابھویاکتی (Self expression) دے سوال، جو کہ سمکالی واہتک آلوچکاں وچ سبھ توں تکھے سوالاں وچوں اک ہے، دا جواب دین دی کوشش کردی ہے۔ جیکر پہلاں اس سوال دے جواب وچ اوہ ایہی کہنا کافی سمجھدی سی کہ لیکھک اک اجیہا کلاکار ہے جس دی لوکاں اتے سماج پرتی بڑی وڈی ذمے واری ہے تاں ستویں دھاکے وچ اس دا نظریہ ایہ ہے کہ زندگی دی سچی تصویر کھچن لئی لیکھک دے سماجک درشٹی کون نوں، جو کہ سماجک ورتارے دے کلاتمک چترن لئی ضروری ہے، اس دیاں لکھتاں توں وکھ انہیں کیتا جاسکدا۔ نال ہی نال ایہ وی کہندی ہے کہ ایہ اپنی 'میں' دی زیادہ ڈونگھی پہچان ہے۔ جد لیکھک دی 'میں' دا سماجک رسماں نال نہ حل ہون والا ٹکراء ہندا ہے تاں اس نوں دکھ پہنچدا ہے۔ ایہ احساس اس دیاں نظماں وچ پیڑ دے روپ وچ ظاہر ہندے ہن جویں کوتا 'میں تے میں' وچ اس ٹاکرے دے مطلب نوں کھلن دی کوشش وچ اپنے احساس دیاں نقلی دنیاوی رسماں نال ٹکر دی گل کردی ہے۔ کدی کدی اس دیاں رچناواں آلوچکاں نوں انتر مکھی اتے بہت نجی لگدیاں ہن، جویں کہ 'اک رات' 'عشق، انتظار۔ پر اوہناں وچ ہمیشہ کدے پرتکھ اتے کدی گجھا سماجک انش ہندا ہے۔ اس دے کلاتمک جیون دے وکھرے دوراں وچ اس انش وچ گنیاتمک تبدیلی آوندی ہے، پر ایہ انش کدی وی ختم نہیں ہندا۔ ایہ وی کیہا جاسکدا ہے کہ 1947 دیاں گھٹناواں توں بعد جد اک

جذباتی شاعرہ دی تھاں اک سماجک اتے حقیقی سمجھ بوجھ والی شاعرہ نے لئی، تاں ایہ انش لگاتار ودھدا ہی گیا۔

کلا وچ نجی اتے سماجک انش دا ذکر کردیاں لیکھکا کلاکار دے کرتو دی اتے اس اتے اس کرتو دے بھار دی وی گل کردی ہے۔ اس کرتو دا بھار اس لئی ایناں ہندا ہے کہ ساہت لکھاں لوکاں دے دلاں اتے دماغاں اتے وچار دھارک اثر پاؤن دا اک ذریعہ ہے۔ اس دی تقریباً ہر رچنا وچ، بھاویں اوہ وارتک تے بھاویں کاورچنا ہووے، نجی پکھ سدھے جاں اسدھے روپ وچ منکھی سمبنداں وچاراں اتے احساس نال رل کے لیکھک دے خشی اتے خوبصورتی بارے وچاراں نوں پرگٹاؤندا ہے۔ اوہ بھاویں عشق دے وچھوڑے اتے امیداں دی گل کردی ہووے (نظم 'اک خط') اتے بھاویں عورت دی خشی دی (دعوت، عشق) ہمیشہ کوی دی ذمے واری دا احساس ہندا ہے۔ عورت دے احساس دی دنیا وچ پرویش کر کے امرتا اس دے چتر تر دے قومی لچھناں نوں ابھاردی ہے۔ اس دیاں رچناواں وچ نجی پکھ آپنے آپ لئی نہیں، سگوں سماجک زندگی دے وکاس نال وکھو وکھ اتے بہت واری انتر ورودھی سمبندھاں دے روپ وچ پیش کیتا جاندا ہے۔ اوہ زندگی نوں حرکت وچ اتے عملی انتر ورودھی دے پرسنگ وچ سمجھدی ہے۔

وکھو وکھ دوراں وچ ساہت دے کارج بارے امرتا پریتم دے وچاراں وچ کجھ تبدیلی آؤندی رہی ہے، حالانکہ کل ملا کے اوہناں وچ بہت زیادہ فرق نہیں پیا۔ اپنیاں رچناواں راہیں اوہ ساہت اتے کلا دے زندگی نال سمبندھ تے زور پاؤندی ہے، لیکھک نوں نویں بھارت دی اساری وچ ودھ چڑھ کے حصہ لین لئی ونگاردی ہے اتے پریم چند اتے ٹیگور دیاں نصیحتاں اجوکے حالات وچ، حقیقت وچ تبدیل کردی ہے۔

امرتا کیول لیکھکا اتے شاعرہ ہی نہیں، سگوں انوادک وی ہے۔ اس نے پنجابی پاٹھکاں دی جان پچھان سوویت یونین اتے دوجے سماج وادی ملکاں دی شاعری نال کروائی ہے۔ اس نے ہورناں دے علاوہ یوگینی یوتوشینکو، زلفیا، مرزا ترسن زادے، رومانیہ، بلغاریہ دا پنجابی وچ انوواد کیتا ہے۔ اپنی لیکھنی اتے انوواداں لئی امرتا پریتم نوں سن 1980 وچ بلغارین راشٹری واپتسا کو پرسکار مل چکا ہے۔

شاعرہ دے رچن تمک مارگ دا نرکھن رچن توں بعد ایہ دھیان رکھدیاں ہویاں کہ اس دی کوتا اتے وارتک وچ ڈونگھا اتے اندرونی میل ہے اتے ایہ وی کہ وارتک لکھنی اس نے چوتھے دھاکے دے اخیر وچ ہی شروع کیتی اس دیاں رچناواں نوں ہیٹھ لکھے چار حصیاں وچ ونڈیا جاسکدا ہے۔ ایہ ونڈ دا آدھار اس دے نظریے دی ہنر، بھارتی ناری وشے دا اس دی رچنا وچ وکاس اتے رچنا تمک شیلی دی ودھدی نپنتا ہن۔

پہلا دور --- تھاپنا دا دور ہے (تیجے دھاکے دے انت توں چوتھے دھاکے دے انت تک):
نظماں، گیت، کوتاواں دا۔

دوجا دور --- وکاس اتے پر پکتا دا دور ہے (چوتھے دھاکے دے اخیر توں پنجویں دھاکے دے اخیر
تک (نظماں، لمیاں کوتاواں، ناول، کہانیاں اتے لیکھاں دا۔

تیجا دور --- سبھ توں بھرپور اتے گنجھلدار دور ہے (چھیواں دھاکا): کوتاواں، کاوسنگریہ، ناولاں،
کہانیاں، لیکھاں دا۔

چوتھا دور --- ورتمان دور (ستویں دھاکے توں ہن تک): کوتاواں، ناولاں، کہانیاں،
آلوچناتمک لیکھاں دا۔

امرتا پریتم دیاں رچناواں دی پڑچول کر کے اوہناں وچ ناری بمب دے وکاس نوں گجھیا جاسکدا
ہے۔ ایہ شروع دیاں رچناواں وچ روایتی اتے رومانچک سی اتے بعد دیاں رچناواں وچ اصل وادی ہے، جس
وچ رومانچک انش ہن۔ شاعرہ دی شخصیت اتے رچناتمک شیلی دے وکاس اتے پر پھلتا دا اٹوٹ سمبندھ
عورت دے آتمک بل وچ اس دے بھرپور وشواس نال ہے۔ امرتا پریتم دی رچناتمک شیلی دی خاصیت اس
دی منکھ دے نجی اتے مانسک پکھاں وچ زندگی دے پرواہ نوں ویکھ سکن دی سمرتھا ہے۔

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆
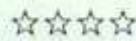
ناول کار امرتا پریتم

امرتا پریتم دے پہلے ناول

پنجابی ناول دا بانی بھائی ویر سنگھ نوں منیا جاندا ہے۔ اوہ اک کوی دے طور تے جانیا جاندا سی۔ پر اس نے بہت ساری وارتک وی لکھی جس وچ چار ناول شامل ہن۔ ایہہ ہن--- سندری، وجے سنگھ، ستونت کور اتے بابا نودھ سنگھ۔ بھائی ویر سنگھ دے ناولاں توں پہلاں پنجابی ساہت وچ کئی ورنن یوگ گلپ رچنا نہیں سی۔ "ایہی کارن ہے کہ بھائی ویر سنگھ دے ناولاں نوں پنجابی ساہت دے نویں دور دا پہلا قدم منیا جاندا ہے۔" بھائی ویر سنگھ دے سارے ناول سکھ قومی لہر وچ سہائی ہون لئی رچے گئے سن اتے اوہناں دی شیلی کھلے طور تے سکھیاتمک سی۔ اپنے پاتراں نوں چترن وچ لیکھک نے صرف روایتی رچنا تک ڈھنگاں دی ورتوں کیتی--- چترن اک پکھی اتے آدرشاتمک سی اتے اس وچ پاتراں دے آتمک سنسار دی ٹھیک جھلک نہیں سی ملدی۔ ایہہ چیز نہ کیول مڈھلے پنجابی ناولاں وچ سگوں بھارت دیاں دوجیاں بھاشاواں دے واہت دے شروع دے ناولاں وچ وی ویکھن نوں ملدی ہے۔

پنجابی ناول دے وکاس نال سبھ توں وڈی تبدیلی وشاوستو وچ آئی جو کہ سمے دی لوڑ دے مطابق زیادہ دھرم نرپیکھ ہندی گئی۔ لیکھنی دے مچے وی بدلدے گئے۔ جیکر بھائی ویر سنگھ دا مچا دھارمک اپدیش دینا سی، تاں نانک سنگھ دا مچا سماج سدھار اتے جسونت سنگھ کنول دا مچا سماج دی تبدیلی ہے۔ پر زیادہ تر بھارتی آلوچکاں دے مطابق ویہویں صدی دے پہلے ادھ وچ پنجابی ناول دے وکاس وچ زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ اس پرمپرا دے مطابق جس نوں گربخش سنگھ نے 'رومانچک آدرشواد' داناں دتا ہے پنجابی ناول دے خاص لچھن ایہہ سن--- اک وکست پلاٹ بھاوکتا (جیہڑی عورت دے چترن وچ خاص طور تے دسدی سی) اتے سارے

کرداراں دا اصاف طور تے چنگیاں اتے ماڑیاں وچ ونڈے جانا۔

گربخش سنگھ (1975-1892) نوں پہلی پیڑھی دے وارتا کاراں وچوں اک جانیا جاندا ہے۔ گربخش سنگھ نے بہت وارتک لکھی اتے اس نوں آدھونک پنجابی وارتک دے موڈھی دے طور تے جانیا جاندا ہے۔ گربخش سنگھ دی ساہتک سرگرمی، پریت لڑی دے سمپادن اتے پنجاب دے ساہتک پرچیاں 'پریتم' اتے 'پھلواڑی' وچ وی لکھن دے سٹے وچوں پنجاب دی سمھیاچارک زندگی وچ اک نویں لہر --- 'پریت لہر' دا وکاس ہویا۔

گربخش سنگھ دیاں رچناواں --- ناولاں، کہانیاں اتے ساہتک پرچے 'پریت لڑی' دا جس وچ اوہ آپ کئی لیکھ لکھدا سی، آدھونک پنجابی وارتک دی شیلی دے وکاس اتے بڑا اثر ہویا اتے اس نال ساہت اتے لوکاں دی زندگی وچکار سمبندھ ہور ڈونگھیرا ہویا۔ لیکھک نوں عام کامیاں دی قسمت بارے چنتا ہے اتے سماجک وکاس دے راہاں دی بھال وچ اس نے مارکس وادداوی ادھیین کیتا۔

تیجے دھاکے دے شروع وچ نانک سنگھ (1971-1897) جو کہ 'پریت لہر' دا ہی اک پریت ندھ سی، ناول رچنا شروع کیتی۔ بھائی ویر سنگھ توں الٹ نانک سنگھ نے اس سمے دے پنجاب دیاں سماجک مشکلاں نوں اپنے ناولاں وچ پیش کیتا۔ ناول دی کلا وچ اس دے استاد پریم چند اتے لیوتالستائی سن۔ اپنے ناولاں وچ نانک سنگھ عورت وی برابری ذات پات دے سسٹم اتے پنڈاں وچ جماتی ٹکراء دے سوال اٹھاؤندا ہے۔ چٹا لہو (1932)، غریب دی دنیا (1939)، دور کنارا (1946) آدِ۔ نانک سنگ دے تقریباً سارے ناول اہنساتمک ورودھ دی وچار دھارا نال بھرے ہوئے ہن اتے اس دی وجہ آپ نانک سنگھ دی ایہ خوبی سی کہ 'اوہ سرتوں پیر تک بھاوک سی'۔ پرسدھ سوویت آلوچک ای۔ د۔ سیر یبریاکوف دے مطابق نانک سنگھ دیاں رچناواں نے پنجابی ناول دی پر پھلتا دا آدھار قائم کردا اتے اس نوں نویں پنجابی ناول دا موڈھی گنیا جاسکدا ہے۔

پنجابی ساہت دی دھارا، جس نوں گربخش نے 'سماجک-یتھارتھ' داناں ہے، سنت سنگھ سیکھوں توں شروع ہوئی (ناول خون تے زمین) اتے اوس نوں سریندر سنگھ نرولا نے اگے دھایا۔ (ناول 'لوک دشمن'، 'دین تے دنیا'، دلی دریا')۔ بھاوک پرتھا اتے 'سماجک-یتھارتھ' دی دھارا دا ساانجھا وکاس بھارت دیاں دوجیاں بھاشاواں دے ساہت وچ وی پنجابی ساہت توں کجھ پہلاں ہی ویکھن نوں ملدا ہے۔

آلوچکاں نے انت سنگھ سیکھوں اتے سُریندر سنگھ نرولا دی بڑی ہرشنسا کیتی اتے اوہناں دیاں رچناواں وچ-تھارتھاوادا تے سماجی حقیقت دی صحیح اتے ڈونگھی سمجھ دا وی ذکر کیتا۔ ایہ وی کہیا گیا کہ ناول لکھن دے ڈھنگ وچ اوہناں نوں بڑی نپنتا پراپت ہے۔

پر پنجابی پاٹھک حالاں اجیہے ناول پڑھن لئی تیار نہیں سن۔ عام پاٹھکاں دا جھکاؤ زیادہ بھاوک اتے رومانچک رچناواں ول سی۔ اک پاسے تاں اس طرح دے آدرش وادی ناولاں وچ کجھ چنگیائیاں وی سن۔ پر دوجے پاسے جویں گُربخش سنگھ نے صحیح کہیا ہے 'ایہ رُچی پنجابی ناول دے وکاس نوں روک رہی سی'۔

چوتھے دہاکے دے انت وچ کرتار سنگھ دُگل، جس دیاں کہانیاں پہلاں توں ہی مشہور سن، نے وی ناول لکھنے شروع کیتے۔ کرتار سنگھ دُگل دے ناول وشا دے نظریے توں دلچسپ ہن، پر کلاتمک پکھوں سارے اک سار نہیں۔ اوس دا مکھ ٹیچا شہری مدھ ورگ دیاں اخلاقی قدراں نوں ظاہر کرنا ہے۔ عشق بارے اوس دے ناولاں وچ فرائڈ (Freud) دے ستھانت دا اثر دسدا ہے اتے اس کارن اوہ پچھم دے 'نویں ناول' دے نیڑے ہن۔ اس دور دا دوجا ناول کار اتے کہانی کار جسونت سنگھ کنول ہے۔ اوس دیاں رچناواں دنیاوی حقیقت دے اک وڈے دائرے نوں چھوہندیاں ہن اتے اوہناں دا مول مقصد زندگی دے مطلب نوں پرگٹ کرنا ہے۔ آلوچکاں نے اودے ناول 'پورن ماشی'، 'رات باقی ہے'، 'متر پیارے نوں' آدِ پسند کیتے ہن۔

چھیویں دہاکے دے شروع وچ پنجابی ساہت وچ نویں لیکھکاں گُردیال سنگھ اتے موہن کاہلوں نے پرویش کیتا جنھاں نے روائت نوں تبدیل کرن دی کوشش کیتی۔ اوہناں دیاں رچناواں دے خاص چنن حقیقت دی صحیح سمجھ اتے بیان ہن۔ نال ہی آلوچکاں نے ایہ وی کہیا ہے کہ اوہناں دیاں رچناوان وچ درسائے گئے ورتارے دی چھان بین وچ بہتی ڈونگھیائی نہیں۔ ایتھے ہی ناول کار سُرجیت سنگھ سیٹھی دا وی ناں لینا ضروری ہے۔ اوہ پنجاب دے اوہناں بہت تھوڑے ناول کاراں وچوں اک ہے جس نے ہور ہے تجربیاں ول دھیان دتا۔

امرتا پریتم دا پہلا ناول ڈاکٹر دیو 1949 وچ ارتھات گُردیال سنگھ اتے موہن کاہلوں دیاں کیرتاں نالوں کتے پہلاں چھپیا۔ امرتا پریتم دے ناولاں وچ ساہت پرمپراواں نال نیڑتا اتے بیان نے نویں ڈھنگاں دی بھال وکھرے پڑاواں تے وکھ وکھ حد تک دیکھن وچ آؤندے ہن۔ اس دا سمبندھ پنجاب دے سماجک حالات اتے ساہت ورتارے دیاں وشیشتاوان نال ہے۔

پنجابی ساہت اتے بھارت دیاں دوجیاں بھاشاواں دے ساہت وچ وی ناری دا پرشن اک
اتیانت مہتوپورن وشا ہے۔ پنجابی ساہت دے اتہاس وچ اک سیاں دیاں نایکاواں جویں کہ ہیر، صاحباں،
سسی، سوہنی دے ناں مشہور ہن، جنہاں نوں 18-16 صدی عیسوی وچ گایا گیا۔ ایہ نایکاواں ناری دا پاتر
اُلیکن لئی اک امک سوما ہن۔ ایہ کردار ناری چرتر دے ناں صرف ڈونگھائی اتے وفاداری ہی رساؤندے ہن،
سگوں ناری دی سوئنتر بھرتا دی اچھا، طاقت، پرانے سماجک ریتی رواجاں تے دھارمک بندھناں دے خلاف
روس دا وی ساکار روپ ہن۔

ایتھے ایہ دسنا ضروری ہے کہ پنجاب دے سکھ دھرم وچ تھاپنا دے سمے توں ہی ساریاں نوں رب
اگے اک سمان گنیا جاندا سی اتے ناری اتے نر دا وی اکو درجہ سی۔ وی۔ ای۔ کوچنیو لکھدا ہے---''بھارت دے د
وجے حصیاں دے مقابلے وچ پنجابی عورتاں کول زیادہ سُتنترتا اتے زیادہ ادھیکار ن اتے اجے وی ہن.....
عام طور تے پنجاب دیاں استریاں پردے تے گھر دی چاردیواری اندر جیون نہیں بیتاؤندیاں''۔

پرمپراواں دی پکیائی اتے ستھرتا دا وڈا کارن ایہ ہے کہ عورت جہڑی کہ چنگی ماں اتے آؤن والی
پیڑھی نوں پالن والی ہندی ہے، پروار دے ریتی رواجاں دی راکھی وی کردی ہے۔ دھارمک پرتھاواں دی پالنا
کرنا وی اوس دی ہی ذمہ داری ہندی ہے۔ ایس لئی ناری دا پرشن اتے اوس نال سمبندھت پریورتن پورے
بھارت سماج لئی بڑے معنے رکھدے ہن۔ ناری دی جاگرتی بھارت دے راج نیتک اتے سماجک وکاس دا اک
مہتوپورن انگ ہے۔ بہت ساریاں لیکھکاواں نے پرانے اتے بے مطلب سماجک اصولاں دے خلاف آواز
اُٹھائی ہے۔ ایس بارے عصمت چغتائی (اردو) خدیجہ مستور (اردو)، سرلا دیوی، منوں بھنڈاری (ہندی)
آدے نے وی لکھیا ہے۔ اوہناں نے اپنے درودھ نوں امرتا پریتم دے مقابلے وچ زیادہ تکھے اتے زوردار
شبداں وچ پرگٹ کیتا ہے۔ اس دے وپریت امرتا پریتم نرم اتے احسان مند نظر آؤندی ہے۔ 'اوہ نعرے نہیں
لاؤندی، مُٹھی نہیں کسدی، دراصل اوہ استری اتے اوسدی اپنی حالت نال جاندیاں بُجھدیاں ہویاں اہمیت
دے ہی خلاف ہے۔'لیکھکا اپنیاں نایکاواں بارے اتنے دل اتے پریرنا نال لکھدی ہے، جویں کہ اوس نے
اپنے آپ اوہ سبھ کجھ جھلیا ہووے جو اوس دیاں نایکاواں نال گزردا ہے۔

اوس دے سبھ توں مہتوپورن مُڈھلے ناول ہن--- ڈاکٹر دیو، پنجر، اک سوال، رنگ دا پتا۔ ناول
ڈاکٹر دیو، اک سوال مدھ ورگ دی ناری دی حالت نوں سمرپت ہن تے ناول 'پنجر' اتے 'رنگ دا پتا' پینڈو

گڑیاں دے نصیب نوں سمرپت ہن۔ پر ایہناں ناولاں وچ لیکھکا نے کلاکار لیکھک اتے بدھی جیوی دے سماجک کرتو دے سوال نوں وی چھوہیا ہے۔

ناول ڈاکٹر دیو وچ کافی لمبے عرصے (سن 1948-1923) دیاں گھٹناواں داویروا ہے۔اس وچ لیکھکا نے پیار، ویاہ، پروار اتے دھرم دے وشیاں نوں چھوہندیاں اک اجیہی ناری داچتر الیکیا ہے، جو سماجک ہر ریتاں اتے انیاواں دی شکار ہے۔ پریم کرن دی شکتی امرتا پریتم دی نائیکہ دا سبھ توں وڈا گن ہے۔

ناول دی نائیکہ ممتا امیر ماپیاں دی بوٹی ہے۔اس نے اپنی زندگی دا سکھ دیو دے پیار وچ لبھ لیا۔ دنیاں دیاں سبھ پریشانیاں اتے بناوٹی پنے توں دور پرکرتی دے نیڑے، ممتا تے دیو اس وچ لین ہو جاندے ہن۔ناول دے شروع وچ پیار دے رومانچک انندا تے ہور کسے چیز دا پرچھاواں نہیں پیندا۔دیو غریب باپ دا پتر سی۔ پر ممتا لئی امیری اتے غریبی کوئی معنے نہیں سن رکھدے۔اس دا پریم دھرتی دیاں سبھ دولتاں توں اچا سی۔ ممتا اپنے پیار لئی لڑدی ہے پرانت اس دی ہار ہندی ہے۔ماپے اس دے بچے نوں اناتھ آشرم وچ دے کے ممتا داویاہ اک امیر گھرانے وچ کر دیندے ہن۔ممتا انتاں دی ہمت تے حوصلہ کر کے اس انچارے پتی نوں چھڈ کے چلی جاندی ہے۔اپنے روس داپرگٹاء اوہ اس طرح کردی ہے۔سو بھ مان اتے مان نال بھری ممتا اپنے ماپیاں کول نہیں پرتدی۔اوہ اک سکول وچ ادھیاپکا بن جاندی ہے۔نائیکہ اپنی زندگی دیاں ساریاں اوکڑاں دا ساہمنا کردیاں ہویاں وی اپنے پیار نوں نہیں بھلاندی، اوہ میری یاد ہے، اوہی میرا جیون ہے۔ پریم شاید مرنا نہیں جان د۔ممتا داچرتر دل دیاں ڈونگھائیاں نوں چھوہ لیندا ہے اتے اس دی شرافت اتے پاکیزگی پاٹھک دے من اتے پربھاو پائے بنا نہیں رہندی۔ جدوں اس دا پتی اس نوں پیسے دین دی گل کردا ہے تاں اوہ جواب دیندی ہے--- مینوں کجھ نہیں چاہیدا۔ میں پتنی دے روپ وچ تہانوں کجھ دتا ہی نہیں۔جیکر دتا وی ہندا تاں اپنے پتنیتو نوں اس طرح نہ ویچدی۔ویاہ دے رشتے دے ناں تے تہاڈے کولوں مہینے دے خرچ لئی بھکیا نہ منگدی۔ممتا اک نویکلی شخصیت ہے۔اوہ کہندی ہے کہ منکھ اپنے کرم راہیں اجیہی اگنی اتپن کرے جو کہ سماج دے سارے غلط ملاں نوں ساڑ کے سواہ کر دیوے۔

لیکھکا درڑتا نال پاٹھکاں نوں اس وچار تک لیاؤندی ہے کہ ''پراتن رہو ریتاں بہت سارے لوکاں دیاں روحاں اتے زندگیاں نوں اکھیڑ دیندے ہن۔تسیں تاں کیول اک ہتھیار ہو، کرم ہو، کرتا نہیں۔کرتا تاں اوہ سماج ہے۔جس نے میرے پیار نوں پیراں ہیٹھ کچل دتا۔..... سماج نے آپ میرا ہتھ پھڑ کے مینوں اس راہ

تے پایا ہے۔'' پر اس دے نال نال لیکھکا ایہ وی درساؤندی ہے کہ ناری دے اپنے من وچ بھرم حالاں بہت ڈونگھے ہن اتے اوہی اس نوں سوے دی پچھان اتے زندگی لئی لڑن توں روکدے ہن۔ ساڈے خون وچ پرانے سنسکاراں دے جہڑے کیہڑے ملے ہندے ہن، اوہی ہولی ہولی پلدے رہندے ہن۔ جیہڑے لوک مر چکے ہن، اوہناں دے سدھانت ہی انسان دی سمپورن وچار دھارا اتے چھائے ہوئے ہن۔ جیون دے سارے راہ اوہناں نے ہی گھیرے ہوئے ہن۔

منکھی ہردے نوں سوکھمتا نال سمجھن والی امرتا پریتم نے ناول وچ نائیکہ دے منو دگیانک پکھ نوں الیکن دے کلامئی ڈھنگ دی ورتوں کیتی ہے۔ نائیکہ دی ہر گتیودھی، سوچ سمجھ اتے آتمک پریرنا دا نتیجہ ہندی ہے۔ پاتراں دا چرتر سنواد راہیں اتے اوہناں دی سوچنی راہیں وی درسایا جاندا ہے۔ پاتراں دی سوچنی راہیں اوہناں دا چرتر الیکنا امرتا پریتم دی کلامئی ودھی دا اک مکھ ڈھنگ ہے۔ ''ممتا سوچن لگی شاید ہر جیون اک بند کمرے دی طرح ہندا ہے جس دی اک باری قدرت دے وکاس والے پاسوں کھلی ہندی ہے۔ قدرت دے وکاس وچوں وی کدے کسے چن دا ودھلا جیا چہرہ، کدے کسے ہنیرے دی کالکھ، کدے اکھاں نوں چندھیاؤن والی روشنی تے کدے گھپ ہنیرا، کدے خشک ہواواں تے کدے پانی نال بھجا ہویا جنگل، کدی چنگا اتے کدی ماڑا گلن والا ہر طرح دا درشاس جیون روپی کمرے وچ آؤندا رہندا ہے۔''

اس سارے وستار دا آدھار کیول اک الوکار ہے، جھروکے راہیں پیندی روشنی۔ لیکن اس اکو علم کار دے ارتھ اتے شیلی بہو پکھی ہن۔

اپنے توں پہلی پیڑھی دے لیکھکاں نانک سنگھ اتے گربخش دیاں پرمپراواں نوں جاری رکھدیاں امرتا پریتم نے نرم، سوہل پر نال ہی نال انکھیلی مان والی اتے اندرونی طاقت والی پنجابن دا بمب الیکیا ہے۔ کسے حد تک ایہ چرتر ٹیگور دی نائیکہ ('آخری کاو، دی نائیکہ لابونے، 1929) دی یاد دواؤندا ہے اتے ایہ کوئی حیرانی والی گل نہیں، کیونکہ لیکھکا اتے ٹیگور دا وی اثر ہے۔ امرتا پریتم دے ناول اتے ٹیگور دے 'آخری کاو' دوہاں دے ہی پاتر کجھ زیادہ 'دلیری' وکھاؤندے ہن۔ کیونکہ متھ ورگ دی کوئی وی کڑی ویہویں صدی دے پہلے چوتھائی حصے وچ اجیہی 'نا سمجھی' نہیں سی کردی کہ اپنے رشتے نوں ویاہ دا روپ نہ دیوے۔ پر ممتا دی ہوند دا ارتھ اس دا دیولئی پیاری۔ کسے حد تک ممتا دا چرتر بھارتی استری دے پرمپراگت چرتر توں الٹا ہے۔ پاتر نوں چترن دی ودھی وچ مولکتا کجھ گھٹ نہیں۔ منکھ وچ سبھ توں وڈی وستو کراشیل آدھار ہے۔ اس وچ امرتا پریتم

پنجابی کوتا دیاں پراتن پرمپراواں دا انوکرن کردی ہے۔ استری کراشیل، رچناتمک مل دی جیوندی جاگدی مورت ہے۔ امرتا پریتم دی نائیکہ دی وشیشتا ایہ ہے کہ اوہ اوہناں کارناں نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے جہناں نے اس نوں موجودہ حالت تک پہنچایا ہے۔ لیکن مکھ نائیکہ وچ صرف چنگیایاں ہی ہن اتے اس دا اک آدرش پاتر ہونا ناول دے وچار دھارک مل نوں کجھ گھٹاؤندا ہے۔ پاتر نوں الیکن وچ اک پکھتا اتے اچے پیار دا رومانچیکرن اس گل دا سنکیت ہن کہ اپنے پہلے ناول نال امرتا پریتم پنجابی ناول شیلی وچ بھائی ویر سنگھ دی تھاپت کیتی اتے نانک سنگھ دی اگے ودھائی اوبھاوک رومانچک پرمپرا نوں شردھانجلی ارپت کردی ہے۔

ممتا دے پاتر وچ پرمپراگت وچار اتے ناری چرتر نوں الیکن دا مول سدھانت دوویں اکٹھے ہو جاندے ہن جو اپنے دیا کتو دی صداچارک پوترتا نوں نہیں بچا سکیا اوہ پیار نوں خشی نہیں دے سکدا، کیونکہ اوہ پریمی نوں کیول نکلی سوغاتاں دیندا ہے۔ "فیر اک مورتی دسی۔ ... ممتا نے پچھانیا اوہ جگدیش سی.... ممتا دے ہردے وچوں نکلیا، مینوں معاف کر دیو، مینوں کھما دے دیو۔ میں تہانوں کی دے سکدی ہاں.... میں سبھ پونجی لٹا چکی ہاں۔ تسیں موتیاں دے وپاری سی، پر میں کنگال ہو کے تہاڈے کول آئی۔ تہاڈے پیراں وچ ٹٹے پھٹے منکے، سستیاں سپیاں، نکیاں نکیاں سپیاں ارپت کردیاں مینوں شرم آگئی۔"

بیان کرن والے پکھاں دی چون وچ امرتا پریتم دی ولکھنتا نظر آوندی ہے: نائیکہ دے چترن وچ اس دے سداچارک منوگیانک پکھاں دا ڈونگھا دھیان شامل ہے، جس نال تکھا پن پیدا ہندا ہے، اتے سماجک سمسیاواں ابھر کے ساہمنے آوندیاں ہن۔

حالانکہ ناول دا انت دکھانتک ہے (ممتا دی موت ہو جاندی ہے)، اس نوں پڑھ کے پاٹھک اداس نہیں ہندا، کیونکہ پورا ناول آشاواد نال بھرپور ہے۔ لیکھکا درساؤندی ہے کہ کویں صدیاں پرانے سماجک تے دھارمک بھرماں وچ جکڑی بھارتی ناری جاگرت ہو کے اپنے ادھیکاراں لئی لڑنا شروع کردی ہے۔ پہلیاں کوششاں وچ بے وسی جھلکدی ہے اوہ پریوار دے تنگ دائرے تک سیمت ہن۔ لیکن بھارتی حالات لئی اس داوی کافی سماجک مہتو ہے کیونکہ کئی صدیاں تک بھارتی ناری بے زبان غلام بن کے رہی ہے۔ تیجے تے چوتھے دہاکے دا سماں جس دا بیان ناول وچ کیتا گیا ہے اجیہا سماں سی، جدوں بھارتی ناری دیاں رچیاں دا دائرہ گھر بار تک ہی سیمت سی۔

جس طرح پنجاب دے پرسدھ ناولکار نانک سنگھ دے ناول 'چٹا لہو' (سن 1932) وچ ناول دی

نائیکہ سارے سماج نال لڑسکن دی حالت وچ نہیں سی، اسے طرح امرتا پریتم دی نائیکہ نوں وی پچھے ہٹنا پیندا ہے، اس نوں کسے دی ہمدردی جاں سہارا نہیں ملدا۔ اتے ایہ کوئی انجوگی میل نہیں، سگوں پنجاب دی اس سمے دی سماجک حالت دا پرتیک ہے، جس وچ پرانیاں رہوریتاں پھلدیاں آرہیاں سن۔

اجو کے بھارتی سماج دیدی آلوچناں دے نال نال لیکھکا ممتا دے وچار راہیں نائیکہ دی اکلی آواز دی نسفلتا اتے نرارتھاں نوں درساؤندی ہے۔ پر آپ لیکھکا نوں وی گھول دے طور طریقے پتا نہیں حالانکہ ناول اک اجہے سمے لکھیا گیا جد پنجابی پاٹھک شاید موجودہ سماجک اتے دھارمک بندھناں اتے حالات دے غلط پکھاں نوں سمجھن لئی تیار ہو چکا سی۔

لیکھکا دے پہلے ناول بارے آلوچکاں نے زیادہ رائے پرگٹ نہیں کیتی پر دوجے ناول 'پنجر' دے حق وچ بہت کجھ کہیا گیا۔ ہندی دے لیکھکاں وچوں جیندر کمار نے سبھ توں پہلاں ناول دی پرسنسا کیتی۔ نیوزی لینڈ دے لیکھک چارلز براش نے امرتا پریتم نوں لکھیا---''میں پنجر ناول پڑھیا ہے، میں تینوں جاننا چاہوندا کہ میں اندر تک کناں ہل گیا ہاں۔ توں کہانی نوں بڑے خوش نور احساس نال لکھیا ہے۔ لفظاں دے سنجم نال ایہ کیرت مان کرن والی ہے۔''

ناول 'پنجر' اک ہندو شاہوکار دے اُجڑے پروار دی بیٹی دی قسمت بارے ہے۔ ناول وچ پنجاب دی ونڈ دے بعد ہویاں اخلاقی تبدیلیاں نوں درسایا گیا ہے۔

'ڈاکٹر دیو' دی طراں ہی اس ناول وچ وی ہندوواں اتے مسلماناں وچکار ودھدے ویر دے پورے دکھانت نوں درسایا گیا ہے۔ ملک نوں آزاد کرواؤن لئی پنجاب دی قربانی دتی گئی سی۔ امرتا پریتم نے، جس نے اپنے اکھیں اس خونی قتلِ عام نوں ویکھیا سی، اجہے حقیقی اتے دردبھرے ڈھنگ نال ہندو گرویاں دے اوودھالے، گھراں دے ساڑے جان اتے پناہ گیراں دے سارے دکھاں نوں چتریا ہے، کہ تقریباً سارے لیکھکاں دے اس وشے اوپر لکھن دے باوجود وی ایہ ناول کافی مشہور ہویا۔ لیکھکا دو ملکاں دے واسیاں، پنجابیاں دی مانسک پریشانی اتے اوہناں دے احساس دی پیچیدگی نوں بیان کرن وچ کامیاب ہوئی۔ آپ لیکھکا نے لکھیا ہے، 'ایہ پورو میں ہاں، ایہ میرا احساس ہے کہ جہڑی وی کڑی اج ٹکانے پہنچدی پئی ہے، سمجھو میری آتما ٹکانے پہنچ رہی ہے۔'

بنگلہ دیش وچ ہندولڑائی دے دوران اک جوان اک دن لئی جنگ توں گھر آیا۔ اوس نے امرتا پریتم

نوں لبھ کے اوس نوں بنگلہ دیش دے شرنارتھیاں دی ڈرردرشا بیان کیتی۔

نال ہی اوس نے ایہ وی دسیا کہ اوس دیاں پستکاں پڑھن والیاں اُتے کیہ اثر ہندا ہے۔ اوس نے دسیا کہ اجے لوک عورتاں دی بے حرمتی کرن دی گستاخی نہیں کر دے۔ ایہ گل امرتا پریتم دی مہارت دی پرتیک ہے۔ ایہ قلم دے سماج اُتے اثر دی نشانی ہے اتے اس توں پتا لگدا ہے کہ ناول کار نوں اک عورت دی بے حرمتی راہیں ملک دی ونڈ دیاں شکار ہزاراں لکھاں عورتاں دی قسمت بیان کرن وچ سفلتا ملی اتے اس پرسنگ وچ امریکی آلوچک دی ٹپنی صحیح نہیں جاپدی کہ اکو کردار نال واپردیاں بہت ساریاں گھٹناواں اک ودھیکی جاپدیاں ہن۔ ایہناں کلیاں ڈکیاں گھٹناواں دے پچھے اک تاں سماجک اہمیت رکھن والے انش ہن اتے دوجے پاسے نائیکہ دے کردار خاص طور تے پورو دے کردار وچ اخلاقی زور ہے۔ جدوں اپنے رشتے داراں کول جان دا موقع آؤندا ہے اتے ایہ امید وی ہندی ہے کہ اوس نوں واپس لے لیا جائے گا تاں اوہ کیوں واپس نہیں جاندی۔ کہ اس دی وجہ ایہ ڈر سی کہ سماج اوس نوں اتے سارے پروار نوں تیاگ دیوے گا۔ جے کر ایہ ہے کہ اوس دی نفرت پیار وچ بدل چکی ہندی ہے، اوہ اپنا اودھالا کرن والے نوں پیار کرن لگ پیندی ہے، مذہب وکھر اہندیاں دی اتے اپنے سگے سمبندھیاں توں دور ہندیاں دی ایہ گل پورو نوں اوس دے نال رہن دا فیصلہ وچ مدد دیندی ہے۔ ایتھے ناول کار نے احساس دی دھرم اگے پرمکھتا اُتے زور دتا ہے۔ ناول کار دے مطابق جیون دیاں دوراہاں ممکن ہن۔ حالات نال سمجھوتہ کیتا جاوے کہ ناں؟ پورو حالات نال سمجھوتا کرلیندی ہے پر ایہ اچیت سمجھوتہ نہیں، سگوں چیتن طور اُتے چکیا گیا قدم ہے۔ اس طرح نال جے کر پہلے ناول وچ ممتا دیو نال پیار کردی ہے لیکن کسے ہور نال ویاہ کرن لئی مجبور ہے تاں پنجر دی پورو حالات نال سمجھوتہ صرف اس لئی کردی ہے کہ اوس دی محبت دا تقاضا ہے۔ اس طراں پہلے ناولاں وچ ہی اس سوال نوں دووکھ ڈھنگاں نال نبیڑیا گیا ہے۔ جتھوں تک پورو دے چترن دا سوال ہے، تاں آلوچکاں نے بالکل صحیح کہیا سی کہ اوس دا چتر اک دم آدرش وادی ہے۔ اس نال چرتر دا کلاتمک وزن اتے اہمیت ضرور کجھ گھٹ جاندے ہن، پر ایہ آلوچنا پروان نہیں کیتی جاسکدی کہ ''اوس نوں پورے معانی وچ عورت ہونا چاہیدا ہے۔'' کیونکہ پورو دا اپنے خاوند ول رویہ اتے اوس دا آخری فیصلہ اس گل دے خلاف ہن۔ اوہ اپنے احساس کارن رشتے داراں کول جان توں نانہ کر دیندی ہے۔

ڈاکٹر دیو دی وشاد ستونوں جاری رکھن ولا امرتا دا اگلا ناول 'اک سوال' ہے۔ اس دا مکھ نائیک کلاکار

جگدیپ ہے۔ کتھانک دے دومکھ رُکھ ہن جہڑے دو نائیکاواں شاہنی اتے ریکھا دے چرتراں نال سمبندھت ہن۔ اوہناں دوہاں دی قسمت دا جگدیپ دے جیون نال نیڑے دا سمبندھ ہے۔ ناول وچ بیان کیتیاں گھٹناواں بھارت دی ونڈ توں بعد دے سمے دیاں ہن۔

ناول کار نائیک دے بچپن در ساؤندی ہے جد اوس دی ماں دی موت ہو جاندی ہے اتے نائیک دے من وچ سر وشکتی ماں رب دی ہوند بارے شک پیدا ہو جاندا ہے کیونکہ ایہ رب اوس دی پراتھنا دے باوجود وی اوس دی ماں نوں نہیں بچا سکیا۔ جگدیپ دا امیر باپ شاہنی نال دوجا ویاہ کر لیندا ہے۔ شاہنی اک غریب گھر دی بیٹی ہے جس دا ویاہ اوس دے گھر والے اوس دی مرضی دے خلاف کر دیندے ہن۔ کالج دی پڑھائی توں بعد جگدیپ کلاکار بن جاندا ہے۔ بہت سفر کردا ہے اتے تصویراں بناؤندا ہے۔ اپنے پتا دی موت دے بعد اوہ شاہنی دی بدنیتی نوں سمجھدیاں ہویاں اوس دے دوجے ویاہ اُتے زور دیندا ہے۔ ناول دے اخیر وچ شاہنی اپنے من چاہے بندے نال ویاہ کر لیندی ہے اتے اک خوش پتنی اتے ماں بندی ہے۔ جگدیپ دی ملاقات اک ویاہی عورت ریکھا نال ہندی ہے اتے اوس نوں ریکھا نال محبت ہو جاندی ہے۔

لیکھکا نے شاہنی اتے ریکھا دے چرتراں نوں اپنے ڈھنگ نال چتریا ہے--- ایوں جاپدا ہے کہ ناول وچ وکھری قسمت ہندیاں وی اوہ اک دوجے دے چرتر نوں پورا کر دے ہون۔

شاہنی دے کردار نوں لیکھکا نے بڑی ہمدردی نال اُلیکیا ہے۔ زبردستی کیتے گئے ویاہ توں بعد اوہ کھوہ وچ چھال مارن دی کوشش کردی ہے پر اوس دا پریمی اوس نوں بچا لیندا ہے۔ اپنے پتی دی موت توں بعد اوہ پرمپرا مطابق اپنے پتا دے گھر نہ مڑ کے ہورناں لکھاں بھارتی وِدھواواں وانگ اپنے پتی دے گھر ہی رہندی ہے۔ اوس دا جائیداد تے کوئی حق نہیں، دوجے ویاہ بارے اوہ سوچ وی نہیں سکدی، اک طرح نال اوہ گھر دی چاردیواری وچ زندہ دفن ہو جاندی ہے۔

ایتھے امرتا پریتم نے ویاہ دے سوال نوں دوجے پکھ توں چھوہیا ہے۔ ایتھے اوس نے وِدھوا دی حیثیت اتے اوس دے دوجے ویاہ دے سوال دا ذکر وی کیتا ہے۔

لیکھکا نے درسایا ہے کہ اُپروں نرم وطیرے والی شاہنی دا سوبھا کِنا باریک اتے پیچیدہ ہے۔ ممتا دے چرتر دی طرح ایتھے وی شاہنی لئی اخلاقی سوچ دا سوال ضروری ہے، 'میں جی نہیں سکدی میرا تن ہی رہ گیا ہے میرے کول اوس نوں ہور سنبھالن دی طاقت نہیں، میری آتما تاں اوس دن ہی کھوہ وچ ڈُب گئی سی۔'

امرتا پریتم نہ صرف ایہ دکھاؤندی ہے کہ اوس دی نائیکہ داورتارا کس طرح دا ہے سگوں اوس دے مانسک اتے سماجک پچھوکڑ نوں وی وکھاؤن دی کوشش کردی ہے--- ''.... چلو، باپو ہی تھوڑا خوش ہو جائے گا تے اوہناں دے سرتوں قرضے دا بھار تھوڑا ہلکا ہو جائے گا......، اوہ ہی راضی خوشی جی لین۔''

ناری پرشن دے سلسلے وچ ناول دا آلوچناتمک رُکھ صاف نظر آؤندا ہے-- ''مرضی کیہ چیز ہے.... کس نوں کسے دی مرضی دی پرواہ ہے۔ میرے باپ نے مینوں ویچ دتا سی۔ میں تاں کھوہ وچ چھال مارنا چاہندی ساں..... '' ناول دیاں ایہناں سطراں وچ روحانی دردا تے غصہ جھلکدے ہن۔

شاہنی دی قسمت دی مثال نوں لے کے امرتا پریتم ودھواواں دے خوس رہن دے حق داذ کر کردی ہے، اوہناں دے دوجے ویاہ دی گل کردی۔ اوہ ایہ درساؤندی ہے کہ حق ملن نال شخصیت نوں ابھرن اتے سُتنتر ہون دا موقع ملدا ہے، اوس دی نائیکہ جگرے نال بولن لگ پیندی ہے، اوس دی آواز وی پکی ہو جاندی ہے۔ پر اوس دی خوش ہون دی خواہش بہت نرم اتے بے چین ہے، بھاو ایہ کہ اکارشک ہندیاں ہویاں وی شاہنی دا چرتر کسے حد تک نسچل ہے۔ گل ملا کے لیکھکا اک ایسے چرتر نوں اُلیکدی ہے جو کہ ہورناں ہزاراں لکھاں ہندوستانی عورتاں دی طراں دقیانوسی خیال دی شکار ہے اتے اوہناں دے خلاف سرگرم لڑائی نہیں کردی۔

جیکر شاہنی نوں پریوار دے دائرے اندر دوایا گیا ہے تاں اس دے الٹ دوجی نائیکہ ریکھا نرم اتے سوچوان ہے، اس نوں اک پرتبھا شالی اتے مشہور شاعرہ دے طور تے درسایا گیا ہے۔ ایہ لیکھکا دی سمکالی عورت دا چرتر ہے۔ ریکھا کلاتمک ملاں دی ستھاپنا وچ قلم دے ماہراں، دی یعنی اپنی تھاں نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے۔ اس نال لیکھکا ایہ درساؤن دی کوشش کردی ہے کہ عورت بڑی کامیابی نال سماجک زندگی وچ حصہ پا سکدی ہے اتے کلا دی سیوا کر سکدی ہے۔ ایہ نویں پنجاب دی ناری ہے اتے اس دی سوچ دا دائرہ اگے نالوں بہت وڈا ہے۔ جدتک ریکھا دی ملاقات جگدیپ نال نہیں ہندی اوہ اپنے وپاری پتی نال خش اتے شانت ہے۔

ناول ''ڈاکٹر دیو'' جس وچ لیکھکا نے ناری دی پرچلت ویاہ پرتھا ول ساہن شیلتا وکھائی ہے، توں الٹ ناول ''اک سوال'' وچ سوال کھڑا کردی ہے: ''کی کیتا جاوے؟'' اک پرواہ کرن والے پتی نوں سوچ اتے پریرنا بھرے پریم لئی وی چھڈ جانا کٹھور اتے انیائیں ہندا۔ امرتا نے بڑے دلکھن ڈھنگ نال اس کردار

نوں الیکیا ہے: اس دی نائیکہ دے باہری احساساں وچ نہیں، سگوں گجھے اتے اندرونی احساساں وچ بڑی گہرائی ہے۔ ایہناں وچ ہی اس دی کھچ ہے۔

پر نائیکہ دے چرتر وچ ہی ایہہ نہیں کہ اوہ اک نال جیوے اتے پیار دوجے نال کرے --- سبھ توں قیمتی چیز اوہ بھاوک نرملتا ہے جو کہ آپسی انسانی تعلقات وچ سچی بھاونا دا نتیجہ ہے۔ نائیکہ دے ساہمنے دو راہ ہن --- سچ کہہ دینا (جو کہ ''ڈاکٹر دیو'' دی ممتا نال ہویا)، جاں اپنے پیار نوں قربان کر دینا۔ اس ناول وچ امرتا پریتم اپنے آپ نوں دوہراؤندی نہیں: اس لئی اپنے پیار دی قربانی اتے اپنے پتی اتے آتمک وار اپنی موت دے برابر ہن۔ اس لئی ایہہ دلیل کہ ''لیکھکا اپنے آپ نوں دوہراؤندی ہے۔'' کجھ بے بنیاد جاپدی ہے۔ مول بھاوک وشا صحیح ہے: ناول دے اخلاقی سوال داحل ریکھا دے چرتر راہیں کیتا گیا ہے اتے کمزوری ایتھے دوجی ہے: نائیکہ اجیہا بھاوک بھار سہہ نہیں سکدی اتے اس دی موت ہو جاندی ہے۔ ایتھے شاید امرتا پریتم تھوڑا جیہا رومانس وا دول جھکی ہے: کاو آتمک موت شاید نائیکہ نوں پاٹھک دیاں نگاہواں وچ ہور اچا کر دیندی ہے۔ اس طرح دے انت وچ پچھے اتے چوتھے دہاکے دی رومانس وادی شاعری دی جھلک دسدی ہے۔ لیکھکاں اصلی جیون دی لڑائی۔ تھارتھوادی ڈھنگ نال نہ کر کے نائیکہ نوں رومانس وادی موت پردان کر دی ہے، اس نوں رسمی انت دیندی ہے۔ ریکھا عورت دی مکتی، خوبصورتی اتے شخصیت دی روح دا اک رومانچک روپ ہے۔ ایہہ لیکھکا دی رچنا وچ نویں ناری چرتر دا پرا روپ ہے۔ نائیکہ دے پریم دے اچے رومانچک درجے ہون دا اک پرتیک ایہہ وی ہے کہ نائیکہ دا اس ول رویہ روحانی ہے۔ ریکھا خود قدرت دا اک حصہ ہے، ''پانی وچ پرچھاواں'' ہے، جویں اک ''دکھانتک کاو'' ہے۔ اس ناول وچ لیکھکا دی کاو آتمک سجھ بہت صفائی نال ابھردی ہے: قدرتی خوبصورتی دا تکھا انوبھو منکھی روح دے سبھ توں کومل وچاراں دی ڈونگھی سمجھ۔

اپنے پہلے ناولاں دے الٹ ''اک سوال'' وچ لیکھکا اپنی نائیکہ دے چرتر دا بیان پروارک زندگی دے دکھ وکھ پکھاں توں مکت ہو کے کردی ہے: اس دے پہلے ناول وچ ممتا سکول وچ کم کرنا شروع کر دیندی ہے تاں ''اک سوال'' وچ ریکھا سماجک زندگی دا اک اہم حصہ ہے۔ اوہ ایہہ مجھند دی کوشش کردی ہے کہ اس دے کماں دا سماج اتے لوکاں نوں کتنا حاصل ہے۔

دوجیاں رچناواں دی طرح اس ناول دا کلاتمک مل جذباتی ناٹک دے انشاں، ملکھ نائیکہ دے چرتر دے روایتی اتے اسادھارن ہون نال کجھ حد تک گھٹ جاندا ہے۔

پچھلے ناول وچ اٹھائے گئے سوال دا جواب ناول ''بند دروازہ'' وچ ملدا ہے۔ اس دی نائیکہ کمی بچپن توں ہی حقیقت نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے، جد اوہ ویکھدی ہے کہ اس دا پتا بیدردی نال اس دی ماں نوں ماردا ہے۔ ماں کیوں ایہ وطیرہ سہندی ہے؟ شروع وچ کمی نوں نہ اس وطیرے نوں سہن دی وجہ اتے نہ ہی مطلب سمجھ آوندے ہن۔ پر وڈے ہون توں بعد مرد دا ظلم اتے عورت دی بے بسی، جنہاں نوں اپنی اکھیں ویکھدی ہے، اس نوں جھنجھوڑ کے رکھ دیندے ہن۔ اوہ سمجھ جاندی ہے کہ اس سماج وچ گھر نوں بناؤن توں بعد وی ناری گھر دی مالکن نہیں۔

ناول ''بند دروازہ'' وچ اسیں ویکھدے ہاں کہ ناری دی آرتھک ستنترتا اس نوں دوجیاں دے نظریے نوں نظر انداز کرن اتے اپنے فیصلے آپ لین دی طاقت بخش دی ہے۔ اس طرح چیتنا نوں ناری دی قسمت بدلن دا اک طریقہ درساندیاں، امرتا پریتم اس ناول وچ پروار وچ ناری دی موجودہ آرتھک ستھتی نوں بدلن دا وی سوال کھڑا کردی ہے۔ اس ناول وچ نائیکہ ریکھا دے مقابلے وچ زیادہ آتم وشواس اتے سوے مان رکھدی ہے، اوہ زیادہ طاقتور اتے بے سمجھوتا ہے۔ ناول دی نائیکہ کمی ہی ویاہ توں انکار کرکے دروازہ بند کردی ہے۔ پر اوہ اپنے استریتو نوں گواندی نہیں، مرداں نال نفرت نہیں شروع کردی، اپنے کوڑے تجربے دے باوجود وی بجھ نہیں جاندی۔ امرتا پریتم دی ناری وچ مڈھلا فرق ایہ ہے کہ اوہ ہر حالت وچ پیار کرن دی اچھا اتے امید جاگدی رکھدی ہے، اوہ رومانچک امیداں اتے امنگاں نال بھرپور ہے۔ اس وچ اک اجیہا انتر ورودھ ہے، جو کہ اندرونی طاقت اتے نال ہی نال بھوکتا وچ پرگٹ ہندا ہے۔ ایہ انتر ورودھ ہی امرتا پریتم دے ناری چرتر دی تازگی دا سوما ہے۔

عشق دی چاہ، پر ناری سویمان اتیا آتم سنمان دی قیمت تے نہیں --- عورت دے اس گن امرتا پریتم دے اگلے ناول ''رنگ دا پتا'' وچ نظر آوندے ہن۔ اس ناول نال لیکھکا دی ناری سوال دی سمجھ وچ وی تبدیلی آوندی ہے۔ ناول وچ سماجک ٹکراء درسایا گیا ہے جو نائیکہ کیلی دی بورژوا رہوریتاں دے خلاف اتے اپنے پیار لئی اٹھائی گئی آواز راہیں درسایا گیا ہے۔

ناول دا مکھ پلاٹ اک سادا پینڈو کڑی کیلی دی قسمت دوالے گھمدا ہے۔ اس دے ماتا پتا قرضے ہیٹھاں دب جاندے ہن، اوہناں اتے پنڈ دے شاہوکار لکھے شاہ دا اینا قرضہ ہو جاندا ہے کہ اوہ اپنی بیٹی دا اس نال ویاہ کرن تے مجبور ہو جاندے ہن اتے کیلی جیہڑی کہ رومانچک پریم دی آس وچ جیوندی ہندی ہے اس

شاہ دے گھر آ جاندی ہے، جتھے اس دے بچے (پہلے ویاہ توں) بہیاں روٹیاں کھاندے ہن اتے نہائے بناہی رہندے ہن کیونکہ اوہناں دا باپ صابن نہیں دیندا۔ گھر وچ فرنیچر اتنا پرانا ہے کہ ویکھدیاں ویکھدیاں ٹٹدا جاندا ہے۔

ناول دی نائیکہ کیلی اپنے امیر اتے بے اصولے پتی دے گھر روٹی دی فکر توں بنا زندگی گزار سکدی سی۔ اوہ گدام وچ لگی اگ دی چھان بین کرن لئی آئے انسپکٹر نال عورت دی طرح معاملہ نپٹا سکدی سی۔ ایہ اگ اس دے پتی نے ہی بیمے دے پورے پیسے وصول کرن لئی جان بجھ کے لگوائی سی۔ اس توں علاوہ مال دا عملی حصہ اس نے پہلاں ہی چھپا لیا سی۔ راتیں دیر نال شاہوکار نے کیلی نوں جان بجھ کے انسپکٹر جو اوہناں دے گھر ہی ٹھہریا سی دے کمرے وچ بستر او چھاؤن لئی گھلیا۔ کون جاندا ہے اوہ اس توں بعد زیادہ آرام طلب زندگی جیوں سکدی سی۔ پر امرتا پریتم دی نائیکہ اجہی نہیں۔ اوہ اپنے بے اصولے گھر والے نوں چھڈ کے اپنے من چاہے مرد کول چلی جاندی ہے۔ پر چپ چپیتی نہیں سگوں اچی آواز وچ اس دی اخلاقی کمزوری دے خلاف بول کے اتے سماج نوں ونگار کے۔ کیلی دے چرتر وچ امرتا پریتم اک اجہی ناری نوں درساؤندی ہے، جو نہ صرف اپنی انکھ نوں پچھاندی ہے، سگوں اس دے حق وچ ٹھوس قدم وی چکدی ہے۔ ''میں جا رہی ہاں جیکر توں پلس نوں بلاویں گا تاں میں تیری ساری سازش کھول دیواں گی۔''

ایہناں ناولاں وچ گھناؤناں نوں سدھی اتے سرل شیلی وچ الیکیا گیا ہے۔ لیکھکا بڑے سدھے سادے فقرے استعمال کرنا پسند کردی ہے جیہڑے کہ مطلب دے پکھوں اتنے وزن دار ہندے ہن کہ اوہناں نوں پورے پیریاں وچ بیان کیتا جا سکدا ہے۔

''سماج نے میرا ہتھ پھڑ کے مینوں اس راہ تے پایا ہے۔''

''گھناؤنیاں اتے غلیظ شکلاں والے لوک گالاں کڈھدے دوویں پاگل کتیاں دی طرح اک دوجے نوں وڈھدے ہن۔''

اس دے مڈھلے ناولاں وچ ہی ناواں نوں چنہاں دی طرح ورتیا گیا ہے، جس دے نتیجے وجوں اک وشیش چیز عام عام چیز دی پرتیک بن جاندی ہے۔ اس لئی اک باہرلی گھنا اندرلی کھچوتان نوں درساؤندی نہیں بلکہ اس ول اشارہ کردی ہے۔ اس وچ ہی امرتا پریتم دی گلپ شیلی دا انوکھا پن چھپیا ہوا ہے۔

''بند دروازہ'' اک خود قید ہوئی عورت ول سنکیت کردا ہے جد کہ اگلی پیڑھی دی عورت آپے اس سے

دروازہ بند کر دیندی ہے جدوں اوہ کسے چیز نوں اپنے اخلاقی اصولاں دے مطابق نہیں سمجھدی۔ یعنی کہ ناول دے ناں دا اس تھاں تے اک مطلب نہیں۔ ''اک سوال'' دا مطلب ہے ''کیہ کیتا جاوے؟''

امرتا پریتم اک سوال اٹھاؤندی ہے اتے حقیقت نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے۔ پر ناول وچ اس کیتے گئے سوال دا کوئی جواب نہیں ملدا اس نال پاتراں دیاں رہوریتاں وچ جکڑی زندگی وچ کوئی فرق نہیں پیندا، جدکہ لیکھکا لئی انسان دی پورنتا، احساس دی پورنتا اتے اکھنڈتا اتے اخلاقی آسرے دی بھال رچناواں وچ ساکار ہندے ہن۔

لیکھکا دے وارتک دی دو جی وشیشتا ہے --- سنکھیپتا اتے وارتک وچ چلنا دے کھلے استعمال راہیں حاصل کیتا جاندا ہے۔ اس ساہتک سادھن دا صحیح استعمال اس دی شیلی دی وڈی خاصیت ہے جیہڑی اس نوں صحیح، نپے تلے اتے سپشٹ ڈھنگ نال بیان کرن وچ مدد دیندی ہے۔

امرتا پریتم دی شیلی وچ بیان دے روایتی اتے نویں ڈھنگاں دا پنجا میل ہے۔ اس نوں خاص طور تے اس دے قدرت دے بیان وچ ویکھیا جا سکدا ہے۔ اوس دیاں رچناواں وچ اک پاسے بھارتی ساہت وچ پہلاں توں پرچلت منو گیانک قدرتی نظارے ہن، جیہڑے پاتراں دی مانسک اوستھا بیان کرد ے ہن۔ اس توں وی زیادہ سوکھم اتے شکتی شالی ہن قدرتی نظارے دے بیان دے نویں طریقے۔ ایتھے قدرتی نظارا نویں ساہت وچ پرچلت اک چنھ جاں ڈھنگ ہے۔ اس دی مثال ناول ''ڈاکٹر دیو'' وچ ممتا دا سپنا ہے۔

امرتا پریتم دے ناول ''ڈاکٹر دیو'' اتے ''اک سوال'' وچ بدھی جیوورگ دے پرتیندھاں دے رہن سہن دے بیان لئی ورتے ڈھنگاں وچ باریک چون نظر آؤندی ہے جدکہ ناولاں ''پنجر'' اتے ''رنگ دا پتا'' وچ پینڈو پنجابیاں دے رہن سہن دے تجربے، سبھیتا، مانسک بنتر آدِ دے بیان لئی صحیح طریقیاں دی چون دی مثال ملدی ہے۔ مثال دے طور تے ممتا دی بول چال سنکھیپ اتے پربھاوک ہے۔ دیو دے لفظ ہور طرح دے ہن، اس دے سادے لفظاں وچ وی کوتا جھلکدی ہے۔ دل نوں چھوہن والیاں کوتاواں امرتا دے پہلے ناولاں نوں اک خاص نگھ اتے سنگیت پردان کردیاں ہن۔

ایہہ سبھ کجھ مل کے ہی امرتا پریتم دی شیلی نوں انوٹھا بناؤندا ہے۔ اس دا نتیجہ ا.. ندا ہے کہ امرتا پریتم دے پہلے ناولاں وچ ہی کئی تھاواں نوں کئی وار پڑھن دی لوڑ پیندی ہے اتے سطراں وچکار بھرے بولاں ول دھیان دینا پیندا ہے۔ لیکھکا اپنی شیلی نوں بہو پکھتا پردان کردی ہے، جیہڑی اوہنوں حقیقت نال جوڑ دیندی ہے۔

لیکھکا لئی ایہ طریقہ اک ایسا ہتھیار ہے جس راہیں اوہ پاٹھکاں نوں اپنے پاتراں دیاں حرکتاں دا سدھا حل نہ پا کے اوہناں دے دلاں نوں منوگیانک بھل بھلیویاں وچ آون دا سدا دیندی ہے اتے زندگی ول اپنا رویہ سمجھن لئی پریردی ہے۔

اس طرح نال اپنے مڈھلے ناولاں (1963-1949) وچ امرات پریتم ناری پرشن بارے لکھدیاں اپنے دسہدیسوں وددھاؤنچی جاندی ہے: اخلاقی مثالاں اتے عورت نوں داسی بناؤن والیاں رہو ریتاں دے خلاف آواز اٹھاؤن توں شروع ہو کے اوہ سماجک مسلیاں اتے بورژوا سماج دے ریتی رواجی دی آلوچنا تک پہنچ جاندی ہے۔ ایہ کوئی سنجوگ نہیں کہ لیکھکا ناری دے سوال نوں پنجاب دی ونڈ دے سوال نال جوڑدی ہے۔ اس ونڈ نال ملک وچ موجود اوہ انتر وروددھ جنہاں نال ناری دی اوستھا خراب سی، ہور تکھیرے ہو جاندے ہن۔

اک سائنسدان دی طرح اوہ سوکھمتا نال ہر درجے دی پنجابی عورت دے نظریئے دی بنتر تے وکاس دا ادھیین کردی ہے: بھارتی سماج دے ریت رواجاں دیاں خامیاں دے خلاف آواز اٹھاؤن توں عورت دے سماج لئی لاہے وند کم دے سپرک وچ آون تک اتے پریوار اتے سماج وچ اپنے حقاں لئی لڑائی دی لوڑ تک، ساریاں پڑاواں دا بیان امرتا پریتم کردی ہے۔ ناری پاتراں نوں درساؤن وچ روایتی جذباتی رومانچک ڈھنگ (پہلے ناولاں وچ) توں لے کے رومانچک۔یتھارتھوادی ورتوں کیتی گئی ہے۔

امرتا پریتم ولوں درسائے گئے پل پل جیوندے جاگدے پاتر ہن، جو بھارت دیاں اس دور دیاں ساریاں عورتاں دے حقیقی احساس اتے خیالاں نوں وکھاؤندے ہن۔

ناری پاتراں نوں الیکن وچ اخلاقی نرملتا دا اصول لیکھکا لئی سبھ توں ضروری اصول ہے۔ پر ایہ اچا اخلاق، جس دا ذکر امرات پریتم کردی ہے، بھارتی سنسکرتی وچ پرچلت عورت دے اخلاق نال پورا میل نہیں کھاندا۔ بھارتی روایت انوسار عورت دے گن ہن: نرمانتا، آتم بلیدان، سہن شیلتا اتے دین دی بھاونا۔ ناری چرتر دے الیکن وچ انوٹھا پن نہ میل کھان والے گناں دے گٹھ جوڑ نال حاصل کیتا لگدا ہے۔ ایہ گن ہن: گرمی، رومانچک مجاز اتے نال ہی نال اک عجیب روحانی طاقت۔

ناری پاتراں نوں درساؤن لئی ورتیا گیا سبھ توں وڈا ڈھنگ منوگیانک پڑچول کیہا جاسکدا ہے۔ لیکھکا اپنے پاتراں دے کماں دا سدھا ملنکن نہ کر کے اوہناں دے نال نال سوچ وچار کردی جاپدی ہے اتے

پاٹھکاں نوں اپنے ہم وطناں دے دکھ درداں وچ شامل ہون دا سدا دیندی ہے۔

امرتا پریتم دی نائیکہ چپ چپیتے دکھ سہن والی نہیں سگوں اپنے ڈھنگ نال بے انصافی دے خلاف آواز اٹھاؤندی ہے۔

نائیکہ اپنے آلے دوالے نال نہ صرف روحانی سگوں اصلی طور تے ناتا توڑ لیندی ہے اتے لیکھکا اوس دے اس قدم نوں اک صحیح قدم قرار دیندی ہے۔ اپنیاں نائیکاواں وچ سویمان دے احساس دی جاگرتی اک چنگیرے جیون دی چاہ، جیون وچ اپنی تھاں نوں سمجھن دی کوشش ایہناں ساریاں چیزاں دا درساؤنا پرگتی شیل ہون دا چنھ ہے اتے اس طرح نال، ایہناں مڈھلے ناولاں وچ دی امرتا پریتم دے گلپ ساہت وچ سماجک آلوچنا دا مادہ نظر آؤندا ہے، جو خاص طور تے سرمائے دار بھارتی بورژوا حلقے وچ پرچلت سنسکاراں اتے اوہناں دے ناری دی اوستھا اتے اثر تے چاننا پاؤندا ہے۔

چھیویں دہاکے دے ناول

لیکھکا دے چھیویں دہاکے دے ناول اک طرح نال ناری پرگتی دے بیان نوں ہی جاری رکھدے ہن، جس وچ تبدیلی ناول ''رنگ دا پتا'' توں شروع ہوئی۔ ایہناں وچ اک طرح نال لیکھکا دے روحانی وکاس دے پرمان ملدے ہن۔

اپنے ناولاں 'ناگ منی' جاں چک نو: چھتی (1964) اتے 'دھرتی، ساگر تے سپیاں' (1965) وچ امرتا پریتم نے شان، سویمان اتے آتم نربھرتا دے پکھوں سبھ توں پرتکھ ناری چرتر الیکے ہن۔

امرتا پریتم دے اس طرح دے بے سمجھوتا جاندار اتے غیر پرمپراگت پاتر بناؤن دے پچھے کئی کارن لبھے جا سکدے ہن۔

سبھ توں پہلاں ایہ کہ پہلے ناول دے چھپن دے سمے توں اس سمے تک تقریباً ویہ سال گزر چکے سن اتے اس دوران امرتا پریتم نے نجی جیون اتے اک لیکھک دے طور تے بہت تجربہ حاصل کر لیا سی۔ دوجا ایہ کہ بھارتی ساہت دے چھیویں دہاکے دے وکاس دیاں کجھ وشیشتاواں نے امرتا پریتم دی رچناتمک شیلی اتے اپنے اثر دی چھاپ چھڈی۔

ویہویں صدی دا چھیواں دہاکا اک اجیہا سماں سی جدوں سدھانتک گھول کجھ تکھیرا ہو گیا سی، جس دا

اثر پوربی دیشاں دے ساہت اتے خاص طور تے بھارت دے ساہت اتے ہویا۔ آزادی حاصل کیتیاں دس ورھے گزر چکے سن، لیکن چھوٹے چھوٹے قدماں دے راہ وچ وی اندرونی اتے باہرلیاں پچھانہ کھچو طاقتاں ولوں اوکڑاں دا ساہمنا کرنا پیندا سی۔ دوجے پکھوں چنگیاں پرپیتاں دی غیر موجودگی نے سماج نوں نراس کردتا سی۔ وکھ وکھ طاقتاں وچ حد بندی شروع ہوگئی، راشٹری ایکتا وچ تریڑ پے گئی۔ اس طرح پیدا ہوئی حالت وچوں نکلن لئی لیکھکاں نے پچھمی دیشاں دے ساہت وچوں کوئی حل لبھن دی کوشش کیتی۔

دوجے قلم دے ماہراں دی طرح امرتا نے وی کامیو، سارتر، لارینس، سٹین بیک ول نظراں موڑیاں۔ شاعرہ نوں فرانسیسی لکھاری اتے ڈاکٹر سٹین بیک بہت پسند سن۔ سٹین بیک دوجے پنجابی لیکھکاں وچ وی مشہور سی اتے اسند کیتا جاندا ہے۔ امرتا پریتم نے خود فراسٹ اتے ایڈگن ایلن پو دیاں کئی کوتاواں دا ترجمہ پنجابی وچ کیتا۔

شخصیت بارے، امرتا پریتم دے وچاراں وچ اپنے مضبوط اتے کمزور پکھ ہن، ایہناں وچ کجھ وچار جان پال سارتر دے نظریے نال میل کھاندے ہن اتے کئی اس توں عین الٹ ہن۔

کرشنا سوبتی دے ناولاں اتے سعادت حسن منٹو دیاں کہانیاں دا حوالہ دیندیاں امرتا پریتم ایہناں لیکھکاں دی مہارت دا ذکر کردی ہے، جنھاں نے صرف دو پریمیاں دی نیڑتا بارے نہیں لکھیا سگوں اوہناں دے دل دی حالت بیان کرن وچ کامیابی حاصل کیتی، اتے ایہ وی وکھا سکے کہ اک سچے پیار دا قدرتی پرگٹاء کس طرح وی دلی نرملتا اتے وشواس دی قیمت تے ہندا ہے۔ امرتا دے ناول ''ناگ منی'' دے پاتراں دے آپسی ٹکراء دا آدھار ایہی نظریہ ہے۔

ناول دے پاتر ہن کلارا کمار اتے امیرزادی الکا، جو کسار کول کلا دی سکھلائی لئی آؤندی ہے۔ کمار اپنے کم وچ لین ہے اتے الکا نوں پسند کردیاں ہویاں وی شادی دا ارادہ نہیں رکھدا۔ اوہ پیار دے کارن اپنے بجٹ نوں نہیں گواؤنا چاہندا اتے پیسے دے سمبندھ (20 روپے والے) نوں زیادہ بہتر سمجھدا ہے کیونکہ اس نال اوہدے اتے کوئی بوجھ نہیں پیندا، نہ احساس دا: نہ آرتھک اتے نہ ہی سماجک۔ الکا اس نال پیار کردی ہے اتے اپنی مرضی اتے سویمان نال ایہ شرطاں قبول کردی ہے۔ اوہ الکا نوں بالکل نہیں سمجھ سکدا۔ نہ تاں اس نوں اس دل الکا دے شانت رویے دی سمجھ پیندی ہے اتے نہ ہی الکا دی اپنی قسمت اتے سماج وچ بدنامی دل بے پرواہی دی۔ کمار نے کسے سمے اپنے دوست دی ہوٹل بناؤن وچ بڑی مدد کیتی سی۔ اس دے بدلے اوس نے

کمار دی مدد زمین دا ٹوٹا خرید کے سٹوڈیو بناؤن وچ کیتی۔ ہن اوس نے کمار نوں ہوٹل دے نویں پراجیکٹ دی سجاوٹ لئی دلی بلایا۔ اس سے لئی الکا اپنے پتا دے گھر جا سکدی سی لیکن اوہ سٹوڈیو دی اساری پوری کرن لئی پنڈ وچ ہی رہ جاندی ہے۔ دلی وچ کمار نوں ایہ گل سمجھ آؤنی شروع ہو جاندی ہے کہ اوہ الکا نال پیار کردا ہیں اتے دوسری عورت نال سمبندھ نہیں رکھ سکدا۔ الکا دا پتا اوس دے گھر مڑ آؤن اتے ویاہ کراؤن اتے زور دیندا ہے۔ الکا اپنے منگیتر نوں ساری گل دس دیندی ہے۔ خبر آؤندی ہے کہ کمار موت تے بسترے تے ہے اتے الکا اوس کول جا کے ہمیشہ لئی اوس دے گھر ووہٹی دے طور تے رہن دا فیصلہ کردی ہے۔

الکا دا عشق اوس نوں سپٹ ویکھن وچ مدد دیندا ہے، اوس دی سانجھ اتے احساس نوں نکھیر اکر دیندا ہے۔ عشق اوس دی دنیا دی سمجھ اتے اوس دے اپنے وجود نوں ڈونگھیرا کر دیندا ہے۔ جیکر کمار دے احساس استھیر اتے رومانچک ہن تاں الکا دا جذبہ ڈونگھا اتے ستھیر ہے۔ ایہناں دو نظریاں دے ٹکراء وچ الکا سدھی سادی اتے اڈول ہے، کمار دے من وچ کئی طرح دے اک دوجے توں الٹ وچار آؤندے جاندے ہن۔

لیکھکا درساؤندی ہے کہ کس طرح بھارت ورگے پرمپراگت سماج وچ وی ویاہ بارے وچاراں وچ وڈی تبدیلی آ گئی ہے۔ روایتی ویاہ دی تھاں بورژوا ویاہ نے لے لئی اتے امرتا پریتم اوس دیاں صفتاں دے گیت گاؤن دا کوئی کارن نہیں سمجھدی۔ اوس نے بڑے حقیقی اتے باریک ڈھنگ نال پاتراں دے رہن سہن اتے سوچ وچار وچ ہویاں تبدیلیاں نوں درسایا ہے۔

ناول ''دھرتی، ساگر تے سپیاں'' اک لڑکی چیتنا دی کہانی ہے جس نوں اقبال نال پیار ہے۔ اقبال وی اوس نوں پیار کردا ہے لیکن اوس نال ویاہ نہیں کر سکدا۔ اس دی وجہ اوس دی ماں سی جس دا پچھوکڑ بڑا دکھدائی سی: 16 سال دی عمر وچ اوس نوں جبراً گھروں چک لیا گیا سی پر بعد وچ اوس نوں سڑک تے سٹ دتا گیا۔ اوس نے بچے اقبال نوں جنم دتا۔ ساری زندگی اوس نے اقبال نوں سمرپت کر دتی۔ اوس دی قربانی نوں جاندیاں اقبال نے اپنا پیار اوس نوں دین دا فیصلا کیتا اتے طے کیتا کہ ہور کوئی عورت اوہناں درمیان نہیں آوے گی۔ چیتنا اوس نال سہمت سی پر اوس نے اک گزارش کیتی: اوس دا ویاہ اقبال نال ہووے جاں نہ، پر اوہ پہلا مرد ہونا چاہیدا ہے جس نوں اوہ اپنا تن من دیوے۔ اوہ بچے نوں جنم دیندی ہے پر اقبال توں ایہ گل ایہہ کہہ کے چھپا لیندی ہے کہ اوس نے بچے نوں اناتھ آشرم توں لے کے اپنایا ہے۔ چیتنا کم کردی ہے اتے بچے

نوں پالدی ہے۔ اقبال دی ماں زور دیندی ہے کہ اوہ چیتنا نال ویاہ کرلوے، کیونکہ اوہ چیتنا دے اس بچے نوں ویکھ کے سمجھ جاندی ہے کہ اوس دا پوترا ہے، پر اقبال نوں اس بارے کجھ نہیں دسدی۔ چیتنا اس شرط تے راضی ہو جاندی ہے کہ اوس دا اپنا یا بچہ اوس دے نال ہی رہے گا۔ اقبال نوں ویاہ توں بعد پتا لگدا ہے کہ ایہ اوس دا بچہ ہے۔ اس دی وجہ ایہ سی کہ چیتنا ایہ نہیں سی چاہندی کہ اقبال سمجھے کہ اوہ بچے دی گل کر کے اوس اتے ویاہ لئی زور پا رہی ہے۔

چیتنا دے اخلاقی سدھانت سپشٹ اتے پکے ہن: صاف دلی اتے احساس دی سوچھتا اتے چیتنا دا ویہار کوئی غیر اخلاقی نہیں سگوں سوے چیتنا دا پرتیک ہے۔ اس نوں پر مپراگت سداچارک ملاں دے خلاف اک آواز وی کیہا جاسکدا ہے، اوہ مل جیہڑے کہ انسان دے آدرشاں نوں کچلدے ہن اتے انسانی رشتیاں نوں وکرت کردے ہن۔ چھیویں دہاکے وچ اس ہندوستانی ''کنزیومر سوسائٹی'' دے چنھ صاف ابھردے ہن۔ لیکن اس طرح دا وروودھ کجھ حد تک غیر قدرتی ہے، زیادہ طور تے ایہ لیکھکا دا اوس ساہت دے خلاف روس لگدا ہے جس نے زندگی نوں آدرش روپ دے دتا ہے اتے انسانی احساس نوں صرف اصول دے سیمت دائرے دے اندر ہی درساؤندا ہے۔ امرتا پریتم جویں پیار نوں اوس دی پہلی انسانی، احساس نال بھرپور خوبی پردان کرنا چاہندی ہووے جیہڑی کہ اک سے رومانچک کویاں دیاں رچناواں وچ دیکھن نوں ملدی سی۔

اسیں آلوچکاں دی اس رائے نال پوری طرح سہمت ہاں کہ امرتا پریتم کیول اوہناں گھراں نوں اجاڑدی ہے جیہڑے کہ بچی اتے ''ان اچھا'' تے اسری عینہ تے کھڑے ہون جاں اوہناں نوں، جنہاں وچ تریڑ پے گئی ہووے۔ اس طرح نال اوہ اخلاق دی سبھ توں اچی پدھر دی راکھی کردی ہے۔ امرتا پریتم پکھنڈ توں دور ہے اتے نزدیکی سمبندھاں بارے اوہ کھلے اتے متھے طریقے نال گلاں کردی ہے جو کہ چھیویں تے ستویں دہاکے دی پیڑھی لئی سبھاوک سی۔

پر جیکر رابندر ناتھ ٹیگور اپنیاں رچناواں وچ ''اشلیلتا'' دا انش نہیں سی آؤن دیندا اتے نہ ہی دوجیاں لکھاریاں دیاں لکھتاں وچ اوس نوں پسند کردا سی، تاں اس توں الٹ امرتا نوں لیکھکاں دی بھارتی پاتراں نوں ساہت وچ زیادہ کھلے بناؤن دی کوشش پسند ہے۔ اوس نوں پاتراں نوں کام وچاراں دا کھلا پرگٹاء اتے اس توں وی ودھ کے عشق دا زیادہ حوصلے والا اتے نجھک بیان زیادہ پسند ہے۔ اوہ لکھدی ہے کہ نیڑے دے سمبندھاں دے کھلے بیان وچ نہیں سگوں لیکھک دے اوہناں نوں درساؤن پچھلے مقصد وچ ہے۔

سچائی اتے روحانی خوبصورتی دے آدرش ایہ امرتا پریتم دے رچناتمک ویاکتتو دی خاصیت ہے جو ناری چرتر وچ پورنتا دی لگاتار بھال وچ ویکھن نوں ملدی ہے۔

امرتا پریتم دے دوجے دور نے ناولاں وچ دی انسانی ہوندا تے سچ اتے پریم دے سومیل بارے ڈونگھی سوچ دے میل دا احساس ہندا ہے۔ ایہ وی کہیا جاسکدا ہے کہ ایتھے کسے حدتک ٹیگور دی سندرتا بارے دھارنا ویکھن نوں ملدی ہے۔

ایہناں ناولاں وچ امرتا پریتم دی ناری پاتر نوں اُلیکن وچ مہارت سبھ توں زیادہ ویکھن نوں ملدی ہے۔ اوس نوں اپنے پاتراں دے آپسی رشتیاں وچ سبھ توں سُوکھم اتے ڈونگھے احساس دا بیان کرن وچ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ایہ پاتر اوس دے سمکالی ہن: انسان اپنے آپ نوں صرف دو جیاں راہیں سمجھ سکدا ہے اتے اس پکھ توں ''ناگ منی''، ''دھرتی ساگر تے سپیاں'' وچ نویں بھارتی ساہت دے سبھ توں ''اُجاگر اتے سیانے ناری پاتراں'' وچوں کجھ ویکھن نوں ملدے ہن۔ اوہناں دے خاص چنھ نرمی اتے سدھاپن ہن۔ شاعرہ امرتا پریتم ات جذباتی اتے بودھک ہے، لیکن ناول کار امرتا پریتم شانت اتے مختصر ہے۔

پر اوس دا ناول ''ایریل'' (1968) رچناتمک پکھوں اک ونگی ٹیڈھی لکیر ہے، اتے گل ملا کے وودھدی ترقی دے بیان دی حدتوں باہر ہے۔ اس دا ذکر بھارتی اتے سوویت آلوچکاں دوہاں نے ہی کیتا ہے۔ اس ناول دا دائرہ آتم مکتھا، شخصیت دے فلسفے نال جُڑے سوال، اک وِکھے ویاکتتو دی اندرونی ''میں'' راہیں پڑچول ہے۔ ناول دا مکھ وچار عورت دا اکلاپن ہے۔ جس نوں ناکامیاب محبت راہیں درسایا گیا ہے۔

اس ناول وچ ڈھانچے دی اسپشٹتا اتے سمبندھتا پلاٹ دا کمزور وکاس، بودھک اتے انوبھوی پکھاں دی ملاوٹ آدِ ویکھن نوں ملدے ہن۔ اس دی وجہ ایہ ہے کہ ناول وچ لیکھکا دے وچاراں دی بہتات ہے، جس نال گھٹناواں اتے پاتراں دے ورنن ول گھٹ دھیان دتا گیا ہے۔

چھیویں دہاکے بھارت وچ آرتھک اتے سماجک ڈھانچے وچ انتر وِرودھاں دے ویکھن نال راج نیتک جیون اتے اصولی جدوجہد وچ نکھاپن آیا، جس دے نتیجے وچوں بھارتی بدھی جیویاں وچ نراستا اپرسنتا غصہ اتے اخلاقی سنکٹ پیدا ہوئے۔

اس کارن ہی بھارت دے کئی لیکھکاں نوں، جویں کہ ہندی دے اگیوار اجیند ریادو، تیلگو دے رچنچو

کونڈا او سونت شاستری، مراٹھی دے ہلو اڑکر، پنجابی دی امرتا پریتم نے پرانے ڈھنگ توں زیادہ ہو کے پر گٹایا
دے نویں ڈھنگاں نوں اپناؤن دی کوشش کیتی۔ -تھارتھ وادد دے منچ تے کھڑیا ایہ لیکھک پچھم دی آتمک بھیتا
وچ کجھ اجیہا طور طریقہ لبھدے، ہن جہڑا کہ بھارتی ساہت وچ اس کٹھن منوا وستھا دا بیان کر سکدا ہووے۔

امرتا پریتم دی پراپتی اس وچ ہے کہ اوس نے نویں بھارتی سماج وچ بیگانگی (alienation) دے
لچھناں نوں پچھانیا، لیکن اوس نوں اک بورژوا سماج وچ شخصیت دی بیگانگی دے مُول کارن نہیں دِسے۔

امرتا پریتم دی سبھ توں وڈی خاصیت ایہ ہے کہ اوہ سدا نویں طریقیاں دی بھال وچ رہندی ہے،
جس نال اوس دے رچناتمک ہتھیاراں وچ ہمیشہ نویں انش ویکھن نوں ملدے ہن۔ جیکر ''ڈاکٹر دیو'' اتے
''اک سوال'' وچ دکھانتک حل ہے تاں ''ناگ منی''، ''دھرتی ساگر تے سپیاں'' وچ اوس نوں ناول دے
ڈھانچے نوں بدلنا پیا۔ دوجے دور دے ناولاں دے خاص چِھن ایہ ہن کہ منووگیانک ناول دی طرح اوہ گہرائی
دل نوں جاندی ہے اتے کارناں دی بھال وچ رہندی ہے۔ اس نال پلاٹ دی اہمیت گھٹ جاندی ہے اتے
اندرونی تارکک سمبندھ زیادہ ضروری بن جاندے ہن۔ باہرلے طور تے کدے کدے ناول دے حصیاں وچ
کوئی آپسی سمبندھ نہیں نظر آؤندا۔ ایہناں ناولاں وچ امرتا پریتم نے دسن والے کارن نہیں، سگوں، گُجھے
بھارت نوں درسایا ہے، جو باہروں آسانی نال نظر نہیں آؤندا۔ اک چھوٹے جہے ویروے راہیں امرتا پریتم
پورے چرتر نوں درسا سکدی ہے۔ اک اجیہا طریقہ الکادی مُنی ہے--- ''خوشی چیزاں وچ نہیں خوشی دل دی
حالت وچ ہے۔'' لیکھکا تارکک پڑچول اتے اُپ چیتنا (subconscious) دے پرواہ دے بیان وچ
مہارت رکھدی ہے جویں کہ انیتا یادگاراں اتے اجوکڑ دی ڈولویں اُتھل پُتھل وچ اپنے آپ نوں سمجھن دی
کوشش کردی ہے۔ اس توں اسیں لیکھکا دیاں -تھارتھ وادی رچناواں دے وشیش گُن منووگیانکتا بارے کہہ
سکدے ہاں۔ ایہ کہیا جا سکدا اے کہ مُڈھلے ناولاں وچ ورتی گئی منووگیانک پڑچول نوں بعد وچ ہور گہرائی
ال استعمال کیتا۔

لیکھکا دے چھیویں دہاکے دے ناول اوس دیاں پہلیاں گلپ رچناواں نال تاں اندرونی طور تے
جُڑے ہوئے ہن ہی، اس دے نال ہی اوہناں وچ ناری چرتر دی پر مپراگت دیا کھیا توں لگاتار ودھدی دوری
وی نظر آؤندی ہے۔ دوجے -تھارتھ وادی لیکھکاں جویں کہ موہن سنگھ، کرتار سنگھ دُگل اتے جسونت سنگھ کنول
آدِ نے اپنیاں رچناواں وچ ناری دی سماج اتے گھر وچ اپنی تھاں بناؤن لئی گھول دے سوال نوں اٹھایا ہے

لیکن اوہناں نے اس مسئلے نوں کیول سماجک پرکار دے طور تے لیا ہے۔ اس توں ہٹ کے امرتا پریتم نوں عورت دے احساس وچ روحانی مولکتا دا پرمان ہون دے طور تے دلچسپی ہے۔ پر لیکھکا اس گل نوں صرف حقیقت دے طور تے بیان نہیں کردی، ناری دے کردار دا وکاس اوس دیاں رچناواں وچ زندگی دی چال توں اڈ نہیں، نایکاواں دے حقیقت نال ٹاکرے وچ اوہناں دیاں خوبیاں زیادہ صاف طور تے ابھردیاں ہن۔ لیکھکا اپنی ہر نایکا دی شخصیت دے انوٹھے وکھرے پن تے زور دیندی ہے پر اس دے نال ہی اوس دے وکھرے پن وچ ہزاراں ہندوستانی عورتاں دے احساس اتے خیالاں دا پرگٹاء ملدا ہے۔

ستویں دہاکے دے ناول

لیکھکا دے چھیویں دہاکے دے انت اتے ستویں دہاکے دے شروع دے ناولاں وچ زیادہ وشے دستو دی بھنتا اتے زیادہ سماجک رخ جویں کہ متر نال پیار، ماتر بھومی نال پریم، جیون دا مطلب اتے جوان پیڑھی دا بھوکھ آدِ موجود ہن۔ شاید اس دی وجہ دیش دی وچار دھارک، سماجک اتے سائنسک زندگی وچ ہویاں تبدیلیاں وچ آشاوادی جذبات دا نراشاوادا اُتے غلبہ سی۔ اس دا سمبندھ اوس نویں اتہاسک پڑاء نال ہے جس وچوں بھارت گزر رہیا سی۔ ایہ پڑاء سی وگیانک اتے تکنیکی ترقی دا بھارت دی سماجک اتے آرتھک اتے نال ہی سبھیاچارک زندگی تے اثر۔

اگانہ ودھو لیکھک اک اجہے نویں پاتر دی تلاش کردے ہن جو کہ اس دور دے اُنت وچاراں نوں درسا سکے، اتے اوہناں دی بنا تے حقیقت نوں تبدیل کر سکے۔

اج دے بھارت دی سماجک اتے راجنیتک زندگی وچ نویں پیڑھی دا مسئلہ، بھارت چ بھوکھ دا سوال، ودھدی ودیارتھی چیتنا دی سمجھ اک وڈا مسئلہ ہے۔ کالجاں اتے یونیورسٹیاں دے ودیارتھی موجودہ سکھیا پرنالی وچ تھوڑاں اتے سماجک انیاں دے خلاف آواز اٹھاؤندے ہن۔ نویں نویں وچار اتے لہراں ودیارتھیاں وچکار پرچلت ہو رہے ہن۔ سرکاری سیکٹر وچ تیز صنعتی وکاس دا پروگرام، لوکاں دے جیون پدھر وچ اسمانتا نوں ہٹاؤن دی کوشش، اک سماجوادی قسم دے سماج دی اساری --- ایہناں ساریاں چیزاں دی حمایت نوجوان کردے ہن اتے ایہ قدرتی گل ہے کہ لیکھک نویں سماج دی اساری وچ نوجوان طبقے دے رول ول اپنا دھیان دیون۔

ہندی دے لیکھک کاشی ناتھ نے اپنا ناول ''اپنا فرنٹ'' 1952، چھیویں دہاکے دے اخیر دی ودیارتھی لہر بارے لکھیا۔ تیلگو دے لیکھک کٹنبا راؤ دے ناول ''پنج کڑیاں'' اتے ''جیون'' وی پنجویں تے چھیویں دہاکے دی نوجوان پیڑھی دے بارے سن۔

کسے وی سچے لیکھک دی طرح امرتا پریتم وی سمے دیاں ہواواں وچ ساہ لیندی اتے اوہناں دے اثر ہیٹھ رچناواں لکھدی ہے۔

کی اوس دے پاتر گھول دے راہ تے چلدے ہن؟ امرتا پریتم اجہی ہی کجھ کوشش کردی ہے جدوں اوہ درساؤندی ہے کہ سرکار دے خلاف سپیچاں دین کرکے اوس دے پاتر نوں جیل بھیج دتا جاندا ہے اتے اوتھے اوہ کوتا لکھدا ہے۔ اتے ایہ کوئی اتفاق نہیں کہ اس دا جیل نمبر (جیت کترے) گورکی دے پاتر دے نمبر نال میل کھاندا ہے جاں ناول ''جلا وطن'' دے پاتر نوں ہی الو۔ اوہ اپنے آپ نوں اپنے ہانیاں مطابق ڈھال نہیں سکدا کیونکہ بودھک اتے آتمک وکاس وچ اوہ اپنے ساتھیاں نالوں کتے اگے ہے۔ اسے وچ امرتا پریتم نوں یوگ دے خاص چنھ دکھائی دیندے ہن۔ لیکن ہن تجربے کار امرتا پریتم اپنے پہلے ناولاں ''ایریل'' آدِ دی طرح ناولاں دا نراشاوادی جاں دکھانتک انت نہیں دیندی۔ نویاں رچناواں وچ کوئی صاف انت نہیں جس نال ساڈے نظریے وچ اوہ ادھوراپن اتے اسپشٹتا رہ جاندے ہن، جہناں دا اپنا مطلب ہے۔

ٹالسٹائی نے کیہا ہے کہ سچی کلا ہمیشاں پاٹھک نوں رچنا بارے سوچن اتے انت تک پہنچاؤن لئی مجبور کردی ہے۔

امرتا پریتم دے ناول ''ایریل'' (1968) اتے ''جیب کترے'' (1971) ساجھی سمسیا راہیں اک دوجے نال جوڑے ہوئے ہن۔ ناولاں دیاں گھٹناواں اکو سمے ہندوستان دے چھیویں اتے ستویں دہاکے وچ واپردیاں ہن۔ پاتراں وچ وی سانجھ ہے --- ایہ نوجوان اتے ودیارتھی ہن۔ پر جیکر پہلے ناول دا مکھ پاتر اپنی امروں زیادہ سیانا بودھک اتے بھاوک نوجوان ہے تاں ''جیب کترے'' دا نائک اپنی پیڑھی دا مثالی پرتیندھ ہے۔ رضیت اتے سماج دے ٹاکرے راہیں لیکھکا بھارتی جیون دی پرانی اتے نویں دھارا دے مت بھید نوں درساؤندی ہے۔

''جلاوطن'' دا نوجوان نائیک ملک اک پڑھیا لکھیا اتے سنجیدہ لڑکا ہے۔ اوہ پڑھائی ختم کرن توں بعد ایہ نہیں جاندا کہ کیہ کرے گا۔ کتاباں دے علاوہ اوس نوں کسے ہور چیز وچ دلچسپی نہیں اوس لئی کتاباں ہی سبھ

کجھ سن۔ ملک اتے اوس دے دوستاں دا جیون دلکش اتے شور شرابے والے موج میلے نال بھرپور ہے جو کہ ودیارتھیاں دی زندگی دا خاص لچھن ہے۔

ملک سچیاں اتے جھوٹھیاں قیمتاں بارے بہت سوچ وچار نال اس نتیجے تے اپڑدا ہے کہ اوس دا دوست جھوٹھیاں قیمتاں دے پچھے پے کے جال وچ پھسیا سی اتے اوس نے خودکشی اسے لئی کیتی سی۔ نوجوان دی اندرونی کھوج اتے نراستا دا کارن سماج نال ہون والی پھوتان ہے۔ پاتر سماج اتے اوس دیاں کپڑیاں دی طرح لاہ کے بدل لین والیاں قیمتاں نوں آسانی نال منظور نہیں کر سکدے، اسے لئی اوہ دکھی ہن۔ ناول وچ اندرونی جدوجہد دا کارن اندرلی دوچتی اتے ملک دی زندگی دے مطلب دی اتھل پتھل اتے دکھدائی بھال۔ تریجا نال رشتہ ملک دے چرتر نوں ہور ڈونگھا بناؤندا ہے، اتے ایہ دسدا ہے کہ اوس دے محبت بارے وچاراں نویں پیڑھی دے نوجواناں دے وچاراں نالوں کنے وکھرے ہن۔ پر اوس دا تریجا ول رویہ کیوں اتنا سنجم والا اتے شانت ہے؟ اوہ تریجا نوں ملن دی کوشش وی نہیں کردا، سگوں تریجا ہی اوس نوں ملن دا بہانہ ڈھونڈ دی ہے۔

پچھلے ناولاں وچ امرتا پریتم لئی سبھ توں کوڑا اتے دکھدائی سچ پروار دی جھوٹھی شانتی اتے گھر دے سکھ نالوں زیادہ قیمتی سی۔ کیہ اس دا مطلب ہے کہ ہن امرتا پریتم دی کلاتمک بھال وچ کجھ فرق پے گیا ہے؟ ناول وچ پیار دے گجھے کارناں دی گھوکھ توں ایہ پتا لگدا ہے کہ ملک تریجا دی ماں ول کجھ عجیب جذبہ محسوس کردا ہے، جیہڑا اوس نوں خود اپنے آپ نوں وی سمجھ نہیں آؤندا۔ ملک اتے تریجا دی ماتا دے وچکار کوئی عجیب دکھدائی مانسک دیوار ہے۔ اوہ تریجا نوں وی ایہ جذبہ کھول کے سمجھا نہیں سکیا۔ اسے لئی اوس دے جذبے وچ رکاوٹ، لکاؤ پنا آ دسن۔ دوجا کارن ایہ ہے کہ اوس لئی عشق زندگی دے مطلب توں وکھرا نہیں سی ہو سکدا، اوس لئی عشق واسنا دی پکار جاں لیول '' حلقہ سمبندھ نہیں سی ہو سکدا جو ین ایہ اوس لئی سی جس نے تریجا دی سہیلی نوں دھوکھا دتا۔ اوس لئی عشق وچ کس طرح دا سمجھوتا، دھوکھا جاں ہولا پن نہیں سی ہو سکدا۔ اس لئی امرتا پریتم جذبات نال سمبندھت اپنے سبھ توں اہم اصول تے قائم ہے اتے ایہ کیس وچ ایہ سارے کارن جذبے دے پوری طرح کھل کے ساہمنے نہ آؤن دی وجہ بندے ہن۔

ناول دا ناں '' جلاوطن '' اسے لئی ہے کہ لیکھکا نے نائیک نوں عشق اتے خوبصورتی ول اپنے نظریے دے سلسلے وچ اپنے ساتھیاں نالوں کتے اچا درسایا ہے۔ اوہ جویں کہ اپنے دیش وچ ہندا ہویا وی جلاوطن ہے۔ اس کردار وچ امرتا پریتم نے سبھ توں سوہنے تے اچے چنھ اکٹھے کیتے ہن۔ ایہ کردار نویں بھارت دا،

اوس دے بھوکھ دا چنھ ہے۔ امرتا بھارت دی نوجوان پیڑھی وچ اجیہے لچھن ہی ویکھنا چاہندی ہے۔ اوہ چاہندی ہے کہ نوجوان سیانے اتے وچارشیل ہون۔ ناول وچ ملک دا کردار منو وگیانک اتے ودیاک پکھاں توں دلچسپ ہے۔ اوس دا ذے واری دا احساس اتے وکاس بارے وچار بہت نویں ہن۔ مکھ نائک دی سوچ سمجھ راہیں امرتا پریتم اس ناول وچ نوجوان طبقے دی منووگیانک اوستھا نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے۔ ''وقت میرے نال کی کر رہیا ہے؟ کیہ کرے گا؟ اتے وقت نے میرے نال کی کیتا، کیوں.....؟''

ویہویں صدی دے ستویں دہاکے وچ نواں سماں نوجواناں دے جیون وچ پلاڑی جہاز اتے ایٹم اتے جت دی آواز ہے روپ وچ پرویش کردا ہے۔ ایہ سماں نویں رواج، نویں وچار، نویں بودھک پدھر، نواں رویہ، سبھ کجھ پیدا کردا ہے، جس دے نتیجے وجوں نویاں سمکاناں اتے انتر ویرودھ پیدا ہندے ہن۔

نائیکہ دی سوچ وچار، اوس دی اپنے اندر دی اوکھ، جو کہ پیدا ہندی بیگانگی (alienation) اتے اثر پاؤندے ہن، شاید بھارت وچ واپردی حقیقت نوں صحیح درساؤندے ہون، پر اوہی سوچ وچار پاٹھک نوں بہت اہم مسئلیاں توں ہٹا کے اندرلے ''میں'' وس موڑ کے لے جاندے ہن۔ زیادہ کر کے ناول ''جلاوطن'' پرانے اتے نویں اخلاقی اصولاں دی تھوڑ نوں درساؤندا ہے۔ اجیہے سماج وچ سفلتا کی چیز ہے؟ دوجے دی جیب وچوں پیسہ کڈھنا۔ جو زیادہ پیسے کھچ سکے اوہی زیادہ کامیاب منیا جاندا ہے'' ناول وچ امرتا پریتم بڑی سوکھتا نال نویں پیڑھی دی سوچنی وچ ونگ ولیویاں اتے گنجھلاں وچ جھات پاؤندی ہے۔ ساڈے وچار نال وڈیہون نال سمبندھت گنجھلاں اتے ''بیماریاں'' جو کہ سبھاوک ہی ہن زیادہ چنگی طرح ناول ''جیب کترے'' وچ درسائیاں گئیاں ہن۔

بھارتی آلوچکاں نے نویں ناول وچ بڑی دلچسپی وکھائی اتے زیادہ تر آلوچکاں دا کہنا سی، امرتا پریتم نے ناول وچ نوجوان پیڑھی، جس نوں کہ بہت وڈیاں اوکڑاں دا ساہمنا کرنا پیندا ہے، نال ہمدردی نہیں وکھائی، سگوں اوس نوں اپنا پیار اتے لاڈ دتا ہے۔

ناول ''جیب کترے'' دی وشے وستو دا ذکر کردیاں بھارتی آلوچکاں نے ایہناں دی تعریف کیتی۔ ڈی۔ این۔ کلاہن نے اس ناول نوں ہلکی ہون دے نال نال کٹھور کہانی دسدیاں کیہا کہ ناول ''جیب کترے'' ویہویں صدی دے اتم ناولاں وچوں اک ہے۔

ناول دا مکھ ڈھانچہ امرتا پریتم دے اپنے بیٹے دے ودیارتھی جیون اتے آدھارت ہے۔ ودیارتھیاں

اگے آؤندیاں ساریاں سمسیاواں نوں کھل کے دسن توں بعد لیکھکا پاٹھک نوں نوجواناں دی قسمت بارے سوچن تے مجبور کردی ہے۔

ناول دا مکھ پاتر، انجینئری دا ودیارتھی کپل اتے اوس دے متر اپنا تقریباً سارا سماں اک پرانے سن مسان عمارت ''شانتی گھر'' وچ گزاردے ہن، جتھے کوئی گندگی، کٹڑ پنا اتے عیش پرستی نہیں۔ اس تھاں تے اوہناں نوں گل بات اتے بحث کر کے شانتی ملدی ہے۔ اوہ اپنے اگے کھڑے مسئلیاں نوں سلجھاؤندے ہن، ''سنسکرتی دے جنسی (salirtic) وکاس'' تے افسوس کردے ہن، ودھدی بے روزگاری تے رؤس پرگٹ کردے ہن۔ اتے اجے کتھن کہ ''اسیں بھوکھ نال، سے نال تے ڈر نال کھیڈ رہے ہاں'' صرف ایہ درساؤندے ہن کہ اوہ ''سگریٹ دے کدے کڈھے دھوئیں دی طرح'' اپنے نجی درد نوں بھلا سکدے ہن۔ نوجوان بے صبری نال کسے روشن دن نوں ویکھن دی لالسا رکھدے ہن۔ کیہ ایہ ممکن ہے؟ جے ہے تاں کس حد تک؟ لیکھک ایہ سوال کھڑے کردا ہے۔ لیکھکا نہ کپل نوں تے نہ ہی ونود جاں تنویر نوں آدرشاؤندی ہے۔ ایہناں ساریاں دے دکھانت راہیں امرتا پریتم کل ملا کے پیڑھی دے سوال نوں کھڑا کردی ہے۔

نوجوان کلاکار ونود دا ہنر پوری طرح پھل پھل نہیں سکدا۔ سماج سمپورن کلا نہ چاہ کے اک طرح دیاں تصویراں ہی پسند کردا ہے کیونکہ اصلی کلا تاں اک اجیا شیشہ بن سکدی ہے جس وچ سماج اپنے آپ نوں ویکھ سکے۔ ایہ سماج ہی پہلے نمبر دا ''جیب کترا'' ہے۔ جس نے نوجواناں دی کلا دے ودھن پھلن دے حق نوں اپنی جیب وچ چھپا لیا ہے اتے اس سماج دا انش جوزف ورگے آدھم پک ہن، جنہاں نے ''جیب کتریاں'' دی طرح انسانیت دے اصول نوں اپنی جیب وچ چھپا لیا ہے۔ اپنے ہونہار کوی ودیارتھی دے ہنر دی پرواہ نہ کر کے اپنی عزت اتے سفلتا دے لئی اوہ آسانی نال تنویر نال نجٹھ لہندا ہے اتے اوس دی اہمیت لئی ساری یونیورسٹی موجود ہے۔ یونیورسٹی دی پربندھک سنستھا بارے لیکھکا نے لکھیا ہے،''انسانیت اتے سوجھ بوجھ یونیورسٹی پربندھکاں دی سمجھ توں پرے سن۔''

وا پردیاں گھٹناواں نوں سمجھن دی کوشش کپل کئی طریقیاں نال کردا ہے: ونود راہیں، تنوہر، اشوک، شیریں اتے ریکی راہیں اتے ہار کے اس نتیجے تے پہنچدا ہے کہ -- ساڈے وچوں کوئی وی ایسا نہیں جس دے اندروں کجھ ٹٹے دی طرح بھونکدا نہ ہووے۔'' کئی واری اوس دے وچاراں وچ کوئی سلسلہ نہیں ہندا، لیکن اس نال صرف ایہی پتا لگدا ہے کہ اوس دا اندرونی درد، خیالاں دی اتھل پتھل اتے حقیقت نوں سمجھن دی کوشش

وچ کِنی گہرائی سی، اوہ صرف زندگی دے ویہن نال ترن والا نہیں سی، سگوں واپردیاں گھٹناواں نوں سمجھن دی کوشش کردا سی، سماجک انیاں دے کارناں دی پڑچول کرن والا، پچھوکڑ نال مقابلہ کر کے ویکھن والا اتے بھوک وچ جھات پاؤن والا نوجوان سی۔

کپل دی دوستی رِکی ناں دی کُڑی نال سی لیکن رِکی دے ماں باپ نے اوس نوں اپنے ساتھیاں نال ملن توں، جاں اوہناں نوں عمارت وچ آؤن توں روک دتا سی، کیونکہ اوہناں نے رِکی لئی لڑکا لبھ لیا سی۔ اوس نوں تالے اندر بند کردتا جاندا سی، اتے اک وار اوس نوں دیر نال گھر پرتن وجوں مار دی پئی۔ اخیر اوس نے اعلان کر دتا کہ جے کر اوس کول پیسے ہندے تاں اوہ وی تنویر دی طرح پردیس چلی جاندی۔ سال گزر گئے۔ شیریں دی طرح اوس نوں سبھ دی ویاہتا جیون وچ سمجھ اتے وفاداری، جنہاں دی اوس نوں سبھ توں زیادہ تلاش سی، نہیں ملے۔ باہروں ویکھن نال اوہناں دی ویاہتا زندگی حالاں وی ٹھیک ٹھاک سی، لیکن اپنی جوانی دی کشش، کپل نال صرف اک ملاقات تے اوہ اپنا سبھ کجھ لٹاؤن لئی تیار سی۔

رِکی دی طرح سویتا وی آخری سال دی ودیارتھن سی۔ کسے گھٹنا کارن اوس نوں اپنے نال پڑھدے منڈے روی نال لگاؤ ہو گیا۔ اک دن شامیں منڈے کڑیاں سُوئے دے کنڈے تے گئے۔ واپس آؤندیاں تن سواراں والا موٹر سائیکل، جس اُتے روی وی بیٹھا سی، ہنیرے وچ اُلٹ گیا۔ اوس دے سر تے ڈونگھی سٹ وجی اتے سویتا اوس دے نال ہی رہ گئی، تاں جے لوڑ پین تے اوس دی مدد کر سکے۔ اوہ اک دوجے دے دوست سن۔ اگلے دن واپس آ کے ہوسٹل وچ اوس نے اپنی غیر حاضری دا کارن دسیا۔ ہوسٹل دی وارڈن نے اپنی رپورٹ وچ لکھیا کہ روی اوس دا رشتے دار نہیں، کوئی انجان ویاکتی ہے۔ اس لئی جدوں اوہناں کولوں صفائی منگی، تاں اوہناں نے کہیا کہ اوہ اک دوجے نال ویاہ کرن دا ارادہ رکھدے ہن۔ اوہناں دے گھر خبر کر دتی گئی۔ سویتا ڈردی سی کہ اوس دے ماتا پتا اوس نوں گھر لے جان گے۔ اوہ چنگی ودیارتھن سی، اتے اگے ریسرچ کرن دا ارادہ رکھدی سی۔ اس لئی اوس واسطے جلدی جلدی روی نال ویاہ کرن توں علاوہ کوئی چارا نہیں سی۔

نوجوانی دے جیون درشن وچ امرتا پریتم دی، اوہناں نوں اتے اوہناں دیاں مصیبتاں نوں سمجھن دی کوشش دسدی ہے۔ پر ایہ کوئی نویں زندگی دے انت والا دکھانت، جو کہ ایہ کوئی آلوچکاں نوں لگدا ہے۔ اجیہی دلیل سندیہ۔ رہت نہیں جاپدی، کیونکہ امرتا پریتم حالات نوں سرل کیتے بغیر، سماج نوں جنگ لگن دے کارناں دی بھال کردی ہے، نہ کہ اوس دی ''تباہی'' دے۔

لیکھکا دو پیڑھیاں وچکار پئے پاڑے دے کارناں دا وستھار کردی ہے، اتے اوہناں دے آپسی سمبندھاں وچکار آوندیاں مشکلاں نوں بیان کردی ہے۔ سویتا دی کہانی اک اُدھارن دی طرح دتی گئی ہے، ایہ سماج دی گل بیماری دی اک علامت ہے۔ اک پرمپراگت پریوار وچ جنمی اتے پلی سویتا اپنیاں نجی خوشیاں دی قیمت تے وی پرانیاں پرمپراواں نالوں توڑن دی کوشش کردی ہے۔ وِدیا نے نہ صرف اوس دی سماج نال لڑائی نوں مکاؤن وچ مدد نہیں کیتی، سگوں اس لڑائی نوں ہور ودھا دتا۔

امرتا پریتم بھارتی بورژوا سماج، جس وچ نفع اتے نقدی دے سدھانت انسانی قدراں اتے ضمیر توں زیادہ ضروری ہن، نوں جھنبدی ہے۔ لیکھکا ایہ درساؤن دی کوشش کردی ہے کہ پونجی وادی سماج دے پرانے کٹھور سدھانتاں اتے نویں زندگی وچ ڈونگھا پاڑ ہے۔

سماج کپل ورگے ایماندار، نویں زندگی دے چاہوان نوجواناں اتے اوس ورگیاں لڑکیاں نوں سمجھدا اتے سویکاردا نہیں۔ کپل دا بمب اک نویں بھارتی نوجوان دا نمونہ ہے، اوس وچ بھارت دی نویں پیڑھی دے سارے چنگے گن -- ایمانداری، شرافت، سیانپ اتے اندورنی خوبصورتی آدِ-- ہن اتے اس پکھوں اوس دا بمب ناول ''جلاوطن'' دے ملک نال بہت ملدا جلدا ہے۔

امرتا پریتم نوجوان پیڑھی دیاں تانگھاں، جتن اتے حقیقت وچکار فرق نوں درساؤندی ہے اتے ایہ دی دکھاؤندی ہے کہ جیون دے ہر پکھ وچ حصہ لیندیاں ہویاں وی، اوہ کسے چیز نوں بدل سکن توں اسمرتھ ہن، اتے اوہناں نوں، سماج نوں بدل دین دے طریقیاں دا نہیں پتا۔ لیکھکا نوجوان پیڑھی ول اگانہ ودھو بھارتی پونجی وادی سماج دے درشٹی کون توں دیکھدی ہے اتے ایہ نہیں دسدی کہ کیہو جہے نوجوان سماج نوں بدل سکن دی سمرتھا رکھدے ہن۔

امرتا پریتم دا نظریہ ہے کہ سماج وادی تبدیلیاں وچ اک گھاٹ ہے اتے اوہ ہے نجی آزادی دی لوڑ۔ نویں سماجک رشتیاں دے حق وچ دلیل دیندیاں امرتا پریتم نال ہی نال پونجی وادی سماج دے گل گھوٹو وارتاورن دی گل کردی ہے، جس وچ انسان اپنی شخصیت نوں گوا دیندا ہے۔ ایتھے امرتا پریتم دے سماجک آدرشاں وچ اک آپسی وِرودھ ویکھن نوں ملدا ہے۔ جویں کہ نامور سنگھ نے وی کہیا ہے کہ اس دی وجہ بھارت دے پیچیدہ، آرتھک اتے راجنیتک حالات ہن، جنہاں دی ویاکھیا کرنا بہت مشکل ہے۔

ناول دا چھپنا بھارت دی ساہتک زندگی وچ اک وڈی گھٹنا سی اتے اس نال لیکھکا دے کلاتمک

ہنر دا پتا لگدا سی۔ ناول وچ بڑی سوکھمتا اتے نال ہی نرمی نال آپ ہُدرے اتے روکے نہ جاسکن والے نوجواناں دے جیون نوں درسایا گیا سی۔ ایسے قلمائی ڈھنگ نال چھویں دھاکے دی نوجوان پیڑھی دی اخلاقی حالت نوں درسایا گیا ہے۔

سماجک حالتاں نوں سپشٹ طور تے وکھاؤن لئی امرتا پریتم نے ٹلناواں دا سہارا لیا ہے، جہڑیاں پہلے نالوں سپشٹ اتے گھٹ جذباتی ہن: انسان اک پنڈولم ہے، حقیقت ''کالا دروازہ ہے'' آدِ۔

شروع دی گلپ شیلی وچ دِسن والی شبداں اتے واکاں دی گہرائی ستویں دھاکے دیاں رچناواں وچ وی صاف دسدا ہے۔ جان کے انگریزی زبان دا زیادہ استعمال کر کے امرتا پریتم اصلی ورتارے نوں درساؤندی ہے''ودیا دے کھیتر وچ راج نیتی، نوجواناں دا زبان ول رویہ، اوہناں دی سماجک پدھر، اتے اس توں ودھ کے باہرلیاں طاقتاں دے اثر نوں۔

ناول ''جلاوطن'' اتے ''جیب کترے'' وی منوویگیانک -- امرتا پریتم دی مہارت دی مثال ہن۔ سبھ توں پہلی گل ایہ ہے کہ امرتا اپنے ولوں ٹپیاں دین توں سنکوچ کردی ہے، پاٹھکاں نوں گھٹناواں ول اوہناں نظراں نال ویکھن لئی مجبور کردی ہے، جہناں نال مُکھ پاتر ویکھ رہیا ہے۔

ناول دے پلاٹ دا ڈھانچا کوئی بہتا سپشٹ نہیں، گھٹناواں وچ ہمیشہ ترتیب نہیں دِسدی۔ خاص طور تے ناول ''جیب کترے'' وچ گھٹناواں وچکار باہری سمبندھ بہت گھٹ ہے، اوہناں دی ترتیب مانسک پریرنا نال کیتی لگدی ہے۔ ایہناں ناولاں وچ گھٹناواں ترنگاں دے روپ وچ واپردیاں ہن، جہڑیاں مُکھ پاتراں دے منوویگیانک سوچ وچار وچ پرتکھ ہندیاں ہن۔

ناول ''جیب کترے'' وچ کپل دے ہر دوست بارے سوچ وچار نوں اک وکھرا کانڈ سمرپت ہے۔ اُپروں اوہناں وچ کوئی آپسی سمبندھ نہیں جاپدا، لیکن اندرلا سمبندھ ظاہر ہے، کیونکہ ہر پاتر دی نجی زندگی اتے سماج وچ ڈونگھا سمبندھ ہے۔ ایہ سوچ وچار کئی تھاواں تے کہانی دے ویگ اُتے چھا جاندے ہن، اتے اوہناں نوں پڑھن لئی پورے مانسک دھیان دی لوڑ پیندی ہے۔ اتے جے ایہناں ناولاں نوں اندرلے روپ دے پکھوں ویکھیا جائے، تاں ایہناں نوں سماجک منوویگیان دیاں رچناواں دا درجہ دتا جاسکدا اے۔

ایہناں ناولاں دی اک ہور خاصیت ول دھیان دواؤنا ضروری ہے۔ ایہ ہے سمے وچ کٹوتی۔ ناول ''جیب کترے'' دے اٹھویں کانڈ وچ کالج دے اخیرلے دناں دی گل ہو رہی ہندی ہے اتے نوویں وچ

اک دم اوس توں تن چار ورھے بعد دیاں گھٹناواں دا ذکر ہندا ہے۔''جیب کترے'' وچ پہلے کانڈ نے کجھ دا کاں وچ ہی پچھلے پورے سال دیاں گھٹناواں دا ذکر کردتا جاندا ہے، جس نال ناول وچ اُٹھائے گئے مسئلیاں ول پورا دھیان دین وچ مدد ملدی ہے۔

ناول دے سمے وچ، بھو کھا تے پچھوکڑ دا ہیر پھیر --- ایہ سبھ اجیہیاں چیزاں ہن، جنہاں دی ورتوں لیکھک نے جان بُجھ کے ناول دی گہرائی نوں ودھاؤن لئی اتے اوس وچ لئے گئے اصلی سوالاں نوں اُبھارن لئی کیتی ہے، اتے ایہ ودھیاں نویں قسم دے ناولاں دا پرتیک وی ہن۔ امرتا پریتم دی پراپتی ایس وچ ہے کہ اوہ نویں ڈھنگاں دی ورتوں توں سنکوچ نہیں کردی اتے اپنیاں رچناواں وچ نویں قسم دے ناول دیاں ودھیاں نوں ابھاردی ہے۔ وِشے وستو دے پکھوں نویں ناولاں ''جیب کترے'' اتے ''جلاوطن'' وچ کافی سانجھ ہے۔ دوہاں ناولاں دا منکھتا وادی رخ اس وچ ہے، کہ امرتا پریتم اخلاقی قیمتاں دی تبدیلی دے سوال نوں نویں پیڑھی دے نال جوڑ دی ہے اتے اس دا فیصلہ سماجک ڈھانچے وچ ہویاں تبدیلیاں دے نال جوڑ کے کردی ہے۔

پنجابی اتے پورے بھارتی ساہت وچ وی پلاٹ دی ملکیت دا کوئی وڈا مول نہیں سی گنیا جاندا، بھ توں ضروری وستو المکارک بھو پکھتا گنتی جاندی سی۔ اپنے مڈھلے ناولاں دی طرح چھیویں اتے ستویں دھاکے دیاں گلپ رچناوان وچ وی امرتا پریتم تکھے پلاٹاں دی بھال نہیں کردی، سگوں المکارک پکھ دا وکاس کردن دی کوشش کردی ہے۔ اتے اس پکھ وچ اوس نوں گھٹ شبداں دی ورتوں کر کے بہت ڈونگھے مطلب کڈھن وچ سفلتا ملدی ہے۔ امرتا پریتم دے المکارک سادھارنیکرن وچ نویں حقیقت دی پوری بہو پکھی جھلک، اصلی جنوادا اتے جذبات اُتے ڈونگھا اثر ویکھن نوں ملدے ہن۔ ایہناں ساریاں صفتاں دے میل کارن اوس دیاں رچناواں انوکھیاں اتے بے جوڑ بن جاندیاں ہن۔

امرتا پریتم دے چھیویں اتے ستویں دھاکے دے ناولاں وچ پنجابی وارتک وچ اک نویں دِشا ویکھن نوں ملدی ہے۔ ایہناں وچ وِکھی سانجھ (perspective) دا انش ہے۔ جس ولوں کجھ دکھ دکھ گھٹناواں عام تھتی دا پرتیک بن جاندیاں ہن۔ اس دا مطلب ایہ ہے کہ دیوی، کامی، چیتنا، الکا، سوِیتا اتے کپل دے ہمب صرف کجھ پاتراں دے مثالی لچھناں نوں نہیں درساؤندے، سگوں کلاکارولوں درسائی گئی زندگی دی گل اوستھا دا روپ ہن۔

امرتا پریتم دیاں رچناواں دے کلاتمک ڈھانچے وچ دلیل وی ایسے سادھارنیکرن دے سدھانت نال سمبندھت ہن۔ پلاٹ، جاں اوس دا نرنتر وکاس ہی صرف رچنا دے مکھ وشے نوں ابھارن دا طریقہ نہیں رہ جاندے۔ گھٹناواں دا باہرلا ٹکراء اوس دیاں رچناواں وچ اندرلے ٹکراء نوں صاف اُبھارن دی بجائے اوس ول اشارہ کردا ہے۔ ایسے کارن لیکھکا دیاں رچناواں وچ اک خاص سنکیتکتا، منووگیانکتا اتے دارشانک گہرائی پیدا ہندے ہن۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

جسبیر بھلر
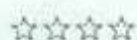
ترڑ کے گھڑے دا پانی

امرتا پریتم نوں اپنی موت دی اڈیک بڑے چرتوں سی، اودوں توں ہی جدوں اوس لکھیا سی:

''میں ترڑ کے گھڑے دا پانی

کل تک نہیں رہنا۔''

..... تے مینوں امرتا نال ہوئی ہر ملاقات آخری لگن لگ پئی سی۔ اوہ، جہنے بھرپور زندگی جیوی سی، عمر بھر صحبت لئی ساہ لئے سن، میرا اوہدے نال بہت گلاں کرن نوں جیا کیتا سی۔

..... تے میں گفتگو کتاب لئی ملاقات وہونت لئی۔ اودوں امرتا دماغی طور اتے پوری سچیت سی پر سریر ڈنگو ڈنگو کردا مکان سی۔ اوہدے لئی اٹھنا، بیٹھنا وی محال سی۔ امرتا نے آکھیا، ''جسبیر ..... گلدا ہے، ایہ سمجھو نہیں۔ میں بہت تھک جاندی ہاں۔ توں اس طرح کیوں نہیں کردا، کچھ سال کاغذ اتے لکھ دے۔ میں جدوں وی راضی ہوئی جواب لکھ دیاں گی۔''

دلی توں واپس آ کے میں سوال بھیجے سن، اک وار نہیں، ..... دو وار نہیں، ..... پورے تن وار۔ امرتا دے خستہ حالت سریر نے راضی نہیں سی ہونا۔ ایہ میں وی جاندا ساں تے اوہ وی، پر اوہنے بیماری وچ ہی اوکھیاں سوکھیاں جواب لکھے سن۔

چوتھی وار دی سوالاں دی فہرست توں پہلاں امرتا دا فون آیا سی۔ اوہدا ہاسا چھنکیا سی، ''جسبیر، کیہ گل پورا دیوان لکھن دا ارادہ ہے۔''

میں امرتا دے اوس ہاسے وچوں درد دی پیڑ نپ لئی سی۔

.... تے میں سوالاں دی چوتھی فہرست امرتا نوں نہیں ساں بھیج سکیا۔

وقت ریت درگا سی؛ مٹھاں وچ پھڑیا نہیں سی جا سکیا۔ انگلاں دیاں ورلاں وچوں کر رہیا سی۔ بس.

کر رہیا سی۔

جدوں امرتا پریتم نوں 'پدم وبھوشن' نال سنمانیا گیا تاں میں فون کیتا سی۔ امرتا پریتم نے ہیڈسٹ اکثر اپنے کول ہی رکھیا ہنداسی۔ مینوں لگا، ہنے میں امرتا دی آواز سناں گا، ''ہیلو جسبیر!''

پر فون دا جواب امروز نے دتا سی، ''توں اپنی دیدی نال گل نہیں کر سکیں گا۔ اوہ جیوندی ہے، پر اس دنیا نالوں اوہنے ناتا توڑ لیا ہے۔ اوہ اپنے اندر ہی کسے ہور دنیا وچ بیٹھی ہوئی ہے۔''

میں اداس ہو گیا ساں۔

اگلیرے دن دلیپ کور ٹوانا نے دسیا، ''سنمان والے دن میں اک ڈیڈھ گھنٹہ امرتا امروز دے گھر رہی ہاں۔ امروز مینوں امرتا دے کمرے وچ لے گیا سی تے عام نالوں کجھ اچی سروچ اوہنوں مخاطب ہویا سی ''ویکھ ملکہ! دلیپ تینوں ملن آئی اے۔''

امرتا دیاں اکھاں وچ کوئی پچھان نہیں سی جاگی۔ اوہ خلاء ول ویکھدی رہی سی۔

کجھ دن پہلاں ہی میں سکھ ساند پچھن لئی فون کیتا سی۔ پتہ لگا امرتا کجھ نہیں سی منگدی، کجھ نہیں سی آکھدی۔ اوہدی لوڑ دا انداز امروز نوں خود ہی لاؤنا پیندا سی۔

میرے کول پے سوالاں والے کاغذاں نے ہوکا بھریا سی۔

میں امرتا نوں جد کدی وی ملیا ساں، اوہ بیمار سی۔ جدوں امرتا پریتم دا سریر بیماریاں دی ٹھار بن گیا تاں اسیں کجھ دوستاں نے رل کے سوچیا، امرتا ہوراں کول کجھ دن رہ کے آئیے۔ کی پتہ، فیر آخری میلا ہووے نہ ہووے۔

اسیں آپو اپنے گھراں وچ رجھے ہوئے ساں۔

ایہ گل ویہہ کو سال پرانی ہے۔

امرتا پریتم دیاں بیماری دی گنتی ہولی ہولی ودھدی رہی سی۔ گھن سریر نوں کھاندا رہیا سی۔ اوس گھن نوں برداشت کرن دی پیڑ امرتا دے چہرے اتے وی صاف دسن لگ پئی سی۔

میں امرتا پریتم نوں اپنیاں لتاں آپ گھٹدیاں وی ویکھیا سی تے گوڈیاں اتے دوائی دا لیپ کردیاں وی۔

اوہدے پینڈے دے راہ وچ بھکھر ا سی تے اوہ ننگے پیریں سی۔

نکیاں، وڈیاں گھٹناواں اوہنوں اگلواںڈھی ہو کے ملدیاں رہیاں سن۔ زندگی دے ایہو جہے ورتارے دا سمبندھ اوہدی صحت نال وی سی۔

ہندی دی ناول کارہ کرشنا سوبتی نے اک شبد 'زندگی نامہ' دی ملکیت دا مقدمہ امرتا پریتم اتے کیتا ہویا سی۔ اوہ آکھدی سی زندگی نامہ اوس دا گھڑیا ہویا شبد سی۔ زندگی نامہ اوس دے ناول داناں وی سی۔ امرتا پریتم نے اپنے اک ناول داناں 'ہردت دا زندگی نامہ' رکھ لیا تاں شبد دے حق حقوق دا مقدمہ چھڑ پیا۔

شبد تاں لوکاں دے ہندے نے، بھاویں کوئی وی ورت لئے۔

مینوں اس مقدمے دی کدی سمجھ نہیں سی لگی۔

------

12 اگست 1991 دی تاریخ والی امرتا دی اک چٹھی مینوں ملی سی.... ''میری طبیعت بہت چنگی نہیں، انج ہلی ہوئی ہے، جے سٹیرن نہ پوے تاں۔ ہن تیراں ستمبر نوں تاریخ ہے، میرے 'اتہاسک مقدمے' دی۔ اپریل دا مہینہ وی پہلی توں لے کے پندراں تک اوسے دے لیکھے سی۔ پر جولائی وچ تاریخ لگی سی۔

''اکھراں دے اوہ ڈنگ پتہ نہیں کدوں تک بھگتاؤنے ہن۔''

مقدمہ، جو سالاں توں چل رہیا سی، امرتا موئی تاں اوہ وی مک گیا۔

امرتا ہمیشہ توں سوہنی سی۔

اوہدا دل وی ایہو کردا سی کہ سوہنی سوہنی ہی دسے۔

اوہ گلاں کردی سی تاں ایہہ کرشمہ وا پر جاندا سی۔ اوہ ہان پروان ہو جاندی سی۔ اوہدی عمر کدھرے پرانہہ رہ جاندی سی۔

بس، صرف اک وار اس طرح نہیں سی ہو سکیا۔

میں اودوں مدت بعد دلی گیا ساں۔ امرتا نوں ملے بناں پرت آؤنا تاں واجب نہیں سی۔

امروز نے آکھیا، ''جسبیر! توں امرتا نوں نہ مل۔''

میں بضد ساں، فیر بہت نہیں میں دیدی نوں کدوں ملاں۔ اج توں پچھوں کدی مل وی سکنا سی کہ

نہیں، مینوں کجھ پتہ نہیں سی۔

امروز اندر چلیا گیا۔ امرتا نے اوہدے ہتھ سنیہا بھیجیا، ''جسبیر نوں کہو، بس دو منٹ لئی آجاوے۔''

میں اندر گیا تاں میرا ترپہ نکل گیا۔

میری نظر ساہنویں ہڈیاں دی مٹھ   کو بھر امرتا اپے سرہانے اتے بیٹھی ہوئی سی، تھکی تھکی، ٹٹی ٹٹی۔ ہنے اوہنوں دو جنے چک کے باتھ روم لے کے گئے سن۔ غسل خانے وچوں باہر آؤن تک اہ بہت ہف گئی سی۔ مڑھکو مڑھکی ہو گئی سی۔ بس فیروی چادر دی بکل مارلئی سی۔

مینوں ویکھ کے اوہدے کولوں مسکرایا نہیں سی گیا۔

مینوں کسے نے اندروں دسیا، میں امرتا نوں آخری وار مل رہیا ساں۔ میرا من بھر آیا۔

میں اوتھے بیٹھ نہیں ساں سکیا۔ میرے کولوں کوئی گل وی سانجھی نہیں سی ہوئی۔ سوچداں ہاں، آخری وار تاں ویدی نال کجھ گلاں کر لیندا۔

میں بھریاں اکھاں لکا کے باہر آگیا ساں۔

دلی توں واپس موہالی پہنچ کے وی میں کئی دن اداس رہیا ساں۔

اک دن میں امرتا پریتم دی سانبھ کے رکھی ہوئی عکس پرانی تصویر باہر کڈھ لئی۔ اوہ تصویر مینوں اک وار امروز نے دتی سی۔

تصویر فریم کرواکے میں اپنے لکھن پڑھن والے کمرے وچ لٹکا لئی۔

میں چاہوہنداساں، اوس تصویر ورگی امرتا میرے چیتے وچ رہے۔

امرتا پریتم دی صحت دا حال میرے کول پہنچدا رہیا سی، کدی ڈاکٹر دلیپ کور ٹوانہ راہیں، کدے امروز راہیں تے کدی پٹیالے والا محبتی سریندر شرما دکھ درد دا حال پھرول کے بیٹھ جاندا۔

پہلوں اوہ بسترے نال بستر اہوئی، فیر اوس دی ہوش گواچی۔ کجھ سماں اوہ ڈبنوڈبنو کر دی اکھاں اگھیڑ دی لیندی۔

..... تے فر اک ویلا اوہ وی آیا، اوہ سار لیندی رہی پر ذہنی طور تے کتے ہور تر گئی۔

امروز نوں لگدا، امرتا داپا ساتھک گیا ہووے گا۔ اوہ اوہدا پاسا پرت دندا۔

امروز نوں لگدا، ملکہ نوں بھکھ لگی ہووے گی، اوہ چمچے نال اوہدے منہ وچ سوپ پا دیندا۔

امروز نوں لگدا، بر کتے دا بستر امیلا ہو گیا ہے، کپڑے بدلن والے نے، اوہ.....۔

امرتا پریتم دی تیمارداری کردیاں امروز نت دن وڈا ہندا رہیا۔

اوس ویلے ساہ امرتا دے جیون دی نشانی سن تے فر اوہ ساہ وی مک گئے۔

اوہ جو بہت سوہنی سی، اپنا سپن اکھراں دے پلے بنھ کے ترگئی۔

اوس دن مہینے دی 31 تاریخ سی، ایہو تاریخ امرتا دے جنم دن دی وی سی۔

امرتا پریتم دی موت توں پچھوں میں حالے تک دلی نہیں گیا۔

K-25 حوض خاص حالے وی اوتھے ہی ہے، فیر وی لگدا ہے اوتھے نہیں۔

اپنے یقین لئی میں اک دن اوتھے جاواں گا ضرور۔ مینوں پتہ ہے، ہن وی سارا کجھ اوسے طرح ہی ہے۔ اوپرلی منزل تے کنداں رہندی ہے تے زمینی منزل تے نوراج۔ وچکارلی منزل امرتا تے امروز دی سی۔ ہن وی ہے۔ امرتا چلی گئی، پر غیر حاضر نہیں ہوئی۔ ہن وی میں بوہے دیاں سوہے رنگ دیاں گھراں اتے لکھی امرتا دی نظم پڑھاں گا:

پرچھاویاں نوں پکڑن والیو
چھاتی چ بلدی اگ دا/ پرچھاواں نہیں ہندا۔

میرے پیر اوتھے ہی تھم جان گے۔ میری نظر نوں دوسرا بوہا بول لویگا تے اوس بوہے دی نظم نوں وی میریاں اکھاں سجدہ کرن گیاں:

اک درد ہے
جو سگرٹ دی طرح میں چپ چاپ پیتا ہے
کجھ نظماں ہن / جو سگرٹ دے نالوں
میں راکھ وانگ جھاڑیاں۔

میں امرتا دے کمرے وچ پیر دھراں گا۔ اوتھے میں امرتا نوں محسوس کراں گا۔ اوس بستر نوں چھوہ کے ویکھاں گا، جتھے اوہنے ادھ لیٹیاں اتھاہ ساہت رچیا سی۔

اوہ بستر اتے میں اک پل تھر کے پرت آواں گا۔

میں جاندا ساں، کجھ ہور ورھے بیتن پچھوں اوہ گھر کج زندگی جیو رہیا ہووے گا۔ پر اوددوں اوتھے امروز نے نہیں ہونا۔

جے اوددوں میں ہو یادی تاں کج بھاK-25 حوض خاص دیاں پوڑھیاں نہیں چڑھ سکاں گا۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

جسونت دید

سچو سچی دس وے جوگی

(امرتا ہوراں بارے فلم، یاداں تے کوتا بارے گل بات)

میں جالندھر دوردرشن ولوں لیکھکاں دے جیون تے رچناواں تے آدھارت دستاویز فلماں بناؤن دا وچار بنایا تاں سبھ توں پہلی شخصیت جیہڑی میرے من وچ آئی اوہ 'امرتا پریتم' سن۔ امرتا ہوراں دی طبیعت ناساز ہون کارن مینوں اوہناں تے فلم بناؤن لئی کجھ دیر رکنا پیا۔ اک دن میں دلی آیا تاں اوہناں نوں ملیا۔ اوہ اجے وی بیمار چل رہے سن۔ امروز نے بوہا کھولیا تے میں امروز دے پچھے پچھے امرتا ہوراں کول جا کھلوتا۔ ''ماشا! دید آیا'' امروز نے گھسمسے وچ آکھیا۔ شام سی تے مٹھا مٹھا ہنیرا۔ امرتا ہوراں منہ سر رضائی وچ دتا ہویا سی۔ اندروں ہی ہوں دی آواز دتی۔ ''دید آیا ہئ جالندھروں'' امروز نے فیر آکھیا۔ ہولی جہے امرتا ہوراں رضائی منہ توں چکی تے الجھے ہوئے سلیٹی سفید والاں وچ ہتھ پھیریا۔ ستیاں اکھاں تھائیں مینوں جھاکیا تے میں نمسکار کیتا۔ اوہناں کسے درد نال ہوں کیتا تے میرے ول دیکھ مسکرائے۔ ''کیسی طبیعت ہے؟'' میں ہولے جہے پچھیا۔ کول ہی بیٹھ گیا۔ 'پیتا جے ہندی ہے۔ بس ہن کاہدا حال اے، دید! میں سوچنی آں اک عمر توں بعد بندے نوں چلے جانا چاہیدا اے۔ رب نوں آواز مار لینی چاہیدی اے۔ امرتا ہوراں جسمانی پیڑ نوں کجھ دیر ٹھمنا دے کے آکھیا۔

''تسیں انج نہ آکھو۔ رب تہانوں تندرستی بخشے۔ اجے تساں بہت کم کرنا ہے۔ سانوں تہاڈی لوڑ ہے۔'' میں آکھیا۔

ہن میں جو لکھنا سی لکھ لیا۔ بہت کم کر لیا۔ بس ہن تاں آ او رب جی! رکھ نالوں ہن ٹا کی کھولن آ وا! اوہناں مسکرا کے آپ دی اس نویں نظم دی پہلی سطر بولی۔ 'ہن میں ہور کی کرنا اے۔ میں تاں رب نوں دعا کرنی آں کہ ہن بس'

امروز کول کھڑا مسکرایا۔۔ ''لے آپاں چاہ پینے آں۔ توں بیٹھ دید۔''

کجھ دیر چپ توں بعد میں امرتا ہوراں نوں ہسدیاں آکھیا ''میں رب نال گل کرلئی اے۔ اوہ کہندا تیری مرضی۔''

''کیہ گل؟'' امرتا ہوراں لیٹے ہوئے میرے دل جھا کیا۔

''رب نال گل کرلئی اے پئی امرتا ہوراں تے جیہڑی میں فلم بناؤنی ایں اوہ پوری ہون وچ میری مدد کرے۔ تے اوہ من گیاے'' میں آکھیا۔ امرتا جی ہس پئے۔

''۔ دید میرے وچ ہن ہمت نہیں۔ فلم دا کم تاں تہاڈا لما ہووے گا۔''

''۔ تسیں جے مرضی کرو میں آپنی زندگی دا ایہ سپنا ضرور پورا کراں۔'' میں آکھیا تاں شاید امرتا ہوراں دی اکھ چہ میرے اس سپنے دی لوجھی۔ اوہناں اٹھ کے بیٹھن دی ہمت کیتی۔ میں ہولی جہے اوہناں نوں آسرا دتا۔ جویں دھپ وچ کوئی چہرہ مسکرا پیا۔ امروز چاہ لے آئے۔ ''ارے!'' اوہ امرتا ہوراں نوں بیٹھیاں دیکھ کے بولیا۔

- ایما! دید نے رب نال گل کرلئی اے۔ امرتا ہوراں مسکرا کے کہیا۔

- دید نے گل کیتی اے کہ میرے تے فلم بناؤن دا کم سرے چڑھ جاوے۔

- صرف ایہی نہیں۔ میں ایہ وی آکھیا پئی امرتا ہوراں نوں اوہ ہور لمیاں عمر بخشے۔ سو سال تک۔ میں آکھیا تے امرتا امروز دوویں مسکرائے۔ تے اسیں چاہ دے گھٹ بھرن لگ پئے۔ فیر اساں پوری شوٹنگ دی پلان بنائی۔ تریکاں نشچت کیتیاں۔ فلم دا تندن دا شیڈول رکھیا۔ امرتا ہوراں سارے سوال، مینوں لکھ کے دین لئی کیہا۔ امروز ہوراں نوں میں فلم لئی گرافکس بناؤن لئی گزارش کیتی۔ سبھ کجھ طے کرن توں بعد میں امروز دے نویں چتر تے ہور کم دیکھیا۔ امرتا ہوریں فیر لیٹ گئے۔ تے میں اجازت لے واپس آ گیا۔

کوئی مہینے بعد میں اپنے یونٹ سمیت جلندھر دلی آ گیا۔ ذہن وچ فلم دے ٹکڑے گھم رہے سن۔ اونہیں دنیں امرتا ہوریں ایم۔ پی سن۔ اوہناں دا سرکاری فلیٹ خالی پیا سی۔ اسیں اٹھ دن اوتھے ٹھہرے۔ امروز ہوراں ساڈی مدد کیتی۔ سانوں ایتھے کوئی مشکل نہ آؤن دتی۔ شوٹنگ توں اک دن پہلاں میں امرتا ہوراں کول آیا۔ اوہ اجے وی ٹھیک نہیں سن۔ آکھن لگے ''ایہ کم لما ہے۔ میرے کولوں ہونا نہیں۔'' میں چپکیں چپکیں رب نوں ارداس کیتی کہ میرا ایہ کم پورا ہووے۔ شاید رب ضرور ہونا ہے کدھرے جو امرتا ہوران نے ساری رات، بیٹھ کے سوالاں دے اُتر لکھے۔ سویرے شوٹنگ شروع ہوئی۔ پہلا شاٹ اسیں K-25 حوض خاص

اوہناں دے گھر دالیا۔ امرتا ہوراں دے لکھدیاں دے شاٹ لئے۔ اوہناں نوں ترن لئی آکھیا۔ ایہ رب دی کرامت ہی سی کہ بیمار پئے امرتا جی نے رب نو برنو ہو گئے سن۔ اوہناں اپنے وال کرینے نال سنوارے۔ سلیٹی سوٹ پایا۔ کالی شال جس نوں جال کناری لگی ہوئی سی اپر لئی۔ تکھی لپسٹک دی لیک ہوٹھاں چوں چمکی تے چہرے تے نور ڈھلکن لگ پیا۔ میں اوہناں نوں دیکھ کے چندھیا گیا۔ میں شاید امرتا ہوراں نوں اینے سہپن وچ پہلاں کدی نہیں سی تکیا۔ مینوں اوہناں دیاں جوانی ویلے دیاں تصویراں یاد آئیاں۔ ساحر یاد آیا۔ میں کدھرے گواچ گیا کہ اچانک کیمرہ مین بولیا'' وی آر ریڈی سر'' امروز ہوراں نے ڈرائنگ روم نوں ترتیب دتی سی۔ امرتا ہوراں دی شوٹنگ توں پہلاں میں اوہناں نوں آکھیا: ''رب تہانوں کسے دی نظر نہ لائے۔'' اوہ مسکرا پئے۔ تے فیر لگاتار تن دن اسیں شوٹنگ کردے رہے۔ کدے امرتا جی سوالاں دے جواب دے رہے سن۔ کدی پوڑھیاں اترن دا شاٹ۔ کدی برآمدے چہ گھسن دا۔ کدی کوٹھے تے بچیاں دا۔ تے کدے باہر کسے باغ دی سیر دا۔ امرتا امروز دووین ایس فلم وچ گھل مل گئے۔ اسیں اک پریوار وانگ کم کرن لگے۔ اوہناں دے بچے وی ساڈے نال گھل مل گئے۔ اک عجیب نشہ طاری سی۔ شاید مینوں اینا آنند تے تسلی کدی وی نہیں ملی کم کر کے جنا ایہ فلم بناؤندیاں۔ جس دن اسیں پیک اپ کیتا تاں ساڈا سارا یونٹ امروز امرتا ہوران توں وداع لین ویلے اداسی بھری مسکراہٹ وچ سی۔ اسیں واپسی ویلے امرتا ہوراں دی ایہ سطر سارے سفر دوران اچاردے آئے: ''پرچھاویاں نوں پکڑن والیو، چھاتی چہ بلدی اگ دا کوئی پرچھاواں نہیں ہندا۔''

فلم بناؤندے سمے ایہ گل بات امرتا ہوراں دیاں کوتاواں بارے وکھرے طور تے ریکارڈ کیتی گئی سی:

دید: امرتا جی! تہاڈی کوتا تہاڈیاں رچناواں دا پرکھ حصہ ہے۔ اج وی تہاڈیاں کجھ کاوسطراں لوک گیتاں وانگ لوکاں نوں یاد نیں۔ تے ایس توں ہوراگے تہاڈا چنتن تے فلسفہ وی تہاڈی کاویتا وچ شامل ہندا ہے۔ ایہ دسوہی تساں پہلی نظم کدوں لکھی؟

امرتا: میری پہلی نظم دے پہلے اکھر چنن وچوں ڈگے سن..... بہت چھوٹی ساں، اجے باراں ورھیاں دی ساں، جدوں ماں نہیں سی رہی۔ میں راتیں، گھر دی چھت تے جا کے چنن ول ویکھدی رہندی ساں، اوتھے چنن دی چھاتی وچ پئے ہوئے کالے داغ، میرے ویکھدیاں ویکھدیاں دو کالے اکھر بن جاندے سن، ایہی ''ر'' ورگا تے ''ج'' ورگا۔ تے مینوں جاپدا کہ ایتھے میری ماں داناں لکھیا ہویا اے--- راج.....

فیر جدوں میرے پنڈے وچ جوانی سرکن لگ پئی تاں چنن اتے لکھے ہوئے دو اکھراں وچ اک اکھر دا اضافہ ہو گیا۔ جاپے-- کہ اوتھے میرے محبوب دا ناں لکھیا ہویا اے-- راشن

ایہو-- میری کلپنا دا جادو سی، جو فیر نظماں بن کے کاغذاں اتے اترن لگ پیا.....

کافیہ کی ہندا اے، ردیف کیہ ہندی اے، تے ماترا کویں گنی جاندی ہے، ایہ سکھلائی مینوں میرے پتا جی، جو آپ پہلوں برج بھاشا دے شاعر ہندے سن، تے فیر پنجابی وچ لکھن لگ پئے سن۔

اجیہیاں نظماں-- اخباراں وچ وی چھپ جاندیاں سن، تے فیر کتابی صورت وچ وی چھپ گئیاں سن، پر اوہ جھلماں، جنہاں دے اکھر چنن وچوں ڈگدے سن، اوہ میں اپنے پتا کولوں وی چوری لکھدی ساں۔ فیر اوہ کاغذ، دو چار دن سکول دیاں کتاباں وچ لکا کے رکھدی ساں، تے فیر پاڑ دیندی ساں.....

کاغذاں دے اوہ پاٹے ہوئے ٹکڑے-- جویں چنن نوں میرا دتا ہویا سراپ ہندے سن.....

روایتی نظماں نوں چھڈ کے، اج میں سوچدی ہاں کہ میری پہلی نظم اوہ سی، جہدا کاغذ میں پاڑیا نہیں سی، اوہ اسمان نوں اک الانبھا سی-- ''چپ چنن تے مٹھ کو تارے ساڈا مل بیٹھے اسمان''

تے ایہ نظم چنن نوں وی الانبھا سی، جیہڑا میرے کولوں سراپ لے کے، کجھ بولدا نہیں سی....

ہن سٹھاں ورھیاں پچھوں اچانک میرے کاغذ اتے اک نظم اتری اے، تاں میں حیران جہی اوہدے منہ ول ویکھن لگ پئی ہاں--

نہیں-- چپ دے اس رکھ نالوں
میں اکھر نہیں توڑے
ایہ تاں جو رکھ نالوں جھڑے سن
میں اوہی اکھر چنے ہن.....
چنن دے چرکھے تے بہہ کے--
بدلاں دی کپاہ کتی
ایہ تاں کجھ اوہی دھاگے نیں
میں کھڈی تے اُنے ہن.....

تے حیران جہی سوچ رہی ہاں کہ اوہ جو پاڑیاں ہوئیاں نظماں دے ٹکڑے میں اوہناں ارپ

دیندی ہندی ساں، اوہناں چپ چاپ میرا ارگھ قبول لیا سی۔ ایسے لئی تاں اوہ ہمیشہ اپنے رکھ نالوں اکھر جھاڑ دا رہیا، تے میں ساری عمر اوہ اکھر چندی رہی......

دید: تساں نظم وی لکھی تے نثر وی -- ایہناں دوہاں وچ تسیں وکھرتا کویں بناؤندے ہو؟

امرتا: جی ہاں -- نظم وی لکھدی ہاں، نثر وی۔ مینوں جاپدا اے کہ جدوں احساس دی شدت اکو نقطے تے کھلو جاندی اے۔ جم جاندی اے، تاں اس شدت نوں جرن واسطے، کجھ سنکیت جہے اک اشعار منگدے نیں، تے فیر اوہ سنکیت نظم ہو جاندے نیں۔ نظم وچ اک آواز وی ہندی اے، تے گنبدے بلھاں ورگی اک خاموشی وی.....

فیر جدوں ایہی نقطے اتے جمی ہوئی بارف ٹلدی اے، تاں پانی دا پرواہ نثر بن جاندا اے۔ اوس ویلے گنبدے بلھاں دی خاموشی اکھر اکھر ہو جاندی اے.....

ایہ پل پل جنم دی تے پگھل دی برف داناں نظم تے نثر ہندا اے......

کدے کدے لگدا اے کہ نظم کنتی دی اوہ چیخ ہندی اے، جو کرنے دے جنم ویلے کنتی دے موہوں نکلی سی، تے اوہناں گھبرا کے ہوٹھاں وچ میٹ لئی سی۔ اوہ کواری کنتی دی حیرانی وی سی، خوشی وی، تے خوف وی--

کرن سورج پتر سی، تے سورج دنیاں والیاں دی سوچ توں باہر لگ ہندی اے۔

تے نثر -- کنتی دی اوہ چیخ ہندی اے -- جو پانڈھواں دے جنم ویلے کنتی دے موہوں نکلی سی۔

اوس ویلے کنتی تاں اکو ہندی اے۔ نظم ویلے وی تے نثر ویلے وی، پر ایہدے وچ اوہی فرق ہندا اے جو کنتی واسطے کرن دے جنم ویلے دا تے پانڈواں دے نظم ویلے دا فرق سی.........

دید: نظماں لکھن دے پہلاں پلاں دی پراپتی اپراپتی بارے جاں اوہدا چھواں بارے کوئی اجیہی یاد جو تہاڈے کول سانبھی پئی ہووے؟

امرتا: 1936 وچ جدوں میری کتاب چھپی سی - امرت لہراں۔ مہاراجا کپورتھلا نیں دوسو روپے بھیجے سن، تے مہارانی نابھا نے اک ساڑھی بھیجی سی۔ دوویں چیزاں ڈاک راہیں آئیاں سن، تے فیر اک دن جدوں ڈاکیے نیں گھر دا بوہا کھڑکایا تاں میرے انجانے جیہے من نے کسے ہور سوغات دی تمنا کر لئی، اوس ویلے میرے پیتا دے متھے اتے اک تیوڑی پے گئی، تے اک سوچ میریاں ہڈیاں وچ اتر گئی کہ ایہو جیہی تمنا

کے لیکھک نوں نہت چھوٹیاں کر دیندی اے -- تے فیر اوہ تیوڑی میری نگھبان ہوگئی، میری نظر ثانی کردی رہی۔ جیسے قسمت کہ مینوں ایہو جیہے پیتا دا متھا نصیب ہویا سی -- جس متھے وچ اوہ تیوڑی پے سکدی سی۔

اوہ تیوڑی مینوں ورثے وچ ملی اے، تے ایہ میرے متھے اتے الف وانگ لکھی گئی ہے۔

ایہو تیوڑی کدے گرجے دی موم بتی بن جاندی اے---

کدے ورن گنڈھ وچوں اٹھدے دھوئیں دی لکیر ہو جاندی اے

کدے مرزے دی جنڈ وچوں اٹھی ہوئی ٹاہنی

کدے بودھی برکھ دی اچی پتی

تے کدے روح دے دماغ وچ بلدی روں دی بتی.....

ایہ میری زندگی ایسے -- تیوڑی دا اتہاس اے--

کجھ لکھیا تے کجھ ان لکھیا۔

دید: کوئی بھانا جو کتاواں نال واپریا ہووے؟ اوہ پل اوہ چھن جو چھاتی چوں نکل ہوٹھاں تے کاغذاں تے آجاندے نے-- کجھ ذکر کروگے؟

امرتا: نظمان دی پہلی تے دوجی کتاب تے 1936ء وچ چھپی سی۔ ایہناں وچ اوہ نظماں سن--- جو پیتا دے پائے ہوئے پورنیاں تے لکھیاں سن۔ بڑی محنت نال ایہناں دے قافیے جوڑے سن، پر جدوں ایہ کتاباں چھپیاں-- میرے اتے پہیلا الزام ایہ لگیا سی کہ ایہ نظماں میں نہیں لکھیاں، میرے پیتا نے لکھ کے میرے ناں تے چھپوا دتیاں ہن....

دکھ ہویا سی، پر ایہ الزام کوئی اجیہا مسئلہ نہیں سی کہ میرے دل وچوں لہو سم آؤندا۔ پر لہو دا قطرہ اودوں ضرور سم آیا سی، جدوں میں اپنیاں نظماں پاڑنیاں چھڈ دتیاں سن، تے فیر جدوں اوہناں نظماں دی کتاب چھپی تاں اوہدے وچوں اک نظم 'ان داتا' پنجاب یونیورسٹی ولوں ضبط شدہ کردتی گئی.....

انج ایہ وی اک چھوٹا جیہا حادثہ سی، تے اودوں قیاس نہیں سی، ہویا کہ دنیا والیاں نے--- آؤندے ورھیاں وچ کیہو جیہے بھاو ورتانے نے....

سوکنیاں بھانیاں۔ بی پالی ہوئی ہاں ....

ایسے لئی جیہڑے بھانے دے دور وچوں لنگھ رہی ہندی آں، اوسے طور دی نظم ستیاں جاگدیاں

ہوٹھاں اتے آؤندی رہندی اے.....

ہندوستان دی تقسیم دا ویلا سی تاں دن رات ایہو بولدی رہندی ساں---

اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین

اج لکھاں دھیاں روندیاں--- تینوں وارث شاہ نوں کہن

اٹھ دردمنداں دیا دردیا---اٹھ تک اپنا پنجاب......

تے اکثر نظم دی ایس تھاں آ کے آواز رک جاندی سی، گلا بھر آؤندا سی......

محبت دے ریت تھلاں وچ گزردیاں اکثر ہوٹھ کنبدے رہندے سن---

رُتاں بھوندیاں تے ورھے پئے گڑدے

دے کوئی انت نہیں سی ایناں گیڑیاں دے

سجرے موہاں توں رونقاں اوہناں ویڑھیاں دے.....

چر پاکے ایتھوں تڑپ اپنے ہی ہوٹھاں وچوں نکلدی رہی تے اپنے ہی کناں وچ پیندی رہی---

دے میں تڑکے گھڑے دا پانی-- کل تک نہیں رہنا

ایس پانی دے کن تریہائے--- تریہاں دے ہوٹھاں وانگو

او میرے موڈھے گھٹ دیا مترا--- کہہ دے جو-- کہنا.....

ویر جدوں میری نوہ سپیاں والی نظم نوں میرے گناہ دا فتویٰ مل گیا، تاں میں تڑپ کے ایہو نظم لکھی

سی----

بدلاں دے مینہ لئی میرا سورج مُتا جتھے بوہانہ باری نہ پوڑھی

تے صدیاں دے ہتھاں دی ڈنڈی سولیکی، اوہ سوچاں دے پیراں نوں سوڑی......

تے ایسے دی پہلی سطر میرے نال سوندی سی، میرے نال جاگدی سی.......

دید: تساں اپنی عمر دے اپنے ورھے اتہاس دے کئی کچھ دیکھے نیں۔ اپنی اکھیں سانجھا پنجاب وی ڈگدا، مُڈدا پنجاب وی تے تقسیم ہویا پنجاب وی تے ہن پنجاب سمسیا والا پنجاب وی۔ ایہناں حادثیاں بارے تسیں کویں سوچدے ہو؟ اج کل من اوپر کی واپر رہیا ہے؟

امرتا: میری عمر دے کئی ورھے ہلاک ہندے رہے نے، تے ہن جدوں کہہ سکدی ہاں ''کربسم

اللہ کھولیاں میں ستر گنڈ ھاں' اودوں ہی میرے سکون نوں ہلاک کرن واسطے کنیاں ہی سیاہ تاریخاں اٹھ کھڑوتیاں نیں---

اپنی پاسے ابد دے کھیتر وچ تے اک پاسے سیاست دے کھیتر وچ۔

پنجاب دی حالت ساہمنے آوندی اے--- تاں کئی کئی دن آکھدی رہندی ہاں---

رب خیرے کرے میرے ویڑھے دی

کہ جس تھاں رانجھن ڈیرا کیتا، اوتھے دھکے سندی کھیڑے دی......

تے جدوں اپنی حالت ساہمے آوندی اے تاں آکھدی رہندی ہاں---

فقیرا! آپے اللہ ہُو!

''برہے سیالاں دے معاملے'' صرف ایک کال دی حقیقت نہیں سی، ہر کال دی ہندی اے۔

صاحباں وانگن میرے دی بہت سارے ویر شمیر نے۔ صاحباں دیاں بھیناں نہیں سن--- مینوں ویراں شمیراں ورگیاں بھیناں وی ملیاں نے۔ سو حقیقت ایہ ہے کہ میں حادثیاں دی پلی ہوئی ہاں۔

پر ایہ وی حقیقت اے کہ میریاں اکھاں نے جو میرے کولوں

میرا تصور منگیا سی--اوسے وچ کسر نہیں آئی---

ایہو احساس میرے ہوٹھاں تے کئی دن کھڑوتا رہیا، تے فیر نظم بن گیا---

رب جی! توں میرے رکھ تے اکے اک ون منت منی---

تے چولے نالوں پاڑ کے کئی--- رُکھ دی ٹاہنی بنھی......

میں اپنے لہو دا اک ٹیپا، اک اک اکھر گھڑیا

تے اوہی اوہ میرا اک اکھر--- جگ دی سولی چڑھیا

میں ایسے جنم دی لاج بچائی--- اکھ کدے نہ رُنی

رب جی!......

آ دَو رب جی! رُکھ نالوں ہن ٹا کی کھولن آوَو تے روح دا اک اخیری اکھر اپنی جھولی پاوَو---ایس رُکھ تساں جو منت منی--اوہیو منت پُنی

رب جی......

ایسے نظم وچوں ایہ جیہڑیاں سطراں نے---

آ دوَ رب جی رُکھ نالوں ٹاکی کھولن آ دوَ

تے روح دا اک آخری اکھر اپنی جھولی پادوَ.....

ایہ اک التجا بن کے کئی دن میرے ہوٹھاں تے بیٹھیاں رہیاں.....

اج کل نویں نظم دیاں دو سطراں میرے اندر اک دھونی وانگ اٹھیاں نے---

میں لیک رب دے شہر دی

میں مٹی اپنے حجرے دی.....

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

حسین شاد

درد کتھا

درد وچھوڑے دیاں گلاں ۔ ہجر دے سَل ۔ دُکھاں دے موسم ۔ پیار دیاں رفراں ۔ عاشقاں دے نغمے ۔ عشق دے تھکدے دھوئیں ۔ صُوفیاں دی حق ہو ۔ وَنجھلی دیاں کوکاں ۔ راگاں دے سُر ۔ تھلاں دا سناٹا ۔ عشق مجازی تے عشق حقیقی ازل توں ای پنجابی شاعری دے موضوع رہے نیں ۔ جناں وچ درد دی اک لہر ہلورے لیندی سُندی وی اے تے نظری وی اوندی اے ۔

1947 وچ ملن والی آزادی دی انتہاں دی خوشی اپنی تھاں پر تقسیم سے دی لہو رنگ ہولی ۔ شیطان دے بھنگڑے ۔ انساناں دے حیوانی ناچ ۔ لہو دیا نہراں ۔ ڈراؤنے مُکھ ۔ مشویاں دے لشکارے ۔ بے وسی تے مجبوری نال بھریاں تھل ۔

اکھاں ۔ ڈرے چہرے بھریاں جوانیاں چہ تار تار جثے اپنے اندر اک وکھری داستان رکھدے نیں ۔ ایہہ اک نہیں ان گنت داستاناں سن ۔ لہو بھریاں داستاناں ۔ انہاں داستانیاں نوں مکھ دُکھ کے جنہاں دو شاعراں شاعری کیتی اوہناں وچ امرتا پریتم تے احمد راہی دے ناں بڑے چمکدے دمکدے نیں ۔ جنہاں مذہباں توں وکھ ہو کے صرف انساناں دی گل کیتی' دُکھیاں دے دُکھ ونڈے ۔ چادراں دی لیراں جمع کیتیاں تے اوہناں اُتے درد اُلیک دتے ۔

اُنج تے پاکستان نین مگروں نویں سوچ لیکے اون والے ۔ انسانی مجبوراں دیاں گلاں کرن والے ۔ ویب دے حسن تے دُکھ سے نال ولا کے ادب کھلا نوں ودھاوا دین والیاں وچ ۔

افضل احسن رندھاوا ۔ اکبر لاہوری تے نواز بڑے مُڈھلے لکھاری منھے جاندے نیں ۔ پر جنے گوہ نال افضل احسن رندھاوا ۔ احمد راہی تے امرتا پریتم نوں پڑھیا گیا' شاید اوس دور وچ ایہو جہی توجہ کسے ہور نوں نہ لبھ سکی ہووے ۔

امرتا گئی تاں ایتھوں ای سی پر جاندیاں جاندیاں او ہتے رجی چیک ماری' جیہڑی بڑی دور تائیں دردمنداں دے دلاں تائیں اپڑی تے سارے دردمنداں امرتا نوں سلامی دتی۔ کیوں جے اوہدی چیک اُتلے سُراں وچ سی تے روہتے پنجاب دے وڈے دردنوں سد ماری سی' اوہنے آکھیا سی

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھا دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ دردمنداں دیا دردیا اُٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے ہو دی بھری چناب

ایس نظم نے بڑیاں دُہائیاں پائیاں۔ انہاں دُہائیاں دی گونج حالے وی سُنی جاندی اے۔ پنجاب دی دھرتی اُتے۔ بے وسیاں۔ بے گناہویاں دا اپنا لہو ڈھلیاں جینے دھرتی اُتے کھلاے سبزے نوں ساڑھ سواہ کردتا۔ ایس سڑھی بلی دھرتی دا درد بھنا بیان راہی تے امرتا دی شاعری دا بڑا حصہ اے۔ احمد راہی دی ''ترنجن'' تے امرتا دی ''نویں رُت'' اوس ظلمی موسم دی کتھا نیں۔ پر امرتا نے اپنے دل دے درد نوں شاعری دے نال نال اپنیاں کہانیاں وچ اپنے مضموناں وچ وی اکو جہے جذبے نال بیان کیتا اے۔

بھارتی پنجاب وچوں پاکستان وچ جنوں سب توں بوتہا پڑھیا گیا تے پڑھیا جاندا اوہ صرف امرتا پریتم اے۔ ہنیریاں راتاں وچ چانن ونڈدے اوہدے اکھی۔ لہو دے موسماں وچ جاگن والے خیال۔ دردوون سوایاں کرن والے شعر۔ ٹھنڈ پان والیاں مٹھی مٹھی پیڑ بھریاں کہانیاں تے سانجھ پان والے سوال اج وی پنجابی ادب دا وڈا حصہ سمجھے جاندے نیں۔ ایس لکھاری بی بی نوں ادبی دُنیا وچ جیہڑا مقام ملیا اوہ ہور کسے لکھاری دے حصے نہیں آیا۔ اوہدے دِل دا درد اینا گوہڑا اے کہ اوہدی لکھت وچ ڈھلکاں ماردا اے۔

اوہدا درد بیان اک نظم وچ انج بیان ہندا اے

آنی میریئے جندے
اج وی اوہو سپنے تیرے
اکھیاں وچ لکدے

پوناں وچ سگھنداں ان دی
جھمیاں چوں اُتھروپُن دی
شاہ راتاں دی مینڈھی وچ
کوئی لکھاں تارے گندے
پر سُر گھی دا رنگ گھسمیلا
ترکالاں دا بول کیسلا
محساں دامنہ پے گیا میلا
اکھیاں توں پیا مندے
نہ ہندی نہ چھنجی چھوہی
نہ تیری نہ میری ہوئی
پر عشقاں دی گوری گئی
پینڈی جاندی اندے
تیل بناں جگدے نہ دیوے
جندوں باجھ کویں کوئی جیوے
سورج کولوں منگ کے چانن
چن چمکدے ہُندے

امرتا دی فکروی عجیب اے کدے تے اوا پنا درد بیان لی کوئی لمبی نظم اُلیکدی اے۔ کدے دوفقریاں وچ دُکھ دے جنگل آباد کر دیندی اے۔ ایسے طرح دا اک لمبا کھلار اوہدے انہاں فقراں وچ دیکھدے آں۔ اوہدی حیاتی چہ وسدے سارے دُکھ دی کتھا دکھائی دے گی۔ اوہ کہندی اے

اک دردی
جو سگریٹ دی طرحاں میں، چپ چاپ پیتا
صرف کجھ نظماں ہین۔۔
جو سگریٹ دے نالوں میں راکھ وانگن جھاڑیاں

ذرا گوہ کرو کیویں سڑدی بلدی انسانی حیاتی دی راکھ وچوں زندگی دے پُھل بھال لیائی۔ ایہہ وکھری گل اے جے انہاں سرخ گلاباں دے موسماں وچ پھلاں دے رنگ کالے نظر اوندے نیں۔ امرتا نوں دی تے پڑھن والیاں نوں وی کیوں جے گل دِل وچ ایڑن دی نیں۔

سگوں دل وچ پکی تھاں بنا کے عباچر ڈیڑھ لان دی اے

اوتا دِلاں دی ڈیرے دار اے اوہدی اک ہور

نظم جیہڑی ذرا لمبی اے دیاں لائیناں دیکھدے آں۔ عنوان اے ''دیوتا''

توں پتھر دا دیوتا ٹھنڈے لگر بھاو تیرے نہ اجے تیک گرمان

جگاں جگاں دی نیندر ستے اجے تیک وی جذبے تیرے جاگن وچ نہ اون

بال بال کے حسن اپنے لکھ سندریاں آن

تیرے سولے جڑھ انگاں تے چیتن انگ نوان

پیڈے پتھرے چرناں اُتے لوئیں لوئیں پوئے چھوہ کے

ماس دی گندھ وچ متے متھے پیراں تک جھکان

نگھے ساہ دیاں گرم ہواڑاں پوجا دی سام گری وچوں

اُٹھدے لمبے دھوئیں تیرے بھاؤ نہ اجے بُھکھان

ولاں ورگے قد اونہاں دے نیوں نیوں لقدے جان

چنوں چٹیاں لکھ گوریاں، کالے بھورے نین اونہاں دے

تیرے سولے سولے بُت تے روم روم لپٹان

جیویں مٹی دی خوشبو تے ناگ لیٹدے جان

جگاں جگاں دی پوجاپی کے ہوٹھ تیرے ترہائے

کنے کو ہوٹھاں دے رس تیرے چرناں اُتے سکے

ہارے سجن اسیں ہارے

پتھر دے جھوٹھے پیراں نوں میرے پوجن بھاؤ کنوارے

اک تقدیر زنانی دی رب نے بنائی اک تقدیر مرد نے

آپ گھڑلئی جیہڑی زنانی نوں پوجا پاٹ کے لا کے جلوے

وی دیکھدی اے تے حلوے وی کھاندی اے۔ امرتا زنانی

ایس کشت توں مکت کران دا جتن کردی اے۔ اوہدیاں تحریراں مکتی دوان دی ایسی کوشش نوں رُوپ دیندیاں ہین۔ ایسے کر کے اوہدے سوال وی اوکھے نیں میرے شہر دی ایک بی بی افضل توصیف دی بڑی درداں ماری اے۔ اوہدے درد دی پڑھن جوگ نہیں کیوں جے لگدا اے اوہ پاکستان وچ امریتا دی نمائندہ اے۔ اوہدیاں لکھتاں وچوں وی دُکھڑے ڈُھل ڈُھل پیندے نیں۔ امرتا اوہنوں سوال کردی اے۔ اوکھا وی تے درد بجھاں وی۔

''توصیف! چھاتی وچ ہیر دی رُوح پا کے جیویں جیویں اوہدی کوئی گل دسیں۔؟'' افضل توصیف دی حیاتی نوں ویلے دی باغی نمیار نال جوڑ کے پچھن دا مطلب ایہہ ہے کہ درد دی لمبی کہانی سُن جا سکے۔ حالاں ایس سوال کسے ہور آسان جے طریقے نال وی پچھیا جاسکدا سی پر آسان سوال تے اوہ کردے نیں جنہاں دُکھاں دے موسم نہ تکے ہون۔ پر ایس سوال دا جہیڑا جواب افضل توصیف نے دِتا پہلے اوہ دیکھ لیے خیر گل اگے توردے آں۔ ''بڑی اوکھی گل پُچھ بیٹھے او امرتا جی پر تہاڈے حساب تاں بڑی سوکھی گل اے۔ تُسیں آپ تاں دُنیا فتح کری بیٹھے او۔ پنجاب دی سبھ توں وڈی شاعرہ تے دِلّی دا تاج دی سر تے پالیا۔ ہُن اوہ جو دی پچھے یا دے فرق نیوں پیندا۔ میں اک گل دساں امرتا جی ایس پاسے تے پنجاب وچ جتھوں دی مٹی تہاڈے بدن نوں وی لگی ہوئی' ہیرا جے وی کھیڑیاں دے وس پئی ہوئی اے۔ پہلے پنڈ ایس ہیر لئی لکھاں ہزاراں کیدو دُشمن جان دے ویری' وارث شاہ دا مقبرہ بھی ویں ایتھے ہیگا پر اوہدی رُوح نے مُڑ کدے پھیرا نہیں کیتا۔ رانجھا وچارا اپنے آپ جوگا وی نہیں بھاویں۔ دامن ورگے نے لکھ دلاسے دتے

رانجھا تخت ہزاریوں ٹرے تے سہی

قدماں بیٹھ سیالاں دا جھنگ اوندا

مینوں پکہ یقین اے ایس جواب نے امرتا جی نوں ضرور خوش کیتا ہوئے گا کہ اوہناں ورگی درد بیانن والی ہور وے اے۔

امرتا جیویں آپ درد بلیاں گلاں کردی اے رنج ای دوجے نوں رنج دیاں گلاں کرن دی پر پرنا دیندی اے۔ فیض احمد فیض نال اک گل بات کر دیاں اوہنے رنج دے ای سوال کیتے' جنہاں وچ بظاہر تاں ہلکا پھلکا

اندازسی پر اندر کھاتے اک درد دی لہر ودھدی سکڑ دی صاف دکھائی دیندی اے،اوہدے پچھن دا انداز دیکھو
''تہاڈی اک نظم شاید اوہی''اک ذرا سوچنے دے''اوہ تساں آندرے وزنی ۔۔۔۔ دے ناں کیتی ہوئی اے
اوہ کس خیال توں اوہدے ناں کیتی سی ۔؟''فیض وسدے نیں۔
''اوہ میرا بڑا دوست اے۔نظم کجھ اوہدے رنگ وچ لکھی سی ایس لئی اوہدے ناں کردتی۔''ایس طرح'' کجھ
ہورنظماں وی ہور دوستاں دے ناں کیتیاں نیں؟''
''ایہہ پتہ اے کہدے کہدے ناں لکھیاں نیں پر کسے اُتے کسے داناں نیں۔''
ہن امرتا اپنے مطلب ول آندیاں پچھیا۔''پھر بغیر ناں دے اوہدی گل سناؤ جہدے ناں دُنیا دے غم نوں رقم
کردے رہے۔؟
فیض کھل کے ہس پیئے' کہن لگے''اوہ اک ہندی سی قلوپطرا اوہدے توں لے کر تیرے تک لوک ہندے نیں'
جنہاں دے ناں غم رقم کری دے نیں۔''
فیض کہن لگے''لے ہُن میں تینوں دساں' میں پہلا عشق اٹھاراں وریاں دی عمر وچ کیتا سی''نقش فریادی''
دیاں ساریاں نظماں میں اوسے عشق وچوں لکھیاں سن۔''
''امرتا کسے وی درد دی گل نوں مکن نیں دیندی اگے پچھدی اے''پر اوہنوں زندگی وچ پایا کیوں نہیں۔؟''
''ہمت کتھے ہندی سی اوہدی زبان کھولن دی۔اوہدا ویاہ کیسے وڈے جاگیردار نال ہو گیا سی۔''
ایہہ درد کتھا اگے وی ٹردی اے پر میں سمجھدا تُسیں آپ وی اگے پڑھیاں بنا ساری گل سمجھ لئی ہوئے گی۔
کوئی ہور گل چھونے آں۔''رسیدی ٹکٹ''وچ امرتا کہندی اے۔
''کدے کدے خوشی تے اداسی اکٹھیاں اکو وارگی آجاندیاں ہین۔''آکھیا وارث شاہ دی ویل نوں
دل دا پانی دتا سی' دل دادی' اٹھرواں دا وی۔۔۔ پر یاد ای اوہ ویلا جدوں تیرے پہلے میل نال چوطرفی ایہہ خبر
پھیلی سی۔جالندھر وچ کسے ساگم دی پردھانگی لئی میرا ناں پیش ہویا تاں کمیونسٹ پارٹی دے اک نیتا نے
آکھیا سی۔''نہیں اسیں اوہنوں نہیں بلانا' اوہدی بدنامی نال ساڈی سبھا بدنام ہو جائے گی۔''
گل تاں ایہہ وی دُکھ بھری ہے۔امرتا دی شاعری ہووے یا کہانی ہووے اکو جیسی درد کتھا بیان ہندی
ہے۔کینی دا سفر اک کہانی ہے۔جہدے وچ کینی دی ماں پولینڈ توں کینی نوں لکھدی ہے۔''۔۔۔تے
فیر وقت آیا جدوں ہندوستان میرے لئی میرا نہ رہیا میں سوچیا سی ہندوستان نہ سہی پر پولینڈ ضرور میرے لئی میرا

رہے گا۔ کڈی عجیب گل ہے کہ اوہنوں وی میرا آکھن لئی میرے اندر کجھ نہیں رہیا۔ ایس لئی تینوں جنہوں بھاویں میں اپنے لہو ماس وچوں جمیا ہے۔ ۔۔ جدوں میری آکھدی ہاں' تاں سوچیں پے جاندی ہاں۔ ۔۔ سوچدی ہاں۔ ۔۔۔ ایس دُنیا وچ۔

جے کوئی وی اوہ نہیں ہندا جینوں اپنے جیوندے جی ہمیشہ میرا آکھیا جا سکے۔ تاں گھونگھٹ اپنا آپ اوہ چیز ضرور ہونا چاہیدا ہے۔ جنوں میرا اپنا آپ آکھیا جا سکے۔ مینوں ایہہ وی نصیب نہیں ہویا۔ ایہہ جے مینوں تھوڑا اجیہا وی نصیب ہو جاندا تاں میں ہندوستان توں کدے واپس نہ اوندی۔ تینوں ہمیشہ اپنیاں اکھاں نال دیکھ سکدی۔ پر جدھی خاطر ایہہ میرا اپنا آپ میرا نہیں سی رہیا اوہنوں روز او تھے اک اجنبی' ہور اجنبی' تے ہور اجنبی ہندیاں دیکھی جانا میرے لئی بڑا اوکھا سی۔"

دلاں دی اوکھیائی دے ایہہ سمے لگدا ایہہ امرتا نے آپ ہی بنائے نیں۔ ایسے لئی اوہدے بیان وچ دُکھ آپو آپ آوڑھدے ہین' اوہدے دلاں دے بوہے دُکھاں نوں جی آئیاں نوں کہن لئی ہر ویلے تیار بیٹھی رہندی ہے خیر اوہناں دُکھاں نوں خودے کئی دیر سانبھ سانبھ کے' پونج پونج کے' ہنجو صاف کر کر کے انج دا بنا کے بیان کردی اے کہ جگ دے کنے ای لوک اوہ سارا دُکھ اپنا دکھ بنان دی آس لا ہندے ہین پر بے وسی اوہناں نوں ہنور دُکھی کر دیندی ہے۔ پر امرتا دا حوصلہ ہے کہ اوہناں نوں سانبھ وی وی ہتے تے انہاں نوں لفظاں دے شیشے وچ سجا کر زمانے دے سپرد کردی ہے کہ کدے۔ ۔۔ شاید کدے انسان ایسے اپنی دُنیا نوں ہی دُکھاں توں تے گناہواں توں پاک کر کے جنت پچھاتے جنت ورگا بنا سکے۔ کہانیاں تے بوہت نیں پر میتھوں اونہاں دا پروا نہیں ہندا۔ ناں لکھ دیناں پڑھیاں ۔۔ آپ لینا۔ "اک نمبردار فرق" "بھابھی مورنی" "پردیسی" تے ہور کنیاں ای۔ جدوں رُت اداسی ہووے تے اداس چہ وادھا کرن نوں دل کرے تے امرتا نوں پڑھنا مزہ آئے گا۔

اپنی اک نظم "چپ دی سازش" وچ اوہ کہندی اے۔

"رات اُلانگھدی پئی۔ ۔۔۔

کسے نے انسان دی چھاتی نوں سنھ لائی ہے

ہر چوری توں بھیانک ایہہ سپنیاں دی چوری ہے

چوراں دے کھرے۔ ۔۔

ہر دیس دے شہر دی، ہر سڑک تے بیٹھے
پر کوئی اکھ تکدی نہیں، نہ چونکدی ری
صرف اک کتے دی طرحاں اک سنگلی دے نال بجھی
کسے دیلے کسے دی کوئی نظم بھونکدی۔۔۔''

اک نظم دا عنوان ہے ''مارلن مینرو'' اوہوای مارلن مینرو جنہے ہالی ووڈ دی مقبول ہیروئن ہون دے باوجود خودکشی کرلئی سی۔ ایہہ نظم پڑھ لو تے باقی گلاں امرتا بارے آپ سوچ لینا۔ بس ایہوای درد کھاوے۔

''زندگی اک میلے رومال دی طرحاں۔۔۔
میں بوجھے دے وچ پائی پھردی ساں
خورے ہزار واری میں ایس دے نال متھے دا مڑھکا پونجھیا
تے اج ایس نوں میں موت دے چشمے تے دھون چلی آں''

☆☆☆☆

دیوندر

میں کِنا جاندا ہاں

امرتا پریتم نوں نال دے نیڑے تیڑے یاں نال نالوں تھوڑا یاں ودھ جاندا ہاں۔ ایہ سطر لکھدیاں ایسے چھن میرے اندر کوئی بولدا ہے۔ 'توں امرتا نوں اینا جاندا ہیں، جس نوں کوئی وی دسیا نہیں جا سکدا' ہن میں ایہناں دوہاں اُلٹ سریاں دی تھوہ پا سکن دے آہر وچ ہاں۔

میں امرتا نوں 2 ستمبر 1996 دی سویر دس پندراں منٹ ای ملیا ہاں۔ تے بس۔ میں تے گرپریت اپنی آپنی پہلی کاو پستک (شاعری دا مجموعا) بھینٹ کرن گئے ساں، جو اوسے شام ریلیز ہونی سی۔ امرتا نوں ملن خاطر بندے نوں اوس دے گھر دے اندروں پنج پوڑھیاں چڑھنا پیندا ہے پہلاں۔ فیر ملن والا اوس سمتل فرش تے پہنچ جاندا ہے جتھے امرتا سہج اوستھا چ ٹر پھر رہی ہوندی ہے۔ جدوں اسیں ایہ پنج پوڑھیاں چڑھ فرش تے پہنچے امروز ساڈے نال سن۔ اوہ پوڑھیاں نہیں چڑھے سن، امروز لئی ایہ پوڑھیاں نہیں سن۔ سجے پاسیوں پڑھن کمرے وچ امرتا ہولی ہولی ساڈے ول سرک رہی۔ لال بوٹیاں والا ڈھلا سوٹ جس دی بھوئیں مینوں بھگویں بھاسی۔ گل کوڈیاں دی مالا، مدھرا، گورا جسم۔ مینوں لگیا جویں لاہور قصور والا پنجاب سرک رہیا ہووے ایدھر ساڈے ول دھیرے دھیرے۔

میں امرتا دے چہرے دیاں جھرڑ گھاڑیاں پتھاراں چوں پڑھ رہیا کنے ای بیلے، کنیاں ای جھناواں۔ جنگلاں چ بنیاں سراواں جتھے جاندے راہی رات کٹدے ہن۔ جدوں سویرے اوہ اگلے سفر تے ٹردے ہن اوہناں دے اگلے پینڈے دی سیرت بدل

چکی ہوندی ہے۔ اتے صورت وی بدلی ہوئی بھاسدی ہے۔ پہلاں نالوں نویں تازی۔ ہریاولی۔ سراں پاندھی دے ذہن وچ پوری طرحاں شامل ہو چکی ہوندی ہے۔ میں امرتا دے چہرے تے اُداسی سادھاں دا دھونا بلدا ویکھ رہیا ساں۔ جتھے مینوں "میں کیہ ہاں" دے سوال دی اگن تپش دسدی رہی۔ اوہنی پلیں میں آپ نوں، جھنگ، سیال، رانجھا، گورکھ دا ٹلا، ہیراں دے در، ٹھوٹھا، بگلی، پیراں دیاں مزاراں، ٹلا باورا ہو ہو نچدا پھردا، عشق دی نویوں نویں بہار دے بھاو منڈل چ پھردا ویکھ رہیا ساں۔

اوس سمتل فرش تے ساڈے نال صوفیاں تے بیٹھن خاطر امرتا تن پوڑھیاں (آپنے اندروں وی) بیٹھاں اُتری۔ اسیں صوفیاں تے بیٹھ گئے۔ امرتا امروز دیکھے مونڈھے دا سہارا لئی بیٹھی سی۔ یاں امروز نے ای آپنے مونڈھے نوں سہارے دی مُدرا وچ کھڑا کر رکھیا سی۔ جاپدا سی، امروز دے جسم دا ایہ انگ امرتا دے جسم دا ہے۔ امرتا بولی۔ نیاز بو پڑھے ہن سارے۔ کہڑا نیاز بو سبھ توں چنگا لگیا۔ تسیں آپنا نیاز بو بھیجنا۔ ساڈیاں کتاباں پھولدیاں بولی۔ سوی اچھیاں کتاباں چھاپ رہیا۔ امروز چاہ لے آئے۔ چھوٹے ڈبے چ بسکٹ۔ چھوٹیاں چھوٹیاں گلاں ہوئیاں ساہتک شرارتیاں دیاں وی۔امرتا نے ننگے پئے بسکٹاں نوں ڈھکدیاں آکھیا۔ ایہ ننگے پئے سلھ پھڑ لیندے ہن۔ میں سوچ رہیا ساں جویں امرتا کہہ رہی ہووے۔ بسکٹاں نوں ڈھکے تے بندے نوں ننگے رہنا چاہیدا جو اوہ فضا چوں سلھ پھڑدا رہے۔ جو وی اوس نوں چھوہے اوس دا کجھ حصہ چھوہن والے دے ہتھاں نال لگیا رہ جاوے۔ ڈھکیا بندا تاں ڈھکے بسکٹاں ورگا ہوندا ہے۔ کرڑا۔ سُکا سُکا جو وی چھوہے اچھوتا رہ جاوے۔ پکڑ ودھاوے تاں بسکٹ ٹُٹ جاوے۔

بھلا اینے کو سے چ امرتا نوں کِنا کُو جانیا جا سکدا ہے۔

امروز ساڈے نال گیٹ تک آئے تے گیٹ تے کھڑے دس بارھاں منٹ گلاں کردے رہے۔ مینوں لگا میں ایہناں دساں منٹاں چ امروز نوں پورا جان گیا ہاں۔ امروز محنت، عشق بارے بول رہیا سی۔ جے تسیں ایہ جاننا ہووے کہ میں امرتا

نوں کنا پیار کردا ہاں تاں تہانوں ساڈے گھر ست اٹھ دن رہنا پوے گا۔ پر ایہناں دناں چ کدے وی تسیں مینوں امرتا نوں پیار کردے نہیں ویکھ سکو گے۔ میں اوہناں وستاں نوں محبت کردا ہاں جہناں نوں امرتا پیار کردی ہے۔ میں امرتا دی ہر وست، ہر پسند نوں محنت کردا ہاں۔ اک وار امرتا رات پئے ٹیکسی لے گھر آئی۔ آپنی گڈی جو خراب ہو گئی سی۔ ورکشاپ تے چھڈ آئی۔ کہن لگی۔ آپے کل نوں مستری چھڈ جائے گا۔ سویرے امرتا نے اٹھ کے ویکھیا۔ کار گھر وچ ای کھڑی سی ۔ میں امرتا توں چوری کار ٹھیک کروا راتو رات گھر لے آیا ساں۔

امروز کدے امرتا نال آپنی محبت دیاں گلاں کر رہیا سی۔ مینوں جاپیا جویں اوہ کوئی مدھ یگی پنجاب دا انپڑھ جٹ ہووے۔سدھا سادا، بھولا، موہ ونا، پیار رتا۔ جس دے پینڈے دی ڈھوڑ نال بھرے گٹیاں تے اُچا چادرا لمک رہیا ہووے۔ مینوں لگا اوہ دن وی کدے آ سکدا ہے، جدوں امرتا نہ رہی تاں ایہ جٹ کے کھونجیوں آپنا کھیس چک کے مونڈھے تے رکھے گا تے جدھر مونہہ ہویا اوس راہ ٹر پوے گا۔

میں محسوس کردا ہاں کہ میں امرتا نوں اینا جاندا آں کہ دس سکنا ناممکن ہے۔ مینوں جاپدا اے جویں تھاٹ وائبریشنز یاں کوئی جینیٹک کریکٹرز راہیں میرا امرتا نال کوئی ادِکھ سبندھ ہے جس کر کے میری زندگی وچ کئی اجہیاں گھٹناواں گھٹیاں ہن جہناں توں ایس سبندھ دی سمجھ پین لگدی ہے۔ کجھ دس سکن دی کوشش کر رہیا ہاں۔

میں آپنی عمر دے تیہویں ورھے تک اسھتک بندا رہیا ہاں۔ اتفاقن میرے گوڑھے متر نے میرا ایم اے پنجابی دا فارم لیا کے بھر کے مینوں سائن کرن لئی کہیا۔ میں پاٹھ کرم چ ''کاغذ تے کینوس'' پڑھی۔ مانن لئی وی، نمبر لین لئی وی۔ ایس توں چار کو سال بعد میری زندگی چ اک اہم موڑ آ گیا۔ مینوں جیوں سکنا اوکھا، وادھو تے بھارا بھارا لگن لگا۔ سارے سماجک رشتے مینوں جعلی، پھوکے، غرض ہت،کھوکھلے لگن لگے۔ جہناں وچ محبت ناں دی کوئی شے نہیں سی۔ پورا دن، رات، موسم، بارش، ہواواں، سبھ بے کار وادھو وادھو۔ ایتھوں تک کہ میرے اکلوتے بیٹے نال وی پیار کے زیرو

ڈگری تے پہنچ گیا لگن لگا۔ مینوں لگدا سی ایس طرحاں وادھو جیونا ہور کنا چر جاری رکھ سکاں گا۔ بس کدوں وی کدے وی ایس زندگی توں نجات پا لین والا آخری راہ ای مینوں آپنا راہ لگ رہیا سی۔

اتفاقن میں آپنے سرہانے اپرلی کانس توں امرتا دی وارتک دی کتاب چکی۔ پڑھن لگا (ہن تاں اوس کتاب، ناں تے سطراں وی وسر گئیاں ہن) شاید سارا شگفتہ بارے سی۔ اوس وچ کجھ سطراں امرتا دے منکھی رشتیاں دی حقیقت بارے کہیاں سن۔ اک دم میرے اندروں جویں ہزاراں من بوجھ لہ گیا ہووے۔ ایہ گل مینوں بہت دیر بعد ٹھیک ہو جان توں بعد سمجھ آئی کہ جنہاں رشتیاں نوں میں ناکارا سمجھ رہیا ساں کھوکھلے، محبت ہین سمجھدا ساں، اصل وچ میں اوہناں نال اندروں جڑنا چاہوندا ساں، اوہناں نوں ٹھیک کرنا چاہوندا ساں۔ اوہناں نوں اوویں سویکار (قبول) کرنا نہیں سی چاہوندا۔ جس دے سٹے وجوں میں سویرٔ ڈپریشن دا شکار ہو گیا۔ میں اوس سے پورے سماج نال کٹیا ہویا ساں۔ اک بہت پرانے متر نوں بلایا۔ اوہ مینوں کسے منو چکتسک (ماہر نفسیات) دی بھال وچ چنڈی گڑھ لے گیا۔ میں لدھیانے اک سائیکیٹرسٹ ایس ایس گل کول زیر علاج رہیا تے ٹھیک ہو گیا۔ امرتا نال اوس کجھ سطراں والے رشتے نوں صرف محسوسیا ای جا سکدا ہے۔ دس لگا تاں جاپدا ہے کوئی ہلکی گل لکھ بیٹھا ہاں۔

اُنج میں امرتا نوں دو تن خط لکھے ہن ایہناں پچھلے پندرھاں ورھیاں چ۔ بے جوابے خط۔ اک خط میں پنجابی یونیورسٹی توں رجسٹری کروا اوس دی رسید پتا نہیں کیوں کنے ای سال آپنے پرس وچ پائی پھردا رہیا۔ اوس پہلی اِکو اِک ملنی سمے وی میں ایس گھٹنا نوں آپنی کتاب دی بھینٹ عبارت وجوں لکھیا سی۔ جدوں میں کوتا لکھدا نہیں ساں، بس تھوڑا تھوڑا پڑھدا ساں، میں تے گرپریت اک شام چنڈی گڑھ گھم رہے ساں۔ میں مخول وجوں گرپریت نوں کہیا فلاں کوی کیہ کوتا لکھدا اے، میں ہنے ٹریا جاندا لکھ سکدا ہاں۔ اجہی کوتا 'توں ماں ہیں توں چھاں ہیں، توں گاں ہیں۔۔۔۔' اوتھوں ٹردے ٹردے اسیں اک ہوٹل چ جا بیٹھے۔ گرپریت نے کہیا۔ ایہ کوتا کاغذ تے

لکھ لے۔ مخول نہیں۔ کوتا ہے ایہہ۔ اوہ کوتا لکھ میں 'ناگ منی' نوں بھیج دِتی۔ شاید 1982 دی گل ہے۔ اوہ کوِتا ''ناگ منی'' دے ٹائیٹل پنے تے چھپی۔ اوسے دن توں میرا ''ناگ منی'' نال ایہہ رشتا قایم ہو گیا۔ میں دو چار مہینیاں بعد ''ناگ منی'' لئی کوِتا بھیجدا رہندا ہاں۔

مینوں امرتا گرہست آشرم چ رہ رہی اداسی سادھوی لگدی ہے۔ جو کھان پین دے آہر توں بنا باقی سارا سما پڑھن لکھن دے لیکھے لاوندی آ رہی ہے۔ پرانے سمیاں چ اداسی سادھو آپنے ڈیریاں وچ سویرے چار وجے اُٹھ نہاؤن دھون تے بندگی کرن توں بعد پورا دن گرنتھ لکھن پڑھن وچ لا دیندے سن۔ صرف کھان پین دا سما ای گرنتھوں باہر رہندا۔

میں سمجھدا ہاں کہ امرتا نے بھارتی عورت نوں آپنے اندروں آپنے آپ توں لبریٹ کروایا ہے۔ جو سبھ توں اوکھا کارج ہے۔

(لپی انتر: جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

ڈاکٹر دیوندر سنگھ دھالیوال

امرتا پریتم دا پنجابی ناول وچ ستھان

امرتا پریتم بھارتی ساہت دے اتیانت مہتو پورن پرتندھ ساہتکاراں وچوں ہے۔ ساہتک پچھ بھومی صدقہ پتا دے پربھاو ادھین بھاویں چھوٹی عمر وچ امرتا نے ساہت سرجنا شروع کر دتی سی پر وِدھوت روپ وچ اوس نے 1936ء وچ 'امرت لہراں' نال پنجابی کاوساہت جگت وچ پرویش کیتا اتے جدوں تک اوہدی چیتنا قائم رہی اوس نے اپنی سرجنا وِبھِین ساہتک ودھاواں وچ جاری رکھدیاں ہویاں لگ بھگ 60 توں ودھ پُستکاں پنجابی ساہت دی جھولی پائیاں۔ ایہناں وچ لگ بھگ 22 کاو سنگریہ، دے قریب ناول، 200 توں ودھ کہانیاں اتے ساہت نال سمبدھت کیرتاں، لوک ساہت اُتے لکھے شامل ہن۔ اینی وڈھ، ماترا وچ ساہت سرجنا اوس نوں گِناتمک پکھوں ہی نہیں سگوں گُناتمک پکھوں وی اُتم درجے دی ساہتکارا وجوں ستھاپت کر دی ہے۔

بھاویں امرتا پریتم پنجابی ساہتک حلقیاں وچ اک کاوتری وجوں سبھ توں ودھ پچھان قائم کر دی ہے پر اوس نے ساہت دی ہر وِدھا اوپر قلم آزمائی کر کے اک بہوپکھی ساہتکار وجوں وی پچھان بناؤن دا جتن کیتا ہے۔ پنجابی ناول ساہت وچ اوس نے وڈی گنتی وچ ناول سرجنا کر کے بھرپور یوگدان پایا ہے۔ میرے ہتھلے پرچے دا اوشاوی امرتا پریتم دا پنجابی ناول ساہت وچ ستھان نشچت کرنا ہے، ایس لئی اسیں اوس دی ناول سرجنا اوپر دھیان کیندرت کر دے ہوئے ایس کھیتر وچ اوس دے یوگدان بارے چرچا کراں گے۔

پنجابی ناول دا مُنڈھ بھائی ویر سنگھ دے ناول 'سُندری' نال بجھدا اہے۔ بیشک اوس دی پچھان دی اک کوی وجوں ودھیرے ہے پر 'سُندری' توں علاوہ اوس نے 'بِجے سنگھ'، 'ستونت کور' اتے 'بابا نودھ سنگھ' چار ناولاں دی سرجنا کیتی۔ ایہ سارے ناول، سنگھ سبھا لہر دے پربھاو ہیٹھ سکھ قومی لہر نوں کامیاب بناؤن وچ سہائی ہون لئی رچے گئے سن۔ ایہناں دی رچنا شیلی وی سندیشاتمک اتے سکھیاتمک ہی سی۔ بھائی ویر سنگھ دے

سمکالی موہن سنگھ دیوا تے چرن سنگھ 'شہید' آدی نے وی ایسے پرویرتی ادھین ہی ناولاں دی سرجنا کیتی ہے۔ ایہناں توں بعد نانک سنگھ ایس ساہتک کھیتر وچ پرویش کردا ہے۔

نانک سنگھ دے پنجابی ناول وچ پرویش کرن نال ایس دے وکاس وچ وِشے پکھوں جو تبدیلی آئی اوہ سی ایس دے دھرم نرپیکھ ہون دی۔ جتھے بھائی ویر سنگھ دا مکھ سُر اُپدیشاتمک سی اوتھے نانک سنگھ سُر دھاروادی درشٹی کون ادھین سماج سُدھار نوں اپنا مکھ مُدّا متھدا ہے۔

جسونت سنگھ کنول ایس دے وکاس دا اگلا پڑاء بندا ہویا اپنا مُدّا سماج دی تبدیلی وجوں نشچت کردا ہے۔ ایس دور دے ناولاں نوں گُربخش سنگھ رومانچک آدرشواد نال سمبدھت کردا ہے۔ ایس ناول دے خاص لچھن ایہ ہن۔ اک وِکسیت پلاٹ، بھاوکتا اتے سارے پاتراں دا اصاف طور تے چنگیاں اتے ماڑیاں وچ ونڈ جانا۔ پنجابی ناول ساہت جگت وچ امرتا پریتم دا وی وڈ مُلا یوگدان ہے۔ اوس دے ناولاں بارے رچرچا کرن لگیاں ساڈا دھیان سبھ توں پہلاں اوس دے ناول 'ڈاکٹر دیو' اوپر کیندرت ہندا ہے۔ ایس ناول دا ادھین کردے ہوئے ویکھدے ہاں کہ اس ناول وچ کافی لمبے عرصے دیاں گھٹناواں نوں پلاٹ وچ شامل کیتا گیا ہے۔ لیکھکا نے ایس وچ پیار، ویاہ، پروار اتے دھرم نال سمبدھت وشیاں نوں چھوہدیاں اک اجیہی ناری دا چرتر ابھاریا ہے جو سماجک قدراں قیمتاں اتے انیاواں دی شکار ہے۔ اپنے توں پہلی پیڑھی دے لیکھکاں نانک سنگھ، کنول اتے گُربخش سنگھ دیاں پرمپراواں نوں جاری رکھدیاں امرتا پریتم نے نرم، سُہل پر نال ہی نال انکھلی سان والی اتے اندرونی طاقت والی پنجابن ناری دا بمب اُلکیا ہے جو کجھ زیادہ دلیری وکھاؤندی ہے۔ زیادہ دلیری وکھاؤن توں بھاو ہے کہ مدھ ورگی دی کوئی وی کُڑی ویہویں صدی دے پہلے چوتھائی حصے وچ اجیہی نا سمجھی نہیں سی کہ اپنے پیار دے رشتے نوں ویاہ داروپ نہ دیوے۔ پر ناول دی نائیکہ ممتا دی ہوند دا ارتھ اوس دا دیوتئی پیار سی۔ سو کسے حد تک ممتا دا چرتر بھارتی استری دے پرم پراگت چرتر توں اُلٹ ہے۔ امرتا پریتم دی ایس نائیکہ دی وشیشتا ایہ ہے کہ اوہ اوہناں کارناں نوں سمجھن دی کوشش کردی ہے جنہاں نے اوس نوں موجودہ حالت تک پہنچایا ہے۔ لیکن مکھ نائیکہ وچ صرف چنگیائیاں ہی روپمان ہندیاں ہن۔ اوس دا اک آدرش پاتر ہونا ناول دے وچار دھارک مُل نوں کجھ گھٹاؤندا ہے۔ پاتر نوں اُلیکن وچ اک پکھتا اتے اُچے پیار دا رومانچی کرن ایس گل دا سنکیت ہن کہ اپنے پہلے ناول نال امرتا پریتم پنجابی ناول شیلی وچ بھائی ویر سنگھ دی ستھاپت کیتی اتے نانک سنگھ دی اگے ودھائی اُبھاوک رومانچک پرمپرا نوں شردھانجلی ارپت کردی ہے۔

اپنے دوسرے ناول 'پنجر' وچ امرتا نے ہندوواں اتے مسلماناں وچکار ودھدے ویر دے پورے دکھانت نوں روپمان کیتا ہے۔ ایس دے نال نال ملک نوں آزاد کراؤن لئی پنجاب نوں کیہ کیہ مصیبتاں جھلدیاں پیاں اتے کیہ کیہ قربانیاں دینیاں پیاں ایس گل نوں وی ابھاریا گیا ہے۔

پنجر تے 'اک سوال' تھوڑے بہتے فکر نال 'ڈاکٹر دیو' دے وشے نوں ہی اگانہ تر دے پرتیت ہندے ہن۔ اپنے ناول 'بند دروازہ' وچ اوہ ناری دی آرتھک سُتنترتا، اوس نوں دوجیاں دے نظریے نوں نظرانداز کرن اتے اپنے فیصلے آپ لین دی طاقت بخش دی نظر آوندی ہے۔ اوہ ناری چیتنا نوں اوس دی قسمت بدلن دا اک طریقہ درساؤندیاں ایس ناول وچ پریوار وچ ناری دی موجودہ آرتھک ستھتی نوں بدلن داوی سوال کھڑا کردی ہے۔ اصل وچ امرتا پریتم جس ناری دی پیش کاری کردی ہے اوس وچ مڈھلا فرق ایہ ہے کہ اوہ ہر حالت وچ پیار کرن دی اچھا تے امید جگائی رکھدی ہے۔ اوہ رومانچک امنگاں نال بھرپور ہے۔ اوس وچ اک اجیہا انتر وروده ہے جو کہ بھاوک پدھر تے اندرونی طاقت پیدا کردا ہے۔ بھاوکتا اتے اندرونی طاقت دا ایہ انتر وروده ہی امرتا پریتم دے ناری چرتر دی تازگی نوں وی برقرار رکھدا ہے۔

ایس پرکار وشے پکھوں اپنے مڈھلے ناولاں وچوں امرتا پریتم ناری بارے لکھدیاں اوس دے اخلاقی مسئلیاں اتے عورت نوں داسی بناؤن والیاں قیمتاں دے خلاف آواز اٹھاؤن توں شروع ہو کے سماجک مسئلیاں اتے بورژوا سماج دے ریتی رواجاں دی آلوچنا تک پہنچ جاندی ہے۔

اپنے اگلے ناولاں 'چک نمبر دار' آدے وچ لیکھکا نے شان، سویمان اتے آتم نربھرتا دے پکھوں سبھتوں پرتھ ناری چتر اُلیکے ہن۔ اوس نوں اپنے پاتراں دے آپسی رشتیاں وچ سبھتوں سوکھم اتے ڈونگھے احساس دا بیان کرن وچ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ایہ ناول انسانی ہوند، سچ اتے پریم دے سومیل بارے ڈونگھی سوچ دے احساس وی کرواؤندے ہن۔

امرتا پریتم دی سبھتوں وڈی خوبی ایہ ہے کہ اوہ صدا نویکلی شیلی دی بھال وچ رہندی ہے، جس نال اوس دے رچنا تمک ڈھنگ ہمیشہ نویں انش ویکھن نوں ملدے ہن۔ جیکر 'ڈاکٹر دیو' اتے 'اک سوال' وچ دکھانتک پہلو اگربھوی اوپر ہن تاں 'ناگ منی' دھرتی ساگر تے سدھیاں وچ اوس نے ناول سنرچنا وچ تبدیلی لیاندی ہے۔ ایس دے ناولاں دی وشیشتا ایہ ہے کہ لیکھکا منوگیانک پڑچول نوں بعد وچ ہور گہرائی نال استعمال کر کے امرتا پریتم اپنی ناولی کلا وچ لگاتار وکاس کردی ہے۔

'اریل'، 'جیب کترے' آدے ناولاں راہیں لیکھکا دی ناولی رچنا اندر آ رہی پرپکتا صاف نظر آؤندی ہے۔ ایہناں ناولاں وچ نوجواناں دے جیون درشن وچ امرتا پریتم دی، اوہناں نوں اتے اوہناں دیاں مصیبتاں نوں سمجھن دی کوشش دسدی ہے۔ لیکھکا دو پیڑھیاں وچکار پے پاڑے دے کارناں دا وستھار کردی ہے اتے اوہناں دے آپسی سمبدھاں وچکار آؤندیاں مشکلاں نوں بیان کردی ہے۔ سِوتا دی کہانی ایس دا سپھل اُدھارن کہی جاسکدی ہے۔

امرتا پریتم بھارتی بُرجیا سماج، جس وچ نفعے اتے نقدی دے سدھانت، انسانی قدراں اتے ضمیر توں زیادہ ضروری ہن نوں تمبدی ہے۔ لیکھکا ایہ درساؤن دی کوشش کردی ہے کہ پونجی وادی سماج دے پرانے کٹھور سدھانت اتے نویں زندگی وچ اک وڈا اتے ڈونگھا پاڑا ہے۔ سماج 'جیب کترے' ناول دے مکھ پاتر کپل ورگے ایماندار، نویں زندگی دے چاہوان نوجواناں اتے سِوتا ورگیاں کُڑیاں نوں سوے کاردا نہیں ہے۔

ایس پرکار عورت لئی اک سنتر اتے سوے نِربھر سوچ نوں اُلیکن والے نگاروشیاں دی ولکھن پیش کاری وچ امرتا پریتم دی نویکلی توں وکاس شیلی ناولی کلا دا وی بھرپور یوگدان ہے۔ اوس دے ناولاں وچ اوس دی ناولی کلا وچ ہور یہا لگاتار وکاس وی نظر آؤندا ہے۔ اوس دی پراپتی ایس گل وچ ہے کہ اوہ نویاں گلّھی جگتاں دی ورتوں سنکوچ نہیں کردی ہے سگوں اپنیاں رچناواں وچ نویں قسم دے تجربے کردی ہوئی نویاں ناولی ودھیاں نوں وی ابھاردی ہے، جہناں دا پنجابی ناول ساہت دے وکاس وچ وی محتوپورن یوگدان ریہا ہے۔ 'جیب کترے' اتے 'جلاوطن' وچ اوہ ناولی سمے وچ، بھوِکھ اتے پچھوکن دا ہیرپھیر کردے ناول دی گہرائی نوں ودھاؤن اتے اوس وچ پیش کیتے گئے اصلی سوالاں نوں ابھارن وچ سپھل ہندی نظر آؤندی ہے۔

ایس طراں اسیں دیکھدے ہاں کہ امرتا پریتم جدوں اپنا ناولی سفر شروع کردی ہے اودوں توں لے کے اپنے اگلے ناول تک وشے اتے کلا پکھوں وکاس کردی نظر آؤندی ہے۔ اوس دیاں ناولی سرجناواں سچے پنجابی ناول ساہت جگت دے وکاس وچ وشیش یوگدان پاؤندیاں ہن۔ پنجابی ناول ساہت نوں نویں دیسہدے ملن لئی پریرت کرن اتے وکاس دی نویں لیہے تورن وچ امرتا پریتم دا وشیش یوگدان ہے، جو پنجابی ناول ساہت جگت وچ ہی نہیں سگوں سچے بھارتی ساہت جگت وچ اوس دا سماجنک ستھان بناؤندا ہے۔ امرتا پریتم دا ساہت یوگدان ہمیشہ ساہت جگت نوں نظر اؤندا رہے گا۔ (لپی انتر: قمر الزمان)

ڈاکٹر ستندر سنگھ نور

امرتا پریتم دا کاوشاستر

امرتا پریتم دیاں کاوشاستر اتے کاوشلپ دیاں کئیاں گلاں تاں اوس دے کاووکاس نوں دیکھدیاں ہی سپشٹ ہو گئیاں ہن پر فر وی اوہدے کاوشاستر نوں کجھ وکھرا وچار لینا چاہیدا ہے۔ ایہ کردیاں ضروری نہیں کاوشاستر دے پرتیماناں ول دھیان دتا جاوے۔ سگوں سرچناتمک چیتنا نال اوس دے اپنے کاو اتے کاو سمبندھی کتھناں چوں اوس دے کاوشاستر ول سنکیت کرنا بن دا ہے۔ کوئی وی کوی اوس سدھانتک لہجے وچ پر میرک کاوشاستر جاں اوس دے سدھانتاں نال سمبندھت نہیں وی ہندا۔ کوی دا اپنی کوتا وچ کاوشاستری انداز ایوں ہندا ہے:

اک دردی
جو سگریٹ دی طرح
میں چپ چاپ پیتا ہے
صرف کجھ نظماں ہن
جو سگریٹ دے نالوں
میں راکھ وانگن جھاڑیاں

ایہ درد تے نظماں دا راکھ وانگ جھاڑنا اوہ چھن ہن۔ جہناں نال ایہناں کوتاواں دی ودھی دی گل جاں تھیمک کیندر جوڑیا ہویا ہے۔ ایسے نوں امرتا اک 'لمبی گرہن گاتھا' دے متھک پرتیک راہیں پیش کردی ہے:

درد دے کنے رنگ ہندے ہن تے ایہناں نوں
دھارن کرن والا رب جانے کنے رنگ جھلدا ہے

تے کنے دیوتے جھلدا ہے.......

کہہ سکدی ہاں کہ میں اج تک جو وی لکھیا ہے،

اوہ اک لمبی گرہن گاتھا ہے۔

(کاغذ تے کینوس)

اس دردنوں امرتا اپنا کاوشواس بناؤندی ہے۔ اوس دی کوتا وچ ایس دے دو پکھ ہن۔ اک پکھ عشق نال سمبندھت ہے، جس دی آواز اوس دا کاو ہے تے اس کاوتوں اس کاو وچ تڑپ وی اوسے عشق کارن ہے۔ اوس دیاں ایہ سطراں اجیہے پکھنوں ہی پرگٹ کردیاں ہن:

۱۔ عمر بھر دا عشق
بے آواز ہے
ہر میرا نغمہ
میری آواز ہے
حرف میرے تڑف اٹھدے
ہن ایویں
سلگدے ہن رات بھر
تارے جویں۔

۲۔ گیت میرے! کردے میرے
عشق دا قرضہ ادا۔
تیری ہر اک سطر چوں
آوے زمانے دی صدا۔
میری صحبت دے چراغ!
ایہ سیاہیاں بدلدے۔
گیت میرے خون دے!

ایہ زار شاہیاں بدلدے۔

(سنیہڑے)

اوہ کاؤنوں اک خط دے روپ کار نال، اوس دے سندیش نال سمبندھت کردی ہے۔ اوس نے اپنیاں کئی کوتاواں 'خط' دے وانگ ہی لکھیاں، کتے کسے خط دے لکھے اُلکھے شبداں دا اُتر وی دتا۔ اوس نے کاؤ شاستری چیتنا نال آکھیا:

ہر میرا نغمہ جویں میں
خط کوئی لکھدی رہی۔
حیران ہاں اک سطر وی
تیرے تک پجدی نہیں۔

(سنیہڑے)

کوتا دے اتہاس نوں اوہ عشق دی اس پیڑ دے اتہاس نال سمبندھت کردی ہے۔ اس پیڑ دے اتہاس دی اوس نے اپنی کوتا وچ بار بار گل کیتی ہے تے ہن وی اوس نوں آدرش عشق دی پیڑ اوویں لگدی ہے۔ کوتا اس پیڑ انوں پیش کردی ہے:

ڈاچی سے دی اجے نکھیڑ دیندی
سسی اجے وی پنوں دا کھرا بھالے۔
دو ویں اتیاں حسن دا مل پیندا
ہتھ تیسا تے اجے وی پیر چھالے۔
کٹھا عشق جو چھری اپٹھری تون
رت اوس دی سمدی پئی حالے۔
کانی سمے دی سدا ہی رہی لکھدی
خونی پترے پیار دی پیڑ والے۔

(سنیہڑے)

ایتھے ہی درد والے کاؤ وشواس دا دوجا پکھ اگھڑنا شروع ہندا ہے۔ جتھے اوہ عشق نوں لوکائی تے

اتہاس دی تراسدی نال سمبندھت کرلیندی ہے۔ اِس داسدھا پرگٹا امرتا نے 'میں تواریخ ہاں ہند دی' اتے ہور کئی کوتاواں وچ کیتا۔ دلاں دا بھیت وچ پرتیکاتمک روپ وچ ماں۔ دھی سمواد ہے۔ ماں دی پنجاب دی تواریخ ہے تے دھی سے دی جوانی۔ ماں دے بولاں وچ اوس تراسدی دا اُلیکھ ہے۔ اوس حرف دی پہچان وی ہے:

بکھر ا عشق لوکائی دا،

اوکھا حرف پچھانا،

اوکھا ناؤں لکھانا۔

(اشوکا چیتی)

اس لمی کوتا وچ فرید، نانک، شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث، ہاشم، شاہ محمد تے ہور شاعراں نے اپنے کاو وچ پنجاب دی پیڑ کویں پچھاتی اس دا نریکھن ہے۔ کوتا دی جھوجھی ذے واری جاں چیتنا بن دی ہے۔ امرتا اس دا اُلیکھ کردی ہے۔ کوتا چراغ کویں بالدی ہے، اوس بارے آکھدی ہے:

وارث دیوا بالیا

چانن اٹھے جاگ۔

جوت جگایا جوت نوں

راہیں بلے چراغ۔

اوہیو صدی اٹھارویں

ہاشم آیا وت۔

عشق سوغاتان دتیاں

پچھی آتش گھت .....

(اشوکا چیتی)

جدوں اوہ 'اج آکھاں وارث شاہ نوں' وچ وارث نوں پنجاب دے سبھیاچارک نائیک دے طور تے آواز ماردی ہے تاں ایہ اوس دے کاوِ وشواساں دا ہی اظہار تے اوس دی درشٹی ہے۔

ایوں امرتا نے اپنے کاوِ شاستر نوں اپنے کاوِ چِہناں تے کاو اتہاس دے اس نریکھن راہیں پرگٹایا۔

اس نال سمبندھت ہور گلاں پر گتاؤن توں پہلاں اوس دی وارتک وچوں اوہناں کجھ کتھناں دا وشلیشن کیتا جا سکدا اے، جہناں داسدھا سمبندھ، اوس دے کاوشاستر، کاو پریوجن، کاو پرورتی جاں کاو وِدھی نال بن دا ہے۔

'سورج ونشی-چندرونشی' وچ اوس نے لکھیا:

''میں صحیح ارتھاں وچ لیکھک اوس نوں من دی ہاں۔ جہدی قلم سیاہ دور دی چیخ ہووے۔''

'میں تواریخ ہاں ہند دی' ایہوجہی سیاہ دور دی اک چیخ ہی سی۔

امرتا نے اپنیاں تقریراں وچ کاو تے ساہت دے مسئلیاں، وِدھیاں آد بارے اکثر گلاں کیتیاں۔اک وار آکھیا:

''رچنا زندگی دی آلوچنا ہندی ہے۔زندگی دی کلپنا ولوں کیتی گئی، زندگی دے-یتھارتھ دی آلوچنا، زندگی دی سمرتھا دی آلوچنا۔ پر اس آلوچنا دا حسن اودوں ویکھیا جاسکدا ہے، جدوں ایہ احساس دی شدت، سوچ دی ڈونگھائی تے بیان دے انداز والے پورے تخلیقی عمل وچ گزر کے ساہمنے آوندی ہے۔''

ایہ گلاں کاو دے پرتیماناں بارے ہن تے پوری آلوچناتمک تے کاو-شاستری چیتنا نال آکھیاں گئیاں ہن۔

اوہ اپنی اک ہور تقریر وچ-یتھارتھ چنتن، پرگتی شیلتا نوں پربھاشت کردی ہے:

''جویں پھل دا دھرم خشبو ہے۔لیکھک دا دھرم چنتن ہے۔ اوہ کسے دی کال وچ ہووے،-یتھارتھ جو ہے تے-یتھارتھ جو ہونا چاہیدا ہے، جو اوہ فرق جان دا ہے تاں میری نظر وچ اوہ پرگتی شیل لیکھک ہے۔''

ایوں امرتا اوس کاو وچ وشواس رکھدی ہے، جس وچ ایہ پکھ سنیوکت ہو جاندے ہن۔ ایہو ہی اوہ درد دا چجھن پر بھاشت ہندا ہے، جس دی گل اسیں ارنبھ وچ کیتی سی۔اوہ قلم، اکھر تے ادب دی تاریخ بارے اس سنیوکت چیتنا دے انداز وچ اک ہور تقریر وچ آکھیا:

''جہناں نے وی ہتھ وچ قلم لئی تے قلم دی اکھ وچ بھر آئے اتھروں نوں دیکھیا تے فیر ہر اتھروں نوں اکھر بنا دتا، اوہناں ہتھاں دا درد تے اوہناں دا حاصل ادب دی تاریخ بن دا ہے۔

اوس دی ایہ چیتنا ہی ڈونگھی طرح اوس دی کوتا دی جگت جاں 'چھن پر بندھ' نال جڑی ہندی ہے۔ اوس دی کوتا تے تن تن چھناں رات، سُپنا تے سورج نوں وشیش طور تے دھیان وچ رکھیا جاسکدا ہے کیونکہ ایہ چھن وچار دھارک طور تے انتر سمبندھت ہو جاندے ہن۔ اوس دی کوتا دی چھن کاری نوں اک ہور چھن ''چیتر' توں بناہی نہیں سمجھیا جاسکدا۔ 'چیتر' دا اوس لئی وشیش مہتو ہے تے اوس دی لکھت وچ سبھ توں ودھ 'چیتر' دا ذکر کیتا گیا ہے۔ اوس نوں چیتر بارے اپنے کاوِنوں اک وکھری پستک وچ 'چیتر نامہ' نام وی دتا۔ ایہ چھن اوس دی کوتا دے پیراڈائم دی پچھان کردا دیندے ہن۔ 'کاغذ تے کینوس' دے ارنبھ وچ اس دا دھلا منو دگیا نک بندو وی ملدا ہے۔ اوس نے بچپن دی اک سُپن ستھتی بارے لکھیا ہے:

''رات اِنج لگدی سی کہ ہنیرے دا دریا وگدا پیا ہے، میں اس کنڈھے اتے ہاں تے سورج کتے دریا دے اوس پار چلا گیا ہے، پتا نہیں کتھے تے مین ایتھے ہی کھلوتی رہ جاواں گی، کدے اوس گھر نہیں جاسکاں گی۔''

ایہ گل امرتا دی کوتا وچ اک تلاش بن جاندی ہے۔ ایہ چھن اوس دی کوتا دے کیندری چھن بن دے ہن۔ ایہناں دا انتر سمبندھ کویں ستھاپت ہندا ہے، ایہ دیکھن لئی اوس دی کوتا وچوں کجھ کو اُداہرناں لئیاں جاسکدیاں ہن:

رات

۱۔ دل دے ویہڑے رات پے گئی
ایس داغ نوں کنج سکھاواں

۲۔ اج دی رات تاریاں بھنی،
جناں چانن درشٹی اونی۔

۳۔ ایہ کس طرح دی رات سی
ایہ کس طرح دی بات ہے۔

۴۔ رات دا الانبھا کہ دن جان لگا سی

۵۔ رات کڑی دی جھولی پاؤ
چٹا چن گری دا کھوپا۔

سُپنا

۱۔ فیر چنبا سپنیاں دا
رات بھر کھڑ دا رہیا۔

۲۔ سپنے دا اک تھان اُنایا،
گز کو کپڑا پاڑ لیا۔

۳۔ نیندر نے جیوں ہتھاں دے وچ
سپنے دا اک کولا پھڑیا۔

۴۔ اک دیہاڑے سپنا تیرا
ڈھا من دے پاسے جاندا

۵۔ ایس نگر وی سپنے آوندے
کنیاں وی سوچاں نوں بھیڑے۔

سورج

۱۔ سورج نے کجھ آٹھر کے
اج چانن دی اک باری کھولی

۲۔ میں روز سورج جمدی
تے روز سورج یتیم ہندا ہے۔

۳۔ جدی پشتی اک پنگھوڑا
سورج پیار ات دی ککھے۔

۴۔ سورج دے نال جھگے وچ
ایہ سورج کسے اُنیا ہے۔

۵۔ سورج دا اک کولا لے کے
لیکاں پاوے فیر بجھاوے۔

ایہناں چہناں بارے امرتا نے اپنی وارتک وچ وی کئی وار ذکر کیتا۔ اپنے اک بندھ 'سورج تے

سیال' دے حوالے نال اوس نے لکھیا:

''سورج دے ڈبن نال میرا کجھ روز ڈبدا ہے تے ایہدے مڑ اسمانے چڑھن نال، میرا کجھ روز اسمانے چڑھدا ہے۔ رات میرے لئی ہمیشہ ہنیرے دی اک جھناں وانگ رہی ہے جھنوں روز اس لئی ترنا ہندا ہے کہ اوس دے پرلے پار سورج ہے۔''

''سورج دا ذکر مڑ مڑ کے میریاں نظراں وچ آوندا رہیا۔''

(رسیدی ٹکٹ)

سپنیاں بارے امرتا نے بے شمار لکھیا ہے۔ 'لال دھاگے دا رشتہ' وچ اوس نے 1988 تک دے اپنے سپنے ہی بیان کیتے ہن۔ 'میں تینوں فیر ملاں گی' دیاں کوتاواں سپن جگت وچ پھیلیاں ہندیاں ہن۔ کئی وار راتاں سپناں تے ہور چہن کھلے ملے اوس دے اوچیتن دی اوستھانوں کا وبھاشا وانگ بمبت کردے ہن:

''اک وار رات نوں مہاں بھارت پڑھدی پڑھدی سونہ گئی سپنے وچ ویکھیا اک کبوتر اڈدا آیا تے اوہنے میری جھولی وچ پناہ لے لئی۔ ویکھیا، اوہدے پچھے اڈدا باز وی سی۔ تے اوہ میرے کولوں اوس کبوتر نوں منگ رہیا سی۔ کبوتر اپنی جان دی حفاظت منگدا گھٹ کے میرے نال لگا ہویا سی کہ باز نے مینوں آکھیا، ''جے کبوتر نہیں دینا تاں ایہدی تھاویں اپنے پنڈے دا ماس تول کے دے دے۔ میں اپنے پنڈے نالوں ماس لاہ کے اوہدے وزن دا تولنا چاہیا، پر کبوتر ہور بھارا ہندا گیا، ہور بھارا، اینا کہ میں ساری دی ساری اوہدی تھاویں مرن لئی تیار ہوگئی۔۔۔۔ اک ہاسا کناں وچ گونجیا، تے نال ہی میرے پنڈے وچ ایہ احساس ہویا کہ ایہ کبوتر میری قلم دا پرتیک ہے تے اک مخالفت ایہنوں جانوں ماردین لئی ایہدے پچھے پئی ہوئی ہے۔۔۔۔۔''

(رسیدی ٹکٹ)

ایوں ایہ چہن امرتا دی کوتا تے وارتک وچ کیول کھلے ملے ہی نہیں، سگوں دوناں نوں وی انتر سمبندھت کر دیندے ہن۔

چیتر

ایوں ہی چیتر دا چھن اوس دیاں لکھتاں وچ رچیا مچیا ہے۔ چیتر دا مہتو اوس دی کوتا وچ کویں تے کیوں ہے، اس بارے امرتا نے لکھیا:

''ساحر نوں ملن توں پہلاں میری زندگی وچ صرف خلاء سی۔ خلاء نوں کسے تتھ وار جاں رت نال نہیں جوڑیا جا سکدا پر ساحر جدوں ملیا، اوہ چیتر دا مہینہ سی۔ پہلی وار وی تے اگوں اک کرشمے وانگ، کئی وار۔

اوہدے پہلے میل ویلے میری عمر مساں ویہاں اکیاں ورھیاں دی سی۔ دیوانگی دا عالم اودوں وی ویکھیا سی پر جدوں میری محبت نوں دیوانگی دی سکھر چھوہی، اوہ 1953 دے چیتر وچ ہویا۔ اوہدا میل سی۔ اس میل وچوں میں سنیہڑے کتاب دیاں ساریاں نظماں لکھیاں (سوائے اک نظم توں) اس لئی سنیہڑے بھاویں 1955 وچ چھپی سی پر اوہدے مڈھلے صفحے اتے 1953 دے ناں لکھیا ہویا سی۔

کئی چیتر اوہ وی آئے جدوں اوہدا میل نہیں ہویا پر انج جویں چیتر دے مہینے چیتر نہ آیا ہووے۔ نظماں ہر چیتر وچ لکھیاں تے فیر ہر لکھن کال، میرے لئی چیتر ہو گیا۔ اسے لئی اج اوہناں ساریاں نظماں نوں جو میری محبت دی دیوانگی ہن، چیتر نامہ وی کہہ سکدی ہاں۔''

(میں جمع توں)

ایوں امرتا دی کوتا وچ چیتر اک چھن لچھنک وانگ پھیل دا ہے تے اوس دی کوتا وی کجھی چھنکاری وچ اس دا وشیش مہتو بن جاندا ہے۔ کجھ اداہرناں:

۱۔ چیتر نے پاسا موڑیا
رنگاں دے میلے واسطے پھلاں نے ریشم جوڑیا،
توں نہیں آیا.......

۲۔ چیتر دا ونجارا آیا
بچکی موڈھے چائی وے۔

اسیں وہاجھی پیار کٹھوری
ویہندی رہی لوکائی وے۔

۳۔ پنجاں اتے ہے ویہ سوچ سمپت
چڑھیا چیتر مہینے تے ہوئی ناویں؟
ہتھیں اپنی لکھے سنیہڑے میں،
ہتھیں اپنی آپ وصول پاویں۔

۴۔ چیتر نے بوہا کھڑکایا
اج دا گیت اس طرح بنایا۔

۵۔ وحیاں لے کے چیتر آیا
بجی اکھ زمیں دی پھڑکی۔

۶۔ اک چیتر دی پنیاں سی
کہ چنادوھ میرے عشق دا گھوڑا
دیساں تے بدیساں نوں گاہن توریا۔

(چیتر نامہ)

امرتا نے محبت نال جڑیاں اپنیاں کچیاں کوتاواں نوں چیتر نامہ آکھیا، اس لئی چیتر دا چھنک اوہناں ساریاں کوتاواں دے انگ سنگ ہے۔

ایہ چھن / چھنک پھیل دے تے ارتھاں دیاں بہو دشاواں ول سنکیت کر دے ہن۔ امرتا دا کاو شاستر اس چھنکی سمرتھا دے وشواس نال جڑیا ہویا ہے۔ ایہ چھن پر بندھ اوس دا سندیش بن دا ہے۔ اوہ آکھدی ہے:

نویں رت دا کوئی سندیش دیوا
ایس کانی دی لاج نوں پالنا وے۔

(سنیہڑے)

تاں اس سندیش وچ چھنکی طور تے رات توں لے کے پربھات دے سورج تک سپیاں چوں

لنگھدیاں اک یاترا ہے۔ اسے لئی کئی وار اوہ اس چھن پر بندھ دے اوس سندیش نال جڑدیاں اکٹھی گل کردی

ہے:

رات ہے کالی بڑی

عمراں کسے نے بالیاں؛

چن سورج کہے دیوے

اجے وی جگدے نہیں۔

اس دے نال ہی امرتا لئی سمرتھ کوتا دی شکتی سنتر تا دا احساس دین وچ ہے۔ اوس نے 'رسیدی ٹکٹ'

لکھیا:

''اگ دی بات ہے، توں ہی ایہہ بات پائی سی۔' لکھ کے جاپیا کہ ہن چوداں ورھیاں دا

بن واس بھگت کے سنتتر ہاں۔''

ایوں امرتا دا کاوشاستر اوس دردتوں لے کے اس سنتتر تا دے احساس تک پھیلیا ہویا ہے تے اوس

دی کوتا دا چھن پر بندھ اس کاوپیراڈائم دا ہی پرگٹا ہے۔

☆☆☆☆

سجاد حیدر

جان پچھان

خیال دے راہ اُلیکن لگیاں ساڈے چیتے دیاں کنیاں کئی بے باک ہتھ کھچدے نیں،
اندروں بے وس ہو کے باہر آ جان والے کئے ای منہ زور جذبے ساڈی سوچ نوں گنجھلاں پاوندے نیں تے
کدھروں کوئی ازلی ایلی آ کے ساڈی زبان دی پھرکی بھوان لگ پیندی اے۔ ساڈی قلم دی قلم سانبھ کھلوندا
اے۔ انج ساڈیاں نظراں ساہمنے آون والی ہر شے غلانی جاندی اے۔ بہروپ بھرلیندی اے۔ ساڈے دل دا
رنگ ساڈیاں اکھاں وچ آ جاندا اے تے سانوں نظر حوالے ساڈیاں تصویراں وچ من بھاوندے رنگ
اگھڑدے جاپدے نیں۔ انج جے اپنا آپ وکھر کھ کے دیکھیئے تے خورے سانوں خدا دی اپنی محنت کیتی اکارت
جاپے۔ اوہنے تاں اپنی خدائی دی نینہہ ای جذبیاں اتے اساری اے۔

ایس ویلے جد میں اپنے اک ساتھی بارے لکھ رہیاں میرے دماغ وچ آن منے جذبیاں دیاں تیز
نوہندراں ڈونگھیاں اتر رہیاں نیں۔ میں سچ دا سوہج قائم رکھن واسطے ایس توں بناں ہور کجھ نہیں کر سکدا جے
اوہنوں جیویں میں آپ ویکھیا اے۔ انجے ای تہانوں وی وکھا...... میں ایس گلوں ڈرناں کدھرے تہانوں
میری جھولی وچ پھل ای پھل نہ دسن۔ میں منناں میری گلچیں نظر ایس سدا بہار باغ دے پھلاں تیکر ای جا کے
رہ گئی اے پر خورے تسی کنڈے وی ویکھ لوؤ۔ میں پھل چن کے تہاڈے اگے ڈھیر کر دیاں گا...... تہانوں پھل
چنگے لگدے نیں تے بھخدے مچدے گوہڑے پھل چگ لیا جے، تے جیکر کنڈے چن دے اتے تکھیاں نوکاں
والے کنڈے ویکھ بھال لیا جے۔ پر ایہناں پھلاں نالے جے کنڈے ہین تے اونے ای جنے پھلاں نال
سوہندے نیں۔

امرتا پریتم انسانی احساس دا موقلم اپنے اتھروواں نال بھیوں کے لوک پیڑ دے نازک نقش ابھار دی
اے۔ آدم دی اولاد دے دکھاں دیاں ایہناں تصویراں وچ اوہ اپنے دردمند دل دے خون نال رنگ بھر دی

اے اتے درد رنجانی انسانیت دیاں ایہناں بے زبان مورتاں نوں صدا اندازی دے جادو نال مونہوں بولن دا اذن دیندی اے۔ ایہہ جادوگری سدھی سانویں دلوں اٹھ دی اے تے سنن والیاں دے دلاں وچ اتر جاندی اے۔ احساس دل نزول سچائی ای امرتا پریتم دی بلاری وچ اثر دا شہد گھولدی اے۔ جگ بیتیاں نوں اوہ انج بڈ ورتیاں دی رنگن وچ رنگدی اے جے ہر کسے دے اپنے الہڑے گھاؤ چھوپے جاندے نیں تے اوہ خلقت دیاں دکھاں دے قصے سن سن کے اپنے ہاڑے کرن لگ پیندا اے...... وچھوڑے دی اگ، پیار دی سک، ادھ اٹیوں ٹٹ کے ڈگن دا سلہہ، دنیا دے دکھ، اپنیاں دا بیگانہ پن، بھکھ، غریبی، غلامی تے انسان دا انسان تے ظلم مڈھ قدیم توں ہر زبان دی شاعری دے مضمون نیں۔ پر نریاں لفظاں دے الٹ پھری نال کلام وچ اثر پیدا نہیں ہندا تے ایسے کر کے گرامر دے ٹل تے شاعری کرن والیاں دے بول سنن والیاں دے کناں دیاں پردیاں نال ٹکرا کے پرت اوندے رہے نیں۔

دل تیکر اپڑن دا راہ اوہناں نوں نئیں لبھا۔ جس جذبے نوں کہن والے نے آپ تہہ تیکر محسوس نہیں کیتا اوہدا اندرلا حال اوہ دوجیاں نوں کیویں دس سکدا اے۔ امرتا پریتم نوں جدوں کوئی اظہار دا سوالی جذبہ اپنے دل وچ پنگر دا جاپدا اے تے دوجیاں ساہمنے لیاؤن توں پہلاں اوہنوں رج رج کے محسوسدی اے۔ اک نظم "بابا" بارے میں آپ جاناں جے اوہ امرتا نے کنیاں پہراں دی اشکباری دے بعد لکھی سی تے لکھن ویلے اوہنوں ایس کر کے گھڑی گھڑی رکنا پیندا سی جے اتھرو تھمن وچ نہیں سن اوندے۔ احساس دی ایس شدت نال دلاں تے ٹونے کرنا بہتا اوکھا نہیں ہندا۔

امرتا پریتم دے احساس دی صداقت نے ای اج اوہنوں ہندوستان تے پاکستان وچ پنجابی شاعراں دی صف وچ سبھ توں اگے لیا کھلوایا اے۔ ایہناں دوہاں ملکاں نے اپنے آپ دے سیاسی جھگڑے جھیڑے بھل کے ایہہ سانجھانیاں دے دتا اے جے امرتا پریتم ایس ویلے دی عظیم پنجابی شاعرہ اے۔ اج پاکستان وچ پنجابی بولن والے اوہدے کلام نوں اوسے شوق تے عقیدت نال پڑھدے تے سندے نیں جیویں ہندوستان دے پنجابی اپنی بولی دی سبھ توں ودھ دل ٹھمبن والی شاعری دا مان کردے نیں۔ امرتا دی اک نظم "اج آکھاں وارث شاہ نوں" پاکستان وچ اپنی تھانویں چھپی تے ترجمہ ہوئی اے جے ایس دیس دی ادبی تاریخ وچ کسے دوجے ملک دے لکھاری دی اینی مقبولیت دی کوئی ہور مثال نہیں مل سکدی۔ پاکستانی پنجاب دے ادبی رسالیاں وچ کسے ملکی پنجابی شاعر توں ودھ ایس شاعر دا کلام چھپدا اے تے بڑے چاء نال پڑھیا جاندا

اے۔

جیہناں دیساں وچ پنجابی بولی نہیں سمجھی جاندی اوتھے لفظاں دا جادو اثر نہیں کردا، ایس کر کے چونویاں اکھراں دے جوڑ نال اساری ہوئی شاعری اوپری زبان وچ ڈھل کے آپنا اثر گم کر دیندی اے۔ امرتا دی شاعری ایس کٹھالیوں وی کندن ہو کے نکلی اے۔ امرتا دیاں نظماں اینکاں ویری انگریزی وچ چھپ چکیاں نیں تے اوہدی شاعری بارے کئی مضمون انگریزی اخباراں رسالیاں وچ نکل چکے نیں۔ ایہناں ترجمیاں وچ اوہدے شعراں دا سوہج نکھریا اے تے اوہناں دے اثر وچ رتا روالی فرق نہیں پیا۔ پنجابی ادب دے منے پرمنے نقاد پربنس سنگھ نے امرتا پریتم دی شاعری بارے بڑے سلجھے انداز وچ انگریزی اخباراں ''ٹائمز آف انڈیا'' تے ''سٹیٹسمین'' وچ مضمون لکھے نیں۔ ایسے لکھاری نے امرتا پریتم دی اک نظم ''مجبور'' ترجمہ کر کے ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' وچ چھپوائی اے۔ اک ہور نظم ''حق'' دی انگریزی تے مرہٹی وچ ترجمہ ہو کے چھپی اے تے ایہناں ترجمیاں نے اوہدا روپ سوایا کردتا اے۔

اج توں اٹھاراں ورہے پہلوں امرتا نے اپنا پہلا نظماں دا مجموعہ چھاپیا ''امرت لہراں'' نوں پڑھ کے پنجابی دے نقاداں نے ایس زبان دی شاعری دے اسمان تے اک نویں تارے دے ابھرن دی پیشن گوئی کیتی۔ ایہہ کتاب اوس ویلے لکھی گئی سی جدوں روائتاں دے پرچھاویاں اوہدی سوچ دے آلے دوالے اپنیاں چھانواں کیتیاں ہوئیاں سن۔ اوہنے اپنیاں ریجھاں، اپنیاں اڈاریاں اپنے توں وڈیاں تے اپنے توں سیانیاں دے سپرد کر چھڈیاں سن۔ اوہ ایہناں وڈیریاں دی اکھیں ویہندی تے اوہناں دے دسے ہوئے راہواں تے ٹردی۔ ایسے کر کے ایہہ شاعری اوہدی اپنی محسوس کیتی ہوئی سوچ توں زیادہ اوہدے نالوں وڈیاں، اوہدے نالوں سیانیاں اتے واپری ہوئی کہانی اے۔

اوہدی دوجی نظماں دی کتاب ''جیوندا جیون'' پہلے مجموعے توں تن سال بعد چھپی۔ ایہدے وچ اوہنے دستی بجھی توں وکھ ہو کے اپنی ورتی لکھن دا جتن کیتا۔ ایس مجموعے وچ پہلے دوردیاں بتاں نوں توڑن دا راہ دسدا اے تے لیہہ توں ہٹ کے اپنے راہ چلن دی خواہش جاگ دی معلوم ہوندی اے۔ پر اجے اوہدے ساہمنے کوئی نواں راہ نہیں سی کھلیاں جیہڑا اوہنوں سوچ دی نویں منزل ول لے جاندا۔ ایس کر کے اوہ اعتماد تے بے خوفی ایہناں حرفاں وچ نہیں جیہڑی اپنا راہ آپ بنان والیاں دے ہوٹھاں اتے آئے ہوئے بولاں وچ ہندی اے۔ امرتا اوس تھاں نویں آن اپڑی سی جدوں اگاں ودھن دی تاہنگھ وی ہندی اے تے راہ دی اوکھیائی

داہول وی۔

''ترےل دھوتے پھل'' لکھ کے امرتا نے روپ بارے اک نواں تجربہ کیتا۔ ایہہ ساری کھلی کویتا سی تے ایہدے وچ پیار دی سک دے نال نال سیاسی تے مجلسی جکڑاں توں اکی ہوئی روح وی پئی کرلاندی سی۔ ایس کتاب وچ کئیاں تھانواں نے اچی کلانوں اپڑن دی آس پئی دسدی سی تے خیال پہلاں توں نویں سن۔

''او گیتاں والیا'' تے ''بدلیاں دے پلے وچ'' امرتا دی کلا پکیری ہوگئی تے اوہدے خیال ڈونگھیرے ہوگئے۔ اوہدے جذبیاں نوں جیبھاں لگ گئیاں تے اچیاں اڈاریاں دی ہوا اوہدے کھنباں وچ بھر گئی۔ پھیر اوہنے ''سجھ دی لالی'' لکھی جیہدے بارے پنجابی دے منے پرونے لکھاری نوتیج نے لکھیا'' پنجابی وچ کھلی کویتا ایدوں سوہنی کتے نہیں ملدی۔ ایہدے وچ اے۔ امرتا پریتم دی جادو بولی دا محسوس ہون والا سنگی'' ایہنوں جیہناں پڑھیا اے اوہناں نوں نوتیج دی تنقیدی دیانت اتے پورا یقین آگیا اے۔

''لوک پیڑ'' لکھن نال امرتا دی شاعری اک نویں سنگھم تے آن پہنچی۔ اوہدے شعر دار مک رمک وگدا پانی چھلاں بن کے کنڈھیاں اتوں اچھالے لین لگ پیا۔ اوہدے بیان وچ دور دراڈیاں خیالی وارداتاں دا ذکر گھٹ گیا تے جیوندے جاگدے انساناں دی حیاتی دے دن تے محسوس ہون والے دکھاں اوہدی قلم دا رخ اپنے ول پھیر دتا۔ اوہ زندگی دے بہت نیڑے آگئی تے بدلاں دے اوہلیوں تپ دی تراس تراس کردی دھرتی اتے آن اتری۔ اوہدے کلام وچ سچائی دا سارا سوہج سما گیا تے اوہنے رومان دی رنگین دنیا پچھے چھڈ کے لوک پیڑ دی سانجھی وراثت نال اپنے شعراں دا حسن ودھایا۔

وقت دے تقاضے نوں سمجھ کے اوہنے پیار تے سوہج دے دل لٹن والے مضمون پراں رکھ کے غریبی تے بھکھ دے کلیجہ منہ نوں لے آون والے تذکرے چھوہ دتے۔ اوہدے گیت اینکاں دکھیاں دی درد بھری پکار بن گئے تے اوہدی شاعری نے غریب بیکس عوام ولوں موجودہ مجلسی نظام دے خلاف جنگ دا نعرہ بلند کیتا۔ پر اجے اوہدے شاعر مزاج دل دی سیج توں رومان دی پنج پھولاں رانی تھلے نہیں سی لتھی۔ اوہنے ''پتھر گیٹے'' لکھ کے لنگھیاں بہاراں دیاں کھڑیاں کملایاں پھلاں ول پرت کے جھات پائی تے اک واری پھیر دھرتی توں اچیاں فضاواں دیاں رنگینیاں اوہدا دل موہ لیا۔ اوہ پھیر لوکاں توں دور چلی گئی۔ اوہنے پھیر شاعری دے ازلی مضمون...... پیار دیاں کہانیاں چھوہ دتیاں تے شعر وچوں لوک پیڑ دی کرلاٹ کڈھ کے اوہنوں نغمے دا سوہنا روپ دتا۔

پیار دی کتھا امرتا دی شاعری وچ اینی رچی ہوئی سی کہ جدوں تیکر کوئی دلاں وچ ترتھلی پان والا طوفان نہ اوندا اوہ ایہناں مٹھیاں سفنیاں نوں چھڈ نہیں سی سکدی۔ اوہدے شعر نوں اک نویں حیاتی اک نویں للکار دین واسطے انسانی تاریخ دا سبھ توں گمبھیر طوفان آیا۔ ملک دے بٹوارے دیاں پیراں تے پیڑ دھڑدے نویں دکھ آئے تے نویاں سرحداں دے آر پار جنداں لوہیاں گیاں، دلاں نوں اولڑدے روگ لگے تے سر ایپنے بھار نال دھرت تے آن ڈگے۔ اپنیاں بروہاں سی مٹی چم کے متھے نال لان والے انسان، جیہناں دیاں جڑاں دھرتی وچ رکھاں نالوں وی ڈھیر ڈونگھیاں سن، سارے بندھن توڑ کے اوپریاں واٹاں نوں ٹر گئے۔ (ایس انقلاب جیہنے عام انساناں دے دل ہلا دتے۔

امرتا پریتم دے دردی دل اتے ڈوہنگا سلھ لایا تے اوہنے ڈاہڈھیاں دکھی ہو کے جو کجھ لکھیا اوہ پنجابی ادب وچ مدتاں تیکر منزل دے نشان دا حکم رکھے گا۔ اوہدی اک لمیں نظم دا ٹکڑا ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' تاثیر وچ دنیا دی عظیم شاعری دے ٹکڑیاں نال رکھیا جاسکدا اے۔ ساڈی بولی وچ شعر دی زبان توں ایدوں اچی چیز آپ وارث شاہ دے کلام وچ وی کھوجیاں ای لبھے گی۔ ایہہ دل توں نکلے ہوئے حرف دی دماغ وچ پالے ہوئے بیان اتے اک بڑی وڈی فتح اے۔ ایس دل دی غنی شاعرہ نے سانجھیاں دکھاں نوں ایس انداز وچ نظم دا روپ دتا اے جے کوئی اکھ نہیں جیہڑی پڑھ کے دکھاں دیاں پانیاں وچ ڈب ڈب نہ جائے۔ سمیں دی واگ نوں پچھان موڑ دیاں ہوئیاں آکھیاں اے۔

گلیوں ٹٹے گیت، پھر
ترکلیوں ٹٹی تند

ترنجنوں ٹٹیاں سہیلیاں،
چرکھڑے گھوکر بند

سنے سیج دے بیڑیاں،
لڈن دتیاں روڑھ

سنے ڈالیاں پینگھ اج
پپلاں دِتی توڑ

دھرتی تے لہو وسیا
قبراں پیّیاں چون

پریت دیاں شہزادیاں اج
وچ مزاراں رون

اج سبھے قیدو بن گئے،
حسن عشق دے چور

اج کتھوں لیائیے لبھ کے
وارث شاہ اِک ہور

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

امرتا پریتم نے ایس خون روندی لوک پیڑ دی کہانی پنجاب دے گھراں وچ صدیاں توں سنائیاں جان والیاں قصیاں دے انداز وچ کہیا اے۔ اوہنے ایس ادس کتھا وچ ایہدے اپنے اندر دے دکھ توں ودھ دین نہیں بھرے تے مُڈ ھلے انسانی جذبیاں نوں لفظاں اگے سوالی نہیں کیتا۔ ایہہ لکھاں ہدورتیاں دی اک جگ بیتی اپنی نرول سچائی، اپنے ٹھوس دکھاں تے سرپیّیاں وارداتاں سمیت امرتا دے قلم وچوں نکلی اے۔ اوہدی قلم نے کجھ پنیاں چھانیاں نہیں۔ بس ایس درداں بھری لمبی کہانی دا اثر پوری دیانت نال اپنے دل اتے محسوس کیتا

اے تے اپنے سہج مٹھے انداز وچ لوکاں نوں اوہناں دی اپنی آپ بیتی سنائی اے۔ اگ تے خون دی ایس گل وچ کدھرے کوئی غصہ نہیں، کوئی گلہ نہیں، کسے نوں کوئی دوش نہیں دتا۔ ایس کرودھ توں پاک دل دی آکھی دا اثر سبھناں نے قبول کیتا تے جتھے اوہ روئی اوتھے ساریاں دے اتھرو وگ پئے۔ جتھے اوہنے ہاڑے پائے اوتھے ساریاں دیاں ہوکیاں اوہدا ساتھ دتا۔ اوہنے اپنے دردمند دل دا دکھ لوکاں نوں ونڈیا تے اوہناں، پیار دے اک بول دے بھکھیاں اپنے دلوں اٹھے ہوئے غم اوہدے اگے بھینٹ کردتے۔ ایہناں دکھیاں دے دلاں اتے نگاہ ہون کرکے امرتا دی شاعری وچ اگوں اون والے ویلے بارے کوئی وسوسہ نہیں، کوئی ہراس نہیں، اوہنوں انسان دی عظمت وچ پورا یقین اے تے اون والے روشن زمانے دی امید بھری اڈیک۔ اوہ آپ آکھدی ''جیوے پھیر منکھتا جیوے پھیر منکھ'' تے لوکاں دا دھرتی نال انج مل ورتن ہندا اے بھئی ''ایہہ دھرتی اج لوکاں جوگی۔ ایہہ لوکیں اج دھرتی جوگے'' پھیر کھیتاں دی بھرپور جوانی دا گیت انج چھوہیا جاندا اے۔

ہاڑی بیجی، سونی بیجی
دونی بیجی، چونی بیجی

سڑ دا بلدا ہار گیا
تے ٹھنڈا اگر پوہ

کھیتاں دی بھرپور جوانی
میری بھکھ دی کرے کہانی

میری بھکھ دے گیت سناوے
پوے کلیجے کھوہ

پر انسان دی تقدیر سنور جان دا یقین اوہدی لکھائی وچوں جھات پیا پاندا اے۔ اک ہور نظم وچ انسانیت اپنے عروج نوں اپڑدی جاپدی اے۔

جاگے اج لوکائی دے حق جاگے
او ہناں کھوہنیاں دی سونہہ کھا کے تے

''سانجھے حق تے دھرتیاں سانجھیاں نیں''
جھلّے کون ایس وار نوں آ کے تے

''کھیت لوگاں دے'' کھیتاں نے قسم کھادی
سٹے اَنّ دے ہتھاں وچ چا کے تے

رِنداں آن وفا دے تول دتے
سانجھی پَون دا جام اٹھا کے تے

امرتا پریتم نے اظہار دیاں نویاں راہواں لبھن توں پچھے اپنی شاعری دے مُڈھلے سوتے سکن نہیں دتے۔ پیار دی گل اج وی کسے مست الست وانگر جھمر پاندی اوہدے ہوٹھاں تے اوندی اے۔ کسے دی اڈیک، مِلن دی سک، ہک دا سیک تے پیار دے مضمون دی معاملہ بندی اوہ بڑے سوہنے طریقے نال نبھاندی اے۔ ہن بھانویں امرتا دی شاعری دا سارا جادو اوہدیاں رومانی نظماں تے گیتاں وچ بھریا ہویا نہیں پر پھیر وی ایس مقام تے آ کے اوہدی شاعری وچ اک مٹھاس، اک رنگینی، اک نغمہا بھر اوندا اے تے سوہل سوہنے لفظ اپنی بھاوَنی بنتر وچ من موہنی تاثیر لے کے ایہل اڈول ڈھلے اوندے نیں۔ امرتا دیاں تازیاں گیتاں وچ محبت دی واردات لوک پیڑے تے جا مکدی اے۔ کیوں جے روایتی محبوب دے نال اوہنے کھیتاں دی رانی کنک نوں وی سولاں سنگار کر کے حسن دے مقابلے وچ لیا کھلوایا اے تے شاعری دے معجزے نے اوہنوں ہورناں سوہنیاں توں ودھ جاذب نظر بنا دتا اے۔ عشقیہ شاعری دیاں کجھ ونگیاں توں تسی ایس صنف وچ امرتا پریتم دی مہارت دا اندازہ کر سکو گے۔ دل وچ پیار اٹھن داذ کر اے۔

قدماں نوں دو قدم ملے سن
زمین نے سن لئی سوہ

پانی دے وچ گھل گئی ٹھنڈک

پُوناں وچ خشبو

دن دا چانن بھیت نہ سانبھے

رات نہ دیندی راہ

اج وگدی پُرے دی واء!

یاداں دل وچ تھرتھلی پاندیاں نیں تے مونہوں ہوکے بل بل کے نکلدے نیں

پیار میرا ہوگیا یاداں دے حوالے

کنڈھیاں نالوں ٹُٹ گئے ناتے

چھپوؤں نالوں رشتے مک گئے

دل دریا وچ کانگاں آیاں

اتھرو کھان اُچھالے

یاداں دے حوالے

ایہو جہیاں دل ٹمبن والیاں جذبیاں دی کہانی کئیاں لطیف اشاریاں وچ بیان ہندی اے۔ کدی انج کہ

اجے وی اوہو سفنے تیرے

اکھیاں وچ لشکدے

کدے ایس اچاٹ سوچ دے سہارے بھئی۔ ''کیہے ٹونیاں ہارے راہ'' تے کدے ایس مٹھی اگ دے سیک اتے کہ

سانوں پنکھ وکنڈڑے لے دے

یاں رہ پو ساڈے کول

پیار دی واردات دے سارے رنگ امرتا پریتم نے ''نویں رت'' وچ سموئے نیں تاں جا کے دل دے خون نال رنگیا ہویا ایہہ گلدستہ ساڈے تیکر اپڑیا اے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر سدرشن گاسو

وشو بھائی چارے اتے سدبھاوناں دی شاعری: امرتا پریتم

آدھونک پنجابی ساہت دے اتہاس وچ امرتا پریتم داناں اک مان جوگ اپل بدھی وانگ انکرت ہویا نظر آوندا ہے۔ اوس نوے اپنے ساہت وچ اس مانوی قدراں قیمتاں اتے سمویدناواں نوں کاوک انداز اتے شیلی وچ بہت ہی خوبصورت بھرپور جیون جیون لئی پریت کردی ہے۔ اوس دی کوتا وچ منکھ ولوں سرجیاں ونڈیاں سماپت ہندیاں نظر آوندیاں ہن۔ اوس دی کوتا منکھتا نوں ایکتا دے سوتر وچ بجھیا ویکھنا لوچدی ہے۔ بھارتی ناری دی ستنتر، مان جوگ مانوی ہوند دی ستھاپتی لئی اوس دی کوتا وشیش روپ وچ پرجتن شیل نظر آوندی ہے۔

امرتا پریتم دی کوتا دی وڈی خوبی، خوبصورتی اتے مہتو اس گل وچ ہے کہ اوس دی کوتا پڑھ کے زندگی ہور حسین اتے مانن جوگ لگن لگدی ہے۔ زندگی نوں ویکھن دا اوس دا نظریہ اسارو اتے اتشاجنکھے۔ اوہ ماڑیاں اتے الٹ پرسدھتیاں وچ وی حوصلہ نہیں ہاردی۔ اوس دی کوتا پڑھ کے پاٹھک زندگی جیون دے سپنے لین لگدا ہے۔ اوس دی کوتا نے بھارتی نوجوان پیڑھی نوں چنگیرے اتے پیاریکت جیون جیؤن دے سپنے بُنجون والی پیڑھی دے طور تے تیار کیتا۔ اوس دی کوتا پڑھ کے پاٹھک سمویدن شیل اتے سمویدنایکت بن جاندا ہے اتے اپنے پیار دے چاواں دی اڈاری اوہ اس قدر لاؤندی ہے کہ اوس نوں اسمان چن، ستارے، سورج دھرتی اوس نوں اپنے چاوناں وچ سموندے وکھائی دیندے ہن۔ اس کر کے اوس دے چاء، سدھراں، بھاوا تے جذبے نویں نکور، مہتوپورن اتے شاناں متے جاپن لگدے ہن:

دواکھیاں دے پانی اندر کل آں، کجھ سپنے گھولو
ایہ دھرتی اج ساڈے ویڑے چنی رنگ آئی وے
برہادا اک کھرل بلوری جندڑی دا اساں سپنا پیٹھا

روز رات نوں امبر آکے منگدا اک سلائی وے

حسناں دے عسقاں والیو! جاؤ لیاؤ موڑ کے

وشواس دا اک جات روجھتے دی کدھرے ترگیا

امرتا نے اپنی کوتا وچ منکھی پریم، سد بھاونا، امن، اصول، لوک بھلائی، وشو بھائیچارے دی بہتری اتے بہبودی دی دعا دے گیت گائے ہن۔ امرتا دی ہر دا اصاف، سچا تے سُچا سی، اسے کر کے اس دے ہردے وچوں نکلے گیت لوکائی دے درد دے گیت بن کے ابھرے ہن۔ اوہ وشو بھائی چارے دی سد بھاونا دی شاعرہ ہے۔ اوس دی کوتا قدرت دی سندر پوشاک پا کے نویں نویلی دلہن وانگ مٹکدی اتے مچلدی وکھائی دیندی ہے:

حق سمے دا شاہ اسوار ہووے

واگ سمے دی انج سنبھالنا وے!

پیر جگ دے پیر جگ دے منزلاں ڈھونڈ سکن

دوہاں دیویاں نوں کیکن بالنا وے!

نویں رت دا کوئی سندیش دینا

ایس کانی لاج نوں پالنا وے!

بور پووے جوں جمیں دے رکھاتے

ٹاہنی امن دی، عمر دا آلھنا وے!

درد دے گیت گا سکن بڑا مشکل ہندا ہے لیکن جدوں درد دے گیت نون کوئی شاعر گاؤندا ہے، اوس سے اوہ اوہدی شاہکار رچنا ہو نبڑدی ہے۔ شوکمار بٹالوی نے اپنے درد دے گیتاں نوں جدوں گایا، لوکاں نے اوس نوں دھیان، ہمدردی تے پریم نال سنیا۔ درد دا جنم ہی پریم وچوں ہندا ہے۔ ڈونگھے، نرمل تے نرچھل پریم وچوں درد جاگدا ہے۔ فیر شاعری وچ آ کے ایہ درد نجی نہیں رہندا، لوکائی دا درد بن جاندا ہے۔ ایہی ساہت دا سنساری کرن دا سدھانت ہے۔ ایتھے آ کے ہی درد دلاں دا دارو بن دا ہے' اج آکھاں وارث شاہ نوں' نظم جیہڑی پنجابی ساہت جگت وچ امرتا دی سبھتوں ودھ پرسدھ رچنا ہے، امرتا دی اک لمی نظم 'تواریخ' دا وچکارلا حصہ ہے۔ اس نظم وچ امرتا نے 1947 دی ونڈ دا دکھانت بھوگتی بھارتی لوکائی دا بہت ہی مارمک چتر الکیا

ہے۔ اس حصے وچ آ کے امرتا جی دی نظم اپنے پورے جلوا تے سموید نا دی سکھر نوں چھوہندی ہے۔ اس نظم وچ امرتا جی دا نجی دکھ درد، سنتاپ اتے بھارت دے لوکاں دا دکھ، درد اتے سنتاپ اک مک ہوئے جاپدے ہن، ایہی اس نظم دی پراپتی ہے۔ ایہی اس نظم دی پرسدھی دا کارن / آدھار ہے۔ اس نظم وچ شبداں نے وی امرتا دا ساتھ دتا ہے۔ دکھانتک ہون دے باوجود کلا دی درشٹی توں اوس نے اپنے بھاواں نوں اک روانی، لیجے اتے لَے وچ ابھیویاکت کیتا ہے بھاو درد دا گیت ہے ایہ نظم اتے ایہ درد دا گیت ہی لوکاں دے دکھاں دا دارو بنیا:

اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول۔

تے اج کتابِ عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول۔

اک روئی سی دھی پنجاب دی، توں لکھ لکھ مارے وین،

اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں واث شاہ نوں کہن۔

اُٹھ دردمنداں دیا دردیا، اٹھ تک اپنا پنجاب،

اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب۔

کسے نے پنجاں پانیاں وچ دتی زہر رلا،

تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا۔

ایس زرخیز زمین دے لُو لُو پھٹیا زہر،

گٹھ گٹھ چڑھیاں لالیاں پھُٹ پھُٹ چڑھیا قہر۔

سانپردائیکتا دے خلاف امرتا دی آواز ہورناں پنجابی شاعراں نالوں سبھ توں ودھیرے تیز، تکھی تے پربھاوشالی وکھائی دیندی ہے:

جد مذہبی عشق جنون بن سرنوں چڑھدے جان

تد لوہا چڑھدا اسان

بندیاں دے منہ ترکھے، پریتاں دے منہ کھنڈھے

سوہیاں رت دیاں ناڑاں

کالے ناگی ڈنگیاں، نیلیاں پینڈیاں جان

کسے برودی اولھیوں، زہر ولسیاں ناگاں

ہر ہر جاندے راہیاں دے جیوں راہ ولنگدیاں جان

منکھی جذبیاں وچلی آشا ہی اوس نوں نویں نویں سبھیتا دی اُساری لئی پریت کردی ہے۔ اسے لئی 1947 دی ونڈ دے دکھانت نوں جھلدی ہوئی منکھتا فر نویں اتہاس نوں سرجن لئی اٹھ کھڑی ہندی ہے۔ امرتا انوسار، آشا، امید اتے اتشاہ ہی اصل زندگی ہندے ہن۔ زندگی بناں کسے اُسارو جذبے اتے سوچ دے جیوں ای نہیں جاسکدی۔ پنر اساری دی اس اتہاسک ضرورت اتے بھارتی لوکاں دے ایجنڈے نوں اوس نے بہت ہی خوبصورتی نال بیان کیتا ہے:

میں تواریخ ہاں ہند دی، میرے پچھلے ورقے کج

جیوے جگاں تیک واے--- جو ورقا لکھیا اج

اج سرگھی ویلا ویکھدا نویں جگاں دا مکھ

پنجابی مناں دی اچی مٹی اتے روشنی دا، چنتن دا، سوچ دا دیوا جو ساڈے پرکھے بال کے گئے ہن، اوسے روشنی وچ پنجابی سبھیاچار آلوکت ہویا سگوں وشونوں اپنی لوء نال نہ کیول رشناں رہیا ہے بلکہ دنیا نوں اپنے دل آکرشت وی کر رہیا ہے۔ پنجابی اپنے من دے اچے امبراں اتے ہمیشہ ہی اک اچے تے سچے سوچ تے سورج نوں مگھائی رکھنا چاہندے ہن۔ اسے لئی اوہناں دی زندگی وی نیکی، اچتا، سچتا، سُچتا، سارتھکتا دا مجسمہ نظر آوندی ہے۔ امرتا پریتم دی قلم خوبصورت ڈھنگ نال لکھدی ہے:

چانن دی پھلکاری تو پاکون بھرے

امبر دا اک اعلیٰ، سورج بال دیاں

من دی اچی مٹی دیوا، کون دھرے

بھارتی سنسکرتی تے سوچ دا سندیش اوس نے اپنی شاعری وچ بہت پربھاوشالی ڈھنگ نال دتا بھاو اوہ ورثے اتے وراثت دی اچتا تے سچتا نوں اپنے نال لے کے چلدی رہی ہے:

'سن نی دھیے میرے! ایہ میرا پنجاب

بیٹھ حضوری ایس دی ایہ اک پاک کتاب

حرف سنہری ایس دے امن، اہنسا، تیاگ

سمیاں والی رات وچ جاگ تے جویں چراغ'

اس دی کوتا داوڈا ہنر اس گل وچ ڈبیا ہویا ہے کہ اوہ اپنے اُدیش اتے سندیش نوں پراکرتک بمباں نال بہت ہی خوبصورتی نال پیش کردی ہے۔ قدرت دا حسن اس دی کوتا وچ ہوردی کھڑ کھڑ پیندا ہے۔ پرکرتی امرتا دی کوتا وچ انگنت بمباں، پرتکیاں اتے تشبیہاں دے روپ وچ ودمان ہے۔ امرتا کا ودی وشیشتا ایہ ہے کہ اس وچ پرکرتی دے انیکاں روپ شاید پنجابی دے باقی کویاں نالوں سبھ توں ودھیرے اتے وبھن روپاں وچ پریوگ ہوئے ہن۔ امرتا، چن، سور، تاریاں، دھرتی اتے بدلاں نوں کدے کسے روپ چتودی ہے اتے کدے کس روپ وچ۔ اجیہا کردے سمے اس دی کوتا وچ دہراؤ دا احساس نہیں ہندا سگوں تازگی ہمیشہ برقرار رہندی ہے۔ قدرت اس نوں اپنی سکھی سہیلی لگدی ہے، اک حسین مَیار وانگ امرتا کدے اس نوں کسے روپ وچ سجاؤندی ہے، کدے کسے روپ وچ، کدے اس کول اپنا کوئی دکھ سکھ پھولدی ہے اتے کدے کوئی۔ کدے کوئی بدل 'میگھدوت' بن کے کسے پریمی دا سنیہا اپنی پریمکا نوں دین جاندی ہے، کدے سورج رات دی کُکھ وچ اتر جاندا ہے۔ انج امرتا قدرت نال اپنی پروارک سانجھ ستھاپت کرلیندی ہے۔ اسے طرح دی سانجھ نوں کسے سمے ساڈے رشیاں منیاں اتے گروواں نے وی ستھاپت کیتا سی۔ سری گرونانک دیو جی نے قدرت نال اپنے پیار نوں بہت سہج اتے آنند بھرپور درشٹی توں پرستت کیتا سی جد اوہناں نے لکھیا سی 'میری رنجھن لایا بھینے ساون آیا۔' گرو جی ولوں قدرت نوں بھین دے سمبودھن دوارا ستھاپت کیتا سمپرک وشیش ساتوک اتے اپنت بھرے ارتھاں دا سوچک ہے:

دھرتی انگن موہکلا لوک وڈا پروار

بھارت پیڑھا ر نگلا انگن دے وچکار

دھرتی دیس پنجاب دی، حوراں وچوں حور

داواں جھلن پکھیاں متھا چمے نور

امبر لہنگا بھچیا دھرت لوائی پون

پیریں تارے بنھ کے راتاں جھمر پون

رت پھرے لٹ باوری سوندی امبر تان

بدل زلفاں کالیاں اسوں گندے آن

کنک پھل کپاہ دے ریشم پے جائے مات

مکھر چہرہ رانگلا کتے پوہ دی رات

کھیت جویں پھلکاریاں چیتر لایا منگ

امرتا کا وڈی وڈی وشیشت ایہ ہے کہ اس نے ناری دے حق وچ آواز بلند کر دیاں ہویاں کتے دی مرد دی ہوند نوں نندیا جاں ردیا نہیں سگوں اس نے مرد نوں جیون وچ اک سہ یاتری دے روپ وچ سویکار کیتا۔ اجوکے سمے وچ ناریوادی لہر دے ادھین مرداں نوں بھنڈنا اک فیشن بندا جا رہیا ہے۔ ایہ اس لہر دا اک ناہندرو پکھ ہے۔ مرد اتے استری اس سماج اتے سبھیاتا دے مہتوپورن آدھار اتے پہلو ہے، ایہناں دوہاں دی سن یکت ہوند نال ہی چنگی جیون ودھی اتے ویونت دی کلپنا کیتی جا سکدی ہے۔ امرتا نے اپنی کوتا وچ فیشن پرستی ادھین اجیہا کجھ نہیں لکھیا جیہڑا مرد دی سنمان جوگ سماجک ستھتی نوں اپہاس وادی درشٹی توں اُجاگر کردا ہووے۔ اوہ استری دی اپمان جوگ ستھتی لئی مرد دی تھاویں سماج وستھا نوں دوشی سمجھدی ہے جیہڑی استری نوں اک ورتن دی شے سمجھدی ہے۔ جس سماج وستھا وچ پیار لئی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس دی نظم 'ویوپار' استری دے سراپ اتے سنتاپ بھرپور جیون جیؤں رہی زندگی دا ردن پیش کردی ہے:

جسماں دا ویوپار

تکڑی دے دو چھابیاں واکر اک مرد اک نار

روز بولدے ماس روز ویچدے لہو

تے آخر کا روٹ لیندے نیں

لہو مٹی دے نکے نکے سکے ..... دو..... ترے..... چار۔

نردوش پریمیاں لئی پریم دا رستہ کدے وی سہل نہیں رہیا، سماج وستھا نال پریمیاں دا ٹکراؤ مُڈھ قدیم توں رہیا ہے۔ امرتا ساڈے پریمیاں دے درد اتے دکھانت نوں سمجھ کے اس نوں اس ڈھنگ نال بیان کردی ہے کہ درد جاگدا لگدا ہے، کجھ کہندا لگدا ہے اتے سماج نوں اک سوال پاؤندا ہے؟ کتھوں دی نیکتا ہے؟ اوہ اک اجیہے سماج دا سپنا ساڈے ساہمنے رکھدی ہے جس وچ آپسی پریم پیار دی واوء رکھدی ہوئی واتاورن وچ مہکاں بکھیر دی رہے:

ڈاچی سمے دی اجے نکھیڑ دیندی

سسی اجے وی پنوں دا کھر ابھالے

دووین اٹیاں حسن دا مل پیندا

ہتھ تیسا تے اجے دی پیر چھالے

کٹھا عشق جو چھری اٹھڑی توں

رت اوس دی سمدی پئی حالے

کئی سمے دی سدا ہی رہی لکھدی

کونی پتر ے پیار دی پیڑ والے

امرتا دی کوتا پیار دے سموید ناتمک پہلوئوں بیان کرن سمے جنی کومل ابھویاکتی دا پریچے دیندی ہے۔ لوک مثالاں بارے اوہ اونے ہی آکورش دا پرگٹاوا کردی ہے۔ اج اوہ سہج روپ وچ ہی اپنی کوتا وچ پرگتیوادی اتے سماجوادی چیتنا دی گل کر جاندی ہے:

لکراوے کنڈیالیا، اتوں چڑھیاں چیت

جاگ پئیاں اج پیلیاں، جاگ پئے اج کھیت

لکراوے کنڈیالیا، چڑھیا اج وساکھ

سامراج دے منہ تے اڈاڈ پیندی راکھ

لکراوے کنڈیالیا، اتوں چڑھیا جیٹھ

اصل وٹے بھن دی، دھرتی تیرے ہیٹھ

....

حاکم دا حکم اونا ہے

اوہ جناوی کرلوے

تے پرجا دی پیڑ اونی ہے

اوہ جنی وی جر لوے ......

قدرت اپنے آپ وچ اک وشال اکائی ہے۔ دیشاں دیاں ونڈیاں، دھرماں، ذاتاں دیاں ونڈیاں تاں انسان دے پائیاں ہن۔ قدرت سرودیا پک،، وشال، سردھتکاری، مانورکھیاک، برہمنڈ نوں نیارا، نویکلا، اچیرا، آکرشک، من موہک روپ پردان کرن والی ہوند ہے۔ جیہڑا ساہتکار پرکرتی / قدرت

دے اس ورتارے/ ہوند نوں سویکار کردا ہے اس دی رچنا وچ وڈیرے مانوی سروکاراں نوں ویاپت ہونا سہجاوک پرکریا منیا جاسکدا اے۔ امرتا اس پکھوں پرے پورن کوتری ہے۔ اس نے پرکرتی دے مانوی سروپ نوں اپنی کوتا وچ بھرپور روپ وچ ابھیویکتی پردان کیتی ہے۔ اس ابھیویکتی کر کے اس دی کوتا داچہرہ مہرہ ہور سندر، آکرشک، آنندمی، رسی اتے کلیانکاری بن گیا ہے۔

پیار نوں امرتا نے ساری عمر آردھنا، پرارتھنا، بھگتی وانگ اپنایا۔ اس دا جیون پیار داہی دوسرا روپ بن گیا سی۔ اسے لئی اوہ اپنی عمر دے آخری ورھیاں وچ پنرجنم ملن سے اسے طرح دے پیار والا جیون جیون دی لوچا من وچ رکھدی رہی۔ دوبارہ جیون ملن دی ستھتی وچ اوہ اپنے پیارے پریتم نوں فر پیار وگڈے پلاں وچ ملنا لوچدی ہے اتے اپنی تانگھ دا پرگٹاواں انج کردی ہے:

میں تینوں فیر ملاں گی
کتھے؟ کس طرح؟ پتہ نہیں
شاید تیرے تخیل دی چنگ بن کے
تیری کینوس تے اتراں گی
جاں خورے تیری کینوس دے اتے
اک رہس مئی لکیر بن کے
خاموش تینوں تکدی رہواں گی

اپنیاں پچھلیاں کوتاواں خاص کر کے اپنیاں پستکاں 'میں تینوں فیر ملاں گی' اتے 'خاموشی توں پہلاں' وچ امرتا دی کوتا دے سروکار سماج نالوں ودھیرے آتم اتے اناتم، مکوش اتے مکتی دے رشتے نال سمبندھ ستھاپت کردے ہن اتے اس رشتے دے دوالے اسرے انیکاں پرشناں نوں لبھن لئی فکرمند اتے پریتن شیل نظر آؤندے ہن۔ اس دور دی اس دی شاعری کائناتی لیلاواں ول بھرپور اشارا کردی ہے، روحان دی گل کردی ہے، پرکھیاں نال سمبندھاں دیاں گلاں کردی ہے۔ اجہے سے اوہ اس سنسار نوں اک ہمسفر سمجھدی ہے۔ اس طرح اس دیاں نظماں وچ متھیاہاک حوالے، دھارمک روڑھیاں اتے آستھاواں دا وی ذکر آؤندا ہے۔ لوک یا نک دستو ویروے دیکھن نوں ملدے ہن۔ اس دور دی اس دی کوتا اپراتھیاتمک رہسوادوے سنموہن دا پربھاو ویکھیا جاسکدا اے:

اک جھولے جہے وانگ ویکھیا

کہ ٹک تھاں شواک دھونی سیک

رہے، ہن میں کھبے پاسے اوہناں دے

کول بیٹھی ہاں تے سجے پاسے

پاربتی نرت کر رہی ہے

....

کہ ہن میں موت دے چشمے وچ نہاؤنا ہے

جتھے سارے دکھ روگ کٹے جان گے

فیر کرشن مینوں روٹی دین گے، کسے راہ

دا سنگیت وی کرن گے.......

فیر کوتری اپنے آپ نوں ہی سوال کردی ہے کہ کیہ اوس نے کائنات دے سارے بھید جان لئے

ہن جاں.......

خدایا! تیریاں توں جانے

میں نہیں جان گی ....

جس طرح کائنات وڈی اتے وشال ہے، ایسے طرح امرتا دی شاعری دا کینوس وی وڈا اتے و شال ہے۔ جس طرح ندی دی دھارا نوں ونڈیا نہیں جاسکدا، اوسے طرح امرتا دی کوتا نوں کھنڈاں وچ ونڈ کے پڑھیا تے سمجھیا نہیں جاسکدا۔ اوس دی کوتا اکھنڈ تے نرنتر وہ رہی ندی دا نرمل جل دھارا وانگ سدیوی اتے پوتر ہے۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

ڈاکٹر سرب جیت سنگھ

امرتا پریتم کاوی دے کاوشاستری نکتے

آدھونک پنجابی کوتا دے اتہاس وچ امرتا پریتم دا یوگدان بہتی جان پچھان دا محتاج نہیں ہے۔ اوس دی کوتا نوں اکو سمے وکھو وکھریاں وچار دھارک درشٹیاں رکھن والے آلوچکاں / سمیکھیا کاراں نے مانتا ہی نہیں دتی سگوں وڈیائی وی ہے۔ ایسے وڈیائی وچوں پرگتی وادی کاو دورنوں امرتا موہن سنگھ یگ جاں دور عام کیہا جاندا ہے۔ اوس نوں ایوں ہی 'پنجاب دی آواز' جہے لقباں نال نوازیا گیا ہے۔ پرنساتمک درشٹی توں ایہو جہے لقب ساڈی دھارمک آدرش وادی سوچ وچار دی اپج ہن۔ ایہناں لقباں دی وڈی سیما ایہہ بن جاندی ہے کہ کاو پاٹھک اک شردھامئی ماحول وچوں بول اچاردیاں اوس پچھے دار و مدار نوں نظر انداز کر دیندا ہے۔ جس وچ رچنا ابجدی وی ہے اتے سمبادوی رچاؤندی ہے۔ دوسرا اوس نوں ہوراں دی گت مت توں نکھیڑنا اسمبھو ہو جاندا ہے۔ مثال دے طور دے امرتا پریتم اتے موہن سنگھ پرگتی وادی دور دے دو مہتوپورن شاعر ہن، دوواں دیاں کجھ سانجھاں وی درکار ہن، پرنتو دوویں شاعر اک نہیں ہن، دوواں دی کاو سمویدنا، کاو درشٹی، کاو انوبھو وچ ہی وکھریواں نہیں کاو ونچرنا اتے کاو جگتاں وچ وی ڈھیر انتر ہے۔ دوویں ویہویں صدی دے وچکارلے یگ دے منکھ نوں وبھن درشٹی کوناں توں انوبھو کر دے ہوئے وبھن روپ پترن دیاں ودھیاں دا پریوگ کر دے ہن۔ ایوں کہن توں بھاو ہے کہ اک یگ نوں دو شاعر وبھن نظریے توں دکھدے ہن، اک دوجے دا بدل نہیں بندے اتے نہ ہی اک دوجے دا پورک بندے ہن۔

دوسرا نکتہ ایہہ وی ہے کہ ویہویں صدی وچ چلی مہتوپورن لہر پرگتیوادی دے انو وان بیٹھ اسیں سطحی پدھر اتے امرتا پریتم نوں پرگیوادی شاعر وجوں وی ستھاپت کر دے رہے ہاں۔ پرگتیوادی لہر دا اوس سمیں اپناں زبردست پربھاو سی کہ ہر لیکھک پرگتیوادی کہن اکھاؤن وچ فخر محسوس کر دا سی۔ امرتا پریتم اوپر پرگتیوادی لہر دا پربھاو آوش سی پرنتو اوہ بنیادی طور تے پرگتیوادی کاو درشٹی والی اتے پرگتیوادی وچار دھارک درشٹی والی شاعری

نہیں سی۔ اوس سمیں اوپرے پرگتیوادی محاذ اتے اندولن داہی پربھاوسی جس نے مدھ ورگی شرینک کرداروچ سوتنترتا دے سپنے نوں جگایا سی۔ اوس سمیں ہر مدھ ورگے منکھ نوں انقلاب اپنے اوہناں دکھاں درداں دا دارو لگدا سی جیہڑا دکھ درد سامراجی بست وادا تے دیسی پونجی وادی سماجک سنگھرناوچوں اگمیں سن۔ سدھ ورگی منکھ ۔بدھی جیوی۔ رچنا کار نے اپنے کرداروچ اوہ بنیادی تبدیلیاں نہیں کیتیاں سن جنہاں دی منگ پرگتیوادی درشن کردا ہے۔ دوسرا مدھ ورگی کردارا اپنے ہت دے کارن ہی 'سنتنترتا' دے سپنے دا انو یائی سی۔ مثال دے طور تے پروفیسر موہن سنگھ جدوں ایسے سنتنترتا نوں ایہ کہندا ہے کہ 'ہو آزاد ہل پوویں گی توں' تاں کسے وی طراں دا بھرم نہیں رہندا۔ اُنج اسیں پھوکے پرگتیوادے آتم موہ چوں پروفیسر موہن سنگھ نوں جڈا مرضی وڈا پرگتیوادی کوی کہی جایئے پرنتو حقیقت ایہ ہے کہ اوہ رومانٹک اتے یوٹوپیائی ودھی اتے سوبھادا دھارنی ہے۔ ایوں ہی امرتا پریتم دا بارہ ماہ ہے۔ ایس وچ بھاوکتا سمبودھنی ودھی دو وآر انیارا بن جاندی ہے جدوں کہ شاعر جس چیتنا نوں جگاؤنا چاہندا ہے اوہ سطحی پرگتیوادی لکھائی بن جاندی ہے۔ پرنتو ایس لہر نے کاوہماوالی نوں کرت دے نیڑے تیڑے لیا کے 'اُچے نجھیتری' وسدی سُتنترتا دا وستھاپن کردتا۔ ایس وستھاپن وچ امرتا پریتم دی کوتا دا کاو شاستری نیم نہت ہے۔ اک نظم ویکھو:

نیلے امبر دی اک گُٹھے.....

رات مل داگھگووچے

چندر مادی چمنی وچوں

چٹا گاڑا دھواں اٹھے......

سپنے جیکن کئی بھٹھیاں

ہر اک بھٹھی اگ جھونکدا

میرا عشق مزوری کردا.....

میل تیرا کجھ ایکن ملدا

جیکن کوئی تلیاں اتے

اک ڈنگ دی روزی دھرتا....

رہندی اگ تے ہتھ سیکدا

گھڑی ماسے نسل ہندا

شکر شکر اللہ دا کردا

رات مل گئی گھکو وجے

چندرما دی چمنی چوں

دھواں نکلے ایسے آس تے--

جوئی کمائی سوئی کھانا

نہ کوئی کنکا کل دا بچیا

نہ کوئی بھورا بھلک واسطے

ایس کویتا دے پنڈے وچ اوس بمبا والی دا زور ہے جو کرت نال جُڑی ہوئی ہے۔ پرنتو ایس معیار اتے اوس دی کویتا نوں پرگتیوادی سدھ کرنا زبردستی ہے۔ امرتا پریتم اچھے اجیہی کاو بھاشا دی سرجنا ول رُچت ہے جیہڑی شرجن۔ کرت شکتی نال لبریز ہے۔ پرگتیوادی کاولہر نے اجیہی کاو بھاشا اگربھومیں اتے لیا کے کاو نوں کرت دا انجھا گرہن شیل بنا دتا۔ امرتا پریتم اپنیاں آرمبھلیاں کاو پستکاں صداچارک اتے آدرشک جذبیاں انوں روپنترت کردی ہے۔ اوہ سوے موہ توں سمبندھنی دھر تک دا ہی صرف نہیں کردی سگوں کاو اندر جیسے ودھی ودھیان اتے ویہار دی سرجنا کردی ہے جو تھار تھکتاں نال جُڑدا ہے۔ منکھی جیون دے آتم وردھاں وچوں اوہ مانوی ہوند دے تلاش نال جڑ کے ایسے ساجک آدرشاں دے سنچار ول ودھدی ہے جہناں دی صداچار توں اگانہ ساجک سار تھکتا اجاگر ہندی ہے۔ ساجک سار تھکتا دی درشٹی اوس نوں پرگتیوادی اندولن توں پراپت ہندی ہے۔ ایہ درشٹی پورن ساجک ورتارے پرتی اک سوجھی پردان کردی ہے۔ ایسے کارن اوہ عورت دی ہوند پرتی نظماں اندر اک اجیہا بھاو بودھ پیدا کردی ہے جیہڑا صداچارک نیتکتا دا موہنہ چڑاؤندا ہے۔ امرتا پریتم دے کاو دے اندر ویہ نیم کم کردا پرتک دکھائی دیندا ہے پرنتو ایہ نیم دوچار دھارک روپ وچ اگانہ نہیں تردا سگوں ہوند دی پچھان اتے تلفظ دے اردگردہی کارج شیل رہندی ہے۔ عورت اُن ملے نظماں وچ ایہ درشٹی بوند اوس دے کاو دا کا دشاسرتی نکتہ بن جاندا ہے۔

میں تیری سوچ تے جد پیر دھریا سی

میں اک نہیں ساں-- دو ساں

اک سالم ویاہی، تے اک سالم کنواری
سو تیرے بھوگ دی خاطر
میں اوس کنواری نوں قتل کرنا سی.....
میں قتل کیتا سی
ایہ قتل، جو قانوناً جائز ہندے ہن
صرف اوہناں دی ذلت ناجائز ہندی ہے
تے میں اوس ذلت دا زہر پیتا سی.....
تے فیر پربھات ویلے
ایہ لہو وچ بھجے میں اپنے ہتھ ویکھے سن
ہتھ دھوتے سن--
بالکل اوس طراں، جیوں ہور مشکی انگ دھونے سی
پر جیوں ہی میں شیشے دے ساہمنے ہوئی
اوہ ساہمنے کھلوتی سی
اوہی، جو اپنی جاچے، میں راتیں قتل کیتی سی......
او خدایا!
کیہ سیج دا ہنیرا بہت گاڑھا سی؟
میں کیہنوں قتل کرنا سی، تے کیہنوں کر بیٹھی......

امرتا پریتم دے کاو کیندر وچ عورت 'میں' روپ وچ سثھت ہے۔ امرتا پریتم اوس دی پچھان مرد پردھان سماج دے پرسنگ وچ کردی ہے۔ اوس دا سمچا اوسار سانمتی قدراں قیمتاں وچ عورت دی کھین ہو چکی ہوند دی ویدنا ہے۔ ایس کاوشاستری نقطے ول ڈاکٹر اتر سنگھ نے دھیان دواؤندیاں سترک وی کیتا ہے کہ، ''امرتا دی کوتا وچ استری لئی جو بھاوناجاں سمویدنا پرکاشمان ہوئی ہے، اوس نوں کیول استری واد ہی نہیں کیہا جا سکدا، جو اک فیشن وجوں باہروں ادھار لیا گیا ہووے۔ ایہ امرتا پریتم دی مانووادی درشٹی اتے سماجک چنتن دا اک انکھڑواں انگ ہے۔ اس درشٹی تے چیتنا دا سوما اوہ سمچا مانو کوندری دِتن سی جیہڑا منکھ دی ہوند نوں سربوتم سچ

سوئیکار کردا ہے۔ منکھی چیتنا نوں اتہاس نال سمبندھت کر کے ساپیکھک بناؤندا ہے اتے ساریاں منکھی سمسیاواں نوں شدھ مانووادی انتر سوجھی اتے اتہاسک وشو درشن نال جوڑدا ہے۔'' (ساہت سمویدنا، پنا - 155)

مانووادی ہونا مانوی سہردتا دا پرتیک ہے۔ فر منکھی ہوند دا پرتیک ہے۔ فر منکھی ہوند دی سمتر تالئی جدو جہد کرنا دچار دھارک طور تے اک دارشنک درشٹی نال جوڑنا ہے۔ امرتا پریتم اپنے آرنبھ دے دور وچ سدا چار دے کوڈھ نال جوڑدی ہے، فر پرگتی وادی ساہتک لہر دے پربھاو نال اتہاسک چیتنا ول ودھدی ہے تے تیسری) اجوکے پڑاء اوپر اوہ منکھی ہوند دے ادھیاتم اتے رہساتمک درشن ول پرتدی ہے۔ ایہ تنے پڑاء اوس دے کاوو وکاس دے ہی پہلو نہیں سگوں کاوشاستری سمجھ دے وی پڑاء ہن۔ محبت دا کیندری سوتر ایہناں تناں پڑاواں دے پنڈے وے آر پار پھیلیا ہویا ہے۔ اوس دی لمی کوتا 'سنیہڑے' وچوں اجیہا سوجھ دے کئی سوتر مل جاندے ہن جتھے اوہ محبت دے راہی گل کیہندی ہے۔

ڈاچی سے دی اجے نکھیڑ دیندی
سسی اجے دی پنوں دا کھر ابھالے
دوویں اتیاں حسن دا مل پیندا
ہتھ تیسا تے اجے دی پیر چھالے
کٹھا عشق جو چھری ایھٹروی توں
کت اوسدی سمری پئی حالے
کانی سے دی سدا ہی رہی لکھدی
خونی پترے پیار دی بیڑ والے

اسے کر کے اوہ اپنی سمپورن کوتا 'چیتر نامہ' وچ اسے بھاونا، سمویدنا، چیتنا اتے استتوی درشٹی توں بولدی ہے:

اک دردی۔
جو سگرٹ دی طرح میں چپ چاپ پیتا ہے
صرف کجھ نظماں ہن -

جو سگرٹ دے نالوں میں راکھ وانگن جھاڑیاں.....

امرتا پریتم محبت دے احساس نوں عورت دی ہوند دے پرتے بدل وجوں اوسار کے اپنی کوتا دے ارتھاں نوں معنوی کرت بنائی رکھدی ہے پرنتو جدوں اوہ 'آدِ رچنا' تے پہنچدی ہے تاں اوہ ادھیاتمک اتے دارشنک وِدھیرے ہو جاندی ہے اوس دی کوتا اتے سنگٹھن جٹل ہو جاندی ہے۔ اوہ پورو لے پڑاواں دے سرلی سچا اتے اکہرے سنگٹھن دی تھاویں کوتا دی مجمتا پرتی ودھیرے سچیت ہو کے جٹل سمرچنا رک دا پرمان دیندی ہے۔ اوس دی اس سمرچنا کاری چیتنا نوں 'آدِ رچنا' والیاں ست نظماں دا پاٹھ ضروری ہے۔ اوہ منکھی ہوند نوں دارشنک روپ چہ ادھیاتمک پہنچ درشٹی توں واچدی ہے۔ 'آدِ رچنا' نظم چوں لکھیا اس کا وشاستری وکاس دا آنبھاس ہو جاندا ہے:

میں- اک نراکار میں ساں
ایہ میں دا سنکلپ سی، جو اگ وانگ بھریا
تے اگ دا جلوہ پانیاں تے تریا.....
پر اوہ پراا تہاسک سمیاں دی گل ہے.....
ایہ میں دی مٹی دی تریہ سی
اک اوس نے توں دا دریا پیتا،
ایہ میں دی مٹی دا ہارا سپنا
اک توں دا جنگل اوس لبھ تا،
ایہ میں دی مٹی دی واشنا
تے توں دے امبر دا عشق سی
کہ توں دا نیلا جیہا سپنا
مٹی دی سیج تے ستا۔
ایہ تیرے تے میرے ماس دی سمگدھ سی-
تے ایہو حقیقت دی آدِ رچنا سی.....
سنسار دی رچنا تاں بہت پچھوں دی گل ہے.....

اس نظم توں امرتا پریتم دی بدل دی چیتنا دا ہی پتہ نہیں لگدا سگوں اوس دے کاو دے بدل دے اوہناں شاستری نیماں دا گیان ہندا ہے کہ کاو درشٹی اتے کاوانو بھوہن کیہڑیاں ستھتیاں چوں بولدا ہے۔ اجیہے درشٹی بندو دا نظر بیٹھ رہنا ضروری ہے نہیں تاں امرتا پریتم ورگی ذہین شاعرہ دی شاعری پرتی چنتن جھٹ پرم پراگت لیہاں تے ڈھل جاوے گا۔ اوس دی کوتا دے بدل دے دھراتلاں دی نشان دہی کرنی کاوشاستری سمجھ لئی اتے مہتھو پورن پہلو ہے۔ امرتا پریتم دے دھراتلاں دی سوجھ لئی اتہاسک پرستھتیاں اتے اوس سماجک انوبھوساردی سوجھی دی وی ضرورت ہے جتھوں ایہ اپنے آپ نوں بدلن لگدے ہن کیونکہ کوئی وی کاو دھراتل امورت دا نرپیکھ نہیں ہوسکدا اوس لئی اک پورن اتہاسک پرسنگ ہندا ہے۔ اس پرتی امرتا آپ بے حد سچیت ہے۔ اوہ اس سچیت ستھتی وچ سمبادکردی ہوئی بول اوچاردی ہے جس دا اوس دی کوتا نوں سمجھن وچ ہور سہائی ہوسکدا ہے:

دے میں ترکے گھڑے دا پانی
کل تک نہیں رہنا......
ایس پانی دے کن تریہائے
تریہ دے ہوٹھاں وانگو
او میرے موڑھے گھٹ دیا مترا
کہہ دے جو کجھ کہنا۔
اج دا پانی کیکن لاہوے
کل دی تریہ دا قرضہ
نہ پانی نے کتیں بجھنا
نہ پلے وچ رہنا.....
دیکھ کے تیری تریہ ورگی
اس پانی دی مجبوری
نہ اس تیری تریہ سنگ ترنا
نہ اس ایتھے بہنا....

اج دے پنڈے پانی لشکے

تریہ دے موتی ورگا

اج دے پنڈے نالوں کل نے

چپر وانگوں لہنا

دے میں تڑ کے گھڑے دا پانی

کل تک نہیں رہنا۔

اس نظم وچ امرتا پریتم جس 'تڑ کے گھڑے دے پانی' دا روپک ورتدی ہے، اوس صرف اتے امورت روپ وچ ارتھوت نہیں سگوں امرتا پریتم دی اوس چیتنا درشٹی دا لکھائیک ہے جو چاردھارا، جماتی ہوند، درشٹی کون، کاونظریے دا سوچک ہے جو سمے وکاس گرہن کردا رہیا ہے۔ اس وچ اوس دا چھپیا کاو سدھانت وی ہے، جیہڑا کاوشاستر دا پرکھ پہلو وی ہے۔ دوسرا اوہ دھروی ہے جو اوس نوں اپناؤندی ہے، پر امرتا اوس نال سمباد رچا رہی ہے۔ تیسرا جس وچاردھارا دا اوہ پرچلن کر رہی ہے اوس دی سارتھکتا دی سیماں وی اکھوں پروکھے نہیں ہندی۔ چوتھا جتھے اوہ کھڑنا چاہوندی ہے، اوہ وی گجھی نہیں رہندی سگوں 'پانی دی مجبوری' راہیں پرم تت ہندی ہے۔ امرتا پریتم دی کاوزخمیات دا ایہ اجیہا پہلو ہے جو 'ٹھنڈیاں کرناں' دے نال ہوندوچ آکے 'سنیہڑے'، 'کاغذ تے کینوس'، 'میں جماں توں'، 'توں پار ہندا ہویا ہن تک دیاں 'ناگ منی جھلماں' تک پہنچدا ہے۔

اوس دے کاووچ 'چھاتی دی اگ' دا چجن اجیہا ہے جس نوں چھیتی کیتیاں 'پرچھاویاں نوں پھڑن والے دی پکڑ' وچ آؤن دی سمبھاونا توں اوہ سچیت کردی ہے۔ ایتھے اوس کوتا نوں۔ تھارتھ دی فوٹوگرافی نہیں بنن دیندی۔ ایہ کسے کوی دا الہام نہیں ہندا سگوں اوس دی تچیتا ہندی ہے۔ کوئی وی رچنا کار اپنی دھرنال کھڑکے اوسے دھر دے۔ تھارتھ نوں جس کلاتمکتا نال پیش کر سکدا ہووے اوہ وڈا نہیں، مہان ہندا ہے۔ کدے اجیہا 'بالشاک' نے اپنے ناولاں وچ کیتا سی جس نوں پنجابی وچ امرتا پریتم نے کوتا راہیں کیتا ہے۔ اس لئی اوس دی وچاردھارک پرچنڈتا والی اس کوتا وچوں لنگھو جیہڑی کاوشاستری نکتہ نہیں اٹھاؤندی سگوں 'بالشاک' یاد کروا دیندی ہے:

اج میں اپنے گھر دا نمبر مٹایا ہے

گلی دے متھے تے لگا

گلی دا ناؤں ہٹایا ہے

تے ہر سڑک دی دشا داناؤں پونجھ دتا ہے

پر جوتساں مینوں ضرور لبھنا ہے

تاں ہر دیش دے ہر شہر دی

ہر گلی دا بوہا ٹھکورو۔

ایہ اک سراپ ہے اک ور ہے،

تے جتھے وی سنتتر روپ دی جھلک پوے

سمجھنا اوہ میرا گھر ہے.....

ضروری نہیں سنتتر تا تہاڈے، ساڈے، کسے ہور دے سپنیاں جہی ہووے پر ایہ ہور دے سپنیاں دا انوواد وی ہو سکدی ہے۔ ایہ بہت اہم ہے کہ سپنیاں دی Dimension تہاڈے ساہمنے آوے۔ اسے کر کے شاعر، وگیانی جاں سماج پرورتک نالوں وکھرا ہندا ہے کہ اوہ سپنا لیندا ہے باقی سپنے نہیں لیندے سگوں سپنیاں دا پریوگ کردے ہن۔ سپنا لین تے سپنا پریوگ دا انتر کا وشاستری چھن چکارنوں بدل دا ہے۔ جس نوں امرتا پریتم نے حقیقت چہ کر دکھایا ہے۔ اوہ عورت ہو کے محض عورت دی وکالت کرن والی شاعرہ نہیں۔ اس لئی امرتا پریتم نوں منکھ عورت جاں عورت منکھ دے روپ وچ چتونا ضروری ہے تاں ہی اوس دے کاوشاستری نیاں تک پہنچ سکدے ہاں۔

امرتا پریتم نوں پرگتیوادی کاو دھارا دے اک انگ وجوں سمجھن دی بجائے اوس نوں آدھونک شاعر وجوں سمجھنا اتے آدھینک ہوٹھ لیاؤنا ضروری ہے تاں ہی اوس دی کوتا دے دھر اندر کارج شیل نیاں تک پہنچیا جا سکدا ہے۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

ڈاکٹر سرجیت کنجاہی

ناری دی آواز--امرتا پریتم

سنسار دی وسوں دی ادھی آواز ناری دی آواز ہے۔ اس آواز وچ عمر گھٹ تے تراہ باہلا ہے۔ ورلیاں ناری قلماں نے اس تراہے تے سہے اُدگاراں نوں قلمبند کیتا ہے۔ پچھم دی ناری نے بیشک اپنی سدھ بدھ نوں قابو چہ رکھ آدمی نال ہر مہم وچ برابری دا ادھیکاری پراپت کیتا ہے۔ اس دے وپریت بھارت دی ناری اپنے پروارک جیون وچ دکھ دکھ پڑاواں تے دکھو دکھ نرویا کتیاں نال جڑی صدا قربان ہندی رہی ہے۔ مانو اتہاس دے لمے سفر وچ ہر تراسدی دی شکار عورت ہی ہندی آئی ہے۔ جیون جیؤن لئی لوڑیندے صدق اتے سرڑ دی وڈملی دولت دی تراسدی دے بھرپور سروتاں وچ صدیاں توں جمع ہندی رہی ہے۔ عورت کنی آسانی نال ہر کرتن بناں منہ وڈے ڈیک لیندی ہے، اس دا احساس ہر درد وت ہر دے نوں ہندا رہندا ہے۔

نر ناری دا اڈھلا فرق کیول اک مُندے تے وکھ ہویا دسدا ہے۔ نر ناری دی سانجھ دا بیج بندا، اگدا، نسردا، پھلدا تے پھلدا ناری دی دھرتی تے ہے۔ ایہ ناری دا کایا دا اجھوتا حصہ بن کے نو مہینے تک، جتھے سوادلی جلون بن ناری دیاں اندراں نوں نپی رکھدا ہے، اوتھے موہ ممتا دے سندار دا انکھڑواں انگ وی بنیار ہندا ہے۔ انج جیون لئی ہر شے نر تے ناری لئی اکو جہی ہے۔ ناری نوں جس کو ملتا کر کے نر نالوں زیادہ ناجکتا پردان ہے، اوہ اوس دی شان وی ہے تے کمزوری وی۔ نر اوس تے وکتی طور تے فدا ہندا ہویا وی اوس دے سر نوں تروڑدا ہے۔ ناری ہر پیڑ نوں پرشاد وانگ پراپت کردی ہے اتے اپنی وفائی نوں آخر دم تک نبھاندی ہے۔ نر دی فطرت وچ بھاویں اس اہمیت دی دی خشبو کدھرے کدھرے ضرور ملدی ہے پر اکثر اس دا احساس ورلا ورلا ہندا جاندا ہے۔ مانو جاتی دیاں بہتیاں جسمی تے آتمک قربانیاں عورت نوں دینیاں پئیاں ہن۔

ساہتکار دا وسترت سنسار، مانو اودگاراں دا وسیع پرگٹی کرن کردا آیا ہے۔ سنسار دیاں چنندہ قلماں نے ناری دے انتریو بھاواں نوں اپنے خوبصورت انداز وچ لکھیا ہے۔ کلا دے ہور کئی سروپ وی پچھے نہیں

رہے۔ایہناں سارے جتناں دے باوجود ناری دے نال بیت دی تراسدی دا صحیح مل امکن جو کسے قلم نے ریتا ہے تاں اوہ امرتا پریتم دی قلم ہے۔امرتا پریتم دی قلم دا جادو اج وی سنسار دے ساہتک اداریاں وچ اوس دی مشہور کوتا،)جو ہندستان دی ونڈ سے اتیاچار دا بھیانک چتر چتر دی ہے)نال بھجیا اتھر و کیردا ہے،

''اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول۔

تے اج کتاب عشق دا،کوئی اگلا ورقہ پھول۔

اک روئی سی دھی پنجاب دی،توں لکھ لکھ مارے وین،

اج لکھاں دھیاں روندیاں،تینوں واث شاہ نوں کہن۔

امرتا پریتم نے پنجابی ساہتک نوں اپنے لہو پسینے نال برہا جیویا اتے ہنڈایا ہویا دتا ہے۔اوس دا ہر اک ساہ ساہت سرجدا رہیا ہے۔کیہ کوتا ہے کیہ کہانی ہے تے کیہ ناول......،ایہ ساریاں ونگیاں امرتا دی چھاپ چھڈ گئیاں ہن۔کوتا وچ بھاو،بھاوناں ہیٹھاں چھپے زخم،زخماں چوں اٹھدیاں تراٹاں،تراٹاں تے چیساں دی انتہا جدوں گیت بن مشہور آوازاں دی ہوک بن فضاواں نوں ہلا دیوے تاں سمجھو کدھرے امرتا پریتم دی قلم تڑف رہی اے۔کہانی لکھدی ہے تاں پڑھدیں رونگٹے کھلو جاندے ہن۔ناول سرجدی ہے تاں سموہ سماج دی ویدنا اجاگر ہو جاندی ہے۔امرتا پریتم پنجابی ساہت لئی وشیش کر کدی نہ مکن والا سمندر ہے۔اس سمندر چہ اٹھدیاں لہراں سنسار دے سموہ سمندراں نوں ٹھاردیاں ہر ملک دے کناریاں تے وچھ گئیاں ہن۔ہر دھرتی دی ناری دی سمویدنا اوتھوں دی فضا وچ گونج گئی۔امرتا دی ہر رچنا نوں لوکاں نے پلکاں تے چک لیا۔کوتا،کہانی،ناول،لیکھ تے آلوچنا (رچناتمک)امرتا دے اکھد ساہتک بھنڈاراں وچ سُسجت الماریاں وچ امر ساہت پیا ہویا ہے۔سنساردیاں اوہ زباناں جو یورپ تے باقی حصیاں وچ بولیاں جاندیاں ہن،امرتا دے دل دی دھڑکن بن گئیاں نیں جنہاں وچ امرتا دا ساہت ترجمایا جا چکا ہے۔بھارت دیاں ہور زباناں وچ وی ایہ سرور موجود ہے تے امرتا ہر دل عزیز نام ہے۔

امرتا پریتم دا جیون پاردرشی شیشہ ہے۔اپنے ہردے دی پاردرشتا اوس دے جیون کال وچ اوس نال کویں نبڑی،اس گل دا احساس ہی کافی ہے کہ ناری ہردے دی قلم تاں سنسار دے کرخت رویاں نوں کویں نجٹھ سکدی ہے۔امرتا نے ناری ظلماں نوں ہنڈایا اتے اوس دے خلاف بغاوت دا پرچار جھلایا۔اوس دی رسیدی ٹکٹ نے ساہت کارتا دے جگت وچ بھچال لے آندا سی۔ناری نوں کیول کمزور تے بے وسی دے

برقعے بیٹھ لکا دینا مانو تا نہیں۔اس نوں اختیار کر لینا وی گناہ ہے۔ہر جیوندی جان اےنمان ہے۔اےنمان بن کے جیونا کنا مشکل ہے، امرتا نے ایہ جنگ جوجھیا ہے تے تے اوہ جیتوں رہی ہے۔ چنگیائی کیول قربان ہو جان دا نام نہیں ہے۔قربان کرنا ہے تے اوہناں غیر معنوی شکتیاں نوں قربان کرو جھاں کر کے سماج وچ اکسار تا نہیں رہندی۔عورت تے درد دوا کو جے جیوہن۔ کیول سریک بنتر ہی کافی نہیں۔ دماغی تے اخلاقی پدھر تا دی اک شہری پہنچ دوہاں نوں برابری دا درجہ پردان کردی ہے۔دوہاں دی سانجھ، دوہاں دا اک دوجے نال پیار، وچار تے وچاراں دی سانجھ سوچ، سانجھے سفنے بننے، سانجھے سنسار سرجینے اتے اپنی سانجھی ہوند نال سموہ سانو جگت وچ سٹیہڑے دینے۔

''سبھے سانجھی والو سدائنو، کوئے نہ دسے باہرا جیو''

امرتا نے اس برابری اتے سنیہ دی آواز اپنیاں رچناواں وچ دتی ہے۔''پیار'' پر ماتما دی سبھ توں قیمتی دستو ہے۔ پیار نوں سماج کویں تے کیوں سراپ سمجھدا ہے۔امرتا دے گیتاں وچ اس گھاٹ لئی تڑفن ہر ہردے نوں ہلا دیندی ہے۔

''پیار میرا ہو گیا یاداں دے حوالے
کنڈھیاں نالوں رشتے سک گئے، چھوواں نالوں ناطے ٹٹ گئے
دل دریا وچ کانگاں اٹھیاں، اتھر وکھان اچھالے
ایہ وی دنیاں تیرے لیکھے، اوہ وی دنیاں تیرے لیکھے
دوویں دنیاں وار چھڈ دے، پیار کرن والے
ایہ برہا سانوں سجناں نے دتا، ایہ برہا اسیں منگ کے لیا
ایہ برہا دے گھپ ہنیرے، کیوں کوئی دیوا بالے''

ہر روشن چراغ جدوں بجھدا ہے تاں ہنیرا پسردا ہے۔اج امرتا پریتم وی اپنا جیون سفر پورا کر کے سنسار توں وداع ہو گئی اے۔ اس خلا داذکر ہر جانو ہردا پیا کردا ہے۔امرتا دے جانو بڑے ہن۔امرتا نے ہر آوندے جاندے نوں اپنے چہرے دی سدیوی مسکان نال نوازیا ہے تے ہر اک نوں ساہت پیار دتا ہے۔ اپنی ناک منی نوں کافی مشکلاں ہون دے باوجود بڑی دیر تک چھاپیا تے لوکاں تک پہنچایا۔ پنجابی جگت وچ ایہ سدیوی چیپ اسبیہ دکھ ہے۔ پنجابی ساہتکاراں نوں جس پیار تے سنیہ دی دات ہمیشہ ملدی رہی ہے، اج اس

توں بغیر جیون دی آدر پانی پوے گی۔ امرتا پریتم نے کدی اپنے آپ نوں وڈیایا نہیں۔ ہر چھوٹے وڈے ساہتکاراں نوں سنیہ ونڈیا۔ جدوں کسے نے کوئی صلاح منگی، اوس نوں واجب اتر دے کے نوازیا۔ امرتا پریتم ورگی شخصیت صدیاں چہ کدی اک وار دھرتی تے آوندی ہے۔ اپنی کرنی تے رچناواں وچ امرتا سدا جیوندی رہیگی۔ امرتا دے ساہت وچ انتریو بھاواں دی قدر کر کے اسیں امرتا دے مشن نوں جیوندا رکھ سکدے ہاں۔ اسیں وی اس مہان کوتری دے سنویدنشیل ساہت دیاں تہاں چوں نگھ تے پیار مان دے ہوئے سرناتمک ساہت رچیئے اتے پیار دی دولت دا آنند مانیئے۔ ایہی امرتا نوں سچی شردھانجلی ہووے گی۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

ڈاکٹر سرندر سنگھ کومل
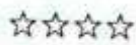
امرتا پریتم-141 کوتاواں

(ویدنا اتے سمویدنا دی شاعری)

امرتا پریتم -141 کوتاواں، اک اجیہا لکھن کوی-سنگریہ ہے جو لیکھکا ولوں 1847ء توں لے کے 1984ء تک لکھیا کوتاواں وچوں چونویاں کوتاواں نوں اپنے کلاوے وچ لیندا ہے۔ ایداں ایہ کوی-سنگریہ امرتا دی اک لمی کوی یاترا دا ویروا ہو نبڑدا ہے۔ ایہ اوس دے کوی وکاس دے بھین بھین درشاں نوں روپمان کردا ہے اتے اوس دے کوی وچلی انساں دی سوکھمتا، بھاوتمکتا اتے سنویدن شیلتا نوں رکھانکت کردا ہے۔ ایس سنگریہ دیاں کوتاواں دا دھیان کرن اوپرنت کوئی سہجے ہی جان سکدا ہے کہ کیوں امرتا پریتم نوں اپنے سمیں وچ یوگ کوتری ہون دا سنمان پراپت ہے۔ ایہ سنمان اوس نوں کیول ایس لئی ہی پراپت نہیں کہ اوس نوں 'پنجابی دی آواز' کیہا گیا سگوں ایس لئی کہ امرتا اپنی ساہت گھالنا صدقہ بھاشائی پاساراں اتے دیش کال دیاں حداں ایس ستر تک ٹپ گئی کہ اوہ 'منکھتا دی آواز' بن گئی، 'منکھ دی سمویدنا' دی آواز بن گئی۔

جویں کہ اوپر سنکیت کیتا گیا ہے، ہتھلے کوی-سنگریہ دی مکھ وشیشتا ایس دیاں کوتاواں وچلی ویدنا اتے سمویدنا نال ہے۔ جتھے ایس ویدنا اتے سمویدنا دا اک مکھ-گھٹک لیکھکا آپ ہے اوتھے ہی ایس دا سنبندھ پاٹھک ورگ نال وی ہے۔ رچناکار اکثر لکھن سمیں اپنے پاٹھکاں نوں درشٹی وچ رکھدا ہویا اپنی سمویدنا نوں شابدک روپ دیندا ہے۔ کئی واری رچنا وچ وی اقت ہوندی سمویدنا پاٹھک دے انوکول ہے جاندی ہے اتے کئی واری پاٹھک رچنا دے انوکول ہو جاندا ہے۔ ایداں رچنا خود ہی پاٹھک نوں اپنے ستر تک لے جاندی ہے۔ امرتا پریتم وی اک اجیہی کوتری ہے جو اپنی زندگی دیاں پراسدک، دکھد اتے سکھد اوستھاواں نوں ہنڈاؤندی ایناں نوں بڑے ہی سہج بھاو نال پرستت کر جاندی ہے۔ اوس دی ایہ جگتا ہی اوس دی سوچی کوتا نوں اک ولکھن پچھان پردان کردی ہے۔ ہتھلے سنگریہ دیاں 'چانن دی پھلکاری'، 'صحبت'، 'خوشبو'، 'قلم دا بھیت'،

روشنی‘، ’کفر‘ اتے عینکاں ہور کوتاواں سپشٹ روپ وچوں اوپروکت دھارناں دیاں پرمان ہن۔ ایناں کوتاواں وچوں کجھ انش ویکھو:

نظر دے آسمان توں
ہے تُرگیا سورج کتے
چن وچ پرا وس دی
خوشبو اجے آوندی پئی

رل گئی سی ایس وچ
اک بوند تیرے عشق دی
ایس لئی میں عمر دی
ساری کُڑتن پی لئی

(روشنی: پنا 67)

سپنے دا اک تھاں اونایا
گز کو کپڑا پاڑلیا
تے عمر دی چولی سیتی

گیتاں نال چکا جاواں گے
ایہ جو ساں موت دے کولوں
گھڑی ہدھاری لیتی

(کفر: پنا 79)

نرسندیہ ایہ کلا دی اک سکھر ہی ہوندی ہے جدوں رچیتا دی ویدنا، اوس دا دکھ ایوں رچنا وچ اکثر ہو جاندا ہے کہ اوس نوں اُداتیکرن ویلے کدی وی باہری پرپنچاں، جھوٹھے روپکاں دا آسرا نہیں لینا پیندا۔ بول رچنا داروپ دھار کے سُتے سدھ نازل ہندے رہندے ہن۔ ستندر سنگھ نور ایس آوستھا نوں ہڈاں تے ہنڈایا انوبھو

کہندا ہے۔ امرتا پریتم دیاں کوتاواں وی کجھ اجیہی ہی پیڑ، ایسے ہی انوبھودی ترجمانی کردیاں نظر آوندیاں ہن جدوں اوہ کہندی ہے۔

جویں سوچ دی کنگھی وچوں
ٹٹ گیا اک دندا
جویں سمجھ دے جھگے اتے
لگ گئی اک کھنگی
جویں صدق دی اکھ دے اندر
چبھ گیا اک تیلا
نیندر نے جیوا نگاں دے وچ
سپنے دا اک کولا پھڑیا
نواں سال اج ایکن چڑھیا

(سال مبارک: پنا83)

موت میری اک گل چروکی.........
کئی وار میں اٹھاں..... سوچاں.....
چلاں.... پھل پرواہ آواں میں
لاش دا قرضہ لاہ آواں میں

ہر گھٹنا سمجھا سکدی ہاں
اک گھٹنا سمجھا نہیں سکدی
لاش نوں ہندی بھکھ لاش دی
باجھ نہ ہووے لکھ لاش دی

ہارے لکھ، لاش وی ہارے

موئی ککھ نوں ممتا مارے
لاش دا قرضہ لاہ سکدی ہاں
ککھ دا قرضہ کون اتارے

(اک گھنٹا: پنا93)

امرتا پریتم کی کوتا وچ اوہ پرگیتک انش وی ہے اوہ سردی رہسوادی کویاں والا خاصا وی ہے جو کدے مدھ کالی کوتا دی ملکیت سی۔ نال ہی نال اوس اندر گیت سرجن دی پربل رُچی دے وی درشن ہندے ہن۔ دراصل جے کر ایہ کر کہیا جاوے پنجابی گیت ساہت وچ اوہ بڑی اہم تھاں رکھدی ہے تاں ایس وچ کوئی شنکے والی گل نہیں۔ اوس دے گیتاں وچ لہہ لہہ کردا راگ، ڈلھ ڈلھ پیندا جذبہ تے مرگدھ کر دین والی روانی ہے۔ پروفیسر موہن سنگھ وی اوس دے گیتاں دا سکہ من دا ہویا لکھدا ہے: ''امرتا پریتم دے گیت اوس دی آتما وچوں آپ مہارے نکلے ٹوٹے ہی نہیں سگوں اوس نے ایہناں نوں اک گاریگر وانگ گڑ گڑ کے شکل دتی ہے۔ اوہ گیت دی گوندی استاد ہے۔'' بلونت گارگی انوسار ''امرتا پریتم دی کوتا دی بولی سپنیاں دی بولی ہے۔ اوس دے گیت کتک دی چاننی رات دے پھلاں وانگ نرم ہن، تے سادے ہن۔ اوہ اینے زیادہ سادے ہن کہ اک گھمبیر آدمی ہی جان سکدا اے کہ اوہ کنے کوڈونگھے ہن۔'' گیت سرجدے سمے امرتا پریتم پنجابی سبھیاچار، پرانی پنجابی کوی پرم پرا نوں اپنے اک خاص اتے وشیشٹ انداز وچ ویکھدی ہے۔ ایس انداز وچ اوہ پرم پرا پالن وی کرلیندی ہے اتے نوستاول دی اکثر ہو جاندی ہے۔

اوس دے گیتاں دا اک پرمکھ شدگار ہے اوہناں وچ بمباں، پرتیکاں، اپماواں، رساں اتے دیس چتراں دی اصلوں ہی نویکلی اتے سوچی ورتوں ایہناں گیتاں لئی پرتیک، روپک جاں بمب لبھن لئی اوس نوں کوئی وشیش ادھم نہیں کرنا پیندا سگوں جیہڑی زندگی نوں اوس نے جیویا ہے، چتریا ہے اوس وچوں ہی اوہ ایہ سارا کجھ لبھ لیندی ہے۔ ایہو کارن ہے کہ اوہدے پرتیک تے اپماواں ساڈے نیتا پرتی دے جیون وچ رچیاں پئیاں سانوں دسدیاں ہن۔ سچی گل تاں ایہ ہے کہ اوس دی سچی کوتا ہی ڈھلکدے بمباں دی اک البم ہے۔ مثال دے طور تے اوس دے گیتاں دے کجھ انش پرستت ہن:

چانن دی پھلکاری تو پا کون بھرے
امبر دا اک اعلیٰ، سورج بال دیاں

من دی اچی ممٹی دیوا، کون دھرے

(چانن دی پھلکاری: پنا37)

کرناں جیوں مولی دیاں لڑیاں
میڈھی دے وچ گندھن لگی
رات ہوئی نمیا روے۔

دل دامان سرور بھریا
اکھیوں سکے موتی چگدی
ایہ ہنساں دی ڈاروے

(مان سرور: پنا41)

پھگن پیڑ ھار انگا چیتر کسی دون
رت کسے دے راہ تے لگی پھل وچھون

(پھگن چیتر: پنا50)

ورھیاں دے چندوئے بیٹھاں
دل دی بیڑی کھول کے بیہے
یاد سجن دی آوے
بھاویں کدھروں واک لوو

(خشبو: پنا51)

چیتر نے بوہا کھڑ کایا
اج دا گیت اس طرح بنیا
جویں عشق دے پنڈے اتوں
اکھر اس دا کجھ مڑھکا آیا

(دستک: پنا99)

امرتا پریتم دا ۔تھارتھ پرتی درشٹی کون صدا ہی تکھے بھاوک پرتکرم دار یہا ہے۔ جاں کہہ لوؤ اوس

نیں اپنی تبر پر گیتاتمک سمویدنا دوآرا ہی۔ تھارتھ نوں گرہن کرن دا راہ اپنایا ہے۔ شائد ایسے لئی برہا تے درد اوس دے گیتاں دا اک بنیادتت رہیا ہے جس دی اردھنا اوہ جیون دے ویاپک تتاں دے روپ وچ کردی رہی ہے۔ مگر ایتھے اک گل سپشٹ کر دینی اتے ضروری ہے۔ اوپری نظرے ویکھاں ایہ برہا بیشک اترپتی جاں اپراپتی دی پیڑ دا سوچک لگدی ہے مگر اپنے اودات روپ وچ ایہ پورتی دا اک رچناتمک پرتیک ہو نبڑدی ہے۔ منووگیانک طور تے ایہ آتم پچھان اک شکتی شالی پریرنا بندی ہے تے ایسے پریرنا دے روپ وچ ہی ایہ وچھوڑے دی تھاں پراپتی دا انوبھو کراؤندی ہے۔ پراپتی دا ایہو انوبھو ہی برہا دی رچناتمک سنبھاونا ہے تے ایسے سنبھاونا اودھیان ہی امرتا دی رچنا برہا دی اردھانا کردی نظر آوندی ہے:

ساڈی اگ مبارک سانوں
سورج ساڈے بوہے آیا
اوس نیں اج اک کولا منگ کے
اپنی اگ سلگائی وے

(چیتر: پنا46)

اپنے ولوں ساری بات مکا بیٹھی
ملے وی اک ہوکا تیری گل کرے

(چانن دی پھلکاری: پنا37)

امرتا پریتم کاوی دا اک مکھ دھرا ناری سمویدنا ہے۔ مگر اوس دی کوتا دی کینوس ناری نوں ہی اپنے چتراں دا حصہ بناؤندی ہے (جویں کہ بہتے آلوچکاں دی مانتا ہے) ایہ نشکرش امرتا دی بہو آیامی کوتا نال انصاف نہیں۔ دراصل ناری ہرمیس دی کوتا داوشا بندی رہی ہے۔ چاہے اوہ کوتا کسے کوی ولوں لکھی گئی ہووے بھاویں کسے کوتری ولوں۔ ایہ دکھری گل ہے کہ کسے اک رچنا کار دا ناری پرتی درشٹی کون ہور رہیا ہے تے دوجے دا ہور۔ اتے اجیہی اوستھا وچ جے اک عورت رچنا کار عورت ذات پرتی، اوس دیاں سمسیاواں پرتی کجھ زیادہ سوچیت ہو کے لکھدی ہے تاں ایہ سوبھاوک ہی ہے۔ نشچت طور تے اک استری ہون دے ناتے امرتا استری من دیاں گہرائیاں وچ اتر کے اوس دی رون ویدنا، اوس دے کرماں پرتیکرما دا احساس ادھک سوکھتا نال کر سکی ہے۔ اوس دیاں انیکاں کوتاواں جویں 'مجبور'، 'پنجاب'، 'کنیادان'، 'ویوپار'، 'ان داتا'، اتے اوس دے انیکاں

گیت استری ذات دیاں مجبوریاں، ادھورے سپنیاں، دردناک پیڑا تے اوس دی ترس یوگ ستھرتی دی پرتی ندھتا کر دیاں ہن۔ اپنی کوتا مجبور وچ اوہ لکھدی ہے:

میری ماں دی ککھ مجبوری

میں اوس حادثے داچن ہاں
جو میری ماں دے متھے تے لگنا ضروری
میری ماں دی ککھ مجبوری.......

(مجبور: پنا12)

ایسے طراں کوتا 'ان داتا' وچ اوہ ناری دی ستھتی داورنن ایویں کردی ہے:

ان داتا! میں چم دی گڈی، کھیڈ لے، کھڈا لے
لہو دا پیالہ، پی لے پیا لے

میں ہاں اک ورتن دی شے
جویں چاہے ورت لے
اُگی ہاں، پسی ہاں، گُھی ہاں، ویلی ہاں۔
تے اج تتے توے اوپر جویں چاہے پرت لے

میں برکی توں ودھ کجھ نہیں جویں چاہے نگل لے
تے توں لاوے توں ودھ کجھ نہیں جناں چاہے پگھل لے

(ان داتا: پنا35)

ایداں ہی اوسدیاں انیکاں انیک ہور کوتاواں ہن جو ناری دی منو- ستھتی، بھوتک، سماجک اتے آرتھک ستھتی نوں اپنا کیندر بندو بناؤندیاں ہن۔

تے جتے امرتا درتماں سماجک سندربھ وچ ناری دی اوستھا پرتی ایس حد تک سوچیت ہے، اوتھے ہی

اوہ سماج سے دوجے پہلوواں توں وی انجھ نہیں۔ اوہ ایس تتھ پرتی پوری طراں چنت ہے کہ کسے وی ساہت کاردا اپنی سماجک ستھتی پرتی جاگ رک ہونا بڑا ضرورہ اتے محتو پورن ہے۔ مگر اوہ ایس گلوں وی سوچیت ہے کہ کوتا دے کلاتمک مل دا نرنا کرن لئی کیول یوگ چیتنا نوں ہی ادھار نہیں بنایا جاسکدا کیونکہ ساہتک کرت کیول چیتنا دا ہی اک روپ نہیں، ایہ منکھ دے رچناتمک کم دا وی اک روپ ہے۔ ایسے لئی اوسدی ماننا ہے کہ ساہتک کرت دا صحیح مل پاؤن لئی جتھے ایہ ویکھنا ضروری ہے کہ ساہتکار آپنی سوہردتا تے سوجھ دے نال نال اجیہے سماج پربندھ وچ آپنے مانوی آپے نوں کنا کو ستنتر رکھ سکیا ہے، اوتھے ایہ ویکھنا وی ضروری ہے کہ اوہ اپنے ساہتک کرم بارے کنا کو سوچیت ہے، اوس دی کرت دی سنچار شکتی کنی کو ویاپک ہے تے اوس وچ مانوی پریرنا بنن دی کنی کو یوگتا ہے۔ ایسے بھاونا ادھیان ہی امرتا پریتم دا ہتھ صدا ہی سمیں دی نبض تے ریہا ہے تے اوہ ہمیشہ ہی اپنے ساہتک قدم دے سماجک پرکارج پرتی سوچیت رہی ہے۔ مذہبی جنون بارے اوہ لکھدی ہے:

جدوں مذہبی عشق جنون بن سرنوں چڑھدے جان......

تدلوہا چڑھدا اسان

بندیاں دے مونہ ترکھے، پریتاں دے مونہ کھنڈے

....

تے چمن جوگے ہینٹھ کسے دے جھگ جھگ ہوجان

....

جاں جیوں گرجاں دیاں چنجھاں

جیوندے موئے ہڈ کسے دے چونڈ چونڈ کے کھان

بہو بیٹی دی بھل جائے پہچان

(جنون: پنا11)

تے ایداں ہی جنگ دی حقیقت بارے اوس دی قلم پرکار اٹھادی ہے:

بہادر لوک میرے دیس دے

بہادر لوک تیرے دیس دے

ایہ سارے مرن مارن جاندے

سراں نوں وارن جاندے

صرف ایہ گل وکھری ہے

کہ سر کدے اپنا نہیں ہوندا

(تمغے: پنا117)

تے نال ہی اوسدی کوتا جنگ دے رستے نوں تیاگ کے ایہ امن سنیہا وی دیندی ہے:

امن دا ایہ عہد نامہ

آؤ دنیا والیو دستخط کرو

نفرت دی کالی رات ہے، نفرت دی کالی رات ہے

ٹھوکرناں لگے علم نوں، ٹھوکرناں لگے قلم نوں

دل دا چراغ بال کے ساہویں دھرو

(عہد نامہ: پنا 136)

تے سامراج اتے لوک راج اوپر امرتا انج ویانگ کردی ہے:

سامراج: اک ٹاواں شاہی بوٹا

ہر آدم دی ذات کھمبل دے وانگ اگے

حاکم دا حکم اوناں ہے، اوہ جناں وی کرلوے

تے پرجا دی پیڑ اونی ہے، اوہ جنی وی جرلوے

تے لوک راج: گالی گلوچ دی کھیتی

کہ بندا جدوں موئہ مارے تاں جنی چاہے جرلوے

کھرلی وی بھرلوے، تے فیر جدوں چاہے

تاں اوسے گالی گلوچ دی بہ کے جگالی کرلوے.....

(دکھ کبیرا رویا: پنا131)

ایداں امرتا پریتم نشچت ہی سماج اتے مانوتا پرتی اک ساہتکار دے کرتب نوں سپھلتا نال نبھاؤندی ہے۔ جتھے اوہ اپنیاں کوتاواں راہیں سمکالی جیون دا پرتی بمب پیش کردی ہے او تھے اوہ جیون نوں اک صحیح سدھ دین وچ وی سپھل ہے۔ اوس پاس -تھارتھک سچ (Reletive Truth) وی ہے، اتے ابوبھوتکا سچ (Realised Truth) وی ہے تے نال ایناں سچاں دی پڑچول کرن واسطے تیجی اکھ وی۔ نرسندیہ اوسدی چوکھی کوتا ایس تیجی اکھ نال ویکھیا تے پراپت کیتا گیا جیون انوبھو ہی ہے۔

اتے وچ امرتا پریتم دی کوتا 'تڑکے گھڑے دا پانی' وچوں کجھ سطراں تہاڈے ساہمنے پرستت ہن:

وے میں تڑکے گھڑے دا پانی
کل تک نہیں رہنا .....
اج دا پانی کیکن لاہوے
کل دی تریہ دا قرضہ
ناں پانی نیں کنی بجھنا
ناں پلے وچ رہنا

وے میں تڑکے گھڑے دا پانی
کل تک نہیں رہنا

تے ایتھے میں ایہو ہی کہنا چاہاں گی کہ امرتا نیں بھانویں کجھ وی کیہا ہووے، کجھ وی سوچیا ہووے، بھوکھ ایس ستھ دی گواہی دیوے گا کہ امرتا دی کوتا اوہ نرمل پانی سی جس دی جدوں کدے سماپت ناں ہوئی تے جو جمانیاں تک لوکاں دی ساہتک تریہ نوں بجھاندی رہی۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

سریندر شرما

امرتا پریتم نوں ست سوال

منکھ اُتے جدوں لگاتار ظلم ہوندا ہے تاں اوس دے سبھا وچ اک عجیب جہی کڑتن آونی سبھاوک ہے، جہڑی کہ وینگ کلا لئی بہت اُپجاؤ زمین بندی ہے۔ جویں کہ اتہاس توں وی سپشٹ ہے کہ پنجابیاں دا سہج جیون ہر حملاور دی آمد سے انیکاں وار جڑھوں اکھڑیا ہے، تے نتیجے وجوں ساڈے لوکاں دی بولی وی ودھیا وینگ (طنز) دے لچھن ہین، پر کیہ کارن ہے کہ ساڈے پنجابی ساہت وچ اجے تک ایہ وِدھا ستھاپت نہیں ہوئی؟

امرتا : جاپدا ہے، کڑتن دا بہتا انش، پنجابیاں دی محنت مشقت دے مڑھکے نال وگ کے، اوہناں نوں کڑتن دے زہر توں سرخرو کر دیندا رہیا۔ ساڈے ساہت کاراں لئی وی، اوہناں دی قلم نہیں، ہمیشا کوئی ہور محنت روٹی دی سادھن بنی رہی۔

تے کڑتن دا باقی انش، پنجاب دی ستاں صوفیاں تے ملنگاں دی لمی روایت والی اپرامتا وچ رل کے اک اُپرامتا بن گیا۔

میں ذاتی طور اتے بھاویں کھیتاں دی محنت نال کدے نہیں جڑی پر ہتھیں کم کرن دے سبھاء نال ہمیشا جڑی رہی ہاں۔ تے نال ای درویشی سبھاء نال۔ ایس لئی ذاتی تجربے توں کہہ سکدی ہاں کہ ضرور ایہی کارن ہون گے۔ جہناں نے ادب وچ طنز نوں اوس طرحاں سان اتے نہیں چڑھایا، جس طرحاں وقت دیاں سماجک، مذہبی، تے سیاسی حالتاں اوہدے لئی زمین تیار کردیاں رہیاں۔

قلم دی جرات تے بے باکی ساڈے ساہت دا ہمیشا سبھا رہی ہے، اوہ ہن وی

ساڈے ساہت دا سہج انگ ہے۔

؟ اجوکی پنجابی کوتا عام لوکاں وچ دن بدن گھٹ مقبول ہو رہی ہے۔ کیہ ایہ ایس دے چھند مکت ہون کر کے ہے یاں ہور وی کجھ کارن ہن؟

امرتا: اج تاں ایہ ساری دنیا وچ کوتا دی نامقبولیت دا دور ہے۔ ایس دے باوجود وی کہ دنیا دے کئیاں حصیاں وچ انٹرنیشنل مظاہرے ہو رہے ہن۔۔۔۔کوتا ہندستان دیاں رگاں وچ اتری ہوئی سی، کیوں کہ باہر دیشاں وچ کوتا دی روایت دا سبندھ ادبی طور اتے انسان دے ذاتی احساس نال ہمیشا رہیا سی، یاں کدے کدے لوڑ پین تے قومانتری احساس نال جڑ جاندا سی، پر سماجک روہ ریتاں نال، تے دھارمک روایتاں نال ایس طرحاں کدے نہیں سی جڑیا ہویا، جس طرحاں ساڈے دیش وچ جڑیا ہویا سی۔ تے ایہ ویاہ دی دیوی دے، یاں سادھنا دے منتراں دی صورت وچ اجے تک جڑیا ہویا ہے۔ ایس لئی سانوں ادبی کھیتر وچ کوتا دی نامقبولیت بہت اکھردی ہے۔۔۔۔

ایس نامقبولیت دا اک بہت وڈا کارن ایہ جاپدا ہے کہ کناں نال کوتا دے سبندھ دی جو روایت چلی آوندی سی، اوہ اتہاس دے اک موڑ تے آ کے کناں نالوں بہت متھے نال جڑن لگ پئی ہے، تے ایس لئی اک سروتے نوں اک پاٹھک بنن وچ مشکل پیش آ رہی ہے۔۔۔۔

اوس نال جڑدا کارن ایہ وی ہے کہ کوتا نوں کناں نالوں توڑ کے متھے نال جوڑن دے عمل وچ، کوتا والیاں نے کوتا وچلے سنگیت نوں لوڑ توں بہتا ناکار دتا ہے۔۔۔۔

ایہ ٹھیک ہے کہ اک وقت آیا سی، جدوں قافیے دریف جہی بندش دی سلامتی واسطے، چنتن نوں واریا جان لگا، تے اوسے تک بندی نوں نکارن لئی، کوتا سوچ پردھان ہوئی۔ پر سوچ پردھان کوتا نے بندش دے تانکے توڑ کے جو راہ موکلا کیتا، اوس راہ نوں اک بہت سوکھا راہ سمجھ کے، بہت سارے واہو داہی اوس راہ اتے پے گئے ہن۔

تے میں سمجھدی ہاں کہ ایس نامقبولیت وچ سبھ توں بہتا 'کرم' اوہناں دا ہے۔۔۔۔

؟ روسی ساہت دے پربھاو تھلے لکھیاں گئیاں ساڈیاں بہتیاں کہانیاں وچ کسے سمسیا نوں لے کے پوری رچنا وچ تاں ایکشن برقرار ہوندا ہے، پر انت وچ یاں تاں نائک اچانک ٹھہلا ماردا ہے، اتے یاں رچنا بڑے ای آشاوادی نوٹ تے ختم ہوندی ہے، تاں کئی وار انج محسوس ہوندا ہے جویں ساڈا پورا مانسک (نفسیاتی) تناؤ ریلیز ہو گیا ہووے، تے اسیں اصل سمسیا توں یاں تاں مکت یاں بے لاگ محسوس کردے ہاں۔ ساڈی بولی دے بہت سیانے لیکھک ہون دے ناتے تہاتھوں ایہ سمجھنا چاہندا ہاں کہ رچنا دی شیلی کہو جہی ہووے کہ چنتن جنم لے سکے۔

امرتا : میری نظر وچ تہاڈے سوال دا جواب، تہاڈے سوال وچ شامل ہے۔ تساں کہانیاں وچ ایکشن دے برقرار ہون توں بعد، نائک دے اچانک ٹھیلے نال یاں کہانی دے آشاوادی نوٹ اتے ختم ہون نال، پاٹھک نوں مانسک تناؤ توں مکت یاں بے لاگ ہون دی گھاٹ نوں محسوس کیتا ہے، اوہناں کہانیاں نوں تساں کسے پربھاو (اثر) ہیٹھ لکھیاں آکھیا ہے۔ دوست ! کوئی وی رچنا جدوں کسے پربھاو وچ آ کے، اوہدے انت نوں گنے متھے تے کترے ویترے نوٹ تے ختم کرے گی تاں پاٹھک دا بے لاگ ہو جان والا کرم (عمل) ضرور واپرے گا۔

پر ٹھیک ایہو جہیا انت، جو لیکھک دے انتر وچ ہوئی لوکائی دی پیڑ وچوں، لوکائی واسطے کوئی راہ لبھن دے جتن کردیاں، کسے راہ دے اشارے وانگ آوے گا، تاں اوہ پاٹھک نوں بے لاگ کرن دی تھاں، اوہدا چنتن وی بن جائے گا، اوہدی جرات وی۔

پہلی حالت وچ پاٹھک نوں ہمیشا اوہ انت پڑھ کے، اوس انت دا پہلے ای انومان (اندازا) ہوندا اے، ایس لئی اوہ انت اوہدے لئی اچنبھا نہیں بندا۔ بلکہ کہہ سکدی ہاں کہ کہانی وچلی پہلی ٹینشن وی، اوہدیاں دھر ناڑاں وچ نہیں اُتری ہوندی، کیوں کہ ہنے کسے موڑ اتے، اوہنوں ٹینشن توں مکت کرن والی گھٹنا دے واپر جان

دا یقین ہوندا ہے۔

پر اوہی کرم جے بے یقینی وچوں اک اچنبھے وانگ ساہمنے آ جائے، تاں اوہ پاٹھک دے لوواں وچ اُتر جاندا اے۔ اوہی لوواں وچ اتریا ہویا اچنبھا اوہدا چنتن بن جاندا اے۔ تے اوہی چنتن، کہانی دے کردار وانگ، اِک جرات بن کے اوہنوں کسے سنبھاونا دے راہ لے جاندا ہے۔۔۔۔۔

؟ میں کدھرے پڑھیا سی کہ سیانا آلوچک ہمیشا لیکھک دی اگوائی کردا اے۔ پر ساہتک گوشٹیاں وچ کتاب دے ریویو سمے عام طور تے ایہو جہی آلوچنا سنن یاں پڑھن نوں ملدی اے، جس توں من اُداس ہوندا اے۔ تہاڈے وچار وچ 'آلوچک' نوں کیہ دین ہونی چاہیدی اے؟

امرتا :سریندر جی ! اگوائی لفظ جے ضرور ورتنا ہووے، تاں ایس پہلو توں ورتیا جا سکدا اے کہ کئیاں بنیادی سچائیاں نوں جدوں لیکھک اچیت طور تے لکھ جاندا اے، تاں اک آلوچک اوہناں نوں سے دی چیتنا نال جوڑ کے اُجاگر کر سکدا اے، تے ایس طرحاں چیتنا دی ہور زمین لیکھک دے چنتن دی حد وچ آ جاندی اے۔

میری نظر وچ آلوچک، اوہ پاٹھک اے، لیکھک دے سپنیاں وچ سمایا ہویا اوہ چنتن شیل پاٹھک، جہنوں اوہ ہزاراں پاٹھکاں دے مہاندریاں وچوں لبھدا رہندا اے۔ پر ایہ میں اوس آلوچک دی تشریح کیتی اے، جو آپنی ہوند دے ارتھاں نال جڑیا ہویا اے۔ اوہناں دی گل نہیں کیتی، جہناں دی ہوند نال اوہناں دے ارتھ ٹٹ گئے ہن، تے جہناں نوں پڑھ یاں سن کے تہاڈا من وی اداس ہو جاندا اے، میرا وی۔

رچنا توں آلوچنا دی گل کردیاں میں بھاشا وبھاگ والے سماگم وچ آکھیا سی، رچنا، زندگی دی آلوچنا ہوندی اے۔

زندگی دی کلپنا ولوں کیتی گئی، زندگی دے یتھارتھ دی الوچنا توں زندگی دی سمرتھا ولوں کیتی گئی، زندگی دی اسمرتھا دی آلوچنا۔

پر ایس آلوچنا دا حسن اودوں ویکھیا جا سکدا اے، جدوں ایہ احساس دی شدت،

سوچ دی ڈونگھائی تے بیان دے انداز والے پورے تخلیقی عمل وچوں گزر کے ساہمنے آوندی اے، صورت نظم دی ہووے یاں نثر دی، پر کسے رتن وانگ اوددوں لبھدی اے، جدوں احساس سمندر ورگا ہوندا اے، تے چنتن سمندر منتھن ورگا۔

تے ٹھیک ایہی کرم اوس آلوچنا دا ہوندا ہے، جو ایس آلوچنا دی مڑ آلوچنا ہوندی ہے۔

تے ایس طرحاں نظم یاں نثر دی صورت اختیار کرن والے احساس نوں آلوچنا دا حق ایس لئی حاصل اے کہ اوس نوں زندگی نال بے پناہ محبت ہوندی اے۔ اوسے طرحاں اک آلوچک دی نظر نوں رچنا دی آلوچنا دا حق صرف اوددوں حاصل ہوندا اے، جدوں اوہنوں نظم یاں نثر نال اوڑکاں دا عشق ہووے۔

جس طرحاں زندگی نوں نکارن دا بل، بہتر زندگی تے اوس کلپنا کول ہوندا اے، جہدے کول سمجھ تے دلیل ہوندی اے، اوسے طرحاں رچنا نوں پھولن تے پڑچولن دا بل، آلوچک دی سمجھ تے دلیل وچ ہے۔۔۔۔

سو ایس تشریح نوں ساہمنے رکھ کے تہاڈے سوال دا جواب ایہ دینا چاہواں گی کہ ایہ دو شکتیاں دے چ روبرو ہون والی حالت ہے، جہناں وچوں اک نوں کرم شکتی آکھیا جا سکدا اے، دوجی نوں چنتن شکتی۔

اوس کرم شکتی وچ چنتن وی شامل ہوندا ہے، تے چنتن شکتی وچ کرم وی۔ پر کرم شکتی (لیکھک دی) وچ جو چنتن شامل ہوندا اے، اوہ آپنے سنتتر روپ وچ ہوندا اے۔ تے چنتن شکتی (الوچک دی) وچ جو کرم شامل ہوندا اے، اوہ پردھان روپ وچ ہوندا اے۔ ایس لئی ایہ وی ٹھیک اے کہ ایہ دو شکتیاں برابر دیاں شکتیاں نہیں۔ تاں وی میں ایہناں نوں دو شکتیاں آکھ سکدی ہاں، کیوں کہ ایہناں وچ، جے اک شکتی (لیکھک دی) اوس دوجی شکتی (آلوچک دی) نوں، چنتن دی زمین دے سکن دے سمرتھ ہے، تاں اوہ دوجی (چک دی) وی، اوس پہلی (لیکھک دی) شکتی والی زمین نوں پہچان دے بل تے، ہور زرخیز کرن دے سمرتھ ہو جاندی اے۔

ایس زرخیزی نوں جے تسیں اگوائی لفظ دے ارتھ نال جوڑنا چاہو، تاں جوڑ سکدے او۔

؟ ''گرو نانک'' تے لکھی تہاڈی نظم تے ''رسیدی ٹکٹ'' دے کجھ حصیاں بارے پنجاب وچ کافی دیر توں کجھ لوکاں ولوں اعتراض اٹھائے جا رہے ہن۔ منکھی جیون وچ ''دھرم دی مہتتا دے'' دے پرسنگ وچ ''لیکھک دی آزادی'' بارے تسیں کیہ کہنا چاہو گے؟

امرتا: دوست! ایہ سوال آپنے آپ وچ سمے دا دکھانت اے۔ کیوں کہ دھرم دی ویاکھیا لیکھک نے کیتی سی، ایسے لئی ویداں دے رکھیاں نوں یعنی وقت دے لیکھکاں نوں 'ساکھیاتکرت دھرم' آکھیا گیا۔ جہدا ارتھ ہے۔ اوہناں نے (لیکھکاں نے) سرشٹی دے مولک تتاں دا ساکھیاتکار کیتا، تے اوہناں تتاں نوں منتراں وچ گرنتھت کیتا۔

اک اک اکھر نوں اک اک تت دا پرتیک منیا گیا، ایسے لئی اک اگنی دے وکاس کرم نوں جدوں پنجاہ ناں دتے گئے، آتما وی آکھیا گیا، چیتنا وی، شبد وی، واک وی، تاں واک رچنا کرن والے کوی نوں وی اگنی آکھیا گیا۔

جدوں دیو نوں، یعنی لیکھک دے قلمی چنتن نوں 'ہے دیو! توں آپ وید روپ ایں' آکھیا گیا تاں اوددوں 'دھرم دی مہتتا دے پرسنگ وچ لیکھک دی آزادی' ورگے سوال دی گنجائش کتھے سی؟

پر ایہ سوال پیدا ہویا، ایس لئی میں ایس سوال نوں سمے دا دکھانت آکھیا ہے۔

جدوں ایس سوال دی زمین تیار ہو رہی سی، اج توں صدیاں پہلاں، تاں دھرم دے مول ارتھاں دی ویاکھیا لئی کئی اپنشد پران تے کئی ویدک درشن جہے گرنتھ لکھے گئے، سپشٹتا دتی گئی کہ سبھ دیوی دیوتے مول تتاں دے لوکک روپ ہن۔ یوگ اوہناں تتاں دی ویاکھیا ہے۔ تے کرم کانڈ اوہناں تتاں دا ابھینائے ہے۔

کرم کانڈ نوں 'بجھ تتاں دی وکاس پرمپرا دا ادت چنترن' آکھیا گیا۔ رگ وید وچ ایتھوں تک سپشٹتا دتی گئی کہ جو کرم کانڈ دیاں ودھیاں وچ الجھ کے مول ارتھ

نوں بھل جاندے ہن، اوہناں لئی ویداں دی راگ روپی کام دھینو بانجھ ہو جاندی ہے۔

سو دوست! چنتن دی کامدھینو اوہناں لئی بانجھ ہو گئی ہے، جو کرم کانڈ وچ، یعنی باہری چنھاں وچ اُلجھ کے دھرم دے مُول ارتھ نوں بُھل گئے ہن۔

؟ ہن تک تسیں جدوں وی کسے نوں ست سوال پچھدے سی، تاں ستویں سوال ویلے ایہ چھوٹ ہوندی سی کہ اک سوال اوہ آپ ای آپنے کولوں پچھے۔ پر اج جی کردا اے کہ یہ ستواں سوال وی میں ای پچھاں۔ پچھنا چاہندا ہاں کہ تہاڈے ناول ''پنجر'' تے نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' چھڈ کے، تہاڈی بہتی رچنا دی مکھ دھارا سر وچ ''ودھیا محنت'' دی دنیا تاں ہے، پر اوس وچ آرتھک (معاشی) تے راجنیتک (سیاسی) کیدوواں دا بہت گھٹ ذکر اے۔ پر پچھلے کجھ سالاں دوران تہاڈے چنتن وچ 'متھہیاس' 'دھرم' 'یوگ' 'تنتر' تے 'جیوتش' وغرا جو وشے شامل ہوئے نیں، ایہ سماجک چیتنا ول 'محبت' والے بندی دا پیار نیں کہ اوس دا بدل؟

امرتا: تہانوں آپنی فایل دا اک ورقا وکھاندی ہیں، جو میری نویں ارنبھی ہوئی کتاب دا اک حصا ہے۔ ایہ کتاب اتہاس (تواریخ) نال اک لمی گل بات ہووے گی۔ جدوں میں اتہاس نوں آکھیا آ سجن اج گلاں کریے، تے جدوں اوہنے آکھیا 'مینوں اوہ وی دن یاد ہے، جدوں اج توں کئی پنجھی ورھے پہلاں توں ایہو گل تڑپ کے آپنے محبوب نوں آکھی سی' تاں میں جواب دتا 'اج وی اوہو تڑپ اے، تے کہن والی میں، آپنی اوسے میں دی وشالتا ہاں، تے جہنوں مخاطب ہو رہی ہاں، توں اتہاس! میرے اوسے محبوب دا انت روپ ایں۔'

دوست! ایہو ورقا تہاڈے سوال دا جواب اے۔ میں اصل وچ چرک جاتی دی ہاں، پراچین کال وچ چرک اوہنوں کہندے سن، جہنوں ساری عمر گیان دی تریہہ لگی رہے۔ ایہ متھہاس، دھرم، یوگ، جیوتش تے تنتر، میرے لئی 'محبت' والے بندو دا پیار ہن، علم دی پیاس۔

(لپی انتر: جمیل احمد پال)

فرخندہ لودھی

وجوگ

مَیں اُمرتا جی نوں کدے ملی نہیں۔ درشن ہوئے، اوہ وی ٹیلی وژن راہیں۔ اوہناں نوں بولدیاں وی ٹیلی وژن لھا پئی اوہناں دا بڑا سبھاؤ ے۔ مٹھا تے رُنھیا ہویا بولدے نیں۔ اوہناں دے ادبی قدتوں تے ہوش سنبھالدیاں ای جانکاری ہوگئی سی۔ جدوںہناں دی نویکلی نظم۔ وارثشاہ نوں خطاب کر کے لکھی ساہمنے آئی۔ پنجاب دی دھیاں لئی امرتا جی دی کوکردوہاں پنجاباں توں پار تائیں اپڑ گئی۔ اوہدوں پاکستانواں نواں وجود چہ ایا سی۔ دھرتی دی ونڈ دے پھٹ اجے دونویں پاسے سجرے سن۔ امرتا جی دی لہو بھجی دی نظم دے چھٹے ہندوستاں دیاں کندھاں ٹپ کے عام کوھائی سے بانے بھیوں گئی۔ انج امرتا جی ہوش سنبھالدیاں' میں جیہیاں کڑیاں دے دلاں وچ وس گئی۔ نہین بھگی پر نہیں بھلی۔ کسے نوں وی نہیں بھلی۔ امرتا نال میری سیان کج انج اے۔ لگدا اے جیویں اوہ میرے لیتر دی دنیا دا حصہ نیں۔ میرے زوق تے شوق دا اک اڈا نیں میری ادبی بنتر وچ اگاہی دا اک نمونہ نیں۔ امرتا جی دیاں لکھتاں کدے کدے شاہ مکھی وچ ایدھر دا کوئی کوئی رسالا یاں اخبار چھاپ دیندا سی اوہ وی اوہ اخبار جہڑے انسانیت پسند تے آل دوال دی خیر خبر رکھن دا چارا کردے سن۔ جد کوئی نظم کہانی چھپنی بڑے چاؤ نال پڑھنی۔ ایسراں پنجابی زبان تے ادب دی دوجے پاسے ٹور دا کج کج لیکھا پتا لگ جاندا سی۔ اپنے پاسے دی پنجابی دی اگ سگ وی اوہدوں ای شروع ہوئی تے جانیا پنجابی وچ ادب تے زبان دیاں ڈونگھیاں رمزاں نیں۔ اونہاں رمزاں ول دھیان مارنا چاہیدا اے۔ اے ساڈے لئی سوکھت تے مان وی اے۔ جیویں ایڈی وڈی رائٹر امرتا اپنے اچے توں اچے خیال نوں اپنی بولی وچ سوکھے سبھا' پیش کر دیندیاں نیں۔ ایسے طراں ہور لکھن والے وی ہون گے پنجابی وچ۔ کج ایس طراں مینوں پنجابی دا کلاسکی ادب پڑھن دی پریرنا امرتا جی ولوں ملی۔ پڑھیا۔ تے چس پے گئی۔ جس وہ ملیا۔ کہن اکرن دی جاچ وی آ گئی پر مرا امرتا جی نال میل کدے وی نہ ہوسکیا۔ نہت جتن لیتے اپنیاں اوہناں تائیں اپڑان وچ کئی جھانسے وہ

کھاہدے۔ اک واری میرے قابل وزت لکھاری جناب افضل احسن رندھاوا جی نال ملاقات ہوئی۔ گلاں باتاں چہ او ہناں آکھیا۔ تسیں اپنیاں کہانیاں بھارت نہیں بھیجدے؟ میں اتر دتا۔ اوتھے کہنوں بھیجاں' میرا اوتھے کوئی نہیں رہندا۔ میں کسے نوں جاندی نہیں۔ رندھاوا جی کہن لگے۔

''امرتا پریتم نوں وی نہیں۔''

''ہائے میں مراں۔ اوہ تے بہت وڈی رائٹر اے، اوہنوں کیوں بھیجاں؟'' اوہ آکھن لگے 'ناگ منی' پریتم دا پرچہ اے۔ لیا مینوں اپنی چھپی کیاب دیاں گھٹوں گھٹ چھ کاپیاں دے۔ میں ناگ منی نوں گھل دیاں گا۔

دوجے دن میں چاؤ چائی ''چنے او بلے' دیاں پنج کاپیاں رندھاوا صاحب دے حوالے کیتیاں تے اڈیک لگ گئی۔

''ناگ منی' اج آیا کہ کل آیا۔ ہائے لوہڑا۔ اتھوں تے کوئی رسید وی نہ آئی۔'' ناگ منی' نے کیہ آنا سی۔

ایہناں ای دناں وچ امرتا جی دی ہڈ ورتی ''رسیدی ٹکٹ' اردو لپی وچ چھپ کے پاکستان دی مارکیٹ وچ آ گئی۔ پڑھی تے امرتا جی نال گلاں چہ گل نکل آئی۔ توصیف کہن لگی ''توں اپنی کتاب امرتا نوں گھل۔ ناگ منی دا پتا لیا۔ کتاب گھلی نال اپنے ہتھ نال چاہ بھی چہلکھی چھٹی وی گھل دتی۔ فیر اڈیکن بہہ گئی، پر کتھوں؟ جیہڑی گل نصیب چہ نہ ہوئے کیویں ہیجے۔ لل لگی رہی جیہڑی ہن تائیں رئی۔ بقول غلام فرید

آپ ونجاں یا میں قاصد بھیجاں میرا تھی گیا حال بیماراں

امرتا پریتم لئی اک ہرکھ

آپاں اشوق سی کنا تینوں ویکھنے دا' افسوس کہ کدے نہ مل سکی
اک سک سی چھالے چھلنے دی سانہویں بہہ کے کدے نہ چھل سکی
گل پائی جو صدری ہجر والی' پائی رہی دلییں نہ سل سکی
ویلے آسدی کلی مسوس چھڈی' کدی کلی مسوی کھل سکی؟
مینوں رب نے جس جا سٹیا سی اوتھے رہئی نہ انچ وی ہل سکی
جی نواں سدا ای ہرکھ تے دکھ رہنے گا جیندے جی نہ تینوں میں مل سکی
بڑا چاؤ سی تینوں ملنے دا اودھوو کھ جے کدے نہ مل سکی

کرانتی پال

امرتا پریتم پنجابی ساہت دا مان

امرتا پریتم پنجابی ادب نال جڑی مہان کلاکار سی۔ اوس دی کلاکاری ساہت دے ہر کھیتر چ ابھردی ہے۔ ایہ کھیتر بھاویں ساہت دی دنیا نال جریا ہووے تے بھاویں ساہت کاراں دی دنیا نال۔ جدوں وڈے ساہت کاراں دی گل چلدی ہے تاں اوس سے امرتا داناں گونجدا ہے، ایہ ناں ضروری نہیں پنجابی کھیتر وچ ہی گونجدا ہووے کیونکہ امرتا تاں کئی سال پہلاں ہی پنجابی کھیتر دی سیماں پر کر چکی سی، اوس دیاں رچناواں بھارتی ساہت دا حصہ ہن جس وچ پنجابیت دی جھلک پیندی ہے۔

امرتا دی زندگی پنجابی لیکھک دی پریبھاشا نشچت کردی ہے، امرتا دا پچھوکڑ اتے اوس نال جڑے سردکار اوس نوں لیکھک نالوں وڈا انسان نشچت کردے ہن۔ امرتا نے کدے وی اپنے آپ نوں فضول دے کماں چ نہیں ڈھالیا۔ اوس دا سوبھا پنجابی لیکھکاں نالوں بہت بھن سی۔ پنجابی لیکھک تاں اپنے سمکالیاں نال لڑلڑ کے ارکھائی جیون جیوندے رہندے ہن۔ اوہناں نوں لگدا ہے سارا شہر تے ساہت ساڈی جیب چ ہے۔ ساڈیاں رچناواں کر کے کتے کجھ وی ہوسکدا ہے؟ پر سچ بہت دور ہے۔

امرتا دا سوبھا اوس دیاں رچناواں چوں جھلکدا ہے۔ اوس وانگ اوس دیاں رچناواں وی نگھ دندیاں ہن۔ اوہناں نوں کسے آسرے جاں جوگاڑ دی ضرورت نوں پئی۔ کوئی دس نہیں سکدا کہ امرتا داگھیرا کنا وشال سی۔ اوس ہمیشہ چرچتا توں بچدی رہی۔ لوک پریا ہونا اوس لئی وڈی مل سی، شائد ایس کر کے اوس دے تور جان توں بعد بھارت دا میڈیا اوس نوں وڈے پدھر تے یاد کر رہیا ہے۔

امرتا رچناکار دے طور تے وڈی رچناکار تاں سی ہی، پر ایس دے نال اوس نے پنجابی ساہت نوں سکھر تے پہنچائی ہے۔ اوس دی 'ناگ منی' لئی ہر ساہت کار واسطے در کھلا سی۔ اوس نے ایہ کدے نہیں سوچیا کہ فلانا لیکھک کس گروپ دا ہے۔ امرتا نے کوئی فوج تیار نہیں کیتی سگوں اوس دی فوج اپنے آپ تیار

ہندی گئی۔ کئی ایسے فوج وچوں جرنیل بن گئے ۔ بھارتی بھاشاواں وچ اوس دی رچنا بناں کوئی کشٹ اٹھائے مل جاندی ہے۔اوس نے پنجابی ساہت نوں ہور بھاشاواں نال کھڑا کیتا۔ جوتھاں بھارتی ساہت وچ امرتا دا اوہ ہور کسے دا نہیں کیونکہ ایماندار آدمی زندگی دے ہر موڑ تے سپھل ہندا ہے۔ جے کر اوہ اسپھل ہو جاوے تاں زندگی اپنے ارتھ گوا بیٹھدی ہے۔ شائد ایسے کر کے امرتا ورگا بننا بہت مشکل ہے۔اوس دی تسیں نقل تاں کر سکدے ہو پر ملکتا کتھوں لے کے آؤ؟ ملکتا کوئی اجیہی چیز نہیں جیہڑی بزاروں ملدی ہووے۔ایہ تاں خدا ولوں دتی ہوئی چیز ہے جیہڑی ساہڈے خون وچ رچ جاندی ہے۔ایس دی وڈی اُداھارن امروز امرتا دی محبت ہے جیہڑی پنجابی ویڑھے دی سیماں پار کردی ہوئی نویں ارتھ سرجدی ہے۔

امرتا نے بہت لمبا سفر طے کیتا۔اوہ اپنے آخری پلاں چ گم رہی۔ نہ کجھ پڑھنا نہ لکھنا۔ناگ منی وی بند ہو گیا اتے اچانک اک دن امرتا وی تر گئی۔اوس دے ترجان نال بھاویں اج دے لالچی یگ چ کسے نوں کوئی فرق نہ پیا ہووے پر اوہ یگ جیہڑا ہمیشہ کل یگ دے نال نال چلدا رہندا ہے، ایس شخصیت نوں سجدہ کردا رہے گا۔ اتے اتہاس دے پنیاں تے ایہ گل ابھردی رہے گی کہ پنجابی ادب نے امرتا پریتم ورگیاں شخصیتاں وی دتیاں ہن۔

اج دی ستھتی بہت ہی ترسائی ہے۔ایہ ستھتی وی ایسے طراں سی۔اسیں بہت کجھ نواں سرجن دی کوشش کردے ہاں پر اپنے لالچ نوں، شہرت نوں تیاگ نہیں سکدے۔سانوں لگدا ہے ساڈی گڈی چڑھی ہوئی ہے، ایس چ سانوں سواد آؤندا ہے۔ پر ایہ سواد اکھاں نال ویکھی چیز دی سندرتا تے نربھر کردا ہے۔ اصلی گل تاں جیبھ ہی دس سکدی ہے۔اوہ دسدی ہے سواد کناں مٹھا ہے، کناں کوڑا؟ اوس سے اصلیت جان کے نک، کن، اکھ تے جیبھ اپنا نواں فیصلہ سناؤندے ہن صرف دکھانت پیدا ہندا ہے کہ گل تاں کجھ ہور ہی نکلی۔

اصلی جیون تے سنگھرش تاں اوہی ہے جس دی تعریف تہاڈے ترجان توں بعد ہووے۔جیوندے جی تاں عام بندہ اپنے آپ چ مان نہیں ہندا۔ فیر ساہت کارتاں اُنجھ ہی کُتی چیز ہندا ہے۔اج دے دور وچ کوئی بھرا اپنے بھائی (جو وڈا لیکھک ہے) نوں بھنڈ رہیا ہے کہ اوہ سبھ توں خطرناک لالچی بندہ ہے، کوئی عورت اپنے وڈے لیکھک پتی نوں بھنڈ رہی ہے کہ اوہ غلط آدمی ہے، پاکھنڈی کردا ہے۔ کوئی پُت اپنے وڈے لیکھک پیو تے ہسدا ہے کہ مورکھ نے پاٹھک جیہڑے ایس نوں اسمانی چڑھا رہے ہن۔ اجیہا کیوں؟ اجیہا ایس لئی کہ ایہ لوک زندگی نوں کھیڈ سمجھ کے اپنے کردار نال انسانیت دیاں بھاوناواں نوں جویں چاہن اوس

رنگ چ رنگدے ہن ۔ بھانڈا اوس سمے پھٹدا اے جدوں گل زہر ہو جاندی ہے۔

امرتا پریتم نے زندگی چ جو لکھیا اوہ اوس دے اپنے قد دے برابر سی۔ اوس نے کسے دی پرواہ نہیں کیتی ۔ وڈے ویانگ کار لیکھک پرسائی دے انوسار رچنا کار رچنا لکھدا اے اتے کدے بھوندکے ہن ۔ امرتا دے ٹائم دی بھونکن والے بہت سن پر اوہ اک دن تھک گئے ،امرتا امرتا بن گئی ۔ جدوں تک پنجاب دا ادھا سریر اودھر رہے گا اودوں تک امرتا دی اکو رچنا ''اج آکھاں وارث شاہ نوں'' گونجدی رہے گی۔ اجیہی پرسدھی کسے کسے رچنا کار دے ہتھ آوندی ہے۔ خوش نصیب ہے امرتا جس دی قلم چوں ایہ درد نکلیا۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول۔

تے اج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول۔

اک روئی سی دھی پنجاب دی، توں لکھ لکھ مارے وین،

اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں واث شاہ نوں کہن۔

اُٹھ دردمنداں دیا دردیا، اٹھ تک اپنا پنجاب،

اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب۔

کسے نے پنجاں پانیاں وچ دتی زہر رلا،

تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا۔

ایس زرخیز زمین دے لُو لُو پھٹیا زہر،

گٹھ گٹھ چڑھیاں لالیاں پُھٹ پُھٹ چڑھیا قہر۔

ویہ ولسی وا فیر ون ون وگی جا،

اوہنے ہر اک وانس دی ونجلی دتی ناگ بنا۔

ناگاں کیلے لوک مونہ بس فیر ڈنگ ہی ڈنگ،

پلو پلی پنجاب دے نیلے پے گئے انگ

گلیوں ٹٹے گیت فیر ترکلیوں ٹُٹی تند،

ترنجنوں ٹُٹیاں سہیلیاں چرخڑے گھوکر بند۔

سنے سیج دے بیڑیاں لڈن دتیاں روڑ،

سنے سیج دے بیڑیاں پینگھ اج پپلاں دتی توڑ۔

جتھے وجدی سی پھوک پیار دی، اوہ ونجھلی گئی گواچ۔

رانجھے دے سبھ ویر اج، بھل گئے اوہدی جاچ۔

دھرتی تے لہو وگیا، قبراں پیاں چون۔

اج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور

اج کتھوں لیایئے لبھ کے وارث شاہ اک ہور؟

اینی زخم رچنا امرتا جیہا سمویدن شیل دل ہی کر سکدا اے۔ ایتھے اک گل ایہ وی ابھردی ہے کہ امرتا دی شاعری اردو تے پنجابی بھاشا دے محبت دی پرتیک ہے۔ اوس دی کٹھ چو نکلے شبد روحاں نوں جگاؤندے ہن۔ ایس دے الٹ پنجابی ناریاں سویرے سویرے اپنے پتی (شرابی لیکھکاں) نوں جگاؤندیاں ہن کہ ہن تاں سوج چڑھ آیا اٹھو میرے لیکھک شہنشاہ جی۔

1947ء دی ونڈ ویلے جیہڑیاں رچناواں ملدیاں ہن اوہ پاٹھکاں دے گھیرے چوں باہر ہن، پاٹھک اوہناں نوں پڑھنا چاہندا ہے پر اوہ بہت مہنگیاں ہن۔ بھشیم ساہنی دا 'تمس' تے یش پال دا 'جھوٹا سچ' گھنوگھٹ دو ڈھائی سو دا ملدا اے۔ پر امرتا دی ایہ کوتا پاٹھک نوں آسانی نال 1947ء دے درد نال ملاؤندی ہے۔ ایسے کر کے آکھدے نے گلپ نالوں کوتا ودھ پربھاوت کر دی ہے کیونکہ اوس نال دماغ دے بند پئے دروازے کھولدے ہن، پر جے کوتا صرف کوی نوں سمجھ آوے جس نے اوہ لکھی ہے تاں فیر خدا ہی بچاوے:

موت میری اک گل چرو کی......

کئی وار میں اٹھاں...... سوچاں......

چلاں...... پگھل پرواہ آواں میں

لاش دا قرضہ لاہ آواں میں

اک وار امرتا نے کیہا سی اصل لیکھک اپنے پاٹھکاں دیاں رگاں چ جیوندا ہے اوہناں دے سپنیاں چ اوہناں دی زندگی دے ہنیرے چوکیاں چہ تے ایتھوں تک پہنچا سکنا ہی لیکھک دی سبھ توں وڈی پراپتی ہندی ہے، سبھ توں وڈا ایوارڈ'

امرتا واقعی ایہ ایوارڈ پراپت کر چکی ہے۔ اوس دی الوداع قیامت دی اُڈیک چہ ہے۔

ڈاکٹر کرن دیپ سنگھ کرن

امرتا پریتم: نویں پرتِ ماناں دی سرجک

امرتا پریتم پنجابی ساہت دی اک اجیہی وِلکھن رچناکار ہے جس نیں رچناتمک ساہت وچ ہی نویں پرتِ ماناں نوں نہیں سرجیا سگوں سماج وچ وی اپنی جیون شیلی راہیں نویں ماڈل ستھاپت کیتے۔ اپنی اپنے بلوان جیون شیلی اتے ملوان کِردار اہیں اوس نیں مرد پردھان سماج دیاں ودھیکیاں نوں نہیں ونگاریا سگوں سماج وچوں کڈھن دا اپرالا وی کیتا اتے اوس نوں اوسدیاں ساہتک سمبھاوناواں پرتی وی جاگروک کیتا۔ اصل وچ امرتا نیں جس سمکالی پنجابی بھارتی سماج وچ لکھن دا بیڑا اٹھایا اوس وچ عورت صدیاں توں کرڑے سماجک بندھناں کارن کمزور اتے تراسد آدستھا دا لمبا پندھ بھوگ رہی سی۔ ایناں کرڑے بندھناں دے باوجود وی جیہڑی عورت رچناتمک کارج ول رُچت ہون دا جتن کردی سی اوس دی قلم نوں دھرم جاں پروارکلیان دے وِشیاں تک لکھن لئی ہی سمیت کردتا جاندا سی۔ سماج دے ایناں مُول ودھاناں دی گھُٹن نیں امرتا وچ استری دا ایہ لمبا سنگھرش ہی اوسدے رچناتمک کارج وچ اوسدی ساہتک سپھلتا دا وڈا سروت بنیا اتے استری جاتی لئی وہارک روپ وچ اک بہت وڈی پریرنا وی۔ اوسدی ایس پریرنا نیں عورت نوں پہلی وار سُتنتر زبان بخشی اتے اوس نوں اوسدی سُتنتر روح دی جھلک دی وکھائی۔ ایسے لئی اسیں امرتا نوں جیون اتے ساہت دوہاں کھیتراں وچ نویں پرتِ ماناں دی سرجن کیہا ہے۔

امرتا پریتم نوں اوسدی دوستی ساہتک پراپتی لئی بھارت سرب- سریشٹ ساہتک پرسکار 'گیان پیٹھ' نال سنمانیا گیا اتے بھارت سرکار ولوں پدم وبھوشن دی پدوی وی دتی گئی۔ ایناں پرسکاراں نیں جتھے پنجابی زبان دیاں ساہتک سمبھاوناواں نوں راشٹری اتے انتر راشٹری پدھرُ تے بلند کیتا، اوتھے سماج وچ عورت جات دے گوروں نوں وی ودھایا۔ اوسدے ایس مہان یوگدان کرکے ہی اوس نوں استری جات دی آواز اتے استری دے جذبیاں، اکنکھیا اتے سویمان نوں جس قدر رندیا گیا، اوس دی ہوند نوں نتانی سمجھ کے جویں کویں اوس

اُتے ظلم ڈھائے گئے، آرتھک طور اُتے مرد اُتے اوس دی پردھانتا نیں کویں اوس نوں بے زبان کیتا۔ اجیہی
مُوک ویدنا نوں امرتا نیں اپنے جذباتاں دی سچائی اتے بولاں دی ندھڑکتا نال اپنے کاوی وچ چتریا۔ اوسدی
کوتا 'ان داتا' دیاں ایہ مارمک پنکتیاں ایس تتھ دا بہت وڈا پرمان ہن جس وچ مرد پردھان سماج دی حقیقت
نوں ویانگ دے تکھے نشتر دی چوبھ نال اوس نیں ابھاریا گیا ہے؛

ان داتا

میں چم دی گڈی، کھیڈ لے، کھڈا لے

لہو دا پیالہ پی لے، پیا لے

تیرے ساہویں کھڑی ہاں ایہ، ورتن دی شے

جویں چاہے ورت لے

میں بُرکی توں ودھ کجھ نہیں جویں چاہے نگل لے

ان داتا؟

میری زبان تے انکار؟

ایہ کویں ہوسکدے؟

ہاں پیارا ایہ تیرے مطلب دی شے نہیں

امرتا دی کوتا وچ عورت ہون دے سنتاپ سمبندھی اوسدی انتر درشٹی وچ اوس سے ہور ودھرے
گہرائی اتے پرچنڈتا آئی جدوں دیش دی ونڈ سمیں مذہبی جنون ہیٹھ استری دے مانوی سنکٹ نوں اک ہور
دکھانتک پارسار پراپت ہویا۔ اُدھلے، بلاتکاراں، عورتاں دے ننگے جلوس اتے اوس اُتے ہر پرکار دے جنسی
اتیاچار، ادھیالیاں ہویاں عورتاں دے سماجک کلنک دے دکھدائی سٹیاں نوں، پُرکھ دے ورشنت دی شکار
استری دی سمپورن نیاستر ادے سچ نوں امرتا لے ڈونگھے پانیاں وچ آئی آ۔ تواریخ، خرید، ویاہتا نار، آدے
کوتاواں آدھونک پنجابی کاوپ دے اتہاس وچ احساس دی تیبرتا اتے پرگتاؤ دی تیبرتا کارن کلاسیکل بن گئیاں
۔ 'اج آکھاں وارث شاہ نوں' کوتا ایدھرلے تے اودھرلے ہرتھاں واسطے پنجابیاں لئی اک سانجھی ہُوک بن
اودے ہوئی، کوتا دے کرونامئی بولاں نے سموچے پنجابیاں نوں روا کے رکھ دتا۔ اوس دی کوتا 'خرید' وی اوس
سمیں دی دکھانتک مانوی پربھاوکاری درشانت ہے۔ جس وچ اوس نے اک اجیہے بچے دی نجک دُبیدھا نوں

چتریا ہے۔ جیہڑا اک اُدھلی ہوئی استری دے پیٹوں بلاتکاری دے پھل وجوں پیدا ہویا۔ پر مان وجوں کوتا دیاں پنکتیاں:

میں خرید ہاں اک زخم دا
میں دھبہ ہاں ماں دے جسم دا
میں ظلم دا اوہ بوجھ ہاں
جو ماں میری ڈھوندی رہی
ماں میری دے پیٹ چوں
سڑ آند جیہی آؤندی رہی

امرتا دیاں ایہ کوتاواں سماج وچ استری ورگ دے دکھ نوں مانووادی درشٹی توں پچھانن والیاں ہن۔ ایس تتھ وچ کوئی راواں کہ دیش دی ونڈ سمیں عورت دے درد نوں اُلیکن والیاں کوتاواں دے اتہاس وچوں امرتا پریتم دیاں نظماں نوں سبھ توں ودھ لوک پریتا حاصل ہوئی۔ ایہناں کوتاواں وچلی ڈھونگھی ٹوک کارن امرتا نے ساہت وچ اک نویں سکھر چھوہی۔ کسے پڑاء نوں ہی اوس دی رچناتمک پرتبھا دا سکھرلا پڑاؤ کیہا جاسکدا اے۔ پر اوس دی ایس پراپتی نوں وڈیاؤن دی تھاویں پنجابی ساہت دے کجھ وداناں نے ایہ کہہ کے کہ 'امرتا دیاں استری بارے رچیاں کرتاں کیول 'مہیلاواد' دے باہروں داخل ہوئی ساہتک فیشن دی ہی پرستشی ہن' اوس دے ساہتک وکار نوں اک وار فیر چنوتی دتی اتے جیون وچ اوس دے حوصلے نوں کمزور کرنا چاہیا۔ پر امرتا دے سچے بولاں دی بدھڑ کتاساہویں اوہناں دی ایہ دھارنا نرویل ثابت ہوئی۔ امرتا دیاں استری دے جذبات تے دکھاں نوں ابھوویاتک کرن والیاں رچناواں وچ ایت ڈھونگھی ویدنا ہے جو اوس دے خود عورت ہون کر کے نجی انوبھووچوں آئی ہے۔ دوجا 'امرتا کیول ایہناں دکھاں نوں پرگٹاؤندی ہی نہیں، سگوں ایہناں دی چیتنا راہیں عورت نوں ایہناں توں مکت ہون لئی جاگرک وی کردی ہے۔ اوس دی مانوتاوادی درشٹی سماج وچ عورت اتے مرد دوہاں نوں بہترین مانو وجوں دیکھن دی چاہوان ہے۔ ایسے لئی اوس نے سماج دے ستانے تے کمزور ورگ دی دلوں حمایت کیتی ہے اتے اجیہا کارج اوس دا نرا 'مہیلاواد' نہیں سگوں عورت ہون کر کے نجی بھوگیا سنتاپ ہے جو ساہت وچ اوس دی پریرنا بنیا۔

امرتا دے ساہتک سفر نوں پرگتیوادی لہر دے پرت ماناں نے ہور سدھاتک ڈونگھائی دتی تے

ایس لہر دی پریرنا راہیں اوس نے سماج دے اوہناں وِیہلوزمینداراں دے ظلم نوں اپنی قلم راہیں ننگیاں کیتا جو کرتی قسماں دی انتھک محنت دا ناجائز فائدہ اٹھا کے آپ عیش پرستی دا جیون جیوندے رہے۔ امرتا نوں ہر مزدور اتے کامے نوں اپنے حقاں لئی چیتن ہو کے سنگھرش کرن لئی پریریا اتے اپنی بلند آواز وچ اوہناں نوں آشا پردان کیتی:

ایہ دھرتی اج لوکاں جوگی

ایہ لوکیں اج دھرتی جوگے

بھر کے چاڑھے ہانڈیاں گوہئے

بھر کے گن پرات

اتے اوہناں نوں ہور وڈھیرے جاگ رُک کرن دی وچن بدھتا نبھائی:

لگراوے کنڈیالیا

پھکن دے ایس یگ وچ

لوک چڑھن پروان

پر دیش دی آزادی توں بعد وی جدوں کرتی، کساناں تے کامیاں دی آرتھک مندحالی وچ کوئی فرق نا پیا تاں اوس دا کومل ہردا اوہناں دی ویدنا نال ولوندھریا گیا تے اوس دی کاوسمویدنا چیخ دے روپ وچ کرلا اٹھی:

کہندے: لنگھ گئی اے رات

کہندے: آئی اے پربھات

میرے عرشاں تے شاہیاں اجے اوڈیاں ہی اوڈیاں

اساں کڈیاسی گوڈیاں

اکٹھیاں سی بیجیا

اوئے کویں آ کے ستا شادانہ ونڈیا

امرتا پریتم دی کوتا جتھے سماجک سروکاراں نوں بڑی ساہتک سویدن شیلتا نال پرگٹاؤندی ہے اوتھے پیار دے سروکاراں دی پیروی وی بڑی شدت نال کردی ہے۔ پیار دا جذبہ بھاویں منکھی قدراں قیمتاں نال

سمبدھت ہے پر فروی سماج وچ ایہدی کامیابی دے راہ وچ جات پات، نسل بھید، آرتھک اوچ نیچ، دھارمک بھن بھید ورگیاں انیکاں اوکڑاں ہمیشہ رہیاں ہن۔ کوتری نوں نجی پریم پیڑ اداوی ڈونگھا انوبھوی ایسے لئی عشق دے درد دبیان اوس دیاں رچناواں وچ بڑ ڈب کے ہویا ہے جویں:

عمر بھر دا عشق بے اواز ہے — ہر میرا نغمہ میری اواز ہے

حرف میرے تڑپ اٹھدے ہن ایویں — لگدے ہن رات بھر تارے جویں

عشق دے جذبے نوں اوہ سمے دے اتہاس دی تراسدی نل جوڑ دی ہوئی رہندی ہے:

کانی سمے دی سدا ہی رہی ویکھدی — خونی پترے پیار دی پیڑ دالے۔

ڈاکٹر سریندر سنگھ نورامرتا کاودے کاوشاستری مکھ دی چرچا کردے ہوئے 'درد' نوں اوس دی کوتا دے تھیمک کیندر نال جوڑدے ہن۔ اوہناں انوسار امرتا دی کوتا وچ پیدا ہوئے درد دے دو پکھ ہن۔ اک پکھ عشق نال سمبندھت ہے اتے دوجا لوکائی تے عتہاس دی پیڑ نال سمبندھت ہے۔ امرتا انوسار کوتا دا کردار اتے ذمے واری پیڑ نوں پچھانن دی بن دی ہے اتے پیڑ دا ذکھن کر کے چراغ بلن دی وی۔ امرتا آپ اس گل دا اولیکھ کر دی ہے: ''میں صحیح ارتھاں وچ لیکھک اوہناں نوں من دی ہاں جہدی قلم سیاہ دور دی چیخ ہووے۔''

اتے امرتا دیاں بہت ساریاں کوتاواں سیاہ دور دیاں چیخاں ہی ہن جنہاں راہیں اوس نے اپنے درشٹی کون توں سماج وچ واپر رہیاں تکلیفاں دا وویچن وی کیتا اتے اوہناں دا سمادھان کرن دی وی ذمے واری نبھاؤن دا جتن وی کیتا۔ جس دی کھیتر وچ اوس دے دکھ تے ترازنوں ودھیرے محسوس کیتا، اوس دی مکتی لئی دلوں منوں ہو کے قلمائی ڈھنگ نال لکھیا۔ اوس دی کلاتمکتا ساہت دے کئی ہور روپاں وچ ابھویکت ہوئے جویں گلپ، لوک دھارا، سوے جیونی، انوواد، ساہتک پترکاری۔ سارے روپ ہی اوس دی بہو رنگی پرتبھا دا پرمان رہے ہن پر اس گل وچ کوئی سندیہ نہیں کہ اوس دی ساہتک سدھی جتنی کوتا دوارا سمپن ہو کے ہوند وچ آئی اونی ہور کسے روپ وچ نہیں۔ کوتا اوسدے احساس پرگٹاوے دی شدت وی رہی ہے اتے سکھر وی۔ سچ مچ ہی امرتا اک یگ کوتری سی۔ نرسمدیہ نویں راہاں دی سرجن وی اتے نویں ساہتک پرت ماناں دی چتیری وی۔

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

موہن جیت

گیت اکھراں والی ورن مالا

اج اسیں اکویں صدی دی دہلیز تے کھڑے ہاں اتے جدوں وہویں صدی دے کجھ چونویں وچار ماڈلاں جاں شخصیتاں دا لیکھا جوکھا تاں جس کلا ماڈل نوں گوڑے اکھراں وچ لکھیا جائے گا اتے جس بہو پرتی، بہودشائی اتے بہوونی شخصیت دا ناں ابھر کے ساہویں آئے گا اوہ شخصیت ہوئے گی امرتا پریتم۔ امرتا پریتم سمکالی اتہاس دی دستاویز۔ امرتا پریتم ساڈے سمیاں دی دند کتھا۔

31 اگست 1919ء وچ جنمی امرتا پندراں ورھیاں دی عمرے لاہور وچ گورودیو راوندرناتھ ٹھاکر نوں ملی اتے سنگدیاں سنگدیاں نظم سنائی جہدیاں پہلیاں پنکتیاں انجھ سن۔

موتی ملے گا کوئی انمول تینوں

توڑ توڑ کے سپیاں ویکھدا جا

گورودیو نیں نظم دا انگریزی انوواد سنایا تے اسیس دتی۔ ایہہ خبر اگلے دن ٹریبون چھپی۔ اس گھٹنا بارے امرتا دسدی ہے 'نظماں اودوں وی لکھدی ساں پر سنگدیاں جھیاں۔ اوہناں دے جدوں نظم سان لئی کیہا تاں سنگ کے سنائی سی پر اوہناں جو پیار تے دھیان دتا سی اوہ نظم دے مطابق نہیں سی، اوہناں دی اپنی شخصیت دے مطابق سی۔

امرتا دیاں پہلیاں کوتاواں آدرش وادی رنگن والیاں سن جو اوسدے پتا دے وچاراں دے دے پربھاو دھیں لکھیاں گئیاں۔

ویسے امرتا نیں پہلی کوتا اودوں لکھی جدوں اٹھ ورھیاں دی سی۔ اس کرتا وچ کے سپیاں دے شاہزادے 'راجن' دا ذکر سی۔ نظم والا کاغذ اچانک باپ دے ہتھ آ گیا اتے بالکڑی امرتا نوں ڈاہڈھے غصے دا شکار ہونا پیا۔ امرتا دسدی ہے کہ اس خیالی چہرے دا سپنا اوہنوں ویہہ ورھے تک آوندا رہیا۔ سوہنا سونکھا چہرہ،

موڈھے تے چٹی شال لئی ہوئی، ندی کنڈے تر ریہا چہرہ۔

امرتا پریتم نیں کوتا دا تکنیکی پکھ اپنے پتا توں سکھیا پر اوہناں ولوں درسائی سدھارووادی وشے آدرش وادی اتے سودھاروادی ہی ہن۔

امرتا دے ذہن دے کنیاں پکھاں تے اوہناں دے پتا ڈونگھا پربھاو ہے۔ اوہ بچپن وچ ہی ویراگ گئے تے بابا دیال دے ڈیرے جا بیٹھے۔ (بابا دیال دی علاقے چ مانتا سی۔) اوس ویلے اوہناں دا ناں نند سادھو سی۔ گا کے کوتا پڑھدے سن۔ اس ڈیرے چ ہی امرتا، برج بھاشا اتے حکمت سکھی۔ اس ڈیرے وچ کوئی راج بی بی وی آوندی سی۔ اوہدا پتی فوج وچ سی تے اک وار ایسا گیا کہ کدے وی نہ پرتیا۔ راج بی بی ویراگ گئی۔ ایتھے وی اک دن بابا دیال نیں نند سادھونوں راج بی بی ول ڈونگھی نظر ویہندیاں تکیا تے اوہدے من دی گل بجھ لئی۔ اوہ نند، بی بی دی جیون وکھیا دی جاندے سن۔ سو کہن لگے: نند بیٹے! ویراگ تہاڈے لئی نہیں۔ تسیں گرہستھ جیون دھارن کرو تے راج بی بی دا ہتھ اوہناں نوں پھڑا دتا۔ ایہ راج بی بی امرتا سی ماں بنی تے نند سادھو گرہستھ دھارن کر کے کرتار سنگھ بنے۔ کیونکہ کوتا لکھدے سن اس لئی تخلص 'پیوش' (امرتا) رکھیا۔ دھی جنمی تاں اپنے تخلص توں اوہدا نام امرتا رکھیا تے آپ کرتار سنگھ 'ہتکاری' بن گئے۔ امرتا کہندی ہے: 'میں اپنے باپ دے تخلص دا انوواد ہاں۔' 1931ء وچ ماں سوورگ واس ہوگئی۔ سو پالنا پوسنا باپ نیں ہی کیتا۔ باپ نال سمبدھت کئی یاداں گھٹناواں ہن جو امرتا دے اچیت چ ڈونگھیاں اوکریاں گئیاں۔ اک وار پیتا نیں گردوارا بومی صاحب چ بالڑی امرتا توں ارداس کروائی سی بھری سنگت وچ۔ کئی دن ارداس یاد کرواوندے رہے۔ کیہا: 'بولن ویلے دھیان صفر شبداں ول رکھنا ہے۔ لوکاں ول نہیں ویکھنا۔ اس طراں کوئی شبد بھلے گا نہیں۔' اس گھٹنا بارے امرتا کہندی ہے: 'جاپدا ہے ایہ چھوٹی جیہی گل میریاں رگاں وچ اتر گئی۔ زندگی بھر دھیان اپنے ای لفظاں نال جڑیا رہیا۔ جس ویلے لکھدی ہاں پوری اوہدے وچ سموئی ونی ہاں۔ نند ااوستت کیہ کہندی ہے اودوں نہیں سماں جاندی۔ (ارداس والی گھٹنا ویلے امرتا پنجاں ورھیاں دی سی) پر میرے پیتا جی جاندے سن۔ پتا نہیں ایہ اوہناں دی دوراندیشی سی جاں قدرت دا کوئی کرم، ہنیرے میرے وجود وچ اوہ کئی پادتی کہ فیر کنیاں استت دیاں وڈیاں وارداتاں وچوں گزرن ویلے دی من تھاویں ریہا۔ جے کدے گھڑی ڈولیاں وی تاں اگلے پل ساویں آگیا۔ کدے خیال نہیں آیا کہ لوکیں میری لکھت پڑھ کے کہن گے۔' سماں گواہ ہے کہ اوہدے ویہار تے لکھت بارے کئی وار چکڑ اوڈایا پر اوہ اپنے راہ اڈول تردی رہی، بھاویں لکھت سکھ عقیدے

نال سمبدھت سی جاں چیکوسلوا کیا تے روسی حملے دی نکھیدھی نال جاں رجنیش اتے جیوتش بارے لکھنا وچارنا سی۔ رجنیش (اوشو) دیاں کتاباں دیاں تاں امرتا نیں بھومیکاواں دی لکھیاں ہن۔ تے 'اوشو ٹائمز' دے وشیش نمبراں دا سنپادن کیتا ہے۔

پتا نہیں سبندھت اک ہور گھنڈاوا ہے۔ اوددوں امرتا ستاں ورھیاں دی سی۔ لاہور چونا منڈی والے مکان وچ بیتکاری ہوریں پرتھا چن کھڑیاں نوں، کتاباں توں خوشخط کر کے لکھاؤندے ہندے سن۔ اک دن بالڑی امرتا اوس کمرے وچ ننگے سر چلی گئی تاں پیتا نیں چپیڑ ماری۔ اوہناں دا کہنا سی کہ اوس کمرے وچ ننگے سر نہیں آونا۔ بال من نوں صدمہ پہنچیا اتے تیز بخار چڑھ گیا۔ ماں سر تے پانی دیاں پٹیاں رکھ رہی سی۔ اوس ویلے بال من نیں تڑپ کے آکھیا سی۔

'اج جیہڑیاں کتاباں کر کے چپیڑ ماری ہے ایہو کتاباں میں آپ لکھ سکدی آں۔ ایہ قیامتی حرف میری زبان تے کس طراں آئے سن میں اج تک نہیں جاندی، امرتا کہندی ہے۔

امرتا نیں زندگی وچ کئی شوق پالے پر نبھیا آخر قلم دا شوق۔ پہلا شوق فوٹوگرافی دا سی۔ پروفیسر کرتار سنگھ بیتکاری ودھیا فوٹوگرافر وی سن۔ گھر وچ ڈارک روم بنیا ہویا سی۔ خالی کاغذاں تے ابھردے لشکدے منہ اک دنیا رچن وانگ لگدے۔ فیر لاہور تارا چوہدری توں چھے اٹھ مہینے ناچ سکھیا۔ سکول دے فنکشناں تے نچیا وی۔ تارا چوہدری نیں سٹیج تے آون لئی کیہا تاں گھر دیاں اجازت نہ دتی۔ امرتا دے شبداں وچ 'شوق مرجھا گیا۔ ایہ سکے پتیاں وانگ زمین تے ڈگا تاں نویں بیہ دی شکل وچ پنگریا ستار وجاؤن دا شوق'۔ ماسٹر رام رکھا، سراج احمد تے فینا استریاں امرتا دے استاد سن۔ اس ویلے امرتا دی عمر 17 ,16 ورھیاں دی سی۔ کجھ دیر لاہور ریڈیو توں ستار وجایا۔ گھر دے ٹانگے تے بٹھا کے ریڈیو سٹیشن جاندی۔ سمکالی کلاکاراں چوں نورجہاں، شمشاد بیگم، منور سلطانہ اتے مراجیہ بیگم سن۔ ملکہ پکھراج صرف گاؤندی سی۔ پر ایہ شوق وی بہتی دیر نہ نبھیا۔ لاہور ریڈیو سٹیشن ولوں چھپن والے رسالے ''آواز'' نے ستار وجاؤندی امرتا دی تصویر ٹائٹل تے چھاپ دتی۔ تے فیر ایہ تصویر پاناں والیاں دیاں دوکاناں تے لگ گئی۔ سوہریاں نوں پتہ لگا تاں کہیا وڈے گھراں دیاں دھیاں پاناں والیاں دیاں دوکاناں تے لگیاں شوبھا نہیں دیندیاں۔ ایہ وی کہیا جنے پیسے ستار وجاؤن دے ملدے نیں ساتھوں لے لیا کر۔ اتے ایداں ستار دا شوق وی بیتے دی گل ہو گیا۔ اداسی ہور سنگھنی ہوگئی۔ پہلیاں کتاباں چہ جیہڑا لوک یا تک رنگ سی اوہ پوری شدت نال سماج دیاں

عورت ورودھی قیمتاں دی خلافت وچ بدل گیا۔ پر مپرک سماج وچ رہن والے پر مپرک مردنوں عورت دے ماس دی ضرورت سی۔ اوہدی روح نال اوہدا کوئی واسطہ نہیں سی۔ اکھوتی دھرم نے وی پر مپرک مردنوں ہی ہنگارا دتا۔ امرتا نے عورت نوں وستو سمجھے جان وروودھ شدت نال لکھیا۔ امرتا دے پرگتیو دا ایتھوں ہی مڈھ بجھدا ہے۔

امرتا نوں پچھیا ویاہ بارے کویں سوچدے ساؤ؟ کہن لگے: اوہناں ویلیاں چہ لڑکی ویاہ بارے Aware (باخبر) نہیں سی ہندی۔ جتھے گھر دیاں کردتا، ہوگیا۔ منگنی تاں چونہہ ورھیاں دی عمر چہ ہوگئی سی۔ دوسرے ماں جیوندی نہیں سی تے باپ نال کڑی کی گل کردی۔ اودوں سوچن والی گل نہیں سی۔ نالے اوہ (سوہرے گھر والے) چنگے لوک سن۔ پہلاں توں ہی جانوسن سو ہوگیا۔ ویاہ ویلے امرتا دی عمر 17 کو ورھے دی سی۔ پتی داناں پریتم سنگھ کواترا سی۔

تے امرتا پریتم ناں دا کی اتہاس ہے؟

ایہ تاں ریڈیو تے جان ویلے رکھیا۔ امرت کورتوں سکھ ہندو دی پچھان ہندی سی۔ نرا امرتا چھوٹا ناں سی۔ امرتا پریتم نام ڈھکواں لگدا سی۔

پلیٹھی دا کاوسنگریہ ''ٹھنڈیاں کرناں'' تے ''امرت لہراں'' کاوسنگریہ ویاہ توں پہلاں چھپ چکے سن۔

ویاہ توں پہلاں وی پیار کیتا؟ امرتا دا کہنا ہے کہ ویاہ توں پہلاں پیار نہیں کیتا۔ خیالاں چ ضرور کوئی روپ اگھڑ داسی پر۔ تھارتھ وچ کوئی نہیں سی۔

تے ساحرلدھیانوی؟

ساحر امرتا نوں چوہنداتاں سی پر اظہار نہیں سی کردا۔ اندرو اندریں ہی کجھ کہنداکرداسی۔ امرتا نے ساحرنوں رج کے چاہیا ہے۔ انیکاں کوتاواں لکھیاں ہن۔ سنیہڑے دی لمی کوتا۔ چیتر ناں دیاں ساریاں کوتاواں۔ اس توں بنا ''عاشو''، ''اک سی انیتا'' اتے ''دلی دیاں گلیاں'' وچ وی ساحرنوں چتویا ہے۔ اک وار کسے اردو مشاعرے توں بعد ساحر دے چہرے اوس دے، آٹوگراف لے رہے سن تاں امرتا نے وی ہس کے اوہدے اگے ہتھ دی تلی کردتی۔ ساحر نے پین دی سیاہی انگوٹھے نوں لاکے، اوہ انگوٹھا امرتا دی تلی تے لادیتا۔ امرتا کہندی ہے: ''ایہ میرے کاغذ دی--- عبارت سی جہدے اتے اوہنے دستخط کیتے۔ ایہ سبھ ہواواں دے

حوالے ہے۔ ایہ عبارت نہ کدے اوہنے پڑھی نہ زندگی نے۔ ایسے لئی کہہ سکدی ہاں۔ ساحر اک خیال سی۔ ہوا وچ لٹک دا، شاید میرے اپنے ای خیالاں دا اک جادو پر امروز نال گزاری زندگی بیخودی دے عالم تک پہنچ گئی۔''

اک وار پرکاش پنڈت نے دسیا کہ لاہور وچ جدوں امرتا گمٹی بازار وچ رہندی سی تاں ساحر روز رات نوں گلی چوں لنگھدا ہندا سی کہ شاید کتے باری چوں دس پئے۔ 'جاپدا، ساحر نوں کوئی کمپلیکس سی'، امرتا دسدی ہے، اک وار بمبئی چہ امرتا اوہدے گھر رہی تاں رات نوں کہن لگی۔ لائٹ بجھادے۔ میں سوہنا نہیں۔ مینوں گھبراہٹ ہندی ہے۔ اوہ سنسنی خیز گلاں چوں آنند ماندا سی۔ بمبئی اک پارٹی ویلے اوہ امرتا نوں نال لے کے دوستاں دی گھریں صدالین گیا تے امرتا نوں کہیا۔ 'ویکھ تینوں میرے نال ویکھ کے لوک کویں چونکدے نیں۔' امرتا نوں پچھیا۔ ساحر ہور کی کہندا سی؟ کہندا سی۔ 'چل چین چلیے، اوتھے میں میں چینی زبان وچ گیت لکھاں گا۔' ایہ چین جان دی بھارت امرتا نوں وی سمجھ نہیں آئی۔ گل تاں صاف ہندی ہے جے اس وارتا بارے امرتا دی کہانی 'ایہ کہانی نہیں' (شلا لیکھ، جون 96) پڑھیے۔

نوتیج نے اک وار امرتا نوں پچھیا سی۔ زندگی وچ تیرا سنکلپ کی ہے؟ 'بس ایہو کہ جیہدے نال رہنا چاہُندی ہاں اوہ مل جائے۔' امرتا دا جواب سی۔

سو امرتا زندگی وچ اپنے سنکلپ بارے ہمیشہ سچیت رہی ہے۔ اوس دے بہتے سمکالی اودے نزدیک ہونا چاہُندے سن پر جدوں ہنگارا نہ ملیا تاں تہمتاں تے اُتر آئے۔ موہن سنگھ نے تاں کئی کوتاواں لکھیاں۔ 'جائداد' تے 'جندرے' اداہرناں ہن۔ موہن سنگھ دا پیارا اک پاسڑی۔ 'جندرے' کتاب دے ٹائٹل تے موہن سنگھ دو جندرے بناؤنا چاہندا سی بھاو کہ اوہدے رستے وچ امرتا دے دو بچے رکاوٹ ہن۔ امروز نے دو دی تھاں تنے جندرے بنادتے۔ کہن لگا: 'تیجا جندرا دو بچیاں دی ماں دا پرتیک ہے۔' امرتا کہندی ہے۔ اوس ویلے امروز نے میری سوچ اپنے متھے وچ پالئی سی۔

جویں کوتا وچ امرتا اپنی روح دا اقرار پالدی رہی ایویں اوہ کوتا وچ ولکھن تے وکھری وی ہے۔ سمکالی کوتا دی کھڑوت دی تھتی وچ وی امرتا اپنی طرح دا لکھدی رہی۔ 'کاغذ تے کینوس' (جس تے اوہنوں بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ ملیا) فر کاغذ تے کینوس توں بعد، فرنویاں کوتاواں والی 'کاغذ تے کینوس' تے دوورھے پہلاں چھپی 'درویشاں دی مہندی' دیاں کوتاواں اس گل دیاں گواہ ہن۔

امرتا دے پنجھتر ویں جنم دن تے ہندی دے پرسدھ کہانی کار کملیشوار نے کہیا سی- ''جدوں اسیں ہندی، بنگالی، مراٹھی جاں تیلگو تامل چہ لکھ رہے ساں، امرتا کوتا لکھ رہی سی۔''

امروز نوں امرتا 'رب ورگا آسرا کہندی ہے۔' پچھیا- امروز نوں تسیں کویں پہچانیا، پتی وانگ، پریمی وانگ، جاں دوست وانگ؟ اس بارے امرتا دا جواب سی:

'باپ، ویر، دوست تے خاوند
کسے لفظ دا کوئی نہ رشتہ
انج جدوں میں تینوں ویکھیا
سارے اکھر گوڑھے ہو گئے'

تے ہن پچھے جہے جد 'ہیر رانجھا' فلم بنی، تاں میوں ہیر رانجھے دی پہلی ملاقات ویلے دا گیت لکھن لئی آکھیا گیا سی تاں میں امروز دی تے اپنی پہلی ملاقات دا ویلا چتر کے گیت لکھیا سی:

سچ توں سپنا دی توں
غیر توں اپنا توں.... واہ سجن!

جوگ دا اک راہ وی توں
عشق دی درگاہ وی توں
ایہ ساری کائنات توں
خدا دی ملاقات توں.... واہ سجن!

امرتا پریتم جتھے کمال دی لیکھکا ہے اوتھے اوہدی دوستی دا آدھار وی آپسی انڈرسٹینڈنگ ہے۔ ایہی اکرن ہے چونہہ دہاکیاں توں وی تری ساڈی دوستی سے دی تورنال گوڑھی ہوئی ہے۔ جدوں میں دلی یونیورسٹی دی نوکری کیتی تاں اوہنے کیہا سی: 'ویکھیں موہن جیت ہی رہیں۔ اوہنیں دنیں دلی یونیورسٹی چ ڈاکٹر ہربجن سنگھ تے اوہدا سرکل امرتا بارے کوئی نہ کوئی شوشہ چھیڑ دا ہندا سی۔ اودوں میں جواب وچ کیہا سی 'جدوں موہن جیت نہ رہیا' دلی چھڈ جاواں گا۔' ساڈی متر تا تے وی دکھی اُوناں لاؤندے رہے، ہن پرکاواں دے آکھے ڈھور نہیں مردے۔

ہو چی من نیں اپنی دلی پھیری ویلے امرتا دا متھا چم کے کیہا سی 'اسیں دووےں دنیا دیاں غلط قیمتاں نال لڑ رہے ہاں' توں قلم نال، میں تلوار نال'۔

امرتا دی دوستی وچ جادو ہے۔ پچھے جہے پاکستان دی کہانی لیکھکا افضل توصیف دلی آئی تاں میں پچھیا ''تسیں دلی چ ہور کیہ ویکھیا؟''

''دلی چا امرتا نوں دیکھ لیا، ہور کیہ ویکھنا سی! امرتا دا گھر ہی ساڈا مکہ ہے۔'' سچ مچ ہی امرتا ہی دا گھر نویں پرانے لیکھکاں دی محبت گاہ، زیارت گاہ ہے۔

مئی 1966 وچ امرتا تے امروز نیں ساہتک پتر ''ناگ منی'' شروع کیتا جو اج تیک نرنتر چل رہیا ہے۔ پنجابی دا شائد ای کوئی ہور سینئر لیکھک ہووے جو نواں لکھن والیاں نال اپنی نیڑتا رکھدا ہووے۔ 'ناگ منی' اج سنستھا بن چکیا ہے۔ ایہ پہلا پرچہ ہے جہنے چندہ دے کے پرچہ خریدن دی پیرت پائی۔ اس دے پہلے لائف ممبر خود امرتا اتے امروز سن۔ راجندر سنگھ بیدی نیں چندے وجوں گیاراں روپے بھیجدیاں کیہا سی دس روپے چندہ تے گیارواں روپیا سروارنا۔

1947ء وچ دیش دی ونڈ ویلے امرتا دلی آ گئی۔ ایہ روزگار دی تلاش دے دن سن۔ ڈاکٹر مہندر سنگھ رندھاوا دی سہایتا نال دلی ریڈیو سٹیشن تے پارٹ ٹائم نوکری مل جو کئی ورھے چلی۔ ریڈیو تے امرتا نیں 'آواز دے دوستو' پروگرام نال سروتیاں دا دل موہ لیا۔ آکاشوانی دے اک سیوانورت ڈائریکٹر نیں پچھے جہے پروگرام دی گل کردیاں دسیا کہ امرتا دی آواز وچ کوئی جادو سی ایتھوں تک کہ کئی وار اوہ سٹوڈیو دے شیشے وچوں ویکھدے ہندے سن کہ امرتا کویں بولدی ہے۔

بھارت دا پہلا سرو شرشٹھ ساہتک پرسکار گیان پیٹھ امرتا نوں ہی ملیا ہے۔ ایہ 1982ء دی گل ہے۔ مینوں یاد ہے، واگدیودی جو پرتما ایس پرسکار وچ دتی جاندی ہے اوسدی آرتی پہلی وار امرتا دی رچنا 'آدھی کوتا' نال اتاری گئی سی۔

امرتا پریتم دی نویں کوتا وچ دارشنکتا اتے ادھیاتمکتا دی سر ودھیرے ابھردی ہے۔ ایہ انتر گیان دے انبھو دی کوتا ہے۔ ایس کوتا وچ کایا کلپ ہوئے وی اکتو دے روشن درشن ہندے ہن۔ ایہ آن دسدے دی گل ہے اوہ جو پرا۔ بھارتھ دی دی زمین ہے۔ ایس وچتر انوبھو وچ اوشو دے گیان دی سرو پہے اتے سویہ پچھان دے بھاو وی۔

پچھلے دنیں امرتا نوں پچھیا کہ کئی پاٹھکاں دا وچار ہے کہ امرتا ہن جیوتش دا چرچا بہت کردی ہے جو اوہناں دی وگیانک سوچ دے انوکول نہیں۔ ایہ گل پچھے جیسے دلیپ کور ٹوانا نیں وی کہی تے اک دن آرٹسٹ سرجیت کور تے جسوندر ردیہ نیں وی کہی تے پرسنگ وچ امرتا نیں دسیا کہ جیوتش بارے کسے بھرم بھولیکھے جاں اندھ وشواس وچ اوہناں دا وشواس اوہناں دا وشواس نہیں۔ جیوتش بارے اوہناں دی پہنچ وگیانک ہے اتے ایس کھیتر وچ اوہناں دا نظریہ کسے کھوجی والا ہے۔ بہت واری لوک گل دی تہہ تک پہنچن توں بناں ہی ٹپنی کر دیندے ہن۔ جیوتش اک شاستر ہے اتے۔۔ بھارتی پرسنگ وچ ایس دا وڈا مہتو ہے۔ ایسے طراں آچاریہ رجنیش بارے امرتا دا کہنا ہے کہ گیان دے کھیتر وچ رجنیش دا کوئی ثانی نہیں۔ امرتا زندگی دے رہساں نوں جانن سمھدی اپنی پہنچ نوں تلاش (کوایسٹ) داناں دیندی ہے۔

امرتا ساڈے سمیاں دی دند کتھا ہے۔ ایس وڈ ملے ورثے بارے جناں وی کیہا جائے تھوڑا ہے۔
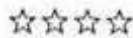
(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

پینٹنگ: ظاہر رشید

چانن دیاں چھٹاں

چانن دیاں چھٹاں

چانن دا اک چھنبھ سی
تارے جھجراں بھردے چھلکن وہنگیاں
چھٹاں پیتیاں جند تے
چھیتے آئیاں گلاں جندوں مہنگیاں
دھرتی سی کندیالڑی
امبر پلا اڑیا گھنگی لہہ گئی
بجھنی جندے میریئے!
لنگھدی لنگھدی رات کہانی پا گئی
نازک پوٹے وِلاں دے
کرناں چوبھی سُوئی، دسر ہو گئی
یاداں بھانبڑ بالیا
لکھ بچائے پلے، کنی چھوہ گئی

احمد لطیف

کون کہے اب وارث شاہ کو

ناگ منی، اُمروز، اُمرتا وارث شاہ اور ساحر
دُور افق پر چمکا چاند اور دل کی گلیاں، جگ مگ جگ مگ کرتی ہیں
میرے دل میں میری رُوح میں زندہ ہے
تیرا اک اک مصرعہ، تیرا ہر اک مکھڑا
تیرے گیت اُمر اُمرت ہیں تو ہے اُمرتا پریتم
کون اس اُمر پریت کی لے پر حال دھمال کرے
پیلے ہوتے جیون کو پھر لال گلال کرے
کون کہے پھر وارث شہ کو
کون اُمرتا ہو
ناگ منی، اُمروز، اُمرتا
ساحر کی ساحرتا
کون کہے پھر وارث شہ کو، میری لکھے بات
وارث اور اُمرتا آج تو ٹوٹ آئے یاد
ٹپ ٹپ آنسو گر کرتن من ہونے لگا پنجاب
ناگ منی، اُمروز اُمرتا، ساحر کی ساحرتا
کون کہے پھر وارث شہ کو، کون اُمرتا ہو
کون اُمرتا ہو........

امرتا پریتم کے نام ایک خط

منی پلانٹ کو کیا چاہیے ہوتا ہے؟
اِک بوتل، کچھ چُلّو پانی
پُھول گلاب کا گملے کی مٹی میں کِھل اُٹھتا ہے
جس رنگ کا بھی چاہیں
اور گملا جس جگہ بھی چاہیں، رکھ لیں
نیم بکائن کی چھاؤں میٹھی، پتے کڑوے
پتے گھوٹ کے پی لیں، صاف لہو ہو جائے
اور پھر آنگن بھی سوہنے لگتے ہیں
بڑ قیدی نہیں ہوتا
نہ بوتل، نہ گملے اور نہ آنگن کا
بڑ کو دیواریں اور چاردیواریاں قید نہیں کر سکتیں
بڑ لگانے والا اپنے لگے ہوئے بڑ کی چھاؤں میں
بیٹھ نہیں سکتا، کہتے ہیں
اتنی عمر حیاتی کی لکھوائے کیسے؟
پر کیا بڑ دنیا سے ختم ہوئے؟
دھرتی پر انسان کو چھاؤں دیتے ہیں
پیپل، نیم، بکائن، پھلاہی، شیشم، کیکر، توت، کریر
اور بہت سے میں نے ابھی نہیں گنوائے

پھولوں والے لاتعداد درخت نہیں گنوائے

وہ بھی ہیں ان گنت

پر دیکھوں تو

کس نے کی برابری بڑ کی!

بڑ کی چھاؤں ماؤں جیسی گھنی، گھنیری، ڈھانپنے والی

ہر اک چھاؤں کی سردار

اپنے نیچے اُگے ہوئے بوٹوں کو

بڑ نہیں بڑھنے دیتا

اک اعتراض پرانا!!

کس نے بڑ سے بڑھنا کس پودے کس بوٹے نے؟

(دور ہو یا پھر پاس، بڑھ کے بڑ سے کس نے کبھی دکھایا؟)

ویسے بھی تو بڑ کے نیچے گیان، دھیان

امرتا پریتم! تم جو درخت کوئی ہوتیں، تو بڑ کہلواتیں

امرتا پریتم!

تم پنجاب کی ٹکڑے ٹکڑے دھرتی

لہو میں سُرخو سُرخ، پھر بھی ساوی ساوی

اپنے تاؤ میں تپتی، پھر بھی چھاؤں بانٹتی

''اک دایوتا'' تیرے سچ کا سمبل، پر سوچو تو

بڑ اور بڑ کی چھاؤں کیا کیا سمبل دیتے ہیں؟

تو دھرتی اور اپنے لہو کے پھولوں کی پھلکاری تیرے اوپر

پر تم کوئی درخت جو ہوتیں، بڑ کہلواتیں

☆☆☆☆

امرتا پریتم کو یاد کرنے کی بھول

صبح دم جب پھول پر شبنم پڑی
اک کلی سی امرتا پریتم کھلی
ٹوٹ کر جو پیار کرتے ہیں سدا
اُن بتوں میں ایک وہ مورت بھی تھی
جس گلی میں اُس نے رکھا تھا قدم
وہ گلی تھی پریم کی' پر بند تھی
اُس کی چٹھی پر رسیدی تھا ٹکٹ
ڈاک میں چٹھی یہ کچھ دن تک رہی
اس کی تحریروں نے اور باتوں نے دیکھ
ایک دُنیا میں مچادی کھلبلی
اس کی باتوں میں تھی دُنیا کی مٹھاس
وہ تھی پوری ایک مصری کی ڈلی
اس کا ماضی اور مستقبل نہ پُوچھ
حال کہتا ہے وہ عورت تھی بھلی
موت آئی اُس کو بام و در کے بیچ
زندگی امروز و فردا میں گئی
ہیر وارث نے کہی تھی رانجھنا
امرِتا کی ہیر تو ہے اَن کہی

شاعرہ تھی وہ تو دُنیا کی سنو
وہ تھی بھارت اور نہ پاکستان کی
یاد آئی جب بھی اُس کی بھول کر
رنگ دے کر گُل کو خوشبو اُڑ گئی
بات کہنے آئی تھی وہ دِل کی، سُن
بات کی بَس اور کہا میں تو چلی

☆☆☆☆

زہیر کنجاہی

امرتا پریتم

شاعر دھی پنجاب دی
جہدا اکھراں وچ اے ناں
اوہ گوجرانوالے دی جم سی
ایتھے ہوئی جوان
جدوں ہوئی جوان
تے ملک دیاں ونڈیاں پے گئیں
وگی خون چناں
اوس وگدا خون جد ویکھیا
آکھے وارث شاہ نوں
میں چلی دِلّی شہرنوں
توں رکھ اپنا پنجاب
ایتھے لکھاں دیاں روندیاں
میں کنوں چُپ کراں
میں آپے مردی جاں

☆☆☆☆

سلطان کھاروی

تیرا نام امر

ایک رسیدی ٹکٹ پہ لکھا

ترا نام اَمر

کیوں کاغذ احسان ترے پر

بھولے کرنا ناز

تیری اک پرواز

تیرے دور زمانوں کو

تحریر کرے امروز

تیرے غم کا سوز

بھول سکے گا کیسے تجھ کو

سانسیں گنتا دور

تیرے من میں آج بھی رقصاں

دلی اور لاہور

اے حرفوں کی رانی!

تیرا ورق ورق پر راج

طعنہ زن ہے

پھر کاہے کو

بیری وقت سماج

اے حرفوں کی لاج

شفیق احمد خان

امرتا پریتم کے لیے

عمر بھر رُوح تری درد سے بے چین رہی
تو نے دیکھا نہ سویرا سکھ کا
چار سو دکھ کی ترے رین رہی
خواب جو تیری نگاہوں نے کبھی دیکھے تھے
وہ ادھورے ہی رہے
ٹو نے وصل کے موسم میں کئی ہجر سہے
تیری تخلیق ترے غم سے نمو پاتی رہی
عمر بھر ٹو نے بیاض دل پر
گم شدہ درد لکھے
اپنے ایام گزشتہ کے سبھی خواب لکھے
تیری تحریر ترے درد کو مہکاتی رہی
ٹو نے الفاظ سے جوڑا تھا جو رشتہ دل کا
عمر بھر ساتھ رہا
ایک ناکام محبت کی خلش کے باعث
جو خلا تھے ترے سینے میں کبھی بھر نہ سکے
ٹو نے الفاظ کے دامن میں سمویا غم کو
لفظ پھر مر نہ سکے

☆☆☆☆

عامر سہیل

نذرِ امرتا پریتم

سرما کے اِک خواب میں
آنکھیں دیکھیں آب میں
نیلے نیلے آئینے
بچپن کے تالاب میں
جوبن دیکھا کانچ میں
اور ہنسی مضراب میں
آسایش کی بھیڑ میں
فہمائش کے باب میں
انہونی کی سسکیاں
ہونی کے گرداب میں
باطن کی میزان میں
ظاہر کے اسباب میں
آنچ کسی رُخسار کی
ٹھنڈے خنک گلاب میں
صبحوں کے گلدان میں
جاڑے کی محراب میں
چہرہ ڈھکتی اوڑھنی

آیت اِک اعراب میں
سونے کی اِک جلد میں
اک تنگ چڑھی کتاب میں
دِل میں اِک قندیل سی
لڑکی جو مہتاب میں
سُرخ زمین کا زائچہ
بہے، رُکے، سیلاب میں
چھنے ہوئے مرجان دو
کانسی کی اِک قاب میں
جیسے حُسن کا بھولپن
بہتی ہوئی شراب میں
سُکھ بھرا برآمدہ
لرزش سی اعصاب میں
عامر سرد کلائیاں
اک زر دوز حجاب میں

☆☆☆☆

نذیر قیصر

چانن دی پھلکاری

روشنی کی چادر میں
کون ٹانکا بھرتا ہے
دل کی اونچی مٹی پر
کون شمع دھرتا ہے
کس کے راستے کی دھول
پھول بنتی جاتی ہے
بلھے شاہ کی ''بکل'' میں
رات مسکراتی ہے
شاہ حسین، وارث شاہ
گور سے پکارتے ہیں
عشق میں جو مرتے ہیں
کب وہ جان ہارتے ہیں

امرتا ہو میرا ہو
روشنی کی ڈوری میں
شبد ہیں پروئے ہوئے
زندگی کے رنگوں میں
ہاتھ میں ڈبوئے ہیں

☆☆☆☆

نذیر قیصر

امرتا پریتم کے نام

دن میں سپنے رات کے
پھول ہیں "پاری *جات" کے

گیت ہیں تیرے پاؤں میں
پتوں کی برسات کے

پھول، پرندے، آسماں
موسم تیری ذات کے

چمکے قلم دوات میں
تارے قلم دوات کے

جلتے پگھلتے حرف ہیں
جادو تیرے ہاتھ کے

تصویریں امروز کی
سائے ذات صفات کے

رنگ و نور کی شاخ پر
پھول کھلے آیات کے

آنکھوں کی دہلیز پر
دیے پڑے ہیں رات کے

* (پاری جات ایک پودا جو دیوتا کرشن سورگ سے دھرتی پر لائے تھے' امرتا پریتم کے گھر میں یہ پودا موجود ہے اور اس کی شاخیں امرتا کے بیڈروم کی کھڑکیوں سے جھانکتی رہتی ہیں۔ امرتا کے سرہانے چاندی کے پیالے میں پاری جات کے پھول تیرتے رہتے تھے۔ پہلی ملاقات میں امرتا نے یہ بھیگے اور چمکتے ہوئے پھول مجھے دیئے تھے۔۔۔۔ نذیر قیصر)

☆☆☆☆

امرتا پریتم جی دے نال

چن ستارے اک دوجے توں پُچھن گے
سورج کولوں رت سویرا پُچھے گا
رُکھ پُچھن گے پنڈ دیاں سونیاں گلیاں توں
بوہے باری کولوں ویہڑا پُچھے گا
جیہڑا آوے گا او تیرا پُچھے گا
تیرے باجھوں ساہنوں کیہڑا پُچھے گا

☆☆☆☆

افتخار نسیم

امرتا پریتم واسطے

میں---
کال بیل تے
انگل رکھی
تے مندراں دیاں---
گھنٹیاں وج اٹھیاں
دو گن ولا دے
کاغذی پھل
گلاب بن گئے
اوہ اِس دروازے تھانیں
باہر آوندی ہووے گی
میں دہلیز نوں
چم لیا
اوہ کمرے وچ آئی
امروز دیاں بنائیاں
تصویراں اتے تحریراں
جاگ اٹھیاں

رب اگر عورتا اے
تاں ایڈا ہی سوہنا ہووے گا

اوس نوں کنے ہی لوک
ملن آؤندے نیں
کنے ہی اوس نوں
ملن دی تانگھ رکھدے نیں

چند منٹاں دی---
ملاقات تاں سی
میں اوس نوں کیہ دسدا تے
کیہ پچھدا

میں تاں اوس نوں
ایہہ وی نہ دس سکیا
کہ اوس نوں دیکھ کے
مینوں انج لگدا ہے
کہ حسن تے تحریر دی
کوئی عمر نہیں ہوندی

☆☆☆☆

امریک سنگھ

امرتا پریتم

امرتا پنجابیت دی شان سی
اک طرح انسانیت دا مان سی

مات بھاشا دا سریلا ساز سی
بن گئی پنجاب دی آواز سی

نام ساہت وچ اوہ اچا کر گئی
جنم اپنا اچا سچا کر گئی

اوس نے وارث نوں بلایا قبر چوں
جابراں نوں ہٹکیا اوس جبر توں

درد دھیاں دا ونڈاون واسطے
ظالماں توں پت بچاون واسطے

''منی'' بن کے چوسیا اوس زہر نوں
اپنے ڈنگ ہی روکیا اوس قہر نوں

بہت کجھ نیں اوس دے بارے لکھ رہے
جاپدے لکھنا اوہ حالے سکھ رہے

رب نوں وی اوس نے سنیہڑے گھل کے
جبر نوں اوس نے وکھایا ٹھل کے

انسانیت دا درد اوس نے جانیا
لوک بر ہا عمر ساری مانیا

لوک پیڑا دی علمبردار سی
صفت بھریا اوس دا ہر کردار سی

اوس دے بارے اتنا کہنا ٹھیک ہے
پڑھ کے اوس نوں امر اج امریک ہے

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

ڈاکٹر امیا کنور

ہیر روح تے رانجھا قلبوت جانیو

سون کمرہ، پڑھن کمرہ اک مک ہوئے
جتھے ہن نہ اوہ سوندی اے نہ پڑھدی اے
آل دوال دیاں کتاباں توں بے واسطہ
نہ کجھ رچدی اے، نہ گھڑدی اے

اوہ عالیشان لائبریری
جیہڑی ورھیاں دے ورھے
اوہدے ساہواں نال ساہ ہوئی
اج اوہدے وانگ کھنڈی پنڈی
دل ڈھائی بیٹھی اے

نال لگدا چتر کار دا کمرہ
جیہڑا کجھ پل چتر کاری وچ بتاؤندا
اوس توں وی گھٹ سون کمرے وچ لنگھاؤندا
دن وچ سو وار، اوہ نال دے کمرے چہ آؤندا

اپنی اکو اک بیش قیمتی

حال دی گھڑی تک جیوندا
پینٹنگ نوں نظر اوندا
اوہدے متھے نوں چمدا، کیساں نوں پولے دینی سہلاوندا
خیرے کیہ کیہ کہن، اہنوں کویں تے کنج پرچاوندا
اوہ وی قلم دی ہانی، اکھراں دی جائی
اج پڑھنا لکھنا کیہ، ہر پاسوں سرت گوائی
زندگی دی ہر اہم کریا نوں بھلائی
کدے کدائیں اگا پچھا دی وسرائی
پر پوری زندگی دے کمائے
اس اکلوتے سرمائے
ایہناں کگھو جنے تے نہیں
جذا ایس رب دے جائے
اُتے تے کر دی وشواس دھرواس
رتا کو سنے جے اوہدی بھڑک
محسوس کر اپنے آس پاس
نڈھال جہے سروچ دیندی اے جھڑک
ایما او، ایما میرے نیڑے آ
انج کولوں دی لنگھ کے نہ جا

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

انوپ وِرک

امرتا پریتم دے مان

انج تاں شاعر سارے ماں دی کُکھ چوں جمدے نے
کجھ شاعر رشتیاں دی بھُکھ چوں جمدے نے
کئی ہندے نے اوہ وی، جو ماواں دے دکھ چوں جمدے نے
کوئی کوئی امرتا جیہے ہندے، جو رشی رکھ چوں جمدے نے

کجھ شاعر پیراں فقیراں دی دعا ہندے نے،
دوستی دے دریا دی بیڑی دے ملاح ہندے نے
معصوم کھکیاں دے جیون دا چاء ہندے نے،
بہتے شاعر نہیں، صرف شاعری دی افواہ ہندے نے

امرتا جیہے شاعر روح دے رشتیاں دی رباب ہندے نے،
سگل سرشٹی دی شاعری دا انت پرواج ہندے نے
ایہو جیہے شاعر ربی درگاہ دی آواز ہندے نے
قدرت دا سنگیت ہندے نے، امرتا دا انہد ناد ہندے نے
ایہو جیہے شاعر لوک سپنیاں دی تعبیر ہندے نے
اوہ زمین تے نہیں، امبر تے واہی لکیر ہندے نے

درد ہی دستاویز ہندے نے، دوستی دی تقدیر ہندے نے
اوہ تن دے شہنشاہ، من دے صدا فقیر ہندے نے

ایہو جیہے شاعر لوک سپنیاں دی تعبیر ہندے نے
اوہ جی تے نہیں امبر تے واہی لکیر ہندے نے
درد دی دستاویز ہندے نے، دوستی دی تقدیر ہندے نے
اوہ تن دے شہنشاہ من دے فقیر ہندے نے
شاعر امرتا جیہے پوتر پستک دا پہلا واک ہندے نے،
اکھراں دا ادب ہندے نے، ارتھاں دا احساس ہندے نے،
سمیاں دا سچ ہندے نے، لفظاں دا سندر لباس ہندے نے
اوہ وداع ہو کے وی وداع نہیں قیامت تک ساڈے پاس ہندے نے
(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

ڈاکٹر انیل سویرا

پرنام

امرتا پریتم!
اک زسمئی جہی لیکھکا
جس دی اگ اگھلدی لیکھنی
لکھیاں گئیاں کوتاوان
سوچ توں روح، بروح کراؤندا ساہت
بندے نوں بندے نال جوڑن لئی
بڑی وڈی سوچ
اور شاں نوں
کدے وی دتی نہیں اہمیت
تمام عمر کیتا نہیں اصولاں نال سمجھوتا
زندگی بتائی
اپنی ہی شرطاں تے
لکھی ہمیشہ حقیقت،
جھوٹھ دا کیتا،
پردہ فاش
اپنی رچناواں وچ کیتا

ناری دے درد دا بیان

نوچ دتے،

جھوٹھے سماج دے مکھوٹے

شوشن دے خلاف،

ہن نہیں ہے۔

سانوں اوہناں تے بڑا مان ہے،

ایہو جہی مہان ہستی نوں،

ساڈا کوٹ کوٹ پرنام ہے۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

اوتار جیت

امرتا دے ناں

نی کڑیے نظماں ونئیے !
کدے پیکڑے گھر آ۔
تیرے بھائیاں سندیاں گھوڑیاں
اج پئیاں پُٹھڑے راہ.....
تیرا مرزا اویں نہتھڑا
اج بیٹھا اوندھی پا
تیری صاحباں بھابھی ولکدی
اوہدی کتے نہ چلدی واہ
اج سالو کفن ہو گئے
ایس گھر نوں لگی ڈھاہ
کوئی ویڑھا ضامن نہ بنے
کوئی کندھ نہ بنے گواہ.....
ایہ گلیاں بابل والیاں
ایہدا قبریں جاندا راہ
ایتھے اگن بالے تیلیاں
تے آتھن ہوئے سواہ.....
نی کڑیے نظماں ونئیے !!

(لپی انتر: قمرالزمان)

امر-امرتا

امرتا دھرتی دی دیوی
نمشکار! پرنام!!
ونڈ پئی دھرتی تے
تاں روئی توں،
تاں دل چوں نکلی کوک ترے
وارث شاہ نوں
واجاں مار بلایا
دھرتی اتے وہے خون دا
لکھ لکھ حال سنایا!
بندہ جدوں
کو بندہ ہویا
وحشی ہویا، خونی ہویا
حدوں ودھ
جنونی ہویا
ایس جنونی بندے نوں تک
رام رحیم خدا دی رویا
امبر رویا

دھرتی روئی
لپ لپ ہنجوتوں دی روئی
پر نہ رویا
دھرتی داہراوہو بندا
جس دے اندر مانوتا لئی
موہ مویا سی
کئی پنتھی، ہمنیسیارا
جس نے اپنا ہوش کھویا سی
سرسوتی توں
لے کے توں وردان کوئی
دھرتی تے آئی
مانوتا لئی، حق سچ دی
اکھراں وچوں جوت جگائی۔
گل کری توں لوکاں دی
دھیاں اتے دھریکاں دی
چڑیاں نوں کھنب دتے
کڑیاں نوں گیت ونڈے
پریتاں دی گل چھیڑی
عشق دی بات پائی
ون سونے وشیاں اُتے
اپنی سندر قلم چلائی
تیری سگھڑ سیانی،
مٹھی بولی۔

لکھتاں بن کے
کل دنیا تک پہنچ گئی
فیر تیری۔
چرچا چھڑی
بن گئی دھرتی دی دیوی
امرتا!!!
کئی سور جاں۔
اج ورائی
پتھراں وچوں۔
تڑفن دی آواز وی آئی
نہ بولی۔
نہ کنبی
نہ ڈر کے تیرا دل گھبرایا
سُولاں ونے راہاں اُتوں
لنگھ گئی توں جیرا کر کے
پھلاں دیاں سوگندھاں وچوں
تینوں اک نشہ وی ہویا
تیرا ہیر دا۔ الفت ہویا
تیری الفت!
بن گئی تیری جت امرتا!
اپنیاں سندر لکھتاں کر کے،
توں ہو گئی۔ امر۔ امرتا!
توں ہو گئی۔ امر۔ امرتا!!

ایرا کلی آبا شی دیش

شاعری دیاں لاٹاں

امرتا! توں ساری دی ساری شاعری دیاں لاٹاں
اگ دا بانا،
میں تیری زبان کویں سمجھاں
میں--- جو پنچھیاں دی بولی نہ جاناں
میں صرف جاندا کہ کبوتر کویں گوندا ہے
تے کوئل دیوانی کویں ہندی اے،
--- جد ہنال آوندا ہے۔
میں جاندا کہ اکو اداسی اسیں سارے ہنڈائے،
اکو ہی کرم پینڈے
تے پنچھی تے شاعر--- محبت نوں گولدے
میں جو تیری زبان بس اینی کو جانا
جنی کبوتر دی، تے جنی اک کوئل دی
پر اک وشواس ہے کہ توں وی محبت نوں گا رہی
اوہ کون خوش نصیب ہے کہ جہدے لئی تیرا---
ایہہ گیت بن دا ہے
اوہ کون ہے جو تیری روح دی جھرناٹ سن دا ہے
اوہ کون مان متا جو تھر کدی آتما دے قابل؟

توں امرتا! جو شاعری دی اگ وچ پگھلی ہوئی
تے ساہمنے اک نظم وچ بلدی پئی

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

ایم اے رانا

امرتا پریتم

امرتا پریتم اک انسان
اک امکان
انسانیت دی درگاہ
امرتا پریتم اک پل
اک پریت
لوکاں توں ایہ منگ پئی کردی
آؤ ملو نفرتاں دے دریا لنگھ کے
محبتاں ونڈیے تے شانت ہو رہیے
امرتا پریتم اک درد
اک کرلاہٹ
شام دے انت ہون تے
جدوں گونجی
دھرتی ہل گئی
قبر وچ ستادردی تڑف گیا
امرتا پریتم اک دس
اک اکھ
لہو بھریاں ندیاں

بیلے وچھیاں لاشاں
ویکھ گئی تڑف
امرتا پریتم اک بھکھ
اک امید
اجڑے وچھڑے لوکاں دی
امرتا پریتم اک خوشبو
اک مسکان
ہجراں مارے رانجھیاں دی
امرتا پریتم اک آدرش
اک چارا
پھنیر ڈنگے لوکاں لئی
ناگ منی تریاق

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

بلوندر سنگھ سندھا

امرتا پریتم

امرت نام نرا نہیں اوس دا، اوہ سی امرت بانی
جس دی بولی دے وچ مٹھت، جیوں مشری دا پانی
تہذیباں دی ہستی جس نوں نہیں منظور لکیراں
زندگی بن کے لکیاں جس دے شبداں وچ تقدیراں
جھوٹھ فریب دیاں گلیاں چوں اٹھدی اک سچائی
رب دے بندیاں دی عبادت، رب دے کول پہنچائی
رسماں اتے رواجاں والی، خودریتی بن نکلی
کوڑے بول قبولے نہ جو، نرم سبھا جہی تتلی
کوتا دی چھاں بیٹھاں بیٹھی، چانن دی پھلکاری
تو پا نور دا ابھردی رہندی، بچے کا دکیاری
جس دی کا دکیاری وچوں، اگیاں نویاں لوواں
رنگ اوہدے اسمانی لشکن، مٹی وچ خشبوواں
وارث شاہ نوں آکھیا جس نے، قبراں وچوں بول
اج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی، لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن
رتاں دے نال سے گواچے، گم گئے اوہ گیت

ایہ خواباں دی دنیا تیری، خواباں نال پریت
خواباں دی اک پونی کت، چرکھے پایا تند
رنگاں دی جد باری کھولی، سمے دے جڑ گئے دند
تیرے بولے بولاں وچوں، ہنداانج پرتیت
اک دلکھتا نوں جداں، بھلیا نہیں اتیت
زندگی والا ہر پل اوکھا، زندگی نال ہنڈایا
مرچکی، انسانیت نوں دی، کوتا نال جوایا
بکھتا پئی جد ویڑھیاں اندر، منکھتا کرلائی
نربل ہوئے حقاں دے لئی، سی آواز اٹھائی
جس امرت نے امرت ورگا، ونڈیا ساہت خزانہ
پڑھ پڑھ جس نوں ہویا پھردا، سارا جگ دیوانہ
ساہتکاراں دی دنیا وچوں، اک قلماں دی رانی
تر گئی راہ دسیرا بن کے، شکتی سگھڑ سیانی
تیریاں لکھتاں والا سورج، جگ نوں دوے اجالا
اوس دی بکل دانگھ مانے، 'سندھا' کرماں والا۔

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

پال کور

بال امرتا

بال توں شروع کیتا سی اوس
تے بال ہی گئی اے بن
جویں لکھ چ پیا بال
لتاں پیٹ نوں لگیا، نکا جیہا مونہ
چھوٹے چھوٹے انگ، اکھاں چ تیز
پر زبان خاموش، دماغ خاموش
انجان جیہا درد
تے انجان جیہی مسکراہٹ!
امرتا -- جس دیاں انگلاں نیں
اک صدی نوں ٹنجیا
اکھراں نوں اُنیا
رشتیاں نوں پہنیا
عشق دی بکل چ
دھرتی توں انبراں تک
ہنگال سٹے سبھ لیکھے جوکھے!
امرتا -- جس دردنوں پیتا کش کش
تے اکھراں دے اکھر جھڑ دے رہے

اوہدی قلم چوں!
امرتا -- جس گاہیا
'چودہ طبق دلے دے اندر'
تے لایاں ست اسمانی تاریاں!
امرتا -- جس نوں چاہیا ملکاں -- در -- ملکاں دے
عاشقاں -- جوگیاں -- فقیراں نیں --
جس نیں گاہے سرجنا دے انبر
جس نیں بیجے سپنے -- پیڑیاں دے اکھیں!
بڑے لمے سفر' تے ہے' پرتن دے اج کل۔
جویں اکھر -- اکھر جیوندی رہی
اویں ساہ -- ساہ پرت رہی اے مگر کتے!
اک معصوم مُدراچ پئی
بال امرتا ---
خورے روز جمدی -- مردی،
فیر لکھے پیندی
کٹ لیندی اے جُون کوئی!
حالے یاترا' تے ہے
پر اک مینوں دِیا پدا ہے دو آلے اوہدے!

اوہدے پرادرشی، معصوم، بال جسم چوں،
حور دے لشکارے پیندے!
لگدا ہے کوئی مہا استو
اوہدے سر یہ چوں ڈھلدا، سنگ دا

اک بندو وچ ہے سمٹ ریہا!

امرتا!
جو مانو دے، عورت دے
مہا وستھار داناں ہے--
سمٹ رہی اے،
اک بندو تے اج کل!

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

پرمندر جیت

ممتا تے اسیس دا چہرہ --امرتا پریتم

امبر چہ کھلدی چتنن دی کھڑکی
صحبتاں، سانجھاں تے دوستیاں دی سکھر چھوہ
اکہرے بدن چہ لہر داوسماد
اتھاہ ساگراں دی گہرائی چوں لبھی ناگ منی

اوہدے پیراں چہ کئی پینڈے
ہر پینڈے دی منزل محبت
اوہدی عبارت وچ کئی چہرے، کئی بول
اوہدی عبارت --زندگی
من دیاں اداسیاں دے کول بیٹھی لوری
سنگھنی چپ نوں نام دیندی بول تھانی
ارتھ دی تلاش وچ چڑا شبد
شبد دی پرکرما کردا سچ، سوچ
شبد تے ارتھ دی گفتگو
کاو دے انتر من دی یاترا
سمکال دی سگل صورت
آتمنا دی ساکار مورت

سوچاں تے جذبیاں دی آبشار

سوچ وچ ادب

نظر وچ آداب

بولاں وچ بنسری

چپ وچ شہنائی

اوہدا آلا دوالا

جی بھر کے جین دی جستجو

اوہدے کول بہنا جین جوگے ہونا

شاہ حسین، بلھے شاہ، دے کلام دی روح

وارث شاہ دے درد دی ہمسفر

دھرتی دی سلگدی داستان

دردمند پانیاں دا سنتاپ

کوئی آدِکالین کتھا کہانی

کے لوک گیت دا منہ سہاندرا

اوہدے بارے لکھن

امبر دی اسیستانوں آکار دینا

سمندر دے پانیاں نوں مٹھی چہ بھرنا

کچی ہریاول نوں وچھی تکنا

ممتا، دوستی، نیڑتا

اسیس، نگھ، محبت

دھرتی دی ہک داہوکا

امبر دی اکھ دا خواب

بیاباناں چہ گونجدا برکھ راگ

کئی رشتیاں سنگ تر دا رشتہ

اوہدے چہرے چہ کئی چہرے

ہر چہرے دا سر لیکھ - زندگی

ہر چہرے دا اُپنام - امرتا

اک صدی دا سنگ ساتھ - امرتا تے زندگی

کئیاں صدیاں دا ساتھ سنگ - زندگی تے امرتا

اوہدا سفر لوگ گیت

اوہدا راہ پنج دریا

اوہدی عبادت شبد سادھنا

اوہدا خواب امن سدیوی، روحاں دے میلے

اوہدے انگ سنگ سدا رہیاں ڈونگھیاں عبارتاں

اوس نے بکھڑے پینڈے وی گاہے

تلخیاں، الاہمیاں، روسیاں، طعنیاں دی دھپ چھاں وی ہنڈائی

پتھریلے بول سہے، سول صراحی چڑھی

محبت دے سنگھنے دھنالے چہ تری

من تے شبد دی دھند چہ سدا لین رہی

ایسے دھند توں اوس نوں بادباناں دا بل ملیا

تے اوہ منجھدارنوں وی

کنارا سمجھ کے تر دی رہی

زندگی دے سون سنہرے ناپواں تے آن لتھی

اندر دھکھدی دھونی باہر سورجی سنیہا

زندگی نوں جی بھر کے جیین دی ریجھ ہی اوس دا خواب

اس خواب نوں لوں لوں ہنڈایا

تے لا دتی سوچ دے ہر پنے تے -- مکت رسیدی

اپنے بارے بولے تے اپنے ہنڈائے سچ نوں

سچ کر کے جانیا

سچ کر کے وکھایا

سچ نوں جیین تے رہن دی سزا پائی

پر من دی سوچتا نوں آنچ نہیں آون دتی

امرتا پریتم ہون دے ارتھاں نوں -- سمیاں دی ہک اتے لکھ دتا.....

اوہدے بارے ہور کی لکھاں، کنا کو لکھاں

دھرتی دی ہک دا ہوکا

شبداں دے میچ نہیں آوندا

فی الحال تاں اینا ہی بہت ہے

کہ اوس دی ممتا تے اسیس

ساڈے سراں تے ہے.....

☆☆☆☆

ترلوچن میر

چانن

جدوں ساڈے چلھے ٹھنڈے سن
جدوں ساڈے گھراں تے
مےُ لشکر ہنیرے دے
جدوں آوندی سی ہوا چوں
مہک بارود دی
جدوں پھلاں دی تھاں
کڈھے سرفبیاں نے خنجراں نے
جدوں اکھاں چہ اتری ہیوی اداسی
خوشی دی تھاویں
اکھاں چہ اتھروں دی سلھ
جدوں من دے کھیت بنجر
ہو گئے کلرائے
جدوں گادھی تے بیٹھے بھرائی دی
رک گئی ہیک گلے چ
جدوں گیتاں دی تھاویں
اگ آئے سن مرثیے
اوہناں کالے طوفاناں چہ

جھکھڑ بلیاں رات چوں
بلدا ہویا اک چراغ
آمکھیا ساڈے ویڑھیاں چہ
جس توں لے چانن
سورجاں نے
جڑے بسہر عشق نوں
جس دی لوء چہ گایا گیت
دے ارتھ محبت دے
مک گئی بتی اوس چراغ دی اج
دھر گیا مر گیا
ساڈے لباں تے فراوہ چراغ
تے اکھاں تر ہو گئیاں۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

جگ پال

اک شردھانجلی امرتا پریتم

بلبلے نی پنجاب دیئے، تیری کمی ہونی نہ پوری
بلبلے نی میرے دیش دیئے، تیری کمی ہونی نہ پوری
بلبلے نی پنجاب دیئے.........

1919 وچ گوجرانوالا جنمی
پتا گیانی کرتار سنگھ ہتکاری
چھوٹی عمرے دے گئی ماں وچھوڑا
آ گئی باپ تے ذمے واری
86-1/2 سال توں ہس کھیڈ کے، کر گئی یاترا پوری
بلبلے نی پنجاب دیئے.........

اپنی وچ کوتاواں لکھیا
کھل کے ناری پیڑا
عورت دے دکھ ہرن دا
چکیا سر تے بیڑا
پنجابی ساہت وچ پہلی لیکھکا، جانی عورت دی مجبوری
بلبلے نی پنجاب دیئے.........

قلم تیری دیاں لکھیاں سطراں
چڑھیاں لوک زباناں
اج آکھاں وارث شاہ نوں،
اج دی گادے ہر اک گھرانہ
آواز پنجاب دی کیہا ہے تانہیوں
پروفیسر تیجا سنگھ جہے مہان لکھاری
بلبلے نی پنجاب دیئے ....

ڈیڈھ درجن توں ودھ پستکاں
آئیاں وچ بزاراں
'پدم سری' جہے انعام ملے،
کولوں دیش دیاں سرکاراں
وچ ساہت دے ناں مہکدا، جویں مہکے کستوری
بلبلے نی پنجاب دیئے ....

لے کے جنم توں پہلا کیتا
نہ بے ارتھ گوایا
ایسے جنم وچ سیوا کر کے
ماں دا قرض چکایا
نام امر رہیگا وچ جگ دے
جدوں تک رہے گی دنیا پوری
بلبلے نی پنجاب دیئے ....

شکلوں کدے نہ ویکھیا میں تہانوں
پڑھیا وچ کتاباں
وچ اخبار دے دکھ بھری خبر نوں پڑھ کے
ہویا دکھ بے حسابا
جگ پال، کرے رب اگے بینتی، ہووے واسا سورگ پوری
بلبلے نی پنجاب دیئے، تیری کمی ہونی نہ پوری
بلبلے نی میرے دیش دیئے، تیری کمی ہونی نہ پوری
بلبلے نی پنجاب دیئے.........................

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

جمیل احمد پال

اَمرتا پریتم لئی اِک نظم

''اک سی انیتا'' جو'' دلی دیاں گلیاں'' وچ رہندی سی
میں اوہدے ''سنیہوڑے'' وی پڑھے نیں، تے'' آخری خط'' وی
پر جدوں دھرتی اُتے رات دی پہلی چھاں دے نال ہی اک ٹھنڈ
پیراں راہیں ہولے ہولے چڑھدی اے
جسم دے پیراں ولوں وی، تے من دے پیراں ولوں وی''
''اک سوال'' میرے'' ذہن دا بند دروازہ'' کھڑکاندا اے
ایہہ تاں میرے دل دی حالت سی، امرتا نوں کنجھے دسی؟
انج تاں'' میں وی اوہ راہ ویکھیا اے، جتھوں نظماں ٹُر کے آوندیاں نیں''
اوہ لوک ویکھے جنھاں دے'' اک ہتھ مہندی اک ہتھ چھالا'' ہوندا اے...... پر
''نویں رُت'' آون تیکر'' کستوری'' ورگے بول کھلاردی'' وَنجھلی'' دی آواز کنجھے سُنی؟
''پنج ورہے'' لمبی سڑک اُتے ٹُر کے میرا جی'' چک نمبر ۳۶'' جان نوں کردا اے
جتھے'' کرمچی لکیراں'' نال کالا گلاب بن دا اے
''ایہہ سچ'' ہے کہ'' ناگ منی'' دی تلاش
''شوق صراحیوں'' دُکھاں دے دارُو چین ورگی ہے۔
'' پکی حویلی'' وچ بہہ کے'' چانن دا ہوکا'' سننا تے'' اک شہر دی موت'' ویکھنا
کوئی معمولی دُکھانت نہیں ہوندا
دل دے'' کورے کاغذ'' اُتے'' اگ دیاں لیکاں'' نال'' کچے اکھر پاندیاں''، مینوں ایس گل دا

بالکل پتہ نہیں ہوندا کہ ''چھتی ور ہے'' بعد کیہ ہووے گا؟

آل دوالے کرودھ مشکلاں تے مجبوریاں بھی اک ''اُداس کتاب'' ورگی زندگی وچ

جدوں ایہہ آوے کہ ''کہڑی زندگی کہڑا ساہت''.....تاں

امرتا!

دیو چاچا، دیو کی بھین، ملکہ، ڈاکٹر دیو تے ''اشو'' نوں مل کے

''کاغذ تے کینوس'' ورگے ''دستاویز'' نوں پڑھ کے......تے

''تریل دُھوتے پھُل'' ورگیاں تیریاں امر لکھتاں پڑھ کے

میں اپنے من نوں شانتی تے ننگھ نال بھر لینداہاں

تے سچ......جو''اک دا بوٹا ہے''، اوہدے وچ

میرا وشواس

''اک نمبر دے فرق'' نال جت جاندا ہے......

☆☆☆☆

دیوراج

توں دسیا....

(امرتا دی کہانی 'اک شہر دی موت' دی اک کردار نوں مکھ رکھ کے)

توں دسیا، شہر مر گیا، سڑ گیا،
سواہ ہیٹھ دبیا گیا۔
تینوں تریخ وی یاد ہے، چنگی طراں، 24 اگست 79
توں ایہ وی جاندی ہیں
سڑدیاں ہن روز پام پئیاں گئی،
دبدیاں ہن فوز پام پئیاں گئی۔
توں اگلی پام پئی ہے نہیں،
جس نوں کئی وار کھنڈراں چ مڑنا پیا۔
اج دا جارج وی ہے، جاریہا کھنڈراں چ روز
ورندرنوں لوڑ ہے تیر، رات نوں سپنے چ روز
مینوں پتا ہے، تینوں پتا ہے،
دنیا دیاں دلیلاں اتے قنون،
سبھ ہن دیارتھ --
دل دی اک دلیل ہی ہے سر دسریشٹ
تے دل میرے دی دلیل ہے اک ہی --
تینوں ویکھن دی پیاس ہے -- اک آس ہے --

حالے وی آس ہے --

آس ہے تاں سواس ہے.....

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

دیونت

اک صدی اک ندی

امرتا تاں وارث شاہ دی گل چوں جنمی کوئی کُڑی ہے،
ویہویں صدی وچ شبد سوت کت رہی ہے۔ کہندی ہے،
میں تاں اجے گوہڑے چوں کجھ پونیاں ہی کتیاں ہن،
کتی بیٹھی ہے دوواں پنجاباں دی ساری رُوں.......

ایہ صدی جا رہی ہے، انتم چھناں وچ ہے
اک ندی جا رہی ہے، انتم قدماں وچ ہے
سمندر ول دھا رہی ہے، سمندر نیڑے ہے
سمندر نوں پتا ہے: ہو جاوے گا اوہ ہور وڈا
سمندر سوچدا ہے:
کنج کراں گا میں اوس دا سواگت
کیہڑا ہووے گا پردیش دوآر
کتھے لاواں گا سواگتی گیٹ

سمندر پورا
ندی دے سواگت وچ ہو جاندا ہے
ہن ندی ہو جاوے گی سمندر

دھرتی سوچے گی: میں اوہ نہ رہی ہون
سمندر دھاراواں نوں کہندا ہے
تسی بنناہے.... قرآن دیاں آئتاں
میں بنناہے دھرم گرنتھ دی دیہ
چنتن جگ رچایئے انج ہی
ہوسکے گا میری بچی دا سواگت.....

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

رجندر سنگھ بھٹی

اٹھ دنیا دے مالکا

لوکائی دا دکھ درد پلٹن والی مہان کوتری امرتا پرتیم دی یاد نوں سمرپت کوتا

اٹھ دنیا دے مالکا،
نگاہ چو فیرے مار
کل لوکائی ترپ دی،
تینوں رہی پکار

اک دوجے نوں کھا رہیا،
ہر بندہ، ہر نار
دیکھ کیہ بھانا ورتیا؟
کیسی وگ گئی مار

آپو دھاپی پے گئی،
کوئی نہ سنے پکار
چیخ چہاڑا مچیا،
مچی ہاہا کار

ہر پاسے پیا ڈُلدا،

مانوتا دا خون

پشوواں توں بے قدری ہوئی،
مانووتا دی جون
چارے پاسے پھیلیا،
نفرتاں دا زہر
ہرتھاں ہونی ورت گئی،
ورت گیا اے قہر

سبھے دشمن بن گئے،
اپنے نے جاں غیر
سبھ کجھ الٹا ہو گیا،
نہ ہوئے نرویر

دھرت پئی اج ڈولدی،
دھول ہویا پریشان
دھرم کرم سبھ اُڈیا،
کوڑ ہویا پردھان

دھواں دھواں ہو گیا،
پھیل گیا اندھکار
تچی مچی ہو گیا،
انا ایہ سنسار

پت دھیاں تے بھیناں دی،

لٹیندی سرِ بازار

گھر گھر کنور جم پئے

پانڈو ہوئے لاچار

گل گل تیکر آ گئے،

بھکھ، بھرشٹاچار

واڑ کھیت نوں کھا رہی،

اُڈیا شِشٹاچار

کتھے کریئے جودڑی،

کوئی نہ دِسے دوآر

ٹھگاں دے دربار نے،

تے جھوٹھاں دی سرکار

اٹھ دنیا دے والیا،

ڈُب رہیا سنسار

ڈُبدی پئی ایس بیڑی نوں،

توں ہی سکدیں تار

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

رخشندہ نوید

ہجراں دی ماری

ویلے دے اُنے کھوہ وچ سُٹیا
اوس اکھیاں دا ڈول
ڈونگے پانیاں
ننگے پیری
اک اک لہر پھرول
جیون جت کہ ہارے سائیاں
آ اوہدے اتھرو تول!
مٹھیاں کوڑیاں دریاواں چوں
سپیاں چنن آئی
حرفاں دے لبھ لبھ کے جگنو
بولاں دے رنگلے پھلاں نال
قبرے مٹی پائی
نمیاں نمیاں آہواں دی
اوس اپنی چیک سنائی
اوس پنجاب داہوکا بھریا
دھرتی دے ہجراں دی ماری
سینے اندر ریت کھلاری

دکھ دا گھٹ اوہدے سنگ چ اڑیا

یاداں دے پنجرے وچ رکھ کے

اک پنچھی دا پر

پچھے سٹ کے کھلا آئی

او اپنا اک در!

☆☆☆☆

دھی وارث دی---امرتا پریتم

آپے
آپنا سورج بنا کے
آپنے ہی
متھے بچ اگدی
آپے
آپنی دھپ وچ بیٹھی
دھپ دی کاترجھی
سون کڑی اک
بچ قصیدہ کڈھدی
اک اکلی
کلی کاری
جھلم تڑی سی
عمراں دی سرگھی دے ویلے
پتھر گیٹے کھیڈدی
تردی جاندی
اونسٹریاں دی اتی رتے
شبداں دے جنگل دے وچوں

بھکھڑیاں لیہاں دے کنڈے
گھگریاں دی لون نوں چنبڑے
ہوا پیازی پلا اوس دا
جھنک جھنک کے
پھٹک پھٹک کے
تڑ دی جاندی
تڑ دی جاندی
دھی وارث دی
دھید وآپے
کدے اوہ سسی
کدے اوہ صاحباں
اوہ سوہنی دے دیس
کدے جھناں
کدے اوہ رانی
اوہ ستلج داویگ
جا بیٹھی جمنا دے کنڈھے
کرکر دیکھے دیس

جتھے بیٹھے
جتھے بولے
اک ترنجن گاوے

امڑی ویڑے میلا لگا

اک آوے

اک جاوے

ناگ منی دے پیڑھے بہہ کے

نُچیاں تنداں

سچے بول

چرکھا بایئڑ

تند تے تانے

امرت شبد پچھانے

سُپن لوک وچ

مات لوک وچ

دیولوک وچ

تاریاں اتے گرہاں اُتے

ٹُٹیاں تنداں پھرے جوڑدی

'متھ' دے شیشے وچ

'ات' دا عکس پچھانے

پیٹھ جیہے

پیڈھے متھے تے

گیان جیہی

اک سگھڑ لکیر

ماناں سنماناں دے

اچ چبارے

چڑھ کے بیٹھی

برش دیاں چھوہاں جہی ہے

کن مِن کن مِن

مینہ جیو وسے

کاغذ دی کینوس تے اگی

ست اسمانی لشکاں مارے

ایہ ست رنگی پینگھ

آپے

آپنا سورج بن کے

آپنے ہی متھے وچ اگدی

آپے آپنی

دھپ وچ بیٹھی

دھپ دی کاتر جہی

سون کڑی اک--- قصیدہ کڈھدی

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

سرجیت پاتر

شاعرانہ روح

امرتا پریتم داناں
پنجاب لئی اک اجیہا نام ہے خاص
جویں جھناں، راوی، ستلج جاں بیاس
امرتا اک گاتھا، اک دنت کتھا
امرتا، اک بہجمئی شخصیت
جہدے ناں دوالے جھلملاؤندا ہے
انیکاں کہانیاں، کوتاواں دا پربھامنڈل
امرتا نوں ملنا---
اوس پربھامنڈل دی لو وچ بیٹھنا
امرتا نوں ملنا---
کوتا دے رکھ دی چھاویں ہے بیٹھنا
عشق دی شدت، ودروہ دا ساہس
امرتا پنجابی لئی، اک ناں ہے خاص
امرتا دا جیون کاغذ تے قلم دی سوچی صحبت ہے
شاعری اوس لئی ہنر نہیں، صحبت ہے
جاچ نہیں چنتن ہے
شلپ نہیں، عبادت ہے

اک شاعرانہ روح دے تپڑے سفر دا

ناں ہی تاں ہے امرتا

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

غزل

کم دھندیاں وچ ہو کے لین
بندہ بن گیا اک مشین

پل وچ گلوں پھردے لوکی
سپنا ہویا شبد یقین

ملک قید سرحداں اندر
ٹوٹیاں وچ ونڈ لئی زمین

رہبر راہ درساوندے تھکے
پر سکھیا جاپے بل ہین

نت ہی فتوے جھوٹھ سنا کے
سچ توں رہے مناوندا این

مٹھا بولی دلاں چوں وسری
شبد ارتھ ہوئے رہین

نفرت دے ناگاں نوں کیلے
کوئی نہ دے وجاؤندا بین

تن تے اُجالے اُجالے بستر
من کچی تے سوچ ملین

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

سریندر کور

ساحر دے جان پچھوں

نظم جیہی! تیری زندگی چوں
جدوں نفی ہویا اوہ گیت جیہا
تاں جی کیتا سی آکھاں 'ہر کوئی اکلا'
گیت اوہ گواچیا نہیں،
اوہدے بول ہر زبان تے
اوہ گیت سبھناں دا سانجھا،
ہواوچ ٹھنڈیاں فضا وچ گھلیا،
اوہ دیسہدیاں نال کھبہ کے پرت آوے گا
نظم جیہی! تیری زندگی چوں
جو نفی ہویا گیت جیہا
تاں جی کردا ہے آکھاں ''توں اکلی نہیں''
تیرے پیڑاں نوں اُلیکدے،
لیکاں نال نقش چتردے ہتھاں دا دلاسا ہے
لکھ دے جایاں دا گہرا بھروسہ،
تیرے ہی سرجے اکھراں دے ارتھاں دے
خوبصورت سنسار دے لکھ عاشق، تیرے غم چ شریک نیں
دیس پردیس چوں تیرے ناں دیاں آوازاں گونجیاں،

تاں تیری عقل دا بھرم ٹُٹدا

محبت دی ہیک وچ اوس گیت دے اکھر تیری

آواز وچ لبھدے

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

تیرے ناں

جیہڑا اتھرو جمن بھوئیں دی
یاد وچ ،کریا
تیرے ناں

جیہڑا ہوکا دل وچ
یار لئی بھریا
تیرے ناں

جیہڑا تیر مرزے یار
دل اساں نے جڑیا
تیرے ناں

جیہڑا کاسہ کن پڑوا کے
رانجھے ہتھ وچ پھڑیا
اوہ وی تیرے ناں

☆☆☆☆

شائستہ نزہت

اج یاد پیا کوئی آوے

اج یاد پیا کوئی آوے
کنی کنی اک میگھ یادوا
ے لہو دی لیک
تک تن دی واشنا
تیرے ہجو مارے چیک
تو کیکن اک اک ساہ دا
لیا جتا آپ تریک
اج تن تیرے دیاں سکھیاں
گیاں سیس گندھا کے آ
کوئی گھول لیائی مہندیاں
کوئی ساوو آئی رنگا
اُٹھ جاگ گناں دیے راہے
تیرا ہوئی گھنڈ پئی چاوے
اج یاد پیا کوئی آوے
کنج کمیاں چرخیوں گھوکراں
کنج نئی ایس دی ماہل
تینوں سنھ سہیلیاں روندیاں

پی ٹی گھوکر نال

اج ننجے بیٹ تے بیڑیاں
اتے ننجی چھانجھر آپ
تیتھوں لیکن گئی گواچ نی

اج شگناں والی چھاپ
تیرے ننجے سبھ سلیکھ نی
اتے بارہ ماہ دے گاؤن
تینوں پریت دیئے شہزادیئے
اج اچی اچی رون
تیرے اکھراں وچوں بولدی
میرے دیس پنجاب دی ریت
تیری سوچ نے تپدی دھپ نوں
کر دِتا ٹھنڈا سیت
تیری امر منکھ نال پریت
اج دیس دے پنجاں پانیاں
وچ اٹھ وکھان ابالے
اج کنڈیاں دی ہر نوک نے
تیرے چم لیے پیر دے چھالے

تیری چپ تے سخن نوں پے گئے

کیہے ہجر دے نال پالے
جند یاداں دے حوالے

تیرے باجھوں لگھی بُجھ گئی

تے سکھ چوں اڈے زہر

جیہڑی لکھی کو بتا آپ توں

اسیں آ کھیے شہر و شہر

اج روپے مار دو ٹھوراں

اتے پٹ کے دونویں پیر

اُٹھ یاد تیری دا پاسا

تک فیر کوئی پرتاوے

اج تو تاوے ہریالیا

تیرا رنگ بدلدا جاوے

اج یاد پیا کوئی آوے

☆☆☆☆

صوفیہ بیدار

امرتا لئی۔۔۔

امرت رس وچ وِش ہجر دا گھول کے اتھر کھڑدے نیں
ہجرت روگ اولّی دل کیہہ دھرتی امبر ہلدے نیں
واج چناں نوں مارے دھی تے چھلاں وی کرلاندیاں نیں
بدلاں دے وچ چھیک ہوؤن تے اتھر کردے نیں

جوڑا رتا پیریں جتی تنگ حیاتی والی اے
جوڑے کھول کے روؤن ہیراں ہاڑے دل دے نیں
حرفاں نال تریدی رہندی ساں توں روگ حیاتی دے
پانی پنج ہوؤن تے مٹھی وانگوں ہلدے نیں
اٹھ امرتا بول قبر چوں ویلے نوں للکار
سلی اکھ تے پانی کھارا ویلے ملدے نیں

☆☆☆☆

ظفر اقبال

ٹوں مویئوں۔۔۔

توں مویئوں ہیں رویا میں
ہنجواں ہار پرویا میں
پانی پھردا اندر باہر
کوٹھا بھانویں چویا میں
ہندا ہندا رہ گیا کیوں
تھوڑا بوہت وی ہویا میں
اندر دا کیہ دساں حال
باہروں وی اجے توہیا میں
رہ گیا ربّ تے قدرت گئی
مجھ کھلی اُنے کوہیا میں
کھا ہنڈاہ بیٹھا میں وی
اوہ وی نواں نرویا میں
لگے ہوئے سو گجھ ہتھ
ایڈا وی ان چھوہیا میں
لڑ وی جاناں ایس کدی
ساڈا سپ گڈویا میں
ساہ نہ آیا ظفرے نوں
فیر وی کنجر مویا میں

ظفر اقبال

لبھیے وارث شاہ اک ہور

سبھے حُسن عشق دے چور
لبھیے وارث شاہ اک ہور
آپ ای ڈولے پھر دے نیں
ہتھ جنہاں دے ساڈی ڈور
جنگل بیلے وسیا مینہ
آپے ای چالے پے گئے مور
لتھی اسماناں توں چیک
ڈر گئے سبھے ڈنگر ڈھور
کھاہدی بڈھے وارے سٹ
کردا رہناں روز ٹکور
میں وی نیواں داء تکیں لیا
اوس نے وی چھڈیا تکیں کھور
گھر نوں وی ٹرجاواں گے
جس دن وی کدی آ گئی لور
باہر دا رولا کیہہ سُندے
اندر وی سی ایناں شور
کاہنوں پنگا لیا' ظفر
اوہ تکڑا سی' میں کمزور

ظفر اقبال

کوئی ویل ودھائیے

کوئی ویل ودھائیے
مٹھڑا میوہ کھائیے
گھُٹ کے پائیے جپھی
بھانوں تھاں مرجائیے
کھو لے کوئی تاکی
ہر دم آئیے جائیے
پھسی ہوئی بیڑی نوں
پتوں پار لنگھائیے
باہر وچھائیے دریاں
نالے گریاں ڈاہیے
لبھے کوئی طریقہ
کوئی اُلاہمہ لاہیے
آر ایس شبراتے
ایٹم بمب چلائیے
ہان نوں ہان پیارا
بڈھڑی کوئی پھسائیے
کے ہور دی پھاہی
ظفرے دے گل پائیے

ظفر اقبال

اسیں دونویں۔۔۔۔

وکھو وکھ وی، نال دی سِکھ دے رہے
دانے ہجر فراق دے چبدے رہے
دین مِتھیا کُفر تے کافری نوں
بھانویں مُڈھ گوانڈھ وی رب دے رہے
نہ کجھ خرچیا تے ناں ای دان کیتا
پیسے ڈب دے وِچ ای ڈب دے رہے
ہو کے آپنے وس توں باہر اسیں
نہ کویل دے رہے نہ جھب دے رہے
کسے ہون ہوان دی فکر لاہی
کجھ کرن کران نوں پھبدے رہے
اک رنگ وی کسے نہ رہن دتا
وچے وچ ای ڈب کھڑبدے رہے
دشمن دل دی اِکو ای کوٹھڑی سی
دنے رات اوسے وچ بہدے رہے
اکو شے سی پار الار جہنوں
اسیں، میں تے توں، دونویں لبھدے رہے
جیوندی جاگدی دیہی نوں اجّ، ظفر !
کِتے ساڑدے رہے ' کِتے دبدے رہے

ظفر اقبال

ایس طراں نئیں جاوی دا

کِدھرے نونہہ اڑا وی دا
ایس طراں نئیں جاوی دا
پیتا سگواں توں، تے میں
پانی ایسے راوی دا
ساڈے اتے تہاڈے وچ
فرق سی اگی باوی دا
تیلے اُڈن ٹوٹی دے
سکھنا بوہل اُڈاوی دا
اک واری جے چھوہ لویئے
کم اوہ توڑ چڑھاوی دا
منجی پھوہڑی دی تھاہرے
اپنا آپ وچھاوی دا
سیک سڑن دا ہور سواد
پاسہ نئیں پرتاوی دا
مٹی سرت سمہال، جدوں
چڑھیا کولا ساوی دا
بھوتنیاں دے نال، ظفر
جھولا جیہا بڈاوی دا

ظفر اقبال

تیری اک بلاہنگ

ککڑ وتی بانگ
اوہو اُوٹ پٹانگ
ٹپ گئی سرحداں
تیری اک بلاہنگ
یاں کِکر دی چھل
یاں ٹاہلی دا چھانگ
پالا سیت ہوا دی
پالا پوہ نہ مانگھ
کدے آپ وی پھیریئے
منجی بیٹھاں ڈانگ
چھنگے ننگے فرش تے
بیٹھا کالا ناگ
کدی بہاون ڈھکیاں
کدی اُڈاون کانگ
لبھاں اپنے آپ نوں
پھراں سُدائیاں وانگ
اجے کھلارے گا ظفر
کوئی نواں ڈفانگ

گربخش سینی

کوتا

(مہان لیکھکا امرتا پریتم نوں سمرپت)

امرتا پریتم ساہت منڈل وچ،
سورج وانگاں چڑھی رہی
گھر وی اوس دا دنیاں بھردے،
ساہتکاراں دی گڑھی رہی۔

بچپن توں ہی ساہت دی منزل،
پوڑھی پوڑھی چڑھی گئی۔
دُنیا دے ہر کونے دے وچ
سبھ توں ودھ ہے پڑھی گئی۔

عیش و آرام دے جام وی پیتے،
نہیں کسے دی تڑی سہی۔
ساہت رچنا ہی دھرم سمجھیا،
قلم سدا ہتھ پھڑی رہی۔

وانگ انگوٹھیاں رچنا اوس دی
ہیرے موتیاں جڑی رہی
قسمت اوس دے اگے ہردم،
ہتھ جوڑ کے کھڑی رہی

بول مٹھڑے تے شاعری اوس دی،
پھل کلیاں دی لڑی رہی
گاتھا عورت دے درداں دی،
دل دماغ تے چڑی رہی

اوسدیاں بھاوناواں دی گڈی،
سدا اسمانیں چڑھی رہی۔
مان، سنمان، پرسکاراں دی،
لگی سدا ہی جھڑی رہی۔

''مان سچے عشق دا'' کردی،
حق، خواہشاں لئی اڑی رہی۔
توڑ کے رسم، رواجاں تائیں،
وانگ چٹاناں کھڑی رہی

نال سماجک بندھناں دے اوہ،
عمراں ساری لڑی رہی۔
بے وس ہوئی چڑی وانگ پر،
پنجرے وچ نہیں تڑی رہی

چنگی چاہے ماڑی اوس تے،
وانگ انساناں گھڑی رہی
جگ وچ ساہت دا کردی چانن
''سیٹی'' سماں وانگراں کھڑی رہی۔

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

لکھوندر باجوہ

یگ بیت گئے

مک گیا ہے اک یگ تے
ساہت دا اک چومکھا دیوا بجھ گیا ے
تول نکھٹ گیا، لاٹ تھڑکدی
سدا لئی ہو گئی الوپ
تے رک گیا کوتا اتے ساہت دا
لمبا سفر
رہ گئی پچھے
ماناں سنماناں دی دنیا
وچاراں دی دنیاں
جو سدا جگدی رہے گی
ہمیشاں یگاں تیکر ازلاں تک
تے دیندی رہے گی ہوکا
بیگانیاں پیڑاں دا
ہیراں دے درداں دا
کیدوواں دیاں چالاں دا
تے روندی رہے گی ابلاواں دے دھڑے
دسے گی راہ منزلاں دے پاندھیاں نوں

تے آکھے گی اج دے لیکھاں نوں

کیہ تسیں وارث شاہ بن سکدے ہو؟

کیہ تسیں بن سکدے ہو امرتا پریتم؟

جو نہیں تاں قائم تاں کر سکدے ہو

اپنی ہوند

زندگی دی بیڑی نوں ہمت دے چپوواں دی

ہندی ہے لوڑ

فر کوئی کنارا دور نہیں ہندا

سوارتھ دا جھوٹھا برقع لاہ کے

پچھانو بیگانے درد نوں

بولوانیاں دے خالف

جاں فر

تان سین وانگ، چھیڑو کوئی راگ

تاں جو ہزاراں نہیں

جگ پین لکھاں چو مکھے دیوے

تے دیویاں توں ملدی رہے دیویاں نوں روشنی

ملدی رہے گیان دی لوء

اتے ایہ سلسلہ چلدا رہے

چلدا رہے

تے ہندی رہے نویں یگاں دی شروعات۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

منجیت کور انبالوی

ویہویں صدی دی لوء

(امرتا دے ناں)

اوہ اک وانگ ودھدی
زندگی دے کنارے کنارے ٹردی
کدے پتھر گیٹیاں نال کھیڈدی
جھرنیاں دے سرودی سنگیت نوں سن دی
سپیاں دے چھتے نوں دل چہ کھڑاوندی
سورج دے سنگ سنگ ٹردی رہی
اوکھیاں تے ہنیریاں راہاں دی پاندھی بن
کدے ہنیریاں دیاں کندراں چوں لنگھدی
اداسیاں دے بندھن توڑے
کدے چنچل بن جاندی
کدے دھرتی نال پاوندی بات
آپ دی دھرتی بن جاندی
لمیاں لمیاں واٹاں گاہندی
سپن لوک وچ ست رنگاں دا
سپیاں داتھان بناوندی
کدے بدلاں دے ددھ چٹے گوہڑے کت دی

تے، ٹھاردیندی دھرتی دی ہک نوں
ہر دھی دی اسٹ پیاس نوں
تے دلی درد دے احساس نوں
جان دی، رمزاں نوں پچھان دی
اوہ سبھ دھیاں دی،
ماں بن گئی جاپدی
کدے اڈدے پنچھیاں نال
چت ربریاں تتلیاں نال
اڈدے بدلاں نال اڈاریاں لاؤندی
دور امبر دے آلھنے تک
اوہ اپنے شبداں دی،
ون سونتا دی ترجمانی کردی
خوبصورت شبداں دیاں پینگھاں چڑاؤندی
بنا ہوندی امبر دی ہک تے
سوچاں دا اک خوبصورت آلھنا
بھیجدی کدیں 'سنیہڑا'
زندگی دے سفر چوں
وچھڑ گئے محرم نوں
بن جاندی کدے دھارمک گرنتھاں نوں پڑھدی پڑھدی
ویہویں صدی دی لوء، حرفاں دا حاصل
گیتا تے بائبل
شبداں تے ارتھاں دا
بھوپرسار کردی کردی

بن گئی جو ساہت دا دھراتل۔

اوہ امرتا سی، امرتا........

ندی سی نور دی کوئی

جو شبداں دی سرجنا کردی کردی

ساہت دے سروراں وچ

عشق کستوری اوہدیاں رگاں وچ وسدی

کھڑی، مہکدی

ددھ رنگی چانی دیاں

رشماں بن بن لیٹ دی

دھرت دے کینوس اُتے

کاغذ دی کوری سطح اُتے

شبداں دے چتر دی

رنگ برنگے، چانن دی پھلکاری ورگے

امبر دے آلے وچ رکھے

چن سورج دو جلدے دیوے

وشال ارتھاں دا، بھوپرتاں دا

پرسار کردے،

گیان دے چانن نال چمکدے چتر

جیوندی رہی کوتا دے نال نال

موتیاں ورگے شبداں دے رنگ بھردی

سوندی رہی اوہ کوتا دے پنگھوڑے وچ

دھپ سیکدی رہی، تاں کوتا دے ویڑھے وچ

کوتا دی مہندی تلیاں تے سجا کے

کوتا دا ٹکا متھے تے لا کے

کوتا دے سوہے سالو وچ لپٹی

رنگاں دی چتری کینوس سی لگدی

کوتا دے پھلاں دی سیج تے ستی

زندگی دے سارے درداں دی کڑتن

عشقے دی اک ہی بوند وچ پی کے

ٹر گئی دور، بہت دور

اوس ساگر ول

جس دی کوئی تھاہ نہیں

جس دی...............

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

من موہن سنگھ راوؑ

اک دہ صدی داو گوچا امرتا پریتم

(پُورو لکھیا مرثیہ)

امرتا!

میں سوچ داہاں

کہ کیہو جیہی ہووے گی

اوہ سندھیا

جدوں توں الوداع کہہ کے

ہوا وچ مل جائیں گی،

سپنے دی طراں،

خاموشی دے کھنب لا کے،

کائنات دے نینیں

ہنجھو ہون گے موتیاں ور گے

پنچھیاں نوں اڈن لئی،

آکاش سوڑا تے سونا

ہو جائے گا اک دم

برخ اداس ہو جان گے

اوس دن

پنجاب دے دریا رُدن کرن گے
ساگر نوں خبر دین خاطر!
بدلاں دے پلو
سجل ہون گے ترپ ترپ

مٹی چ خاموشی ہووے گی
چیتر دی رین ورگی

ہنر دی جائی دے ترن تے
چن اپنی پگڑی دے لڑ نال
ہنجھو پونجھے گا ہچکیاں بھر کے

کوتا دی سرسوتی
اترے گی آرتی تیری

قلماں دے وارث لکھن گے
مرثیے دا کوئی ویدو کھرا

درد دا ہنگلو اڑا کرے گا پر دکھنا
تیرے قلم مندر دی

دیہی تاں آخیر مل جائے گی
اپنے آدے سنگ ہیجے
پر تیرے اکھراں نے تاں اجے
جیونا ہے صدیاں خاطر

....

تیرے شبداں نے اُگا دنے نے
سمے دے کُکنوس اجے تاں

توں کویں جدا ہو سکدی ہیں
منکھتا دی گل کولوں
تیری تاں بات اجے
مکی نہیں پوری
جگ نوں لوڑ رہنی ہے
تیرے بولاں دی، انصاف دی
دھرتی نوں وگوچا ہووے گا
بابل دے ویڑھیوں
دھی دے ترن ورگا

بعد دی پستک چ
سوگی شبداُ کرے گا
آدم چم کے قلم تیری

سوج کرناں دے کول لے کے

تیرے بوہے تے ڈسکی بھرے گا
جویں گھرنوں بزرگی اسیساں
پوہندیاں نے ہرویلے
علم دے موڈھے
ہے دی سارنگی
عبادت کرے گی تیری،
تے برہڑے دا گیت گائے گا
سونہڑے دین لئی
وارث شاہ تینوں
سچ جانی
صدی دے ادب دا
شیلا لیکھ بن توں
ایتھے ہی تاں رہیں گی ہزار
محبت اتے روشنی بن گے
محبت مرنہیں سکدی
روشنی بجھ نہیں سکدی

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

موہندر کمار مودگل

امرتا نوں

کاغذ قلم دوات
دتی داتے تینوں سوغات
کیتی تینوں اکھراں دی برسات
بنا دتی اک کائنات۔
اج تیرے اکھر موتی بن بکھرے
کوئی نہیں نیواں سبھ دھن شکرے
توں لکھیا اپنا سولا
جنہاں پڑھیا اوہ ہو گئے نکھرے
اج بن گئے لیکھ تیرے کجھ فقرے۔
توں لکھاری ہی نہیں اتہاس سیں
توں ماں بولی داوشواش سیں
توں اج وی جیو ہون دا احساس ہیں
توں کردی سبھناں دے دلاں وچ واس ہیں
ناں وانگوں امرت
اتہاس وانگ جیو
دل دی دھڑکن وانگ تیز
وڈے دریا دی کہانی سیں

شوجی دیاں جٹاتوں نکلی
گنگا ساگرتک دی روانی سیں۔
ان گنت پنے
توں رنگے ون سونے
وچھاومتی اکھراں دے
توں دتا اتہاس بنا۔
توں مڑ ساڈے ویڑھے آ۔
تیرے قدم، تیرا پرچھاواں
آون والی پیڑھی لئی پگڈنڈی
اک لیہہ
ہتھ چک، دہ اشیرواد
نکے وڈے ترے جان
تیری قلم دی لکیر تے۔

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

موہن جیت

امرتا

اج میں فیر چاواں چ کملا ہویا پھردا رہیا
اج فرسڑ کاں بانہاں چ آوٗنو سنگیاں
اج فر جنے وی اکھر
واردار جوڑے بن نظراں چہ پلمیں
ہر جوڑ وچ تیرا چہرہ سی
امرتا!

اج فر پیراں چ آوارگی سی
اج فیر میں حادثیاں چوں لنگھیا

پر
عام توں الٹ ساہویں تاریاں دی کھتی سی
اج فر جد سپنا ٹٹا
تاں جسم ہلکا ہلکا سی
تے ساہویں سورج دی ٹکی سی
نال سوہے گوٹے چ جیہڑی عبارت سی
اوس چ تیرا ناں سی
امرتا!

اج فر من چ اچوی جہی سی
رسوئی چوں بھینی بھینی مہک آوندی سی
نال دے کمرے چ بچیاں دے نکے نکے بول
اج فر میری پٹھ پچھے تن سرہانے نیں
اج فر نکی نکی داپینہ ورھیا ہے
راڈیہ چ طفیل دے بولاں دیاں مرکیاں
اج فر چراں بعد کوتا لکھی ہے
امرتا!

اج فر دوست کہن گے ۔ بڑا بھاوک ہے
اج فر اوہناں کہنا ۔ کوئی سکھیا لکھی ہے
سندراں توں بعد صاحباں
صاحباں تو بعد سہتی
اج فیر اوہ ٹھہکا لگائے گا
اج فیر اوہدی بلبلی فلک چیرے گی
اج فر اوہ چہرے تے لشکدی شام
تے اکھاں چ سرخی بھری آکھے گا:
اج میں کوتا لکھی ہے ۔
امرتا!

کل دی عام وانگ جداوہ گھر آیا
تاں تھکا تھکا سی بوجھل بوجھل

کل وی کسے دے پیر بیٹھ آ کے
اوہدی چیچی مدھولی گئی
تے چپل دی تنی ٹٹ گئی

بھج کے بس پھڑی تاں بانہہ نوں ضرب آ گئی

کل وی بجھیا گھر پہنچیا
اجے پرسوں ہی تاں پتنی نے کیہا سی:
کنے چر توں توں کوتا نہیں لکھی
کوتا لکھ کے توں کویں لٹ لٹ
بلدا ایں
تے عام وانگ اوہ ہور تھک گیا سی

اج اوہ وقتوں پہلاں گھر پرتیا ہے
رسوئی چوں بھینی بھینی مہک اٹھ رہی ہے
بچیاں نوں بانہاں چ اچھالیا ہے
پتنی نوں گلوکڑی چ گھٹیا ہے
تے اوہدبولاں تے مگھدے بلھ رکھ کے
کیہا ہے:
اج میں کوتا لکھی ہے
کوتا لکھی ہے۔ امرتا

(لپی انتر: قمرالزمان)

نائب سنگھ منڈیر

امرتا دے ناں

تینوں کی آکھاں، کیہ بناواں رشتہ
ان جمیاں نال وی کوئی رشتہ جوڑ دا اے
بس اک سوال تیرے ناں ان جنمی دھی دے ذہن
چہ دوڑ دا اے
بولے، گونجگے تے آپ ہدرے سماج نوں سنوارن لئی
توں لایا سی زور بھتیرا
تیتھوں بعد دھیاں دی رکھوالی دس ہور کرو کیہڑا
کیوں ایتھے تاں ہر کوئی پت نال رشتہ جوڑ دا اے
بس اک سوال تیرے ناں، ان جنمی دھی دے
ذہن چہ دوڑ دا اے
تساں دھیاں دے درداں نوں پچھان
ماری سی وارث نوں آواز
دھیاں دی ماں ''امرتا'' اج فیر جگ تیری
للکار نوں جوڑ دا اے
بس اک سوال تیرے ناں، ان جنمی دھی دا
ذہن چہ دوڑ دا اے
آجاماں، ایہ جگ مینوں وی دکھا جاماں

ان جنمی دھیاں دا بھاری دل بولدا اے

بس اک سوال تیرے ناں، ان جنمی دھی دے

ذہن وچ دوڑدا اے۔

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

ستویں دھی

امرتا
امرت لہر جہی
لہر لہرا اٹھدی
دھرتی تے پھیلدی
امرتا توں پریتم تک پہنچدی
پریتم دی ہو کے
امرتا پریتم
سدا امبر توں امرت دی بوند
وانگ برس دی رہے گی

امرتا
تارے
کسے امبر دے دھرو وانگ
دھر آکاش وچ چمکدی رہے گی
چن دی روشنی ونڈ دی رہے گی

سورج
دیاں کرناں وانگ
سدا کردی رہے گی
دھرتی تے پھردی رہے گی
نظم کسے گیت وچ سدا
جیوندی جاں مردی رہے گی

امرتا
پنجابی دی آواز بن
دھرتی تے گونجدی رہے گی
کسے شنکھ نادجہی
سارے آکاش وچ پھیلدی رہے گی
کال کھنڈ تک۔

امرتا
لئی کوتا ستویں دھی ہے
تے دھی دی پیڑ دا احساس ہے
اتے آواز دی پہچان ہے
اتے آواز دی پہچان ہے
ناری دا پرت مان ہے

امرتا
دوستی دی مثال بن

پایر، خوشبو دی مہک جہی
ہوا وچ گھل مل جاوے گی
اتے شبداں وچ شبد جہی
کتاباں وچ کتاب گاہ جہی
کاغذ تے کینوس تے
فر ملے گی
کسے نویں وجود وچ
کوتا دی روح وچ۔

(لپی انتر: قمر الزمان)

☆☆☆☆

نسرین انجم بھٹی

اَمر کہانی

کتھ کہانی کریئے، ہونی جریئے
ہریئے نی ہریئے امبران توں ڈریئے، دھرتی دی تلیاں تے دیوے دھریئے
تیرے نال ای کھوہے ٹیپئے! تیرے نال ای کچے بھریئے کارن کریئے
پرتوں اَمرتا کڑیئے!
ناں توجیونوں ہری، نہ مرنوں ڈری
تینوں کیہ کرسدیئے بھاگ بھری؟
اک اَمرتا گاون گگّے پنجاب داتے فلکر سوانی ستھ دی
کنک چڑھے نوں ٹھلدی تے آکھدی وارث شاہ نوں ''آویں''
ان ہونی نوں اگدوں ہو کے ملدی
نابر قلم کلک دی
اَمرتا پریتم کڑیئے!
رنگلے پنجاب دی چُنیاں رنگدی پیڑھیاں انندی وسوں دے دکھ
گل نال لاکے، وچ کچہریاں نچی
کدی کدی ترنجناں اندر کلی بہہ کے رنی۔ جند گتیاں وچ گُتھی
تے لچھے لچھے سانوں کتدی رہیوں، سانوں تندی رہیوں، سانوں ستھدی رہیوں
اساں کندھاں اتوں جھاکن آلے رہے، بنیرے پھڑدے
توں سیماواں بھن آلی گیوں پتناں پار

اساں آھو آھو آکھن آلے کون ہوئے

اج موئے کہ کل موئے

حرفاں دے ہانی

توں نہ کیتی تے نہ کیتی، پھیر ہاں کیتی تے ہاں کیتی

سبھ دیساں آلے تھسئے پردیسی ارانہہ رھیا نہ کوئی

اس دور پچھوکڑ تج دے اوہلے کلیاں بہہ کے روئے

توں اُمر کہانی لکھدی لکھدی

اُمر کہانی ہوئی

کوئی وارث شاہ کوئی بھاگ بھری

ناں جیونوں ہری نہ موتوں ڈری

☆☆☆☆

ہربھجن سنگھ رینو

توں بات پائی

توں بات پائی
تاں جانیا
رکھ وی وی بھر دے نے ہنگارے
پہاڑ وی کردے نے رُدن
وادیاں دیندیاں نیں
گونجواں موڑواں جواب

چپ دی زبان بن کے
دردیاں دے بول بن کے
ہوکا جاں بھریا قلم نیں
نال اوس دے کائنات روئی
نھیریاں وچ منہ لکا کے
رات ساری
ساری ساری رات کوئی

امبراں دی پٹی تے کوئی
محبتاں دے سنیہڑے لکھ گئے

ایہ جان کے

تاریاں دی عبارت پڑھدی رہی

دور دے

چن دے امیکلش چوں

پی لواں اک بوند ہی

دن رات دے پتھر توڑدی

گیتاں دے مکھڑے گھڑدی رہی

مشقتاں کردی رہی

کٹ کٹ کے انیندرے

کتنیاں نت پین جو

سوچاں دیاں پونیاں

کتھوں یاد آون فر

گنتیاں تے منتیاں

کجھ کتیا گیا

کجھ رہندا رہ گیا

کجھ گیت بن

پوناں دے ہوٹھیں چڑھ گیا

کجھ سمیاں دے

ویہنی وہ گیا۔

سکھ کے جس نے ہاتھ نہ دتی

دکھ کے گوڈے موڈھے لگ بیٹھی

سِرتو کھارا بھارا بھارا
ٹمکتیاں
کتھوں ملدیاں

اک اکلی پیڑ سی
میلیاں وچ بھٹکدی
اوس دامنہ متھا دھوندی رہی
سُرما سلائی پاؤندی رہی
مَولی گُندھدی
مہندی لاؤندی رہی
چانن دی پھلکاری دیندی
ناگ منی دی
بندی لاؤندی رہی
لکھ جائی جان کے
گیت سنگ پرناؤندی رہی

یاداں والی دکھدی دھونی
جند جوگڑ رہی تپدی پھردی
عشق اکھر دا تویت بنا کے
آس دے گل لٹکائی رکھیا
کدھرے مُڑ گواچ نہ جاوے
عبادتاں کردی رہی
اک عمر سی

اک جان سی
مکدی رہی
مردی رہی

غم سن
کہ آوندے رہے
مہمان بن بن
دل دی دہلیز تے
چاواں دی دیپ مالا کرلئی
ہاسیاں دی چیول گتھلی کھول کے
ونڈی گئی
جگر سی
بوٹی بوٹی تلدی گئی
دعوت سدا ورت چلدی گئی

جے کدے لوچا دی تیہ لاہون لئی
سکھ دا پانی منگیا گیا
دکھاں نال چلی بھری رہی
مجبوریاں دی نیں تے
ہستی دی کشتی کردی رہی
قلم دا چپو سانبھ کے
پتناں سنگ کھہندی رہی
لڑدی رہی

دردمنداں دے

وارث نوں واجاں ماردی

آپ وارث بن گئی

عشق دا

اگلا ورقہ پڑھ گئی

دس دی رہی

جوگ دا سر جک اوہو بن دا

آپ جو اپنی اگن نہا کے

سچی دہ پراپت کردا

رچ تے دا جیبھا دھردا

شبد شبد روپ اوہ ہووے

نادنا دوا جاما دھارے

نہ فر جمدا

نہ فر مردا

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

ڈاکٹر ہرنیک سنگھ کلیر

غزل

وقت ہاں تلی تے نکاؤنا مینوں
نیناں دی چنگیر چ سجاؤنا مینوں

نہ ساز نہ آواز نہ دستک کراں
لباں تے گیت وانگ گنگناؤنا مینوں

مرہم بن کے پلوساں گی دل دے زخم
محبوب وانگ سینے چ وساؤنا مینوں

کانٹیاں تے پچھیاں دا ناں ہے زندگی
رکھنا ڈور سانبھ کے اڈاؤنا مینوں

دل دی تار تے گاؤنا وفا دا گیت
آواں گی ضرور پووے نہ بوہا کھڑکاؤنا مینوں

آواں گی تلی تے رکھ دل دی بوٹڑی کلیر
دل دے بوہے کھول کے بلاؤنا مینوں

(2)

دل نوں آکھے لٹ لٹ بلیا کرے
ہنیرے راہاں نوں روشن کریا کرے

منزلاں سر کرنیاں جس گیت نے
بے خوف کچے گھڑے تے تریا کرے

دھرتی رشناؤن دی جو دل چہ ہے امنگ
بلدے چراغ تلیاں تے دھریا کرے

خنجر دی جو بوچھا سینے دی ڈھال تے
انصاف لئی ہر ستم ہس کے جریا کرے

پھلاں وانگوں کھڑی مہک بن جائیں 'کلیر'
جیون ہے جیؤن لئی جتیا کدے ہریا کرے
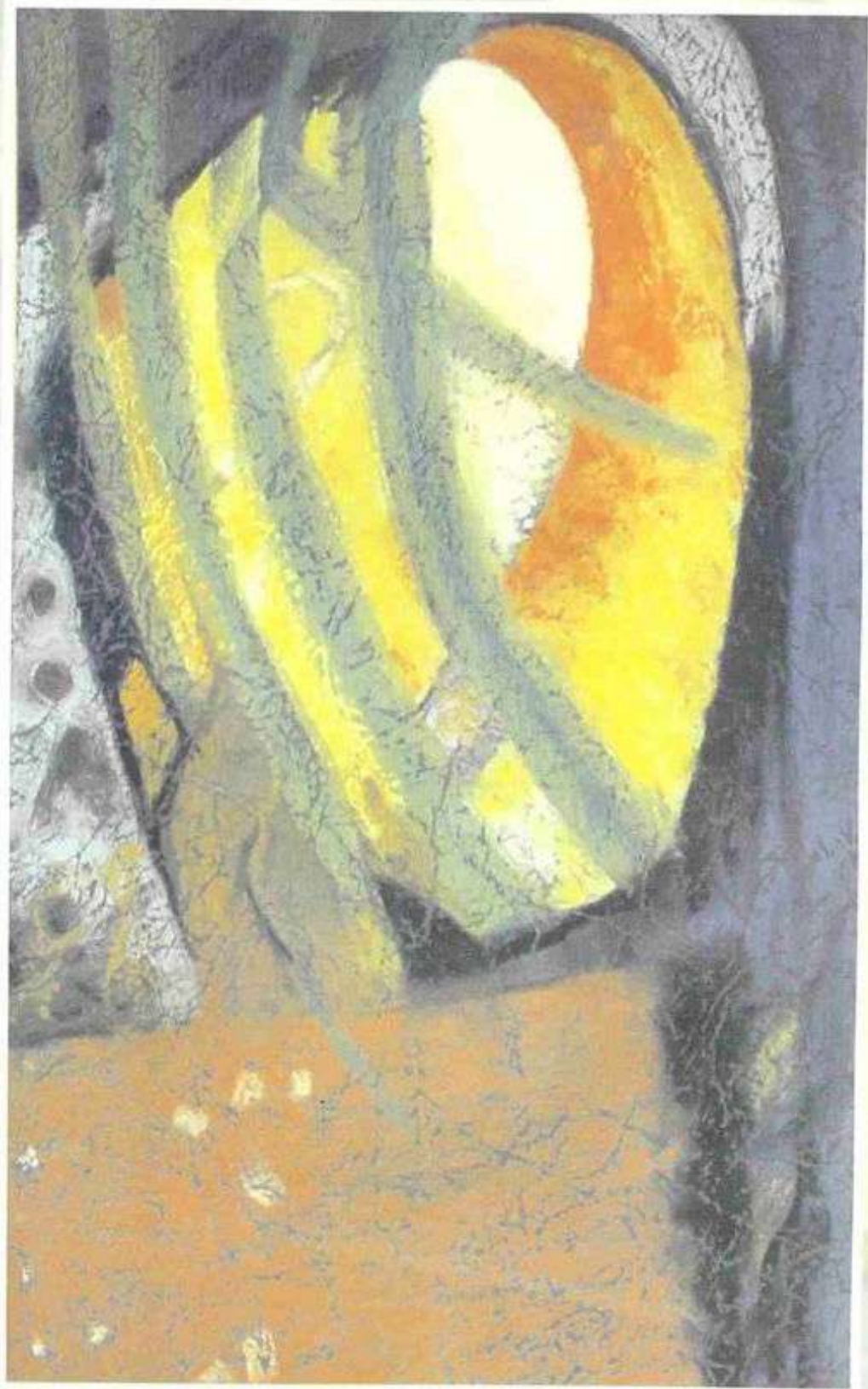
(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

پینٹنگ: طاہر رشید

فیر تیہنوں یاد کیتا

فیر تینوں یاد کیتا

فیر تینوں یاد کیتا' اگ نوں چُمیا اساں
عشق پیالہ زہر دا' اک گھٹ فیر منگیا اساں
گھول کے سورج اساں' دھرتی نوں ڈوبادے لیا
تاریاں دے نال کوٹھا' انگن دالمبیا اساں
دل دے اس دریاؤ نوں' اج پار کرنا ہے اساں
ایس ڈاہڈے جگ دے' لیکھے نوں فر چھنکیا اساں
فیر چنبا سپنیاں دا رات بھر کھڑ دا رہیا
عشق دی اس ونگھنی تے' عمر نوں پنجیا اساں

پھر تمہیں یاد کیا' جیسے آگ کو چوما ہو
زہر کے عشق پیالے سے' ہم نے ایک گھونٹ اور مانگا
ہم نے سورج کو گھول کر اُس میں دھرتی کو رنگ لیا
آسمان چھت کی' تاروں سے لپائی کی
پھر خوابوں کا چمپا رات کھلتا رہا
عشق کے چرخے میں ہم نے اپنی عمر کو دھنا

امرتا لئی لکھیاں نظماں

نظم

کسے دے نال گل کیتیاں گل نہ بنی

کسے دے نال ٹُر کے کِتے نہ پہنچے

کسے دے نال سوں کے کدے نہ جاگے

اُہ ملی

اُس نے مینوں ویکھیا پتا نہیں کیہ ویکھیا

مَیں اُس نوں ویکھیا پتا نہیں کیہ ویکھیا

بولے وی نہیں پر گل بن گئی

ٹُرے وی نہیں پر پہنچ گئے

سُتے وی نہیں پر جاگ پئے

☆☆☆☆

بولدے نین نقش

کل راتیں سپنے وچ

اک عورت ویکھی

جس نوں میں پہلاں کدے نہیں سی ویکھیا

پر مِلدیاں ہی لگا
کہ اس بولدے نین نقشاں والی نوں
کِتے ویکھیا وی ہویا ہے
ہونہ ہو اہ اوہ ہی عورت ہے
جو میریاں سوچاں دے بگیچے وچ
اکثر آکے پھلاں نال کھیڈدی دِس دی ہے
اُس نال پھلاں وچ ٹردیاں ٹردیاں
پتا ہی نہیں لگا کدوں اُس دا گھر آ گیا
اُس دا گھر وی بولدے نین نقشاں والی درگاہ ہی سی
چُنیاں ہوئیاں صرف ضروری چیزاں
گھر دی ضرورت دی تے سجاوٹ دی
فالتو چیزاں نہ ہون کر کے گھر کھُلا کھُلا لگ رہیا سی
خوبصورت دل کش تے سادا وی
اپنی طراں دا آپ ہی
بالکل اپنی گھر والی درگاہ
جتھے سادگی خوبصورتی نوں وَدھا رہی سی
تے خوبصورتی سادگی نوں......
امیری فقیری دویں ماحول وچ صاف
دِس رہیاں سن
اُہ کویتا لکھ رہی ہے تے لِکھ کے ہوا دے حوالے کر دیندی اے
رات مُک گئی ہے
پر سُپنا نہیں مُکیا۔
اوہ اجے وی اُس بولدے نین نقشاں والی نال

کیتے ٹردا پیا اے

☆☆☆☆

نظم

اِک زمانے تُوں
تیری زندگی دا رُکھ
کویتا کویتا
پھلدا پھلدا تے پھیلدا
تیرے نال رَل کے
ویکھیا ہے۔۔۔۔
تے جدوں تیری زندگی دے رُکھ نے
بیج بننا شروع کر دِتا
میرے اندر جویں کویتا دیاں
پتیاں فُٹن لگ پیاں......
تے جس دن تُوں رُکھ توں
بیج بن گئی،
اُس رات اِک نظم نے
مینوں کول بُلایا،
کول بٹھایا
تے اپنا ناں دَسیا۔
اَمرتا جو رُکھ توں بیج بن گئی
میں کاغذ لیاندا
اوہ کاغذ تے اَکھر اَکھر ہو گئی

ہُن نظم اکثر اُون لگ پئی ہے۔
تیری شکل تے تیرے وانگ ہی ویکھدی ہے مینوں
تے کنا چر میرے نال ہم کلام ہو کے ہر وار
میرے اندر ہی کتے گُم ہو جاندی اے......
(31 اکتوبر 2005۔ میری پہلی نظم......ساری رات بیج بن گئی امرتا دے کول بیٹھ کے لکھی۔ امروز)

☆☆☆☆

نظم

توں اُکھر اُکھر کویتا
تے کویتا کویتا زندگی

☆☆☆☆

نظم

کدے کدے
خوبصورت خیال
خوبصورت بدن وی
اختیار کر لیندے ہن...

☆☆☆☆

نظم

توں میری سماج

مَیں تیری سماج

تے ہور کوئی نہیں سماج

☆☆☆☆

نظم

تیرا میرا پیار ہی ہے

گیان زندگی دا...

☆☆☆☆

من چاہا

سپنا پنا ہو کے عورت ہوئی

وگدے دریا وانگ تڑپئی لبھن

اپنی کلپنا دا ہان...

فکر فکر ہو کے نظم ہوئی

وارث شاہ نوں جگایا وی

تے آکھیا وی

اُٹھ ویکھ اپنا پنجاب لہو......لوہان......

محبت محبت ہو کے

اک رابیا ہوئی

کسے نوں وی نفرت کرن توں انکار کیتا

تے اپنی ہوند نال دسیا

کہ محبت نفرت نہیں کردی......

زندگی زندگی ہو کے
امرتا ہوئی
نظم نظم تے پیار پیار ہو کے
من چاہا لکھیا وی
تے من چاہا جیو ویا وی...
☆☆☆☆

کلا

جدوں دی کلا نوں ہوش آئی اے
اُہ زندگی بن نا سوچ رہی اے...
زندگی بنن دے راہ تے
ہُن اُہ ٹُر پئی اے...
راہ وچ کلا سجاوٹ بنی اے
نمائش بنی اے
پر اُہ رُکی نہیں
اُہ تفریح وی بنی اے
محفل وی بنی اے
پر اُہ ٹُردی جا رہی اے...
وقت ساتھ دیوے نہ دیوے
کسے نوں یقین ہووے نا ہووے
پر اُس نوں اپنی سوچ تے یقین اے
کہ اُس نے اک نا اک دن
زندگی بن ہی جانا اے...

☆☆☆☆

اِک دن

وقت نے مینوں پُچھیا

کہ امرتا تیری کون اے؟

میں وقت نوں ہَس کے کہیا

چنگا ہندا جے توں اہ پُچھدا

کہ امرتا تیری کون نہیں...

☆☆☆☆

نظم

پیار دا رشتہ

تصوّر دے ہان دا

قانون دا رشتہ

مَساں سمجھوتے جِڈا...

☆☆☆☆

چابی

اِہ اُودوں دی گل اے

جدوں میں اک برساتی وچ رہندا ساں

اِک دن اُہ ملن آئی

اُس نے بوہا کھڑکایا

میں بوہا کھولیا پر اُہ اندر نہیں آئی
پوڑیاں وچ ہی آکھن لگی
تیرا وی مینوں بوہا کھڑکا ؤنہ پوے
اہ مینوں چنگا نہیں لگدا۔
میں اُس نوں دوسری چابی دے دتی
اُہ کدے چابی نوں ویکھدی کدے مینوں
کمرہ اپنے آپ نوں گھر بن داویکھ رہیا سی
تے اُس دیاں بولدیاں اکھاں وچ
میں اِک رشتہ بن داویکھ رہیا ساں...

☆☆☆☆

نظم

دوستی دے زمانے وچ
اِک دن میں امرتا نوں ملن گیا
اُس دے کمرے وچ بیٹھے گلاں کر رہے ساں
اُہ مینوں ویکھی جارہی سی
کجھ دیر بعد کہن لگی
جا پہلاں دُنیا ویکھ آ
پھیر وی جے تینوں میری لوڑ ہوئی
تاں ٹھیک ہے
میں اُٹھ کے اُس دے سامنے
کمرے دے ست چکر لائے

تے آکھیا۔

میں دُنیا ویکھ آیا واں

اُس ہس دی ہس دی نے آکھیا

تیرے ورگے دا کوئی کیہ کرے...

☆☆☆☆

ساتھ

اُس نے جسم چھڈیا اے ساتھ نہیں

اُہ ہُن وی ملدی اے

کدے بدلاں دی چھاویں

کدے تاریاں دی چھاویں

کدے، کرناں دی روشنی وچ

تے کدے، خیالاں دے اُجالے وچ

اسیں مل کے تردے آں چُپ چاپ کُجھ کہندے آں

تے کُجھ سُندے آں۔

وچ وچ اک دوجے نوں دیکھ وی لیندے آں

سانوں بگیچے وچ تُردیاں ویکھ کے پھُل ساہنوں بُلا لیندے، ہن

اسیں پھُلاں دے گھیرے وچ بیٹھ کے

اک دوجے نوں اپنا اپنا کلام سُنادے آں

اُہ مینوں اپنی اَن لکھی کویتا سُناں دی اے

تے میں وی اُس نوں اپنی اَن لکھی نظم سناں داں واں

وقت کول کھڑا اہ اَن لکھی شاعری سُن داسُن، دا

اپنا روز دا ٹیم بُھل جاندا اے
تے جدوں وقت نوں وقت یاد آوندا اے
کدے شام ہوگئی ہندی اے
کدے رات اُتر آئی ہندی اے
تے کدے دن چڑھ گیا ہندا اے
اُس جسم چھڈ یا اے ساتھ نہیں...
☆☆☆☆

نظم

شعر بولن لئی ہندے بن
تے ارتھ جیون لئی...
☆☆☆☆

نظم

جی کردا اے
پُھل وانگ کِھڑ کے
تے خوشبو وانگ
ہولی ہولی ہوا وچ
گواچ جاواں...
☆☆☆☆

عبادت

پیار سب توں سُرل عبادت اے
وگدے پانی ورگی
نا کسے حرف دی لوڑ
نا کسے زبان دی محتاجی
نا کسے ویلے دی پابندی
تے ناہی کوئی مجبوری...
کسے نوں سر نواں دی...
پیار نال زندگی جیوندیاں
اہ عبادت اپنے آپ
ہر ویلے ہُندی رہندی اے...

☆☆☆☆

سماج

توں میری سماج
تے مَیں تیری سماج
اِس دے بِنا کوئی سماج نہیں...

☆☆☆☆

گھڑی

اَسیں ہر روز

چَلدے پھر دے درختاں وچ

درخت ہو کے بیٹھ جاندے ساں...

اُہ اکثر چُوڑیاں نہیں پہن دی

اُس دن وی اُس دیاں باہنواں خالی سَن

اُہ نے میرے ہتھ توں گھڑی اُتار لئی

تے اپنے ہتھ تے بنھ لئی

تے میرے وَل ویکھ کے مُسکرائی

مَیں وی اُس وَل ویکھ کے مُسکرایا

جس طراں اپنے آپ نوں کُجھ کرن توں پہلاں

کُجھ کہن دی لوڑ نہیں ہندی

اُس نے وی گھڑی اُتارن لگیاں مینوں پُچھیا نہیں

اُہ میری جیب وچ اِسے طراں ہتھ پالیندی اے

جیویں اپنی جیب وچ ہتھ پا رہی ہووے

اُہ سب کجھ سہج سبھا کرلیندی اے

مَیں فیر ہور گھڑی نہیں خریدی

گھڑی اکثر بدلدی رہندی اے

کدے اُس دے ہتھ تے کدے میرے ہتھ تے

پر وقت کدے نہیں بدلیا۔ وقت ساڈے نال اے

اُہ میرا وقت اے تے مَیں اُس دا وقت آں

☆☆☆☆

نظم

اہ اُدوں دی گل ہے
جدوں ساڈے کول صرف اِک شام ہُندی سی
اسیں ساری شام رَل کے تردے رہندے چپ چاپ
وچ وچ اِک دوجے نوں ویکھدے وی رہندے...
اِک شام تردیاں تردیاں
اُس پُچھیا
تُوں پہلاں وی کسے نال تُریاں ایں؟
تریاں ہاں پر جاگیاں کسے نال نہیں
جاگیا صرف تیرے نال ہاں
اہ سُن کے اُہ تردی تردی رُک گئی
میرے سامنے آکھلوتی
تے مینوں ویکھدی رہی ویکھدی رہی
فیر اپنے ہتھ وچ میرا ہتھ لے کے
انج تُرن لگ پئی
جیویں ساریاں حداں سرحداں
پار کرلئی آں ہون...

☆☆☆☆

نظم

محبت اپنی قسمت آپ لکھدی اے

باقی ساریاں دی قسمت
کوئی ہور لکھدا ہے...

☆☆☆☆

نظم

اُہ جدوں وی مِلدی ہے
اکثر
مینوں اِک اَن لکھی نظم نظر آوندی ہے
میں اِس اَن لکھی نظم نوں
کئی وار لکھ چکیا واں
پر اہ فیر وی اَن لکھی رہ جاندی ہے...
کیہ پتا
اِہ اَن لکھی نظم
لکھن لئی ہووے ہی نا
اِہ صرف
زندگی دے جیون واسطے ہی ہووے...

☆☆☆☆

نظم

زندگی تصویر وی ہے
تے تقدیر وی۔
مَن چاہے رنگاں نال بن جائے

تاں تصویر،
ان چاہے رنگاں نال بنے
تاں تقدیر...
☆☆☆☆

نظم

اُہ ہیر وی ہے تے فقیر وی
تخت ہزارہ اُس دا ملکہ ہے
تے من چاہا اُس دا دین۔
اُہ ذات دی صوفی ہے
تے مزاج دی فقیر۔
اُہ ہیر ہیر ہو کے
رانجھا رانجھا لکھدی ہے
تے لِکھ کے ہواواں دے حوالے کر کے
اپنی مرضی دا حج کر دی ہے...
اُہ ہیر وی ہے تے فقیر وی...
☆☆☆☆

پوری عورت

اِک دن تر دیاں تر دیاں
امرتا نے پُچھیا

ٹوں کدے وُمن وِد مائنڈ(Woman with Mind)
پینٹ کیتی اے؟
اہ 1959 دی گل ہے۔
مَیں تر دا اٹر دا رُک گیا،
اپنے اندر ویکھیا، باہر ویکھیا
جواب کِتے نہیں سی...
جواب لبھن ٹر پیا تے پہنچ گیا
پینٹنگ دے کلاسک ہال وچ
امرتا دے سوال والی عورت تے عورت دے اندر
دی سوچ تے سوچ دے رنگ
نہ ہی کسی پینٹنگ وچ دِسّے تے نہ ہی کسی آرٹ گرنتھ وچ لبھے
اہ ویکھ ویکھ حیرانی ہوئی۔
اپنی قوم تے مینوں وی تے آرٹ نوں وی۔
کِسے وی چتر کار نے عورت نوں جسم توں ودھ نہ سوچیا لگدا سی
تے نہ ہی پینٹ کیتا سی
پوری عورت جسم توں بہت ودھ ہندی اے
عورت دے جسم نال صرف سُتا جاسکدا اے
پر جاگیا نہیں جاسکدا...
جے کدے چتر کاراں نے عورت نال جاگ کے ویکھ لیا ہندا
ہوردی ہور ہوگئی ہُندی چتر کلا ہُن تک
ماڈرن آرٹ وچ تاں
ہن کجھ وی ثابت نہیں رہا
نہ عورت نہ مرد تے نہ سوچ...

جے کدی زندگی وچ مرد نے وی عورت نال
جاگ کے ویکھ لیا ہندا
بدل گئی ہندی اُس دی سوچ اُس دی زندگی وی
زندگی ہو گئی ہُندی جیون جوگی اُس دی وی
تے اُس دی نسل دی وی...

1966 وچ جا کے کِتے میں Woman with Mind پینٹ کر سکیا

☆☆☆☆

نظم

جتنا چر مرد
عورت دا، عورت دی مرضی دا
آدر نہیں کردا،
اُہ انسان نہیں بن سکدا
تے ناں ہی
اُس دی نسل کدے من چاہی
ہو سکے گی...

☆☆☆☆

امروز

تن دن ... تن کال

میرے نزدیک ویاہ اک پینٹنگ ہے، جو آدمی تے عورت اک دوجے دے من دی کینوس اُتے بناؤندے ہن، ہر روز، ہر ویلے، اُٹھدے بیٹھدے، کھاندے پیندے، سوندے جاگدے، بولدے سُندے تے سوچدے سمجھدے، ہر ساہ نال۔ چیتر دے پہلے دن توں لے کے پھگن دے اخیرلے دن تک دے سارے موسماں نال تے موسماں دے سارے رنگاں نال ایہ پینٹنگ بندی ہے۔ لگاتار بندی ہے۔ ہر ورھے۔ رنگاں دے نال نال ایس بن رہی پینٹنگ نوں ہر روز نویں سویر دا، نویں ڈُپہر دا، نویں شام دا تے نویں چاننی دا چانن وی چاہیدا ہے، تے ایہناں سویراں، ایہناں ڈُپہراں، ایہناں شاماں تے ایہناں راتاں دا سہج ماحول وی۔ ایہ پینٹنگ عمر دی اوہ فصل ہے جس نوں ودھن پھُلن لئی آپنیاں قدراں قیمتاں دی کھاد تے دل دریا دا پانی چاہیدا ہے۔ ایہ دنیا دی اِکو فصل ہے جس نوں تیار ہون لئی عمر دے سارے موسم چاہیدے ہن۔ سارے خوشگوار موسم۔ جویں میں پینٹنگ دی نمائش وچ یقین نہیں رکھدا، ایسے طرحاں میں ویاہ دی نمائش وچ وی یقین نہیں رکھدا۔ میں آپنا ویاہ کسے بھائی، کسے براہمن، کسے مُلاں، کسے پادری، کسے مجسٹریٹ، کسے قانون یاں کسے رشتے دار دے ساہمنے نہیں کیتا۔ میں ایہ ویاہ صرف آپنے ساہمنے کیتا ہے، دل دے آپ مہارے شگناں نال۔

26جنوری 1957 دا دن سی۔ اوہنیں دِنیں میں اردو دے ''شمع'' رسالے وچ آرٹسٹ ساں تے امرتا دلی ریڈیو تے پنجابی پروگرام وچ اناؤنسر سی۔ اودوں میں ساؤتھ پٹیل نگر وچ رہندا ساں تے امرتا ویسٹ پٹیل نگر وچ۔ اک سڑک دے آر پار۔ اوس

دن میں اوس دے کمرے وچ بیٹھا اوس نال چھوٹیاں گلاں کر رہیا ساں، تے گلاں گلاں وچ جدوں امرتا نوں پتا لگا کہ 26 جنوری میرا جنم دن ہے تاں امرتا نے ملکوے نوکر نوں بازار بھیج کے اک کیک منگوایا۔ آپنی ہتھیں کیک کٹ اک اک ٹکڑا مینوں دتا تے اک اوس آپ لیا۔ چُپ چاپ اک دوجے دی ہوند دے چانن وچ ایہ جشن منایا۔ ایہ پہلا جشن سی۔ میرے جنم دن دا۔ میری ہوش وچ (جدوں میں جمیا ہوواں گا، اودوں میری دادی نے پنڈ وچ گو ونڈ کے ضرور میرا جنم دن منایا ہووے گا۔ میں آپنے ٹبر وچ پہلا بچا ساں تے آپنے ماں پیو دا پلیٹھی دا پُت) جدوں آدمی نے کنک دا دانا مونہہ لایا سی، رب نے اوس نوں آپنی جنت وچوں کڈھ دتا سی۔ اینی گل سنی ہوئی سی، پر مینوں ایہ گل پوری نہیں لگدی۔ رب نے آدم نوں کنک مونہہ لاؤن دے بعد ضرور آکھیا ہووے گا۔ ''جا اج توں ٹوں آپنے لئی آپنی جنت بنا'' اوس دن کیک مونہہ لاؤن دے بعد مینوں لگا سی کہ میں آپنی جنت دی دہلیز وچ پہلا پیر دھر رہیا ہاں۔ ایہی پہلا پیر میرا پہلا رنگ ہے۔ میری پینٹنگ دا، تے ایہی پہلا شگن ہے ساڈے رشتے دا۔ ساڈے ساتھ دا۔۔۔۔

1957 دیاں بھر گرمیاں سن۔ مینوں گرودت دا خط آیا سی میرے لئی اپائنٹمنٹ لیٹر۔ گرودت دے نال بمبئی وچ اوس دیاں فلماں دے ڈیزائن بناون لئی دعوت۔ میں بڑا خش ساں۔ ایہ گل اودوں دی چل رہی سی جدوں میں پہلی وار گرودت دی فلم ''پیاسا'' دا کم کیتا سی۔ میرے کم نال گرودت بہت خش سی تے اوہ مینوں آپنی فلم کمپنی وچ بطور آرٹسٹ بلاونا چاہ رہیا سی۔ گرودت نال کم کرنا میں وی چاہندا ساں، صرف میری آکھی تنخاہ تے نال بمبئی وچ رہن دی تھاں نوں سوچدیاں گرودت دی کمپنی نے کجھ چر لا دتا۔ اوس دن جدوں گرودت دا خط آیا تاں میں چنگے کم کر سکن دے موقعے نال بھریا، امرتا نوں ملن گیا۔ امرتا خط پڑھ کے خش وی ہوئی تے اداس وی۔ خش ایس لئی کہ مینوں چنگیاں فلماں بناون والے نال چنگے کم دی قدر کرن والے نال کم کرن دا موقع مل رہیا سی، تے اداس ایس لئی کہ میں

بمبئی چلا جاواں گا۔ شمع والیاں نوں میں استعفا دے دتا۔ بمبئی جان دی سیٹ بک کر لئی۔ اجے میرے بمبئی جان وچ تن دن سن، امرتا نے ایہ ے تن دن منگ لئے۔ کہ ایہ تن دن میں ہور کجھ نہ کراں، سارا وقت اوس دے نال رہواں۔ تے اسیں سبھ کجھ چھڈ کے، سبھ کجھ بھل کے، اوہ تن دن جنا وی ہو سکدا سی، اِک دُوجے دے نال رہے۔ پہلا دن اسیں دلی دیاں تواریخی تھاواں دے اندر باہر گھمدے رہے، جویں کوئی تواریخ لبھ رہے ہوئیے۔ ایہناں تن دناں دے پار دی تواریخ، دُوجا دن دلی دے باگاں بغیچیاں وچ اٹھدے بیٹھدے پُھلاں پتیاں تے رُکھاں نال گلاں کردے ٹردے اک باغ وچ اک رکھ دے کول آ کے رُک گئے۔ جویں کسے آپنے دے کول آ کے رُک جائی دا ہے۔ ایہ اک پیلے پھلاں نال بھریا اِملتاس دا رکھ سی۔ تے تیجا دن سارا ای اساں اوس رُکھ دے پُھلاں دی چھاویں گزاریا اسیں کدے بول کے گلاں کردے، کدے چپ رہ کے۔ ساڈے چارے پاسے پیلے پُھل ای پُھل سن۔ تھلے زمین پھلاں دی تے اُپر اسمان وی پھلاں دا۔ ایہ تیجا دن اساں کدے بہت کجھ سوچ کے، تے کدے کجھ نہ سوچ کے جیویا۔

میں تناں دناں دے بعد بمبئی گیا سی۔ مینوں اوتھے جا کے وی ایہو ای لگا سی، جویں میں اجے وی اوہناں تناں دناں وچ جی رہیا ہاں۔ پر اکلا جی رہیا ہاں۔ میں کجھ دِناں بعد ای واپس آپنی 'دلی' آ گیا۔ اودوں دا مینوں انج لگ رہیا ہے، جویں اوہ تن دن اجے وی چل رہے ہن۔ تے اوہ پیلے پھلاں دا رُکھ ہن ساڈے گھر دے پچھلے ویڑھے وچ آ گیا ہے۔ میرے کمرے دی وڈی کھڑکی دے ساہمنے۔ میرے کمرے دی ایہ کھڑکی کمرے دی پوری چوڑائی جڈی ہے۔ میں ایس رُکھ دے سارے رنگ، سارا سال ویکھدا رہندا ہاں۔ آپنی کم کرن والی میز تے کم کردا وی، تے آپنے پلنگھ تے لیٹیاں ہویاں وی۔ پر جدوں ایس رُکھ اُتے پیلے پُھل آوندے ہن ساڈا سارا ویڑھا پھلاں نال بھر جاندا ہے تے ایہناں پُھلاں دا سارا رنگ میرا ماحول وی بن جاندا ہے تے میری کرت وی۔

ایہ امرتا نوں ملن توں پہلاں دی گل ہے۔ دلی وچ میں آپنے اک مسلمان دوست دی شادی تے گیا ساں۔ نکاح دی رسم ہون توں بعد اوتھے ساریاں نوں چھوہارے ونڈے گئے۔ میں وی اِک لے لیا، پر کھادا نہیں۔ ساڈے پنڈاں وچ مُنڈے نوں منگنی ویلے چھوہارا مونہہ لائی دا ہے۔ میں ایسے خیال نال اوہ چھوہارا اوس دن گھر لیا کے آپنی الماری وچ سانبھ کے رکھ دِتا سی۔ تے فیر 31 اگست 1957 دا دن سی، امرتا دا جنم دن۔ میں اوس چھوہارے نال امرتا دا جنم دن منایا۔ چھوہارا اِک دُوجے نوں مونہہ لوایا۔ (ایس چھوہارے دی گٹک امرتا نے ململ دی ڈبی وچ سانبھ کے پچھلے بائیاں ورھیاں توں آپنی الماری وچ رکھی ہوئی ہے)۔

سانوں ملیاں تے ملدیاں نوں دو سال ہو گئے سن جدوں 1958 دیاں شروع سردیاں وچ میں تے امرتا پہلی وار اندریٹے گئے سی۔ چاچا جی کول (امرتا سوبھا سنگھ جی نوں چھوٹے ہوندیاں توں چاچا جی بلاندی ہے) چاچی جی (سوبھا سنگھ جی دی پتنی) نوں ساڈے ساریاں دی روٹی پکاندیاں ویکھ کے میں امرتا نوں چاچی جی دا ہتھ وٹاؤن لئی آکھیا۔ چاچی جی مندے نہیں سن، پر اساں اینا کو منا لیا کہ اک ویلے دی روٹی امرتا پکائے گی۔ امرتا آپنے گھر اودوں روٹی آپ نہیں پکاندی سی۔ مینوں کہن لگی 'میں روٹی پکاواں گی جو توں اگ بالیں۔' اسیں اودوں چاچا جی دے کول دس دن رہے ساں۔ میں لکڑاں دی اگ بالدا تے امرتا شام دی روٹی پکاندی۔ اودوں دی امرتا روٹی آپ بناؤندی ہے۔ میں وی اودوں دا، جدوں امرتا روٹی پکاؤندی ہے، اوس دے کول رسوئی وچ ہوندا ہاں۔ ہن روٹی تاں اسیں گیس تے بناؤندے ہاں، پر اوس اندریٹے والی لکڑاں دی اگ دا چانن تے سیک روٹی پکاؤندی ہر روز امرتا دے مونہہ تے مینوں دوویں ویلے دسدے ہن۔ اگ دے چانن دے کئی رنگ۔۔۔۔

ایہ اودوں دی گل ہے جدوں امرتا روز شام نوں دلی ریڈیو دا پنجابی پروگرام پیش کردی ہوندی سی۔ پروگرام دے بعد دفتر دی گڈی وچ امرتا واپس گھر جاندی سی۔ اسیں روز شام نوں ملدے ہوندے سی۔ امرتا بس توں جتھے آ کے اُتردی، میں اوتھے

اوس نوں اُڈیکدا ہوندا۔ تے جدوں پروگرام دا وقت ہو جاندا اسیں ریڈیو سٹیشن آ جاندے۔ اوس شام پروگرام دے بعد امرتا کہن لگی ''دفتر دی گڈی دی بہت دیر اڈیک کرنی پوے گی، چل پیدل چلدے ہاں'' تے اسیں پٹیل نگر پیدل ٹر پئے۔۔۔۔۔ اک دُوجے دے نال ٹردیاں پتا ای نہیں کدوں پٹیل نگر آ گیا۔ امرتا دے نوکر نے روٹی بنا کے رکھی ہوئی سی۔ امرتا نے مینوں وی روٹی کھان لئی آکھیا۔ میں پہلی وار امرتا دے نال روٹی کھا رہیا ساں۔ نوکر نے صرف امرتا لئی روٹی پکا کے رکھی ہوئی سی، صرف دو روٹیاں۔ تے اسیں دو جنے کھا رہے ساں۔ امرتا نے پہلاں آپنی روٹی وچوں، اک روٹی میری پلیٹ وچ رکھی تے فیر تھوڑی دیر بعد اکھ بچا کے آپنی ادھی روٹی توڑ کے میری پلیٹ وچ رکھ دتی۔ اوہ ادھی روٹی اج وی میرے نال ہے، تے اوس ادھی روٹی دا رشتا وی۔ میں روایتی ارتھاں وچ ویاہ نہیں کیتا۔ ہاں ساتھ کیتا ہے۔ انج میں تے امرتا جدوں کوئی وی کم رل کے کردے ہاں، مینوں آپنیاں لاواں ای لگدیاں ہن۔ 'ناگمنی' دے کم توں لے کے بھلاں بوٹیاں نوں پانی دین تک۔ ہو سکدا ہے، ویاہ اک وار چوہاں یاں ستاں لاواں نال مکمل ہو جاندا ہووے، پر ساتھ نہیں۔ ساتھ نت نویں سورج نال نویاں لاواں لیندا ہے۔ چار پہر لاواں بن جاندے ہن۔۔۔۔

میں تے امرتا نے 1957 وچ جہڑے تن دن اپنی تقدیر توں لئے سن، اوہی ساڈے تن کال بن گئے ہن۔ اِک بیت گیا کل، اک اج، تے اک آؤن والا کل۔

(لپی انتر : جمیل احمد پال)

امروز

ڈھپ رنگی

جناچر سورج اسمان تے رہندا ہے، امرتا وی آپنے آپ دی سکھر تے رہندی ہے۔ نڈر، خدمختار تے بے فکر۔ دن دے نکے تے دنیا دے وڈے توں وڈے دھماکے توں بلکل بے پرواہ۔ دن دا بہتا حصا اوہ صرف آپنے آپ نال رہنا چاہندی ہے، رہندی ہے، لکھدی ہے، پڑھدی ہے یاں سوچدی ہے۔

پر رات دا انھیرا اُڑدیاں۔۔۔۔ اوہ آپنے آپ وچوں جویں اُتر جاندی ہے۔ اک عام عورت وانگ کمزور، ڈرپوک، نراس تے محتاج۔ سبھ کاسے توں فکرمند۔ نکے توں نکے کھڑاک نال ڈر ڈر جاندی سہم سہم جاندی ہے۔ سویرے اُٹھدیاں اوس دا مونہہ بُجھیا بُجھیا، تھکیا تھکیا ہوندا ہے۔ جویں اوہ ساری رات انھیرے دی اک لمی گپھا نوں ٹر کے لنگھ کے آئی ہووے تے، اوہ وی اکلی۔ پر دن چڑھدیاں ای اوس دی کایا پلٹ آوندی ہے۔ جیوں جیوں سورج چڑھدا ہے، تیوں تیوں اوس دا مونہہ چمکدا ہوندا جاندا ہے۔ ڈھپ رنگا۔ سویر دے چانن وچ اوہدی خُدمختاری دا ایہ حال ہے کہ سویرے دی پہلی گھنٹی کھڑکان والا وچارا اوس دے غصے دا شکار ہو جاندا ہے۔ اوس دے من دی اکانت وچ ایہ دنیا دا پہلا کھڑاک ہوندا ہے، پہلی دخل اندازی۔ بھاویں اوہ دخل اندازی اوہدے آپنے آرام لئی ہوندی ہے۔ کمریاں دی تے برتناں دی صفائی، پر ایس صفائی لئی گھٹو گھٹ اک گھنٹا چاہیدا ہوندا ہے تے ایہ اک گھنٹا اوہدا بڑا بے چین گھنٹا ہوندا ہے۔ اتوں جے دھوبی آ جاوے تاں آئی سمجھیا دی شامت۔ جہدی خاطر کپڑے پانے پیندے ہن تے فیر دھوانے پیندے ہن۔ اوہ جاندیاں دے کھڑاک توں وی کالھی پے کے آکھدی ہے۔ اسیں صرف پھل نہیں کھا سکدے؟ نہ روٹی کھائیے، نہ بھانڈے

ہُوٹھے ہون۔ اوس ویلے اوس نوں سروس دین والیاں دی سلام اک لعنت لگدی ہے (اج کل جو ساندر کم کردا ہے، اوس نوں بار بار ہتھ جوڑن دی عادت ہے۔ اوہ کئی وار اوس نوں سمجھا چکی ہے کہ انج ہتھ نہ جوڑیا کر) شاید ایہ وی اوہدی خُدمختاری دا تقاضا ہے کہ اوہ نہ کسے اگے آپ ہتھ جوڑ سکدی ہے، نہ کسے کولوں ہتھ جوڑے سہار سکدی ہے۔

سادگی دا ایہ عالم ہے کہ نہ نہاوٴن دی پرواہ، نہ میک اپ دی، نہ کپڑے وٹاوٴن دی۔ تے نہ ای نویں نویں کپڑے خریدن دی چاہ۔ کوئی اک قمیض جے اوس نوں پسند آ گئی تاں سمجھو اوس دی خیر نہیں۔ اوہ بار بار اوسے نوں پائی جاوے گی۔ گنڈھ گنڈھ کے پاوٴن دی حد تک۔ کئی وار اوہ کسے پارٹی تے صرف ایس لئی نہیں جاندی کہ اٹھ کے کپڑے بدلنے پین گے۔

اک عجیب فقر طبیعت۔ روٹی بھاویں سجری ہووے بھاویں بہی، نال بھاویں صرف انب دا اچار ہووے، تے اک پیالا چاہ دا۔ اندازا ہوندا ہے، جویں اک فقیری اوہدی رگاں وچ ہے۔ پر کدے کدے اوس دی طبیعت دی بادشاہت مچل اُٹھدی ہے۔ اک دن اسیں سڑک دے کنڈھے بیٹھے اک ڈھابے تے چاہ پی رہے ساں، چاہ پیندیاں پیندیاں اک خوبصورت مکان اوس دی نظر پے گیا۔ اک دم مینوں آکھیا، تقریبن حکم وانگ، جا کے ایس مکان دی قیمت پتا کر کے لیا۔۔۔۔ میں ''بہت اچھا ملکہ معظمہ، ہنے دریافت کر کے آیا'' کہہ کے مکان دی قیمت پتا کرن ٹر پیا۔۔۔۔ انج اوس نے کئی وار کیتا ہے، کردی ہے تے کردی رہے گی، جد تک اوہ ہے اتے جد تک خوبصورت مکان ہن۔ اوہ کدے سونے دی اک مندری وی نہیں پاندی (سونے دیاں پتلیاں پتلیاں والیاں دی کناں وچ پائے، تاں مساں ادھا گھنٹا سہار سکدی ہے، اوس نوں سچ مچ سر پیڑ ہون لگ پیندی ہے) میں ایس شاہی فقیرنی دا بھیت پا لیا ہے۔ ہیرے موتی، نیلم، پکھراج اوس دا خبط ہن جد کدے، وی کناٹ پلیس وچ ہیریاں دی دکان ساہمنے آوندی ہے، اوس دی ایہ بادشاہی طبیعت اوس نوں ملوملی اندر لے جاندی

ہے۔ ہیرے موتی، نیلم، پکھراج تے ہر طرحاں دے قیمتی پتھر' ویکھدی ہے تے ویکھی جاندی ہے۔ اوس ویلے کوئی ویکھے اوس دا جگمگا رہیا مونہہ ہیریاں نالوں وی زیادا۔ انج اوس خریدیا کدے کجھ نہیں۔ اوس نوں پتا ہے کہ ایہ زیور، ایہ جواہرات اوہدے لئی نہیں بنے، نہ اوہ زیوراں، ایہناں جواہرات لئی بنی ہے۔ جے کدے کوئی زیور پا لوے تاں شیشے وچ آپنے آپ نوں ویکھ کے غصے ہو جاندی ہے۔ ''ایہ تاں میں، میں ای نہیں رہی'' تے اوس ویلے سبھ کجھ لاہ دیندی ہے۔ اپنی شکل اوہنوں آپ ای پچھانی ہوئی نہیں لگدی۔ کدی گھڑی پاندی ہوندی سی، وقت ویکھنا ہوندا سی۔ ہن میں نال ہوندا ہاں، اوہ گھڑی وی نہیں پاندی، وقت میرے کولوں پچھ لیندی ہے۔

تصور نال مالا مال ایس شاعرا کول جے سچ مچ پیسا ہوندا تاں پتا نہیں ہن کنے خوبصورت مکان تے کنے ہیرے جواہرات اوس دی ملکیت ہوندے۔

خوبصورتی ویکھ کے اوہ انج مچلدی ہے، جویں بھکھ، غریبی، بے بسی، انیاں، جبر تے جہالت ویکھ کے اوہ بے چین ہو اٹھدی ہے، اداس ہو جاندی ہے۔

ایہ فقیرنی نازک مزاج وی بڑی ہے تے پوزیسو وی۔ ایس دے مکان وچ کوئی کدھرے ،کل نہیں گڈ سکدا۔ جے کوئی کدے کدھرے کل گڈ رہیا ہووے تاں ایہ سہار نہیں سکدی، زخمی شیرنی وانگ اوس نوں پیندی ہے۔ جویں اوہ ،کل اوس دے اپنے جسم تے لگا رہیا ہووے۔ ،کل لاؤن والا کوئی وی ہووے، بھاویں میں تے بھاویں کرائے دار۔ سبھ توں اوکھا ایس مالکن توں میں ہاں۔ کیوں کہ مینوں آپنے کمرے وچ تجربے کردے رہن دا کریز ہے۔ کندھ توڑن توں لے کے کھڑکی بدلن تک۔ تے مینوں اکثر بڑا صبر تے انتظار کرنا پیندا ہے۔ ایس مالکن دے دیسوں کدھرے باہر جان دا۔ ایس مالکن، ایس شیرنی دی ایستھیٹک سینس ای میرا بچاؤ ہے۔ واپس آ کے نوان تجربا ویکھ کے، چینج ویکھ کے، اوہ خُش ہوندی ہے۔ سلاہندی ہے، توڑ پھوڑ اوس نوں بھل جاندا ہے۔ گزر گئی گل وانگ، گزر گئے کل وانگ۔

امرتا دی ادھیوں بہتی عمر بسترے وچ گزری ہے۔ پر بسترے وچ اوہ سُتی بہت

گھٹ ہے۔جاگی بہتا ہے۔ بے شک اوہدے ناولاں تے کہانیاں دے سارے پاتراں توں پُچھ لوو، کیوں کہ اوہناں نوں وی اوہدے نال جاگنا پیا۔

جدوں امرتا دی قلم لکھ نہیں رہی ہوندی، اودوں اوس دے سجے ہتھ دی انگل آپنے آپ اکثر لکھ رہی ہوندی اے اک اکھر، اک ناں، شاید کسے دا ناں۔ شاید آپنا ای ناں۔ تے اوس دی انگل ایہ اکھر ایہ ناں، بار بار لکھدی چلی جاندی ہے۔ ہر کاسے اُتے، جو وی ساہمنے ہووے۔ پہنچ تک اپہنچ تک۔ آپنے گوڈے توں لے کے میرے موڈھے تک۔ آپنی چار دیواری توں لے کے ہر دیوار تک، ایس پیڑھی توں لے کے ہر پیڑھی تک۔ ایتھوں تک کہ پوناں پانیاں، پھلاں سگندھاں تک، اوہ ہر شے تے لکھدی محسوس ہوندی ہے۔ اوس آپ دسیا سی کہ چھوٹے ہوندیاں اوس نوں چن وچ پئے کالے پرچھاویں، اکھر جاپدے سن۔ خورے اودوں وی پرچھاویاں نوں اوہ آپنی انگل نال اک اکھر، اک ناں بنا لیندی سی۔ ضرور بنا لیندی ہووے گی، پر پتا نہیں ایہ اک اکھر، اک ناں، اپنے آپ وچ کہو جہی عبادت ہے یاں عبارت ہے جو ہن تک لکھدیاں وی مکمل نہیں ہوئی میں ورھیاں توں امرتا نوں ویکھ رہیا ہاں، ایہ لکھدیاں۔ امرتا پتا نہیں کدوں دی لکھ رہی ہے؟ ضرور آپنی ہوند توں ای لکھ رہی ہووے گی۔ نہیں تاں اوس دے ہتھاں دیاں انگلیاں نستبن کدے ایناں چھوٹیاں، ایناں گھسیاں نہ ہوندیاں۔

اوس دی طبیعت آپنے آپ وچ کنٹراسٹ ہے ۔ اک پاسے اوہ اینا صرفا کرے گی کہ رات دی بہی روٹی وی ضائع نہ ہووے، اوہ دوجیاں نوں سجری روٹی دے کے آپ بہی کھا لوے گی۔ پر دُوجے پاسے ایہ طبیعت کہ ایس جولائی وچ اوس دے پُتر نے جدوں آرکیٹیکٹ دی ڈگری لے لئی تاں اوہدا انعام اوس نے یورپ دا ٹور منگیا۔ اوس نے اوسے ویلے فون پھڑ کے اِیر انڈیا والیاں نوں آکھیا کہ یورپ دی واپسی ٹکٹ بنا کے بھیج دیو۔ بنا کسے سنکوچ اوہ آپنی ایس طبیعت نال جیوندی جاگدی ہے۔ بلکل دن تے رات وانگ، اِک دُوجے دے اُلٹ، پر ہمیشا نال نال۔

امرتا دا مونہہ بڑے رنگ بدلدا ہے۔ اسمان وانگ، سگوں اسمان نالوں وی زیادا تے چھیتی۔ کدے جگدا جگدا دسدا ہے تے کدے بجھیا بجھیا۔ کدے کولا کولا پگھلیا پگھلیا لگدا ہے تے کدے پتھر وانگ سخت تے بے رحم۔ کدے ہر اک نال ہسدا ہسدا تے کدے سبھ نال غیر تے اجنبی۔ اِک گھڑی بھریا بھریا چھلکدا چھلکدا جام لگے گا تے دُوجی گھڑی خالی خالی، ویران ویران، ایتھوں تک کہ ہنے اوس دا مونہہ بہار دا بھرپور نظارا ہوندا ہے، رنگاں سگندھاں دی دُمیل تے ہُنے پت جھڑ وانگ بے رنگ تے بے مہک ہو جائے گا۔ اک عجیب و غریب مونہہ ہے جویں اِکو سِکے دے کئی ہِدھ پُٹھ ہون۔ جویں اک مونہہ وچ کنے ای مونہہ ہون۔ آپنے اٹھاں پہراں وچ کنے ای دن تے کنیاں ای راتاں لئی۔

امرتا دا مونہہ جنا حسین ہے، خوبصورت ہے، اونا ای مشکل ہے۔ سگوں مشکل بہتا ہے اوس دے مونہہ اُتے پربھاو اینی چھیتی چھیتی بدلدے ہن کہ ایس مونہہ نوں کسے فارم وچ ریکارڈ کرنا تے اوہ دی مکمل ریکارڈ کرنا بڑا ای کٹھن کم ہے۔ اوس دیاں تصویراں، سکیچ تے فوٹوز اکثر بڑیاں ای ہارڈ تے بڑیاں ای غیر امرتا ہوندیاں ہن۔ امرتا خُد وی اوہناں نوں ویکھ کے تربھک جاندی ہے تے اوس دے موہوں نکل جاندا ہے۔ ''اِٹ اِز ہوریبل۔ اِٹ اِز ناٹ می۔۔۔۔''

میں بڑے مونہہ ویکھے ہن۔ اُلیکے ہن۔ مینوں کدے کسے دا مونہہ اینا دلچسپ تے اینا اوکھا نہیں لگا۔ مینوں کدے کسے دا چہرا بناؤندیاں آپنے آپ نال گھلنا نہیں پیا۔ پر امرتا دا چہرا توبا توبا۔ پتا نہیں کس ہونی نے ایہ مونہہ سوچیا تے گھڑیا ہے۔ جنے ایس دے نین نقش تراشے ہوئے ہن، اونے ای ایہ مشکل ہن۔ کرت وچ پکڑنے سگوں چیلنجنگ ہن۔ میں چودھاں سالاں توں ایس مونہہ نوں حیرت نال ویکھی جا رہیا ہاں۔ کدے دوروں کھلو کے، کدے اصلوں نیڑے ہو کے۔

اک دن اسیں پالم توں آ رہے ساں۔ رستے وچ اِئر فورس دی اک نویں بلڈنگ آئی تاں میں امرتا نوں آکھیا۔ ''تینوں یاد ہے، شاعرا، ایتھے اک خالی میدان سی،

جتھے توں کار سکھنی شروع کیتی سی۔۔۔۔۔" (پر اک سائیکل نال ٹکر لاؤن پچھوں اوس کار سکھنی چھڈ دتی سی) کجھ دیر تک امرتا سوچدی رہی۔ تے جدوں اوس نوں یاد آیا تاں اوس اک ہرکھ نال میرے ول تک کے آکھیا۔ "توں مینوں ایویں ای کار نہیں سکھن دتی۔"

میں آکھیا، "شاعرا، توں ساہت وچ ریڑھیاں، گڈیاں، سائیکلاں، سکوٹراں تے چھکڑے ٹرکاں دی بھیڑ توں اپنی گڈی نوں صحیح سلامت رکھی رکھ۔ ایہ ای آپنے آپ وچ بہت ہے۔ ایہ سڑکاں تے گڈے، سائیکل، سکوٹر تے ٹرک، توں میرے ذمے رہن دے۔۔۔۔"

امرتا نوں کسے اُتے اعتبار نہیں، نہ کسے اِزم اُتے۔ نہ کسے انسان اتے۔ میں جدوں وی کسے بندے دے لفظاں اتے اعتبار کرن لگدا ہاں، اوہ خطرے دی لال بتی وانگ میرے ول تکدی ہے۔ پر میں ہری جھنڈی نوں ہتھوں نہیں چھڈدا، اک بندے اتے اک واری اعتبار ضرور کردا ہاں۔ (انج افسوس نال آکھنا پیندا ہے کہ ہر وار اوہدی گل سچی ای نکلدی ہے تے میرا اعتبار تڑکدا ہے) پر میرے کولوں بہتا فطرتن تے کجھ ضد نال فیر اعتبار ہو جاندا ہے۔ میں آکھدا ہاں۔ میں اک بندے نوں اعتبار دا موقع ضرور دیاں گا۔ اوہ آکھدی ہے۔ "ہندوستان دی آبادی پنجاہ کروڑ ہے۔ سو پنجاہ کروڑ واری تینوں اعتبار کرنا پوے گا، لگا رہو دیہاڑی۔۔۔۔"

امرتا نوں صرف آپنے اُتے تے آپنے پاتراں اتے اعتبار ہے۔ کوئی پاتر جدوں کہانی توں باہر ہووے تاں اوہ اعتبار یوگ نہیں ہوندا۔ (بھانڈے منجوان پچھوں اوہ کولیاں، چمچے دی گنن لگ پیندی ہے) پر اوہی پاتر جدوں کہانی دے اندر آ جاوے تاں کسب دا مان رکھن والا بن جاندا ہے۔

"بس توں میرا اکلوتا دوست ایں۔۔۔۔' اوہ آکھدی ہے۔

"پر تینوں میرے اُتے اعتبار کس طرحاں آ گیا؟" میں پچھدا ہاں۔

"توں آپ ہی تاں کہیا سی کہ توں میرے 'ڈاکٹر دیو' ناول دا ڈاکٹر دیو ایں۔

انج کہانی میں پہلاں لکھی، تینوں ویکھیا پچھوں۔۔۔۔۔ اعتبار شکناں دی بھیڑ وچ تینوں ویکھ لیا، ایہ تھوڑا اے؟۔۔۔۔۔'' تے اوہ فیض دا شعر پڑھن لگ پیندی ہے۔

''کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم،

گلا ہے جو بھی کسی سے، ترے سبب سے ہے۔۔۔۔۔''

تے میں دنیا وچ جتھے کدھرے جو وی غلط ہوندا ہے، اوس دا جواب دہ بن جاندا ہاں۔ اوہ بھاویں اخبار دی ایہ گھٹنا ہووے کہ راتیں بس وچ اکلی سواری اک عورت، کنڈکٹر تے ڈرائیور نے زبردستی کرنی چاہی تاں اوہنے چلدی بس وچوں چھال مار دتی۔ تے بھاویں چین دی کوئی چلاکی ہووے، روس دی کوئی دھکے شاہی ہووے، امریکا دی کوئی تاناشاہی ہووے تے پاکستان دا کوئی جھوٹھ ہووے۔ اوہنوں میرے تے غصا چڑھ جاندا ہے۔۔۔۔

''اک فلاسفر دا کہنا ہے۔ اِٹ اِز چیٹنگ ٹو ٹرائی ٹو بی کائینڈ یو مسٹ بی بورن کائینڈ آر نیور میڈل وِد اِٹ۔۔۔۔''

اوہ بارن آئیڈیلسٹ ہے۔ موہوں بھر ہو کے کجھ وی آکھے، پر اوہدی رگ رگ وچ آئیڈیلزم ہے۔ کوئی وی اعتبار شکن اوہدے دھر اندرلے اعتبار نوں توڑ نہیں سکیا۔ اوہ باہروں لال بتی وانگوں بل پیندی ہے، پر اندروں کدھروں ہرے رنگ وانگ ہری تے شانت رہندی ہے۔ تے جدوں وقت آوے، اوہ فیر زندگی اتے اعتبار کر لیندی ہے۔ بھاویں پچھوں اوس نوں آپنے اعتبار دا مرثیا لکھنا پیندا ہے (جویں اوہدیاں کہانیاں، مونالیزا نمبر دو، دو عورتاں، نمبر پنج، کرماں والی، کیلے دا چھلکا، چانن دا ہوکا۔ تے ٹوسٹ، جنم جلی، سال مبارک، تے ہور کئی نظماں)۔ پر دنیا نال اوہدی آپنت دا ایہ عالم ہے کہ اوہدے کسے سمکالی نے یاں کسے اصلوں نویں شاعر نے جے کوئی نظم لکھی ہووے، اوہ اوس نظم دیاں سطراں گنگناؤندی رہندی ہے تے ہر ملن آئے نوں سناندی ہے۔ جویں اوہدے کسے بڑے عزیز نے ادبی دنیا وچ کوئی پراپتی کیتی ہووے۔ اوس گھڑی اوہ بھل جاندی ہے کہ سمکالی اوہدے لئی کنے سنگ دل تنگ دل

ہن۔۔۔۔ سمکالیاں دے وطیرے انھیرے راہ ورگے ہن، پر اوہناں دی جے کوئی
کرت اوہنوں چنگی لگدی ہے تاں اوہدے لئی ڈھپ چڑھ جاندی ہے تے اوس دی
صفت کردی کردی ایہ آپ ڈھپ رنگی ہو جاندی ہے۔۔۔۔

(لپی انتر : جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

پینٹنگ: وسیم خورشید
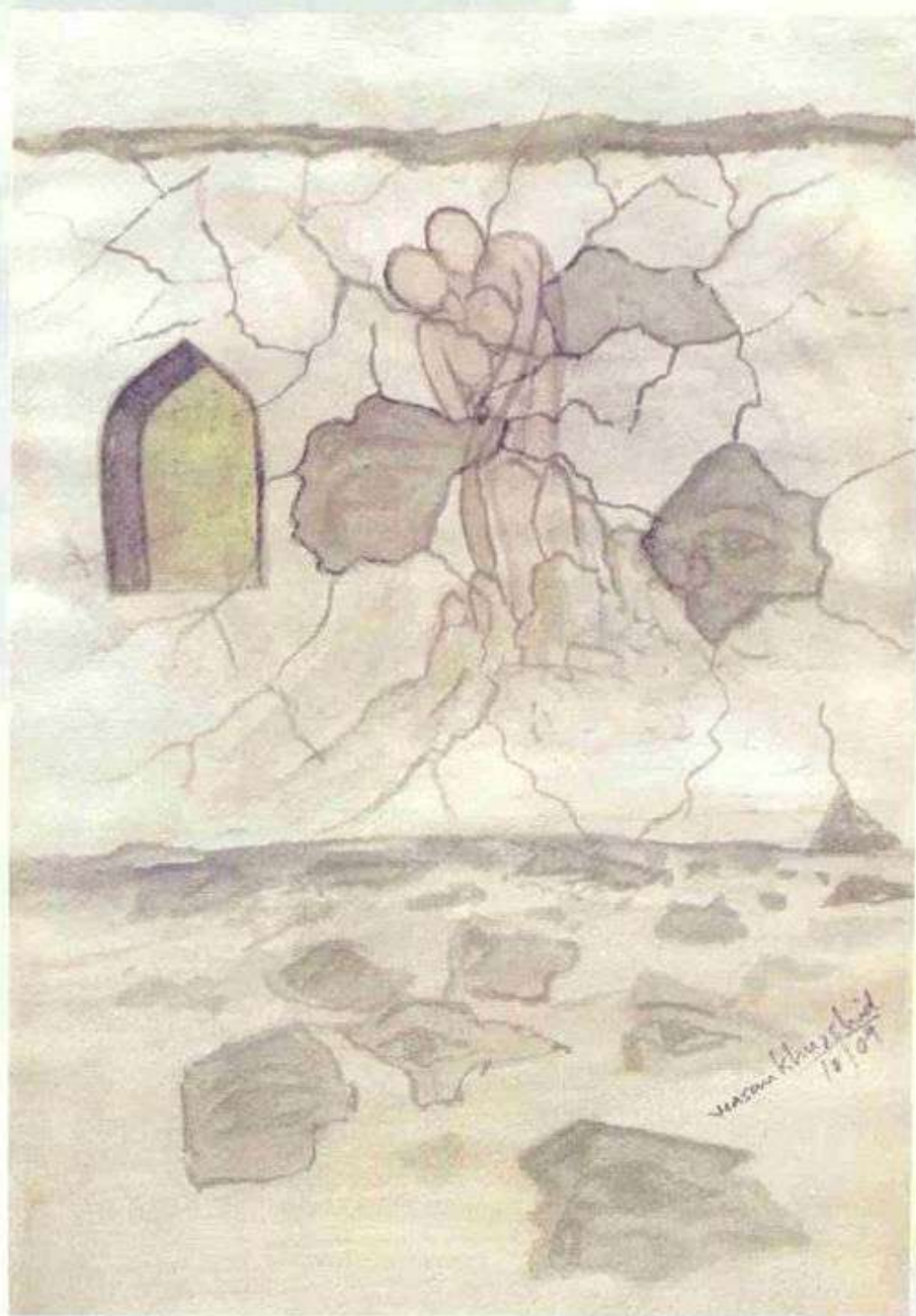
کتابِ عشق
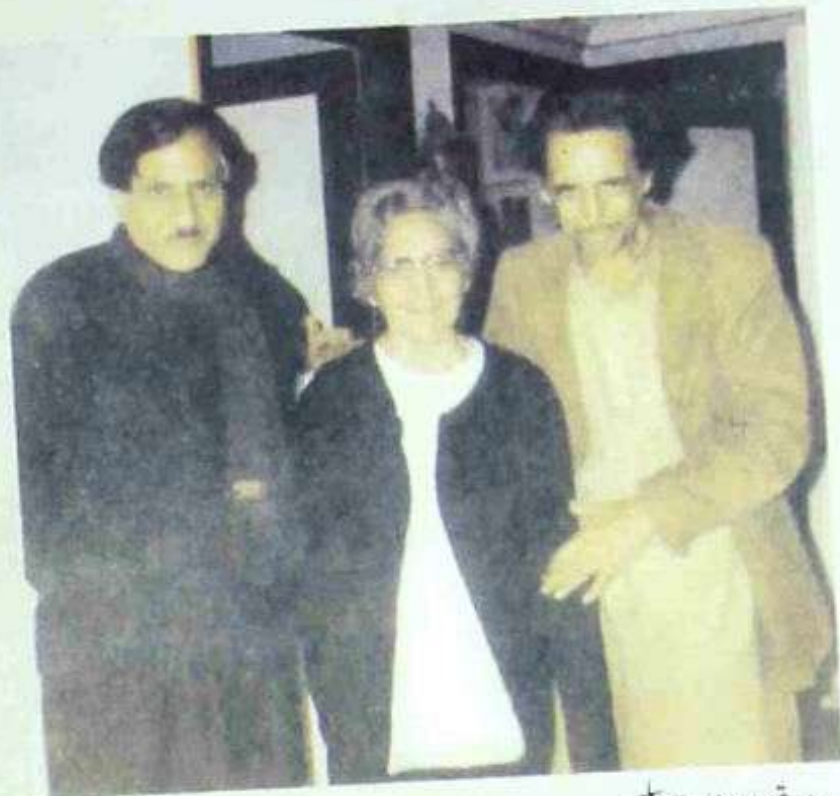
امرتا پریتم، امروز اور احمد سلیم

امرتا پریتم، شکیلہ جمال، تحسین جمال اور یاسمین جمال

امرتا پریتم

گورمکھی سے ترجمہ وانتخاب: احمد سلیم

میں جمع تُو

(امرتا پریتم کی یہ کتاب 1977 میں شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے ساحر اور امروز کے حوالے سے لکھی جانے والی نظموں کی نشاندہی کی۔ میں نے ساحر والے حصے کو پنجابی سے ترجمہ کیا ہے۔ امرتا اور ساحر کے حوالے سے کئی سچی جھوٹی داستانیں مشہور ہیں۔ یہ صفحات ساحر سے امرتا کے عشق اور اس درد میں لکھی ہوئی نظموں کا انتخاب ہیں۔)

ہم سب اپنے اپنے 'میں' کا ایک ٹکڑا جیتے ہیں اور برسوں تک جو بھی سوچتے ہیں' سمجھتے ہیں اور قدروں' قیمتوں کو اپناتے ہیں وہ پورے 'میں' کی تلاش ہوتی ہے۔۔۔۔

ہمیں علم بھی وسیع کرتا ہے اور محبت کا جذبہ بھی۔ علم 'میں' کی پہچان دیتا ہے اور محبت کا جذبہ 'تُو' کی۔ یعنی اس دوسرے کی جسے ہم پیار کرتے ہیں۔

کوئی تُو 'میں' کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ 'تُو' 'میں' کی وسعت ہے اس کا پھیلاؤ۔ 'میں' کا اپنے آپ میں پھلنا پھولنا بھی وہ عمل ہوتا ہے جس کے ایک ایک حصے میں پھلنے پھولنے کا درد شامل ہوتا ہے۔ یہ 'میں' کا اپنے سے آگے زیادہ بڑی 'میں' تک پہنچنے کا سفر ہے۔ لیکن اس سے بھی آگے جو 'میں' سے 'تُو' تک کا سفر ہے وہ ''میں میں سے میں کی پہچان'' کے بعد ''تُو میں سے میں کی پہچان'' ہے۔

سادہ لفظوں میں محبت کو اپنے آپ کی تکمیل کہا جا سکتا ہے۔ یہ تکمیل خامیوں یا کسی کمی کی تکمیل کے معنوں میں نہیں ہوتی' یہ وسعت کے معنوں میں ہوتی ہے۔۔۔ جہاں ایک انسان صرف اپنی صفات کو سمجھنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا' وہ دوسرے کی خوبصورتی کو' دوسرے کی اچھائی کو اور دوسرے کی خوشی کو بھی اپنے وجود کا حصہ بنا کر

سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

یہ گویا ایک قدرت سے دوسری قدرت تک پہنچنے کا سفر ہے یہ دونوں سفر'میں سے آگے میں تک کا' اور 'میں سے آگے تُو تک کا' وہ سفر ہیں جن کا بیان دنیا کا ادب بنتا ہے۔

دونوں مشکل راستے ہیں لیکن ان پر پاؤں والوں کو چلنا ہوتا ہے۔ یہ ''پاؤں والے'' وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں 'میں' کا بھی عشق ہوتا ہے 'تُو' کا بھی۔ اور یہ عشق اکثر کو نہیں ہوتا۔

دنیا کی سیاسی اور سماجی ساخت ''ان اکثر'' لوگوں کے بس میں ہے جنہیں یہ عشق نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے آپ میں ایک تضاد ہوتا ہے ان کا جنہیں یہ عشق ہوتا ہے اور اسی لیے ان راستوں کی مشکل کئی طرح کی مشکل ہے۔

عشق دا بوٹا جتھے اُگدا۔۔۔

میلاں دے وچ آوندی رہندی

برہا دی خوشبو۔۔۔

یہ عمل عشق کے پودے کا اپنے آپ میں معکوس عمل نہیں بلکہ یہ معنوں کو الٹانے والی سماجی ساخت کا عمل ہے۔ یہ عمل ہر'میں' کو تراشتا ہے۔ ہر'تُو' کو توڑتا ہے اور پھر عشق کے پودے میں سے مہکتے من کی یا دل کی عام خوشبو نہیں بلکہ برہا کی خوشبو آنے لگتی ہے۔۔۔

یہاں اپنی کچھ وہ نظمیں دے رہی ہوں جن میں ایک طرف پھلنے پھولنے کا سہاوک درد ہے اور دوسری طرف مشکل راستے کا

مشکل راستے کا درد اگر چہ آج پھلنے پھولنے کے درد جیسا سہاوک درد محسوس ہوتا ہے لیکن میں چاہتی ہوں کبھی وہ وقت آئے جب ہم سب اسے سہاوک کہہ سکیں۔۔۔

مشکل راستہ پھلنے پھولنے کا قدرتی عمل نہیں یہ انسان کی طرف سے انسان کو سزا کے طور پر دیا ہوا راستہ ہے اور وہ وقت جب ہم اس کے شراپ کو سہاوک کہہ سکیں بہت اچھی سماجی ساخت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ ساخت آج سے کہیں بہتر انسانوں کی اکثریت کے بغیر ممکن نہیں۔

امروز کے لفظوں میں ''اگر کوئی امرتا کی تمام تخلیقات' نظمیں' کہانیاں' ناول اکٹھے ترتیب وار سامنے رکھ کر پڑھے تو وہ امرتا کی پوری زندگی کو جان سکتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو اس کی بنیاد پر اس کی سوانح لکھ سکتا ہے'' اور

میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں اسی لیے میں نے ''رسیدی ٹکٹ'' کے شروع میں لکھا تھا جو کچھ پیش آیا وہ سب کا سب نظموں اور ناولوں کے حوالے ہوگیا پھر باقی کیا بچا۔ اس کے باوجود کچھ سطریں لکھ رہی ہوں اس طرح جس طرح زندگی کے حساب کتاب کے کاغذوں پر ایک چھوٹا سا رسیدی ٹکٹ لگا رہی ہوں۔ نظموں اور ناولوں کے حساب کتاب کی کچی رسید کو پکی رسید بنانے کے لیے''

''رسیدی ٹکٹ'' میرے من کی تاریخ ہے' میری تخلیقات کا پس منظر' میری تخلیق کی جنم بھومی۔ لیکن اگر میں اس میں ترتیب سے ان تخلیقات کے زمانے کو بھی جوڑنے لگتی ان تخلیقات سمیت تو مجھ میں انہیں شائع کرنے کی طاقت نہ ہوتی۔ اب بھی ناولوں کو اور کہانیوں کو ایک طرف رکھ کے صرف نظموں کو سامنے رکھا ہے اور وہ بھی صرف ان نظموں کو جن کا تعلق میری نجی زندگی سے ہے حالانکہ لوگوں کے درد کو میں اپنے درد کا ہی حصہ مانتی ہوں۔۔ میرے مفہوم میں تمام لوگ میرے وجود کی وسعت ہیں۔ لیکن یہاں میں ''نجی زندگی'' کے لفظ کو بڑے محدود معنوں میں' اکہرے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے صرف ان نظموں کا انتخاب کر رہی ہوں جو کسی خاص شخص کی' یعنی 'تُو' کی میری زندگی میں آمد سے متعلق ہیں۔

میری زندگی میں پہلی آمد خلا کی تھی جس میں جو کچھ چاہ لیا' جو کچھ تصور کر لیا وہی سوچ گھڑی بھر کے لیے من کی حالت ہوگئی۔ یہ ایک حقیقت کا ایک تصور کے گلے لگ کے باتیں کرنے کا وقت تھا۔ اس عہد کی کچھ نظمیں ہیں:

چپا چن

چپا چن تے مُٹھ کو تارے' ساڈا مل بیٹھے اسمان
ساڈیاں بھکھاں رہیناں وڈیاں' پر او راتا! تیرے دان
مُٹھ کو تارے ترونک کے
تے چپا کو چن سُٹ کے صبر ساڈا از مان
سُٹ دین کجھ رشماں' ڈیگ دین کجھ لوواں
پر ولکن پئے دھرتی دے انگ' ایہ انگ نہ اوہناں نوں لان
اوہ وی ویلے آن
اک دو راتاں' ہتھ تیرے رتا سکھی ہو جان

کُجھ کھلے ہتھیں دین ایس نور دا دان

فیر سنگ جان

چپا چن وی کھو ہن' دان دے کے گھبران

کدے پربت اوہلے کرن' کدے بدلاں ہیٹھ چھپان

فیر سُنجیاں راتاں 'سکھنے پلے' خالی سبھ اسمان

پر بُھکھ ولکدے بُلھ ساڈے فیر وی آکھی جان

تیرے سنگدے سنگدے دان' ساڈا اسّھنو کجھ سر چان

ساڈی ترشنا نوں ترپتان' بھال ساڈی سستان

تیرے ہتھ دے اک دو بھورے 'بھکھ ساڈی ورچان

چپا چن ۔۔۔ تے مُٹھ کو تارے

ساڈا مُل بیٹھے اسمان

دیوتا

توں پتھر دا دیوتا ٹھنڈے مگر بھاو تیرے نہ اجے تیکر گرمان

جُگاں جُگاں دی نیند رُستے اجے تیک وی جذبے تیری جاگن وچ نہ آن

بال بال کے حُسن آپنے لکھ سُندریاں آن

تیرے سولے جڑھ انگاں تے چیپن انگ نوان

پیڈے پتھر چرناں اُتے 'لُوئیں لُوئیں پوٹے چھوہ کے

ماس دی گندھ وچ متے متھے پیراں تک جُھکان

رنگھے ساہ دیاں گرم ہواڑاں' پوجا دی سام گری وچوں

اُٹھدے لمبے دھوئیں' تیرے بھاو نہ اجے بھکھان

وڈاں ورگے قد اوہناں دے' نیوں نیوں لغدے جان

چنوں چٹیاں لکھ گوایاں' کالے بھورے نین اوہناں دے

تیرے سولے سولے بُت تے ردوم ردوم لپٹان
جیویں ملٹھی دی خوشبو تے ناگ لپٹدے جان
جُگاں جُگاں دی پُو جاپی کے، ہوٹھ تیرے ترہائے
لکھ جوانیاں سُک سُک گئیاں، نیلیاں پیاں بانہاں گوریاں
سکھنے ہو گئے جوگن پیالے، اجے وی تیرے بُلھ ترہائے بھر بھر پیندے جان
ہون کنڈ دی وست وانگن میں وی ہاں اک شے
ڈھکھدی ڈھکھدی بل جائے گی، بجھ جائے گی ایہہ سام گری
تے سام گری دا اِک بھاگ تیری پجارن میں وی۔۔۔
پوجا کردی پئی پجارن بھرے تھال وچ نکا جناں حصہ ہی تاں ہے
ہون کنڈ دی وست وانگن میں وی ہاں اِک شے
کنیاں کوتلیاں دی چھوہ تیرے پیراں اُتے جمی؟
کنے کوہوٹھاں دے رَس تیرے چرناں اُتے سُکے؟
ہارے سجن اسیں ہارے
پتھر دے جھوٹھے پیراں نوں میرے پوجن بھاو کنوارے
[تو پتھر کا دیوتا۔۔۔
کتنی ہتھیلیوں کا لمس تیرے پیروں پر جما ہے
کتنے ہونٹوں کے رس تیرے چرنوں میں سُوکھ گئے ہیں
ہارے، ساجن ہم ہارے
پتھر کے جھوٹے پیروں کو میرے کنوارے جذبے پُوج رہے ہیں]

کنڈھیا وے!

کنڈھیا وے! کھلی گلوکڑی اسناں! براں زچ جانا
پوناں دے پیراں وچ چکر بھالن کیوں نکانا

راہ موکلے، رشتے بھیڑے ہُسڑ یا ہُسڑ یا جی
رس اُکتائیاں بُلھیاں نے کوئی کوڑا اپن منہ لانا
نِگھ نندرائیاں نیناں دی کوئی روک سکے نہ جاگ
روپ تیرے دی لوری نے سانوں کدتھپک سُلانا
سُتھرے نیلے امبراں اُتے کدتک ٹنگیاں رہیے
اسیں تاں گنیاں، وس زمیں تے، ڈھوڑ ڈھوڑ ہو جانا
ممتا دی گود دی چوں تُرٹیاں ہُن بھالاں نہ کوئی چھاں
منہ گواچے ہوئے نہ لبھن، ڈھوڑ سے دی چھانا
نویں منہ دے نویں موہ وچ، انگ اُساندے جاندے
پر نویاں پٹیاں دی کس ہٹھیاں، رِسدا زخم پُرانا

[کَسی ہوئی نئی پٹیوں کے نیچے
پرانا زخم رِستا ہے------]

وچن

مُشکلاں دے چیراں نال لکیریاں ہتھاں دا وچن:
میری عمر توں دی لمی ہے میری وفا دی لکیر
تُسیں روز پچھدے ہو میری وفا دی عمر؟
بھرتھری دا امر پھل کجھ کہن دا محتاج ہے؟
عشق نوں عادت نہ پاؤ بولن دی
اجے تاں لوک کناں نوں سنن دی جاچ نہیں آئی
لفظاں دی دولت بناں وی وفا ہے امیر
میرے سواس تاں مہمان نیں میرے جسم دے جاسکدے نیں کدی وی

پرمٹ نیں سکدا' ایہہ سمیاں دی ہک تے جو پے چُکا ہے چیر
ہیر کسے لیلی دی نقل نہیں' نہ مجنوں کسے رانجھے دی ریس
عشق کدے تاریخ نوں دہراندا نہیں' ایہدا ہر صفحہ ہونداے بے نظیر
تلیاں نوں چھیک رہے نیں' پوٹیاں نوں وِنھ رہے نیں مُشکلاں دے تیر
پر وِنھیاں تلیاں دے کنڈھے آس اک انگڑائی لے رہی اے
کسے ارغوانی سویر دی قسم' جھناں دیاں لہراں نیں میری اخیر
مُشکلاں دے تیراں نال' لکیریاں ہتھاں دا وچن:
میری عمر توں وی لمبی ہے' میری وفا دی لکیر۔۔۔

[آپ ہر روز میری وفا کی عمر پوچھتے ہیں؟
عشق کو بولنے کی عادت مت ڈالیں
لفظوں کی دولت کے بغیر بھی وفا امیر ہے
ہیر کسی لیلیٰ کی نقل نہیں' نہ مجنوں کسی رانجھے کی ریس
عشق تاریخ کو کبھی نہیں دہراتا' اس کا ہر صفحہ بے نظیر ہوتا ہے
مشکلات کے تیر ہتھیلیوں کو چھلنی کر رہے ہیں' پوروں میں سوراخ ڈال رہے ہیں
لیکن چھلنی ہتھیلیوں کے کنارے آس اک انگڑائی لے رہی ہے
کسی ارغوانی صبح کی قسم! چناب کی لہریں میرا انجام نہیں ہیں
میری عمر سے بھی لمبی ہے میری وفا کی لکیر۔۔۔]

سنکار

تیرا عشق سنکاراں دا محتاج بن کے رہ گیا
سنکاراں دی ڈھوڑ بڑی گاڑھی جیہی ہوندی اے
میں ہور کجھ نیں اَکھدی:

ڈھوڑ دا جادو تیری اوس محبت تے پے گیا
عشق سنسکاراں دا محتاج بن کے رہ گیا
نزول اک محبت تاں جمی سی ضرور
سنسکاراں دے کنڈے بڑے تکھے جیہے ہُندے نیں
بن چکے نیں نالے تاریخی تعصب
محبت دا دامن اج کنڈیاں نال کھبہ گیا
اُلجھ کے رہ گیا
محبت دا رنگ سی قراراں دا غلام
لیند اسی تسلی میرے قولاں توں ہُد اری
مانگویں اڈاری۔۔۔۔
اڈاریاں دا پنچھی اَج آہنے چ بہہ گیا
عشق، سنسکاراں دا محتاج بن کے رہ گیا
پُل کدے وی پانیاں دی رنگت نہیں رکھدے
گندھلا پنا زرمل پیراں چوں لنگھ جاندے
مینوں ترس آوندا ہے تیرے عشق تے
جو پانیاں دی رنگت دے سوالاں وچ پے گیا
عشق سنسکاراں دا محتاج بن کے رہ گیا
قربانیاں دے راہ بڑے وِنگے جیہے ہُندے نیں
جھناں دا غوطہ وی کدے آسکدا اے
کتنی حفاظت ہے دنیادی لیہہ تے
پیاراں دی پرکھ وچ پین کولوں پہلاں ہی
چنگا ہے پیر تیرا اوس لیہہ تے پے گیا
عشق سنسکاراں دا محتاج بن کے رہ گیا

[پُل کبھی پانیوں کی رنگت نہیں رکھتے
مجھے تمہارے عشق پر ترس آتا ہے
جو پانیوں کی رنگت کے سوالات میں کھو گیا
کتنی حفاظت ہے دنیا کے راستے پر چلنے میں
محبت کی آزمائش سے پہلے ہی
اچھا ہے کہ تمہارا پاؤں اس راستے پر پڑ گیا
عشق سنسکاروں کا محتاج بن کر رہ گیا]

چناں تاریاں دی رات

چناں تاریاں دی رات، سانوں ملی جانا ہو!
سانجھی دھرتی دے گیت، سانجھے پانیاں دی پریت
ہیر رانجھے دی سونہہ لاج رکھنی جے اوہ!
وے کیہ کہندیاں نیں اوہ رُتاں پھریاں نیں جو
میرے اُونے نیں ہاڑ میرے سکھنے نیں پوہ!
آئی مذہباں دی کانگ، کچے گھڑیاں دے وانگ
ٹُٹا سوہنی دا دیس، اکھاں پیاں نیں رو!
ٹُٹن دیساں دے تار ٹُٹن قوماں دے ہار
پائے دھرتی دی لیر اُڈن کنکاں دے توہ!
پر منکھ نوں اک وار ایس منکھتا دے نال
عشق لگا سی جو، کیکن مُٹے گا اوہ؟
چناں تاریاں دی رات، سانوں ملی جانا ہو!

[بدلتی رُتوں میں انسان کی اجتماعی بربادی کی بات کہتی ہوئی یہ نظم ''میں جمع تو اور میں جمع دنیا'' کی درمیانی سرحد پر کھڑی ہے۔ انسانیت کی نومین لینڈ پر خود امرتا جی کی طرح اور اس یقین کے ساتھ کہ انسان کو انسانیت کا جو عشق لگا تھا' وہ کیسے ختم ہو سکتا ہے]

ساحر کو ملنے سے پہلے میری زندگی میں صرف خلا تھا۔ خلا کو کسی مہینے یا رُت کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ لیکن جب ساحر ملا وہ چیت کا مہینہ تھا۔ پہلی مرتبہ بھی اور ایک کرشمے کی طرح آئندہ کئی بار بھی۔

اس سے پہلی ملاقات کے وقت میری عمر بمشکل بیس' اکیس سال تھی۔ دیوانگی کا عالم اس وقت بھی دیکھا تھا لیکن جب میری محبت دیوانگی کے عروج کو پہنچی وہ 1953 کے چیت میں ہونے والی ایک ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں سے میں نے اپنی کتاب ''سینہوڑے'' (سندیسے) کی تمام نظمیں لکھیں (سوائے ایک نظم کے) اس لیے سندیسے اگرچہ 1955 میں چھپی تھی لیکن اس کے پہلے صفحے پر ''1953 کے نام'' لکھا ہوا تھا۔

چیت کے کئی مہینے ایسے بھی آئے جب اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یوں لگا جیسے چیت کے مہینے میں چیت نہ آیا ہو۔ نظمیں چیت کے ہر مہینے میں لکھیں اور پھر لکھنے کا ہر مہینہ میرے لیے چیت بن گیا۔

اسی لیے آج ان تمام نظموں کو جو میری محبت کی دیوانگی ہیں چیت نامہ بھی کہہ سکتی ہوں۔ یہ چیت نامہ میں جمع تو کی تاریخ ہے۔ اور اس ''تُو'' کا نام ساحر بھی ہے امروز بھی۔

1953 کے چیت کو کاتک کہہ کر پہلی نظم لکھی تھی۔ زندگی کی سکھیوں کے چھتے کی طرح لگتی تھی۔ اور ان دنوں پہلی بار چھتے میں شہد کا احساس ہوا۔ سن رکھا تھا کہ شہد کاتک کے مہینے میں اترتا ہے۔ اس لیے شہد اترنے کے مہینے کو سامنے رکھ کر میں نے چیت کو کاتک کہہ کر نظم لکھی۔

ڈنگاں دا سی بھریا چھتا۔۔۔
اک دہاڑے کتک آیا' آن ماکھیوں چویا
جُنوں پتے انگ زمیں دے۔۔۔
سبھناں کرناں سورج وچوں' رنگ کرچی ڈھویا
سبھناں رنگاں کا من پایا۔۔۔۔

پیراں دے وچ جھمر بدھاؤن ترن آ کے موہیا

ویل دُکھ دے گل نوں لگی۔۔۔
پُھلاں وچوں اُٹھ سگندھی، ہتھ پون دا چھوہیا
دونویں لوک میرے رُشنائے۔۔۔۔
دو اکھاں نوں لبھا آ کے، نور گواچا ہویا
ڈنگاں داسی بھریا چھتا۔۔۔
ایک دہاڑے کتک آیا، آن ماکھیوں چویا

[میری دونوں دنیائیں روشن ہو گئیں
میری دونوں آنکھوں کو
اُن کا کھویا ہوا نور مل گیا]

وہ چیت میری زندگی میں سات برس کے بعد آیا تھا اور ایک نظم کا عنوان ''سات برس'' تھا
دونویں نین وراگے میرے، بھر بھر کے اج رُنے
ست سمندر پیراں اگے، کعبہ پرلے بنے
اکھیاں دے وچ دیوے بھر کے، لمی نجھ عمر۔۔ نرلائی
ڈیکاں نال ہنیرے پیتے، چھانے امبر جنے
ورھیاں بدھی سورج بالے، ورھیاں بدھی چن جگائے
امبراں کولوں منگے جاکے، تارے چاندی ونے
کسے نہ آ کے شمع جگائی، گھور کالخاں جندو لیھٹی
ورھیاں دی اس بتی نالوں چانن رہے وچھنے
سوسو وار منائیاں جاکے، پر تقدیراں مُڑ نہ منیاں

پوناں دی اک کنی اندر، کئی کئی دھاگے بُنھے
ہارے ہوئے میرے ہتھاں وچوں، شمعدان جد ڈِگن لگا
ستے ساگرتر کے کوئی، آیا میری ونے
ہوٹھاں وچ جگا کے جادو، ہتھ میرے اُس چھوہے
''کہو قلم نوں ایس پیڑ دا، دارو بن کے پُنّے!
تیریاں پیڑاں، میریاں پیڑاں، ہوراجیہیاں لکھاں پیڑاں
تیرے اتھرو، میرے اتھرو، ہوراتھرو گنّے
ساں ورھیاں دا ایہہ پینڈا، نرے اسیں نہ پاندھی اس دے
لکھاں پُنوں، لکھاں سسیاں، پیرتھلاں وچ بُھنّے
دونویں ہوٹھ اُڑا کے اُس نے، قلم میری فیرچھوہی
دونویں نین وراگے اُس دے، بھر بھر کے فیررُنّے
ست سمندر پیراں اگے، کعبہ پرلے بنّے

[دونوں نین میرے بیراگی، آج بھر بھر کے روئے ہیں
سامنے سات سمندر ہیں اور ان کے پار کعبہ
میرے ہارے ہوئے ہاتھوں سے، جب شمعدان گرنے لگا
تو سات سمندر پیر کر کوئی میری جانب آیا
''تیرا درد، میرا درد، ایسے اور بھی لاکھوں درد
تیرے آنسو، میرے آنسو، اور بھی کتنے آنسو
سات برسوں کی اس مسافت کے، صرف ہم ہی مسافر نہیں ہیں
لاکھوں پُنوں اور لاکھوں سسیاں ہیں تپتے صحراؤں نے جن کے پیروں کو بھون ڈالا ہے
پھر دونوں لب جھک کر، اس نے میرے قلم کو چھوا
پھر اس کے بیراگی نین، بھر بھر کے روئے]

ساحر کے رخصت ہونے کا دن آیا تو اس نے اس دن کے ٹکٹ واپس کر کے اگلے دن کا خرید لیا۔ پھر اگلے دن کا ٹکٹ واپس کر کے اس سے اگلے دن کا اور پھر اسے واپس کر کے اس سے اگلے دن کا۔۔۔

بالآخر بکنگ آفس کا کلرک کہنے لگا "صاحب آپ روز کے پیسے کیوں کٹواتے ہیں جس روز جانا ہوا سٹیشن پر آ کر ٹکٹ لے لیجئے گا"

اس طرح روزانہ کے پیسے کٹوا کر آخر کتنے دن خریدے جا سکتے ہیں؟ زندگی سے قرض مانگے ہوئے ان دنوں میں، میں نے یہ نظمیں لکھیں

سپنے

جیوں کوئی نکا پنچھی جا کے

ڈونگھی سنگھنی رکھ دے اندر، اک آہلنا پائے

سجا ہتھ میرا شیایا

اوہدیاں دو تلیاں وچ بیٹھا، سپنے کئی بنائے

اک دن رج کھیڈیاں انگلاں

تلیاں دی اُس دھرتی اُتے، کِنے گھر گھر پائے

فیر جیویں کوئی الٹا کھیڈے

مُٹھاں دے وچ بھر کے سپنے، اکھاں نوں اُس لائے

ورھیاں اُتے ورھے بیت گئے۔۔۔

رنگ کوئی نہ کھرے انہاں دا، لکھاں اتھرو آئے

چنا چانن ڈھوئی نہ دیوے

اکھاں وچ کھلوتے سپنے، رات بیندی جائے

کچیاں گنڈھاں

پیار تیرے دیاں کچیاں گنڈھاں، توں نہ سکیوں کھول!

پیار میرے دیاں کچیاں گنڈھاں، میں نہ سکی آں کھول!

اک دہاڑے تندولی اک، ولی گئی انجھول

اکھیاں نے اک چانن دِتا، اکھیاں دے وچ گھول

ہنڈھدا ہنڈھدا حُسن ہنڈھیا، کھول نہ سکیا گنڈھ

کیہ ہویا جے اندے پے گئی، تند سبک تے سوہل

دو جِنداں، دو تنداں ولیاں، وَل وَل بجھی جان

کیہ ہویا جے کدی کسے دے، ہُت نہ وسے کول

چڑھ چڑھ لہہ لہہ سورج ہفیا، ودھ ودھ، گھٹ گھٹ چندا

ساری عمر اکیل گئے، تیرے جادو ورگے بول

کھول کھول کے لوک ہاریا، کھول کھول پر لوک

کیہڑے رب دا ز ورو سدا، دو تنداں دے کول

اس منزل دے کنڈے ویکھے اس منزل دیاں سُولاں

اس منزل دے یوجن تکّے، قدم نہ سکّے ڈول

پیار تیرے دیاں کچیاں گنڈھاں۔۔۔

•

[تمہارے پیار کی کچی گرہیں، انہیں تم نہ کھول سکے

میرے پیار کی کچی گرہیں، انہیں میں نہ کھول سکی]

راہ

کیہے ٹونیاں ہارے راہ

گم گو چر رکھچ انہاں دی' جادو نیں اسگاہ!

نہ جانا ایہہ کِدھروں آوندے' تے کِدھرنوں جاندے

سوسوٹونے' سوسو جادو' پیراں ہیٹھ وچھاندے

موڑاں دے نال مُڑمُڑ جاندے' پیر نہ کھان وساہ

جندوں بھیڑے' عمروں لمبے' ایہہ رستے کنڈیالے

پُر پیراں وچ پیندے چھالے' لکھ اقراراں والے

رستے پے کے' کون کرے ہُن' پیراں دی پرواہ

نہ اس راہ دی پیڑ پچھلتی' نہ کوئی کُھرا انجھاتا

پر اس راہ نال پیراں دا' اساں جوڑ لیا اک ناتا

دو پیراں دے نال نبھے گا' پیراں دا نرباہ

دُھپاں ڈھلیاں' دیونہہ بیتا' اج وی راہ نہ بیتے

ایس راہ دے ٹونے توں اساں پیر صدقڑے کیتے

پیراں دی اساں نیاز چڑھائی' راہواں دی درگاہ

کیہے ٹونیاں ہارے راہ۔۔۔۔

[کیسے جادو بھرے راستے ہیں

نہ جانے یہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں

پیروں تلے سوسو طلسم' سوسو جادو بچھاتے ہیں

ہر موڑ کے ساتھ مُڑ جاتے ہیں' پاؤں ان پر بھروسہ نہیں کرتے

یہ کانٹوں بھرے راستے' زندگی سے زیادہ تنگ اور عمر سے زیادہ لمبے ہیں

لیکن پیروں میں' وعدوں کے چھالے پڑ جاتے ہیں

ان راستوں پر چلتے ہوئے اب پیروں کی پرواہ کون کرے

نہ اس راستے کے درد کو جانا' نہ کوئی سرا پہچانا
لیکن ہم نے اس راستے کے ساتھ پیروں کا ایک رشتہ بنا لیا ہے
دھوپ ڈھل چکی' دن بیت چکا' لیکن راستے ابھی تک ختم نہیں ہوئے
اس راستے کے طلسم پر' ہم نے اپنے پیروں کا صدقہ اتار دیا
راستوں کی درگاہ پر' ہم نے اپنے پیروں کی نیاز دے دی
کیسے جادو بھرے راستے ہیں۔۔۔

اس وقت واپس جا کر ساحر نے چار اپریل کو ایک خط لکھا تھا جس کی ابتدائی سطریں یہ تھیں

"I was just listening your programme from Delhi station and you were so rear, but suddenly you gave the last announcement and Hindustani itoms began, giving me the feelings that you are after all nine hundred miles away from Bombay."

نظم ''دو گھڑیاں'' اس خط کے بعد لکھی تھی اسی لیے اس میں نو سو میل ریگستان کا ذکر ہے۔

دو گھڑیاں

ست امبراں نوں لنگھ کے آئیاں' ستیں سُریں جگا لئے جادو
ستے رنگ پہن لئے اوہناں' رُوپ کتوں نہ اُونا
پیشوائی نہ سری اساتھوں' دونویں ہتھ ہوئے بورانے
چند گروی نوں بانہہ دلا کے' کر گئیاں کوئی ٹُونا
ستے امبر لنگھ کے آئیاں' ستے امبر لنگھ کے گئیاں
ہتھ وچ لوہا' ہتھ وچ پارس' بُھل گیا سانوں چھوہنا
اُس ڈاچی میرا اپنوں کھڑیا' نو سو میل بریتا وچھیا

جیوں جیوں سسی جائے اگیرے، تیوں تیوں پینڈ اُدونا
اندرے اندر بدل گھر دے، کدے کدے کوئی واچھڑ آوے
دو اکھاں وچ آ کے لتھے، منہ نوں کر جائے لُونا
جگاں جیڈے دیونہہ بیت گئے، یاداں دی اک تانی بجھی
بہئے، بہہ کے اکھر اُنیئے، ہور اساں کیہہ کونا۔۔۔
[کون اونٹنی میرے پنوں کو لے گئی ہے، نو سو میل کا ریگستان بچھا ہوا ہے
جیسے جیسے سسی آگے بڑھتی ہے، فاصلہ دگنا ہوتا جاتا ہے
اندر ہی اندر بادل اُمنڈتے ہیں، کبھی کبھی بارش کا کوئی تیز چھینٹا آتا ہے
دو آنکھوں میں آکر اُترتا ہے اور چہرے کو نمکین کر دیتا ہے
جگوں جتنے دن بیت گئے، یادوں کی ایک تانی تنی ہے
ہم بیٹھیں اور بیٹھ کر لفظ بنیں، اور ہم نے کیا ہونا ہے۔۔۔]

وہ دن صرف میرے لیے نہیں ساحر کے لیے بھی مشکل تھے وہ بمبئی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کے لیے تیار تھا۔ پھر چودہ اپریل کو اس کا خط آیا

"I will reach Delhi in the last week of this month"

لیکن وہ آخری ہفتہ کبھی نہیں آیا نہ اس مہینے کا نہ کسی اور مہینے کا۔ اس کے انتظار کے تمام دن اور مہینے ایک بھیانک خاموشی بن گئے اتنی بھیانک کہ اس چپ میں اپنی بانہوں میں چلتی نبض بھی اپنی نہیں لگتی تھی۔ یہ چند نظمیں اس دور کی ہیں۔

اِک خط

ایہہ رات ساری، تیرے خیالاں چ گزار کے
ہُنے ہُنے جاگی ہاں، ست بہشتاں اُسار کے
ایہہ رات جیکن رحمتاں دی بدلی ورھدی رہی

ایہہ رات تیرے وعدیاں نوں پوریاں کردی رہی
پنچھیاں دی ڈار بن کے، خیال کوئی آوندے رہے
ہوٹھ میرے، ساہ تیرے دی مہک نوں پیندے رہے
بہت اچیاں ہن دیواراں، روشنی دِسدی نہیں
رات سپنے کھیڈدی ہے، ہور کجھ دَسدی نہیں
ہر میرا نغمہ، جیویں میں خط کوئی لکھدی رہی
حیران ہاں، اک سطر وی، تیرے تک پُجدی نہیں؟

[یہ ساری رات، تیرے خیالوں میں گزار کے
سات بہشت تخلیق کر کے، ابھی ابھی جاگی ہوں
یہ رات ایسے تھی جیسے رات بھر رحمت کی بدلی برستی رہی
یہ رات تیرے وعدوں کو پورا کرتی رہی
خیالات، پرندوں کی ڈاریں بن بن کر آتے رہے
میرے ہونٹ، تیری سانسوں کی خوشبو کو پیتے رہے
دیواریں بہت اونچی ہیں، روشنی دکھائی نہیں دیتی
رات سپنے کھیلتی ہے، اور کچھ نہیں بتاتی
میرا ہر نغمہ ایسے ہے، جیسے میں کوئی خط لکھ رہی ہوں
حیران ہوں، تم تک ایک سطر بھی کیوں نہیں پہنچتی؟

اَج

مان سرووَر شاں لتھیاں، موتی رہیاں چُگ وے
خیر ہنیرے چوسر کھیڈے، فجر گئی اُو پُگ وے
پُورب دی اک ٹاہنی اُتے، کرناں پیاں اُگ وے

سبھے یاداں اُملھ آئیاں بھری کلیجے رُگ وے
الھڑ دُھپاں کھیڈن پیاں' کھیڈن رنگ کسُھب وے
لغراں جیہیاں سحر دوپہراں' ہویاں چٹیاں گھنب وے
ویکھ سے نے چاہڑھ ڈھنکھنی' چانن دِتا تب وے
دونویں پیر دیونہہ دے ٹھر گئے' کرناں ماری جھنب وے
کرناں جیویں چلوٹی ہوئیاں' امبر گئے نیں انب وے
کسے راہی نے اُڈی جھاڑی' پنچھی جھاڑے کھنب وے
آ گے جُھنڈ' وگ تے ڈاراں' بھر گئے سرور چھنب وے
ایسی ہجر دے پینڈے پئی آ جتھے' جند گئی میری ہنبھ وے
ڈول گئی سورج دی بیڑی' پچھم اٹھی چھل وے
گنڈھ پوٹلی چک ترکالاں' آئیاں ساڈی ول وے
کیہڑے بدلوں کنیاں لتھیاں' اکھیاں بھرلئی ڈل وے
ہر اک میری ''اَج'' ڈھونڈدی' کتھے تیری ''کل'' وے؟

[ہجر کی اس مسافت پر' میری جان تھک ہار گئی ہے
میرا ہر ''آج'' تلاش میں ہے' تمہارا کل کہاں ہے؟]

سفر

گہراں چڑھیاں پوربوں' امبر لدے انج
چڑھدا سورج ٹُنبیا' چانن دِتا ٹنج
سکے سرور رحم دے' ہنس نہ بوڑی چنجھ
کرم کسے دے ہو گئے' متھے نالوں رنج
گہراں پینڈے چلیاں' چارے کنیاں گُنج

لیکاں پھڑیاں گھٹ کے، کھرا نہ جاوے کھنج
کالے کوہ مکاندیاں۔ ڈھپاں لتھیاں اُنج
سورج ہویا سر کڑا' کر ناں ہوئیاں مُنج
گہراں پچھم ملیا' لاہی ہجر دی ڈنجھ
پکڑاں پیر لپیٹیاں' ہتھوں چھٹ کے ونج
ہوٹھ نہ ہاڑے مکدے' اکھ نہ سکدی ہنجھ
لبھ لبھ جان دہاڑیاں' ہوئی عمر دی سنجھ

[ہونٹوں سے فریادیں ختم نہیں ہوتیں' آنکھوں سے آنسو نہیں سوکھتے
دن ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ عمر کی شام آ چلی ہے]

ایک بار یہ خاموشی سلگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ 15-5-53 کو ساحر کا خط ملا بمبئی سے نہیں مہابلیشور کے فاؤنٹن ہوٹل سے

"I got a sudden attack of nervous breakdown and my doctor advised me to leave immediately for this small hilly place, which is about two hundred miles away from Bombay.... I will write you again...."

خط اگرچہ بیماری کے بارے میں تھا لیکن خط تھا جس میں دوسرے خط کا وعدہ تھا اور کسی آنے والے چیت کا بھی۔۔۔ یہی وقت تا جب ایک طویل نظم "سنیہڑے" (سندیسے) لکھی۔

سنیہڑے

لگی لوتے پہلو اپہر لگا' فیر دوسرے پہر نے سند لائی
اک تیرے ویوگ دا سیک ڈاہڈھا' دوجا عمر دی بھر دوپہر آئی

تیرا خط سانوں اج بوہڑیا اے' جیویں ستاں اساناں تے گھٹا چھائی
دو دیویں اکھیاں ساڈیاں جھوم پیاں' متھے وچ نصیباں نے پیل پائی

دونویں ہتھ ساڈے اج ہوئے بورے' اکھاں جھلیاں ہُندیاں جاندیاں نیں
قلماں تیریاں اج سرناویاں تے' ساڈے ناویں نوں پیاں بُلاندیاں نیں
چونہہ پوٹیاں تے دس چار لیکاں' خورے کیہڑیاں لوسنیاں پاندیاں نیں
ماں بجلیاں اُٹھ کے اکھراں چوں' پیاں پوٹیاں وچ سماندیاں نیں

لکھاں بیٹھ ہے زمیں ولھیٹ بیٹھا' سارے امبر تے آن کے اج چھایا
ہاں رحمتاں اپنے نال لے کے' ہوکے ڈوت جیوں کسے دا میگھ آیا
اکھر جادواں وچ لبیڑ کے تے' پہلاں نبھ کے آپنے نال لیایا
ساڈی جند نوں آن کے کیل بیٹھا' تُو نے ہار یا دے کہیا خط پایا

پنجاں اُتے ہے ویہہ سو پنج سمت' چڑھیاں چیتر مہینہ تے ہوئی نانویں
تھیں آپنے لکھے سنہیڑے میں' ہتھیں آپنی آپ وصول پاویں
اونہاں کاغذاں نوں اونہا قاصداں نوں' پہلوں خیر خیریت دے نال بہاویں
پھیر حال حوال جو پچھنا ایں' اونہاں محرماں دے کول بیٹھ جاویں
رُتاں بھوندیاں تے ورھے پئے' گردے دے کوئی انت نیوں اونہاں گیڑیاں دے
جہڑے منہ توں رونقاں رُس گئیاں' حال ویکھ جاویں اوہناں ویہڑیاں دے
اکھیں بھریاں نیں نال گلیڈ وواں دے' ہوٹھ بھرے نیں نال سنہیڑیاں دے
سار جاندے نیں اونہاں اکھراں دی' بجن وچھڑے بجناں جیہڑیاں دے

بھلا دس میں اونہاں نوں کیہ آکھاں' اونہاں سبھواں' تھیں سنہیڑیاں نوں

ہس کنڈے دی اوہناں دے چُگ لیے، ہتھیں آپ لائیے پھلاں جیہڑیاں نوں
چھیڑی گل تے اکھیاں نال جھڑیاں، چھیڑ بیٹھے ہاں قصیاں کیہڑیاں نوں
قاصد اکھیاں دے کاغذ پے لکھدے، لے کے آئے نی میرے سنہیڑیاں نوں

بہہ کے آپ نوں سیّں سنہیڑیاں نوں، بہہ کے آپ واچیں اینہاں پاتیاں نوں
دونواں اکھیاں دے وِچ ڈوب دیویں، دونویں اکھیاں بھریاں بھراتیاں نوں
ہڈ بال کے ورھے ہنگال چھڈے، اساں پالیا چننگ چواتیاں نوں
اکھ حرف والے، اِکو وِردا اُنوں، وار سٹیا دونواں حیاتیاں نوں

جیہڑا پایا ای اج سوال مینوں، روز حشر دا ایہی سوال میرا
جیہڑی چھل ہے تیریاں اکھیاں وچ، اوہیو اکھیاں وچ اُبال میرا
کاہنوں فیر مڑ کے سرتاں پچھیاں نی، پچھن گوچرا نہیں سی حال میرا
تیرا ناتا ہے ہجر دے نال جیہڑا، اوہیو واسطہ اوس دے نال میرا
بیتے کئی ستوار تے بیت چلے، کئی بیت گئے نیں باراں ماہ ساڈے
جو وی سال چڑھدا جو وی چڑھے سمت، اوہیو سال ڈاہڈھا اوہیو سن ڈاہڈھے
چھپیے رُتاں ہی وکھ مڑ تھ ہویاں، وکھ پندے پُن گئے دیونہہ ساڈے
پینتی اکھر ہی ساڈے وِیوگ والے، جیہڑا راہ پھڑیا سو ویہا آڈے

نہ کوئی دِتے نیں اساں اُلانبھڑے وے، نہ کوئی گلے گزارشاں کیتیاں نیں
کسے ہیر دی قبر چوں واج آئی، اساں ڈیک لاکے زہراں پیتیاں نیں
بادشاہی جہاں دی کہن لگی، پچھ میرے توں جیہڑیاں بیتیاں نیں
کئی کئی فیرز میں دی بول اُٹھی، اساں جھولی چ پائیاں انیتیاں نیں

مُٹی اِک پتی کسے نا ہین نالوں' وناں وناں چوں اروہنیاں بول پیاں
رویاں پُوریاں تے چھنے وِلک اُٹھے بیلے بیلے چوں دوہنیاں بول پیاں
جلاں تھلاں چوں اک آواز ہوکے' کئی سیاں سوہنیاں بول پیاں
اگوواج میری نہیوں واج اِکھ' واج واج چوں ہونیاں بول پیاں
لکھاں واجاں دی اک آواز ہوئی' اکو اک سنہیڑا دین لگی
رہی ہتھ دے وچ حمیل ساڈی' مُٹے پُھل ساڈے مُتی رہی سگی
ایس ہونی نوں ہور کیہ آکھیے وے' جیہڑی ہونی حیاتیاں نال ٹگی
میریا رانجھاں وے! میرا اپنوا وے امیریا مہنوالا! کیہی قلم وگی!

جے کوئی لینا ای میرا سنہیڑا اوے' میرا ایس سنہیڑا آ ڈھولا!
پُٹھی قلم نوں پکڑ کے قلم سِدھی' دیویں اوس دے ہتھ پھڑا ڈھولا
بولے کوئی شریعت جے آن کے تے' دیویں اوس شرع وٹا ڈھولا
رب فیروے کرے جے عذر کوئی' بدل دئیں توں اوہدی رضا ڈھولا
ڈاچی سمے دی اج نکھیڑ دیندی' سسی اجے وی پنوں دا گھر ابھالے
دونویں اتیاں حُسن دا مُل پیندا' ہتھ تیسہ تے اجے وی پیر چھالے
کٹھا عشق جو چھری اٹھری توں' رت اوس دی سمدی پئی حالے
کانی سمے دی سدا ای رہی لکھدی' خونی پتر ے پیار دی بیڑ والے

بچھی ہوئی اے زمین دی پٹھ ساری' گُھرے ڈاچی دے اَج ناسور ہو گئے
ونجاں والیاں نے کچے ونج کیتے' پانی چھلاں دے نال بھرپور ہو گئے
کیدو سمے دے ہور وی ہوئے ڈاہڈے' چاک سمے دے ہور مجبور ہو گئے
پینڈے تخت ہزاریوں جھنگ والے' ہُندے ہُندے اج ہور وی دور ہو گئے

اکو اک سنہیڑا دیاں تینوں' قلماں والے دی قلم نوں گھڑیں جا کے
جاں پھر قلم ہی اوس دی بدل دیویں' سیاہی بدل دیویں سیاہی نویں پا کے
رکھیں کورنکوریاں کاغذاں نوں' اُتے زمیں دے حق دی مہر لا کے
اکھر اوس دے ہتھ پھڑائیں ایسے' بدل دے اوہ سارے فرمان آ کے
اوہو شعر تے اوہو ہے بحر اوہدی' بدل گئے نیں اَج عنوان ڈھولا
سبھے شرماں شریقاں تیریاں نیں' تیرے نال ہے جگ جہان ڈھولا
ہتھیں آپنی پھڑیں توں آپ کانی' ایسے کانی نوں چاڑھ کے سان ڈھولا
اوہدے ویدکتبیاں دا بنیں کاتب' سودھ دئیں توں شاہی فرمان ڈھولا

شاہی چھپاں دے شاہی فرمان سارے' تیری کانی نوں پئے اُڈیکدے نیں
چننہ سمے والے' چکر سمے والے' عاشق ہوئے تیری اِکو لیک دے نیں
کچی وٹ تے پیراں دے پبے تیرے' پکے پندھ دی پیڑ الیکدے نیں
شاہی تاج دا کوئی وساہ نہیوں' وعدے زمیں والے حشر تک دے نیں

حق سمے دا شاہ سوار ہووے' واگ سمے دی اِنج سنبھالناوے
پیر جگ دے منزلاں ڈھونڈ سکن' دونہاں دیویاں نوں اکین پالناوے
نویں رُت دا کوئی سندیش دینا' ایس کانی دی لاج نوں پالناوے
بُور پوے جوز میں دے رُکھ اُتے' ٹاہنی امن دی' عمر دا آہلناوے

[روشنی ہوئی تو پہل پہر ہوا' پھر دوسرے پہر نے صدا دی
ایک تیری جدائی کی تپش بہت ہے
دوسرے عمر کا سورج نصف النہار پر آن پہنچا ہے
تیسرا خط آج اس طرح آیا ہے جیسے

ساتوں آسمانوں پر گھٹا چھائی ہو
ہماری آنکھیں جھوم اٹھی ہیں
اور پیشانی پر قسمت رقص کناں ہے]

[آج ہمارے دونوں ہات دیوانے ہو گئے ہیں، دو آنکھیں پاگل ہوئی جاتی ہیں
پتے پر تیرا قلم آج ہمارے نام کو بلا رہا ہے
چاروں پوروں پر چار لکیریں گئی ہیں نہ جانے وہ کیا پوچھتی اور کیا بتاتی ہیں
لاکھوں بجلیاں لفظوں میں سے اُٹھ اُٹھ کر پوروں میں سما رہی ہیں]

[اس نے تمام زمین کو اپنے پروں میں لپیٹ لیا ہے اور سارے آسمان پر اس طرح چھا گیا ہے
جیسے بادلوں کا سفیر اپنے ساتھ رحمتیں لے کر آیا ہو
لفظوں میں جادو بھر کے انہیں اپنے ساتھ لایا ہے
ہماری رُوح کو اپنے بس میں کر کے جادو! تو نے یہ کیسا خط لکھا ہے؟]

[یہ 2010 بکرمی ہے۔ چیت کا مہینہ چڑھا ہے اور اس کی نو تاریخ ہو گئی ہے
میں نے یہ سندیسے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں انہیں اپنے ہاتھ سے وصول پانا
پہلے ان کاغذوں کو ان قاصدوں کو خیریت کے ساتھ بٹھانا
اس کے بعد جو حال احوال پوچھنا ہو ان محرموں کے پاس بیٹھ کر پوچھنا]

[رُتیں بدل رہی ہیں برسوں کے پہیے حرکت میں ہیں اس حرکت کا کوئی انت نہیں ہے
جس چہرے سے رونقیں سُوکھ گئی ہیں ان اُجڑے آنگنوں کا حال آ کر دیکھ جانا
آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں اور ہونٹ سندیسوں سے
وہ ساجن ان لفظوں کی رُوح کو جانتے ہیں جن کے ساجن بچھڑ گئے ہیں]

[بتا تو بھلا میں ان اشکوں بھرے سندیسوں سے کیا کہوں
جو پھول خود بوئے جائیں ان کے کانٹوں کو بھی ہنس کر چُن لینا چاہیے
بات چھیڑی تو آنکھیں بھی چھڑ گئیں ہم یہ کن قصوں کو چھیڑ بیٹھے
آنکھوں کے قاصد کاغذ لکھ رہے ہیں یہ میرے سندیسے لے کر آئے ہیں]

[ان سندیسوں کو خود بیٹھ کر سننا' ان کاغذوں کو خود بیٹھ کر جانچنا
اپنی آنسو بھری آنکھوں کو میری ان دونوں آنکھوں میں ڈبو دینا
ہڈیوں کو جلا کر ہم نے کئی برس گزار دیئے' ہم نے جلتی لکڑیوں کی خود پرورش کی ہے
ہم نے اپنی زندگیاں ایک ہی حرف والے' ایک ہی وِرد پر سے وار دی ہیں]

[آج تو نے مجھ سے جو سوال کیا ہے' میرا روزِ محشر کا یہی سوال ہے
تیری آنکھوں میں لہر ہے وہی اُبال میری آنکھوں میں بھی ہے
تو نے پھر میرا حال کیوں پوچھا ہے یہ تو' پوچھنے کے قابل نہیں تھا
ہجر کے ساتھ تیرا جو ناتا ہے میرا بھی اس کے ساتھ وہی رشتہ ہے]

[کئی ہفتے بیتے اور بیت چکے ہیں' ہمارے کئی سال (اسی طرح بیت گئے
جو بھی سال چڑھتا ہے' جو بھی سمت آتا ہے' وہی سال اور وہی سن (ہم پر) بھاری گزرتا ہے
چھ کی چھ رُتیں ہی غمزدہ ہوگئی ہیں' دیکھ گزرتے گزرتے ہمارے دن بھی گزر گئے
پینتیس حرف ہی ہماری جدائی کے حرف ہیں' ہم جس راہ پر بھی چلے' وہی رکاوٹ بن گیا]

[نہ تو ہم نے کوئی گلے گزاریاں کی ہیں اور نہ ہی شکوے شکائتیں
کسی ہیر کی قبر میں سے آواز آئی کہ ہم نے زہر کا پیالہ ایک ہی سانس میں پی لیا

چناب کی ملکہ کہنے لگی کہ مجھ سے پوچھو' جو ہم پر بیت گئی
پھر زمین کا ذرّہ ذرّہ بول اُٹھا کہ (اپنے ساتھ ہونے والی) ہر زیادتی کو ہم نے گلے سے لگا لیا]

[کسی ٹہنی سے ایک بھی پتہ ٹوٹا تو ایک ایک درخت کی ڈالیاں بول پڑیں
چُوریاں رو پڑیں اور چھنے بلک اُٹھے جنگل جنگل دو ہنیاں بول پڑیں
پانیوں اور ریگستانوں سے ایک آواز ہو کر کئی سسیاں اور سوہنیاں بول پڑیں
میری اکیلی آواز' اکیلی نہیں ہے' ایک ایک آواز میں سے تقدیر بول پڑیں]

[لاکھوں آوازوں کی ایک آواز بن گئی اور ایک ہی سندیسہ دینے لگی
ہماری حمائل ہمارے ہاتھ میں ہی رہ گئی' ہمارے پھول سوتے رہے اور سگّی کی نیند بھی نہ ٹوٹی
اس تقدیر کو اور کیا کہیں کہ جو زندگی بھر ہمارے ساتھ چلی
میرے رانجھن! میرے پُنوں! میرے مہوال! ہم پر کیسا قلم چل گیا!]

[اگر ہمارا کوئی سندیسہ لینا ہے رے! تو یہ سندیسہ خود آ کر لینا میرے محبوب! میرے ڈھولن!
اُلٹے قلم کو سیدھا کر کے اُس کے ہاتھ میں تھما دینا
اگر کوئی شریعت اعتراض کرے تو اس کی شرع کو بدل دینا
اگر خدا اس کے بعد بھی کوئی عذر کرے تو اُس کی رضا کو بدل دینا ڈھولن یار!

[وقت کی اونٹنی آج بھی جُدا کر دیتی ہے' سسی آج بھی پُنوں کا نشان ڈھونڈتی ہے
حُسن کی قیمت صرف دوائیاں پڑتی ہے' آج بھی اس کے ہاتھوں میں تیسہ اور پیروں میں چھالے ہیں
عشق کو جو اُلٹی چھری سے ذبح کیا گیا تھا' اس کا خون اب تک رِس رہا ہے
وقت کا قلم ہمیشہ عشق کی داستان کے خونی ورق لکھتا رہا ہے]

[زمین کی تمام پیٹھ زخموں سے چُور ہے، اونٹنی کے پاؤں آج ناسور بن گئے ہیں
بنجاروں نے کچے بیوپار کئے اور پانیوں میں لہروں کا طوفان آ گیا
زمانے کے کیدو اور بھی جابر ہو گئے اور آج کے چاک (چاکر۔ رانجھے) اور زیادہ مجبور ہو گئے
جھنگ سے تخت ہزارے کا فاصلہ دور ہوتے ہوتے آج اور بھی دور ہو گیا ہے]

[تمہارے لیے بس ایک ہی سندیسہ ہے کہ جا کر قلم والے کے قلم کو تراشنا
یا پھر اُس کا قلم ہی بدل دینا، نئی روشنائی کے ساتھ
کورنکورے کاغذوں پر زمین کے حق کی مہر لگا کر رکھنا
اُس کے ہاتھوں میں ایسے لفظ دینا کہ وہ تمام فرمانوں کو بدل دے۔۔۔]

[وہی شعر ہے اور وہی اس کی بحر ہے لیکن آج اُس کے عنوان بدل گئے ہیں
آج جو بھی شرع شریعت ہے، وہ تمہاری ہے، پوری دُنیا تمہارے ساتھ ہے
اپنے قلم کو، خود اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے سان پر چڑھانا
اس کے ویدوں کتابوں کا کاتب بننا اور شاہی فرمانوں کی غلطیاں درست کر دینا ڈھولن یار!]

[شاہی راستوں کے سارے شاہی فرمان، تمہارے قلم کے منتظر ہیں
وقت کے نشان اور چکر تمہاری ایک ہی لکیر کے عاشق ہو گئے ہیں
کچے راستوں پر، تمہارے پیروں کے نشان، پکے راستوں کے نشان ثبت کر رہے ہیں
شاہی تاج کوئی کوئی اعتبار نہیں رہا، زمین کے وعدے حشر تک کے لیے ہیں۔۔۔]

[وقت کی باگ کو اس طرح سنبھالنا کہ وقت کا حق شاہ سوار ہو
دونوں دئیوں کو اس طرح چلانا کہ دنیا کے پاؤں اپنی منزلوں کو پا سکیں

نئی رُت کا کوئی سندیسہ دینا اور اس کی لاج کو پالنا
زمین کے درخت پر بُور پڑے امن کی ٹہنی ہو اور عمر کا گھونسلہ]

لیکن سندیسے کہیں نہیں پہنچے صرف قلم کی نوک پر آئے اور کالے لفظ بن کر کاغذ کے سینے پر جم گئے۔۔۔ چپ کی دھرتی وجود میں آ گئی اور چپ کا آسمان بھی۔۔۔ اس طرح کہ حقیقت بھی محض تصور بننے لگی۔ یہی دن تھے جب میں نے یہ نظمیں لکھیں۔

کلپنا

تارے پنکتی بنھ کھلوتے، اچھلی امبر گنگا
گھڑیاں نوں پئی منہ منہ بھردی، بنی کلپنا مہری
کئی اروشیاں چاکر ہویاں، اس مہری دے اگے
اندر سبھا لگا کے بیٹھی حُسن ہوروی قہری
پیار میرے دا بھیت ایس نے، چھمکاں مار جگایا
ستا ناگ عشق دا جاگے، ہوروی ہو جائے زہری
بھکھے امبر بھرن کلاوا، متھاں وچ نہ آوے
سوہنی ہر چندوری، آخر ہر چندوری ٹھہری
کھڑدی دی جیویں کپاہ دی پُٹھی، سپنے تیرے ہسدے
جیا کلپنا اُجگاں تو ڑی، سپنے کت سنہری
لکھ تیرے انبراں وچوں، دس کیہ لبھا سانوں؟
اکو تند پیار دی لبھی، اوہ وی تندا کہری

[تیری (نعمتوں کے) انبار میں سے بھلا ہمیں کیا ملا؟
محبت کی ایک تار اور وہ بھی اکہری]

ماہیا

[چتر کار ونسینٹ وان گوگ دی کلپت پریمکا ماہیا نوں]

پریئے نی پریئے! حوراں شہزادیئے!

گوریئے ونسینٹ دیئے! اج کیوں بن دی نہیں؟

دل دے اندر چنگ پاکے' ساہ جدوں لیندا کوئی

سلگدے انگیار کتنے' توں کدے گندی نہیں

کاہدا ہنر' کاہدی کلا تلا ہے اک ایہہ جیون دا

ساگر تخیل دا کدے' توں کدے من دی نہیں

پریئے نی پریئے! حوراں شہزادیئے!

خیال تیرا پار نہ۔۔۔اُروار دیندا ہے

روز سورج ڈھونڈ دا ہے' منہ کتے دِسدا نہیں

منہ تیرا جو رات نوں' اقرار دیندا ہے

تڑپ کس نوں آکھدے نہیں' توں نہیں ایہہ جان دی

کیوں کسے توں زندگی' کوئی وار دیندا ہے

دونویں جہاں آپنے' لیندا ہے کوئی کھیڈ تے

ہسدا ہے نامراد تے فیر ہار دیندا ہے

پریئے نی پریئے! حوراں شہزادیئے!

حسن کاہدی کھیڈ ہے۔ عشق جد پگدے نہیں

رات ہے کالی بڑی' عمراں کسے نے بالیاں

چن سورج کیہے دیوے۔ اجے وی جگدے نہیں

بُت تیرا سوہنیے! تے اک سِٹا کنک دا

کاہدیاں ایہہ دھرتیاں۔ اجے وی اُگدے نہیں

ہُنر بھکھا روٹیے! پیار بھکھا گوریئے!

کاہدا ہے دُکھ نظام دا۔ پھل کوئی لگدے نہیں

پریئے نی پریئے! حوراں شہزادیئے!

حسن کاہدی کھیڈ ہے۔ عشق جد پگدے نہیں

تصور

(مصور ونسینٹ گوگ کی خیالی محبوبہ مایا سے)

پری ری پری! حور شہزادی!

ونسینٹ کی گوری! تو حقیقت کیوں نہیں بنتی

جب کوئی دل میں چنگاری رکھ کر سانس لیتا ہے تو یہ نہیں گنتی کہ سُلگتے انگار کتنے ہیں؟

کیسا ہنر، کیسا فن، یہ تو جینے کا ایک جتن ہے

تخیل کے سمندر کو تو کبھی نہیں ماپتی

سورج تمہارے اس چہرے کو روز ڈھونڈتا ہے

جو چہرہ رات کے وقت (محبت کا) اقرار کرتا ہے

تو یہ نہیں جانتی کہ تڑپ کسے کہتے ہیں

اور کوئی کسی پر سے اپنی زندگی کیوں وار دیتا ہے

رات بہت کالی ہے، کسی نے اپنی عمر جلا دی

چاند سورج کیسے دیئے ہیں جواب بھی روشن نہیں ہوتے

روٹی! ہُنر بھوکا ہے، گوری! پیار بھوکا ہے

نظام کا یہ کیسا درخت ہے۔ جس پر کوئی پھل نہیں لگتا

قُقنُس

لِکھ جا، مری تقدیر نوں، میرے لئی
میں جی رہی تیرے بِناں، تیرے لئی
ہر چند وری، ہر گھڑی بن دی رہی
ہر چند وری، ہر گھڑی مِٹدی رہی
دودھیا چانن وی اَج ہسدے نہیں
بے بہارے پھل جیویں رَسدے نہیں
عمر بھر دا عشق بے آواز ہے
ہر مرا نغمہ، مری آواز ہے
حرف میرے تڑپ اُٹھوے، ہن ایویں
سُلگدے، ہن رات بھر تارے جیویں
عمر میری بے وفا! مکدی پئی
رُوح میری بے چین ہے تیرے لئی
قُقنوس دیپک راگ نوں اج گائے گا
عشق دی اس لاٹ تے بل جائے گا
سپنیاں نوں چیر کے آ جا ذرا
رات باقی بہت ہے نہ جا ذرا
راکھ ہی اس راگ دا انجام ہے
قُقنوس دی اس راکھ نوں پرنام ہے
رَج کے، امبر جدوں پھر روئے گا
پھر نواں قُقنوس پیدا ہوئے گا

[میری تقدیر میرے لیے لکھ جاؤ

میں تمہارے بغیر، تمہارے لئے جی رہی ہوں

آج دُودھیا چاندنی بھی نہیں ہنستی

جس طرح بہار کے بغیر پھلوں میں رس نہیں آتا

عمر بھر کا عشق بے آواز ہے

میرا ہر نغمہ، میری آواز ہے

میرے حرف یوں تڑپ اُٹھتے ہیں

جس طرح رات بھر تارے سُلگتے ہوں

بے وفا! میری عمر ختم ہو رہی ہے

میری رُوح تمہارے لیے بے چین ہے

آج ققنوس دیپک راگ گائے گا

اور جل جائے گا عشق کی اس لو پر

راکھ ہی اس راگ کا انجام ہے

ققنس کی اس راکھ کو پرنام

پھر اگلے برس کا چیت آنے والا تھا۔۔۔اس کے وعدوں کا نہیں قسمت کے وعدوں کا مہینہ۔ یہ 1954 کا چیت تھا جب یہ نظمیں لکھیں

دو پٹے

چن امبراں وچ نسل سُتا، نسل سُتے تارے

ماگھ دے جے کگرنوں اج پھکن پیا پنگھارے

جند میری دے لکھاں اولے، اک چھنگ پئی اُونگھنے

ٹلے توں اج پون جو اُٹھی، بھر دی پئی ہنگارے

جند میری دے پترے اُتے، دوا کھر اُس واہے

دو اکھراں نوں پونجھ نہ سکے، ہتھ عمر دے ہارے

سو جنگلاں دیاں بھیڑاں وچوں، کھبھ کے کوئی لنگھے

متھے وچوں منی نہ اُترے، گُنجاں لاہ لاہ مارے

دو پلکاں اج کج نہ سکن، اکھیاں دی اُوڑیواں

منہ اتے دو لیکاں پا گئے، دو پٹے اج کھارے

[میری رُوح کے تنکوں کے پیچھے ایک چنگاری اونگھ رہی ہے

ٹیلے سے چلنے والی ہوا آج ہنکارے بھر رہی ہے

میری رُوح کے پتر پر اس نے دو لفظ لکھے

عمر کے شکست خوردہ ہاتھ ان لفظوں کو مٹا نہ سکے

آنکھوں میں تم سے ملنے کی جو حسرت ہے انہیں دونوں پلکیں بھی نہیں ڈھک سکتیں

دو کھاری قطرے آج چہرے پر دو لکیریں ڈال گئے۔۔۔

پھکن۔۔۔چیتر

پورب چُلھا بالیا، پھوکاں مارے پون

سبھے دُھنداں ہلیاں، جیوں دھوئیں چکی دھون

کرناں ہوئیاں اُچیاں، جیویں لاٹاں نکل آون

سورج دھریاں ہانڈیاں، دُھپاں گندھی تون

دھرتی انگن لپیا، کُکر لگی چون

اُسر آئیاں پیلیاں، جیویں مُوہڑے لگی ڈاھون

پھکن پیہڑا ڈانگا، چیتر کسی دون

رُت کسے دے راہ تے، لگی پھل وچھون

چھیڑی ہیک بہار نے، سرگم ہوئی پون

آ جا اَج پردیسیا! کل دی جانے کون

[مشرق نے چولھا جلایا ہے اور ہوا پھونکیں مار رہی ہے
جونہی دھوئیں نے گردن اُٹھائی، ساری دُھند چھٹ گئی
کرنیں بلند ہوئیں، جیسے الاؤ دہک اُٹھے ہوں
سورج نے (چولہے پر) ہانڈی چڑھائی اور دھوپ نے آٹا گوندھا
بہار نے تان لگائی ہے یوں سرگم بنی
پردیسی! کل کی کسے خبر، آج چلے آؤ---]

ورھا

نچڑیاں اکھیاں---وچھڑ چلی انتلی
پھکن دی ترکال، وے چیتر آ گیا!
باربیگانی چلیاں، چھیئے رُتاں رُنیاں
ملیاں نوں ہوگیا سال، وے چیتر آ گیا!
امبر ویہڑا لپیا، اُگھڑ آئیاں کھتیاں
یاداں بدھی پال، وے چیتر آ گیا!
کھنب سمے نے جھاڑیا، لکھ دلیلاں آوندیاں
پچھن کئی سوال، وے چیتر آ گیا!
کیہ جاناں دن کیہڑے مُٹھاں بھریاں عمر نے
سبھے تِل سنبھال، وے چیتر آ گیا!
ورھے نے پاسا پرتیا، سبھے یاداں تیریاں
گُھٹ کلیجے نال، وے چیتر آ گیا!
مُڑ کے ایس مُہاٹھ تے، میں دیوا دھریا، تن سو
پینٹھ بتیاں بال، وے چیتر آ گیا!

[چیت کے آنے اور ساحر کے نہ آنے کی کیفیت کو بیان کرتی یہ نظم' ایک سال کی جدائی کا نوحہ بن جاتی ہے۔۔۔

(آنسوں سے بھری) آنکھیں نچڑ گئیں' پھاگن آخری شام بیت چلی چیت کا مہینہ آ گیا
چھ کی چھ رُتیں' بیگانے علاقے کی طرف چلی ہیں' ملے ہوئے ایک سال ہو گیا' چیت کا مہینہ آ گیا
تمام یادوں کو کلیجے سے لگائے ہوئے سال نے اپنا رُخ تبدیل کیا ہے' چیت کا مہینہ آ گیا
اس دہلیز پر' میں نے دوبارہ' تین سو پینسٹھ بتیوں کا دیا جلا کر رکھا ہے' چیت کا مہینہ آ گیا]

چیتر چڑھیا

اج بیلے وگدی پون وے!
کھوہ دیاں ٹنڈاں واگراں' پئے سال مہینے بھون وے' اَج چیتر چڑھیا۔۔۔
اج پوناں وچ سگندھ وے!
پھگن مُکا' پھگن دا پراجے نہ مُکا پندھ وے' اَج چیتر چڑھیا۔۔۔
اج بُوری ہو گئی داکھ وے!
جو پھگوں اَج چیتر بنیا' کل نوں بنے وساکھ وے' اَج چیتر چڑھیا۔۔۔
اَج رُکھیں ساوا لُو روے!
کل دا پھگن' چیتر کولوں' باراں کوہ اج دور وے! اَج چیتر چڑھیا۔۔۔
اج مولے پتر ٹاہن وے!
عمرا دی اس چرخی اُتے' گیڑے گڑدے جان وے! اَج چیتر چڑھیا۔۔۔
اج صبر کتے کھیت وے!
جند آپنی وچ سانبھ لے' اَج جد میری دا بھیت وے! اَج چیتر چڑھیا۔۔۔

[آج بیلے میں ہوا چل رہی ہے' کنویں کے ڈولوں کی طرح سال مہینے گھوم رہے ہیں رے! آج چیت کا

مہینہ آ گیا۔۔۔

آج ہواؤں میں خوشبو ہے، پھاگن کا مہینہ ختم ہو گیا لیکن ابھی پھاگن کی مسافت ختم نہیں ہوئی، آج چیت کا مہینہ آ گیا۔۔۔

آج درختوں پر سبز بُور پڑا ہے، آج کا پھاگن، چیت کے مہینے بارہ کوس دور ہیں رے! آج چیت کا مہینہ آ گیا۔۔۔]

چیتر

آوندے تے لنگھ جاندا تیرے قولاں دا مہینہ

میلاں دے میل لمبے، ریتاں دے نال اٹے

جیوں ڈاچیاں نوں بدھی، ٹلی دا واج آوندا۔۔۔ تیرے قولاں دا مہینہ

کوہاں دے کوہ کالے، ویرانیاں دے بُوہے

جھونکا بہار دا جیوں، کتوں اُڈ آوندا۔۔۔ تیرے قولاں دا مہینہ

اُنجے ہی ہتھ تیرا مہتھاں دے کول جھکدا

لکھاں ہنیریاں وچ، ٹوہنیاں پھڑاندا۔۔۔ تیرے قولاں دا مہینہ

دل دا چراغ لے کے، منہ تیرا میں ڈھونڈاں

بُجھے ہوئے سُورجاں نوں، فیر بال جاندا۔۔۔ تیرے قولاں دا مہینہ

سبھے طلسم کُھلدے، پریاں دے دیس پینڈے

صدیاں توں سُتیاں، شاہزادیاں جگاندا۔۔۔ تیرے قولاں دا مہینہ

وسدی ستھول دنیا، ہوشاں نوں جھون دیندی

تیریاں ہی قولاں دا، حرف مِٹ جاندا۔۔۔ تیرے قولاں دا مہینہ

لکھاں سوال پچھاں، دیندا نہ کوئی ہنگارا

ہوٹھاں دی چپ پی کے، اکھیاں جھکاندا۔۔۔ تیرے قولاں دا مہینہ

[آتا ہے اور گزر جاتا ہے' تیرے وعدوں کا مہینہ

میلوں کے میل' ریت سے اٹے پڑے ہیں' جس طرح اونٹنیوں کو بندھی گھنٹی کی آواز آتی ہے' یوں آتا ہے تیرے دعووں کا مہینہ

کوسوں کے کوس کالے' ویرانیوں کے دروازے تیرے وعدوں کا مہینہ' بہار کے جھونکے کی طرح ہے' جو کہیں اور سے اُڑ کر آتا ہے

میں تجھے دل کا چراغ لے کر ڈھونڈتی ہوں' بُجھے ہوئے سُورجوں کو پھر جلا جاتا ہے تیری وعدوں کا مہینہ

پریوں کے دیس کے سارے طلسم کُھلتے ہیں' صدیوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگاتا ہے تیرے وعدوں کا مہینہ

لاکھوں سوال پوچھتی ہوں لیکن کوئی ہنکارا نہیں بھرتا' ہونٹوں کا درد پی کر' نظریں جھکا لیتا ہے' تیرے وعدوں کا مہینہ----]

چیتر

سورج کیتی کنڈ' سبھے تیلے سانبھ کے' اج پھگن بدھی پنڈ
ایہہ دی گھیاں تن سو پینسٹھ دہاڑاں ہنڈھ
چیتر پائی آن کے اک ہور ورھے دی گنڈھ
اج فیر وچھوڑا آکھدا' پچھیے رُتاں چھنڈ:
''سبھے راتاں میریاں' میں اک نہ دتی ونڈ''
میرے سجن کیتی کنڈ
سبھے یاداں سانبھ کے' اج عمر نے بدھی پنڈ

[سورج نے پیٹھ موڑی' سارے تنکے اکٹھے کر کے آج پھاگن نے اپنی گٹھڑی باندھ ہم نے یہ تین سو پینسٹھ دن بھی بسر کر لیے
چیت نے آکر ایک اور گانٹھ ڈال دی ہے

جدائی، اپنی چھ کی چھ رُتوں کو جھاڑ کر آج کہتی ہے: 'سب کی سب راتیں میری ہیں، میں نے ایک رات بھی، کسی کے حصے میں نہیں دی
میرے ساجن نے پیٹھ موڑ لی
ساری یادیں سمیٹ کر میں نے اپنی گھٹڑی باندھ لی]

سنجوگ۔۔۔ویوگ

چارے چشمے وگے
ایہہ کلراں دی وادی ماہیا، اس وادی وچ کجھ نہ اُگے
سارے عشق سراپے جاندے، ایتھے کوئی حسن نہ پگے
سبھے راتاں ساکھی ہوئیاں، اکھیاں بہہ بہہ تارے چگے
ایس راس دے پاتر وٹے، نات سے دا کھیڈن لگے
ایہہ اجے وارتا او ہوا وہی دکھانت، جیہی سی اگے
ایہہ میں جاناں، فیر دی چاہواں، تیرا عشق حیاتی تگے
بُھلیا چکیا ور کوئی لگے، تیرا بول بھوئیں نہ ڈگے
انج کسے نہ وچھڑ ڈٹھا، انج نہ کوئی ملیا اگے
ہوئے سنجوگ۔ویوگ اکٹھے، ہنجھو اں دے گل ہنجھو لگے

[اس بنجر وادی میں، میرے محبوب! کچھ نہیں اُگتا
ہر عشق کو یہاں شراپ ملتا ہے اور سارے حُسن یہاں ہار جاتے ہیں
اس طرح کسی نے بچھڑ کر نہیں دیکھا، نہ اس سے پہلے کوئی اس طرح ملا ہوگا
سنجوگ اور وجوگ ایک ہو گئے ہیں اور آنسو آنسوؤں سے گلے مل رہے ہیں۔۔۔]

''رسیدی ٹکٹ'' میں، میں نے ذکر کیا ہے کہ میری نظم ''ست ور ہے'' (سات برس) چھپی تو کسی طرح

پاکستان میں پہنچ گئی۔ اسے سجاد حیدر نے پڑھا اور مجھے لکھا ''میں تمہیں ملنے کے لیے ہندوستان آنا چاہتا ہوں۔ تم بہت اداس دکھائی دیتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ اس کی باتیں کروں گا جس کے لیے تم نے نظم ''ست ورہے'' لکھی ہے'' سجاد دہلی آیا۔ اٹھارہ دن رہا۔ رات میرین ہوٹل میں اور دن بھر میرے پاس۔ میرا ہر حال میں دوست۔ اس وقت مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ نظم صرف عشق کے طوفان میں سے ہی جنم نہیں لیتی یہ دوستی کی پرسکون ندیوں کے پانی میں سے بہتی ہوئی بھی آ سکتی ہے۔ سجاد جب واپس جانے لگا تو میں نے نظم ''وے پردیسی'' لکھی۔ یہ وہی نظم ہے جس کے بارے میں' میں نے ابتدائی صفحات میں کہا ہے ''سنیہڑے (سندیسے) کی تمام نظمیں اس وقت کی ہیں جب میری محبت نے دیوانگی کا عالم دیکھا' سوائے ایک نظم کے

وے پردیسیا!

پورب نے کجھ لبھیا' کیہڑے امبر پھول
ہتھ کٹورا دودھ دا' وچ کیسر دتا گھول
چانن پیتی رات وے' ست سگندھاں ڈوہل
امبر فصلاں پکیاں' تاریاں لائے بوہل
آساں کتنی بیٹھیاں' تند سُبک تے سوہل
بھر بھر لچھے پین وے' ریشمی اٹی جھول
ار پی کس نے جندڑی' چارے کنیاں کھول
بدلاں بھر لئی اکھ وے' پوناں بھر لئی جھول
پنچھی تولے پراں نوں' ٹاہناں گئیاں ڈول
لے دے کھنب وکنڈڑے' یاں رہ پوساڈے کول' وے پردیسیا!

[عشق کے طوفان کی بجائے' دوستی کی پُرسکون ندیوں میں سے بہہ کر آتی ہوئی' یہ خوبصورت نظم' خوشی اور اُداسی کی ملی جلی کیفیت کا اظہار کرتی ہے' جب خوشبوئیں ڈال کر' رات روشنی کی لپائی بھی کرتی ہے اور امیدیں ریشم کے بھر بھر لچھے بھی اُتارتی ہیں ایسے میں جب کوئی اپنی رُوح کسی کی نذر کر دیتا ہے تو بادلوں کی آنکھ بھر آتی

ہے' پرندے اڑنے لگتے ہیں اور ٹہنیاں ڈول جاتی ہیں۔ اور نظم کی آخری سطر رو پڑتی ہے: ہمیں بازار سے پرے لے دو یا پھر ہمارے پاس ہی رہ جاؤ پردیسی رے!]

اشوکا چیتی

لکھاں نغمے' تڑپ تڑپ کے' آکھن ہوٹھاں سیتی
ساڈے سچیاں ساہواں اندر سچیاں پوناں گھولو
دنیا دے اس ویہڑے اندر کھڑے اشوکا چیتی

اشوکا اور چیتی دو پھولوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والا جنوبی ہندوستان کا ایک سُرخ پھول ہے جس کی ایک ڈنھل میں سے تقریباً ستر ڈنھلیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر ڈنھل پر چار چار پتیاں لگتی ہیں۔ یہ پھول ہر موسم میں مل سکتا ہے۔

[چوڑے پتوں والے اشوکا چیتی کا سُرخ پھول اس طرح ہے جیسے سمندر کی لہروں سے سوج طلوع ہو رہا ہو
نہ یہ سورج بلند ہوتا ہے اور نہ نیچے آتا ہے' دھرتی جیسے تھم گئی ہو اور وقت ساکت ہو گیا ہو
تیرا پیار اشوکا چیتی میرے دل میں کھلا ہے' نظر کی ایک ڈنھل پر ستر خواب جُڑے ہیں
ہماری سچی سانسوں میں سچی ہوائیں گھولو تاکہ دنیا کے اس آنگن میں بھی اشوکا چیتی کھلے

کنیا کُماری

شِواں نوں پیار کرن والی' اک کُماری' جو دکھنی بھارت دی آخری چٹان کول' ساگراں دے سنگم اُتے' ہزاراں ورھیاں توں پتھر دا بُت بنی شِواں نوں اڈیک رہی اے۔ آکھدے نیں کہ کماری دا تے شِواں دا ویاہ۔۔۔ دن متھیا گیا سی۔۔۔ سو پر سار کسے کاں دے بولن توں پہلاں ویاہ ہونا ضرور دا سی پر کسے دوکھی نے کاں دی

جھوٹی آواز وچ کُرلا دتا تے ویاہ دی گھڑی اُلنگھی گئی۔۔ کُماری دے ہتھ وچ پھڑے ہوئے چوَل تے سندھور ڈُلھ گئے۔ اوہ چوَل ہُن پتھر ہو کے ساگر دے کنکر بن گئے ہن۔ تے سندھور دے ڈُلھن کر کے اوتھوں دی ساری مٹی لال رنگ دی ہُندی اے

ساگر دے وچ ساگر ملیا' کون لکیراں پاوے
لہراں جیکن نیلم پریاں' جھُمر چھِڑ دا جاوے
راتاں جیکن رُوپ صراحیاں' ہوٹھاں اُتے اڑیاں
کیسا سراپ دِتوئی سانوں' بوند نہ پیتی جاوے
سارے شگن زمیں نے ڈُلھے' دونویں تلیاں خالی
پتھر بن کے اج کھلوتی' تیری شگناں والی
تیرے منہ دا صدقہ سانوں' جگ بیگانہ ہویا
بھری جوانی پتھر کر کے' لاج عشق دی پالی
اس دھرتی دیاں لکھاں دھیاں' میں نہ اک کُماری
عشق سے دا پتھر ہویا پتھر ہوگئی ناری
لکھاں عاشق پھڑ دے رہ گئے' ملن گھڑی نہ آئی
جھوٹھے کاں اجے نہ مُکے' بولن وارو واری
لکھاں بندھن بن کُرلانے کاواں رُوپ وٹایا
نیتی وِکدی' واد وکیندا' سکہ کُوڑ چلایا
چاول کنیاں پتھر ہوئیاں' ویکھ اساڈا جینا
مٹھا پھل عشق دی ٹاہنی' کسے نہ دندی لایا

[ساگر میں ساگر ملا ہے' انہیں کون جدا کرے
لہریں اس طرح ہیں، جسے نیلم پریاں جھوم ناچ رہی ہوں
راتیں جیسے روپ کی صراحیاں ہوں' ہونٹوں پر جھکی ہوئی

تو نے ہمیں یہ کیسا شراپ دیا ہے کہ ایک بوند بھی نہیں پی جاتی
سارے شگن زمین پر بکھر گئے ہیں' دونوں ہتھیلیاں خالی ہیں
پتھر بن کر' آج کھڑی ہے' تیری شگنوں والی
صرف میں ہی نہیں' اس دھرتی کی لاکھوں بیٹیاں کنواری ہیں
وقت کا عشق پتھر ہو گیا ہے' جس نے عورت کو بھی پتھر بنا دیا ہے
لاکھوں عاشق وصل کی ساعت کو پکڑتے رہ گئے لیکن وہ ساعت نہ آئی
جھوٹے کوے ابھی تک ختم نہیں ہوئے' وہ باری باری بول رہے ہیں
چاول اور دانے پتھر ہو گئے' ہماری زندگی تو دیکھو
عشق کی ٹہنی کا میٹھا پھل کسی کو کھانا نصیب نہیں ہوا]

توں نہیں آیا

چیتر نے پاسا موڑیا
رنگاں دے میلے واسطے پُھلاں نے ریشم جوڑیا' توں نہیں آیا۔۔۔
ہوئیاں دو پہراں لمیاں
داکھاں نوں لالی چھوہ گئی' داتی نے کنکاں چمیاں' توں نہیں آیا۔۔۔
بدلاں دی دنیا چھا گئی
دھرتی نے بُکاں جوڑ کے' امبر دی رحمت پا لئی' توں نہیں آیا۔۔۔
رُکھاں نے جادو کر لیا
جنگل نوں چھوہندی پون دے ہوٹھاں چ شہد بھر گیا' توں نہیں آیا۔۔۔
اج فیر تارے کہہ گئے
عمراں دے محلیں اجے وی حُسناں دے دیوے بل رہے' توں نہیں آیا۔۔۔
کرناں دا جھرمٹ آکھدا
راتاں دی گوہڑی نیند چوں

حالے دی چانن جاگدا
توں نہیں آیا

[چیت نے رُخ پلٹا ہے' رنگوں کے میلے کے لیے پھولوں نے ریشم جوڑا' تو نہیں آیا
درختوں نے جادو کر دیا' جنگل کو چھوتی ہوا کے ہونٹوں میں شہد بھر گیا' تو نہیں آیا
آج پھر تارے کہہ گئے' عمر کے محلوں میں ابھی تک حُسن کے دیئے جل رہے ہیں' تو نہیں آیا
کرنوں کا جُھرمٹ کہتا ہے' راتوں کی گہری نیند میں' چاندنی ابھی تک جاگ رہی ہے' تو نہیں آیا۔۔۔]

مان سرو ور

دل دا مان سرو ور بھریا
تیریاں یاداں ایکن آیاں' جیویں ہنساں دی ڈار وے
راہواں نے اج کیسر ڈھوڑے
پانی پین چنہھ کے کنڈھے' لتھی جیویں بہار وے
کرناں جیویں مَولی دیاں لڑیاں
میڈھی دے وچ گُنڈن لگی' رات ہوئی نمیار وے
ست سرگھیاں مہندی گھولن
دھرتی دے ایس سالو دا' پر لبندا جائے لنگار وے
بھولا عشق ڈھوڑ دا جادو
ریت تھلاں وچ چمبا' کھڑیا' چُن چُن گئی آں ہار وے
اَج اڈیکاں زخمی ہوئیاں
نہ کوئی تیری واج سُنیندی' نہ کوئی پوے نُہار وے
دل دا مان سرو ور بھریا
اکھیوں سچے موتی چُگدی' ایہہ ہنساں دی ڈار وے

دل داماں سرود بھریا۔۔۔

[دل کا تالاب بھر گیا ہے' تیری یادیں اس طرح آئی ہیں جیسے ہنسوں کی ڈار آتی ہو
سات سکھیں مہندی گھولیں' لیکن دھرتی کے اس سالو (چادر) کی دھجیاں اُڑی جا رہی ہیں
دل کا تالاب بھر آیا ہے' ہنسوں کی یہ ڈار آنکھوں سے سچے موتی چُن رہی ہے
دل کا تالاب بھر گیا۔۔۔]

شوق صراحی

عشق پچھیندا اس نی جندے! لیکن دیہوں گزارے
جند کہے'' میں سپنے تیرے' مہندی نال شنگارے''
عشق پچھیندا اس نی جندے' لیکن نین روندے؟
جند کہے'' میں لکھاں تارے' زلف تیری وچ گُندے
عشق پچھیندا اس نی جندے' لیکن ورھے بتائے؟
جند کہے'' میں شوق تیرے نوں' سُولاں ویس ہنڈھائے''
عشق پچھیندا اس نی جندے' گھاو کیہیے کو چنگے؟
جند کہے'' میں رت جگر دی' سکناں دے سالو رنگے''
عشق پچھیندا اس نی جندے' کرم کیہیے کو کہیئے؟
جند کہے'' تیری شوق صراحیوں' دُکھاں دے دارو پیتے
عشق پچھیندا اس نی جندے لیکن عمرا بیتی؟
جند کہے'' میں نام تیرے توں' سد قربانی کیتی
عشق پچھیندا اس نی جندے! عاشق دا کیہہ کہنا؟
جند کہے'' تیرا ستھر چنگا بھنھ کھیڑیاں دا رہنا''

[عشق پوچھتا ہے زندگی! تو نے اپنے دن کیسے گزارے! زندگی نے جواب دیا 'میں نے تیرے خواب' مہندی سے سجائے ہیں

عشق پوچھتا ہے زندگی! نین کیونکر روتے ہیں؟ زندگی کہتی ہے ''میں نے تیری زُلف میں لاکھوں تارے گوندھے ہیں

عشق پوچھتا ہے اے زندگی! تو نے یہ برس کیسے گزارے؟ زندگی کہتی ہے' میں نے تیرے شوق کی خاطر کانٹوں کے ملبوس پہنے

عشق پوچھتا ہے اے زندگی! گھاؤ کس حد تک اچھے ہیں' زندگی کہتی ہے ''میں نے جگر کے خون سے شگنوں کے سالو رنگے ہیں

عشق نے سوال کیا اے زندگی! تو نے کس طرح کے عمل کیے؟ زندگی جواب دیتی ہے ''تیری شوق صراحی میں سے' دُکھوں کا دارو پیا ہے۔۔۔]

1956 کے آخر میں سنیہڑے کو ساہت اکیڈمی کا ایوارڈ ملا تھا۔ من کی جس کیفیت سے میں ان دنوں گزری اس کا تفصیلی حال ''رسیدی ٹکٹ'' میں لکھا ہے۔ ایک کیفیت اس میں لکھنے سے رہ گئی تھی۔۔۔ ایک دن من کی آگ میں جل کر ایک نظم لکھ رہی تھی۔

''رات میری جاگتی ہے تیرا خیال سو گیا۔۔۔''

کہ ایک سطر سے اگلی سطر تک پہنچنے کے دوران میں ہاتھ میں پکڑے قلم کے ساتھ بے خبری میں اپنی بانہوں اور ٹانگوں پر کچھ لکیریں سی کھینچتی رہی۔ پھر نظم لکھی تو کچھ ہوش آیا۔ دیکھا۔۔ میرے بازو اور ٹانگوں پر کئی سو بار ساحر' ساحر لکھا ہوا تھا۔ اس دن میرے ہونٹوں نے لفظ ''ہنسی'' کا بھیانک پن دیکھا۔ میں ایک نظر اس کاغذ کی طرف دیکھ رہی تھی جس پر لکھا ہوا تھا ''خیال تیرا سو گیا'' اور ایک نظر اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کی طرف دوڑا رہی تھی جہاں روئیں روئیں پر اس کا خیال جاگ رہا تھا اور اپنے آپ پر مجھے ایک عجیب بھیانک ہنسی آئی۔

یہ نظم 1957 کے شروع میں لکھی تھی لیکن کتاب ''اشوکا چیتی'' چھپ چکی تھی اسی لیے یہ نظم 1959 میں کتاب ''کستوری'' میں چھپی۔

رات میری جاگدی

رات میری جاگدی' تیرا خیال سوں گیا۔۔۔

سورج داڈ کھڑاسی کرناں کسے نے توڑیاں

تے چن دا گوٹا کسے امبر توں اج ادھیڑ ہ

کیوں کسے دی نیندنوں سپنے بلاوادے گئے

تارے کھلو۔تے رہ گئے' امبر نے بوہا ڈھولیا

ایہہ زخم میرے عشق دے' سینے سی تیری یاد نے

اج توڑ کے ٹانکے اساں' دھاگہ وی تینوں موڑیا

کتنی کو وردناک ہے اج پیڑ میرے عشق دی

سبھناں اڈیکاں دا اساں' پترا ایہدے چوں پاڑیا

دھرتی دا ہوکا نکلیا' اسمان نے سسکی بھری

پھلاں دا سی اک قافلہ کتے تھلاں چوں گزریا

کنک دی اک مہک سی بارود نے اج پی لئی

ایمان سی اک امن دا اوہ وی کتے وکدا پیا

دنیا دے چانن نوں اجے صدیاں الانبھے دیندیاں

اس پیار دی رُتے تساں۔نفرت نوں کیکن بیجیا

انسان دا ایہہ خون ہے انسان نوں کچھدا پیا

عیسیٰ دے ہوٹھ نوں سولی نے کیکن چمیا؟

ایہہ کس طرح دی رات سی اُج دوڑ کے لنگھی جدوں

۔۔چن دا اک پھُل سی' پیراں دے ہیٹھاں آ گیا

سورج دا گھوڑا ہنکیا' چانن دی کاٹھی کہہ گئی

عمرا دے پینڈے ماردا' دھرتی دا پاندھی روپیا

ایہہ رات کیوں اج تریہہ گئی' کالخ ہے کجھ کہندی پئی

کدھرے کسے وشواس دا' شاید ٹہنا چمکیا

راتاں دی اکھ پھرکدی' خورے ایہہ چنگا شگن ہے

امبر دی اُچی کندھ تے' چاند دا تیلا لشکیا

کیہ کرے ٹاہنی کوئی' پھلاں دی ممتا ماردی

انسان دی تقدیر نے انسان نوں اج آکھیا:

حُسناں کے عشقاں والیو! جاوو۔۔لیاوو موڑ کے

وشواس دا اِک جاتر' جتھے وی کِدھر ٹُر گیا

[رات میری جاگتی ہے' تیرا خیال سو گیا۔۔۔

سورج کا درخت کھڑا تھا' کسی نے کرنیں توڑ لیں' اور کسی نے چاند کا گوٹا آسمان سے ادھیڑ لیا

کسی کی نیند' سپنے کیوں بلا وادے گئے تارے تکتے رہ گئے' آسمان نے اپنا دروازہ بھیڑ لیا

میرے عشق کے ان زخموں کو تیری یاد نے سیا تھا' آج ٹانکے توڑ کر' ہم نے اس کا دھاگہ بھی تجھے لوٹا دیا

میرے عشق کی کتاب کتنی دردناک ہے' جتنے انتظار تھے' ان کا ورق ہم نے اس میں سے پھاڑ لیا

دھرتی نے آہ بھری' آسمان نے سسکی لی' جب پھولوں کا ایک قافلہ جلتے صحراؤں سے گزرا

گندم کی ایک مہک تھی' اسے بارود نے پی لیا' امن کا ایک ایمان تھا' آج وہ بھی کہیں بک رہا ہے

صدیاں ابھی تک دنیا کی روشنی سے شکوے کر رہی ہیں کہ تم نے پیار کے اس موسم میں' نفرت کا بیج کیسے بویا؟

یہ انسان کا خون ہے اور انسان سے پوچھ رہا ہے کہ عیسیٰ کے سچے ہونٹ کو سُولی نے کیسے چوما؟

یہ کس طرح کی رات تھی کہ آج جب دوڑ کر گزری تو چاند کا ایک پھول (اُس کے) پیروں تلے آ گیا

سورج کا گھوڑا ہنہنایا' روشنی کی کاٹھی اُتر گئی' عمر کی مسافت طے کرتا ہوا' ایک مسافر رو پڑا

یہ رات آج کیسے سہم گئی اور تاریکی بھی کچھ کانپ رہی ہے' شاید کہیں' کسی یقین کا جگنو چمکا ہے

راتوں کی آنکھ پھڑ پھڑا رہی ہے شاید یہ نیک شگون ہو' آسمان کی اونچی دیوار پر روشنی کا تنکا چمکا ہے

کوئی ٹہنی کیا کرے' وہ پھولوں کی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہے' انسان کی تقدیر نے' آج انسان سے کہا:

حسن اور عشق والو! جاؤ اور یقین کا جاندار تمہیں جہاں کہیں بھی ملے اسے لے آؤ ۔۔۔

ساحر کی محبت میں 'میں نے اپنے فن کا وہ عالم دیکھا ہے ۔ جب مجنوں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا خود لیلیٰ بن جاتا ہے جب آدمی خود سے خدا ہو جاتا ہے ۔ کتاب کستوری کی سب سے پہلی نظم 'چیت' اسی کیفیت کی نظم ہے ۔۔۔ اپنے ہی عشق کی بلندی کے فخر سے بھری ہوئی اور دوسری نظم '' چانن دیاں چھناں '' (روشنی کے چھینٹے) بھی زندگی سے مہنگی یادوں پر فخر کرتی ہوئی ۔

چیتر

چیتر دا ونجارا آیا چگلی موڈھے چائی وے!
اساں وہاجی پیار 'کستوری' وہندی رہی لوکائی وے
ساڈا ونج مبارک سانوں 'کل ہسدی سی جیہڑی دنیا
اوہ دنیا اج ساڈے کولوں چٹکی منگن آئی وے
برہا دا اک کھرل بلوری 'جندڑی دا اساں سرمہ پیٹھا
روز رات نوں امبر آکے منگدا اک سلائی وے
دو اکھیاں دے پانی اندر 'کل اساں کجھ سپنے گھولے
ایہہ دھرتی اج ساڈے ویہڑے 'چُنی رنگن آئی وے
ککھ کان دی جُھگی ساڈی 'جند دا مُوہڑا کتھے ڈاہیے
ساڈے گھر اج یاد تیری دی 'چننگ پراہونی آئی وے

[ہمارا بیوپار ہمیں مبارک ہو'کل جو دنیا ہم پر ہنستی' آج وہ ہم سے چٹکی (بھر حصہ) مانگنے آئی ہے کل ہم نے آنکھوں کے پانی میں کچھ خواب گھولے' یہ دھرتی آج میرے آنگن میں چنر یا رنگنے آئی ہے
ہماری یہ تنکوں کٹیا' ہم زندگی کا موہڑا کہاں بچھائیں' ہمارے گھر' تمہاری آج مہمان بن کر آئی ہے

ہمیں ہماری آگ مبارک' سورج ہمارے در پر آیا ہے'اس نے ہم سے ایک کوئلہ مانگ کر' آج اپنی آگ سلگائی ہے۔۔۔۔]

چانن دیاں چھٹاں

چانن دا اک چھنھ سی
تارے جھجراں بھر دے چھلکن وہنگیاں
چھٹاں پیتاں جند تے
چیتے آئیاں گلاں جندوں مہنگیاں
دھرتی سی کندیالڑی
امبر پلا اڑیا کھنگی لہہ گئی
بجھنی جندے میریئے!
لنگھدی لنگھدی رات کہانی پا گئی
نازک پوٹے دلاں دے
کرناں چوبھی سوئی دسر ہو گئی
یاداں بھانبڑ بالیا
لکھ بچائے پلے' کنی چھوہ گئی

[روح پر چھینٹے پڑے ہیں روح سے بھی مہنگی باتیں یاد آئی ہیں
دھرتی کانٹوں بھری تھی' آسمان کا پلو (ان کانٹوں سے) اُلجھا کھونچا لگ گیا
جاتے جاتے رات جو کہانی کہہ گئی' اسے پوچھ میری زندگی!
دل کی پوریں (کتنی) نازک ہوتی ہیں' کرنوں نے سوئی چبھوئی اور وہ آر پار اُتر گئی
یادوں نے الاؤ بھڑکایا' لاکھ دامن بچایا' پھر بھی اس کا پلو (اس آگ سے) چھو گیا۔۔۔
ساحر کے ساتھ پھر بھی ملاقات ہوئی' تاریخ مہینہ کچھ یاد نہیں لیکن جو کچھ یاد ہے وہ یوں ہے۔۔۔وہ

سامنے ہو تو یوں ہوتا ہے جیسے کبھی دور گیا ہی نہیں اور دور ہو تو یوں ہوتا ہے جیسے کبھی پاس آیا ہی نہیں۔ ''کستوری''
میں اس جوگ، وجوگ کی کئی نظمیں شامل ہیں۔

فیر تینوں یاد کیتا

فیر تینوں یاد کیتا' اگ نوں چُمیا اساں
عشق پیالہ زہر دا' اک گھٹ فیر منگیا اساں
گھول کے سورج اساں' دھرتی نوں ڈوبا دے لیا
تاریاں دے نال کوٹھا' گگن دا لمبیا اساں
دل دے اس دریاؤ نوں' اج پار کرنا ہے اساں
ایس ڈاہڈے جگ دے' لہنگے نوں فر کھنگیا اساں
فیر چنبا سپنیاں دا رات بھر' کھڑ دا رہیا
عشق دی اس ڈھنگھنی تے' عمر نوں پنجیا اساں

[پھر تمہیں یاد کیا' جیسے آگ کو چوما ہو
زہر کے عشق پیالے سے' ہم نے ایک گھونٹ اور مانگا
ہم نے سورج کو گھول کر اس میں دھرتی کو رنگ لیا
آسمان چھت کی' تاروں سے لپائی کی
پھر خوابوں کا چمپا رات' کھلتا رہا
عشق کے پنجے میں ہم نے اپنی عمر کو دھنا

عشق

جیوں صدیاں دی تواریخ چوں' پترے پاٹن سیاں

اج تھتاں تے رُتاں اُتے' دُھوڑ دیاں سوتھیاں
اج میرے پیراں نوں چمن' سبھ بیلے دیاں جوہاں
اکھیاں دے وچ ساگر کنبن' پین کتوں نہ سوہاں
میرے ساہ وچ تڑپ اُٹھیاں' ریت تھلاں دیاں لوؤاں
اکو سچی لاٹ ڈھونڈدا' سبھ مذہباں دا دھواں
لکھ نطشے کدھروں آ کے' میٹ جان سبھ لیہاں
عشق سدا امبر وچ رکھدا' اس دھرتی دیاں نیہاں

[جس طرح صدیوں کی تواریخ میں سے سینکڑوں ورق پھٹ جاتے ہیں' اسی طرح موسموں پر دُھول کی سوتھیں جم گئی ہیں
جنگل کی تمام چراگاہیں آج میرے پیروں کو چوم رہی ہیں' آنکھوں میں سمندر کانپتے ہیں پھر کہیں سے (اُس کی) خبر نہیں آتی
ریگستانوں کے روئیں میری سانسوں میں تڑپ اُٹھے ہیں' سارے مذہبوں کا دھواں' (محبت کی) ایک ہی سچی لو کا متلاشی ہوتا ہے
لاکھ نطشے آکر ساری بنیادوں کو مٹا جائیں' عشق' اس دھرتی کی بنیادیں' ہمیشہ آسمان میں رکھتا ہے۔

ملاقات

رات کُڑی نے دعوت دتی
تارے جیکن چول چھڑیندے' کس نے دیگاں چاہڑیاں
کسی نے آندی چن صراحی
چانن گھٹ شراب دا' تے امبر اکھاں گاہڑیاں
دھرتی دا اج دل پیا دھڑکے
میں سنیا اج ٹاہناں دے گھر' پھل پراہونے آئے وے

اس دے اگوں کیہ کجھ لکھیا
ہن اینہاں تقدیراں کولوں کیہڑا پچھن جائے وے
عمرا دے اس کاغذ اُتے
عشق تیرے انگوٹھا لایا' کون حساب چُکائے گا قسمت نے اک نغمہ لکھیا
کہندے نیں' کوئی اج رات نوں اوہیو نغمہ گائے گا
کلپ برچھ دی چھاویں بہہ کے
کام دھین داڈدھ پسمیا' کس نے بھریاں دوہنیاں کیہڑا اسنے ہوا دے ہوکے
چل نی جندے! چلیئے' سانوں سدن آئیاں ہونیاں

[رات کی ناری نے دعوت دی' تارے چاولوں کی طرح صاف کیے گئے' کسی نے دیگیں چڑھائی ہیں
چاندی کی صراحی سے چاندنی کی شراب کا گھونٹ پی کر' آسمان کی آنکھیں گہری ہوگئیں
آج دھرتی کا دل دھڑک رہا ہے' سنا ہے کہ شاخوں کے گھر' آج پھول مہمان بن آئے ہیں
اس سے آگے کیا کچھ لکھا ہے' (یہ بات) اب تقدیر سے پوچھنے کون جائے رے!
عمر کے اس کاغذ پر تمہارے عشق نے انگوٹھا لگایا ہے (اس کا) حساب کون چکائے گا
قسمت نے ایک نغمہ لکھا' کہتے ہیں آج رات کوئی' اُسی نغمے کو گائے گا
ہوا کی آہیں کون سنے' زندگی! چل ہمیں تقدیر بلانے آئی ہے]

میل

میرا شہر جدوں توں چھوہیا
امبر آکھے مٹھاں بھر کے' اج میں تارے واراں
دل دے پتن میلہ جڑیا
راتاں جیوں ریشم دیاں پریاں' آئیاں بنھ قطاراں
تیرا گیت جدوں میں چھوہیا

کاغذ اُتے اُگھڑ آئیاں کیسر دیاں لکیراں
سورج نے اج مہندی گھولی
تلیاں اُتے رنگیاں گئیاں اج دونویں تقدیراں

[دل کے پتن پر میلہ لگا ہے
راتیں جیسے ریشم کی پریاں ہوں' قطار اندر قطار اُتر آئیں
جب میں نے تیرے گیت کو چھوا
کاغذ پر زردی کی لکیریں اُبھر آئیں
سورج نے مہندی گھولی ہے
آج دونوں تقدیریں میری ہتھیلیوں پر رنگی گئی ہیں]

گھوکر

ایہہ کون سونا ہلی سُنیدی
تے کون سوہتھاں گھڑیا۔۔۔چند چرخڑا
ایہہ کون سو پھُل کپاہ دے
میں جھولی دے وچ پایا۔۔تیرا نیو بڑا
عمرا دی اک ماہل وٹیندی
صدقاں والا پایا۔۔۔اکو منکڑا
ورھے ورھے دا نڈھا لبھندا
مُکن وچ نہ آوے۔۔تیرا ابر بڑا
کاک مریندا جھٹی لوکا
تندا جے نہ ٹُٹی۔۔۔وقت نکھڑدا
کت جا اک میل دی پُونی

گھو کر دیندی جاوے۔۔۔اک سنیہڑا

[اس نظم میں وصل اور فراق کی یہی ملی جلی کیفیت چرخے کے پورے عمل سے واضح ہوتی ہے۔ شیشم کا یہ کیسا درخت ہے اور کون سے ہاتھوں نے رُوح کے اِس چرخے کو تراشا ہے۔ اس چرخے پر برہا کی لچھیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ چرخے کی گھوکر کا سندیسہ محبوب کے وصال کی ایک مسلسل ٹوک ہے]

یاداں

آئیاں سی یاداں تیریاں، محفل لگا کے بیٹھیاں
موم بتی جند والی رات بھر جلدی رہی
سورج دے منہ نوں ویکھ کے تیرا اُلیکھا پے گیا
جان لگی رات اُس نوں گھٹ کے ملدی رہی
دنیا دے اس نظام نے پیراں نوں پائیاں بیڑیاں
میں۔۔۔قلم دے ہتھ سنیہے عمر بھر گھلدی رہی
دنیا دی کالخ نوں اسیں ساری عمر رنگدے رہے
اک کرن تیرے عشق دی، راتاں دے وچ رُلدی رہی
دنیا دے سارے رہنما، راہواں نوں توڑن جان دے
اک تند تیرے پیار دی ہے دھرتیاں ولدی رہی
بہت وڈا غم دِلاں دا، پر وڈیرا غم ہے ایہہ
کہ پیار ورگی چیز کیوں پیراں دے وچ رُلدی رہی

[تیری یادیں آئیں، محفل لگا کر بیٹھیں، رات بھر رُوح کی موم بتی جلتی رہی
سورج کے چہرے کو دیکھ کر تیرا خیال آ گیا، رخصت ہوتے وقت، رات اس سے اچھی طرح بغل گیر ہوتی رہی

دنیا کے اس نظام نے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں' میں عمر بھر قلم کے ہاتھ' اپنے سندیسے بھیجتی رہی
دلوں کا غم بہت بڑا ہے لیکن اس سے بڑا غم یہ ہے کہ پیار جیسی چیز پیروں میں کیوں رلائی جاتی ہے]

عمر دی رات

عمر دی اک رات سی
ارمان رہ گئے جاگدے' قسمت نوں نیند آ گئی
رات دی چنگیر وچ چنبہ جدوں چنیا کے
ہتھوں چنگیر ڈگ پئی
صدق سی کجھ انج دا
جتھے وی سر جھکا لیا' دہلیز جا پئی اوس دی
عشق کلی جان ہے
دھرتی کڑا واسا ک ہے' اسمان دا رشتہ ہے کیہ
موت توں واقف اسیں
اکثر ایہہ ساڈی زندگی' اوس دا ذکر کردی رہی
رات نوں' اسمان توں ٹٹدا ہے تارا جدوں وی
آوندی ہے یاد آپنی---

[عمر کی اک رات تھی' (اُس رات) ارمان جاگتے رہ گئے لیکن قسمت کی نیند آ گئی
ہمارا صدق کچھ ایسا تھا کہ جہاں بھی سر جھکا لیا' اُسی کو تیری دہلیز جانا
ہم موت سے آگاہ ہیں' ہماری یہ زندگی' اُس کا اکثر ذکر کرتی رہی ہے
جب بھی رات آسمان سے' کوئی تارا ٹوٹتا ہے' اپنی یاد آتی ہے---]

ونج

اَج چن سورج' جندد' پئے ونج کردے نیں
تے چانن دے نال دونویں' چھابے اُلردے نیں
فیر سانوں کیوں تیری دہلیز چیتے آ گئی
لکھاں خیال پوڑیاں چڑھدے اُتردے نیں
رات نوں سپنا ترانیاں تے موتی دے گیا
اج فیر دل دی جھیل وچ' کجھ ہنس تردے نیں
ایہہ بات تیرے عشق دی' کیکن مکاواں گے اسیں
ہر رات نوں تارے ہنگارا آن بھردے نیں
دے مارو تھلاں دا انت نہ پیندا کوئی
دے سارے قافلے' اس راہ گزردے نیں
ایہہ ہے زندگی' ہر وارا اپنے قول نوں
فیر ساڈے جیہے اعتبار کردے نیں

[پھر کیوں ہمیں تیری دہلیز یاد آ گئی؟ لاکھوں خیال سیڑھیاں چڑھ اُتر رہے ہیں
ہم کیسے' تیرے اس عشق۔۔۔کو پورا کریں گے' ہر رات' ستارے آ کر ہنکارہ کرتے ہیں
رات کے ریگستانوں کا کوئی انت نظر نہیں آ تا'۔۔۔تمام قافلے' اسی راہ سے گزرتے ہیں
زندگی ہر بار عہد توڑ دیتی ہے اور ہمارے جیسے کچھ لوگ دوبارہ اعتبار کر لیتے ہیں]

قلم دا بھیت

جد کدے گیت میرا' کوئی کدھرے گائے گا
ذکر تیرا آئے گا۔۔۔توں نہیں آیا۔۔۔

چھڈ کے چھاواں نوں، جو راہواں نوں چُمے گا کوئی
اوس نوں ہر قدم میرا، نظر آوندا جائے گا۔۔۔
مان سچے عشق دا ہے، ہُنر دا دعویٰ نہیں
قلم دے ایس بھیت نوں، کوئی علم والا پائے گا
شہرتاں دی ڈھوڑ ڈاہڈی، ڈھوڑ اُونچاں دی بڑی
رنگ دِل دے خون دا، کوئی کیویں بدلائے گا۔۔۔
عشق دی دہلیز تے سجدہ کرے گا جد کوئی
یاد فیر دہلیز نوں میرا زمانہ آئے گا
توں نہیں آیا۔۔۔

[جب کبھی، کوئی، کہیں بھی، گیت میرا گائے گا
ذکر تیرا آئے گا۔۔۔تو نہیں آیا۔۔۔
چھوڑ کر چھاؤں کو، چومے گا کوئی جو راستے
ہر قدم میرا اِسے دِکھلائی دے جائے گا۔۔۔
مان سچے عشق کا ہے، فن کا کچھ دعویٰ نہیں
یہ قلم کا راز، کوئی علم والا پائے گا
شہرتوں، بدنامیوں کی دُھول ہے ظالم بہت
رنگ دل کے خون کا، کیسے کوئی بدلائے گا۔۔۔
عشق کی دہلیز پر سجدہ کرے گا جب کوئی
یاد پھر دہلیز کو میرا زمانہ آئے گا۔۔۔
تو نہیں آیا۔۔۔]

اوپر والی نظم ''قلم کا راز'' میں نے اس وقت لکھی تھی جب لاہور بک شاپ کے مالک سردار جیون سنگھ جی نے اپنے ماہانہ اخبار ''ساہت سماچار'' کے چھ شمارے امرتا پریتم نمبر کے طور پر چھاپے تھے اور مجھے بھی اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے یہ نظم لکھی جو ایک طرح سے میری سوانح تھی۔ اس عرصہ میں ایک

بار ساحر کا بمبئی سے فون آیا تھا۔ شاید دہلی میں ملنے کے بعد میں اسے کچھ دیر بمبئی جا کر بھی یاد رہی تھی۔۔۔ بمبئی پہنچ کر اس کا ایک ہی فون آیا تھا اور فون پر سنی اس کی آواز کو میں نے اپنی نظم ''آواز'' میں لکھا تھا۔

آواز

ورھیاں دے پینڈے چیر کے' تیری آواز آئی ہے
کسی دے پیراں نوں جیویں' کسے نے مرہم لائی ہے
اج کسے دے موہڈھیاں توں اک ہما لنگھیا جیویں
چن نے اج رات دے والاں چ پھُل ٹنکیا جیویں
نیندر دے ہوٹھاں چوں جیویں سپنے دی مہک آوندی ہے
پہلی کرن جیوں رات دے متھے تے سگن لاوندی ہے
ہر اک حرف دے بدن چوں تیری مہک آوندی رہی
محبت دے پہلے گیت دی پہلی سطر گاوندی رہی
حسرت دے دھاگے جوڑ کے' سالو اسیں اُندے رہے
برہا دی ہچکی وچ وی شہنائی نوں سُندے رہے۔۔۔
ورھیاں دے پینڈے چیر کے' تیری آواز آئی ہے۔۔
سسکدے ہوٹھاں نے سگناں دی پہلی سطر گائی ہے۔۔۔

[تیری آواز برسوں کی مسافت کو چیر کر آئی ہے' جیسے کسی نے کسی کے پیروں پر مرہم لگایا
آج جیسے کسی کے سر پر ہما نے پرواز کی ہو' چاند نے رات کے بالوں میں پھول ٹانکا ہو
جیسے اس کے ہونٹوں سے خواب کی مہک آ رہی ہو' جیسے (سورج) پہلی کرن رات کی پیشانی کو شگن دے رہی ہو
حرف کے بدن سے' تیری خوشبو آتی رہی' محبت گیت کی' پہلی سطر گاتی رہی

ہم، حسرت کے دھاگوں کو جوڑ کر چادر بنتے رہے، برہا کی ہچکی میں بھی شہنائی کی آواز سنتے رہے
برسوں کی مسافت کو چیر کر تیری آواز آئی ہے، سسکتے ہونٹوں نے شگنوں کی پہلی سطر گائی ہے۔۔۔]

''کستوری'' میں چھپی کچھ اور نظمیں بھی ساحر کے لیے ہی ہیں۔ لیکن نظم 'ہچکی'' صرف مایوسی ہی کی نہیں بلکہ موت کے احساس کی حدوں کو بھی چھو کر لکھی ہوئی نظم ہے۔ مایوسی کو آخری تقدیر مان کر۔

ہچکی

ہونٹھ کجھ اسمان دے ہلدے پئے، کول ہو کے سُن ذرا اج دھرتیے!
ایہہ کسے عیسیٰ دے او ہو حرف نیں، جو او ہنے سولی نوں آکھے سن کدے۔۔۔
رات دی بھٹھی نوں کس نے بالیا، کھولدی ہے دیگ سورج دی کیویں
بات ہے دنیا دی دنیا والیو! دیگ وچ پھر بیٹھنا ہے عشق نے۔۔۔
ذکر سی مارو تھلاں دے کرم دا، رُک گیا ساہواں دا چلدا قافلہ
لکھ رہیا اے، کون ساڈا مرثیہ، ٹٹ رہیا تارا کوئی اسمان تے۔۔۔
ہتھ دی مہندی کسے نے پونجھ کے، فیر باہنواں توں کلیرا کھولیا
کون عاشق فیر دانا بادا، جا رہیا تیراں نوں ہچکی سونپ کے۔۔۔
سامنے رُکھاں دیاں قبراں کئی، لاش ہے پھُلاں دی موہڈھا دے دیو
قلم نے کجیا ہے، جیکن عشق نوں، ذکر ہندے رہن گے اس کفن دے۔۔۔

[زمین! قریب ہو کر سن، آج آسمان کے ہونٹ ہل رہے ہیں
یہ کسی عیسیٰ کے وہی لفظ ہیں جو اس نے سولی سے کہے تھے
رات کی بھٹی کس نے دہکائی ہے، کیسے سورج کی دیگ اُبل رہی ہے
دنیا والو! یہ دنیا کی بات ہے، عشق کو پھر اس دیگ میں بیٹھنا ہے
ریگستانوں کے کرم کا ذکر تھا، سانسوں کا چلتا قافلہ رک گیا ہے

آسمان سے ایک تارا ٹوٹا ہے' کون ہمارا مرثیہ لکھ رہا ہے

دانا باد کا کون سا عاشق (مرزا صاحباں کی لوک داستاں کی طرف اشارہ ہے) پھر تیروں کو بچکی سونپ کر جا رہا ہے

سامنے درختوں کی ان گنت قبریں ہیں' پھولوں کی لاش کو کندھا دو

قلم نے جس (کفن سے) عشق کو ڈھانپا ہے' اس کفن کے تذکرے دیر تک ہوتے رہیں گے]

''کستوری'' کی نظموں میں نجوگ۔ وجوگ کے معنی پہلی بار تبدیل ہوئے۔ اس وقت جب میں نے مایوسی کو اپنی آخری تقدیر مان لیا تھا۔ 1955 کے آخر میں امروز کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ ''آخری خط'' کا ایک ٹکڑا میں نے ساحر کے نام لکھا تھا یہ جب دوسری کہانیوں کے ساتھ کتابی صورت میں چھپنے لگی تو نو یگ والے پریتم سنگھ جی نے مصور نریندر سیٹھی کو کتاب کا ٹائٹل بنانے کو کہا۔ میں نے اس کی گہرائی کے بارے میں خود مصور سے بات کرنی چاہی تو جواب میں سیٹھی نے کہا۔۔۔ میرا ایک دوست ہے'اندر جیت' (ان دنوں امروز اپنا نام (اندر جیت لکھتا تھا) اگر وہ یہ ٹائٹل بنائے تو اس گہرائی کو گرفت میں لا سکتا ہے۔ پھر شاید یہ بات دیوندر تک پہنچی۔ وہ شمع رسالے میں کام کرنے والے مصور اندر جیت کو جانتا تھا۔ ایک دن اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ میں نے کہانیوں کے نام لکھوائے اس نے کتاب کا پہلا صفحہ بھی بنایا اور کہانیوں کے نام بھی لکھے۔ یہاں سے واقفیت شروع ہوئی جو صرف کاموں اور کتابوں کی باتوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ پھر 1956 میں جب شمع والوں نے اپنے ادبی پرچے آئینہ کا ایک خاص نمبر شائع کرنا تھا اور اس میں ''آخری خط'' کے اُردو ترجمے کو چھاپنا تھا تو اس کے لیے ایک دن امروز سے آ کر پوچھا تھا ''جس کے نام یہ'آخری خط' لکھا ہوا ہے اگر مجھے اس کا نام معلوم ہو تو میں ڈیزائن میں اس کی شبیہ بنا دوں'' لیکن میں جواب دینے سے جھجک گئی تھی۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ سو واقفیت ابھی صرف واقفیت تھی دوستی تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ امروز کی دوستی کو میں نے تفصیل سے رسیدی ٹکٹ میں بیان کیا ہے یہاں صرف متعلقہ نظموں کا ذکر کروں گی۔ میں کہہ رہی تھی۔۔۔ کہ کستوری کی نظموں میں پہلی بار نجوگ' وجوگ کے معنی بدلے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے مایوسی کو اپنی آخری تقدیر پر مان لیا تھا۔ تو میرے باخبر من سے بھی پہلے بے خبر من نے زندگی کے بند دروازے پر ایک دستک سنی۔ اوپر تلے تین نظمیں لکھی گئیں۔ محسوس ہوا۔۔۔ جیسے قلم نے مجھ سے ہی پوچھے بغیر

لکھ لی ہوں۔ وہ تین نظمیں یہ تھیں

آواز

درنہ بھیڑ حیاتیے! رکھ صدق دی لاج
ریت تھلاں وچ آ رہی، قدماں دی آواز
درنہ بھیڑ حیاتیے! اجے نہ مُکا پندھ
سورج دھوڑے چاننا، دھرتی ملے سگندھ
درنہ بھیڑ حیاتیے، پل کو ہور اُڈیک
لکھ ہنیرے چیردی، چانن دی اک لیک
درنہ بھیڑ حیاتیے! امبر بدھی چھن
تارے بالن دُھونیاں، الکھ جگاوے چن
درنہ بھیڑ حیاتئے، ویکھ ذرا اک دیر
متھے کرناں بنھ کے، سورج آیا فیر
درنہ بھیڑ حیاتیئے، ویکھ ذرا کو ٹھہر
کاسہ پھڑیا عشق نے، جندڑی پاوے خیر

[زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو، میرے صدق کی لاج رکھ لو، صحراؤں میں قدموں کی آواز آ رہی ہے
زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو، ابھی فاصلے ختم نہیں ہوئے، سورج روشنی چھڑک رہا ہے اور زمین خوشبوئیں لگا کر بیٹھی ہے
زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو، لحہ بھر اور انتظار کر لو، روشنی کی ایک لکیر گھور اندھیروں کو چیرتی آ رہی ہے
زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو، دیکھو کہ سورج، ایک بار پھر، پیشانی پر کرنیں باندھ کر آ گیا ہے

زندگی! اپنے دروازے بند نہ کرو' لمحہ بھر ٹھہر جاؤ' عشق نے کاسہ، گدائی ہاتھ میں لیا ہے' زندگی! اسے بھیک دو۔۔۔]

اک رات

سپیاں دے آہلنے وچ' رات بھر کوئی رہ گیا
گل سی نروان دی' پر جسم خاکی کہہ گیا
ادب اکھیاں دا اسیں قدماں دے وچ دھردے رہے
رات دی دہلیز تے' تارے دعا کردے رہے
ساہ کسے دا پرس کے' ہر ساہ جدوں لنگھدا رہیا
پت جھڑاں دی زُلف وچ' کلیاں کوئی منگدا رہیا
چن دا اک جام سوہنی رات نے بھریا جدوں
عمر دا موتی کسے نے واریا اک نظر توں
جگمگاندے دیویاں دا قافلہ لنگھدا رہیا
قول کئی دیندا رہیا تے قول کئی منگدا رہیا
نظر دا دریا تے جندڑی رات بھر تردی رہی
دین دا سی ذکر' دنیا رات بھر کردی رہی

[ہم آنکھوں کے ادب کو' قدموں میں رکھتے رہے' ستارے رات کی دہلیز پر' دعائیں مانگا کیے رات نے جب چاند کا خوبصورت جام بھرا' کسی نے ایک نظر پر سے' اپنی عمر کا موتی وار دیا جگمگاتے چراغوں کا قافلہ رواں دواں رہا' وہ کسی سے وعدے لیتا رہا' کسی سے اقرار کرتا رہا رُوح' تمام رات نظر کے دریا میں تیرتی رہی' دین کا ذکر تھا' جو رات بھر دنیا کرتی رہی۔۔۔]

محبت نوں

توں سُن مُلکاں والیئے! بول نہ مُکھوں بول

سپنے بیجن واسطے، زمیں نہ ساڈے کول

توں سُن قولاں والیئے! قولاں دی تقدیر

دھرتی چھاواں مُکیاں، امبر مُکیا نیر

توں سُن مہراں والیئے! کیہ کجھ ساڈے جوگ

ہنجھو موتی عشق دے، اکھاں چگن چوگ

توں سُن داتاں والیئے! ہیرے کردی سوٹ

پہن نہ سکے جندڑی، ہیرے چُمن ہوٹھ

توں سُن لاٹاں والیئے! چاننِ بھجی واٹ

عاشق جنداں بالدے، اُچی رکھدے لاٹ

سُول صراحیاں والیئے! ویکھ تڑپدے رِند

زخمی ہون کہانیاں، قصے توڑن جند

[سُن املکوں کی ملکہ، لیکن منہ سے کچھ نہ بول کہ خواب بونے کے لیے ہمارے پاس زمین نہیں ہے۔

اقرار کرنے والی! اُس کہ اقراروں کی تقدیر کیا تھی، زمین پر چھاؤں ختم ہوگئی اور آسمان کے آنسو نہ رہے

مہر بھری! اُس کہ کیا کیا (ستم) ہمارے لیے نہیں تھے، آنسو، عشق کے موتی ہیں اور آنکھیں چوگ چگتی ہیں۔۔۔

روشنیوں کی لو بھڑکانے والی! پگڈنڈی روشنی سے بھیگی ہوئی ہے، عاشق رُوح (کا دِیا) جلاتے ہیں اور لو اونچی رکھتے ہیں۔۔]

یہی۔۔۔ نجوگ اور وجوگ کے بدلے ہوئے معنی ہیں کیونکہ یہ تینوں نظمیں بھی کستوری میں شامل ہیں اور ایک وہ نظم ''سمندر سے'' بھی جو میں نے امروز کے ساتھ بمبئی جاکر لکھی تھی۔ وہاں ساحر سے نہیں ملی تھی لیکن نہ ملنے کا درد ملنے سے کہیں زیادہ تھا۔ میری اس نظم کے درد کو ساحر نے بھی محسوس کیا۔ بعد میں جب وہ دہلی آ کر

ملا میں نے بتایا کہ میں بمبئی گئی تھی اس کو یقین نہیں آیا لیکن جب نظم دکھائی تو اسے یقین آ گیا۔ اس رات میں پہلی بار اس کے سامنے روئی تھی۔ کہا تھا "یوں کئی برس ایک چپ میں گزر جائیں تو کیا تم نہیں سمجھتے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے؟"

اس رات میں نے پہلی بار دیکھا کہ ساحر رو دیا ہے وہ صرف رویا لیکن اس نے اپنی برسوں کی خاموشی کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا یہ خاموشی اس کے اندر پتہ نہیں کہاں تھی، کیسی تھی کہ جس تک اس کا اپنا ہاتھ بھی نہیں پہنچتا تھا یا شاید پھر وہ اسے اپنے آپ تک رکھنا چاہتا تھا پتہ نہیں۔ کستوری کی وہ نظم ہے۔

ساگرنوں

توں سُن چھلاں والیا! ایہہ کون سو کالی راتڑی
ایہہ کون سو چندا سنیند ا، اج دل وچ آ گئی چھل وے
توں سُن موتیاں والیا! وے چوداں رتناں والیا!
اج سپی دے وچ سانبھ لے اک ساڈے دل دی گل وے
سھو گندھ چترا وے کُھلے، عشق جالرو کلا چڑھیا
ایہہ کیہی کو بیڑی اج دی، تے کیہا کوناپو کل وے
دل دے پانی، چھل جو اُٹھی، چھل دے پیریں سفر سنیندا
کرناں سانوں سدن آئیاں، سورج دے گھر چل وے
توں سُن چھلاں والیا۔۔۔

[سُن رے لہروں والے! یہ کیسی کالی رات، یہ کس چندا کی بات، آج آئی دل میں لہر رے
سُن رے موتیوں والے! اور چودہ رتنوں والے! آج سیپ کے دل میں سنبھال لے ہمارے دل کی بات رے۔۔۔
دل کے پانی میں جو لہر اُٹھی، اُس لہر کے پاؤں میں بات سفر کی، کرنیں ہمیں بلانے آئیں، سورج کے گھر چل رے۔۔
سُن رے لہروں والے۔۔۔]

☆☆☆☆
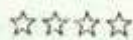
امرتا پریتم

لپی انتر: افضل ساحر، منیر گجر، طاہر سندھو

آکھاں وارث شاہ نوں!

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول!
تے اج کتابے عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول!
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لِکھ لِکھ مارے وَین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن:
دے دردمنداں دیا دردِیا! اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب
کسے نے پنجاں پانیاں وچ دتی زہر رلا
تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا
ایس زرخیز زمین دے لُوں لُوں پُھٹیا زہر
گِٹھ گِٹھ چڑھیاں لالیاں پُھٹ پُھٹ چڑھیا قہر
ویہو وِلسّی واء پھر ون ون وگی جا
اوہنے ہر اک وانس دی وَنجھلی دتی ناگ بنا
پہلا ڈنگ مداریاں منتر گئے گواچ
دوجے ڈنگ دی لگ گئی جنے کھنے نوں لاگ
لاگاں کیلے لوک مونہہ بس پھر ڈنگ ہی ڈنگ
پلو پلی پنجاب دے نیلے پے گئے انگ
گلیوں ٹُٹے گیت پھر ترکلیوں ٹُٹی تند

ترنجنوں ٹمیاں سہیلیاں 'چرخڑے گھوکر بند
سے سیج دے بیڑیاں لڈن دتیاں روڑھ
سے ڈالیاں پینگھ اج پپلاں دتی توڑ
جتھے وجدی سی پھوک پیار دی وے اوہ ونجھلی گئی گواچ
رانجھے دے سبھ ویر اج بھل گئے اوہدی جاچ
دھرتی تے لہو وسیا قبراں پیاں چون
پریت دیاں شاہزادیاں اج وچ مزاراں رون
اج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اج کتھوں لیایئے لبھ کے وارث شاہ اک ہور
اج آکھاں وارث شاہ نوں توہیں قبراں وچوں بول!
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

☆☆☆☆

امرتا پریتم

اک درد سی
جو سگریٹ دی طرح میں چپ چاپ پیتا ہے
صرف کجھ نظماں ہن
جو سگریٹ دے نالوں میں راکھ وانگن جھاڑیاں......

☆☆☆☆

ترڑ کے گھڑے دا پانی

وے میں ترڑ کے گھڑے دا پانی
کل تک نہیں رہنا...

ایس پانی دے کن تریہائے
تریہہ دے ہوٹھاں وانگوں
اوہ میرے ٹھنڈے گھٹ دیا مترا!
کہہ دے جو کجھ کہنا...

اج دا پانی کیکن لاہوے
کل دی تریہہ دا قرضہ
نہ پانی نے کتیں بجھنا
نہ پلے وچ رہنا...

ویکھ کہ تیری تریہہ ورگی
ایس پانی دی مجبوری
نہ ایس تیری تریہہ سنگ ٹرنا
نہ ایس ایتھے بہنا...
اج دے پنڈے پانی لشکے
تریہہ دے موتی ورگا
پر اج دے پنڈے نالوں کل نے
چپر وانگوں لہنا...

دے میں ترٹ کے گھڑے دا پانی
کل تک نہیں رہنا...
☆☆☆☆

رَب خیر کرے

رب خیر کرے میرے ویڑھے دی
کہ جس تھاں رانجھن ڈیرا کیتا
اوتھے دھمک سنیندی کھیڑے دی...

اج چارے کندھاں دین دہائیاں
کہ اج ملکی دی بُکل وچوں
دودھ دیاں بوندا ں کہنے چرائیاں...
رب خیر کرے میرے ویڑھے دی...

اج بیلے دیاں مجھیں روئیاں
کہ اج ایس میری دونی دے وچ
کس نے لہو دیاں دھاراں چوئیاں...
رب خیر کرے میرے ویڑھے دی...

اج ہر اک بستہ پچھن آیا
کہ اج میرے مدرسے وچوں
سچ دا اکھر کہنے چھپایا...
رب خیر کرے میرے ویڑھے دی...

وے پردیسیا!

پورب نے کجھ لبھیا
کیہڑے انبر پھول!

ہتھ کٹورا دودھ دا
وچ کیسر دتا گھول

چانن لپی رات وے
ست سوگندھاں ڈولھ

انبر فصلاں پکیاں
تاریاں لائے بوہل

آ ساں کتن بیٹھیاں
تند سبک تے سوہل

بھر بھر لچھے پین وے
ریشم اٹی جھول
ار پی کس نے جندڑی
چارے کنیاں کھول

بدلاں بھرلئی اکھ وے

پوناں بھرلئی جھول

پنچھی تولے پراں نوں
ٹاہناں کھیاں ڈول

لے دے کھنبھ وکنڈڑے
جاں رہو ساڈے کول
وے پردیسیا!
☆☆☆☆

توں نہیں آیا

چیتر نے پاسا موڑیا
رنگاں دے میلے واسطے پھلاں نے ریشم جوڑیا...
توں نہیں آیا...

ہوئیاں دوپہراں لمیاں
داکھاں نوں لالی چھوہ گئی داتی نے کنکاں چُمیاں...
توں نہیں آیا...

بدلاں دی دنیا چھا گئی
دھرتی نے بُکاں جوڑ کے ابر دی رحمت پی لئی...
توں نہیں آیا...

رُکھاں نے جادو کرلیا
جنگل نوں چھوہندی پون دے، ہوٹھاں چ شہد بھر گیا...
توں نہیں آیا...

رُتاں نیں جادو چھوہنیاں
چناں نے پائیاں آن کے راتاں دے متھے دَونیاں...
توں نہیں آیا...

اج پھیر تارے کہہ گئے
عمراں دے محلاں اجے وی حُسناں دے دیوے بل رہے...
توں نہیں آیا...

کرناں دا جھرمٹ آکھدا
راتاں دی گوڑھی نیند چوں حالے وی چانن جاگدا...
توں نہیں آیا...

☆☆☆☆

سفر

گھراں چڑھیاں پوربوں انبرلدے انج
چڑھدا سورج ٹھنبیا چانن دتا ونج

سکے سرور رحم دے ہنس نہ بوڑی چنجھ
کرم کسے دے، ہو گئے متھے نالوں رنج

گھراں پینڈے چلیاں چارے کنیاں رُنج
لیکاں پھڑیاں گھٹ کے گھُرا نہ جاوے کھُنج

کالے کوہ مکاندیاں ڈھیاں لتھیاں اُنج
سورج ہویا سرکڑا کرناں ہوئیاں مُنج

گھراں پچھم ملیا لاہی ہجر دی ونجھ
پکڑاں پیر لپیٹیاں ہتھوں چھٹ کے ونجھ

ہونٹھ نہ ہاڑے سکدے اکھ نہ سکدی ہنجھ
لہہ لہہ جان دیہاڑیاں ہوئی عمر دی سنجھ

☆☆☆☆

اک خط

ایہہ رات ساری، تیرے
خیالاں چ گزار کے
ہُنے ہُنے جاگی ہاں، سُتے
پیشتاں اُسار کے

ایہہ رات بھجکن رحمتاں دی
بدّلی ورھدی رہی
ایہہ رات، تیرے وعدیاں نوں
پوریاں کردی رہی

پنچھیاں دی ڈار بن کے
خیال کوئی آوندا رہے
ہونٹھ میرے، ساہ تیرے دی
مہک نوں پیندے رہے

بہت اُچیاں بن دیواراں
روشنی دِسدی نہیں
رات سُپنے کھیڈدی ہے
ہور کجھ دسدی نہیں

ہر میر انغمہ جیویں

میں خط کوئی لکھدی رہی
حیران ہاں، اک سطر وی
تیرے تک پُجدی نہیں؟

☆☆☆☆

محبت

سورج مکھی محبت تیری
دل دا انبر میرا
دھرتی آکھے اکھیں ڈٹھا
ہویا عشق سویرا...

سورج مکھی محبت تیری
جیوں جیوں چڑھدی آوے
ندیاں دے وچ چانن وگے
دھرتی مل مل نھاوے...

سورج مکھی محبت تیری
کرناں سالو اُنیا
سیج تیری دے پھلاں وچوں
اج میں انہد سُنیا...

سورج مکھی محبت تیری
ستے رنگ، کھنڈدے
کنکاں نے اج سُچے موتی
زُلفاں دے وچ گُندے...

☆☆☆☆

عمر دی رات

عمر دی اک رات سی
ارمان رہ گئے جاگدے قسمت نوں نیند آ گئی

رات دی چنگیر وچ چنبا جدوں چُنیا کسے
ہتھوں چنگیر ڈگ پئی

صدق سی کجھ انج دا
جتھے وی سر جھکا لیا دہلیز جاپی اوس دی

عشق کلی جان ہے
دھرتی گرواوساک ہے' اسمان دا رشتہ ہے کیہ!

موت توں واقف اسیں
اکثر ایہہ ساڈی زندگی اوس دا ذکر کردی رہی

رات نوں اسمان توں ٹُٹدا اے تارا جدوں وی
آوندی ہے یاد اپنی!

☆☆☆☆

ناگ منی

ڈاڈھا گھنا عقل دا جنگل
علم جیویں اک رُکھ چنن دا
من دا سپ گوڈیاں والا
متھے دے وچ منی چمکدی
پوناں دے وچ پھن پھیلایا ...

پولے پیر سپادھا آیا
ہوٹھاں اُتے بین عشق دی
ہتھ آس دی انھی پچھی
کچا دودھ محبت والا
من دا سپ پٹاری پایا ...

بیٹھ سپادھا اک چوراہے
بین وجاوے سپ کھڈاوے
کدے سپ نوں گل وچ پاوے
ہسے راگ اتے وِکھ رووے
سارا لوک تماشے آیا ...

☆☆☆☆

پنجواں چراغ

نہ کوئی وضو تے نہ کوئی سجدہ
نہ منت منگن آئی
چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ
میں پنجواں بالن آئی...

دکھاں دی گھانی میں تیل کڈھایا
متھے دی تیوڑی اک رُوں دی بتی
میں متھے دے وچ پائی...
چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ
میں پنجواں بالن آئی...

سوچاں دے سرورہتھاں نوں دھوتا
متھے دا دیوا میں تلیاں تے دھریا
تے روح دی اگ چھوہائی...
چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ
میں پنجواں بالن آئی...

دہیں تاں دتا سی مٹی دا دیوا
میں اگ دا سکن اوسے نوں پایا
تے امانت موڑ لیائی...
چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ
میں پنجواں بالن آئی...

کُفر

اج اساں اک دنیا ویچی
تے اک دِین وہاج لیائے
گل کُفر دی کیتی ...

سُپنے دا اک تھان اُنایا
گز کو کپڑا پاڑ لیا' تے
عمر دی چولی سیتی ...

اج اساں انبر دے گھڑیوں
بدل دی اک چپنی لاہی
گھٹ چاننی پیتی!

گیتاں نال چُکا جاواں گے
ایہہ جو اساں' موت دے کولوں
گھڑی ہدھاری لیتی ...

☆☆☆☆

بُرکی

جندڑی نے کل رات نوں
سُپنے دی اک بُرکی بھنی
پتہ نہیں ایہہ خبر کس طرح
پہنچ گئی انبر دے کنیں ...

وڈیاں کھمبھاں خبر سُنی
تے لمیاں پنکھاں خبر سُنی
تے گھنڈیاں موہناں خبر سُنی
تے تکھیاں نونہواں خبر سُنی ...

ایس بُرکی دا ننگا پنڈا
ایس خوشبو دا کجن پاٹا
نہ کوئی من دا او ہلا ملیا
نہ کوئی تن دا جھنگل ماٹا ...

اک جھپٹے بُرکی کھسی
دوویں ہتھ ولوندھر گھتے
اک جھپٹے گلھ جھریٹی
نوہندرو جی موہنہ دے اُتے ...

موہنہ دے وچ بُرکی دی تھاویں

رہ گئیاں بُرکی دیاں گلاں
انبر دے وچ اُڈن پپیاں
راتاں جیویں کالیاں الاں ...

جند گُڑی نے کل رات نوں
سُپنے دی اک بُرکی بھنی
پتہ نہیں ایہہ خبر کس طرح
پہنچ گئی انبر دے کنیں ......

☆☆☆☆

انب دا بوٹڑا

بُت تُسا ڈڑا
انب دا بوٹڑا
وے کیہڑے باگاں وچ لگڑا!

واڑاں تے والی
وڈارن سانوں
سانوں تاں ایہہ دُکھڑا ڈاڈھڑا!

باہواں دی گولی
لسبڑی ٹاہنی
لُس لُس کردے
ہوٹھاں دے پتے
تے ساہواں دا بُور سگندھڑا!

سوں جانی مالن!
سوں جانی بھلیے!
انباں دی راکھی
بُرہا جو بیٹھڑا
تے گل وچ گیت سُریلڑا!

جندتاں ساڈی
کوئل سُنیندی
جیبھے تاں ساڈی
ورجت چھالا
تے درداں دا ساک اساڈڑا!

عرض

رات گروی دی جھولی پاؤ
چِٹا چن گری دا کھوپا'
نال ستارے مُٹھ چھوہارے...

پیڑ گروی دی جھولی پاؤ
دل دا زخم زریل ثبوتا'
نال چھوہارے ہنجھو کھارے...

پورب نے پنگھوڑا ڈاہیا'
جدّی پشتی اک پنگھوڑا
سورج پیا رات دی کُکھے ...

ہوٹھاں نے پنگھوڑا ڈاہیا'
جدّی پُشتی اک پنگھوڑا
گیت پیا پیڑاں دی کُکھے ...
انبر وید سُو ید سنیندا
رات گروی دی ناڑی ٹوہوے'
پیڑ گروی دی ناڑی ٹوہوے ...

عرض کرے دھرتی دی جائی!
رات کدے دی بانجھ نہ ہووے!
پیڑ کدے دی بانجھ نہ ہووے!

عشق

کمینہ...... بے وفا...... بدذات...... ظالم......
تتیا! توں یاد آویں تاں کنے ہی لفظ
میری چھاتی دی اگ پچدے' اُگ ٹھکدے' مونہوں نکلدے ...

پھر پنڈے دا ماس جد وتری مٹی دی طرح ہوندا
تاں سارے لفظ میرے سکیاں ہوٹھاں توں جھڑدے
تے مٹی دے وچ بیاں دی طرح ڈِگدے ...

میں ہفی ہوئی دھرتی دی طرح جد چُپ ہوندی
تاں چندرے' میرے انگاں دے وچوں اُگ پیندے
نیلے پھُلاں دی طرح ہسدے
تے میں اِک کالے کوہ ورگی' مہک مہک جاندی ......

☆☆☆☆

اک ٹوٹا دُھپ دا

مینوں اوہ ویلا یاد ہے
جد اک ٹوٹا دُھپ دا
سورج دی اُنگلی پکڑ کے
نھیر ے دا میلا ویکھدا
بھیڑاں دے وچ گواچیا

سوچدی ہاں سہم دا تے
سُنج دا وی ساک ہوندا ہے
میں جو ایس دی کجھ نہیں
پر ایس گواچے بال نے
اک ہتھ میرا پھڑ لیا

توں کِتے لبھدا نہیں
ہتھ نوں چھوہندا پیا
نِکا تے تتا اک ساہ'
نہ ہتھ دے نال پر چدا
نہ ہتھ دا کھاندا وساہ
نھیر اِکتے مُکدا نہیں
میلے دے رَولے وچ وی
ہے اک عالم چُپ دا'
تے یاد تیری ایس طرح
جیوں اک ٹوٹا دُھپ دا

☆☆☆☆

دیکھ کبیرا رویا

سامراج: اک ناواں شاہی بُوٹا
ہور آدم دی ذات کھبل دے وانگ اُگی
حاکم دا حکم اونا ہے' اوہ جناوی کرلوے
تے پرجادی پیڑ اونی ہے اوہ جنی وی جرلوے...

سماج واد: منکھ ذات دا مندر
تے اک اِٹ جنی' اک منکھ دی قیمت
ایہہ مندر دی لوڑ ہے' جاں ٹھیکیدار دی مرضی
کہ جیہڑی اٹ نوں' جتھے وی چاہے دھرلوے...

درد دا احساس' کجھ گولیاں سوچاں تے زخمی آزادی
بہت وڈے عیب ہن' جے بندہ عیب دور کرلوے
تے پھیر کدی چاہے
تاں روح دا سونا ویچ کے' طاقت دا پیٹ بھرلوے...

دینی حکومت: رب دی رحمت
صرف تکنا ورجت' تے بولنا ورجت!
تے سوچنا ورجت

ہور بندے دے موڈھیاں تے لکھاں سوالاں دا بھار
مذہب بڑا مہربان ہے' ہر سوال نوں خریدا

پر جے کدے بندہ جواب دائہہ ار کرلوے...

تے بندے نوں بُھکھ لگے
تاں بہی روٹی ''رب'' دی اوہ چُپ کر کے کھالوے
صبر شُکر کرلوے، تے پھیر جے چاہے
تاں اگلے جنم واسطے کجھ اپنے نال دھرلوے...

تے لوک راج: گاہل گلوچ دی کھیتی
کہ بندہ جدوں مونہہ مارے تاں جنی چاہے چرلوے
گُھرلی وی بھرلوے، تے پھیر جدوں چاہے
تاں اوسے گاہل گلوچ دی بہہ کے جُگالی کرلوے...

☆☆☆☆

لفظ
ارتھاں دا گنجھ ڈھکن نوں
میں اوہناں دے گل وچ لفظاں دی بانہہ پوائی سی
ایہہ لفظ خورے کیسے مریادا تے نہیں رکدے؟
اج اوہی لفظ، ارتھاں دا ریپ کر کے مڑے ہن
تے شرمسار میرے ساہویں اکھ نہیں چکدے...

☆☆☆☆

بستی

اسیں کھنگھ' دُھواں' مچھر' مکھیاں تے جُواں
تے گوڑے دا ڈھیر' تے ہڈیاں دے پنجر
سارے پروٹیسٹ کردے ہاں
تے دسدے ہاں کہ سانوں ایہہ بستی الاٹ ہوئی ہے
کجھ سُپیاں نے رات نوں جھگیاں بنائیاں ہن
ایہہ جھگیاں اٹھاؤ' کیوں کہ ایہہ 'ان آتھورائزڈ' ہن

☆☆☆☆

آ تم ملن

میری سیج حاضر ہے
پر جتی تے قمیض وانگن
توں اپنا بدن وی اتار دے
پرانہہ مُوڑھے تے رکھ دے
کوئی خاص گل نہیں
ایہہ اپنے اپنے دیس دا رواج ہے!

☆☆☆☆

میرا پتہ

اج میں اپنے گھر دا نمبر مٹایا ہے
گلی دے متھے تے لگا گلی دا ناؤں ہٹایا ہے
تے ہر سڑک دی دِشا دا ناؤں پونجھ دتا ہے...
سبھ نمبراں... نشانیاں دا گوڑا ہو نجھ دتا ہے

پر جے تساں مینوں ضرور لبھنا ہے
تاں ہر دیس دے، ہر شہر دی،
ہر گلی دا بوہا ٹھکورو
ایہہ اک سراپ ہے، اک ور ہے
تے جتھے وی سُتنتر روح دی جھلک پوے
سمجھنا اوہ میرا گھر ہے...

☆☆☆☆

فیملی فوٹو گراف

کندھ تے ٹنگی اک فیملی فوٹو گراف

ایہہ کھاکھاں نوں بپولدا دادا

(جیہنے اک وار پُتر نوں گھروں کڈھیا سی'

کہ اوہنے جاتوں باہری کڑی کیوں ویاہی سی)

ایہہ دنداں دانواں بیڑ لائی باپو

(جیہنے کُل دی لاج رکھن لئی پھیر اک کڑی

اپنی ذات دی ویاہی سی)

ایہہ ماں؛ جو ہُن بہت موٹی ہے تے کرسی دے وچ پوری نہیں آوندی

(تے جیہدے گلے وچ اجے وی سوکن دا تویت لمکدا)

ایہہ پُتر؛ جیہدے گوڈیاں تے بیٹھے ہور پُتر ہن

(اک موئی ووہٹی دا' اک نویں آئی دا)

تے ایہہ پیراں دے کول بیٹھی کُڑی

(ایہہ موئے بھائی دی نشانی ہے)

ایہہ تایا جی

(ایہہ ذرا آپ ہُدرے سن'

سودا دے نے ایہناں نوں بہت چر ہویا بے دخل کردتا اے)

ایہہ چاچا جی تے چاچی جی

(ہن کجھ جائیداد دا جھگڑا ہے' تے اوہ متھے نہیں لگدے)

تے ایہہ بھوا سورگ واسی ......

۔ تے ایہہ دھرم دی ماسی ......

جدکوئی نہیں جاندا کہ اوہ اک دوجے دا کیہ کرے

تاں رل کے بہن دی اوہ کیہی سوہنی جگت کڈھدے ہن!

اسیں وی سارے ہندو تے مسلمان' گورے تے کالے' عربی تے یہودی'
چیک تے روسی' امریکی تے ویتنامی
تے پرانہہ پٹھ موڑ کے بیٹھے ہوئے چینی بھرا
ایس طرح اک تصویر تے کھچا سکدے ہاں
تے جدوں فوٹوگرافر کہے گا ناؤ پلیز سمائل!
اسیں سارے اکو وار مسکراواں گے......

☆☆☆☆

سٹل لائف

ایہہ جلیاں والا
تے اوس دی کندھ وچ' چُپ چاپ بیٹھے' گولیاں دے چھیک

ایہہ سائبیریا
تے اوس دی زمین تے' چیکاں دے ٹکڑے' برف وچ جمے

کانسنٹریشن کیمپ
منکھی ماس دی ہواڑھ بھٹھیاں دی راکھ وچ سُتی

ایہہ کراکوے واچ
جیہدی گل وسوں' اک پتھر دے بُت وچ سمٹی

ایہہ ہیروشیما ہے
جو اک گُٹھے' اک پاٹے ہوئے دستاویز وانگ ڈِگا

تے ایہہ پراگ
جو ساہ گھٹ کے اج سنسر دی پیڈی مُٹھ وچ بیٹھا
ہر چیز چُپ تے اڈول ہے
صرف میری چھاتی دے وچوں' اک اُبھا ساہ نکلدا
تے دھرتی دا ہر ٹکڑا ہل جیہا جاندا......

☆☆☆☆

امروز چِتر کار

میرے ساہمنے ایزل دے اُتے اک کینوس پئی ہے
کجھ انج جاپدا
کہ کینوس تے لگا رنگ دا ٹوٹا

اک لال ٹاکی بن کے ہلدا ہے
تے ہر انسان دے اندر دا پشو اک سنگ چکدا ہے
سنگ تندا ہے
تے ہر کوچا گلی بازار اک 'رنگ' بندا ہے...

تے میریاں پنجابی رگاں وچ
اک چینی روایت گھولدی
گویا دی متھ بُل فائٹنگ ٹل ڈے تھ...

☆☆☆☆

وقت

ساہمنے اخبار سی ویکلی مرکری
تے نظر' خبراں دی تمنزلی عمارت تے کھڑی سی...
اچانک پیر تلکیا' تے اوہ اتلی چھت توں ڈگی
ہیٹھاں اشتہار دی اک ننگی سڑک سی
''اک خوشنما نیگرو عورت وکاؤ ہے......''

نظر' مودھے مونہہ اکھراں تے لگی رہی
تے گوڈیاں دے بھار سڑک تے ڈگی رہی......

وقت کِتے کولوں دی لنگھدا سی' اوس ویکھیا
سڑک توں چکیا
تے نظر نوں اوس نے اخبار دی تاریخ دسی
''منگل وار اُنی فروری' سن ستارھاں سو بائی......''

نظر سکی' تے اوہدا ہتھ پھڑ کے کہن لگی:
توں سچ مچ اوہی ایں کہ بدل چکا ایں؟
ایہہ...... توں...... کیہ...... کی...... تا؟
اوس اپنے ہوٹھ نوں دنداں چ ٹکیا' تے مونہہ پھیر لیتا......
پر مونہہ پھیرن توں پہلاں اوہ اک وار تکیا
تے شرمندہ جیہا کہن لگا'' کہہ نہیں سکدا
شاید اوہی ہاں'
پر ہن میں اشتہار دا شیشہ نہیں تکدا......''

میرے اتہاس دا اک پاتر

توں میرے اتہاس دا کیہو جیہا پاتر ؟

میری کندھ دے کیلنڈر چوں نکل کے
توں روز اوس دی تاریخ بدلدا تے مینوں اک نویں دینھوں وانگ ملدا !

کیلنڈر چوں باہر آ کے
توں سڑکاں تے نکل ٹردا ہیں تاں اک دھپ نکل آوندی ہے'
تے جتھے وی جیہڑی گٹھ گولی ہے' اوہ ہرے پتے دی طرح ہسدی ہے'
تے جتھے وی جیہڑی گٹھ میلی ہے' اوہ شرمسار ہوندی ہے !

پر ایہہ جو تیرا سبھاؤ ہے اتہاس دا سبھاؤ کرم ہے

اتہاس اک سُکھ دا ساہ لیندا ہے جد بھوت کال وچ بیٹھدا
تے اتناں دا پریشان ہوندا ہے جد ورتمان نوں بجھدا ...

سو ایس اتہاس دی خاطر
میں کئی وار تینوں کیلنڈر چ قید کیتا ہے
تے اُتے دیس کال دی اک مہر لائی ہے
تے اُتے کئی ازماں دے، کِل ٹھوکے ہن ...

پر توں میری کندھ دے کیلنڈر چوں نکل کے

پھیر اوس دی تاریخ بدلدا
تے نویں چنتا' نویں مکتی' ہتھ وچ لے کے
توں مینوں اک نویں دےنھوں وانگ ملدا...

تیری اک نویں دےنھوں دی عظمت
کہ میری ہوندی اک چھاویں گُٹھ نے
تیری دُھپ دا اک بول سن لیا'
تے جو اتہاس دا اسچاوک کرم ہے
پر تیرا اُسھاوک ہے اوہ میرا اُسھاوک بن گیا...

☆☆☆☆

پنجویں اُداسی

پنج سو ورھے
پنج سو کھڑاواں دے بکل
پیراں نے ہنڈھائے ہن؛
اج کلاں دی برسی ہے
سو پیر مسکرائے ہن...

ایہہ کلاں دا میلا ہے
تے پیراں واسطے
ایہہ پنجویں اداسی دا ویلا ہے...

بکل کھڑے ہن
صرف راہواں دی بات راہواں دے سنگ ٹُر دی گئی
تے پیراں دی گل پیراں دے سنگ کر دی رہی...

"پچھے دور کتے کلاں دی برسی ہے
تے برسی دا آہر پاہر ہے
تے اگے دور کتے پیر چُپ ہن
اوس ورقے دی طرح
جو ہر جنم ساکھی توں باہر ہے...

☆☆☆☆

نی مائے......

نی مائے! دس کیہڑیاں رُتاں آئیاں' میرے متھے وچ پھل کھڑیا
میرے تن دی تے من دی مٹی' گلابی جیہا رنگ چڑھیا...

اج کھڑی ہاں دہلیز اتے'
نی میں جاگدی تے نین میرے ستے
کیہنوں بھر کے کٹورا دیواں' کہ دُھپیاں والا دودھ کڑھیا...
میرا تن کھڑ ہوا من گولا'
نی میئوں رنگ دے بسنتی چولا
اساں چیتر ماہ دا لکھیا' سنہری جیہا خط پڑھیا...
کتوں جھانجراں دی واج پئی آوے'
نی میرا پیر ٹھمکدا جاوے
میرا اپنا بولیاں پاوے' کہ گِدھا میرے پنڈ وڑیا...
دس کیہڑیاں رُتاں آئیاں' میرے متھے وچ پھل کھڑیا...

آکھاں تے آکھاں میں کس نوں آکھاں
جاواں تے جاواں میں کیہڑے در جاواں
دیس تاں میرا سجن سنیندا
میں سجناں نوں آکھ سناواں
سجنا جی! پایا رُتاں نے پھیرا'
رنگ سگندھاں دا سوتر جھیرا
دیو وتاں دیو دل دا ٹیرن'

لا وو تاں لا وو کرتاں دی کھڈی

میں ننگی لوکائی اج آ کھن آئی

کہ بھاجی! اک جوڑا انا وو'

تے میرے بھوکھ دے گل وچ پا وو

تجن میرے ورتمان نوں سن لے' جیہدے ہتھ چ بھوکھ پھڑیا

اج کیہڑیاں رُتاں آئیاں' میرے متھے وچ پھل کھڑیا...

او میرے دوست! میرے اجنبی!

اک وار اچانک توں آیا

تاں وقت' اصلوں حیران

میرے کمرے چ کھلوتا رہ گیا...

ترکالاں دا سورج لہن والا سی

پر لہہ نہ سکیا

تے گھڑی کو اوس نے ڈبن دی قسمت وسار دتی'

پھر ازلاں دے نیم نے اک دہائی دتی

تے وقت نے بیتے کھلو تے چھناں نوں تکیا

تے گھابر کے باری چوں چھال مار دتی...

اوہ بیتے کھلو تے چھناں دی گھٹنا

ہن تینوں وی بڑی اچرج لگدی ہے

تے مینوں وی بڑی اچرج لگدی ہے

تے شاید وقت نوں وی پھیر اوہ غلطی گوارا نہیں

ہن سورج روز ویلے سر ڈب جاندا ہے
تے ہنیر اروز میری چھاتی وچ کھُبھ جاندا ہے'
پر بیتے کھلوتے چھناں دا اک سچ ہے
ہن توں تے میں' منا چاہیے جاں نہ
ایہہ وکھری گل ہے'
پر اوس دن وقت نے جد باری چوں چھال ماری سی
تے اوس دے گوڈیاں وچوں جو لہو سمیا سی
اوہ لہو
میری باری دے تھلے اجے تک جمیا ہویا ئے...

☆☆☆☆

سورج

بدلاں دے محلیں میرا سورج سُتا
جتھے باری نہ بوہا نہ پوڑی
تے صدیاں دے ہتھاں نے ڈنڈی جو لیکی
اوہ سوچاں دے پَیراں نوں سوڑی...

اوہدا نہ کوئی تھوہ نہ پتہ نشانی
میں جاناں تے جاناں اک چِنگ جیہی
میرے متھے نوں مُڑ مُڑ اوہڑی...

تے چاننی دی مہندی میں تلیاں تے لائی
اج دُکھاں دی کالی تے تگڑی راتے
اوہدی کرن جدوں مینوں بوہڑی...

بدلاں دے محلیں میرا سورج ستا
جتھے باری نہ بوہا نہ پوڑی...

☆☆☆☆

پُل

کل اساں دوہاں نے اک پُل جلایا سی
تے اک دریا دے کنڈھیاں وانگوں نصیب ونڈے...

بدن چھنڈے
تاں اک پنڈے دی ویرانی ایس کنڈھے سی
تے اک پنڈے دی ویرانی اوس کنڈھے...

پھیر رتاں نے جدوں وی کجھ پھُل دتے
تاں توں وی اوہ پنڈے توں توڑ دتے'
تے میں وی اوہ رتاں نوں موڑ دِتے
تے جھڑے پتیاں وانگوں
کنے ہی ورھے اساں پانی چ روڑھ دتے...

ورھے مُکے نیں' پر پانی نہیں مُکا'
تے وگدے پانیاں وچوں پر چھاویں تاں ویکھے'
پر موہنہ نہیں تکے...

تے ایس توں پہلاں
کہ کجھ وتھ تے کھلوتے اسیں مک جائیے
چل! کھنگر اں جیہے پنڈے پانی تے وچھائیے!

توں اپنے پنڈے تے پَیر رکھیں'

تے ادھے دریانوں لنگھ آویں!

میں اپنے پنڈے تے پیر رکھاں گی

تینوں اگوں دی ملاں گی...

☆☆☆☆

شکوہ

یار بدنیتیا!
جگوں تاں باہری ہوندی آہی
اتھا سوں باہری توں کیتی آ...
یار بدنیتیا!

توں تاں سنیند اساہاں داوالی
تے ساہاں داوالی ہو کے ہفیوں؟
پر جاتاں آ کی ہوندی آہی
توں الٹی راہ کیوں لیتی آ
یار بدنیتیا!

توڑے ہکا الانبھا ملنگل دتا
تے ہکے الانبھے تیرا ہیا تڑ ٹا؟
تیں لئی حیاتی دے لے الانبھے
ساڈی تاں عمر ابیتی آ...
یار بدنیتیا!

اوس رُکھ داوس کیہ دے مقدر
تے اوس ڈالی دیاں کیہ تقصیراں؟
تیں جیہے اک پنکھیر ودے سنگ
جیس اشنائی کیتی آ...

یار بدنیتیا!

شہر بھنبور رنہ کرے دھنگانا

چل یارا! بے کچھم جانا

موت دے تے تھل وی لنگھساں

اساں یاری تیں سنگ کیتی آ...

یار بدنیتیا!

☆☆☆☆

دوستو!

دوستو! اُداسیاں دا موسم بہت لمبا اے...
ساڈا اک شاعر اے جو کئی ورھیاں توں
جدوں وی کوئی ورھا جاندا اے
تاں قید با مشقت کٹ کے
قید چوں رہا ہوندے ورھے نوں مِلدا
تے پالے چ ٹھرکدے موڈھیاں اُتے
اوہدا پاٹا کھیس دیندا' اوہنوں الوداع کہندا
وقت دے اک موڑ اُتے چھڈ آوندا اے
تے کسے دی درگاہ اُتے
اکلا بیٹھ کے دُعا کردا اے
کہ آون والیا! سُکھ دا آویں! خیر دا آویں!

دوستو! ایہہ چندرا موسم بہت لمبا اے
بارود دی ہواواں وگدیاں
تاں رُکھاں دے لوے پتے رُکھاں توں ڈگ پیندے
ٹاہنیاں دی کُکھ روندی
رُکھ دیاں جڑھاں نوں ویہندی
تے آہندی: ایہہ کیہڑی تقدیر ہوندی اے
جو اکو مٹی دی رت نوں کئی فرقیاں وچ ونڈ دیندی اے
نفرت رگاں وچ وگدی
تاں ساری بددُعا ماواں دی کُکھ نوں لگدی...

ربا! تیرے دردمنداں نے اک خط لِکھیا سی
اپنے حال تے حوال دا'
کہ چانن روز چُنگلیاں کھاندا اے
تے ہنیرا گھراں دی کُنڈی کھول دیندا اے
روز بیندر دی چھت چوندی اے
باہر چیکاں دا مینہ وسدا
تاں اوہناں دے لیف بھج جاندے نیں...
اوہ ہانڈی وچ دال نہیں، خوف رِندھدے ہن
تے بکل سلُونے لئی'
وشواس دا ماسا گولُون
کسے ہٹی توں نہیں لبھدا...
پر اوہناں دا خط کِتے نہیں پہنچیا
کہ خط نوں بچ دا سرناواں نہیں لبھدا...

دوستو! دُعا منگو!
کہ موسم خوشگوار ہووے
گُہاڑیاں دی رُت بدلے
رُکھاں دی عُمر رُکھاں نوں نصیب ہووے!
ٹاہنیاں دے ویڑھے
ہرے ہرے پتیاں نوں جوانی دی دُعا لگے!
مُسافراں دے سِراں نوں چھاواں
تے راہواں نوں پھلاں دی اسیس مِلے!

دوستو! دُعا منگو

کہ اُداسیاں دا موسم بدل جاوے

سُورج دی کرن

جے متھے دی مِتر بنے

تاں وطناں دے ورقیاں اُتے

امن دی تاریخ لکھی جاندی

چن دی ٹکی

جے راہواں دی متر بنے

تاں پیراں دی سلامتی

ہنیرے دا مقدر بدل دیندی

دُعا منگو! کہ ورھا سُکھ دا آوے

خیر دا آوے

سورج دی کرن

انسان دے متھے دی مِتر بنے!

تے چن دی ٹکی

ہنیریاں راہواں دی گواہ ہووے!

دوستو! وطن توں وڈی

کوئی درگاہ نہیں ہوندی

وطناں والیو! دِل دا چراغ بال کے

درگاہ تے رکھو

تے اِک کدھرے ساڈا جو شاعر اے

اکلا بیٹھ کے دُعا کردا پیا
اپنی تے اوہدی دُعا دی
مقبولیت منگو!

کہندے نیں کہ بندیاں دے دُکھاں تے
جے دُعاواں دا ارگھ دیئے
تاں رب مہک جاندا اے...
محبت دے چراغ بالیے تاں
ساریاں چوں رب دِسدا اے
پُوناں چ رب مہکدا
تاں بندے دی دُعا قبول ہوندی اے!
☆☆☆☆

امرتا پریتم

آڑوواں تے جامنواں دے راکھے

''سوں گیا ایں گنگو؟''

''نہیں تایا۔''

پھیر دھپے کیوں پیا ہویا ایں؟ منجی نوں گھسیٹ کے چھاویں کر لے''

''اچھا تایا، تے گنگو اک آکڑ بھن کے اٹھ بیٹھا۔ منجی گھسیٹ کے اوہنے جامنو دے رکھ بیٹھاں کر لئی۔ اوہدی ننگی پٹھ اتے الانی منجی دے وان دیاں پڑیاں کھبھ گئیاں ہوئیاں سن۔ ہتھ نال پٹھ نوں ملدا اوہ مڑ السایا جیہا منجی اتے پیندا آکھن لگا۔

''آ بہو تایا!''

تائے نے اک وار سرا تانہہ کر کے جامنو دے رکھ ول ویکھیا۔ جامنوواں دا نیلا رنگ تائے دے سارے پنڈے وچ چمک اٹھیا۔ تے پھیر اوہ اک خمار دا بھریا ہویا منجی اتے بہہ گیا۔

''پواندی ول کیوں بہنا ایں تایا! ارانہہ ہو جا!''

''سانوں نہیں ایہہ دوّناں چھدیاں جوانا، تے نالے ایس وار رکھاں نوں جہو جیہا پھل پیا اے، اوہنوں ویکھ کے تاں دوّناں وی کولیاں لگدیاں نیں۔ قسم نال ایس وار تاں جامنو ایڈا گو بھلا اے، گنگ کدھرے لبھدی نہیں۔''

''ہاں تایا!''

''ایہو جیہا جامنو تاں ورھیاں پچھوں ویکھیا اے۔ دساں ورھیاں مگروں۔''

''میں وی ایہوای پیا سوچداساں تایا!''

''توں اوودوں خورے چودھاں ورھیاں دا سیں۔ پندرھاں دا ہوویں گا، رکھوں ایڈا پھل پیا سی۔ مار

ایڈا پچھل......... حالے تیرا پیو جیوندا سی......."

تائے دی ایس گل نال گنگو دے کنان وچ اپنے پیو دا بڑا لٹک والا ہوکا بھر گیا.........." جا مورا لائے نیں، کے پالائے نیں، کاے رلائے نیں........." تے نال ہی گنگو دے والاں وچ اک جلون ہوئی جویں کوئی اپنیاں پتلیاں پتلیاں انگلاں اوہدے والاں وچ پھیردا اوہنوں جگاؤندا پیا سی، گنگو نے تربھ کے رہاندی ول ویکھیا، اوتھے کوئی نہیں سی، گنگو نے کھچ کے اکھاں میٹ لئیاں تے سوچن لگا، تاپی اک کڑی نہیں سی بھوتنی سی۔ تاں ہی تاں مینوں اجے تیکر اوہدی سوچ چنبڑی ہوئی اے...... ہر ورھے جدوں جامنو پکدے نیں مینوں اودوں سوچ چنبڑ جاندی اے..........."

تے پھیر گنگو نوں چیتے آیا۔ بارھاں ورھیاں دی نکی جہی تاپی گل وچ گلیاں دی مالا پائی روز دوپہراں ویلے اوہنوں والاں توں بلون کے جگالیندی ہوندی سی اوہ حکم دا بدھا رکھا توں جامنو توڑدا ہوندا سی۔ تاپی چن چن کے موٹے تے کالے جامنو کھاندی گنگو نوں گھٹ کے جھپی پالیندی سی، تے گنگو دا جی کردا ہوندا سی کہ تاپی اوس نوں ایس طرح گھٹے کہ گھوگھٹ اوہدی اک ہڈی ضرور ٹٹ جائے، اک پسلی...... تے پھیر تاپی اوہدی منجی اتے بہہ کے اوہنوں روں داسیک کردی رہوے۔

گنگو اپنیاں یاداں توں گھبرا کے منجی توں اٹھ بیٹھا۔

"کیہ ہویا؟" تائے نے پچھیا

"خورے کوئی منگنو لڑیا اے" گنگو نے ابھڑ وائے آکھیا تے وان دیاں ورلاں وچ ویکھن لگا۔

"اج کل منگنو کتھوں آیا ایڈیاں لوداں وچ وی کدے منگنو ٹھہردے نیں۔"

"خورے پھیر کیہ سی۔" گنگو نے آکھیا تے دھیان پرانہہ کرلیا۔ رکھ دے پاسے نال پئے ہوئے گھڑے وچوں پانی پی کے اوہ پھیر منجی دی باہی اتے آن بیٹھا۔

"چلاں ویکھاں، متے منڈے دی اکھ لگ جاوے تے جنور جامنو نک جان" تایا اٹھن اٹھن کردا اگوں آکھن لگا۔" کیوں گنگو بھاویں اسیں ایتکی چار ہزار بھریا اے...... کہن نوں ہوندا اے چار ہزار...... بوریاں سن ریہاں دیاں بوریاں..........."

گنگو دا ہاسا نکل گیا۔" بوریاں کتھے سن تایا، نکی جیہی تھیلی وچ سارے نوٹ آ گئے سن۔"

"مکھے گل سمجھی دی اے، جے اج کاگتاں (کاغذاں) دی تھاویں چاندی دے رپے ہوندے تاں

بوریاں ای بھریاں جاندیاں۔"

"تاں وی تایا اکو بوری وچ آ جانے سن۔"

"ہو یا نہ پر ساڈے لوکاں لئی چار ہزار بڑی چیز اے۔"

"ہاں چیز تاں بڑی اے پر ایس دے دس بھائیوال ہاں، ونڈے سر چار سو ہی پیا نہ۔ ایدوں گھٹ ٹھیکہ کتھے مل دا اے تایا۔"

"آہو، آہو منڈیا، میں ایہہ تاں نہیں کہندا پئی سانوں ٹھیکہ مہنگا پیا اے۔"

"پورے سو رکھ نیں جامنواں دے۔"

"توں ایہہ دس کہ رپے دونے ہو جان گے کہ نہیں؟"

"کیوں نہ ہون گے تایا! رپے سیر نیں جامنواں کل! سوار پے وی وچ لینے آں" گنگو دے ایس طرح ہامی بھرن نال تائے دا دل ضرور دونا ہو گیا تے تایا اپنے ونڈ دے رُکھاں دی راکھی کرن لئی انج اٹھ کے چلا گیا جویں اج اوہدے لک دا کب تھوڑا جیہا گھٹ گیا ہووے۔

گنگو دا اک ہوکا ایس طرح نکلیا۔ جویں اوہدے جوان لک وچ تھوڑا جیہا کب پے گیا ہووے۔ تے وہ پھیر منجے اتے لما پے گیا۔

تاپی دیاں باہواں وانگ تاپی دیاں یاداں نے گنگونوں گھٹ کے چھپی پالئی تے اج پھیر گنگو دا جیا کر آیا کہ گھٹو گھٹ اوہدی اک ہڈی ضرور ٹٹ جائے۔ اک پسلی۔

تائی گنگو دی منجی نالوں دون کھول کے آکھدی ہوندی سی "گنگو ایہہ رسا لے پینگھ پا دے۔"

"جھلیے" کدے جامنو دے رُکھ نال وی پینگھ پئی اے؟"

"توں پا تے سہی۔"

"پاواں کس طرح؟ جامنواں دے ٹاہن بڑے کچے ہوندے نیں۔"

"تینوں کہ" جے لتاں باہواں ٹٹن گئیاں تاں میریاں، توں پا دے کھاں پینگھ"

مینوں تیریاں لتاں باہواں دا فکر نہیں، پر توں آپے سوچ میرے جامنواں دا کنا حرج ہو جاوے گا۔"

تے ایس گلوں تاپی چڑ جاندی ہوندی سی۔ پھیر گنگو اوہنوں باہواں توں پھڑ کے بڑیاں بھوانٹنیاں دیندا سی، تے آکھدا سی "بس پینگھ اتے وی انج ای جھوٹے ہوندے نیں۔" تاپی جدوں ڈاڈھی تنگ پے جاندی سی

گنگو اوندے نال اک شرط بنھدا ہوندا سی کہ جے تاپی اوہنوں آڑوواں دے گیت سنائے گی تاں پھیر گنگو اوہنوں ہور بھوانٹیاں نہیں دیوے گا۔

''سناواں گی، سناواں گی، رباسناواں گی'' تاپی جدوں ایہہ گل کئی وار آکھلیندی تاں گنگو اوہدیاں باہواں چھڈ دیندا سی۔ پھیر تاپی بڑے لوروچ گاؤندی ہوندی سی۔

آڑوے دا بوٹا اساں پانی دے دے پالیا۔

آڑو کھائے لوکاں اساں کوڑا جھفر جالیا۔

.....آڑوے دا بوٹا.........!''

تے پھیر تاپی اپنا گیت ادھ وچالے توڑ کے آکھدی۔ ''بھیڑیا تیرے جامنو تے ٹک گئے۔ اوہ ویکھ!'' گنگو جدوں گھبرا کے جامنو دے رُکھ ول دوڑدا، تاپی داء لا کے نس جاندی، تے نسدی نسدی آکھدی ''اک منڈے نوں جھٹھایا۔ اوٹھ کے گھوڑے لایا۔''

دساں ورھیاں دیاں ایہناں یاداں نے اج گنگونوں پتہ نہیں کیہو جیہی گھٹ کے جپھی پائی، گنگو دے من دی کوئی ناڑ مڑک گئی تے گنگو دیاں اکھاں وچ پانی آ گیا، گنگو سوچن لگا توں جھٹھیا نہیں سی تاپی، توں سچ ہی آکھیا سی، میرے جامنواں نوں توتے ٹک گئے تے تیرے آڑو لوکاں نے کھالئے۔''

پھیر گنگونوں اک گل ایس طرح چیتے آئی جویں اوہنے اپنے دنداں نال جامنوں دیاں گٹکاں چتھ لیا ہون۔

''تاپی دے پیو نے گنگو دے پیونوں ہامی بھری سی کہ اوہ تاپی داویاہ گنگو نال کردیوے گا۔ پر جدوں تیسرے ورھے گنگو داپیو بیمار پے گیا تے گنگو نے ٹھیکے لئی جوڑیا ہویار پیا اوہدی بیماری اتے لا دتا تے جدوں اوس ورھے گنگو جامنواں داٹھیکا نہ لے سکیا تاں تاپی داپیو زبانوں مکر گیا۔ تے اوہنے تاپی نوں ہور کدھرے ویاہ چھڈیا۔ گنگو ایہو جیہاں سوچاں نال جامنواں دیاں گٹکاں چتھدا پیا سی کہ تایا اچھو پلی جیہی منجی دی ہیہ تے آن بیٹھا۔ گنگو کھجھ کے سوچن لگا ''اج تائے نون کیہ ہویا اے، اپنے جامنواں دی راکھی کرن دی تھاں اج ایہہ میری منجی دے دوالے بھون ڈیہا اے۔''

''اک گل کرنی سی تیرے نال!''

''دس تایا!''

''بھئی توں مختار جو ہایا، تیرے پچھے بنا اسیں کوئی گل زبانوں نہیں کڈھ سکدے۔''

''دسیں وی تایا کیہ گل اے؟''

''خورے تینوں چیتا اے کہ نہیں، اک تیرے پیو دا یار ہوندا سی اوہ تاں کوئی تن ورھے ہو گئے مر گیا، اوہدی دھی ہوندی سی تاپی، چھوٹی ہوندی تیرے نال کھیڈدی ہوندی سی۔''

گنگو انج تربھک کے منجی اتوں اٹھ بیٹھا، جویں اک دو نہیں پورے پنجاہ منگنو منجی وچوں نکل کے اوہدے پنڈے اتے لڑ گئے ہون۔

''کتھے چلیا ایں اٹھ کے؟'' تائے نے حیران ہو کے پچھیا۔

''کدھرے نہیں'' گنگو نے گھابر کے جواب دتا۔

''تاپی دے مردا ایس واری کدھرے کم نہیں بنیا۔ بڑی دوروں چل کے آیا اے۔ تے آہندا اے پئی جویں جاندے او میرے پتی وی پالو ایس ٹھیکے وچ۔'' گنگو تائے دے مونہ ول ویکھدے دا ویکھدا رہ گیا۔

''جے تیری نہیں مرضی تاں نہ سہی گنگو، مینوں تاں ایویں ہی اوہدے اتے ترس آ گیا سی۔ اوہدے اتے وی کاہنوں۔ اوس کڑی تاپی اتے، وچاری تے ڈاڈھی منت نال آکھیا سی!''

گنگو دا دل زور زور دی دھڑکن لگ پیا تے اوہنے رُکھ دے تنے نوں ایس طرح گھٹ کے پھڑیا جویں اوہدے پیراں ہیٹھاں زمین ہلدی ہووے۔

''میں تاں اوہنو صاف آکھ دتا سی پئی ساڈا مختار گنگو اے، بس ہاں کرے تاں ہاں، نہ کرے تاں اوہ۔''

''میں کاہدا مختار ہاں تایا!'' گنگو نے وراگ کے آکھیا۔

''نہ بھئی اسیں تے سچی گل کرنے آں، انج آکھن نوں بھاویں اسیں دس سے جنے ہاں، ایس ٹھیکے دے سانجھی دار پر ایہہ ٹھیکہ تیری محنت نال ہی ملیا اے ایس لئی۔''

''نہیں تایا ایہہ گل نہیں توں سگوں وڈا وڈیرا ایں، انج نہ آکھیا کر'' گنگو نے نمی جیہی آواز وچ کہیا۔

''تاں پھیر ہاں کہ دیاں سو؟'' تائے نے چھیتی نال پچھیا تے اگوں اوس آکھیا۔ ڈاڈھے نمانے جیہے ہو کے اوہ دوویں میرے منجی اتے بیٹھے تیری منظوری اڈیکدے پئے نیں۔

''میں کدے تیرے کہتی نوں موڑیا اے'' گنگو نے اک ہوکا بھریا۔

''تاپی سچ ای آہندی سی۔'' تائے نے خش ہو کے کہیا۔

''کیہ کہندی سی تاپی؟'' گنگو نے چھیتی نال چھپاتے اوہدے پنڈے وچ اک جلون پھر گئی۔
کہندی سی جے گنگو مختار اے تاں اوہ مینوں نہ نہیں کرن لگا۔'' تائے نے دلیر ہو کے دسیا۔
'اچھا؟'' گنگو حیران ہویا۔
''لے ایدھرای لگی آؤندی اے خورے۔ ویکھ کھاں ساہمنے اوہو ہی اے؟''
تائے نچھلائی اوہدیاں بڈھیاں اکھیاں ہور سنگڑ گئیاں، تاپی نیڑے آپہنچی سی۔ تائے نے پچھان لئی تے منجی اتے بیٹھا بانہہ اگے کر کے تاپی نوں آکھن لگا'' آجا کڑیے، آجا۔ تینوں آکھیا سی ناں کہ گنگو تینوں نہ نہیں کرن لگا۔''
تاپی کول آگئی تے گنگو ول ویکھدی تائے نوں پچھن لگی'' بھلا تایا گنگو نوں میرا ناں چیتے سی؟ توں چیتے کرایا ہووے گا۔''
''توں وی کیہ گلاں کرنی ایں کڑیے، چھوٹیاں ہوندیاں تسیں کٹھے کھیڈ دے رہے۔ اک تھالی وچ کھاندے رہے۔ ایہہ بڑیاں جداں پندا ہوندا سی۔ تیرے نال۔'' تائے نے ملھار نال آکھیا۔
''سچ تایا؟'' تے تاپی گوڈے کول منجی بیٹھاں زمیں اتے بہہ گئی۔
''منجی اتے بہہ کڑیے، بھنجے کاہنوں بہندی ایں؟ تائے نے آنکس نال کہیا۔
''منجی داوان چبھدا اے'' پتہ نہیں گنگو دے موہنوں کیوں انج نکل گیا اوہدی آواز وچ دلا روی سی تے روس وی۔
''تاپی نے اک وار چمک کے گنگو ول ویکھیا تے پھیر ہولی جیہی تائے نوں آکھن لگی۔ ''سچ تایا گنگو مینوں چھوٹی ہوندی نوں بڑا کھجاندا ہوندا سی۔ میرے کولوں بڑیاں شرطاں کرواؤندا ہوندا سی۔''
''کاہدیاں شرطاں؟ تائے نے لاڈ نال پچھیا۔
''بڑیاں شرطاں۔'' تے تاپی سوچن لگ پئی۔ پھیر سرنیواں پا کے آکھن لگی۔ ''مینوں اینیاں بھوانیاں دیندا سی کہ میرا سِر بھوں جاندا سی۔ تے اوناچر مینوں نہیں سی چھڈ دا ہوندا جناچر میں گون دا اقرار نہیں سی کر دی۔''
''پھیر توں کیہ گاؤندی ہوندی سی؟'' تائے نے ہتھ نال تاپی دے سر اتے پیار دتا۔ ''میں کیہ گاؤنا سی تایا بس مینوں اکو گیت آؤندا سی تے اوہ گیت ایہہ گھڑی مڑی سندا رہندا سی۔ کجھ وی نہیں سی۔ ایویں آڑ دواں دا اک گیت سی۔'' پتہ نہیں ایہہ گل کہندیاں تاپی دیاں اکھاں کیوں بھر آئیاں، اوہنے اک وار گنگو ول ویکھیا تے

پھیرا کھاں پرانہ کرلیاں۔ شاید اج اوہنوں اپنے اوس گیت والے راکھے دی قسمت اتے رون آ گیا سی جو آڑوواں نوں پانی دے دے پالدا اے پر، مونہہ نہیں لاسکدا۔

گنگو دے پیراں وچ پتہ نہیں کیڑے کل ٹھکے ہوئے سن، اوہ جتھے کھلوتا اوتھے دا اوتھے کھلوتا رہیا۔

اچانک تاپی دی نظر اتانہہ جامنوواں دے رُکھ ول پئی، پنج چھے توتے اک ٹاہن اتے بیٹھے ہوئے سن تے جامنو ٹکدے پئے سن۔ تاپی چھیتی نال اٹھ کے توتیاں نوں اڈان لگی۔

گنگو دے دوویں بال جیہڑے رُکھ دے پرلے پاسے اک منجی اتے ستے پئے سن۔ اٹھ بیٹھے تے آ کے گنگو دیاں لتاں نال چمبڑ گئے۔ گنگو اک ہوکا بھر کے آکھن لگا۔ ''رہن دے تاپیے کاہنوں اڈانی ایں توتیاں نوں، جامنو تاں ہن مکے ای گئے نیں۔''

(لپی انتر: جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

امرتا پریتم

کرماں والی

ڈاڈھی سوہنی تندوری روٹی سی پر سبزی دی تری نال چھوہی ہوئی گراہی مونہہ نہیں سی لان ہوندی۔

''ایڈیاں مرچاں......''میں تے میرے دویں بچے سی کراٹھے ساں۔

''ایتھوں بی بی جٹاں دالانگھا بہت اے۔ داروں دی دکان وی ایتھے کوہاں وچ اکو ای اے۔ جٹ جدوں گھٹ پی لیندے نیں پھیر واہوا مرچاں والا سلونا منگدے نیں۔'' تندوروالا آکھدا پیا سی۔

ایتھے .... جٹ........

آہو بی بی گھٹ داروتاں سارے ای پیندے نیں پر جدوں کوئی بندہ شندا مار آون، اودوں ذرا بہتا بی جاندے نیں۔

ایتھے ایہو جیہاں وارداتاں.........

اجے تاں پرسوں چوتھے کوئی پنج جنے آگئے۔ اک بندا مار آئے سن۔ واہوا چڑھی ہوئی سانے، لگے کھورو پان، اوہ ویکھاں میریاں تن کرسیاں ٹٹیاں پئیاں نیں، ایہہ تاں رب بھلا کرے پلس والیاں دا، اوہ چھیتی پھڑ کے لے گئے اوہناں نوں، نہیں تے خورے میرے چلھے دیاں اٹاں وی نہیں سی لبھنیاں........... پر کھٹی وی تے اسیں اوہناں دی ای کھانے آں۔

کوشلیا ندی ویکھن دا خبط میئوں اوس دن چنڈی گڑھوں پھیر اک پنڈ وچ لے گیا سی، پر مرچاں توں تر دی گل داروا تے پہنچ گئی، تے داروتوں خون خرابے اتے...... تے میں اوس پنڈوں چھیتی بچیاں نوں لے کے واپس مڑن لئی کاہلی پے گئی۔

تندور چنگا لنبیا ہویا تے اندروں کھلھا سی تے اندروار اک پاسے بجھے ست خالی بوریاں تان کے چھپڑا پردا کیتا ہویا سی اوہدے بجھے ڈٹھیاں ہوئیاں تن منجیاں دے پاوے دسدے سن کہ تندوروالے دے بال

بچے تے تیوین وی اوتھے رہندے سن..... مینوں لگا، آخر کوئی ایڈا خطرہ نہیں اوتھے تیویں دی رہائش ہے، عزت دی رہائش ہے۔

کسے تیویں ہتھ نے ٹاٹ دا کنڈھا موڑیا، باہر نوں جھاکیا، پھیر جھاکیا تے پھیر اوہ باہر نوں جھاکیا، پھیر جاکیا تے اوہ باہر آ کے میرے کول کھلوگئی۔

''بی بی تو مینوں سنجھانیا نہیں؟''

''نہیں تاں''

اوہ اک سادی جیہی تے اصلوں جوان تیویں سی، میں اوہدے موہنہ ول تکدی رہی پر مینوں کوئی بھلی وسری گل وی چیتے نہ آئی۔

میں تے تینوں سنجان لیا ہے بی بی!............

'پروں، نہ بچے پراورں توں ایتھے آئی سیں ناں؟''

''آئی تے ساں''

''سامہنے مدان وچ اک جنج اتری ہوئی سی۔''

''ہاں۔ ایہہ وی مینوں یاد اے''

''اوتھے توں مینوں ڈولی وچ بیٹھی ہوئی نوں ریا دتا سی۔''

گل یاد آ ئی۔ دو ورھے ہوئے میں چنڈی گڑھ گئی ساں۔ اوتھے نواں ریڈیو سٹیشن کھلا سی تے پہلے دن دے سماگم لئی، میرے دلی دے دفتر نے مینوں اوتھے اک نظم پڑھن لئی بھیجیا سی۔ موہن سنگھ تے اک ہندی کوی جالندھر سٹیشن ولوں آئے سن۔ سماگم چھیتی ہی ختم ہوگیا سی تے اسیں تن چار لکھاری کوشلیا ندی ویکھن واسطے چنڈی گڑھ توں ایس پنڈ آ گئے ساں۔

ندی کوئی میل ڈیڈھ میل اترائی اتے سی تے واپسی چڑھائی چڑھدیاں اسیں سارے چاہ دے اک اک گرم پیالے واسطے ترس گئے ساں۔ ساریاں توں صاف تے کھلی دکان ایہو جاپی سی۔ ایتھوں اساں چاہ دا اک اک گرم پیالہ پیتا سی۔ اوس دن ایس دکان اتے بھجدے ماس تے تندوری روٹیاں دے نال نال مٹھائیاں دی وی چنگی بھیڑ بھیڑ سی۔ تندوروالا آکھدا پیا سی۔ ''اج ایتھوں میری بھنویں دی ڈولی لنگھنی اے، میری وی تاں خاطر بندی اے ناں..........''

تے پھیر ساہمنے میدان وچ ڈولی اتر پئی کسے پچھلے پنڈوں آئی سی۔ اگے جانی سی، راہ وچ مامے نے سواگت دتا سی۔

''ویاہ وی عجیب چیز اے، آوندیاں کڈے رنگ بنھدا اے، تے جاندیاں..........

ساڈے وچوں کسے نے آکھیا سی، تے چاہ دے گھٹاں نال رنگ دی فلاسفی وی گرم ہوندی گئی سی۔

''ٹھہرو میں نویں ووہٹی دا مونہہ ویکھ آواں........ بھلا اوہدے مونہہ اتے اج کیہو جیہا رنگ اے.........مینوں یاد اے میں آکھیا سی۔ تے اگوں میرے ساتھیاں نے جواب دتا سی۔'' سانوں تے کسے ڈولی دے نیڑے نہیں جان دینا، تسیں ویکھ آوو۔ پر خالی ہتھیں نہ ویکھنا۔''

میں ہسدی ہسدی ڈولی کول چلی گئی ساں۔ ڈولی دا پردا اک پاسیوں چکیا ہویا سی، میں کول بیٹھی ہوئی نائن نوں پچھیا سی'' میں ووہٹی دا مونہہ وکھلواں؟''

''بی بی! جی صدقے جاواں ویکھناں.........ساڈی کڑی ہتھ لایاں میلی ہوندی اے۔''

تے سچ مچ کڑی وی شنگار پوری نتھ وچ جیہڑا مسکراہٹ دا موتی لشکدا پیا سی اوہدا رنگ جھلنا کوئی سوکھا نہیں سی۔

میں اک رپیا اوہدی مٹھ وچ رکھیا تے جدوں مڑی، میرے ساتھی آکھدے پئے سن۔'' گھڑی کو پہلاں جدوں تساں نظم پڑھی سی، کالج دیاں کنیاں کڑیاں رپئے رپئے دے نوٹ اتے تہاڈے کولوں دستخط کروائے سن۔ پر ایس وچاری نوں کیہ پتا کہ اج ایہہ رپیا اوہنوں کیہنے دتا اے۔ کدھرے جان دی ہوندی، دستخط ای کروا لیندی.........''

ایہہ پرار دی گل اے مینوں سگویں دی سگویں چیتے آ گئی۔

''توں.........اوہ ڈولی والی کڑی؟''

''آہو بی بی۔''

پتا نہیں کہڑے حادثے نے دو ورھیاں وچ اوہنوں کڑی توں تیوین جیہی بنا دتا سی حادثے دے چھ اوہدے مونہہ اتوں لبھدے پئے سن۔ پر پھیر مینوں پتا نہیں سی لگدا میں اوہنوں کس طرح کجھ پچھاں۔

''بی بی میں تیری تصویر اخبار وچ تکی سی۔ اک واری نہیں دو واری اتھے وی کنے ای لوک آوندے نیں جیہناں کول اخبار ہوندی اے کوئی تے روٹی کھاندیاں پھیرا اتھے ہی چھڈ جاندے نیں۔

''سچ تے پھیر توں پچھان لئی؟''

''لے میں تے جھٹ پچھان لئی سی، پر بی بی اوہ تیری تصویر کیوں چھاپدے نیں؟''

میرے کولوں چھیتی چھیتی جواب نہ دین ہویا۔ ایہو جیہا سوال اگے کدی کسے نے کیتا نہیں سی۔ کجھ سنگ کے میں آکھیا۔ ''میں نظماں، کہانیاں لکھنی آں ناں.........''

''کہانیاں؟ بھلا بی بی اوہ کہانیاں سچیاں ہوندیاں نیں کہ جھوٹھیاں؟''

''کہانیاں تے سچیاں ای ہوندیاں نیں انج ناں سارے جھوٹھے ہوندے تاں کہ پچھانیاں نہ جان۔''

''توں میری کہانی وی لکھ سکنی ایں بی بی؟''

''جے توں آکھیں تاں میں ضرور لکھ دیاں گی۔''

''میرا ناں کرماں والی اے، میرا تے بھاویں ناں وی جھوٹھا نہ لکھیں۔ میں کوئی جھوٹھ تھوڑی بولنی آں۔ میں تے سچ آکھنی آں۔ پر میری گل کوئی نہیں سندا۔ کوئی وی نہیں سندا.........

تے میرا ہتھ پھڑ کے مینوں ٹاٹ دے پچھے ڈھٹھی ہوئی منجی تے لے گئی.........

''جدوں دو جنیاں میرا میچا لین آئیاں۔ اوہناں وچ اک کڑی میرے ہان دی سی۔ اصلوں میرے جڈی۔ اوہ دوروں نیڑیوں میری نناں لگدی سی۔ میرا جھگا تھن من کے آکھن لگی۔ ''نری میرا ہی میچا اے۔ بھابی توں فکر نہ کر جیہڑے کپڑے سیواں گی تینوں ڈاڈے پورے آون گے۔''

تے سچی مچی ورھی دے جنے وی کپڑے سن مینوں ڈاڈھے سوہنے پورے آوندے سن۔ اوہیو نناں میرے کول کنے مہینے رہی، تے پچھوں وی میرا جیہڑا کپڑا بن داسی، اوہیو سیوندی سی۔ میرے ملھار دی بڑے کردی سی۔ مینوں آکھدی ہوندی سی ''بھابی بھاویں میں دو مہینیں آواں تے بھاویں چھیں مہینیں پر توں کسے ہور کولوں کپڑا نہ سواویں.........''

مینوں اوہ چنگی لگدی سی، صرف اوہدی اکو گل مینوں ماڑی لگدی سی، میرا جیہڑا کپڑا سیوندی سی پہلوں آپ پا کے ویکھدی سی۔ آکھدی سی ''تیرا میرا اکو میچا اے۔ ویکھ مینوں کیہا پورا اے۔ تینوں وی ڈاڈھا پورا آوے گا۔ تے اوہ سارے کپڑے پان لگیاں میرے من وچ آوندا ہوندا سی۔

''کپڑے بھاویں نویں نیں پر ہن تے اوہدا اتارہی ناں؟''

رسی نال ٹنگے ہوئے ٹاٹ دا پردا سی۔ وان دی ڈھلی جیہی منجی سی، کھیس وی ادھورا نا سی، کڑی الھڑ تے ان

پڑھ سی، پر ایہہ خیال ایڈا نازک، ایڈا کولا............ میں ترِ بھک گئی۔

''پر بی بی میں اپنے من دی گل اوہنوں کدے نہ آکھی۔ متاں وچاری دا جی برا ہو جاوے۔''

''پھیر؟''

''پھیر مینوں کوئی ڈیڈھ ورھے پچھوں پتا لگا وچوں ہی کسے نے دس دتا، اوہدیاں تے میرے گھر والے دیاں لگیاں ہوئیاں سن۔ ایہہ اوہدا اوہدے پوتریوں بھرا لگدا سی۔ پر اک اوہدے سکے بھرانوں ایس گلوں بڑی کوڑ چڑھدی سی۔ اوہ تے اک واری آپنی بھین دی گردن لاہ دین لگا سی۔

کسے نے مینوں ایہہ دی دسیا کہ گھوڑی ویلے اوہ بھین دے ساکوں جدوں واگ گندن لگی، واگ گندی دی نون غشی آ گئی سی۔ اتھر دواں نال بھجی ہوئی کرماں والی نے میرا ہتھ پھڑ لیا۔ ''بی بی! توں میرے من دی گل سمجھ لے، میرے کولوں اتار نہیں پایا جاندا۔ میریاں گوٹے تے کناریاں والیاں ستھناں، میریاں تریاں والیاں چنیاں تے میرے سلمیاں والے جھگے۔ سارے ہی اوہدا اتار سن، تے میرے کپڑیاں وانگ میرا گھر والا وی........

کرماں والی دے بول اگے میری قلم نیوں گئی، کہڑے لکھاری نے ایہو جیہا فقرا لکھ جانا ہے..........

''ہن بی بی میں اوہ سارے کپڑے لاہ آئی آں، اپنا گھر والا وی۔ ایتھے ماے مامی کول آ گئی آں۔ اہناں دا گھر پوچنی آں، میز دھونی آں، تے میں اک مشین وی رکھی ہوئی اے۔ چار کپڑے سیوں لینی آں روٹی کھا لینی آں، بھاویں کھدر دا جڑے تے بھاویں لٹھے دا۔ میں کسے دا اتار نہیں پاندی۔ میرا ماما صلح کران نوں پھر دا اے۔ میرے من دی گل نہیں سمجھدا۔ میں جس طرح وی جیونی پئی آں۔ ایسے طرح جیوں لاں گی۔ ہور کجھ نہیں منگدی توں صرف اک وار میرے من دی گل لکھ دے..........''

کرماں والی دے جھڑے پنڈے نال کہانی واپری سی، اوہنوں میں اک وار آپنیاں باہواں وچ گھٹیا، جاپیا کڈا نرویا پنڈا اے، کڈا نرویا من، ایہہ دوالا جتھے میں گھڑی کو پہلاں مرچاں توں دار واتے، تے دار وتوں خون خرابے اتے پہنچدی گل توں گھبرا گئی ساں۔ اوتھے کرماں والی کڈیاں دلیریاں نال جیوندی پئی ہے.........

باہر سڑک اتوں شملے ولوں آوندیاں موٹریاں لنگھدیاں ہن، تے جیہناں دیاں سواریاں، ریشمی کپڑیاں وچ لپیٹیاں ہوئیاں، کئی واری پل کو کسے دکان اتے چاہ دے پیالے لئی کھلو جاندیاں ہن۔ یاں سگرٹ دی ڈبی لئی، یاں گرم تندروی روٹی لئی، اوہ جہناں دے گل پئے ہوئے ریشمی کپڑے پتا نہیں کیہدا کیہدا اتار ہوندے

ہن............ تے کرماں والی جہنے گل وچ کھدر دی قمیض پائی ہوئی ہے جیہڑی اپنے پنڈے اتے کسے دا اتار نہیں پاسکدی............

''بی بی! میں تیرا اوہ رپیا سانبھ کے رکھیا ہویا اے............''

''سچ مچ ہن تک؟''

''آہو بی بی! اوہ رپیا اوہ میں اوس ویلے اپنی نائن نوں پھڑا دتا سی تے پھیر اوس توں دوسری جھلک دی اوہ گل سی جدوں میں تیری تصویر تکی سی۔ میں نائن کولوں اوہ رپیا لے کے سانبھ لیا سی۔ توں بی بی مینوں اوس رپئے دے نوٹ اتے اپنا ناں لکھ دے! پھیر توں جدوں میری کہانی لکھیں گی، مینوں ضرور بھیجیں۔ میں گرمکھی دے اکھر چنگی طرح اٹھا لینی آں۔ توں گرمکھی وچ لکھیں بی بی!''

تے کرماں والی نے اٹھ کے منجی ہیٹھاں دھریا ہویا ٹرنک کھولیا۔ ٹرنک وچ اک لکڑ دی صندوقڑی سی۔ اوہنے رپئے دا تہ کیتا ہویا نوٹ کھولیا۔

''میں اپنا ناں لکھ دینی آں کرماں والیے۔ میں خورے کنیاں کڑیاں دے نوٹاں اتے اپنا ناں لکھیا ہووے گا۔ پر اج میرا جی کردا اے، توں میرے اک نوٹ اتے اپنا ناں لکھ دے، کہانی لکھن والا وڈا نہیں ہوندا، وڈا اوہ وے جہنے کہانی اپنے پنڈے اتے جھلی اے۔''

''مینوں چنگی طرح لکھنا نہیں آوندا۔''

کرماں والی سنگ گئی، تے پھیر کہن لگی۔ ''توں میرا ناں کہانی وچ ضرور لکھیں۔''

''ہاں! میں اوہی نان تیرے ہتھاں دا لکھیا ہویا تیرا ناں اپنی کہانی دا ناں رکھاں گی۔'' میں بٹوے وچوں نوٹ وی کڈھ لیا تے قلم وی۔

''کرماں والیے! اج تیری کہانی لکھ رہی آں! اوہی رپئے دے نوٹ اتے لکھیا ہویا تیرا ناں، اج ایس کہانی دے متھے اتے پکی بندی وانگ لگا ہویا اے۔

ایس کہانی نے تیرا کجھ نہیں سنوار سکنا۔ پر ایہہ بھروسا رکھیں۔ اوہ دل وی تیری بندی نوں پرنام کردے ہن جیہناں دے اپنے خون دا رنگ ایس تیری بندی دے رنگ نال رلدا ہے۔ تے اوہ متھے وی اک شرمندگی نال ایہدے اگے جھکدے ہن جہناں نے اپنے گلیاں وچ پتا نہیں کیہدے کیہدے اتار پائے ہوئے ہن۔

(لپی انتر: جمیل احمد پال)

امرتا پریتم

اِک نمبر دا فرق

دیوی کی بھین نُوں مین پہلی وار اودوں ویکھیا سی جدوں اوہنے روپ نگر وچ اک نِکا جہیا مکان کرائے اُتے لیا سی۔ مکان نواں نواں بنیا سی، اجے اوہدے وچ بجلی نہیں سی آئی اوہنے کمیٹی نوں بجلی واسطے درخاست دتی سی۔ تے جدوں درخواست منظور ہوگئی سی، میں اوہدے گھر بجلی دا کھمبا گڈ کے باہرلی سڑک اُتے لگے ہوئے پول نالوں بجلی دیاں تاراں کھچ کے جوڑیاں سن۔ میں اوہناں دِناں وِچ بجلی گھر دا اک چھوٹا جیہا مستری ساں۔

میں جیوں جیوں بجلی دی تار واسطے کندھ وچ گٹیاں لاؤندا گیا، دیوی کی بھین دا مونہہ چمکدا گیا۔ مینوں انج جاپیا کہ اوہدے کمرے وچ کوئی بتی اجے ٹھہر کے جگے گی، پر اوہدے مونہہ اُتے اک بتی ہُنے جگ پئی سی اوہ آکھدی پئی سی اَج راتیں اوہ آوے گا۔ تاں اوہدا کمرا اوہنوں کِڈا سوہنا لگے گا''

کھمبے نال رسا بنھ کے جدوں میں کھمبے دے اُتے چڑھیا، دیوی کی بھین ہیٹھاں کھلوتی انج گھابریہوئی سی جویں اوہدا آپنا بھرا جاں آپنا پتر اک اوکھی تھاویں لٹکیا ہویا سی۔

تے فیر جدوں دیوی کی بھین دے کمرے وچ بجلی جگ پئی اوہ چھیتی نال میرے واسطے تے میری ساتھی مستری واسطے چا بنا لیائی، آکھن لگی۔ ''اج میرے گھر چانن آیا اے ویر! ایس لئی سبھ توں پہلاں تہانوں مُونہہ مٹھا کرنا چاہی دا اے۔ تسیں رسیاں نال لمک لمک کے تے بجلی دے خطریاں نال کھیڈ کھیڈ کے لوکاں نون چانن ونڈدے او۔''

میں تے میرے ساتھیاں نے ایس توں پہلاں کئیاں گھراں وچ بجلی لائی سی، کدے کسے نے سانوں ''چانن ونڈن والے'' نہیں سی آکھیا، تے مینوں پتا سی کہ اگوں وی کسے نے ایہہ نہیں آکھنا۔ ایس لئی مینوں انج جاپیا کہ اسیں، جھڑے رسیاں نال لمک لمک کے تے بجلی دے جھٹکیاں نال کھیڈ کھیڈ کے روز دنیا وچ چانن کر دے ساں، تے آپ ہرپل اک جوکھوں دے ہیٹھ وچ رہندے ساں، اوس دنیا وچ کوئی ایہو جہیا وی سی،

جہڑا ساڈے ہنیرے وچ چانن کر سکدا اسی، تے ایہہ ''کوئی'' دیوکی بھین سی۔

اک گل جہڑی مینوں سبھ توں حیران کر دی پئی سی ایہہ سی کہ دیوکی بھین دے گھر دیاں دہلیزاں وچ کھلو کے انج لگدا سی جویں کوئی اک مندر دیاں دہلیزاں وچ کھلوتا ہووے تے دہلیزاں توں اندر لنگھن لگیاں اوہنوں ایہہ خیال آؤندا ہووے کہ پیر دھو کے اندر جانا چاہیدا ہے۔

اندر اک پاکیزگی سی، جہڑی مندر دی مورتی وانگ صدیاں پرانی سی تے اندر دی پوجا وانگ نت نویں سی۔

ایہہ خیال مینوں سبھ توں پہلاں اوس ویلے آیا جدوں بجلی دیاں تاراں جُڑ گئیاں تے میں دیوکی بھین نوں آکھیا اوہ گھر دیاں ساریاں بتیاں جگا کے ویکھے۔ اوس ویلے دیوکی بھین باہر لے برانڈے وچ کھلوتی ہوئی سی، اوہ چھیتی نال برانڈے دی بتی جگا کے ویکھ سکدی سی، پر اوہنے آکھیا ''نہیں، ایہہ بتی پچھوں جگاواں گے۔ پہلاں چانن اوہدے کمرے وچ ہووے گا۔ تے دیوکی بھین نے اپنے ادب نال اک کمرے دا بوہا کھولھیا جویں اوہ مندر دے پٹ کھولھ رہی ہووے۔ بجلی جویں چانن دے پھُلاں دی تھالی سی، جو پہلاں اوہنے ساری دی ساری اوس کمرے وچ چڑھا دتی تے فیر چانن دا اک اِک پھُل لے کے نال دے کمرے نوں، پچھلے کمرے نوں رسی نوں، غلسخانے نوں تے برانڈے نوں پرشاد وانگوں ونڈ دتا۔

میں اوس کمرے وچ جھات پائی۔ سارے کمرے وچ اک ہریا غلیچا انج وچھیا ہویا سی جویں پیراں ہیٹھاں موٹا موٹا ہریا ہریا گھاہ ہووے۔

اک پاسے پیلے رنگ دا دیوان سی، تے اوہ انج جاپدا سی جویں اک ہرے بغیچے وچ پیلے پھُلاں دی کیاری ہووے۔

اک پاسے اچی ڈھوہ والیاں تن کُرسیاں سن ساوے رنگ دیاں، جو آپنیاں لمیاں پٹھاں نال انج لگدیاں سن جویں تن سُر ودے بوٹے ہون۔

تے کمرے دے وچکار اک نکا جہیا میز سی۔ جدھے اُتے اک مرد دی تصویر ایس طرحاں پئی ہوئی سی، جویں کسے کاریگر دا گھڑیا ہویا بُت ہووے۔

ایس سارے بغیچے وچ صرف اک چشمے دی کسر سی، اوہ وی جدوں بتی جگی، مینوں انج لگا جویں دُدھیا پانی دی دھار وگدی پئی ہووے۔

عجیب گل سی۔ دیو کی بھین دے گھر وچ کھلوتیاں اِکو سے اک مندر دا دھیان وی آؤندا سی تے اک باغ داخیال وی آؤندا سی۔

فیر دوسری وار میں دیو کی بھین نوں اودوں ویکھیا جدوں اوہدے گوانڈھیاں نے آپنے مکان وچ اک ہور کمرا پا لیا تے مینوں کمیٹی ولوں ایس لئی دیو کی بھین دے بھیجیا گیا کہ میں اوہدے گھر لگا ہویا بجلی دا کھمبا پہلے کمرے اُتوں اکھیڑ کے دوسرے کمرے اُتے لا کے آواں کیوں کہ اوہدیاں تاراں گوانڈھیاں دے نویں کمرے اُتوں لنگھدیاں سن تے اوہ کمیٹی دے اصول مطابق نہیں سن لنگھنیاں چاہی دیاں۔

''چنگا ویرا! اوتھے لا دے! دیو کی بھین نے آکھیا پر جدوں میں کمرے دی کندھ وچ چھیک کرن لگا، دیو کی بھین ٹھٹھمبر گئی، ایہہ چھیک باہر لے پاسے ہی رہن گے ناں! کندھ دے دوسرے پاسے تاں نہیں جان گے؟

''ایہہ چھیک تاں آر پار ہون گے کیوں کہ کندھ وی نوانچاں دی اے، تے بجلی دا بورڈ وی نوانچاں'' میں آکھیا۔

''کمرے دی کندھ خراب ہو جائے گی۔ چار چھیک، چار چٹاک''

'فیر قلعی کروا لینا۔''

''ایس کمرے دیاں کندھاں اُتے میں تیل والا روغن کروایا ہویا اے۔ فیر جا تاں سارے کمرے نوں مُڑ کے روغن کرواواں.........روغن بڑا مہنگا اے''

''مینوں پتا سی، ایہہ کمرا، دیو کی بھین دے گھر وچ اوہ کمرا سی''

جہڑا اک مندر لگدا سی جہڑا اک باغ ورگا سی، میں سوچیں پے گیا۔

''کوئی گل نہیں بی بی! جتھوں پلستر اکھڑ جائے گا، اوتھے اک وڈا سا کیلنڈر لا دینا۔ سارے داغ اوس کیلنڈر دی پٹھ پچھے چھپ جان گے'' میرے ساتھی مستری نے آکھیا۔

''اوس طرحاں، جس طرحاں لوک مَن دی کندھ اُتے پاپاں دے داغ لکاؤن لئی دھرم کرم دا کیلنڈر ٹنگ لیندے نیں؟ جاں وسماج سیوا دا کیلنڈر؟'' دیو کی بھین ڈاڈھی نموجونی ہو کے بولی۔

''چنگا، میں آپنی واہ لا دینداواں کہ سارے چھیک کندھ دے باہر لے پاسے ہی رہن، اندر تک نہ جان۔ فیر وی میں پکا نہیں کہہ سکدا۔ ٹوں بھین اندر لے پاسے اک کپڑا وچھا دے جے ماسا بھور اڈگ وی پیا

تاں کمرے دیاں چیزاں نہیں خراب ہون گیاں'' میں آکھیا تے ہتھ وچ چھینی ہتھوڑا پھڑلئی۔

''نہ ویر! میں اندر کوئی کپڑا نہیں وچھانا۔ جے توں من وچ ماسا بھوراڈگ پین دی رعائت رکھ لئی تاں فیر تیری ہتھوڑی ضرور اولیلی ہو جاوئے گی۔ تے دیو کی بھین نے اک لما ساہ بھر کے آکھیا،'' ایہہ وشواس بڑی عجیب چیز ہُندی اے ویر! جے ایہدے وچ کتے شک دی نکی جہی موری وی ہو جائے تاں گیر مگھار ہی پیندے جاندے نیں''

میں اک وار دیو کی بھین دے مُونہہ ول ویکھیا، تے اک وار کندھ ول...... تے فیر جدوں میں کندھ اپت پہلی ہتھوڑی ماری، مینوں جاپیا، ہتھوڑی میری ہتھ وچ نہیں سی پھڑی ہوئی، اک وشواس دے ہتھ وچ پھڑی ہوئی سی۔ تے ہن ایہدی کوئی وی سٹ ایس کندھ دے پار نہیں سی پہونچ سکدی۔

میں آپ حیران ساں کیویں میری ہتھوڑی نے نواپچی کندھ وچ سٹ انچ ڈونگھے چھیک کڈھ لیے تے کندھ نوں دوسرے پاسے اُجاں نہ لگن دِتی۔ لوہے دیاں سریاں دے مونہہ موڑ کے میں اُٹھ اُٹھ انچ لمیاں سَریاں ست ست انچاں دے چھیکاں وچ گڈ دتیاں۔

دیو کی بھین نے جدوں آپنی کندھ دا مہاندرا ثابت ثبوت ویکھیا، آکھن لگی۔'' کیوں ویر میں جھوٹھ آکھیا سی؟ ایہہ وشواس بڑی عجیب چیز ہُنداے...... جے توں مَن وچ ماسے بھورے دی رعایت رکھ لیندا تاں فیر ماسا پھُورا کاہنوں کھر پیڑ ہی لہہ جانا سی۔''

کئی دن میں وشواس دے فلسفے نوں سوچدا رہیا، تے تیسری وار میں دیو کی بھین نوں اودوں ملیا جدوں آپنے پنڈوں آپنی ماں دا خط آیا کہ اوہ ہُن پنڈ وچ اپنے وڈے پُتر کول نہیں سی رہنا چاہوندی، اوہ میرے کول شہر آؤنا چاہوندی سی۔ میں تے میرے دوساتھی جس کمرے وچ رہندے ساں مینوں پتا سی کہ اوتھے میری ماں دی گذر نہیں ہو سکتی، ایس لئی میں کرائے دا اک کمرا لبھد البھد ا دیو کی بھین دے گھر جا پہنچیا۔

دیو کی بھین کجھ چر سوچدی رہی تے فیر آکھن لگی، پُتّر گا ویر! میں آپنا پچھلا کمرا تینوں دے دیندی آں، کجھ میرا ابھار وی ہولا ہو جائے گا۔ میرے کولوں سارا کرایا نہیں دتا جاندا''

'' کیوں دیو کی بھین اوہ؟...........'' میں کجھ گھبرا کے دیو کی بھین ول تکیا۔

'' اوہ ایتھے نہیں باہر گیا ہویا اے'' دیو کی بھین نے صرف اینا ہی آکھیا تے میں ہور کجھ پُچھنا ٹھیک نہ سمجھیا۔ اک مہینے دا کرایا میں دیو کی بھین دے اگے رکھ دتا تے مُڑ آیا۔

تیسرے دن جدوں میری ماں پنڈوں آ گئی۔ میں آپنا منجا بستر اچکیا تے اپنی ماں نوں لے کے دیو کی بھین دے پچھلے کمرے وچ آ گیا۔

دیو کی بھین نے جدوں روٹی پکائی، میز اُتے انج سوار کے رکھی جویں ہُنے کوئی آؤن والا سی۔ فیر گھنٹہ لنگھ گیا دو لنگھ گئے، چنگی رات پے گئی، کوئی نہ آیا، تاں دیو کی بھین نے اوس روٹی نوں چنگی طرحاں کج ڈھک دتا تے آپ سویر دی بھی روٹی کھا کے سوں گئی۔

دوسرے دن وی دیو کی بھین نے انج ہی کیتا۔ بڑے صبر نال بھری روٹی بنائی، میز اُتے رکھی، کنا، چر اُڈیکیا۔ فیر اوس روٹی نوں چنگی طرحاں کج ڈھک دتا تے بھی روٹی کھا کے سوں گئی.........

تیسرے دن وی دیو کی بھین نے انج ہی کیتا، چوتھے دن وی انج ہی......... تے روز انج۔

اک دن میں حیران ہو کے دیو کی بھین نوں پُچھیا ''اوہ دس کے نہیں گیا کہ اوس نے کدوں آؤنا اے؟''

''خیال سی اج آ جائے گا، اج نہیں آیا، کل آ جائے گا............'' دیو کی بھین نے صرف اینا آکھیا۔

تے میں حیران دا حیران سوچدا رہیا کہ دیو کی بھین دا ایہہ وشواس میں کیہو جیہا سی، روز روٹی بھی ہو جاندی سی، پر اوہ بھرا رہندا سی۔ دیو کی بھین روز بھی روٹی کھاندی سی، تے بھرا وشواس جیوندی سی۔

فیر شاید دیو کی بھین نوں پیسیاں دی بہت تنگی ہو گئی، اوہنے اک سکول وچ نوکری کر لئی۔ روز سکول جان لگیاں اوہ اک بھری چٹھی لکھدی، تے کمرے نوں جندرا مار کے اوہدے کنڈے وچ ٹنگ جاندی کہ اوہ اپنے گھنٹیاں لئی سکول جا رہی ہے۔ اپنے گھنٹیاں نوں مُڑ آوے گی۔

دیو کی بھین جدوں کالھی کالھی سکولوں مُڑدی، اوہ چھٹی اُنج دی اُنج کنڈے وچ ٹنگی ہوئی ہوندی۔ نہ کوئی پچھے آیا ہُندا، نہ کسے نے اوہ چھٹی پڑھی ہُندی تے دوسرے دن دیو کی بھین فیر نویں تاریخ پا کے نویں چھٹی لکھدی۔

اک دن میں ہار کے دیو کی بھین نوں کجھ بہتا ہی پُچھن لگ پیا تاں دیو دی بھین نے آکھیا، 'ویر توں چنتا نہ کر! اوہ اک وار نہیں، مینوں کئی وار چھڈ کے ٹُر گیا پر کجھ چر پچھوں فیر آ جاندا اے اوہ مینوں چھڈ نہیں سکدا۔''

''اک وار نہیں، کئی وار؟'' میں حیران پریشان ہو کے آکھیا۔

''اک وار گیا تاں مہینے پچھوں ہی مُڑ گیا سی۔ فیر اک وار چلا گیا تاں کجھ بہتا چر لا آیا، فیر اک وار.........''

''پر اوہ کتھے جاندا اے؟ اوس دا کوئی تھوہ پتا؟''

''پتا نہیں کیہ وِلیل اُٹھدا اے اوہدے دل وچ۔''

''پر دیوی کی بھین، اوسنے شاید کتے ہور تیویں.....''

''توں وی جھلا ایں ویر! ہور کوئی تیویں ہووے وی تاں اوس وچاری نون کیہ پتا کہ اوس نوں کیہ چاہی دا اے.......اوہ تاں صرف مینوں پتا اے..........''

''پر دیوی کی بھین توں اوس کولوں کدے کُجھ نہیں پُچھیا؟ اوس نوں کدے کُجھ نہیں آکھیا؟''

''آکھیا کیوں نہیں ویر! میں اوس نوں اِک گل آکھی سی کہ توں بھاویں کئی وار مینوں چھڈ کے جائیں، پر جنی وار جاویں، اوس توں اِک وری ودھ مُڑیں۔ میرا مطلب اے.......'' دیوی کی بھین نے اپنی چھاتی اُتے اپنے ہتھ رکھیا شاید اوس نوں پیڑ چھڑ پئی سی، اتھے چھاتی وچ ساہ لیاں اوس نوں کئی وار پیڑ ہُندی سی، تے اوہ کئی واروں گرم کر کے آپنی چھاتی اُتے رکھدی ہُندی سی۔

تے فیر دیوی کی بھین نے ساہ کے کے آکھیا: ''میرا مطلب اے............. میں آکھیا سی کہ دس واری جاویں تاں مڑیں یارھاں واری۔ جے یارھاں واری جاویں تاں مڑیں بارھاں واری......بس اِک واری ودھ.......ہور میں کُجھ نہیں آکھدی، بس اِک واری ودھ۔''

تے دیوی کی بھین نے مُسکرا کے آکھیا ''جے وچھوڑا اویہہ واری تاں میل اِکی واری۔ جے وچھوڑا پنجاہ واری تے میل اِکونجا واری۔ ایہہ وچھوڑا اپنی مِٹی دیندا رہوے تے میل آپنی مٹی۔ پر اخیر اُتے میل تِگ جاوے۔ اِک نمبر دے فرق نال......اِک نمبر..............''

''تیرا وشواس نہیں مُڑدا دیوی کی بھین؟''

''مُڑدا اے ویر! پر فیر بجھ جاندا اے۔ وشواس بھاویں پنجاہ واری مٹے، پر اوہنوں اکونجا واری جڑنا چاہی دا اے اِک واری ودھ.........بس اِک واری.........''

دیوی کی بھین دے ساہ اوکھے ہو گئے۔ میریاں اکھاں بھر آئیاں۔ میں ماں نوں آکھیا کہ اوہ روں تتا کر کے دیوی کی بھین دی چھاتی نوں سیک کر دیوے۔

دیوی کی بھین نوں اکثر اِک پیڑ چھڑن لگ پئی۔ ہر تیسرے دن سکولوں ناغہ پین لگ پیا۔ پر اوہ روز مندر ورگے، باغ ورگے کمرے نوں سجری ہوا لواندی۔ سجری روٹی پکاندی۔ سکول جان لگی جاں ڈاکٹر ول جان لگی

بجری پھٹی لکھدی تے بے ہُندے جاندے پھیپھڑیاں وچ بجر اساہ بھرلیندی

دیودی بھین دا بھرا اوہنوں کئی وار لین آیا۔ پر اوہ بھرا دے گھر نہ گئی۔ اوہ جویں اوس گھر وچ رہ کے اک نمبر دی راکھی کردی پئی سی..... وچھوڑا ویہہ واری تاں میل اکی واری............ تے اوہ نہیں سی چاہوندی کہ اوہدا میل اک نمبر پچھوں ہار جاوے۔

دیو کی بھین نوں ڈاکٹر نے کئی واری آکھیا سی کہ اوہ ہُن بچ نہیں سی سکدی۔ پر دیو کی بھین دی جان نہیں سی نکلدی، اوہدی جان جویں اوہدے گلے ہوئے پھیپھڑوں وچ بہہ کے اک نمبر دی راکھی کردی پئی سی..... بے وشواسی پنجاہ واری ناں وشواس اکو جا واری..... تے اوہ نہیں سی چاہوندی کہ اوہدا وشواس اک نمبر پچھے رہ جاوے۔

اک رات دیو کی بھین دے ساہ اُکھڑ گئے۔ اوہنے اپنی بانہہ وچوں سونے دی چوڑی لاہی، آپنی انگل وچوں سونے دی مُندری لاہی تے آپنے سرہانے ہیٹھوں نوٹاں دا اک گنڈھ کڈھ، تے سبھ کجھ مینوں پھڑا کے آکھن لگی...... ویرا اک میری گل رکھیں گا؟''

''توں جو کجھ آکھیں دیو کی بھین!''

''ہُن توں وڈا مستری بن گیا ایں۔ تیرے کولوں کجھ تاں ودھ کرایا پُج سکدا اے۔ میرے پچھوں ایہہ مکان نہ چھڈیں میرے والا کمرا توں آپ لے لویں تے اوہ کمرا......... اوہدا کمرا......... انجے دا انجے رہن دیویں۔ ہر مہینے اوس کمرے دا کرایا دیندار ہویں۔ جناچر ایہہ پیسے نہیں مُک جاندے، ایہہ تاں دو ور ھے نہیں مکنے .....'' تے دیو کی بھین نے کھچدے کھچدے ساہوں نال آکھیا ''اوہ خورے کدوں آجائے..... خورے اج ہی آجائے.........''

تے مینوں جاپیا کہ دیو کی بھین دا ساہ اصلوں کھچیا گیا سی فیر میں اوہدی نبض ویکھی، ماڑی ماڑی چلدی پئی سی۔ فیر میں اوہدے مونہہ اگے ہتھ رکھیا، کوئی کوئی ساہ آوندا پیا سی۔

کمر دا بوہا انج کُھلا جویں کوئی بڑی دوروں تے بڑی کاھی کاھی آیا ہووے۔ آون والا اک منٹ ٹھٹھمبر کے کھلو گیا۔ تے فیر اوہنے دیو کی بھین دی منجی اُتے بہہ کے اوہدا سر آپنی جھولی وچ رکھ لیا

دیودی بھین نے اکھیا کھولیاں، اکھاں وچ اک چانن بھر گیا دیودی بھین ہونٹھ کھولے، ہونٹھاں وچ اک مسکراہٹ بھر گئی۔

''میں آ گیا ہاں'' آون والے دی زبان نے نہیں، پر اوہدے جسم دی کنبنی نے آکھیا۔

''مینوں پتا سی توں آویں گا......'' دیو کی بھین دے وشواس نے جواب دتا۔ دیو کی بھین دی نکلدی نکلدی جان اک پل لئی کھلو گئی۔ ایہہ پل جویں اوہدی زندگی نے موت نال کھیڈ دیاں جت لیا ہووے۔ اک پل دے فرق نال موت ہار گئی، زندگی جت گئی۔ اک وار دے فرق نال وچھوڑا ہار گیا تے میل جت گیا۔ اک نمبر دے فرق نال بے وشواسی ہار گئی تے وشواس جت گیا۔

دیو کی بھین ایس دنیا توں چلی گئی۔ تے بھاویں دیو کی بھین دے چھڈے روپیاں نال میں اوہدے محبوب دا بڑا اعلاج کیتا پر اوہ وی دیو کی بھین دے پچھے پچھے چلا گیا۔ شاید اگلی دنیا وچ دیو کی بھین ایک مندر ورگا اک باغ ورگا گھر بنا کے اوہنوں اڈیکدی پئی سی۔

پاکیزگی شاید ایک چھوت دی بیماری ہُندی ہے۔ جو مینوں دیو کی بھین کولوں لگ گئی ہے۔ میں روز اوس مندر ورگے اوس باغ ورگے کمرے نوں کھولدا ہاں۔ اوس نوں جھاڑدا ہاں پونچھدا ہاں، تے فیر بڑے ادب نال بھیڑ دیندا ہاں۔

روز زندگی دے اک موڑ اُتے میرا وشواس ٹُٹدا ہے تے دوسرے موڑ اُتے بجھ جاندا ہے۔ تے مینوں جاپدا ہے کہ دیو کی بھین دا اوہہ کمرا ایس دنیا وچ اِک نمبر دی راکھی کردا پیا ہے بے وشواسی پنجاہ واری تاں وشواس اِکونجا واری.........اک نمبر دا فرق.........بس اک نمبر دا فرق۔

(لپی انتر: جمیل احمد پال)

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پردیسی

میرے دیو چاچا جی کوشی دے دیو پتا جی سن۔ کل ایہو تر کاں داویلا سی جس ویلے اچانک اوہناں دے دل دی دھڑکن بند ہو گئی۔ آخری ویلے اوہناں نے کجھ نہیں آکھیا، پر مینوں وی پتا سی تے کوشی نوں وی پتا سی کہ اوہناں نے اک وار نہیں کئی وار سانوں چتاونی دتی ہوئی سی، ''بئی یہ تمہارے دیش میں لوگ ہنگاما بہت کرتے ہیں۔ کوئی اس دنیا میں آئے یا اس دنیا سے جائے۔ اس میں ہنگاما مچانے کی کیا بات ہے! چاہتا تو ہوں کہ جب میں اس دنیا سے جاؤں، کسی 'ایئر کریش' میں مر جاؤں' برف کی کسی گھاٹی وادی میں خود ہی اک قبر بن جائے۔ ہوا ایک کفن ڈال دے گی، مگر یہ اپنے بس کی بات نہیں۔ مجبوری ہے،۔ پھر بھی تم لوگ یاد رکھنا، جو کچھ بھی کرنا ہو، جلدی سے کر دینا۔ بس اس کے بعد کچھ نہیں، کسی کو کچھ کرنے کی یا کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں''

ایس لئی اج سویرے چپ چاپ اساں اوہناں دے سریر نوں ودیاع کر دتا۔ ایس ویلے تر کالاں داویلا ہے۔ کوشی دا مونہہ بڑا لتھا ہویا ہے۔ شادی میرا وی لتھا ہویا ہووے گا۔ کیونکہ کوشی مینوں زوریں چاہ دا پیالا پین واسطے آکھ رہی ہے۔ چاہ دا گھٹ میرے اندروں نہیں لنگھدا پیا تے کوشی دے اندروں نہیں، کیونکہ جس طرح میرے اندر چاچا دیاں گلاں لتھیاں ہوئیاں ہن، اوسے طرحاں کوشی دے اندر دیو پتا جی دا پیار لتھا ہویا ہے۔ گلاں نوں پیار تے پیار نوں گلاں وچ رلان لئی کوشی مینوں پچھ رہی ہے،'' دیو پتا جی ہمیشہ پنجابی وچ گلاں کردے سن، پر جدوں کدے اوہناں نے کوئی خاص گل کہنی ہُندی اوہ اردو بولدے سن۔ دیدی، اوہ اردو کیوں بولدے سن؟'' ''نہیں، کوشی اوہ اُردو اودوں نہیں سن بولدے جدوں اوہناں نے کوئی خاص گل کہنی ہُندی سی، اوہ اردو اودوں بولدے سَن جدوں اوہ بڑے اُداس ہُندے سَن۔ پنجابی شاید اوہناں دی اُداسی دے میچ نہیں سی آوندی جاں شاید اس لئی کہ اُداسی اوہناں لئی بڑی اوپری چیز سی، تے اوہدے لئی اوہناں نوں زبان وی کوئی اوپری چاہیدی ہُندی سی۔''

''پردیدی.....'' کوشی پتا نہیں مینوں کیہ پُچھن لگی سی پُچھدی پُچھدی چُپ کر گئی ہے۔ ایہہ اج دی گل

نہیں، کوشی دی مُڈھ توں عادت ہے۔ اوہ زندگی نوں ہمیشہ چپ چاپ ویکھدی رہندی ہے۔ اوہدے کولوں پُچھدی کجھ نہیں۔ جے اوہ پچھ سکدی تاں شاید زندگی کولوں سبھ توں پہلاں ایہہ سوال پُچھدی کہ اوہدے کہڑے اُچے کرماں صدقہ دیو پتا جی اوہدے پتا جی بن گئے؟ کوئی وی سکا پتا اینا سکا نہیں ہو سکدا۔ جنا دیو کوشی دا پتا سی۔ دھرتی کوشی دی ماں سی تے دیو کوشی دا پتا سی۔ کوشی دی عمر پورے چوی گھنٹیاں دی نہیں سی جس ویلے اوس دے دیو پتا جی ندی دے کنڈھے اوس دی ہوا تک سُنی سی۔ اپنے گھنٹے دھرتی تے اوس بچی نوں اپنی جھولی وچ امن وامان رکھیا سی۔ کوئی دھرتی دے ایس رحم نوں اودوں توں ویکھدی پئی ہے ویہہ ورہیاں توں ویکھدی پئی ہے۔ بڑے چنگے سکول وچ تے بڑے چنگے کالج وچ پڑھدی رہی ہے بڑے چنگے خاوند نال اوس دا ویاہ ہویا ہے۔ تے دیو پتا جی کولوں اوس نوں اک بڑا چنگا گھر ورثے وچ ملیا ہے۔ ایس لئی اوہ چپ چاپ اک انسان دے روپ وچ اک خدا دیاں رحمتاں نوں ویکھدی ہے، پُچھدی کُجھ وی نہیں۔

اک صرف میں سوچ رہی ہاں کہ کوشی نوں دیو پتا جی کس طرح مل گئے تے کوشی وانگ میتوں دیو چاچا جی مل گئے۔ دیو میرے پتا جی دے نال پڑھدے ہُندے سَن۔ اک وار فیس دین جوگے دوہاں کول پیسے نہیں سن۔ دیو نے آپنے ہتھ وچ پئی ہوئی مُندری ویچ دتی سی، جدھے نال دیو نے وی تے میرے پتا جی نے وی امتحان دی فیس دتی سی۔ اوس دن توں اوہ دوست بن گئے سَن۔ دوست نہیں، بھرا بن گئے سن۔ ایہہ میرے جنم توں بڑے ورہے پہلاں دی گل ہے۔ ایس طرحاں اوہ میرے جنم توں پہلاں ہی میرے چاچا جی بن گئے سن۔ پتا جی دسدے ہُندے سَن کہ جس دن اوہناں دے امتحان دا نتیجا نکلیا سی، دیو چاچا جی سارے کالج وچوں فسٹ آئے سَن تے اوہ سیکنڈ آئے سَن۔ پر اگوں اوہناں نوں وی تے دیو چاچا جی نوں وی پڑھائی چھڈنی پئی سی کیونکہ دوہاں کول اگلی پڑھائی واسطے پیسے نہیں سن اوس دن اوہناں نے دیو چاچا جی نوں پہلی وار اردو وچ بولدیاں سُنیا سی، ''بھئی یہ کیا ہے تمہارے دیس میں، جن کے پاس قابلیت ہے، جن کے پاس خواب ہیں وہ آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ ان کے پاس چاندی کے تھوڑے سے روپے نہیں ہیں!'' میرے پتا جی اک اخبار دے دفتر وچ کم کرن لگ پئے تے دیو چاچا جی اک سکول وچ چھوٹی جہی ماسٹری کرن لگ پئے۔ پتا جی نے اک نہیں، اخباراں دے کئی دفتر بدلے تے دیو چاچا جی نے وی اک نہیں، کئی سکولوں دی ماسٹری بدلی۔ اک دوسرے دے ناتیاں ویلے اوہناں وچ اک دوسرے دی روٹی ہمیشہ سانجھی رہندی سی۔

میری سنبھال توں بہت پہلاں دی گل ہے، جدوں امرت جلھیانوالے باغ وچ گولیاں چلیاں سن

تے امن امان بیٹھے ہوئے لوک حاکم گولیاں نال دھنے گئے سَن ۔ پر ایہہ گل میں پتا جی کولوں اینی وار سُنی ہے کہ مینوں جاپن لگ پیا ہے جویں آپنی اکھیں ویکھی ہوئی ہووے ۔ دیو چاچا جی کئی راتاں منجی اُتے سو نہیں سن سکے ۔ اوہ ساری رات مکان دی اپرلی چھت اُتے پتھر وانگ بیٹھے رہندے سَن ، صرف بیٹھیاں بیٹھیاں اوہناں دیاں اکھاں وچوں اتھرو وگن لگ پیندے سَن تے اوہ اکلّے بیٹھے بیٹھے پتا نہیں کس نوں مخاطب ہو کے کہن لگ پیندے سَن ''یہ کیا ہے تمہارے دیش میں سارے غلام بنے رہیں گے اور گولیاں کھاتے رہیں گے......''

بھگت سنگھ نوں جدوں پھانسی لگی سی، میں اودوں بالکل بچی ساں، پر ایہہ گل مینوں چنگی طرحاں یاد ہے کہ دیو چاچا جی نوں اہناں دے سرکاری سکول وچوں کڈھ دتا گیا سی ۔ شاید اوہ سکول دے کمرے وچ ودیارتھیاں (طالب علمان) دے ساہمنے روپے سن ۔ اوہ جدوں گھر آئے سن، آکھ رہے سن یہ کیا ہے، تمہارے دیش میں، بھگت سنگھ مر جائے اور ہم لگ رو بھی نہیں سکتے......''

ایہہ گل دا کسے نوں پتا نہیں سی کہ دیو چاچا جی میرے پتا جی دے سکے بھرا نہیں سَن ، ایس لئی اک وار انج ہویا کہ پنجاب دیاں گھٹیا سکھ اخباراں دیو چاچا جی دے پچھے پے گئیاں کہ اِک سکھ خاندان دے نوجوان نے اپنے وال کٹا دتے سَن تے اوہ سگرٹ پیندا ہے! اخباراں والیاں نے آپے ہی سوچ سوچ کے دیو چاچا جی دا اک سکھی ناں گھڑ لیا سی ''دیویندر سنگھ'' دیو چاچا جی اک دن ہتھ وچ اخبار پھڑی آئے ۔ اخبار اوہناں نے میز تے رکھ دِتی صرف، چاہ پین لگیاں اوہناں نے اِک واری سرسری طور اُتے آکھیا ''سمجھ میں نہیں آتا یہ تمہارے دیش میں کیا ہے! اسگرٹ میں پیتا ہوں اور اس کا دھواں مذہب کے پھیپھڑوں میں چلا جاتا ہے......''

میری بڑی چھوٹی جہی عمر سی جدوں میرے پتا جی گزر گئے میری ماں اوس توں وی پہلاں گزر گئی ہو سی ۔ مَیں گواچی وچھی وانگ اپنی نانی کول رہندی ساں ۔ دیو چاچا جی

اوسے طرحاں نیم نال اوندے سَن تے چلے جاندے سَن ۔ مینوں یاد ہے، مَیں کئی وار دیو چاچا جی دے بٹناں نوں مُڑ مُڑ کھولھدی تے مُڑ مُڑ کے بند کر دی اوہناں نوں آکھدی ہُندی ساں ''چاچا جی! ہُن تسیں اک چاچی لے آوو'' ــــــ انج جویں میں اک چاچی نہیں، اِک کھڈونا منگ رہی ہوواں پتا نہیں ایہہ میں آپنی اکلتا توں گھبرا کے آکھدی ساں کہ دیو چاچا جی دی اکلتا توں ۔ پر اوہ ہمیشہ والاں دی لٹ نوں سوار دے ہَس پیندے سَن ''بیٹا یہ تمہارا دیش کتنا بڑا ہے، جانے تمہاری چاچی جہاں کھوگئی ہے اس میں! میں کہاں سے

لاؤں اُسے''

دیو چاچا جی نوں آپنی گواچی ہوئی بیوی تاں نہ لبھی، پتا نہیں کہڑے جنم دی گواچی ہوئی سی، پر آپنی بچی ضرور لبھ پئی۔ اوروز سویر ساوندی دے کنڈھے سیر کرن جاندے ہُندے سَن۔ اِک دن اوہناں نے ندی دے کنڈھے اُگے ہوئے جھاڑ بُوٹیاں وچوں اوس دے رون دی آواز سُنی، باہواں وچ اوہنوں چُک لیا، آلے دوالے دے لوکاں نوں کئی وار پُچھیا کہ کوئی اوس دا وارث بننا چاہے تاں بن سکدا اے۔ پر کسے کول وی اوس بچی نوں دین واسطے کئی رِشتا نہیں سی۔ دیو چاچا جی نوں جاپیا کہ اوہ بچی دھرتی دا اِک کشکول ہے: اِک کاسا جہڑا ایس دنیا کولوں اِک رشتے دی منگ کردا پیا ہے۔ جدوں دوالے دے سارے لوک انکاری ہو گئے تاں دیو چاچا جی نے اوس کاسے وچ اپنا دل پا دتا۔ محبت دا اوہ معصوم رِشتا پا دِتا جہڑا اِک باپ وچ تے اِک بیٹی وچ ہُندا اے۔ ایس لئی اوہناں نے بچی دا ناں کشکول رکھ دتا۔ کوشی بچی نوں باہواں وچ چُکی اوہ کئی دن آکھدے رہے'' پتا نہیں یہ کیا ہے تمہارے دیش میں، کوئی ماں باپ اگر شادی نہیں کرتے تو اس میں بچے کا کیا قصور ہے۔ ناجائز حرکت تو ماں باپ کرتے ہیں پر سمجھا جاتا ہے بچہ ناجائز——''

ایہناں دناں دی ہی گل ہے، جدوں ہندو مسلمان فساد شروع ہو گئے۔ ساڈے دیس دا کوئی پنڈ جاں کوئی شہر ایہو جہیا نہیں سی جہڑا چیکاں نال نہیں سی بھریا ہویا۔ دیو چاچا جی دے کناں وچوں لنگھ کے اوہناں دے دل وچ ہندو چیکاں وی اوسے طرح چبھدیاں سَن، جس طرحاں مسلمان چیکاں۔ نہ میں گن کے دس سکدی ہاں تے نہ دیو چاچا جی گن کے دس سکدے سن کہ اوہناں نے کنیاں کو عورتاں تے کنے کو مرداں نوں آپنے ہتھاں وچ کج کج کے رکھیا۔ اوہ ضرور سوچدے ہون گے کہ کدی اوہناں دے دو نکے ہتھ دامن اوتار دے قدماں وانگ بن جان تاں اوہ دیش دے ہزاراں پنڈاں تے ہزاراں شہراں نوں اپنے ہتھاں نال کج دین تے کسے پنڈے اُتے وی کسے پتھر اکدی نہ چھوہ سکے۔ پر نکیاں ہتھیاں دی مجبوری نال اوہ ہر کسے دی چیک نال تڑپ سکدے سَن ہور کُجھ نہیں سن کر سکدے۔

دیش دی سُتنتر تا نے دیو چاچا جی نوں کئی چر اردو وچ بولن دا موقع نہ دتا۔ سانوں انج جاپن لگ پیا کہ دیو چاچا جی نوں اُردو بولنی بھُل گئی ہے۔ ایہناں دناں وچ اوہ صرف دو کم کردے سن۔ روٹی کمان لئی سارا دن اِک سرکاری دفتر وچ نوکری کردے سَن تے رات نوں اخباراں لے کے دیش دے سبھناں آگوآں دیاں تقریراں پڑھدے سَن۔ ایہناں تقریراں دیاں کتراں نوں جوڑ جوڑ اوہ شاید دیش دے بھوکھ لئی کوئی سُپنا

سیوندے رہندے سن۔ فیر ہولی ہولی اوہناں نوں جاپن لگ پیا کہ سپنے دا کپڑا پتا نہیں کیہو جہیا چھجیا ہویا ہے، جس نوں اوہ اک تھاں توں سیوندے ہن تے اوہ دوسری تھاں توں پاٹ جاندا ہے۔ اک دن اوہناں نے ہتھل ہو کے اُمیداں دے سارے سوئیاں دھاگے سُٹ دِتے۔ اوس دن اوہ زور زور دی بول رہے سن ''ایس تمہارے دیش کا کیا ہوگا؟ جن لوگوں نے دیش کے لئے قربانیاں کیں اب وہ ان قربانیوں کو بازار میں بیچ رہے ہیں غریب لوگ اور غریب، ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا کروں اس تمہارے دیش کو پیار کرتا ہوں، اس کے لوگوں کو پیار کرتا ہوں اسی لئے دُکھ ہوتا ہے......''

دیش دی اُنتی والے اخباراں وچ چھپی ہوئی کسے تقریر وانگ ـــــــ، دیو چاچا جی دی زندگی وچ اک اوہ محبت وی آئی جس دا کوئی ارتھ نہیں سی۔ اک بڑی خوبصورت عورت نے اچانک دیو چاچا جی نال ویاہ کرا لیا۔ ایہہ عورت اوہناں دے دفتر وچ کم کردی سی پتا لگا کہ اوہ اک اپھل محبت توں اینی پریشان سی کہ اوس نوں دیو چاچا جی دی خوب سورتی اک رحمت وانگ لگن لگ پئی سی۔ پر چھیاں مہینیاں دے چھوٹے جہے عرصے وچ اوس دی پہلی محبت نے اوس دے اُتے فیر غلبہ پالیا۔ اوس دا پہلا پریمی اوس دے کول مُڑ آیا سی تے اوس دے کولوں اپنی خطا دی معافی منگدا پیا سی۔ اوس عورت نے جنی آزادی نال دیو چاچا جی کولوں طلاق دی منگ کیتی، چاچا جی نے اونی ہی حلیمی نال اوس دی سنتنترتا اوس نوں دے دِتی۔ کجھ گھٹیا تے ویہلیاں اخباراں نوں پتا نہیں کیوں چاچا جی نال بڑی ہمدردی جاگ پئی، اوہناں نے اک عورت دے طلاق نوں سارے سماج سُدھار دا وِشا (موضوع) بنا لیا۔ اینا کہ اک گھٹیا نظم لکھ کے وی اخباراں وچ چھپوائی ''نس گئی، نس گئی اوہ نس گئی'' چاچا جی اخباراں نوں ویکھدے، ہتھاں وچ مروڑدے تے رون ہاکے ہو کے آکھدے، ''یہ تمہارا دیش کیسا ہے؟ کسی انسان کی محبت یا شادی اس کی اپنی محبت یا شادی نہیں۔ کسی سے ملنے کا حق بھی اس کا حق نہیں، اور کسی سے وچھڑنے دا حق بھی اُس کا حق نہیں۔ وہ بے چاری عورت کہاں بھاگ گئی ہے، ان لوگوں کی عقل بھاگ گئی ہے ان لوگوں کی انسانیت بھاگ گئی ہے......''

ایہناں دناں وچ چاچا جی دفتر دے کم توں علاوہ کجھ کتاباں نوں ترجمہ کرن دا کم وی کردے سن۔ اوہناں دی آمدن ودھ گئی سی۔ اوہناں دی بچی دنو دن جوان ہندی پئی سی، ایس لئی اوہ اپنی بچی لئی اک چھوٹا جہیا گھر بنوا رہے سن، تے اوہناں نوں خیال آیا کہ اک ایمان دار شہری وانگ اوہناں نوں ہن بہتا ٹیکس دینا چاہی دا ہے۔ اوہناں نے اپنی آمدن دا سارا ویروا لکھ کے سرکار نوں بھیج دتا۔ پر میتوں چنگی طرحاں یاد ہے کہ جس دن

اوہ بڑے اُتشا نال انکم ٹیکس دی تریک بھگتن گئے، اوس دن شام نوں اوہ آپنے کمرے وچ آپنا سر پھڑ کے بیٹھے ہوئے سَن، ''یہ تمارا دیش کیسا ہے! ہم لوگ اِس کے شریف ناگرِک ہیں یا چور ہیں! جو بھی ہم لوگ کماتے ہیں، اس میں سے سرکار کا حق دینا آپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم خوشی سے دیتے ہیں۔ ایمان داری سے دیتے ہیں، پر ہمارے ساتھ یہ کیسا سلوک ہے؟ ہمیں ایسی نظروں سے دیکھ جاتا ہے۔ جیسے ہم کیا، ہمارے باپ دادا بھی چو رہیں!'' گل ایہہ ہوئی سی کہ چاچا جی مکان بنوا رہے سَن، کئی وار اِکو ہفتے وچ زیادہ خرچ آپیندا سی۔ بنک وچ اوہناں دا سیونگ اکاؤنٹ سی جدھے وچوں اوہ ہفتے وچ صرف پنج سو روپئے کڈھوا سکدے سَن۔ ایس لئی اوہناں نے اِک دی تھاں دو بنکاں وچ اکاؤنٹ رکھ لیا سی۔ لوڑ پیندی تاں اوہ دوہاں وچوں پیسے کڈھوا سکدے سن۔ کدے جے اک بنک وچ تھوڑے ہُندے تاں کسے وہیلے ہفتے اوہ دوسرے بنک وچوں کڈھوا کے اوہدے وچ جمع کروا دیندے، تاں کہ لوڑ ویلے اوکھ نہ ہووے اوہناں نوں زندگی دی کوئی ہیرا پھیری نہیں سی آؤندی۔ ایس لئی اوہناں نوں کوئی گل چیتے رکھ کے نہیں سی کرنی پیندی۔ انکم ٹیکس دے افسر نے بنک دی اِک پاس بک ویکھدیاں آکھیا کہ اہدے وچ دسّی ہوئی آمدن نالوں بہتا روپیا جمع سی ایہہ روپیا بھاویں دوسرے بنک وچوں کڈھوا کے جمع کیتا گیا سی، پر چاچا جی نوں اوہدے کھر ہووے، شکی تے بے عزت کرن والے سوالاں توں اینی گھبراہٹ ہوئی کہ اوہناں نوں سارا دیروا بھُل گیا۔ اوس دن اوہ بڑے دُکھی سَن۔ اوہناں نوں کسے پڑتال دا دُکھ نہیں سی، اوہناں نوں دُکھ سی کہ اوہناں دی نیت اُتے شک کیتا گیا سی تے اوہناں نال غیر انسانی سلوک کیتا گیا سی۔

کنیاں ہی گلاں یاد آ رہیاں ہن۔ کوشی دے ویاہ دی گل وی یاد آ رہی ہے۔ کنیاں شریف گھراں وچ کوشی دے ویاہ دی گل چلی سی۔ کوشی بہت خوبصورت کُڑی ہے، بڑے پیارے سُبھاء دی تے پڑھی لکھی۔ کسے لئی وی کوشی نال ویاہ کرنا اک فخر دی گل ہو سکدی سی۔ پر اکثر انج ہویا کہ جہڑا وی کوشی دے رُوپ اُتے جان اوس دے گُناں اُتے موہیا جاندا، اوس نوں جدوں کوشی دے جنم والی گل داپتا لگدا تاں اوہ ویاہ توں انکاری ہو جاندا جویں اوس دی شرافت اُتے کوشی نال ویاہ کیتیاں اک داغ پے جانا سی ''یہ کیسے شریف لوگ ہیں۔ تمارے دیش کے، ان کے پاس آنکھیں تو بہت بڑی ہیں پر ان میں نظر بالکل نہیں ہے۔'' دیو چاچا جی اوہناں دناں وچ اکثر بیٹھیاں بیٹھیاں ایہہ آکھن لگ پیندے سَن ہُن جدھے نال کوشی دا ویاہ ہویا ہے اوس نے جدوں چاچا جی اُگے کوشی نال ویاہ دی فرمائی کیتی سی تاں چاچا جی اینے دُکھے ہوئے سَن کہ اوس نوں ویکھدیاں ہی بول

پئے۔ ''کیوں نوجوان! اپنی شرافت کا سودا کرنے آئے ہو؟''——ایہہ چاچا جی نے ایس لئی آکھیا سی کہ اوہناں دِناں وچ کوشی نوں ورتے وِچ ملن والا دیوچا چاجی دا بڑا سوہنا گھر دیکھ کے کیہ امن للچایا ہویا سی۔

''شرافت کو بیچنے نہیں آیا شرافت کی قیمت دے کر شرافت کو خریدنے آیا ہوں.....'' اوس نے جدوں بڑی حلیمی نال تے بڑے آدر نال جواب دتا تاں چاچا جی اکدم اوہدے نال پنجابی وچ گلّاں کرن لگ پئے۔

ایس ویلے کوشی میرے کول بیٹھی ہوئی، میرے مونہہ ول دیکھ رہی ہے۔ اوہی سوال جہڑا کجھ چر پہلاں اوہدے ہوٹھاں اُتے رُک گیا سی، اوہ مینوں پُچھ رہی ہے:''پردیدی! دیو تا جی رہن والے تاں ایس دیس دے سن۔ ایہہ اوہناں دا آپنا دیس سی'' پر میریاں اکھاں وچ اتھرو آ گئے ہن تے مینوں پتا نہیں لگ رہیا کہ میں کوشی نوں کویں آکھاں کہ ایہہ دیس دیوچا چاجی دا دیس نہیں سی، کوئی وی دیس اوہناں دا دیس نہیں سی کیونکہ کسے دیس دی ہنترا ے ایہو جہی نہیں بنی جہڑی انسان نوں جیون دا پورا حق دے سکے۔ میں کوشی نوں کویں دساں کہ دیوچا چاجی بھاویں کسے وی دیس وچ جمدے تے کسے وی دیس وچ رہندے، اوہ پردیس وچ پردیسی ہی ہونے سن......

(لپی انتر: افضل راز)

☆☆☆☆

امرتا پریتم
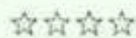
بھابھی مورنی

''نی چندے! ہُن آہ پونیاں کویں کتنیاں؟'' اوہنے اپنے رُوں ورگے چٹے والاں نوں ریٹھیاں نال دھوتا، تاں پونیاں جڈے گڈھ والاں نوں نچوڑدی دِلیلے پے گئی۔

اوہ جویں دلیلاں دیاں تنداں اٹیرن اُتے اٹیردی پئی سی— ''رزق دا آکھیا کون موڑے...... چڑیاں دے بوٹ اُڈن جوگے ہوئے تاں خورے کہڑے رُکھیں جا بیٹھے وارو واری تنے شہراں نوں ٹُر گئے......''

اوہنے بچی بچی تناں منڈیاں لئی ہِک وچ آکھنا پایا سی۔ اوہناں دے سو آہر ہُندے سَن، منجی اُتے لک سدھا کرن دی وی وہیل نہیں سی ہُندی، پرتاں وی اوہ کدے تھکدی نہیں سی ہُندی۔ تے ہُن وڈا، ویاہیا دریا نوکری تے، چھوٹے دوو دویں شہراں وچ پڑھن ٹُر گئے سَن، تاں وہیلی ہوئی چندو نوں جاپدا سی۔ اوہدے بند بند وچ کھلیاں پے گئیاں سَن۔ —— ''کالا رُوں تاں رنڑ گیا، ہُن ایہہ چٹا کویں کتاں گی؟'' اوہنوں جہڑیاں سوچاں جوانی ویلے نہیں سَن آئیاں ہُن بڈھے وارے گوڈیاں دی پیڑ وانگوں اپٹھ پئیاں سَن...... تے اوہنوں شاہ کالے والاں دا چیتا آیا، جو بچی بچی موراں دی پیل وانگوں اوہدی پٹھ اُتے پیندے ہُندے سَن......

''ساؤ! توں کہڑے ویلے میرا ناں مورنی دھریا سی...... مورنیاں دے نصیباں وچ پیلاں کتھے...... مورنیاں تاں پیراں نوں ویکھ ویکھ جھردیاں نیں......'' تے اوہدی انجھ آپنے پیراں نوں ویکھدی، پیراں دیاں بیائیاں وچ ڈِگ پئی۔

''ساؤ'' اوہدے شریکے دا دیور سی۔ اصلوں الُو آں سی، جدوں اوہنے چٹے سرہانے اُتے ہرے کاشنی دھاگیاں نال مور کڈھدی بھابھی نوں ویکھیا سی، تے تھوڑے گھر ویاہی چندو دے ہتھاں وچ پھڑی ہوئی سُوئی، ساؤ دی واج سُن کے بچی بچی دھاگیاں دی جھی پیل پان لگ پئی۔ اوہنے سراہانا ئکا کے جدوں چھبی دی

ململ دا دوپٹا چھوہیا، ج تاں اوہدے اُتے وناں وناں دے پھل ہیان دی تھاں ـــــ مورا اُلیکن لگ پئی۔ اوہدے ایسے ہر دے پلے توں سارے پنڈ وچ اوہدا ناں بھابھی مورنی پے گیا سی۔

دیہندیاں ویہندیاں ساڈا داویاہ ہویا، اوہدے گھر اُتو رُتی دے تن پُتر جمے تے بھابھی اوہناں نوں چُم چُم چٹ چٹ کھڈندی رہی۔ اوہدی اپنی جون اہل جاندی پئی سی پنڈ دی کوئی سینی بیانی جھر دی، تاں اوہ ساڈے پُتراں نُوں گوڈیاں تے بٹھا کے وہیں شکر کھواندی ہس کے آکھدی ـــ ''نہ بے بے کوئی ہرکھ نہیں۔ تیویں نوں ایہو ہرکھ ہندی اے ناں کہ بڈھے وارے جوں گوڈیاں وچ پانی پے جائے گا، اودوں ...... نی اودوں تر بھلا ہی کھانا ہندا اے ناں ......'' تے اوہ ساڈے پُتراں دے مُونہہ چُمدی آکھدی ـــ ''آہ ویکھاں میرے ہرڑ ہیرے آ ملے، ماسا موہ دی پھکی وی ان دین گے؟''

''نی اوہدے گھر دیر ہُندی اے، ہنیر نہیں'' اگلی دِل رکھن نوں کہہ دیندی ہُندی سی۔ پر جدوں بھابھی مورنی دے ویکھن وچ پیلاں پاؤن والا اوہدا گھر والا مر گیا، تاں جدھے گھر سنیا سی، ہنیر نہیں ہُندا، اوہدے گھر ہنیر ورگ گیا۔

''مورنی تاں پیراں نوں ویکھ ویکھ جھر دی اے، پر جدوں تیویں نوں جھرنا پیندا اے، اوہ متھے دے لیکھاں نون ویکھ ویکھ جھر دی اے ......'' اوہ جدوں سائیں دا ہنیر کہن جوگی ہوئی سی، تاں بیٹھی کھلوتی دے مُونہوں ایہو نکلدا سی۔

غم جدون لہندا اے، تاں عورت دی چھاتی وچ لہندا ہے۔ تے مرد دے ہتھاں وچ۔ ساؤہڈ بھن کے اپنے کھیتاں نوں وی گوڈ دا ہیجدا، تے بھابھی مورنی دے کھیتاں نوں وی جہڑی تھڑوں رب نے پادتی سی اوہنوں اوہ ندے دی ذاتی نہیں سی بھر سکدا، پر ہور کئی تھڑوں اوہنے بھابھی مورنی نوں نہین سی اوّن دِتی۔

''بالاں دے بیج چلھے اگ تاں بالے گی۔ نہیں تاں بھی سنی کھا کے پے رہوے گی'' ساؤ من وچ چتاردا تے بالاں نوں اجے بیجے اوہدے گھر بھیج دیندا سی۔ انج دی اک کندھ داٹپو واڑا سی ـــــ بال کئی واری کندھ دے اکیس پار سوندے تے اوس پار جا گدے۔ سُتیاں نوں اوہناں دی ماں چک کے لے جاندی سی، جاں بھابھی مورنی موڈے نال لا کے چھڈ آندی سی۔

تیف یرچا نچک ساؤدی تیویں، آپنے پیکے آپنے پیو دی مکانی گئی، جویں آپنی مکانی گئی ہوگئی۔ اکو رات وچ اوہدے کلیجے پیڑ اُٹھی ـــــ کے ہول ورگی، جنھے دو جا دیہوں نہ دیکھن دتا'' اوہدی مڑھی اوہنوں

بلاندی سی'' کہندے تے گرلاندے اوہدے پکے سوہرے اوہنوں رہ بیٹھے، تاں ساؤنوں اگلی سوچ پئی سی——اوہدے بالاں دا کیہ بنے گا؟ اوہنے بھابھی مورنی دا درکھڑکایا—— ''آہ تیرے ہر بیڑے رُل جان گے ایہناں نوں سانبھ لے!

اوس ویلے بھابھی مورنی نے رُنیاں اکھاں نال بالاں نوں تاں کلیجے لا لیا سی پر آکھیا سی——
''ساؤ تیرے بڑے حسان نیں میرے تے، میرا لُوں لُوں ودھا ہویا اے تیرے حساناں ناں، پر جگ دا مونہہ کون تھمے گا''—— تے اگوں ساؤ دا مونہہ انج ہر کھ گیا سی، جیویں اگ وچ تپی ہوئی اِٹ اُتے کسے پانی دا چھٹا کا مار دِتا ہووے۔ جگ اکھاں توں اوھلے سی، ساؤ اکھاں دے ساہمنے سی بھابھی مورنی نے بالاں نوں ماں دا ہوکا نہ لگن دتا—— سیال جائے ہُنال اوہدی بھکھ تریہہ وی بالاں دی بھکھ تریہہ وچ رَنگی سی۔ (انج کوئی ڈیڈھ ورہے پچھوں جھڑی کندھ دوہاں گھراں نوں پاڑدی سی، اوہدے مینہاں نال لئی لتھ گئے، تاں اوہنوں مُڑ کے لنبن پوجن دا اوہنے آہر نہیں سی کیتا۔ فیر اک تھاویں مکھار جیہا ہویا۔ تاں بالاں نے اوہدے وچوں ٹپ ٹپ کے ہولی ہولی اوہدا ابلا بھوں نال لا دِتا تے انج اوہ کندھ، جویں آپ ہی آپنیاں اکھاں وچ بے لوڑی ہو کے ڈھیلا ڈھیلا ڈگ پئی) ہولی وہلی منڈے اوہدے موڈھیاں توں اُچے ہو گئے تے فیر ہولی ہولی ایہہ ہو گیا کہ بھابھی مورنی آپ مساں منڈیاں دے موڈھیاں تک پہنچدی۔ ساؤ نے جوگ تاں کسے کولوں نہیں سی لیا پر پنڈ والے کہندے سن—— کہ اوہ پچھلے جنم دا جوگی ضرور سی۔ اوہدی کرنی سچے سادھاں ورگی سی۔

''نی جندے! ہُن آہ پُونیاں کویں کتیاں؟'' جیہیاں سوچاں بھابھی مورنی نوں وِیہہ ورھے نہیں سن آئیاں۔ خورے اوہدے کول ویہل نہیں سی۔ ایہناں سوچاں لئی، پر ہُن تنے منڈے دجوں شہر ٹُر گئے تاں اُٹھدی بہندی نوں ایہہ سوچاں آؤن لگیاں۔

چھاتی اوس آلھنے وانگوں ہو گئی سی۔ جدھے وچوں پنکھیرو اُڈ گئے ہون۔ چھاتی دے کھپے دل وبہندی اوہ اَج دلیلے پئی ہوئی سی، کہ باہر لائنڈا اکھڑ کیا۔

''خورے شہروں وڈا آیا ہووے......'' اُٹھ کے باہر لے بوہے تک اپڑدی نے کنیاں ہی سوچاں گیڑ لئیاں'' سنتے سڑیا، بتھیرا آکھیا سی کہ پتراں وانگوں متھے سہرا بنھ کے ویاہ کر تے ڈولا گھر لے کے آ...... او تھے خورے کیہ کیتا تے کیہ نہ کیتا، بس خط لکھ چھڈیا کہ ویاہ ہو گیا اے...... ایویں رات وی رات لیایا——

کرائن جہی لگدی سی ...... اوہ وی اچھا اوہدی مرضی ...... فیر جھیرا آکھیا کہ اوہ پورے دناں تے ہووے گی تاں گھرے چھڈ جائیں۔ اوتھے شہراں وچ کون رکھاں کردا اے ...... اوہیو گل ہوئی۔ کچے بڈاں نال اوہنے خورے کیہ کھاہدا تے کیہ پیتا، چلیہے دا منڈ اچھڈ کے مرگئی ...... تے اوہ اج موئی کل دوجا دن ...... اتھرے کولوں چھے مہینے صبر نہیں ہویا ...... تیجے مہینے ہی ہورویاہ نوں پھردا اے ......''

پر کنڈ اکھولھیا، تاں بوہے اگے شہروں آیا وڈا نہیں سی، ساؤ ہی سوچتے گھر مڑ آیا سی۔

''تیرا جی تاں راضی اے ساؤ!'' بھابھی مورنی تو یہہ جہی گئی۔

''انج اں راضی اے، ایویں اک صلاح کرنی سی تیرے نال ...... اندروڑدے ساؤ نے کہیا، تاں بھابھی مورنی نے، اوہدے بجے دے پاوے کول بہندی نے، پچھیا

کیہ بھلا؟ وڈے دا کوئی خط آیا اے؟''

''پرانے ویلیاں وچ پریاں دی جند توتیاں وچ ہندی سی —— تیری وی اَدھی جند وڈے وچ تے باقی ادھی چھوٹیاں وچ اے ......'' ساؤ سوچیں وی پیا جاپدا سی تے روہ وچ سی وی''

''کاہنوں! اوہناں بھانے تاں میں جیوندی مرگئی —— چندرے کدے وکھالی دین وی نہیں اوندے ......'' بھابھی مورنی نے ہرکھ کیتا۔

''توں راجی نہیں کہ مساں اوہناں توں ویہلی ہوئی ایں —— اوہناں پچھے توں بڑ کھوروتے۔''

''تے ہن ویہلی ہوئی میں آپنا اچار پانا اے؟''

''چنگا فیر نہ ویہلی ہو۔ وڈے دا خط آیا اے کہ اوہنے ہورویاہ کرانا اے، تے اوہدی نویں سہیندڑ اوہدے منڈے نوں رکھن وچ راضی نہیں ......''

''ہائے میں مرجاں —— کوئی پُراں نوں وی نابر ہندا اے ......''

''تے اوہ لکھدا اے کہ جے تسیں آکھو تاں منڈے نوں تہاڈے کول چھڈ جاواں ......''

بھابھی مورنی دے من وچ ہورہی گھیراں پیاں، آکھن لگی'' ساؤ! تیری کوئی عمر سی، جدوں تیری تیویں مرگئی، پر توں نہ سوچیا کہ گھر وس فیر وسدیاں کراں۔ ہن ویکھ منڈی کولوں چار دن نہیں کٹے گئے ......''

میری گل ہی ہور سی بھابھی!'' ساؤ نے اک بے معلوما جہیا ہوکا لیا۔

''کیوں تیری گل کویں ہورسی؟ توں تاں آپنے پتراں نالوں وی ست سوایا سی ......''

''اچھا'' ساؤ نوں ہاسا جیا آگیا، تے اوہدی واج اوہدے سنگھ نال گھسر گئی'' پر توں اوددوں مینوں ایہہ دسیا ہی نہ''

''لے ایہہ کوئی دسن والی گل سی...... توں اک واری آکھدوں میں تیرے لئی سَت ڈولے لیوندی...... ''بھابھی مورنی اک جھے نال منجی دی بینہہ اُتے بہہ گئی۔

''ستاں توں سوایا اک مونہہ سی، اوہو ویکھ کے رج لیندا ساں، فیر آکھنا کیہ سی......''

ساؤ نے مونہہ دھیان سامھنی کندھ وَل تکدیاں آکھیا۔

''نہیں وے......'' بھابھی مورنی دے چِٹّے بدلاں جہے والاں وچوں جویں بجلی لنگھ گئی۔

''ہوراویں تائیں نہیں جوانی جرلئی......'' ساؤ دے مونہہ اُتے لشکارا پھر گیا۔

''جو لنگھ گئی سوہنی لنگھ گئی، ہُن بڈھے وارے......'' اوہ اُبھر دا ہے جہی بولی۔

''تے میں کدوں کہندا واں سوہنی نہیں لنگھی__ توں اکو بول بولیا سی__

دیورا__ میری پت تیرے ہتھ اے__ سو تیرا بول پکا دِتا......'' ساؤ دی چھاتی خورے بدل وانگوں پاٹ پئی سی۔

بھابھی مورنی کِنا چِر دھرتی ول ویہندی رہی، فیر دھرتی وانگ اڈول ہوگئی۔

''چنگا ساؤ! جہڑی گل ساری عمر نہیں سوچ، ہُن کاہنوں سوچنی اے......''

ساؤ کِنا چِر تالوں انل جیبھ ملدا رہیا، فیر کہن لگا'' چنگا دس فیر منڈے دا کیہ کریئے؟''

بھابھی مورنی سُبھو کے جہی بولی، ''منڈھے دا کیہ کرنا اے، گھر لیا سُو، اوہ اُیتھے پیڑھی تے بیا ہووے گا تاں گھر فیر وسد ا لگے گا......''

ساؤ نے اُٹے کے کارڈ اُتے دوا کھڑ پائے، تے فیر ویہلا جیا ہو کے روز وانگوں اپنے کھونجے وِچ بہہ کے دارو دا گھٹ پین لگ پیا۔

بھابھی مورنی نے روز وانگوں پُھلکے تے دال رکھی، تے فیر ویہلی جہی کھلوتی نوں خورے کیہ گھیر پیا چھاتی وِچوں اک لنب جہی اُٹھی__ تے اوہنے مٹی دی انگیٹھی وچ چار چھوڈے پا کے تیل دی کڑاہی رکھی تے گنڈھیاں دے نِکے نِکے پکوڑے تل کے دارو پیندے ساؤ کول جا کے دھر آئی......

پنجویں دن وڈا شہروں آیا۔ تے رات دی رات رہ کے اوہ جدوں چونہہ مہینیاں دے بلونگڑے جہے

نوں بھابھی مورنی دی جھولی پا کے چلا گیا، تاں بھابھی مورنی نے چٹے زیرے دی پھکی مار کے بال نوں چھاتی نال لا لیا۔

پنڈ دی ایہہ وند کتھا اے جو دی سنیندی اے کہ ساڈا دادا پوترا پورا اک ورہا بھابھی مورنی دا دُدھ چنگھدا رہیا۔

(لپی انتر: افضل راز)

☆☆☆☆

امرتا پریتم

تیڑ دے کپڑے

اچانک میرے ساہمنے کئی لوک آکھلوتے ہن، جیہناں دے تیڑ کوئی کپڑا نہیں.....

پتا نہیں میں کتھے پڑھیا سی کہ خانہ بدوش عورتاں اپنے تیڑوں اپنی گھگری کدے نہیں لاہندیاں، میلی گھگری نوں بدلنا تاں سر والے پاسیوں نویں گھگری پا کے، اندروں دی میلی نوں لاہ لیندیاں ہن تے جدوں کوئی مر جاندی ہے، اوہدی لاش نوں نہاؤن ویلے وی، اوہدے تیڑ دی گھگری سلامت رکھی جاندی ہے۔ کہندے ہن کہ اوہناں نے اپنے ننگھ وچ اپنی محبت دا راز خدا دی مخلوق کولوں چھپا کے رکھیا ہویا ہوندا ہے۔ اوتھے اوہ اپنی مرضی دے مرد دا ناں گدوا کے رکھدیاں ہن، تے جیہنوں رب دی اکھ توں سوا کوئی نہیں ویکھ سکدا.....

تے خورے ایہو اصول مرداں دیاں تہمداں بارے ہوندا ہووے گا.....

جیہو جیہے ناویں گدن والا ضرور اک واری عورتاں تے مرداں دے ننگھ ویکھدا ہووے گا، پر اوہنوں خورے اک گھڑی واسطے رب دی اکھ نصیب ہو جاندی ہے، کیونکہ اوہ مخلوق دی گنتی وچ نہیں گنیاں جاندا.....

پر میری اکھ نوں رب دی اکھ والا سراپ کیوں مل گیا؟؟ میں اپنے ساہمنے اوس اوہ عورتاں تے اوہ مرد کیوں ویکھ رہیا ہاں، جیہناں دے تیڑ کوئی کپڑا نہیں، تے جیہناں دے ننگھ اُتے اوہ ناویں گدے ہوئے ہن، جیہناں نوں ویکھنا ساری مخلوق لئی گناہ ہوندا ہے......

کل توں ماں ہسپتال وچ ہے۔ اوہدی جان اوہدے ساہواں وچ ڈبدی تے تر دی پئی ہے۔ اجّ اگے وی کئی واری ہوندا ہے، تے دو واری پہلاں وی اوہنوں ہسپتال لے گئے ساں پر ایس واری شاید اوہنوں جیون دا بھروسا نہیں بجھدا پیا۔ اچانک اوہنے ہتھاں وچوں ہیرے والی مندری لاہی، تے مینوں پھڑا کے

آکھن لگی کہ میں گھر جا کے اوہدی لوہے والی الماری دے خانے وچ رکھ دیاں۔

ہسپتال وچ ہنے وادی وی آئی سی، پاپا دی میرا وڈا بھرا وی پر ماں نے پتا نہیں کیوں ایہ سونپنا اوہناں نوں نہیں کیتی۔ اسیں سارے پرتن لگے ساں، جدوں ماں نے اشارے نال مینوں ٹھہرن لئی آکھیا۔ سارے چلے گئے تاں اوہنے سرہانے ہیٹھوں اک گچھا ہویا رومال کڈھیا، جیہدی کنی نال دو چابیاں بجھیاں ہویاں سن۔ رومال دی پیچویں گنڈھ کھولی، تاں اک چابی ول اشارہ کر کے اوہنے مینوں ایہ سونپنا کیتی کہ میں اوہدی ہیرے والی مندری، الماری دے اندر لے خانے وچ رکھ دیاں۔ ایہ وی دسیا کہ اندر لے خانے دی چابی مینوں اوسے الماری دے اک ڈبے وچ پئی ہوئی لبھ جاوے گی۔

تے فیر ماں نے ہولی جیہی ایہ وی آکھیا کہ میں بمبئی والے چاچا جی نوں اک خط پا دیاں، دلی آون واسطے، تے دوسری چابی اوہنے اوسے طرح رومال وچ ولھیٹ کے اپنے سرہانے ہیٹھاں رکھ لئی۔

تے جیویں تقدیراں وٹ جاندیاں ہن، اوہ چابیاں وی وٹ گئیاں.....

گھر وچ روز دے ورتن والی ماں دی اکو الماری ہے، پر ادھو سامان ٹوکری وچ لوہے دی اک ہور وی الماری ہے، جیہدے وچ لتھے ہتھے کپڑے پئے رہندے ہن۔ پاپا دی ٹرانسفر ویلے اوہ الماری قریب ٹٹ ہی گئی سی، پر ماں نے اوہ نئی نہیں سی، تے چپاں کھڑباں والی اوہ الماری وادھو کپڑیاں لئی رکھ لئی سی۔

گھر آکے میں وی الماری نوں جدوں چابی نال کھولن لگا، تاں الماری کھلدی نہیں سی۔ چابی میری تقدیر وانگوں وٹ گئی ہوئی سی۔ ہتھ وچ پھڑی ہیرے والی مندری کتے سانبھنی سی، ایس لئی میں سمان والی کوٹھڑی دی الماری کھول لئی۔ ایہ دوسری چابی اوس دوسری الماری دی سی۔ ایس الماری وچ وی اندرلا خانہ سی، تے میں سوچیا ایہدی چابی وی ضرور ایسے الماری دے کسے ڈبے وچ ہووے گی، جس طرح اوس دوسری الماری والے خانے دی، اوسے الماری والے اک ڈبے وچوں لبھنی سی.....

تے میں پائیاں پرانیاں ویاں تیہواں پھولن لگا۔

پرانے ادھڑے ہوئے سلمے والے وی کجھ کپڑے سن، جو ماں نے خورے اوہناں دا سچا سلمہ ویچن لئی رکھے ہوئے سن۔ تے پاپا دے پرانے گرم کوٹ وی سن، جو خورے بھانڈیاں نال وٹان لئی ماں نے سانبھ کے رکھے ہوئے سن۔ میں اک واری گلی وچ بھانڈے ویچن آؤندیاں عورتاں کولوں ماں نوں اک پرانے کوٹ دے بدلے بھانڈے خریددیاں ویکھیا سی.....

پر میں حیران ہویا..... ماں نے اوہ سارے ٹٹے ہوئے کھڈونے وی رکھے ہوئے سن، جے تیں نکیاں ہوندا کھیڈ دا ہونداسی۔ ویکھ کے اک دہشت آئی..... چابی نال چلن والی ریس گڈی اج اُلٹی ہوئی سی، جیویں پٹڑی توں اُتر گئی ہووے، تے اوس بھیانک حادثے نال اوہدے سارے مسافر زخمی ہو گئے ہون.....

پلاسٹک دی گڈی جو اک اکھوں کانی ہو گئی سی، ربڑ دا ہاتھی، جیہدی سنڈھ ادھ وچوں ٹٹ گئی سی، مٹی دا گھوڑا، جیہدیاں اگلیاں دوویں ٹنگاں جیویں وڈھیاں گئیاں ہون۔ تے کجھ کھڈونیاں دیاں لتاں باہواں کھلریاں ہویاں سن..... جیویں اوہناں دے دھڑ تے سر اُڈ کے کدھرے دور جا پئے ہون..... تے ہن اوہناں دی شناخت نہیں سی ہو سکدی۔

میرے پنڈے وچ اک کنبنی جیہی لہہ گئی۔ ویکھیا کہ ایہناں زخمی کھڈونیاں دے کول وارہی متی دے بنے ہوئے شوجی دا بت سی، جو دوہاں باہواں توں لنجا ہو گیا ہویا سی۔ تے خیال آیا..... جیویں رب وی اپاہج ہو کے بیٹھا ہویا ہے۔

جتھوں تک یاد آیا، جاپیا کہ میرا بچپن بڑا خوش سی۔ وڈے بھرا دے جنم تے میں ستاں ورھیاں دی وتھ تے جمیا ساں، ایس لئی میرے بڑے لاڈ ہوئے سن۔ اوددوں تک اُنج وی پاپا دی ترقی ہو گئی سی، ایس لئی میرے واسطے بہت سارے کپڑے تے بہت سارے کھڈونے خریدے جاندے سن..... پر ثابت چیتیاں لئی ایہناں ٹٹے ہوئے کھڈونیاں دی ماں نوں کیہ لوڑ سی، سمجھ نہیں آئی.....

صرف کھڈونے نہیں، میرے پاٹے ہوئے کپڑے وی تھبوان وچ لگے ہوئے سن، ٹٹے ہوئے بٹناں والے نکے نکے جھگے، بُنیاں تنیاں نکے نکے جھگے، تے پاٹیاں ہوئیاں جراباں وی.....

تے فیر مینوں اک رومال وچ بجھی ہوئی اوہ چابی لبھ پئی، جیہنوں لبھ رہیا ساں۔ الماری دا اندرلا خانہ کھولیا، تاکہ ہیرے والی مندری اوہدے وچ رکھ دیاں۔

ایہ اوہو گھڑی سی..... جدوں میں ویکھیا کہ اوس خانے وچ صرف تیز دے کپڑے پئے ہوئے سن.....

تے اچانک میرے ساہمنے اوہ لوک آ کھلوتے ہن، جیہناں دے سروی کجے ہوئے ہن، باہواں تے گل وی، پر جیہناں دے تیز کوئی کپڑا نہیں.....

پر لوڈ اویلا خورے ایہو جیہا ہی ہوندا ہووے گا، پتا نہیں۔ میرے ساہمنے میری ماں وی کھلوتی ہوئی

ہے، پاپا وی، بمبئی والا چاچا وی، تے اک کوئی مسز چوپڑا وی، تے اک کوئی مس نندا وی، جیہناں نوں میں جاندا نہیں۔

تے گواچدی جیہی صورت نال میں ویکھیا کہ اوہناں وچ کتے میں گھا جیہا ہو کے بیٹھا ہویا ہاں.....

پتا نہیں ایہ کیہڑا یگ ہے، شاید کوئی بہت ہی پرانی صدی، جدوں لوک رکھاں دے پتے کاغذاں ورگے کدوں ہو گئے، پتا نہیں.....

الماری دے خانے وچ صرف کاغذ پئے ہوئے ہن، بڑے ہی کاغذ، تے جیہناں اُتے ہر اک دے تن دی وتھیا لکھی ہوئی ہے، تن دے تاپ ورگی تن دے مڑھکے ورگی، تے تن دی ہواڑ ورگی.....

ایہ سارے خط بمبئی والے چاچا جی دے ہن، تے سارے خط میری ماں دے ناں ہن.....

طرح طرح دی گندھ میرے سرنوں چڑھدی پئی ہے.....

کسے خط وچوں خوشی تے اداسی دی رلی ہوئی گندھ اٹھدی ہے، لکھیا ہویا ہے، ''وینو! جیہڑا آدمی تے جیہڑی حوا خدا دے، بہشت وچوں کڈھے گئے سن، اوہ آدم میں ساں، تے حوا توں سی.....''

کسے خط وچوں وشواس دی گندھ اٹھدی ہے'' وینو! میں سمجھدا ہاں کہ پتنی دے طور تے توں اپنے پتی نوں انکار نہیں کر سکدی۔ پر تیرا جسم میری نظر وچ گنگا وانگ پوتر ہے، تے میں شو جی وانگ گنگا نوں جٹاں وچ دھارن کر سکدا ہاں.....''

کسے خط وچوں نراستا دی گندھ اٹھدی ہے۔'' میں کیہو جیہا رام ہاں، جو اپنی سیتا نوں راون کولوں نہیں چھڈا سکدا..... پتا نہیں رب نے ایس جنم وچ رام تے راون نوں سکے بھرا کیوں بنا دتا.....''

کسے خط وچوں دلجوئی دی گندھ اٹھدی ہے'' وینو! توں من وچ گناہ دا احساس نہ کریا کر۔ گناہ تاں اوہنے کیتا سی جیہنے مسز چودھری ورگی عورت لئی، تیرے جیہی بیوی نوں وسار دتا سی.....''

تے اچانک اک حیرانی دی گندھ میرے سرنوں چڑھی جس ویلے اک خط پڑھیا'' توں میرے نالوں خوش نصیب ایں وینو! توں اپنے پتر نوں پتر آکھ سکدی ایں، پر میں اپنے پتر نوں کدے وی اپنا پتر نہیں آکھ سکاں گا۔'' تے حیرانی دی گندھ نال میرے سر وچ جیویں اک تریڑ پے گئی، جس ویلے اک دوسرے

خط وچ میں اپناناں پڑھیا۔لکھیا ہویا سی ''میری ناج وینو! ہن توں اُداس نہ ہویا کر، میں نکے جیہے اکٹھے دی صورت وچ ہر ویلے تیرے کول رہندا ہاں، دنے تیری جھولی وچ کھیڈا ہاں تے راتیں تیرے نال سوندا ہاں.....''

سو میں ..... میں .....

زندگی دے انھی ورھے میں جیہنوں پاپا آکھدا رہیا ساں، اچانک اوس آدمی دے ساہمنے ایہ لفظ میرے ہوٹھاں اتے جھوٹھا پے گیا ہے.....

اگلے خط میں پوری صورت وچ نہیں پڑھے۔ پر اینا کو جانیاں ہے کہ جنم توں لے کے میں جو وی کپڑا انگ لایا ہے، اوہ ماں نے کدے وی اپنے خاوند دی کمائی وچوں نہیں سی خریدیا۔ منی دا کھڈونا تک وی نہیں۔ میرے سکول دیاں تے کالج دیاں فیساں وی اوہ گھر دے خرچ وچوں نہیں سی دیندی.....

ایہ وی جانیا ہے کہ بمبئی وچ اکلے رہندے آدمی کولوں کجھ ایہو جیہیاں گلاں وی ہوئیاں سن، جیہناں لئی اک خط وچ ماں کولوں معافیاں منگیاں ہویاں ہن، تے اوس سلسلے وچ کئی واری کے مس نندا داناں لکھیا ہویا ہے، جو خط لکھن والے دیاں نظراں وچ اک آوارہ کڑی سی، تے جیہنے میڈکا وانگ اک رکھی دی تپسیا توڑ دتی سی..... تے کئی خطاں وچ ماں نوں جھڑکیاں جیہیاں دتیاں ہوئیاں ہن کہ ایہ صرف اوہدے من دے وہم ہن جیہناں کر کے اوہ بیمار رہن لگ پئی ہے.....

ایہ ماں، پاپا، چاچا، مسز چوپڑا، ایس اندرا..... کوئی وی خانہ بدوشاں دے قافلے وچوں نہیں، پر اوہناں دی روایت خورے ساری آدم ذات اُتے لاگو ہوندی ہے، سبھناں دیاں گھبرائیاں، تے سبھناں دیاں تہماں اتے جیتھے اوہناں دے بینگھ اتے لکھیا ہویا ناواں، رب دی اکھ توں سوائے کسے نوں نہیں ویکھنا چاہندا۔ تے پتا نہیں لگدا کہ اج میری اکھ نوں رب دی اکھ والا سراپ کیوں لگ گیا ہے.....

صرف ایہ جاندا ہاں کہ رب دی اکھ رب دے منہ اتے ہوئے، تاں ور ہوندا ہے پر اوہ انسان دے منہ اتے لگ جائے تاں سراپ ہو جاندی ہے.....

(لپی انتر: ڈاکٹر شائستہ نزہت)

☆☆☆☆

امرتا پریتم

اک شہر دی موت

اپنی گل کرن توں پہلاں پام پیئی دی گل کراں گا۔

پام پیئی نیپلز دے نیڑے اٹلی دا اک پراچین شہر ہونداسی...... ایس توں وی پہلاں...... ایہ سمندری کنڈھے دا شہر اٹھویں بی سی وچ یونان دے سمندری جہازاں دی بندرگاہ ہونداسی، 310 بی سی وچ اک رومن جہاز ایتھے آیا سی، پر پام پیئی نے اوہنوں کنڈھے توں پرتا دتا سی۔ پر آخر ایہ شہر جت لیا گیا سی، ایہ 80 بی سی وچ رومن کالونی بن گیا سی۔

فیر ایہنے رومن زبان، رومن قانون، تے رومن اتہاسکاری اپنالئی۔ کاروباری تھاں دے نال ایہ آرام گاہ وی ہوندی سی۔ ایہدی وسوں دیہہ جاں ہزار ہوندی سی۔

فروری 63 وچ ایتھے اک بھیانک بھچال آیا۔ بہت کجھ ڈھیہ ڈھیری ہو گیا پر ایہدی اُساری مُڑ ارنبھی گئی۔

اُساری چل رہی سی کہ 24 اگست 79 نوں ایتھے لاوا بھٹ پیا، تے سارا شہر اگ دی تتی سواہ ہیٹھاں کجیا گیا۔

ایہ تتی سواہ مینہ وانگ وسی سی...... دھرتی توں چھ فٹ اچی ایہدی تہہ بجھ گئی سی۔ تے ایہدے کول جتھے بیٹھے جاں کھلوتے سن، اُنج دے اُنج اوس تتی سواہ وچ دبے گئے سن۔

تے انج سارا شہر ایس سواہ دی تے قدرتی دھوڑاں دی 12 فٹ اچی تہہ ہیٹھاں کجیا گیا۔ تے کئی صدیاں کجیاں رہیا۔

سولھویں صدی وچ...... اک نہر کڈھدیاں...... کجھ عمارتاں دے نشان لبھے۔ تے نیپلز دے بادشاہ نے مارچ 1748 وچ باقاعدہ کھدائی شروع کروائی، تے 1763 وچ شلیاں دی لکھائی توں پتا لگا کہ

اوہ پام پیئی دے کھنڈر ہن۔

پہلی لبھت ایہد ے بت سن۔ فیر 1860 وچ ایہد ے اندر موئے لوکاں دے نشان لبھے۔ سواہ وچلے ڈونگھے جتھے وی سن، او تھے پلاسٹر آف پیرس پا کے ٹھیک اوہی روپ ریکھا لبھی ...... جیویں لوک کھلوتے، بیٹھے یاں دوڑدے اوس سواہ وچ ڈگ گئے سن۔

تے ایسے طرح لبھیا ..... کہ اوس شہر دے گھر کیہو جیہے ہوندے سن، پیڑھیاں، پلنگھ، تے پلنگھیریاں کیہو جیہیاں ہوندیاں سن۔ ہاؤس آف سلور ویڈنگ، ہاؤس آف گولڈن کیوپڈ..... تے کہندے ہن ...... سوتری کاری، بت کاری، تے اتہاسکاری وچ ایہ بڑا امیر شہر ہوندا سی......

میں وی ہوندی ساں ...... پام پیئی وانگ......

پورے پندھراں ورھے میں اپنے چپ وچ تے لندن دی دھند وچ لپٹی رہی۔ روز سویرے اٹھ کے مس سنگھ داناں پہن لیندی ساں تے انگلینڈ دے اک سکول وچ نوکری تے چلی جاندی ساں۔ پر ایہناں چھٹیاں وچ میں روم گئی ساں، میں روم دے گرجے ویکھے، اوتھے کئی عورتاں موم بتیاں بال رہیاں سن، پر مینوں کوئی موم بتی بالن دا خیال نہیں سی آیا۔ روم دا اوہ چشمہ وی ویکھیا...... جیہدے وچ اک سکہ پا کے لوک مراداں منگدے ہن، پر میں بوجھے وچ ہتھ پا کے کوئی سکہ نہیں سی کڈھیا۔ فیر روم توں فلورینس گئی ساں، اوتھے مائیکل اینجلو دے چوک وچ لوک کبوتراں نوں چوگا چوگاندے پئے سن، تے اوہناں نوں تلیاں اتے بٹھا کے تصویراں لواہندے پئے سن...... مینوں اپنی تصویر لہوان دا کوئی خیال نہیں سی آیا۔ فیر اک دن روم توں نیپلز گئی ساں، تے اوتھوں آؤندی واری راہ وچ پام پیئی ویکھیا سی۔ پر پام پیئی دے کھنڈراں وچوں گھم کے...... جدوں باہر لے لوہے دے بوہے کول آئی، تاں لوہے دے بوہے نے میرا ہتھ پھڑ لیا سی۔ انج تاں کدی کسے مرد نے وی میرا ہتھ نہیں سی پھڑیا، میں کنب گئی۔

تے لوہے دا بوہا...... پچھلے پاسے ...... اوہناں کھنڈراں ول تکن لگ پیا...... کتھے کئی تھم تے کئیاں کندھاں دے ٹوٹے کھلوتے ہوئے سن۔

تے اوہدے آکھے میں وی اوہناں نوں تکن لگ پئی۔

کدھرے کوئی وی اوہلا نہیں سی۔ کدے ہوندا ہووے گا...... کجھ پھیریوں بند کمرے ہوندے ہون گے...... تے فیر اوہناں دے وی اندر کجھ کوٹھڑیاں۔ پر ہن سبھ کجھ چوپٹ کھلا ہویا سی۔ سارے بھیت

بھنجے پئے ہوئے سن۔ تے پتا نہیں سی لگدا کہ کیہڑا راہ کتھوں نکلدا اسی، تے کتھے جاندا اسی۔ راہ راہواں دے گل لگے ہوئے سن......

اک لوہے دے ہتھ نے میرا ہتھ پھڑیا ہویا سی...... میرا ہتھ سن جیہا ہون لگ پیا...... پہلوں میرا سجا ہتھ سن ہویا، فیر بجی بانہہ، سجا موڈھا۔ فیر کھبا ہتھ، کھبی بانہہ تے کھبا موڈھا۔

میں لوہے دے بوہے کولوں پرانہہ ہون لئی اک زور لایا...... پر ہن میرے پیر وی سن ہو گئے سن...... لتاں وی۔ جاپیا...... میں وی پام پئی شہر دیاں ویہ ہزار لاشاں وانگ اک لاش ساں......

اوتھوں چھیتی نال باہر نکلن لئی سجا پیر اگانہہ کیتا ہویا، تے کھبے نوں اگانہہ کرن لئی اوہدی اڈی ذرا کو چکی ہوئی......

تے فیر اوتھوں دی اک تتی سواہ وچ ہمیشہ لئی لاش بن کے کھلوتی ہوئی......

میں کیہڑے بوہے وچوں نکلی ہاں، تے کیہڑے راہ اُتے جاناں سی...... کجھ پتا نہیں۔ ہن تاں سارے گھر ڈھیہ گئے ہوئے سن، تے سارے راہ رو رو کے اک دوجے دے گل نال لگے ہوئے سن......

فیر پتا نہیں کناچر میریاں اکھاں جاگدیاں تے بجھدیاں رہیاں...... تے فیر میری چھاتی وچ کجھ ہسن لگ پیا...... کہ ایس پام پئی شہر وانگ میں کدے ہوندی ساں......

پچھلے پندھراں ورھے میں اپنی چپ وچ تے لندن دی دھند وچ لکی رہی ساں۔ پتا نہیں ایہ چپ تے ایہ دھند کنے فٹ اُچی سی...... چھ فٹ ضرور ہووے گی...... میرے کد نالوں دے گٹھاں اُچی...... کہ میں ساری دی ساری اوہدے ہیٹھاں آ گئی ساں......

تے میں وی ایس میں نوں کدے نہیں سی ویکھیا......

ہن ویکھ رہی ہاں...... میری چھاتی وچ اک شہر ہوندا اسی، جیویں ہر جوان ہوندی کڑی دی چھاتی وچ اک شہر ہوندا ہے......

تے میرے شہر وچ اک ساریاں توں موکلے ویڑھے والا گھر ہوندا سی...... میرے ماں پیو دا گھر...... تے جتھے اک سنگھنی چھاں والا پپل ہوندا اسی...... اک لمی گلی ہوندی سی...... میریاں اگ سہیلیاں دی...... تے گلی دے متھے اگے اک بوڑھ ہوندا اسی جیہڑے تھکے ہوئے راہیاں نوں سکھ دا ساہ دیندا ہوندا اسی......

تے اوتھے، میری گلی دے موڑ توں، دور اک اُچی اٹاری دسدی ہوندی سی، جتھے رات نوں نکیاں

ہی بتیاں تاریاں وانگ جگدیاں سن تے روز سویرے جیہدی کندھ وچوں سورج چڑھدا سی۔ تے میں وی، جیویں ہر جوان کڑی، اپنے شہر دی اُچی اٹاری نوں ویکھدی ہے...... ایس اٹاری نوں مڑ مڑ کے ویکھدی ہوندی ساں......

اک میرا انکا جیہا شہر، فیر وڈا ہو گیا سی۔ میں کالج وچ پڑھدی ساں، تے کالج دے ناٹکاں وچ کھیڈدی ساں۔ جے ہزاراں نہیں، تاں سینکڑے اوہ پاتر میرے شہر وچ وس گئے سن، جیہناں نوں کہانیاں وچوں کڈھ کے میں منچ اُتے لیائی ساں۔

میرا کڈا اوڈا شہر ہوندا سی...... میرا دل سمندر وانگ وگدا ہوندا سی۔ تے جدوں دوجے دیشاں دیاں کتاباں پڑھدی ساں، اوہناں دے پاتر بیڑیاں وچ بہہ کے میری بندرگاہ تے آجاندے سن۔

تے فیر اکدن لاوا پھٹیا سی، کالی بدلی سواہ مینہ وانگ وسدی رہی سی، تے سارا شہر اوس سواہ بیٹھاں دبیا گیا سی...... میں...... اج توں پندھراں ورھے پہلاں...... جدوں اوس شہر وچوں دوڑن لئی سجا پیر اگانہ دھریا سی، تے کھبے پیر نوں اگانہ کرن لئی اوہدی اڈی ذرا کو چکی سی...... تاں اوتھے دی اوتھے اوس بلدی سواہ وچ ہمیشہ لئی اک لاش بن گئی ساں......

پام پئی شہر دا، تے میرے شہر دا اتہاس اکو جیہا ہے۔ شاید ایسے لئی میں پام پئی دے کھنڈراں وچ تر دی پتا نہیں کیہڑے ویلے اپنے شہر دے کھنڈراں وچ پہنچ گئی......

صرف اک فرق ہے...... پام پئی دے کسے بندے نوں اپنی نعش ویکھنی نصیب نہیں سی ہوئی، تے میں آپ اپنی لاش نوں ویکھ رہی ہاں......

باقی سبھ کجھ اوسے طرح ہے۔ ایہ وی کہ جیویں پام پئی دے کسے آدمی نوں کفن نصیب نہیں سی ہویا، میرے شہر دے وی کسے آدمی نوں کفن نصیب نہیں سی ہویا۔ ساریاں لاشاں دے منہ ننگے ہن، پچھان سکدی ہاں......

تے اوس پچھان وچوں ساریاں دے نین نقش چیتے کر سکدی ہاں۔

ایہ میری لاش...... چھک جیسے پنڈا تے اک بڑا الشکدا منہ ہوندا سی۔ سدھے چیک نال ڈھالویں وال واہے ہوندے سن۔ نک چٹے ریشم دی سلوار، تے گل وچ اکثر ہرے رنگ دی قمیض تے ہرے رنگ دی چنی ہوندی سی۔ کناں وچ پتلی تار دیاں والیاں۔ منہ بھولا دی ہوندا سی، پر اوہدے اتے تانبے رنگی ضد دی

ہوندی سی، جیہدے نال اوہ کدے بڑا گولا دسدا سی، کدے بڑا پیڈھا۔

چھنیچھر وار تے ایتوار سکول بند ہوندا ہے۔ کدی کدی ایہ دو دن اکلی نوں محال ہو جاندے سن۔ ایسے لئی چھٹیاں وچ روم گئی سان، نہیں تاں اکٹھے پندھراں دن گھر دے کمرے وچ رہندی، تاں چونہ کندھاں وچ میں بجھویں کندھ بن جاندی۔ پر روم توں آکے میں جیویں لندن دے اپنے کمرے وچ نہیں، کھنڈراں وچ تر دی پئی ہاں......

کھنڈراں وچ میں اکلی نہیں، ہور کنیاں ای لاشاں سن......

اج چھنیچھر، کل ایت، سوچیا سی جو دن ایہناں کھنڈراں وچ رہواں گی، تے اک اک لاش نوں پچھاناں گی، پر راگی جارج دا فون آ گیا، اوہنے اک فلم دیاں دو ٹکٹاں لئیاں ہوئیاں سن، اک اپنے لئی اک میرے لئی۔ تے میرے کولوں نانہ نہیں کیتی گئی۔ ترکالاں ویلے اوہدے نال فلم ویکھن لئی چلی گئی۔ ڈی کیمرن مشہور اطالوی فلم سی۔ ایہدے وچ اک جوان ہوندی کڑی نوں اک لڑکا چنگا لگدا ہے، تے اوہ کڑی نوں صلاح دیندا ہے کہ اج رات اوہ کمرے وچ سون دی تھاں اپنے گھر دی چھت اُتے سوں جاوے۔ تے اوہ ادھی راتیں گھر دے پچھواڑے ولوں چھت تے آ جاوے گا۔ کڑی اپنی ماں نوں ترکالاں ویلے آکھدی ہے کہ اج رات اوہ چھت اُتے بستر او چھائے گی، تے بلبل دا گیت سنے گی۔ ماں وی من جاندی ہے، باپ وی۔ تے او کڑی اوس رات چھت اُتے جا کے سیں جاندی ہے۔ سویرے سار کڑی دا باپ جدوں جاگدا ہے۔ سوچدا ہے...... چھت تے جا کے کڑی نوں ویکھاں، متے اوہنوں ٹھنڈ لگ گئی ہووے۔ تے اوہ جدوں چھت تے جاندا ہے...... اگے اوہدی دھی کول اک لڑکا سُتا پیا ہوندا ہے۔ دوہناں دے گل کوئی کپڑا نہیں ہوندا۔ اوہ گھبرا کے واپس جاندا ہے، تے اپنی دھی دی ماں نوں جگاندا ہے۔ تے آکھدا ہے تیری دھی اج کوٹھے تے سُتی سی اوہنے بلبل دا گیت سننا ہے، جا کے ویکھ۔ اوہنے بلبل پھڑ لئی ہے۔

جارج میرے نال دی کرسی تے بیٹھا ہویا سی، فلم ویکھدیاں اوہنے میرا ہتھ اپنیاں لتاں اُتے رکھ لیا، تے کہن لگا...... ایہہ بلبل تیری اے، لے لے۔ تے فلم توں بعد اوہ میرے گھر چھڈن لئی آیا، رات میرے کول رہ پیا۔ تے رات دی فلم دی اوس کڑی وانگ میں بلبل پھڑی سی......

ایس طرح دی رات میں جارج نال پہلی وار گزاری ہے، پر اُنج پہلی وار نہیں۔ ایہو جہیاں راتاں گزار لیندی ہاں...... کسے نال دی...... پہلی وار...... بہت گھبرا کے ایہو جیہی رات گزاری سی۔ اک

دن میرے پنڈے دالُوں لُوں ایس طرح بل اُٹھیا سی ...... جیویں میرے پنڈے دا اکو انگ میرے انگ انگ وچ سما گیا ہووے ...... تے میرے اک اک لُوں دا منہ رحم وانگ کھل گیا ہووے ......

اوس دن اک عجیب سبب بنیا سی۔ نہیں تاں میرے سنسکار میرے دوالے انج کسے ہوئے سن کہ میں تتے پانی دی تھاں راتیں ٹھنڈے پانی نل نہا کے پنڈے نوں برف بنا لیندی، تے رضائی وچ گھوک سو جاندی۔ پر اوس دن میں ...... اپنی اک دوست عورت نوں ملن چلی گئی۔ ایہ میری انگریز دوست کلیئر وڈی عمر دی عورت ہے۔ اوس دن اوہنے مینوں اک چیز وکھائی ...... اک مرداواں انگ، جو اوسے ہفتے اوہ بازاروں خرید کے لیائی سی۔ اوہدے وچ بیٹری دے دو سیل پئے ہوئے سن تے اوہنے دسیا کہ اوہ بیٹری دے زور چلدا ہے ...... تے اوہدے لفظ اوس دن اوہدے اُتے ترس کھاندے پئے سن " کیہ کراں ہُن ایس عمر وچ کوئی مرد نیڑے نہیں آوندا۔ طلاق لیاں ست ورھے ہو گئے نیں، پہلوں تاں کدی دو چار دناں لئی کوئی جُڑ جاندا سی، پر جیوں جیوں عمر پھیلدی پئی اے ...... " تے مینوں جاپیا جے میں اپنی جوانی اپنے سنسکاراں نوں دے دتی، تاں آوندی عمرے مینوں وی اک دن کلیئر وانگ ایسے طرح بازار جانا پوے گا، تے بیٹری والا ایہ ربڑ دا ٹکڑا میری قسمت بن جائے گا ......

تے اوس شام میں اپنے اک تھوڑے جیہے واقف آدمی نوں فون کر کے روٹی کھان لئی بلایا سی۔ اپنے مرن دن نوں اپنا جنم دن دسیا سی۔ فیر کاہلی نال روٹی پکائی سی، اوہدے لئی 'ہیگ' خرید کے آندی سی، کمرے نوں تازہ پھُلاں نال سجایا۔ اکلی عورت کول اکلے مرد نے مساں گھنٹا کو کتاباں تے فلماں دیاں گلاں کیتیاں سن فیر اوہنے تانگھ کے میرا ہتھ پھڑ لیا سی۔ میرا ہتھ نستا جیہا وی ہو گیا سی، پر دیا گل جیہا وی۔ تے میرے ہتھ وانگ میرا انگ انگ ......

اوس دن وانگ اج وی پچھتاوا نہیں۔ صرف راتیں ...... جدوں جارج میرے کول ستا پیا سی ...... دل وچ آیا سی کہ اج ایہنوں اپنے نال اپنے موئے ہوئے شہر وچ لے جاواں۔ جس طرح لوک پام پیئی دے کھنڈراں نوں ویکھن جاندے ہن، میں جارج نوں نال لے جاواں تے اوہنوں اپنے شہر دے کھنڈر وکھاواں۔

فیر پتا نہیں کیوں ...... جارج نوں کجھ نہیں دسیا۔ سویرے اٹھ کے اوہ چاہ دا پیالا پی کے چلا گیا ہے، تے میں اکلی اپنے شہر دے کھنڈراں وچ مڑ آئی ہاں ...... ایہ میری لاش ......

تے اوہو اُچیاں ہوندیاں کندھاں اوس اٹاری دیاں ہن، جیہدے وچ ویرندر رہندا سی...... ایہ کندھ دے کول اوہدی لاش ہے، اوہدے سارے نقش میرے چیتے وچ اگھڑ آئے ہن...... چوڑے موڈھیاں اتے تنیا ہویا سر، منہ دا رنگ کنکی، پر اکھاں بڑیاں کالیاں ڈونگھیاں، تے تراشیاں ہوئیاں۔ اوہ اکھاں نال میری جند دھروہ لیندا ہوندا سی......

اوہدی ایس اٹاری وچ میں کئی وار راتیں سپنیاں وچ گئی ساں، تے اپنے مہندی والے ہتھاں نال اوہدی منجی اُتے وہدا وچھونا کیتا سی...... اوہدے قولاں تے قراراں نال بھری ہوئی میں، اوہنوں اوہدی گل دے موڑ اُتے مل کے جدوں اپنے پیو دے کھلے ویڑھے والے گھر آوندی ہوندی ساں...... تاں گھر دیاں کندھاں میرے پنڈے نوں نپیڑ لیندیاں ہوندیاں سن۔ میرے پیو دی گھوری نال...... پپل دے پتے جھڑ جاندے سن، تے میں دھپے لوہی جاندی ساں......

تے اک دن...... میرا کنج کوارا پنڈا اچھلیا گیا۔ گھر آئی نوں ماں نے انگاریاں ورگیاں اکھاں نال ویکھیا، تے چلھے وچوں اک لکڑ کھچ کے آکھیا...... ''تینوں اوہدی ایڈی اگ لگی ہوئی اے تاں ایہ چواتی اپنے اندر پا لے...... '' سپنیاں کولوں میں تے سہیلیاں کولوں مرداں دیاں گلاں سنیاں ہویاں سن، مہکاں ورگیاں گلاں، پر ماں دی گل سن کے انج جاپیا جویں اک بلدی بلدی لکڑ میریاں لتاں وچ کھب گئی ہووے......

میں کنے دن اپنے کمرے وچ ڈکی روندی رہی۔ تے اک دن ماں نے کوئی سادھ پھڑ کے لے آندا، تے اوہدا دتا ہویا تویت گھول کے مینوں زوری پیا دتا۔ ساری رات میں چوری اُلٹیاں کردی رہی، پر سویر سار جدوں اوہ میری کڑمائی دا چھوہارا مینوں کھوان لگی...... پتا لگا کسے دوہاجو نال اوہ میرا ویاہ کرن لگی سی۔ ویرندر ساڈے مذہب دا نہیں سی، تے ایہ دوہاجو ساڈے مذہب دا سی۔ میں چھوہارے نوں منہ وچوں تھک دتا...... تے ماں دے ہتھوں بانہہ چھڈا کے ویرندر دے گھر ول دوڑ پئی......

تے اچانک دھرتی وچوں لاوا نکل پیا...... چارے پاسے کالی تے بلدی سواہ اڈن لگ پئی...... سنیا ویرندر نے پچھلے ہفتے کسے کڑی نال ویاہ کرلیا سی...... تے اوسے بلدے شہر وچوں نکلن لئی میں سجا پیر اگانہہ چکیا ہویا سی، تے کھبا پیر اگانہہ دھرن لئی اڈی چکی ہوئی سی...... کہ میں انج دی انج اوس تتی سواہ وچ اک لاش بن گئی......

تے ایہہ میرے شہر دے کھنڈراں وچ میری لاش......

(لپی انتر: ڈاکٹر شائستہ نزہت)

☆☆☆☆

امرتا پریتم

نہ جانے کون رنگ رے

سماں ہمیشہ اگانہ نہیں تردا، کئی وار پچھانہ وی تر پیندا ہے۔ انج جیویں تردے تردے ہتھوں کوئی چیز ڈگ پئی ہووے، بڑی دور جاکے اس نوں اوس چیز دا چیتا آیا ہووے، تے فیر اوس نوں لبھن لئی اوہ پچھانہ تر پیا ہووے۔

میری ماں دے نک وچ پیا ہویا موتی سمے دے ہتھوں ڈگ پیا۔ دیہ ورھے لنگھ گئے۔ دیہاں ورھیاں پچھوں سمے نوں اچانک اوہدا چیتا آیا، ٹھہمبر کے کھلو گیا، تے فیر اوس موتی نوں لبھن لئی پچھانہ تر پیا۔

دیہ ورھے پچھانہ ترے ہوئے سمے دی مدد نال میں اج اپنی ماں دے نک وچ پیا ہویا سچا موتی ویکھ سکدی ہاں۔ میں اپنی ماں نوں اپنیاں اکھاں نال کدی نہیں ویکھیا، کیونکہ میں اجے پورے چالھیاں دناں دی نہیں ساں، جدوں میری ماں مر گئی، پر اج دیہ ورھے پچھانہ تر کے آئی سمے دیاں اکھاں نال ویکھ سکدی ہاں کہ......گوانڈھیاں دے گھر کاج رچیا ہویا ہے۔ ویاہ والی کڑی دیاں سہیلیاں اج منڈھے دے دن، گیت گون واسطے آئیاں ہویاں ہن۔ ساڈے یو پی دے لوکاں وچ ایہ منڈھے دا دن بڑا رونقیلا ہوندا ہے۔ ویاہ دے منڈپ دوالے کڑیاں گھیرا پاکے نچدیاں ہن۔ تے ایہناں نچدیاں کڑیاں وچ جیہڑی کڑی سبھ توں کٹیلی ہے اوس نے اپنے نک وچ سچا موتی پایا ہویا ہے۔ تکھے تے سولے نک اُتے موتی بری چھب نال بیٹھا ہویا ہے۔ گھنگھرو واں والے وال جدوں ناچ دی پھیر لیندے لک نال بلاراں کھا کے متھے اُتے ڈگ پیندے ہن تاں کوئی گھنگھرو بہتا ہی اُلر کے نک دے موتی نوں ہتھ لا جاندا ہے۔ تے ہوٹھاں وچ جدوں گیت کنبدا ہے تاں اوہدی ڈول نال نک دا موتی جھل مل کرن لگ پیندا ہے۔ موتی دا رنگ دسدا ہے، پر گیت دا رنگ نہیں دسدا، نہ گون والی دے من دا رنگ دسدا ہے، تے ایسے رنگ دے نہ دسن توں پریشان ہو کے اوہ کڑی آکھ رہی

ہے:

کلسا توں بڑا مندر نہ جانے کون رنگ رے......

تے ایس سطر نوں کوئی ویہ واری دہرا کے اوہ اگوں آکھدی ہے:

نہ جانے کمرھا کے گڑھے نا جانے ماٹی رنگ رے......

دلہن تو بڑی سندر نہ جانے کون رنگ رے......

نہ جانے مَیا کی لکھیا نہ جانے بابا رنگ رے......

روپ دیاں کرتا رُسن ہو ہم آپار رنگ رے......

تے نہ دسن والے رنگ دی پریشانی نوں اوہ رب اُتے تے رب دی قدرت اتے سٹ کے اپنا من ہولا کر لیندا اے۔ پر من خورے انج ہولے نہیں ہوندے، من طوطے دا روپ دھار لیندا اے تے اوس دیس نوں اڈن لئی کاہلا پے جاندا اے جیہڑا دیس امروداں دا دیس ہووے۔ دن توں پکے امروداں نوں ٹکدا اوہ ویلا گزار لیندا اے، پر رات نوں فیر چین نہیں کردا۔ ادھی رات نوں کسی ہوئی چولی دے بندھن کترن لگ پیندا ہے۔ ایہو پریشانی گیت بن جاندا اے:

چل کے سگنا امرودا کے دیساں میں

دن میں تو کٹ کے سگنا پکے امرودا

آدھی رتین کنکے چولی چولی کیر بندھنوا

ہائے رے سگنا............

تے فیر پتا نہیں گا گا کے تے نچ نچ کے تھکی ہوئی اوہ کڑی ہف کے کھلو جاندی ہے، کہ طوطے دی لال چنجھ توں ڈردی اوہ طوطے والا گیت گونا چھڈ دیندی ہے، کہ بنے اُتے کھلو کے ویکھدے لوکاں دیاں نظراں توں شرما جاندی ہے...... فیر ترکالاں ویلے جنج آوندی ہے، اوہ کڑی ہور کڑیاں نال رل کے جنج ویکھن چلی جاندی ہے۔ جانجیاں وچ لاڑھے دے کجھ دوست ایہو جہے وی ہن جیہڑے کسے وڈے شہروں آئے جاپدے ہن۔ اوہناں دی چال ڈھال سبھناں جانجیاں نالوں نیاری ہے۔ تے اوہناں نیارے جانجیاں وچوں اک جنا، اک ٹک اوس کڑی دے منہ ول تکدا رہندا ہے، جیہنے نک وچ سچا موتی پایا ہویا ہے۔ کڑی نوں جاپدا ہے کہ دو پہراں ویلے ایہ بنے اُتے وی کھلوتا ہویا سی، خورے دوہاں گھراں نال ایہدا کوئی

دوہرا ساک ہے، ہن جنج وچ وی آیا ہویا ہے۔ کڑی شرم نال دوہری ہوندی جاندی ہے، تے اوس دا موتی اوس دے نک وچ سنگھڑ دا جاندا ہے...... فیر جنج روٹی کھاندی ہے۔ بہت سارے جانجی گھر نوں پرت جاندے ہن، پر ویاہ والا منڈا، اوہدے ڈاڈھے نیڑے دے سمبندھی تے اوہدے نیارے دوستاں وچوں اک دوست، اوتھے ہی رہ جاندے ہن...... ویدی دے دوالے ہن داویلا ہو جاندا ہے۔ سمگری دا دھواں جیوں جیوں اُچا ہوندا ہے، کڑیاں دا گیت اُچا ہو جاندا ہے: ''پہلی بھنور بیٹی اب ہوں ہماری...... بابل کی بیٹی، دوجی بھنور بیٹی ابو ہوں ہماری...... مئیا کی بیٹی......'' تیجی بھنور بیٹی مامے دی، چوتھی بھنور بیٹی تائے دی، پنجویں بھنور بیٹی چاچے دی، چھیویں بھنور بیٹی اپنے بھراواں دی...... ماں دے جائیاں دی، پر ستویں بھنور بیٹی پرائے ہو جاندی ہے...... گون والیاں کڑیاں وچوں سبھ توں چھبیلی نہار اوسے کڑی دی ہے، جیہڑی نک وچ پیا ہویا موتی کنبدا ہے۔ ویاہ والے منڈے دا دوست اکھاں نہیں جھمکدا، اوہنوں تکدا رہندا ہے۔ سارا گیت گاؤندی اوہ کڑی اوس نوں اپنی ہوگئی لگدی ہے۔ سویرے سورج چڑھے اوہ کڑی دے ماپیاں نوں سنیہا بھجواندا ہے تے اوس کڑی نوں منگ لیندا ہے۔ ماپے اوس دا اتا پتا پچھدے ہن تے فیر اپنی تسلی کر کے اوہ اوس کڑی دا ساک دے دیندے ہن...... اوہ کڑی کلاوتی، کہندے ہن کہ میری ماں سی۔

اگلی گل میں اپنی نانی دے موںہوں اک وار سنی ہوئی سی کہ میری ماں اپنے ویاہ وچ وی گیت گاؤندی رہی، ہور کوئی گیت نہیں صرف اک سطر...... نہ جانے کون رنگ رے! ایہ سطر اوہ ڈھولکی نال رل کے نہیں سی گاؤندی، اکلی شیشے دے ساہمنے کھلو کے گاؤندی سی۔ ناچ دا ہتھ مار کے نہیں سی گاؤندی، ہتھ نال اکھاں دا اتھرو چھنک کے گاؤندی سی۔ تے ایس گیت دی ولک نال اوہدے نک دا موتی بل بل جاگدا نہیں سی، بل بل بجھدا سی۔

میری نانی نے مینوں دسیا سی کہ ویاہ دے پہلے پھیرے میری ماں دا روپ جھروٹیا گیا سی۔ دوجے پھیرے گئی تاں مینوں پیٹ وچ پا کے پرت آئی۔ پیٹ وچ مینوں پالیائی تے ہڈاں وچ تاپ پالیائی۔ بس فیر اوہ کتے نہیں گئی۔ مینوں جنم توں بعد اوس نے پورا چلیہا نہیں کٹیا۔ منجی اُتے اک واری اوہ اوس دن لاہی سی جدوں میں جمی ساں، فیر چلیہے توں اندر دوجی وار اوہ اوس دن لاہ لئی جدوں اوہدے ساہ مُکدے پئے سن۔

میں جدوں پلھر پئی ساں، نانی نوں ماں سدن لگ پئی ساں۔ پنجاں ورھیاں پچھوں مینوں پتا لگا سی کہ ماں ہور ہوندی ہے تے نانی ہور۔ اودوں مینوں نانی نے دسیا کہ میرا باپ اک واری میری ماں دے مرن

تے آیا سی، فیر کدی نہیں آیا۔ اوہنے کتوں میری ہور ماں لے آندی ہے، پر ہور ماں اپنی ماں نہیں ہوندی، ایس لئی اوہنے مینوں کدی اپنے کول نہیں بلایا۔

تے سولھاں ورھیاں پچھوں نانی نے مینوں اک بڑی بھیت والی گل دسی۔ میں اودوں کالج وچ پڑھن لگ پئی ساں۔ ساڈے قصبے وچ ہن کالج کھل گیا ہویا سی۔ اک دن میرے کالج دا اک جماعتی مینوں ملن لئی آیا۔ اوہ میرے کمرے وچ بیٹھا ہویا سی کہ باہروں میرے نانا جی آ گئے۔ میری نانی نے مینوں آکھیا کہ میرے نانا جی ایہ پسند نہیں کرن گے کہ میرے کالج دا کوئی لڑکا مینوں ملن لئی آوے۔ ایس لئی میں اوہدے نال کجھ گلاں کر کے اوہنوں چھیتی نال تور دتا۔ میرے نانا جی اگلے ویہڑے وچ بیٹھے ہوئے سن، ایس لئی میں اپنے جماعتی نوں اگلے بوہے وچوں نہیں پچھلے بوہے وچوں بھیج دتا۔ اوس رات میری نانی نے میرے کول بہہ کے مینوں دسیا کہ میری ماں نوں ایہ یوسف ناں دا لڑکا بڑا چنگا لگدا سی۔ تے میری نانی نے سوچاں وچ اک غوطہ کھا کے مینوں دسیا۔ رب نے اوہنوں شکل وی یوسف دی دتی سی تے حلیمی وی۔ پر نہ ذات ملے نہ دھرم، میں کیہڑے بوہیوں اوہنوں گھر واڑ دی۔ اک واری میں پچھلے بوہیوں آوندا ویکھیا تاں میں دھی نوں اندر بہہ کے سمجھا دتا۔ تیویں دا پاپ پھل ورگا ہوندا اے، پانی وچ ڈبدا نہیں تر کے منہ بولدا اے۔ مرداں دا کیہ اے، اوہناں دے پاپ تاں پتھراں وانگ پانی وچ ڈب جاندے نیں، کسے نوں دوجے کن پتا وی نہیں لگدا......

میں دھی نوں بنھ کے ویاہ دتا۔ پر ورھے وچ مک گئی شوہدی۔ جیہڑا سہرے بنھ کے اگلے بوہیوں گھر آیا سی، موئی دی لاش ویکھن لئی بس اک واری فیر آیا تے چلا گیا...... موئی دا منہ ویکھن لئی اک واری اوہ وی آیا تا...... پچھلا بوہا کھڑکا یو سو، میں کیہ کردی، ذات نہیں سی ملدی، دھرم نہیں سی ملدا، پر کیہڑے جگرے نال ہٹک دیندی۔ اندر آ کے موئی دا منہ ویکھ گیا تے فیر اوہنیں پیریں اوسے بوہیوں پرت گیا۔ میری دھی دی قسمت! جیہڑا اگلے بوہیوں آیا سی، اوہ وی تر گیا تے جیہڑا پچھلے بوہیوں آیا سی اوہ وی تر گیا......''

تے مینوں اپنی ماں دا روگ پتا لگ گیا۔ میری نانی مینوں جو کجھ سمجھانا چاہندی سی اوہ وی میں سمجھ گئی۔ میں اپنی ماں والے روگ توں بچنا سی۔ ایس لئی میں کدے کسے نوں پچھلا بوہا نہ کھولیا۔ مینوں پتا لگ گیا کہ پچھلے بوہے وچوں جیہڑا دل اک واری باہر تر جاندا ہے اوہ فیر پرت کے چھاتی وچ نہیں آوندا۔

جوانی میرے اتے وی چڑھی سی، جیہڑی کدے میری ماں اتے چڑھی سی۔ اپنی نانی کولوں میں وی اوہ گیت سکھیا سی جیہڑا کدی میری ماں نے سکھیا سی...... چل رے سکنا امرودواں کے دیسوا میں...... تے شیشے

وچ اپنا منہ دیکھ کے میں وی اوہو گیت گاؤندی ساں، جیہڑا میری ماں گاؤندی ہوندی سی...... نہ جانے کون رنگ رے...... پر میں گھر دا پچھلا بوہا کدے کسے لئی نہ کھولیا تے اگلے بوہے ول اکھاں لا کے اوہنوں اڈیکن لگ پئی جیہدا منہ ویکھ کے مینوں کسے یوسف دا منہ نہ چیتے کرنا پوے۔

فیر مینوں ستارھواں ورھا چڑھیا، فیر اٹھیواں۔ میرے نانا جی نوں گھاٹے پے گئے۔ میرے لئی اوہ جیہڑے چنگے ساک ٹولدے پئے سن، اوہناں ساکاں دی اوہ آس لے بیٹھے۔ اک دن سوچاں وچ پے کے اوہناں نے میرے باپ نوں خط لکھیا کہ میں ویاہ جوگی ہوگئی ہاں ایس لئی اوہناں نوں میرے لئی کوئی فکر کرنا چاہیدا ہے۔

خط دے جواب وچ میں جیہنوں ویکھیا، اوہ میرا باپ سی۔ دھی نے اپنی ہوش وچ پہلی وار باپ نوں ویکھیا، تے باپ نے پہلی وار دھی نوں۔ اکھاں وچ کدے اپنت پے جاندی سی، کدے نکل جاندی سی۔ مینوں پتا نہیں سی لگدا میں اپنے باپ نال کیہ گلاں کراں۔ تے شاید میرے باپ نوں ایہ پتا نہیں سی لگ رہیا کہ اوہ میرے نال کیہ گلاں کرے۔ اوس رات اوہ میرے نانا جی دے گھر گیا، راتیں بڑی دیر تک اوہناں نال گلاں کردا رہیا۔ سویرے میری نانی نے مینوں دسیا کہ میرا باپ کجھ دناں لئی مینوں اپنے گھر لیجانا چاہوندا ہے۔ مینوں ایہ سبھ کجھ عجیب لگ رہیا سی پر میں جان لئی من گئی۔ میری مرضی کسے اپنت نال نہیں سی بجھی ہوئی، پر اک ساک نال بجھی ہوئی سی۔ دوپہر ویلے جدوں میں اپنے کپڑے کڈھے تاں میری نانی نے اپنا لکڑ دا صندوق کھول کے اوہدے وچوں سچے موتی والی اک تیلی کڈھ کے میرے نک وچ پادتی۔ ایہ اوہو سچا موتی سی، جو میری ماں اپنے نک وچ پاندی ہوندی سی۔

مینوں اوہ گھڑی یاد ہے جدوں میرے نک وچ سچا موتی پا کے میری نانی نے میرے منہ ول تکیا تاں دوہاں ہتھاں نال اپنا منہ کج کے رون لگ پئی۔ فیر خورے اپنا رون اوس نوں بے سگنی لگا، اوہ میرے سر نوں اپنی چھاتی نال لا کے میرے متھے نوں چمن لگ پئی۔ چمدی چمدی اوہ آکھدی پئی سی ''مول نالوں ویاج پیارا'' مینوں پتا سی میری نانی دا مول گواچ گیا ہویا ہے، میں تے ویاج ہاں...... دھی دی دھی۔ اوہنوں گواچے مول دا ہیر وا وی آوندا پیا سی تے رہندے ویاج نال پیار وی آوندا پیا سی۔

میرے منہ وچوں، اوس ویلے خورے کس طرح ساریاں نوں میری ماں دا منہ دسدا پیا سی، میرے نانا جی جدوں سٹیشن تے جان لگی نوں سر تے پیار دین لگے تاں اوہناں دے منہ ہابڑ کے نکل گیا، مینوں تے اج

ایہ بلسیا نری کلاوتی لگدی پئی اے...... ایہ رب دے کیہ رنگ ہوندے نیں......''

گڈی وچ مینوں زنانے ڈبے وچ بٹھا کے میرے باپ نے اپنا بیگ مردانے ڈبے وچ رکھ لیا۔
میں جدوں اکلی بیٹھی تاں مینوں جاپیا کہ میں اپنے باپ دی شکل چنگی طرح نہیں سی ویکھی، دوسرے دن سویرے جدوں دلی اُتراں گی تاں پتا نہیں گڈی وچوں اتر کے اوہنوں پچھان وی سکاں گی کہ نہیں۔ تے شاید ایہو سوچ میرے باپ نوں وی آئی ہووے گی، کیونکہ اگلے سٹیشن اُتے اوہ میرے ڈبے وچ آیا تے مینوں انج ویکھن لگ پیا جیویں اوہ وی میری شکل نوں چنگی طرح چیتے کر رہیا ہووے کہ دوسرے دن سویرے جدوں دلی پہنچے تاں گڈی وچوں اتر کے مینوں چنگی طرح پچھان لوے۔

رات پے گئی سی، اجے کنا سفر باقی سی، جدوں آگرے سٹیشن اُتے میرا باپ میرے ڈبے وچ آیا تے مینوں آکھن لگا، '' جے توں آکھیں تاں ایتھے اُتر پییے، توں تاج محل کدے نہیں ویکھیا ہونا، میرے من دا بجھ ٹٹ گیا۔ جیا کرے اپنے باپ دی چھاتی نال سرمار کے آکھاں، '' ماں نے مینوں مر کے چھڈ دتا، پر توں مینوں جیوندیاں ہی چھڈ دتا سی۔ ویہاں ورھیاں پچھوں اج تینوں خیال آیا اے کہ میں آگرے دا تاج محل نہیں ویکھیا ہونا...... میں دلی دا لال قلعہ نہیں ویکھیا ہونا...... میں ہن کجھ نہیں ویکھنا......'' کسے باپ نال میں ضداں کر کے نہیں ویکھیا، پر ہن جدوں ویلا آیا سی تاں ضداں کرن والی عمر لنگھ گئی سی۔ ہن میں انھیواں ورھیاں دی تے کالج دی پڑھی ہوئی کڑی سی۔ آکھا من کے اچھا آکھ دتا تے گڈی وچوں اتر پئی۔

اک ہوٹل وچ سامان رکھیا۔ روٹی کھادی۔ رات بڑی ڈونگھی ہو گئی سی۔ سوچیا سویرے سارا تاج ویکھاں گے، ایس ویلے نہیں۔ تے میں اپنے باپ دے سپنے ورگے میل نوں اکھاں وچ میٹ کے سوں گئی۔

اگوں پتا نہیں میری قسمت کیہ میرے نک وچ پئے ہوئے چٹے موتی دی قسمت...... مینوں اپنی چھاتی وچ اپنا ساہ رکدا جاپیا تے میری گھبرا کے نیندر کھل گئی۔ کسے دا منہ میرے منہ کول اُڑیا ہویا سی، کسے دیاں باہواں میریاں باہواں اتے پئیاں ہوئیاں سن، میری چیک نکل گئی۔ '' بابو جی......'' اپنی جاچے میں اپنے باپ نوں پچھان کے ایہ آواز نہیں سی دتی، جیہڑا کوئی میری منجی اتے آ گیا سی، اوہدے کولوں مینوں بچن لئی میں اپنے باپ نوں آواز دتی سی، پر......

بابو جی نے اپنی تلی نال میرے ہوٹھ میٹ دتے، ۔ میری چیک جنی کو نکلی، باقی ہوٹھاں وچ میٹی گئی۔
میں کنبدی پئی ساں، پر میں ویکھیا میرا باپ وی کنبدا پیا سی۔ میریاں باہواں وچ پتا نہیں کتھوں بڑا زور آ گیا،

میں اپنے باپ دیاں باہواں پچھانہ دھک دتیاں تے منجی اتے اتر کے کھلوگئی۔

پتانہیں سی لگدا کیہ کراں۔ کمرے دا بوہا اندروں بند سی، چھیتی نال کھول دتا، پر بوہے وچ کھول رہی۔ پتانہیں سی لگدا پیا ایس ویلے کتھے جاواں، کناچر بوہے وچ کھلوتی رہی تے فیر میں ویکھیا کہ میرا باپ اپنی منجی اتے لیٹ کے رو رہیا سی۔ میں کناچر اوسے طرح کھلوتی رہی۔ اک پیر دہلیزاں توں اندر سی، اک باہر۔ اندرلا پیر باہر نہیں سی جاندا، باہرلا پیر اندر نہیں آوندا۔

تے فیر میرے کناں نوں جاپیا کہ میرا باپ میری ماں داناں لے کے کجھ آکھدا پیا سی۔ تے فیر مینوں لگا کہ اوہ میرا ناں لے کے وی کجھ آکھدا پیا سی۔ میں کمرے دے کھلے ہوئے بوہے نوں بھیڑ دتا تے اپنے باپ دی منجی کول ہو کے گوڈیاں پرنے بیٹھ گئی۔ میریاں لتاں کنبدیاں پئیاں سن، میرے کولوں کھلوتا نہیں سی جا رہیا۔

جیہڑے لفظ میرے باپ دے رون وچ رلے ہوئے سن، اوہ ہن مینوں چنگی طرح سنائی دے رہے سن۔ میرا باپ کدے میری ماں داناں لے کے اوہدے کولوں معافی منگدا پیا سی، کدے میرا ناں لے لے۔ پتانہیں کیہو جیہا رون میرے اندروں وی اٹھ پیا۔ منجی دی باہی نال سر لا کے میں جیوں رون لگی، نہ اپنے آپ نوں میرے کولوں چپ کروایا گیا، نہ اپنے باپ نوں۔

خورے رات ڈھلدی پئی سی، سویر ہوندی پئی سی کہ خورے چن دا چانن کمرے وچ پیندا پیا سی، میرا باپ تربھ کے منجی اتوں اٹھ بیٹھا۔ ''میں دن دے چانن وچ تینوں اپنا منہ نہیں وکھا سکدا ایٹی۔ میں ہن ایتھوں چلا جاواں گا۔ توں پڑھی لکھی کڑی ایں...... سویرے کوئی گڈی لے کے اپنی نانی دے گھر چلی جائیں......''

میں اپنے باپ دے مٹدے مٹدے بول سنے تے فیر ویکھیا کہ اوہنے اپنے بوجے وچوں کجھ نوٹ کڈھ کے منجی اتے رکھ دتے، ''ہوٹل دا بل دے دئیں...... گڈی دی ٹکٹ لے لئیں......''

میں منجی دی باہی اتے سر رکھ کے روندی پئی ساں، پتانہیں کیہڑے ویلے اپنے باپ دیاں لتاں کول ہو کے اوہدے گوڈیاں نال سر لا کے رون لگ پئی۔

''توں جے معاف کر سکیں مینوں معاف کر دئیں......'' میرے باپ نے آکھیا تے مینوں انج جاپیا، جیویں میرے سر اتے ہتھ رکھن لئی اوہنے اپنا ہتھ اگانہ کیتا سی، پر فیر میرے سر نوں چھوہیا نہیں سی۔

''بابو جی......'' میرے مونہوں ولک کے نکلیا۔

''تیری ماں مر گئی، سمجھ چھڈ یں باپ وی مر گیا'' میرے باپ نے اک وار آکھیا تے فیر اونے میرے کولوں گوڈیاں نوں چھڈا کے پرانہ ہو جانا چاہیا۔ میں گوڈیاں دے دوالے زور دی بانہ والائی۔ پر میرے کولوں کہن کجھ نہ ہویا۔ بڑے چر پچھوں میرے باپ نے آکھیا،''توں نہیں سمجھ سکدی...... میں سمجھاواں وی کس طرح؟ کہنوں سمجھاواں؟...... اک سچ سی، پر سارا جھوٹھ بن گیا......''

''میں سمجھاں گی بابو جی......''

''میں جدوں تیری ماں نوں ویکھیا سی...... ویہ ورھے ہو گئے نیں...... پتا نہیں ویہ ورھے کتھے چلے گئے...... میں کل جدوں ویکھیا، مینوں جاپیا میں اوسے نوں ویکھدا پیاہاں......''

''میں سمجھ رہی ہاں بابو جی!''

سماں ہمیشہ اگانہ نہیں تردا، کئی وار پچھانہ وی تر پیندا اے، انج جیویں تر دے تر دے رے ہتھوں کوئی چیز ڈگ پئی ہووے، بڑی دور جا کے اوہنوں اوس چیز دا چیتا آیا ہووے تے فیر اوس نوں لبھن لئی اوہ پچھانہ تر پیا ہووے...... میری ماں دے نک وچ پیا ہویا موتی مینوں سمے دے ہتھوں ڈگ پیا سی، ویہ ورھے لنگھ گئے سن۔ پر اج میرا باپ سمے دے نال رل کے اوس موتی نوں لبھدا پیا سی۔

میرے باپ نوں ویہاں ورھیاں دیاں گلاں کل وانگ یاد سن۔ میں سندی رہی، انج جویں اوہ اک گل مینوں اکھیں وکھانا پیا سی۔ جو کجھ سمجھ سکدی ساں سمجھیا، جو نہیں سمجھ سکدی، اوس نوں چھاتی وچ پا کے نانی دے گھر آ گئی ہاں۔''متری ماں کول جان لئی جیا نہیں کیتا'' نانی نوں آکھدتا ہے۔ پر سوچ رہی ہاں...... ماں گاؤندی سی،''کلسا تو بڑا سندر نہ جانے کون رنگ رے،'' ماں نوں اپنے من دا رنگ پتا نہ لگا، اوہ ایس توں پریشان ہو کے مر گئی۔ بابو جی جیوندے ہن، پر اپنے من دا رنگ اوہناں نوں وی پتا نہیں لگدا...... جیہڑے رب نے ایہ رنگ بنایا ہے، اوہی اوہناں نوں معاف کرے! میں کیہ آکھ سکدی ہاں......

(لپی انتر: ڈاکٹر شائستہ نزہت)

☆☆☆☆

امرتا پریتم

اک رُمال، اِک چھاپ تے چھانی

کچی پہلی توں لے کے اٹھویں جماعت تک بنتی ساڈے نال پڑھدی رہی سی۔ اجے اوہ پنجویں چڑھی سی جدوں اوہدا پیو اوہنوں سکولوں اُٹھان واسطے آیا۔ پر ساڈے سکول دی وڈی استانی نے بنتی دی فیس معاف کر دتی تے اوہنوں سکولوں نہ اُٹھن دتا۔

ستویں جماعت دیاں کُڑیاں تے اٹھویں جماعت دیاں کُڑیاں ویکھن نوں اکٹھیاں اکو کمرے وچ بیٹھدیاں سن۔ پر ادھی چھٹی ویلے اٹھویں دیاں کُڑیاں سانوں ستویں دیاں کڑیاں نوں اپنے لاگے نہیں سن لگن دیندیاں۔ ہمیشہ وکھریاں ہو کے بہندیاں سن تے پتا نہیں گٹھاں وچ لگ لگ کے کیہ گلاں کردیاں رہندیاں سن۔ اسیں جدوں ستویں دیاں کُڑیاں اوہناں دے نیڑے جاندیاں ساں اوہ سانوں ہتھ نال چھنک کے پرانہ کر دیندیاں سن۔ سانوں ستویں دیاں کُڑیاں نوں اٹھویں دیاں کڑیاں اُتے بڑا غصہ آؤندا سی تے اسیں سوچدیاں ساں اسیں جدوں اٹھویں وچ ہوواں گیاں، ستویں دیاں کڑیاں نال کدی ایس طرحاں نہیں کراں گیاں۔

تے فیر اسیں اٹھویں جماعت چڑھیاں۔ گرمی دیاں چھٹیاں پچھوں جدوں سکول کھلے، ساڈے کولوں وی اوہ گل ہو گئی جہڑی اسیں سوچیا سی کہ اسیں کدی نہیں کراں گیاں۔ ایہ تیرھواں، چودھواں ورھا پتہ نہیں کہو جیہا ہوندا ہے۔ شاید ایہ دہلیز ہوندی ہے بچپن تے جوانی دے وچکار۔ ایس ورھے کڑیاں دا اک پیر دہلیزوں اُرانہ تے اک پرانہ جا پیندا ہے۔

اوہناں گرمی دیاں چھٹیاں وچ بنتی دا اک گوانڈھی منڈا بنتی نوں سوال سمجھاؤندا رہندا سی تے ہن ہر روز ادھی چھٹی ویلے بنتی سانوں گٹھاں وچ لگ لگ کے اوہدیاں گلاں سناؤندی سی۔ ہن اسیں اٹھویں وچ پڑھدیاں کڑیاں ادھی چھٹی ویلے ستویں دیاں کڑیاں نوں لاگے نہیں ساں لگن دیندیاں۔

جس دن بنتی سانوں اوہدی گل نہ سناؤندی' سانوں انج جاپدا جویں اج سکول وچ ادھی چھٹی ہوئی ای نہیں سی۔

''میری تے ایویں ہس دنداں دی پریت ہے۔ ہور میں کیہ لینا اے اوہدے کولوں تے او ہنے کیہ لینا اے میرے کولوں'' فیر کدی کسی بنتی سانوں انج آکھ کے تالن لگ پئی سی۔

بنتی لکھ ٹالدی پر اہدے موہنہ اُتوں سانوں لبھن لگ پیا سی کہ ہس دنداں دی پریت ہُن بنتی دے گل دچوں لنگھ کے اوہدے دل وچ لہن لگ پئی سی۔ تاہیوں تاں ہُن اوہدی جیبھ خشک ہوندی جاندی سی تے اوہ بہتیاں گلاں نہیں سی کر سکدی۔

تے اک دن جھلی نے جویں اپنے ہتھ وچ پنسل پھڑی آپنی حساب دی کتاب اُتے کوئی وِیہ تھاویں اوہدا ناں لکھ چھڈیا۔ راجو...... راجو........ ساڈی استانی نے اوہدی کتاب ویکھ لئی۔ جماعت وچ تے اوہنوں کجھ نہ آکھیا۔ پر جدوں ادی چھٹی ہوئی' اوہنوں اکلی نوں اپنے کمرے وچ بلایا تے کمرے دا بوہا بھیڑ لیا۔ شامت بنتی دی آئی ہوئی سی پر اسیں جہڑیاں بنتی دیاں سہیلیاں ساں' موہنہ ساڈے ساریاں دے لتھے ہوئے سن۔ کنے چر پچھوں بنتی جدوں باہر آئی۔ رو رو کے اوہدیاں اکھاں لال ہوگئیاں سن۔ کتاب اُتے جنی تھاویں بنتی نے راجو ناں لکھیا ہویا سی ساڈی اُستانی نے ربڑ لے کے کھنیں تھائیں اوہ ناں مٹادتا سی۔

اٹھویں جماعت جدوں اک بیڑی وانگر سالانہ امتحان دے کنڈھے اُتے لگ گئی' اسیں ساریاں کڑیاں بیڑی دے پوروانگوں نکھڑ گئیاں۔ ایہ ساڈا سکول اٹھویں تک ای سی۔ اسیں بہت ساریاں کڑیاں نادیں وچ داخل ہو گئیاں پر وکھو وکھ سکولاں وچ تے بنتی سلائی والے سکول چلی گئی۔

فیر کوئی دو ورھیاں پچھوں مینوں بنتی دے ویاہ دا کارڈ آیا۔ ہورناں کڑیاں نوں وی گیا ہووے گا۔ میں چھیتی نال کارڈ اُتوں منڈے داناں پڑھیا' لکھیا ہویا سی ''کرم چند''۔

راجو دی تھاویں بھاویں کارڈ اُتے کرم چند لکھیا ہویا سی تاں وی ایہ ویاہ دا کارڈ سی تے ہر اک ویاہ توں ودھائی لین داحق ہندا ہے۔ میں بنتی دے ویاہ اتے گئی اوہنوں ودھائی دین۔

بنتی دیاں تلیاں اتے مہندی، بنتی دیاں باہواں وچ کلیرے، تے میں بنتی نوں ودھائی دتی۔

''میں بنتی نال اوہدی ''ہس دنداں دی پریت'' بارے کوئی گل نہیں ساں کرن چاہندی، پر گھڑی کو پچھوں اوہ آپ ہی مینوں اکلوا نجے لے گئی۔

''اک چیز سانبھ چھڈیں گی؟''

''کیہ.......؟''

''اک رومال اے۔''

ایہ مینوں پچھن دی لوڑ نہیں سی کہ رُمال کس دا اے۔ رومال راجو دا ای ہوسکدا اسی۔

''پر ایہدے وچ ایڈی کیہڑی گل اے۔ رُمال توں کدھرے اپنیاں چیزاں وچ ای رکھ لے۔''

''پر ایہدی کنی اُتے اوہدا ناں لکھیا ہویا اے۔''

''تے کسے نوں کیہ پتا ایہ کیہدا ناں اے۔''

''نرا راج لکھیا ہوندا۔ کوئی ویکھدا پچھدا تے میں کہہ چھڈدی میری سہیلی دا ناں اے۔ پر میں راجو لکھیا ہویا اے، راجو تاں کڑیاں دا ناں نہیں ہوندا۔''

''کاہدے نال لکھیا ہویا اے؟''

''اوہنے اک پنسل نال الیک دتا سی تے میں سوئی لے کے دھاگے نال کڈھ لیا سی۔''

''تے پرے ادھیڑ چھڈ دھاگا۔''

''ادھیڑ چھڈاں؟ ایہ تے مینوں خیال ای نہیں آیا۔'' تے فیر بنتی نے اک لما ساہ بھریا۔ اگوں آکھن لگی۔

''تینوں یاد اے، اک دن ساڈی استادنی نے ربڑ لے کے میری کتاب اُتوں اوہدا ناں مٹا چھڈیا سی؟ اج میں وی اوس طرحاں اوہدا ناں ادھیڑ چھڈنی آں۔''

میرا من بھر گیا۔ بنتی نے میرے ساہمنے اک ٹرنک وچوں سوہا ریشمی رُمال کڈھیا تے فیر سوئی لے کے اوہدی کنی اُتوں راجو داناں ادھیڑن لگ پئی۔ اک اوہو جہی سوئی، جہو جہی سوئی نال اوہنے دھاگا لے کے اوہدا ناں کڈھیا سی۔ بنتی دی کتاب اُتوں اوہدی اُستادنی نے راجو داناں مٹا چھڈیا سی۔ ویاہ دے کارڈ اُتے سماج نے راجو داناں نہ لکھن دتا تے بنتی دے مہندی والے ہتھاں نے اوہدے رُمال اُتوں اوہدا ناں ادھیڑ دتا۔

''چل چھڈ ایہناں گلاں نوں، توں آپے تے کہندی ہوندی سیں ایویں ہس دنداں دی پریت اے......''

''سوچیا تے ایہو ای سی۔ پر ایہ ہس دنداں دی پریت میرے ہڈاں وچ رچ گئی۔ ہڈیاں تک لہ

گئی۔" بنتی دیاں اکھاں بھر آئیاں۔

"سنیا اے تیرے سوہرے بڑے امیر نیں۔ بڑی کرماں والی ایں۔ اوہدا ناں وی کرم چند..... کنے چر پچھوں میں گل نوں راجو دے راہوں موڑیا۔

"کدے ناواں نال وی کرم بنے نیں؟" بنتی نے صرف اینا آکھیا:

"کدے چٹھی لکھیں کریں گی؟ کہ شاہنی بن کے سانوں ساریاں نوں بھل جاویں گی؟"

"کدے بھلنا اپنے وس ہوندا اے!" بنتی نے اک لما ساہ بھریا۔ ایس ویلے وی شاید اوہدے من وچ سہیلیاں دا خیال نہیں سی صرف راجو دا خیال سی۔

"راجو نوں بھاویں توں بھلیں تے بھاویں نہ بھلیں پر توں اوہنوں خط تاں لکھ نہیں سکنا۔ بھیڑیئے سانوں ای کدی کدائیں لکھ چھڈیں کریں، بھاویں خط وچ راجو دیاں گلاں ای لکھیں۔"

"اچھا کدے کدائیں من دی ہواڑ کڈھ لیا کراں گی۔ پر اک گل اے....."

"کیہ......"

"توں مینوں خط وچ کدے اوہدی گل نہ لکھیں۔ اوہ لوک پتا نہیں کہو جہے نیں۔ گھور پنڈ وچ رہندے نیں۔ سنیا اے چٹھی وی اوتھے ہفتے وچ مساں دو واری جاندی اے۔ مار پتے اتے ضلع تحصیل، ڈاکخانا، پنڈ تے ہور خورے کیہ کجھ لکھنا پیندا ہے۔ خورے اوہ لوک میری چٹھی وی مینوں پڑھ کے دیا کرن ....."

بنتی سوہرے چلی گئی۔ ایس گل نوں اج پندرھاں ورھے ہو گئے نیں۔ پہلے چار پنج ورھیاں وچ بنتی نے مینوں کجھ خط لکھے۔ بہتے نہیں پر جنے وی لکھے اوہناں وچوں اوہدے من دی ہواڑ آوندی سی۔ میں بنتی نوں ہمیشہ جواب دیندی رہی۔ پر اوہدے آکھے مطابق صرف رسمی جواب۔ اوہدے خط دی پہنچ کدے اوہدے من دی ہواڑ دا موڑواں جواب نہیں سی ہوندا۔

فیر دس ورھے بنتی نوں پتا نہیں کیہ ہویا۔ اوہنے مینوں کوئی خط نہ لکھیا۔ میں وی جانیا ہن اوہ اپنے ٹبر وچ رجھ گئی ہووے گی۔ میں وی کدے اوہنوں خط نہ لکھیا۔

پر اج بنتی دا اچانک خط آیا ہے۔ پتا نہیں ایہ کہو جہیا خط ہے! ایہدے وچ نری اوہدے من دی ہواڑ نہیں ایہدے وچ جویں ہر سوانی دے من دی ہواڑ ہے۔

میرا من بھریا ہویا ہے۔ اوہنے مینوں چج دا جواب دین توں وی منع کتیا ہویا ہے۔ نہیں تاں میں اج اوہنوں اک بڑا لما خط لکھدی۔ میرا من ہولا ہو جاندا۔

اج میں اوہدیاں ساریاں پرانیاں چٹھیاں کڈھیاں ہن۔ (شاید وچوں دوتن نہیں لبھیاں) تے اج دی چٹھی وی ساہمنے رکھی ہوئی ہے۔ مڑ مڑ کے ساریاں چٹھیاں نوں پڑھدی پئی ہاں۔ اک عورت دے من دی ہواڑ..... ہر عورت دے من دی ہواڑ......!

''گھور پنڈ اے جھڑا اج دا آہر، اوہیو کل دا آہر۔ ایہ وی پتا نہیں لگدا کہ اج کیہ وار ہے۔ صرف جدوں پنڈ وچ ڈاکیا آوندا اے تاں پتا لگدا اے کہ یاں اج منگلوار اے یاں سنیچروار۔ ایتھے سارے ہفتے وچ دووار ڈاکیا آندا اے۔ جویں شہر وچ تیل تانبا منگن والے ہفتے وچ دووار آوندے نیں۔

جدوں ڈاکیا آوندا اے۔ مینوں انج جاپدا اے جویں اوہ آکھ رہیا ہووے۔ ''منگل وار، ملے بھار، تیل تانبے دا دان۔'' یاں چھنچھر وار، ملے بھار' تیل تانبے دا دان'' ۔ پر اوہ لوک خورے کہو جہے ہوندے نیں جہناں دے بھار ٹلدے نیں۔ اوہ لوک خورے کہو جیہا تیل تانبا دان کردے نیں جہناں توں متراں پیاریاں دیاں چٹھیاں آوندیاں نیں۔ میں کہدی چٹھی واسطے ڈاکیے دا راہ ویکھاں؟

اچھا توں ہی مینوں دو حرف لکھ چھڈیں۔ کوئی گل نہ لکھیں چٹھی وچ بس اینا ای کہ تینوں میری چٹھی مل گئی۔ میں اینی گل واسطے ای ڈاکیے دا راہ دیکھاں گی۔

...... تیری بنتی

......!

توں جنج وچ میرا سوہرا ویکھیا سی؟ دسے والی داڑھی والا۔ جے توں میری سس ویکھیں' وچ حیران ہو جاویں۔ سس تاں کیہ اجے اوہ کسے وی نونہ وی نہیں لگدی۔ اصلوں کواری کڑی لگدی اے۔ عمروں اوہ میرے نالوں تن چار ورھے وڈی ہووے گی پر پندے دی بڑی ماڑی جہی ہے' تتلی چھمک اے اوہ میری سس نہ ہوندی' بھاویں اوہ متریئی سس اے۔ پر ہے تاں سس ای ناں! دھرم نال میں اہنوں اپنی سہیلی بنالیندی!

اج منگل وار سی۔ ڈاکیے نے آونا سی۔ مینوں خیال آیا خورے تیری چٹھی آوے۔ میں بوہے وچ کھلو کے ڈاکیے نوں اڈیکن لگ پئی۔ میری سس وی میرے کول آ کھلوتی۔

ڈاکیا آیا۔ اوہنے مینوں اک چٹھی پھڑائی۔ میں اپنی سس دے مونہ ول ویکھیا۔ اوہدا مونہ بڑا ای

اداس سی۔ اج جاپدا سی جویں اج اوہنوں ضرور کسے دی چٹھی آونی سی' تے آئی سی۔ ''کوئی خط آونا سی تیرا بھابھی؟'' میں اوہنوں ایڈی اداس ویکھ کے پچھیا۔

''مینوں کہدا خط آونا اے؟'' پہلوں تاں اوس نے ایہ آکھیا' تے فیر آکھن لگی۔

''آونا تے ہے سی اک خط' پر آیا نہیں۔''

''کہدا خط بھابھی؟'' میں فیر اوہنوں پچھیا۔

''رب دا خط' ہور مینوں کہدا خط آونا اے؟'' جاپدا سی اوہ ہُنے روپوے گی۔ پر اوہ روئی نہیں۔ یاں خورے کہو جہیا رون روئی اے جہڑا کسے نوں نظریں نہیں آیا۔ ویکھیا ای اسیں عورتاں کہو جہیا رون رو سکدیاں۔ ہاں! کدے کدے میرا جی کردا اے' میں وی اُچی اُچی رو سکاں اوی وی اُچی اُچی رو سکے۔

تیری بنتی

......!

سچ میں جدوں دی ایتھے آئی ساں! مینوں ایہ گھر کدے اپنا نہیں سی لگا۔ نری پروہنی لگدی ساں ایس گھر وچ، پر ہُن ایس گھر نے مینوں بنھ لیا اے۔ اِک نکا جہیا ''راجو'' آ گیا اے۔ مینوں نھن والا۔ گھر دے سارے لوک اوہنوں دیپک کر کے بلاندے نیں پر میں اوہنوں راجو بلانی آں۔

ترکالاں ویلے چنگی ٹھنڈ اُتر آوندی اے۔ میں اِک لال ریشمی رمال اوہدے سر اُتے بنھ دینی آں۔ لال رمال وچ اوہ ہور وی سوہنا لگدا اے تے میں اوہنوں جھولی وچ لے کے کِنا کِنا چر اوہدا مونہہ ویکھدی رہنی آں۔

تیری بنتی

......!

میرا راجو تِناں ورھیاں دا ہو گیا اے۔ تینوں اپنے من دی اک گل دساں؟ کدے کدے میں جدوں راجو دے مونہہ ول ویکھنی آں۔ ویکھدیاں ویکھدیاں اوہدا مونہہ وڈا ہو جاندا اے۔ اوہدا قد وی وڈا ہو جاندا اے۔ جویں میرا راجو پنجھیاں ورھیاں دا ہو گیا ہووے! تے میں؟ میں اجے ویہاں ورھیاں دی ہوواں! ویکھیا ای میں کنڈی شدین ہاں!

بڑا شرارتی اے میرا راجو۔ ہُن اجے میرے کول کھیڈ دا پیا سی۔ ہُنے کدھرے چونکے وچ جا پہنچیا۔

گرم چلھے وچ پانی دا گلاس لُد دتا سُو۔ میرا چلھا پاٹ گیا اے۔ وچاری سس میری نوں دیہاڑی لا کے بنانا پووے گا۔

سچ تینوں اک گل دساں! میری سس چلھا کیہ بناؤندی اے جویں کوئی بُت گھڑدی اے۔ توں کدے ایہو جیہا بانکا چلھا نہیں ویکھیا ہونا۔ اوہنوں آہر وی بڑی چھیتی آ جاندا اے۔ چلھا ڈھا کے مُڑ کے بناؤندی اے۔ اوس دن میں باہر لے چلھے اُتے روٹی پکانی آں۔ انج وس لگدے اوہ روٹی یاں سارا کم آپے کردی اے۔ پر جدوں پندرھیں وِیہ دنیں اوہ چونکے دا چلھا ڈھا کے نواں بناؤندی اے اوس دن اوہ روٹی دے لم نوں ہتھ نہیں لاندی۔ چلھا بناؤن دا تے اوہنوں کوئی جھل اے۔ آئے دن مٹی تے توڑی گولیندی اے۔ فیر اوہ چونکے دا بوہا اندروں مار لیندی اے۔ نال مٹی تھپدی تے نال گاؤندی اے۔

انج میں کدے اوہنوں گاؤندیاں نہیں سنیا۔ گاؤندیاں کیہ کدے رج دے بولدیاں وی نہیں سنیا پر چلھا بناون ویلے اوہ انج گاؤندی اے جویں کوئی چڑخا کتے تے ملے گون چھوہ ہوئے۔ رب دیاں رب جانے اوہدے من وچ کیہ گزر دیاں نیں؟ ماپیاں نے وی تاں اوہدی جوانی نال دھرو کمایا اے۔ ہیرے ورگی کُڑی نوں چھاپے وچ دھر کے چاندی دے روپے تول لئے۔

اچھا دو حرف چھیتی لکھ چھڈیں۔

تیری.........بنتی

!.........

توں گون پچھ بھیجے نیں جہڑے میری سس گاؤندی اے؟ پورا گون اوہنے کدے نہیں گایا۔ کوئی اک ٹپا گاؤندی اے تے فیر گھنٹا بھر اوہیو ای ٹپا گاؤندی رہندی اے۔

اج وی اوہنے پرانے چلھے نوں ڈھا کے نواں بنان دا آہر کیتا ہویا اے۔ چونکے دی اوہنے اندروں کنڈی لائی ہوئی اے۔ اوہدی آواز آؤندی پئی اے۔

چڑھ چڑھ چنداندھ چڑھدے دی لالی

برہا دی اگ اساں ویڑھے وچ بالی

تے میں تینوں چٹھی لکھن لگ پئی آں۔ میں باہر پسار وچ بیٹھی ہوئی آں۔ ہُن جے اوہنے کوئی ہور ٹپا گایا، میں تینوں لکھاں گی۔ دن لہ چکیا اے۔ اوہیو ٹپا اوہ گاندی رہندی اے۔ اج اوہدی آواز وی بھر بھر

آوندی سی تے فیر کناچر اوہدی آواز نہ آئی۔ ہُن فیر آواز آئی اے:

جے ٹُر چلیوں چاکری وے سانوں بوجھے پا
جتھے تاں آوے راتڑی سانوں کڈھ کلیجوں لا

ہاں سچ مینوں اوہدا اک گیت چیتا آیا اے۔ ایہ اوہنے اج تاں نہیں گایا پر اگے اوہ گاوندی رہندی اے۔

نہ تساں بھیجیا سُکھ دا سنیہا
نہ تساں بھیجی اے چیری
کہدے ہتھ بھیجاں میں سُکھ دا سنیہا
کہدے ہتھ بھیجاں میں چیری
لکھنے جوگا کاغذ نہیوں
قلمے جوگ نہ کاہی
دل دا ٹکڑا میں کاغذ بناواں
اُنگلیاں کٹ کاہی
اکھیاں دا کجلا میں شاہی بناواں
تے ہنجواں دا پانی آں پانی
ڈھل پر چھاویں چٹھی واچن بیٹھی
روندی چند نمانی

چونکے دا بوہا بے بند اے۔ پر بند بوہے وچوں وی جویں میرا من لنگھ کے اوہدے من وچ رل گیا اے ایہناں گیتاں وچوں بھلا کہڑا گیت اے جہڑا اوہدے من دا گیت نہیں تے جہڑا میرے من دا گیت نہیں۔

تیری اوہیو...... بنتی

اک گل میں تینوں لکھنی بھُل گئی آں۔ میری سس نوں کنے دناں توں روز ماڑا جیہا بخار ہو جاندا اے۔ لکھ ترلے کڈھو پر اوہ گھڑی آرام نہیں کردی۔

''بھابھی اجے تاں ڈاکیا سچ مچ اک دن رب دی چٹھی لے آوے گا۔ توں آپ ای اپنے ہڈاں دے

ویرپے گئی ایں۔'' اک دن میں اوہنوں آکھیا سی تے اگوں پتا اے کیہ کہن لگی: ''تیرا مونہ مٹھا کراں' جے اِک دن کچی مچی کوئی ڈاکیا اوہدی چٹھی لے آوے۔'' سچ اوہدا مونہ ویکھ کے تاں میرے من دا دُکھ دُونا پے جاندا اے۔

!.........

ورھے لنگھ گئے ہن۔ میں جان بُجھ کے ای تینوں کدے چٹھی نہیں سی لکھی۔ اج تیرے نویں شہر دا پتا لبھ لیا سی۔ پتا ای جدوں کدے میں چٹھی لکھن دی گل سوچدی ساں۔ مینوں ایہ پتا ہوندا سی کہ جے میں تینوں چٹھی لکھی خورے' کہڑیاں' کہڑیاں یاداں میرے دوالے گھرا پالین گیاں۔ فیر میں کئی کئی دن سُرت نہیں سنبھال سکدی۔ میرے ہتھوں چیزاں ڈگ ڈگ پین گیاں تے میرے ہتھوں سبزیاں سڑ سڑ جان گیاں۔ ہُن سارا گھر مینوں ای سنبھالنا پیندا اے۔

اینے ورھے میری سس رسی وانگ ولیندی رہی اے۔ منجی اُتے پئی ہوئی نہیں سی لبھدی تے نری نگی پونی۔

تینوں خورے یاد اے کہ نہیں۔ اک واری میں تینوں لکھیا سی کہ میری سس مٹی دا چلھا کیہ بناؤندی اے کوئی بت گھڑدی اے تے آئے دن پرانا چلھا ڈھا کے نواں چلھا بنان دا اوہنوں کوئی جھل اے۔ ایس بیماری وچ وی اوہدا جھل نہیں سی گیا۔ میں وی اوہنوں بُہتا موڑدی نہیں ساں۔ جس دن اوہ مٹی تے توڑی گوندی سی۔ اوس دن اوہدے وچ خورے کتھوں جان آجاندی سی! جویں کوئی گھر وچ کاج رچاندا اے۔

اج کوئی پندرھاں دناں دی گل اے۔ اوہنوں لہو دی اُلٹی آئی۔ نہ ہُن سانوں اوہدے جیون دا دھوکھا سی' تے نہ اوہنوں آپ نوں۔ دیہاڑی جدوں میرا دیور حکیم نوں بلان گیا (میرے سوہرے نوں گزریاں کئی ورھے ہو گئے نیں) تاں میری سس نے مینوں اپنے کول بلایا:

''جے توں میرا آکھا منیں' بچیے!''

''دس بھابھی! توں جو کجھ آکھیں'' میرا من بڑا ای ڈھلدا پیا سی۔ میں اوہدی منجی نال سر لا کے رون لگ پئی۔

''جھلی نہ ہووے تاں۔ رونی کاہنوں ایں؟ میں تاں منت کر کے پئی اُڈیکنی آں.......
کدوں ایہ میری جند دا پنجر ٹٹے گا تے میری روح آزاد ہو جاوے گی۔''

''دس بھابھی توں کیہ آکھنی ایں؟''

''جے توں مینوں مٹی گودیویں!''

''جھلی ہوگئی ایں بھابھی! ساہ تیرے مکدے پئے نیں۔''

''مینوں پتا اے' تاہیوں تاں میں آکھنی آں' آخری وار بس اک وار۔ فیر اُتوں اوہ سڑیا حکیم آجاوے گا۔''

''بھابھی! توں دنیا دے سارے موہ توڑ چھڈ ے۔ دنیا نال تاں موہ توں کدے پایا ای نہ' نہ تینوں پیسے نال پیار نہ تینوں جند دی پرواہ۔ فیر تینوں ایس چلھے نال کیہ اے؟''

''چلھے بیٹھیاں میں کجھ دبیا ہویا اے۔'' مردی مردی میری سس ہس پئی تے فیر کہن لگی۔''توں ایہ نہ امید لائیں کہ میں کوئی مہراں دی ہانڈی دبی ہوئی اے۔''

''بھابھی! تیرا دل میتھوں گجھا نہیں۔ جہڑے گھر وچ تیرا من مرگیا' اوس گھر توں مہراں کاہدے لئی دبیاں سن تے مینوں وی سڑیاں مُہراں دی جھاک نہیں۔''

''ایہ مینوں پتا اے بچیے! تائیں تاں میں تیرے نال......!''

''جو من وچ آوندا اے نشنگ کہہ دے بھابھی! میں تیری نونہ وی آں' تیری دھی وی آ' تیری سہیلی وی آ۔''

بھابھی اکھاں نال روئی تے بُلھاں نال ہسی' فیر آکھن لگی۔

''کدی کدی بچیے میں تینوں آکھدی ہوندی ساں ناں کہ آؤ تہانوں دانے بھُن دیاں' میں بڑی بھٹھیاری آں۔''

''آہو بھابھی مینوں یاد اے' پر ایہ تاں مینوں پتا اے کہ توں اَیویں ہسدی ہوندی سی۔ توں بھلا بھٹھیاری کتھوں آئی۔''

''نہیں بچیے! میں سچی مچی بھٹھیارے دی نشانی۔ تے نالے اک چھاپ' اوہ وی اوہدی نشانی۔''

تے فیر بھابھی نے اپنے مکدے ساہواں نال مینوں سنایا کہ اوہنوں اپنے پنڈ دے اک منڈے نال پیار سی۔ موتی ناں سی اوہدا' ماپیاں نوں من دا موتی پسند نہ آیا۔ اوہناں نے دھی نوں کوڈیاں دے بھاء ویچ چھڈیا...... ویاہ نوں اجے کجھ مہینے ای ہوئے سن' اوودرے ہوئے موتی نے بھٹھیارا بن کے ایہدے

سوہرے پنڈ بھٹھی لادتی۔

ایہ سس میری (روپوناں سی اوہدا) دانے بھنان گئی تے موتی نوں بھٹھیارا بنیا ویکھ کے جویں اوہدی بھٹھی وچ آپ بھجن لگ پئی۔

موتی دے ایس اپرالے نے بھلا موتی دا کیہ سوارنا سی۔ تے نالے روپو دا کیہ سوارنا سی۔ اک دن روپو اوہدے پیراں اُتے ڈگ کے روئی۔

''تینوں میری سونہ لگے جے توں اپنا آپ انج رولیں۔ ہُن بھجے ہوئے بیاں نے نہیں اُگنا۔'' تے روپو نے اوہدی بھٹھی توڑ چھڈی۔ کڑاہی اوہدے کولوں چکن نہ ہوئی۔ اوہ دانے چھانن والی چھانی چک لیائی تے اوہنوں حکم دے آئی کہ اوہ اپنے پنڈ مُڑ جاوے۔

موتی کولوں نہ اوہدی سونہ موڑن ہوئی تے نہ اوہدا حکم۔ اپنی چھاپ 'اک نشانی' اوہنے روپو نوں دتی تے دوسرے دن خورے کتھے ٹُر گیا۔

موتی بھٹھیارا کیہ بنیا' روپو نوں ساری عمر واسطے بھٹھیاری بنا گیا۔ اوہنے اوہدی چھانی تے اوہدی چھاپ دوویں چیزاں اپنے کول رکھ لئیاں۔ پر چھاپ اُتے موتی داناں ہویا سی' کتھے چھپاندی؟

چلھا توڑ کے دوویں چیزاں اوہنے مٹی وچ دب دتیاں تے فیر اُتے نواں چلھا بنا دتا۔

سارا سارا دن اوہ چلھے کول بہ کے روٹیاں کیہ پکاؤندی جویں من دیاں دلیلاں ویلدی رہندی۔ کدے کدے اوہدا دل بہتا ای اودر جاندا۔ اوہ چلھا توڑ چھڈ دی۔ اوہدیاں نشانیاں نوں گل نال لاندی، روندی تے گاوندی۔..... فیر اوسے طرح دوویں نشانیاں دھرتی دے حوالے کر دیندی۔ اُتے نواں چلھا اوہناں دی راکھی بٹھا دیندی۔

ایہ بھابھی دی کہانی کیہ مکی' اوہدے ساہ مُک گئے۔ اوہنوں لہو دی اک ہور اُلٹی آئی تے اوہدی جان دا پنجر اُٹ گیا۔

جناچہ بھابھی جان دے پنجرے وچ قیدی سی اوہنے موتی دی مندری اپنی انگل وچ نہیں سی پائی۔ فیر بھابھی دی روح آزاد ہوگئی۔ میں چلھے نوں پٹیا تے مندری کڈھ کے موئی ہوئی دیاں انگلیاں وچ پادتی۔

میں ای اوہنوں نہوایا سی۔ میں ای اوہدے اُتے کفن پانا سی۔ ایس لئی مینوں ڈر نہیں سی کہ کوئی اوہدے ہتھ وچ پئی ہوئی مندری اُتوں اوہدے موتی داناں پڑھ لوے گا تے جدوں تک لوکاں نے اوہدے

پھل چگنے سن۔ اودوں تک اوہدی مندری اُتوں اوہدے موتی داناں مٹ جانا سی۔

چھانٹی اجے میں اوسے طرحاں چلھے بیٹھاں رہن دتی اے۔ اگلے مہینے میری ماں نے ہردوار جانا اے۔ تے میں اپنے گھر والے نوں منالیا کہ میں وی چار دن ماں نال ہو آواں گی۔ نالے بھابھی دے پھل پرواآواں گی تے فیر اگوں توں سمجھو ای گئی ہوویں گی۔ چھانٹی میں کسے طرحاں ٹرنک وچ پا کے لے جاواں گی تے اوہدے پھل چھانٹی وچ پا کے پرواآواں گی۔

میرے سہیلیے' میرے انگ سہیلیے! اج تینوں نہ لکھاں تاں ہور کس نوں لکھاں؟ میں اپنیاں یاداں نوں وی اج پھرول پھرول کے دیکھیا اے۔ اک سوہا رومال اوہناں دے بیٹھاں سانبھیا ہویا۔ بھاویں کوئی بنتی ہووے تے بھاویں کوئی روپو تے بھاویں کون! کس نے اپنے من دیاں تیہاں وچ کوئی رومال یاں کوئی چھاپ نہیں دبی ہندی۔

اسیں نکرمتاں 'جھریاں کسے نوں محبت کردیاں آں' جنم توں ای بھٹھیاریاں ہو جاندیاں آں۔ دل دی بھٹھی اُتے اپنے ساہواں نوں دانیاں وانگ بھندیاں آں تے یاداں دی چھانٹی وچوں ورھیاں دی ریت چھاندیاں ہاں.......

تیری بنتی..........اک بھٹھیاری

(لپی انتر: قمرالزمان)

☆☆☆☆

اُمرتا پریتم
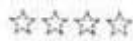
اَنب دابُور

اوہدا ناں کسے نہیں سی دھریا۔ جمی، تاں اوہدی دادی اوہنوں جھولی وچ پا کے لڈیاندی سی۔ ایہہ تاں ویراں والی آئی اے، اک ویر پہلو بھیج دتا، ہُن اک اپنے نال لیاوے گی..... پر ایہہ ناں، ویراں والی کسے دے مونہہ نہیں سی چڑھیا..........

اوہ کجھ پلھر گئی تاں کسے دے مونہہ نکلیاں سی۔ ''ہائے گڈی سوہنی نکلی اے، پتلی چھمک ورگی۔'' تے ہاسے ہاسے وچ اوہدا ناں چھمک پے گیا سی، جو ساریاں دے مونہہ چڑھ گیا.........

پنڈ وچ کڑیاں دا اک سکول سی۔ پرائمری تک، پر جدوں چھمک دا ویلا آیا، اوہ سکول دسویں تک ہو گیا سی۔ سکول دی پڑھائی تاں دسویں تک ہو گئی سی، پر اہدا امتحان نال لگدے شہر وچ جا کے دینا ہوندا سی۔ پر ایہہ گل وی چھمک لئی اوکھی نہیں سی بنی، اودوں تک چھمک دی ماسی اُراں دا گھر شہر وچ بن گیا سی، جتھے اوہناں لوکاں دا کاروبار سی، اناج منڈی وچ۔

امتحان وچ دس ویہہ دن رہندے سن، جدوں چھمک دی ماسی آپ پنڈ آ کے چھمک نوں لے گئی سی۔ اوہدا کہنا سی کہ شہر دے کسے سکول دے ماسٹر نوں دس دن لا کے چھمک دیاں کتاباں پکیاں کروا دیوے گی.......

ایہہ مارچ دے دس دن سن۔ امتحان سراں تے سن ایس لئی بتھیرا اَچھن پچھان تے وی اوہ ماسٹر نہیں سی لبھا جیہڑے کول دس پندرھاں دن ویلے وہن ایس لئی ماسی دے پتر بیر نے ای بندوبست کیتا، اپنے کالج دے دناں والے دوست رَبی نوں آکھیا کہ اوہدی بھین واسطے اوہدا پندرھاں ویہہ دن ویلا کڈھے.......

بیر نے کالج وچے چھڈ دتا سی، اوہدے چاچے دی موت نے بیر دے پیو نوں بہت اکلیاں کر دتا سی کہ اوہنوں اپنے کم کار لئی بیر دی لوڑ وی سی۔ پر ربی نے کالج وی پورا کر لیا سی تے اگوں وی نالے نوکری کردا

سی، نالے اگلی پڑھائی، بیر نال اوہدا بہن اٹھن بنیا ہویا سی۔ ایس لئی بیر نے اوہدے کولوں روز دے دو گھنٹے منگ لیے چھمک واسطے۔

ربی آیا، کمرے وچ پیر دھر دیاں ای، اوہدیاں اکھاں جویں باہر ول ویکھن دی تھاں اندر ول اتر آئیاں۔ اوہدے اندر اک جھولا جیہا سی تے اوہنوں جاپیا ایس ویلے جھولا باہر اوہدے ساہمنے کھلوتا ہویا سی.........

چھمک دے گل وچ پائی ہوئی قمیض، اک واری تاں ربی دیاں اکھاں اگے اک رکھ وانگ دسن لگ پئی تے اوہدے کناں دیاں پتلی تار دیاں والیاں، جویں رکھ دے پتیاں وانگ جھولدیاں ہون............

بیر آکھ رہیا سی "ربی" ایہہ میری بھین اے چھمک......چھمک نے دووّیں ہتھ جوڑ کے نمستے جیہی کیتی سی، پر ربی چپ جیہا کرسی تے بہہ گیا تے اوہنوں گھڑی لگی اپنے آپ وچ سنبھلن لئی.......

گنت دی گنتی منتی وچوں لنگھدیاں پتا نہیں کہڑے ویلے دو گھنٹے لنگھ گئے اودوں لگا جدوں ماسی نے کمرے وچ آ کے چاہ وی رکھی تے کجھ مٹھی مٹھیائی کھان واسطے.....

کھادا ان کھادا جیہا کر کے ربی اوتھوں اپنے گھر آ گیا تاں جاندیاں ای الماری وچ اپنے کاغذ پھرولن لگا، بڑی کاہلی نال.......

کجھ کاغذ ہتھ آئے تے اوہ غور نال اوہناں نوں ویکھن لگا۔ ربی نوں آرٹ دا کجھ پتا نہیں سی، پر اک سفنا سی، جو کئی وار آوندی سی تے ربی اوہنوں ویکھدیاں ای تریہہ جاندا ہوندا سی۔ اک واری اوہنے اپنے سفنے نوں لکیراں وچ اتاریا تے پھیر کئی واری اتاریا، پر ہر واری اوہنوں جاپدا سی کہ اوہ چنگی طرح کاغذاں تے نہیں اتردا............

اک سفنا سی جو پتا نہیں مڑ مڑ کے کیوں آوندا سی، دسدا سی کہ دُور اک انباں دا رُکھ اے، اوہ کجھ نیڑے جاندا سی تاں اُوتھے رُکھ کوئی نہیں سی ہوندا، اوہدی تھاں اک کڑی کھلوتی ہوئی دسدی سی......اوہ ہور نیڑے جاندا سی تاں اوتھے کڑی کوئی نہیں سی ہوندی، پر اوتھے اوہ رُکھ ضرور ہوندا سی جو دوروں دی دسیا ہوندا سی.......

ربی ہمیشہ، جدوں وی سفنا آوندا، کجھ گھابر کے جاگدا سی تے ایسے سفنے نوں اوہ کئی وار کاغذ تے اتارن لئی بہندا سی، پر ول طرح کجھ بندا نہیں سی......اوہ کڑی کدے دوروں دی اوہدے ول ویکھ رہی ہوندی، کدے اوہ پٹھ ولوں دسدی، جیہدی رُکھ دی ٹاہن نوں ہتھ پیا ہوندا تے کدے رُکھ وی نہیں سی ہوندا، صرف اوہ

ہوندی سی۔

ایہہ چھمک نوں پڑھان والے پندرھاں ویہہ دن ربی واسطے قیامت جہے ہو گئے..........

ویلا لنگھنا سی، لنگھ گیا، ربی نے نہ کجھ چھمک نوں دسیا، نہ اپنے دوست بیر نوں۔ چپ دا چپ رہ گیا سی..........

امتحان ہو گیا تے چھمک دے پرتن دا ویلا وی، صرف اوس دن ربی نے کہیا ''چھمک توں اگے کالج وچ کیوں نہیں پڑھدی؟''

چھمک چپ رہی، پھیر کہن لگی ''جی تے کردا اے، پر انج ہونا نہیں..........

''کیوں؟'' ربی نے انج پچھیا، جویں اوہدی آواز وچ کجھ لاچاری ہووے، ایہہ پچھن دی..........

چھمک پہلوں چپ رہی، پھیر کہن لگی ''پھیر میرے بھرا دا ویاہ کس طرح ہووے گا..........''

گل کجھ اٹ پٹی سی، جس توں ربی نوں ہاسا وی آیا تے عجیب جیہی اوکھتا وی..........

ماسی کمرے وچ چاہ پانی رکھدی پئی سی، اوہدے نال اوہدی دھی لالی وی سی اوہ بھاویں چھمک دے ہان دی نہیں سی، چھوٹی سی، پر اوہنوں چھمک نال اجیہا پیار ہو گیا سی کہ اوہدا وی جی کردا سی، چھمک ایتھے، اوہناں دے گھر رہ کے اگوں پڑھن لگ پوے۔ ایس لئی لالی چھیتی نال چھمک دے کول آ کے کہن لگی ''ربی بھائی دی گل من۔ لے دیدی! تینوں کالج بڑا چنگا لگے گا..........

چھمک چپ سی، کولوں دی ماسی کہن لگی ''ربی پتر! گل ایہہ دے کہ چھمک دے بھرا دا ویاہ تاں ای ہووے گا جے دچھمک دا ہووے گا تاں۔ ساڈے پاسے وٹے سٹے دے ویاہ ہوندے نیں جہڑے گھر دی کڑی لیاوندے ہاں، اوس گھر اپنی کڑی دینی پیندی اے..........

جتھے گل چلی ہوئی، اوہ مساں چھمک دے امتحاناں تک اڈیکن دی اے، ہن جاندیاں ای، دوناں دی وتھ تے چھمک دا ویاہ وی ہون والا اے تے اوہدے وی..........

ربی دی اکھاں ساہمنے نہ رکھ رہیا، نہ کڑی، صرف اک انھیر جیہا دسن لگ پیا..........

ماسی نے اگے ہو کے چھمک دے اتھرو پونجھے، کہن لگی ''روندی کیوں ایں؟ جے تیرا کجھ لگدا چنگا، ہویا، تاں اوہنوں منا لویں اگوں پڑھن واسطے۔ داخلے تاں جولائی وچ ہوندے نیں، بس پھیرے لے کے آ جائیں..........

پھیرے، ایہہ لفظ سی، جو ربی دے کناں نال ٹکرایا تاں پھر اوہنوں کجھ سنائی نہیں دتا۔ اوہ اٹھ کے کمرے وچوں چلا گیا.........

چھمک دا گھر سکناں نال بھر گیا، جیہڑے دن ایس گھر دے لوکاں نے اگلیاں دے گھر جنج بنھ کے جانا سی، اوس توں چوتھے دن، اگلیاں نے جنج بنھ کے اوہناں دے گھر آونا سی............

چھمک دے بھرا نوں سہرا بجھا۔ اوہ گھوڑی چڑھیا، چھمک نے واگ پھڑی، پھیر بھرا ڈولی لے کے آیا۔ اوہنے بھابی دے موہنہ گرا ہیاں دتیاں، پر چھمک نوں جاپدا رہیا جویں اوہ کجھ وی نہیں سی کر دی پئی، صرف سبھ کجھ ہوندا اویکھدی پئی سی............

چھمک نوں مہندی لگی، وٹنا مل کے نہویا گیا، کناریاں والے کپڑے اوہدے دوالے جھلمل کرن لگ پئے، تے شیشہ اوہدے ساہمنے دھریا گیا تاں اوہنوں جاپیا اوہ اوپتا نہیں کون سی، جو شیشے وچوں وسدی پئی سی پر اوہ نہیں سی، کتے نہیں سی............

ایہہ پتا نہیں کیہو جیہا داء ورولا سی، جیہنے چھمک دے پیراں ہیٹھوں دھرتی گوادتی تے اکھاں اگوں اسمان وی.........

جیہڑے پنڈ اوہ ویاہی آئی سی، چار دن پا کے جدوں اوپنڈ دیاں کڑیاں نال باہر کھیتاں، پیلیاں ول جان لگی تاں کسی دے نیڑے جا کے اوہدے سرتوں جیہا چکر آیا، اوہ اوتھے ای اک رکھ ہیٹھاں بہہ گئی.........

اوہدے نال دیاں تنے کڑیاں اوہنوں باہوں پھڑ کے رکھ ہیٹھوں اٹھان لگ پیاں "چھیتی اٹھ چھیتی! پر انہہ کسی تے چل کے بہنیاں واں ایتھے نہیں، ایتھے کڑیاں نہیں بہندیاں.........

چھمک نے حیران جیہاں اکھاں نال کڑیاں ول ویکھیا۔ اک جنی بولی "ایہہ رکھ سراپیا ہویا اے، ایہدے ہیٹھاں پنڈ دی کوئی کڑی نہیں بہندی......... کھلوندی ہوئی نہیں

"کیوں؟" چھمک نے پچھیا۔ پر اگوں کوئی گل کڑیاں نون پتا نہیں سی۔ کہن لگیاں "بس اینا ای کہندے نیں کہ ایہہ رکھ سراپیا ہویا اے، ایہنوں بور پیندا اے پر پھل نہیں پیندا۔ ایسے لئی کسے کڑی نون ایتھے نہیں آون دیندے.........

چھمک نے رکھ دے جھڑ دے بورنون تلیاں تے رکھیا تے تلیاں وچ ملدی نوں کڑیاں نے زوری اوتھوں اٹھالیا۔

چھمک اٹھدی، جاگدی تاں اوہدا کوجی کردا، اوس رُکھ ہیٹھاں جان لئی..............

کجھ دن پے گئے تاں اکلی جیرا کرن لگ پئی، اوس رُکھ ہیٹھاں جان دا.........

اوہنوں آپ پتہ نہیں سی لگدا کہ اوہنوں کیہہ ہوندا جاندا سی.........

کدی اکھاں اگے ربی دا جھولا جیہا آوندا پر اوہدے ول نظر بھر کے ویکھنا وی اوہدے وس نہیں سی تے جھولے نوں منع کرنا وی اوہدے وس نہیں سی۔

ہولی ہولی اگلیاں نوں جاپن لگا کہ چھمک بہت سوہنی سی، خبرے ایس لئی شریکاں وچوں کسے نے کجھ کر دتا سی.........اوہ اٹھدی بہندی اپنی سرت وچ نہیں سی جاپدی۔

گھر دی وڈی وڈیری نے کسے سیانے نوں وی پچھیا تے پچھ کے چار منگل وار دریا تے وی جاندی رہی، شبوتا ناریل دریا وچ پان لئی، پر چھمک دی حالت اوسے طرح رہی.........

اک دن چھمک اکلی جا کے سی والے رُکھ ہیٹھاں بیٹھی ہوئی سی کہ پنڈ دا اک بزرگ لاٹھی ٹیکدا کولوں لنگھیا۔ نیڑے آیا، تاں بولیا ''دھیے! ایس رُکھ ہیٹھاں نہ بہو! ایس رُکھا تے کسے دی رُوح رہندی اے۔''

چھمک کجھ دیر اوس بزرگ ول ویکھدی رہی، پھیر اٹھ کے، اوہدے پیر چھوہ کے پچھن لگی ''بابا! ایتھے کہدی رُوح اے؟ مینوں وی ایہو جاپدا اے کہ کوئی مینوں ایتھے زوری بلاوندا اے.........''

بزرگ نے کیہا ''دھیے! اک گل کہندے نیں، پتہ نہیں کدوں دی اے، تکی ویکھی تاں میں وی نہیں پر سنی سی کہ ایس پنڈ اک کڑی ہوندی سی، راجی، جیہنوں نال دے پنڈ والے پورن نال دھراں دی لگ گئی سی۔ راجی دے بھراواں نے پورن نوں کیہا کہ وہ شہر جا کے کمائی کرے، پنڈ وچ پکا گھر پاوے تاں اوہ راجی اوہدے نال ویاہ دین گے.........

چھمک دا جویں ساہ رُکدا پیا سی.........

بزرگ نے کیہا ''اوس ویلے ایہو رُکھ سی جتھے راجی آکھلوتی تے اوہنے پورن نوں کیہا ''ایتھوں پنڈ دا وڈا راہ دسدا اے، جیہڑا شہر ول جاندا اے، اوہ ایسے رُکھ ہیٹھاں بہہ کے اوہدا راہ ویکھدی رہوے گی، جدوں تک اوہ مڑدا نہیں......... پر اوس شوہدے نے کتھوں مڑنا سی اوہنوں تاں راجی دے بھراواں نے شہر دے راہ پئے ہوئے نوں مروا دتا سی۔ راجی وی پاگل ہوگئی تے رُکھ وی......... ایسے لئی رُکھ نوں پھل نہیں پیندا اَبن.........راجی مردی نے آکھیا سی جدوں پورن آجائے گا، رُکھ نوں پھل پے

جائے گا..........''

بزرگ نے اپنیاں گلیاں اکھاں پونجھیاں تے کہیا'' ایس لئی دھیے توں ایس رُکھ بیٹھاں نہ آیا کر! ایہہ سراپیا ہویا اے..........''

اوس ویلے چھمک نے شہر ول جاندے راہ نوں ویکھیاں تے کہن لگی'' سراپیا ہویا نہیں! وراگیاں ہویا اے..........

بزرگ، چھمک دے مونہہ ول ویکھن لگ پیا..............

گل شہر تک وی پہنچی، چھمک دی ماسی تک، کہ چھمک جدوں دی ویاہی اے، ول نہیں۔ اوہ چھمک نوں ویکھن لئی جانا چاہندی سی پر گھر وچوں جان نہیں سی ہو رہیا۔ ایس لئی اوہدی دھی لالی کہن لگی'' ماں! مینوں جان دے میرا چھمک دیدی نوں ملن واسطے بڑا جیا کردا اے........''

ربی نوں پتا لگا کہ لالی، چھمک کول جان والی اے، تاں اوہنے اک دن لالی دے سکول جا کے لالی نوں کہیا'' جے میں تینوں اک خط دیواں توں چھمک نوں دے دیویں گی، اکلی نوں جدوں کول کوئی نہ ہووے.......''

لالی ہن کجھ سیانی ہو گئی سی، زندگی دے بھیت اوہدے اگے وی کسے کسے اکھر وانگ اگھڑ دے پئے سن۔ کہن لگی'' ربی بھائی! تساں چھمک نوں پنڈ کیوں جان دتا سی ایتھے اوہ کالج وچ پڑھدی تاں...........''

ربی اجے وی کجھ دلیلاں وچ سی کہ اوہ چھمک نوں اپنے سفنے دی گل دسے کہ نہ تے ایسے بے چینی وچ اوہنے صرف چار سطراں لکھیاں سن، چھمک ول، لالی کول آ وی گیا سی پر اجے وی دلیلاں وچ سی کہ ہن ایہہ گل چھمک نوں دساں کہ نہ؟ کاہدے لئی دساں؟ پر کجھ سی جو اوہدے کولوں نابر ہو کے آکھدا سی۔ اک واری اوہنوں تے دس دیاں، جہنوں کئی واری ویکھناواں..............

لالی نے اوہدے ہتھوں خط پھڑ لیا، ربی نے کہیا کجھ نہیں پر عاجز جیہاں اکھیاں نال لالی ول ویکھیا.........

لالی پنڈ آئی پر چھمک اپنے پیکے گھر نہیں سی۔ ماں نے وی رو کے دسیا۔ کہندے نیں کڑی ول نہیں، کئی واری سد بھیجیا اے پر آوندی وی نہیں۔ کہندے نیں کسی والے رُکھ بیٹھاں جا کے کلی بہہ رہندی اے........خورے اوہنوں کسے نے کجھ کردتا اے..........

لالی نے کہیا'' ماسی! مینوں اوتھے اپڑادے، میں تاں اوہنوں ملن آئی ہاں، مل کے جاواں گی...........''

چمک دی ماں نے کجھ مٹھی مٹھیائی دی ٹوکریاں وچ پائی تے اپنے اتباری کامے نال لالی نوں چھمک والے پنڈ بھیج دتا............

لالی چھمک دے ہان دی نہیں سی پر چھمک نوں لگا جویں کوئی ڈاڈھا اپنا ملیاں ہووے۔ مڑ مڑ کے اوہدے موہنہ ول تکدی رہی۔ کدے ماسی دا حال پچھدی، کدے بیر دا تے پھیر چپ جیہی ہو کے اوہدے ول تکن لگ پیندی............

دوجی ترکال چھمک، لالی نوں لے کے اوسے کسی والے رُکھ ہیٹھاں چلی گئی۔ جتھے لالی نے ای اوہدی چپ توڑی۔ پچھیا ''توں ہور کسے دا حال نہیں پچھنا؟''

چھمک نے کیہا کجھ نہیں پر لالی دے موہنہ ول تکن لگ پئی۔ لالی نے ای ہس کے کیہا ''دیدی! ربی بھائی دا حال نہیں پچھنا؟''

چھمک ساری دی ساری اپنے دل وانگ دھڑکن لگ پئی............

''ایہہ لے، ربی بھا جی نے تینوں اک خط ہیجیا۔'' لالی نے کیہا تاں چھمک دے ہتھ خط پھڑ دیاں کنبن لگ پئے...... چار کو سطراں سن ''جدوں توں میں ہوش سنبھالیا اے، سفنے وچ مینوں اک رکھ دسدا اے، پھیر ویکھدا ہاں کہ اوتھے رُکھ کوئی نہیں ہوندا، اوتھے توں ہوندی ایں............نیڑے جاندا آں تاں توں کدھرے نہیں ہوندی، صرف اک رُکھ ہوندا اے............''

تے ایہناں چار سطراں دے ہیٹھاں اک سطر سی۔ ''میں ایس سفنے دا بھیت نہیں پایا۔ جے تینوں کجھ پتا لگے تاں دسیں۔''

چھمک سرت وچ نہیں رہی، لالی مساں جیہی اوہنوں تھم کے گھر لیائی تے چھمک ساری رات منجی اتے انج پئی رہی جویں اوہدے وچ جان نہ ہووے............

لالی نے اوہ خط جیہا سانبھ لیا پر بڑی گھابر گئی سی۔ گھر دیاں نے لالی نوں حوصلا دتا۔ ''توں فکر نہ کر کڑیے۔ ایہدا اتے روز دا ایہو حال اے............کئی سیانیاں نوں وی پچھ بیٹھی آں، خورے ایہنوں کوئی اوہر ہو گئی اے............''

اگلے دن لالی نے پرتنا سی، چھمک وی کجھ سرت وچ سی، لالی نوں کہن لگی ''خط دا جواب نہیوں لے کے جانا؟''

''ہاں لیکے جاناں اے........'' لالی نے کہیا تے اوہنوں رون آ گیا

چھمک نے کاغذ لے کے دو سطراں لکھیاں۔

''میں حالے وی اوس رُکھ بیٹھاں کھلوتی آں پچھلے جنم توں کھلوتی ہوئی آں........

بس ایس رُکھ نوں بُور پیندا اے پھل نہیں پیندا............''

(لپی انتر: فیصل مقصود)

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: میر تنہا یوسفی

بُو

گھوڑی ہنہنائی تو گلیری بھاگ کر کمرے سے باہر آئی، اس نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ اس کے میکے کی گھوڑی تھی۔ گلیری نے گھوڑی کی گردن کے ساتھ اپنا سر لگایا جیسے وہ گھوڑی کی گردن نہیں میکے کا دروازہ ہو۔

گلیری کا میکا چنبہ شہر جبکہ سسرالی گاؤں لکڑ منڈی اور کھجار کی راہ میں ایک اونچی اور ہموار جگہ پر تھا۔ کھجار سے کچھ ایک میل آگے نکل آنے پر پہاڑی کا ایک ایسا موڑ آتا تھا جہاں کھڑے ہونے سے بہت دور اور بہت نیچے بستا چنبہ شہر تھا۔ کبھی کبھی جب گلیری اُداس ہو جاتی وہ مانک کو ساتھ لے کر اس موڑ پر آ کھڑی ہوتی جہاں سے اسے چنبہ شہر کے گھر روشن نقطوں جیسے لگتے اور پھر یہ روشن نقطے اس کے من میں ایک رونق لگا دیتے۔

وہ سال میں بس ایک بار میکے جاتی، اسوج کے مہینے میں۔ ان دنوں وہاں چگان کا میلہ لگتا تھا جس کے لئے اس کے ماں باپ اسے بلاوا بھیجتے تھے۔ ایسا بلاوا صرف گلیری کو نہیں آتا تھا بلکہ گلیری کی تمام سہیلیوں کے میکے اپنی اپنی بیٹیوں کو بلوا لیا کرتے تھے۔ سب سہیلیاں جب ایک دوسرے کو گلے مل لیتیں تو سارے سال کے سبھی موسموں کے دکھ سکھ کی باتیں کر لیتیں۔ پھر وہ اپنے میکے شہر کی گلیوں میں ہرنیوں کی طرح کلانچیں بھرتیں۔ تجربہ کار اور شادی شدہ، دو دو تین تین بچوں کی مائیں اپنے بڑے بچوں کو ان کے دادا دادی کے پاس چھوڑ آتیں اور گود والوں کو آتے ہی ننھیال کے حوالے کر دیتیں، میلے کے لئے نئے کپڑے سلواتیں، ابرق لگوا کر چنریاں رنگواتیں اور پھر میلے سے کانچ کی چوڑیاں اور خوبصورت چاندی کی بالیاں خریدتیں، اور پھر میلے سے خریدے ہوئے صابن کی خوبصورت ٹکیوں سے اپنے جسموں کو یوں مل مل کر دھوتیں جیسے وہ اپنے کھوئے کنوارے جوبن کی خوشبو کو ایک بار پھر سے سونگھنا چاہتی ہوں۔

گلیری کئی دنوں سے آج کے دن کے انتظار میں تھی۔ جب اسوج کا آسمان ساون بھادوں کے مہینوں سے ہاتھ پاؤں دھو کر نکھر بیٹھا ہوتا، تو گلیری جیسی سسرال بیٹھی لڑکیاں ہر روز مویشیوں کو چارا دانہ ڈال،

ساس سسر کے لئے دال چاول پکا کر ہاتھ پاؤں دھو کر، بن سنور کر بیٹھ جاتیں کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، ان کے میکے سے کوئی نہ کوئی انہیں لینے آتا ہی ہوگا۔

آج جب گلیری کے سسرال کے دروازے پر اس کے میکے کی گھوڑی ہنہنائی، گلیری خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ گھوڑی لے کر آئے نوکر نتھو کو گلیری نے بیٹھنے کے لئے چوکی دی۔

گلیری کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خود سے اس کے چہرے کا رنگ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ مانک نے تمباکو کا ایک لمبا کش کھینچا پھر پتہ نہیں اس سے تمباکو کا نشہ نہ سہا گیا یا گلیری کے چہرے کا رنگ، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اس بار تو میلے میں آؤ گے ناں! چاہے صرف ایک دن کے لئے ہی سہی'' گلیری نے مانک کے پاس بیٹھ کر بڑے لاڈ سے کہا۔ مانک کے ہاتھ کانپے اور اس نے ہاتھ میں پکڑی چلم کو پرے رکھ دیا۔

''بولتے کیوں نہیں؟'' گلیری نے کہا، اُس کی آواز میں جذبے کی گرمی تھی۔

''ایک بات کہوں گلیری!''

''مجھے پتہ ہے تم نے کیا کہنا ہے! بھلا یہ بات تمہیں کہنی چاہیے؟ سال بھر میں ایک بار تو میں میکے جاتی ہوں، پھر تم کیوں منع کرتے ہو؟''

''پہلے تو کبھی نہیں روکا۔''

''تو پھر اس بار کیوں روکتے ہو؟''

''اس بار........ اس بار........'' مانک نے اک آہ بھری۔

''تمہاری ماں تو مجھے منع نہیں کرتی، پھر تم کیوں........؟'' گلیری کی آواز میں بچوں کی سی ضد تھی۔

''میری ماں..... '' مانک نے منہ بند کر لیا جیسے بات کو دانتوں تلے سختی سے دبا لیا ہو۔

دوسرے دن گلیری منہ اندھیرے ہی بن ٹھن کر تیار ہو گئی۔ گلیری کا نہ کوئی بڑا بچہ تھا نہ ہی گود والا۔ اس نے نہ کسی کو ددھیال چھوڑنا تھا اور نہ ہی کسی کو ننھیال لے جانا تھا۔

نتھو نے گھوڑی پر کاٹھی کسی اور گلیری کے ساس سسر نے گلیری کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر الوداع کہا۔

''چل دو کوس میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا...... '' مانک نے کہا تو گلیری نے خوش ہو کر مانک کی

بانسری اپنی بغل میں رکھ لی۔

کھجار گزر گیا، اگلا ایک اور کوس بھی طے ہو گیا، پھر چنبے کی ڈھلان شروع ہو گئی۔ گلیری نے بغل میں سے بانسری نکالی اور مانک کے ہاتھ میں تھما دی۔

سامنے تیز اترائی تھی جس پر سے پاؤں جیسے پھسلتے جاتے تھے۔ گلیری نے مانک کا ہاتھ پکڑا اور پھر رک کر بولی: ''بجاتے کیوں نہیں بانسری؟''

سوچیں بھی جیسے راہ کی ڈھلوان پر پڑی ہوئی تھیں کہ مانک کا من پھسلتا جاتا تھا۔ گلیری نے جب اس کا ہاتھ پکڑا، مانک نے ٹھٹھک کر اس کو دیکھا۔

''بجاتے کیوں نہیں بانسری؟'' گلیری نے پھر کہا۔

مانک نے بانسری کو لبوں سے لگایا، پھونک ماری لیکن اس میں سے کچھ ایسی آواز نکلی جیسے بانسری کی زبان پر آبلے پڑ گئے ہوں۔

''نہ گلیری! میں پھر تجھے کہتا ہوں، نہ جا اس بار...... نہ جا......!'' مانک نے ہاتھ میں تھامی بانسری گلیری کو دے دی۔

''مگر کوئی بات بھی تو ہو...... چلو! تم میلے کے دن آجانا! میں تمہارے ساتھ ہی لوٹ آؤں گی، وہاں نہیں رکوں گی..... پکی بات!''

مانک نے کچھ نہ کہا، اس نے گلیری کے چہرے کو یوں دیکھا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو''گلیری! یہ بات پکی نہیں ہے..... یہ بہت کچی ہے...... بہت کچی......'' پر مانک نے کچھ نہ کہا جیسے اسے کچھ کہنے کا ڈھب نہ آتا ہو۔

گلیری اور مانک سڑک سے پرے ہٹ کر ایک پتھر کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑے تھے۔ نتھو نے وہاں سے دس قدم آگے گھوڑی کھڑی کی ہوئی تھی مگر مانک کا من کہیں بھی نہیں کھڑا تھا۔

مانک کا من گھومتا، پھسلتا، سات برس پیچھے پہنچ گیا۔ ایسے ہی دن تھے، مانک اپنے یاروں بیلیوں کے ساتھ مل کر اسی راہ سے گزرتا چگان کا میلہ دیکھنے سڑک تک گیا تھا۔

میلے میں لوگ کانچ کی چوڑیوں سے لے کر گائے بکریوں تک کی خرید و فروخت میں مگن تھے اور اسی میلے میں مانک نے گلیری کو دیکھا تھا اور گلیری نے مانک کو، اور پھر مانک نے گلیری کا دل خرید لیا تھا اور گلیری

نے مانک کا۔

مناسب وقت دیکھ کر وہ ایک دوسرے سے ملے تھے ''تم تو مکی کا دودھ بھرا بھٹا ہو'' مانک نے کہا تھا اور گلیری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''پر کچے بھٹوں کو تو ڈنگر منہ مارتے ہیں'' گلیری نے ہاتھ چھڑا لیا تھا اور پھر ہنس کر مانک سے کہا تھا ''انسان تو بھٹا بھون کر کھاتے ہیں۔ اگر ہمت ہے تو میرے باپ سے میرا رشتہ مانگ لو!''

مانک کے رشتہ داروں میں جب بھی کوئی بیاہ ہوتا، لڑکے والے، لڑکی کی قیمت ادا کرتے۔ مانک ڈرتا تھا کہ نہ جانے گلیری کا باپ کتنی رقم طلب کرے۔

مگر گلیری کا باپ سیر شکم شخص تھا اور کسی دور کے شہر کمائی کر چکا تھا۔ اس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ اس نے بیٹی سے پیسا نہیں کمانا، جہاں بھی کوئی اچھا گھر دیکھے گا، بیٹی کو بیاہ دے گا۔

مانک نے گلیری کے چہرے کو یوں دیکھا جیسے اس کے دل کی زبان پر آبلے پڑ گئے ہوں۔

گھوڑی ہنہنائی، گلیری کو اگلی مسافت یاد آئی تو وہ چلنے کو تیار ہوتے مانک سے کہنے لگی ''آگے جا کر نیلے پھولوں والا جنگل آتا ہے، کوئی دو میل لمبا ...... تمہیں پتہ ہے ناں اس جنگل سے گزرتے ہوئے کان بہرے ہو جاتے ہیں!''

''ہاں'' مانک نے آہستگی سے کہا۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم اسی جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ تمہیں میری کوئی بات سنائی ہی نہیں دے رہی.....''

''سچ کہتی ہے گلیری! مجھے تیری کوئی بات سنائی نہیں دے رہی'' مانک نے ایک لمبی آہ بھری۔ دونوں نے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھا مگر دونوں سے ایک دوسرے کی بات نہ سمجھی گئی۔

''میں جاؤں اب؟.... تم اب لوٹ جاؤ! بہت دور تک آ گئے ہو......'' گلیری نے ہولے سے کہا۔

''تو اتنی دور تک چلتی ہوئی آئی ہے، اب گھوڑی پر بیٹھ جانا!'' مانک نے بھی ویسے ہی دھیرے سے کہا۔

''یہ لو! پکڑو اپنی بانسری!''

''تو اسے ساتھ ہی لے جا''

''میلے والے دن آ کر بجاؤ گے؟''گلیری ہنس پڑی، اس کی آنکھوں میں دھوپ چمک رہی تھی۔

مانک نے رخ پھیر لیا، شاید اس کی آنکھوں میں بادل اتر آئے تھے۔

گلیری میکے کی راہ چل پڑی اور مانک اپنے گھر کو لوٹ گیا۔

''ماں......'' گھر پہنچ کر مانک یوں چارپائی پر گر پڑا جیسے وہ بہت مشکلوں سے چارپائی تک پہنچا ہو۔

''بڑی دیر لگا دی؟''ماں نے کہا''مجھے لگا تو اسے پہنچانے ساتھ ہی چلا گیا ہے''

''نہیں ماں پہنچا کر نہیں آیا...... آدھے میں ہی چھوڑ آیا ہوں''مانک کا گلا بھر آیا۔

''عورتوں جیسا روتا کیوں ہے؟ مرد بن مرد!''ماں نے اک غصے سے کہا۔

مانک کا جی چاہا وہ ماں سے کہے''مگر تم تو عورت ذات ہو! ایک بار ہی سہی، عورتوں کی طرح روئی کیوں نہیں؟''پھر مانک کو گلیری کی بات یاد آئی''ہم نیلے پھولوں والے اس جنگل سے گزر رہے ہیں جہاں سب کے کان بہرے ہو جاتے ہیں''تو مانک کو محسوس ہوا کہ آج کسی کو بھی اس کی بات سنائی نہیں دے رہی، اور نہ ہی خود اسے کسی کی بات سنائی دے رہی ہے۔ ساری دنیا جیسے نیلے پھولوں والا ایک جنگل ہے اور سب کے کان بہرے ہو چکے ہیں۔

سات برس ہو گئے تھے مگر گلیری کو اُمید نہیں لگی تھی اور ماں کہتی تھی کہ اب آٹھواں سال نہیں چڑھنے دینا۔ وہ اندر ہی اندر پانچ سو روپے دے کر مانک کے دوسرے بیاہ کی بات پکی کر چکی تھی۔ وہ صرف اس انتظار میں تھی کی گلیری میکے جائے اور وہ نئی دلہن گھر لائے۔

پھر مانک کو محسوس ہوا کہ اس کے بھیتر، دل کا ماس سو گیا ہے۔ گلیری کی محبت اس کے دل میں چٹکیاں بھرتی ہے مگر اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہو رہا۔ نئی دلہن کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے کی ہنسی اس کے دل میں گدگدی کر رہی ہے مگر اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہو رہا.... اس کے دل کا ماس سو گیا ہے.......

ساتویں دن مانک کے گھر اس کی نئی دلہن بیٹھی ہوئی تھی۔ مانک کے سارے انگ جاگتے تھے صرف اک دل تھا جس کا ماس سویا ہوا تھا۔ دل کے سوئے ہوئے ماس کو اس کے انگ ہر جگہ لے گئے تھے، نئے سسرال

بھی، نئی دلہن کی سیج پر بھی......

مانک منہ اندھیرے اپنے کھیت میں بیٹھا تمبا کو پی رہا تھا جب اس کا ایک پرانا دوست وہاں سے گزرا۔

''اتنی سویرے کدھر جارہا ہے بھوانی؟''

بھوانی ایک منٹ کو ٹھٹکا، پھر رک گیا۔ حالانکہ اس نے کندھے پر چھوٹی سی ایک گٹھڑی اٹھائی ہوئی تھی پھر بھی ہولے سے کہنے لگا ''کہیں نہیں''

''کہیں تو جارہا ہے۔ آ! بیٹھ تمبا کو پی لے'' مانک نے آواز دی۔

بھوانی آکر بیٹھ گیا اور مانک کے ہاتھ سے چلم لے کر پیتا ہوا کہنے لگا ''چھنپے جارہا ہوں...... آج میلہ ہے ناں!''

میلے کے لفظ نے دل میں پتہ نہیں کیسی سوئی چبھوئی، مانک کو لگا اس کے اندر، کہیں ایک شدید درد اٹھا ہے۔

''آج میلہ ہے؟'' مانک کے منہ سے نکلا۔

''آج کے دن ہی تو ہوتا ہے ہر سال......'' بھوانی نے کہا اور پھر مانک کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو ''تو بھول گیا ہے اس میلے کو......؟ سات سال پہلے جب تو میلے گیا تھا میں ہی تو تیرے ساتھ تھا ...... تو نے تو اس میلے میں محبت کی تھی......''

بھوانی نے کچھ نہ کہا مگر مانک کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے سب کچھ سن لیا ہو، اور یوں اسے بھوانی پر غصہ آیا کہ وہ اسے یہ سب کچھ کیوں سنا رہا ہے۔ بھوانی مانک کی چلم اسے پکڑا کر اٹھ گیا۔ اس کی پشت پر لٹکی ہوئی چھوٹی سی گٹھڑی میں سے اس کی بانسری کا سرا باہر نکلا ہوا تھا۔ بھوانی چلتا گیا، مانک اسے پیچھے سے دیکھتا رہا۔ پشت پر لٹکی ہوئی اس چھوٹی سی گٹھڑی کو دیکھتا رہا، گٹھڑی سے جھانکتے ہوئے بانسری کے سرے کو دیکھتا رہا۔

''بھوانی اور بھوانی کی بانسری میلے کو جارہے ہیں'' مانک کو اپنی بانسری یاد آئی ''میری بانسری بھی میلے گئی ہوئی ہے'' مانک کو وہ دن یاد آیا جب اس نے میکے جاتی گلیری کو اپنی بانسری دیتے ہوئے کہا تھا ''تو اس کو ساتھ ہی لے جا'' اور پھر مانک کو خیال آیا ''اور میں؟'' مانک کا جی چاہا کہ وہ بانسری کے پیچھے پیچھے دوڑ

پڑے۔

وہ اپنی بانسری کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑے جو اس سے پہلے میلے میں چلی گئی تھی۔ مانک نے چلم پھینک دی اور بھوانی کے پیچھے دوڑا..... پھر مانک کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ وہیں کا وہیں بیٹھ گیا۔

اگلے دن سہ پہر کا وقت تھا جب مانک اپنے کھیت میں بیٹھا تھا اور دور سے آتا بھوانی نظر آیا تھا۔ مانک نے اپنا منہ پرے کر لیا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے نہ تو بھوانی کا چہرہ ہی نظر آئے اور نہ ہی اس کی پشت۔ اس بھوانی کو دیکھ کر اسے میلہ، یاد آ جاتا تھا اور وہ میلہ اس کے دل کے سوئے ہوئے ماس کو جگا دیتا تھا اور پھر جب وہ ماس جاگ جاتا تھا تو اس میں شدید درد اٹھتا تھا۔

مانک نے منہ موڑ لیا مگر بھوانی گھوم کر مانک کے سامنے آ بیٹھا۔ بھوانی کا چہرہ کچھ یوں تھا جیسے کسی نے دہکتے ہوئے کوئلے پر ابھی ابھی پانی ڈالا ہو اور اس کے سکے کا رنگ اب لال کے بجائے کالا ہو۔ مانک نے خوف زدہ ہو کر بھوانی کے چہرے کو دیکھا۔

''گلیری مر گئی۔''

''گلیری مر گئی؟''

''وہ تیرے بیاہ کی خبر سن، مٹی کا تیل ڈال، جل کر مری''

''مٹی کا تیل؟''

اس کے بعد مانک نہیں بولا، پہلے بھوانی ڈرا، پھر مانک کے ماں باپ ڈر گئے اور پھر مانک کی نئی بیوی ڈر گئی کہ نہ جانے مانک کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ نہ کسی سے بولتا اور نہ ہی کسی کو پہچانتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

ایک دن گزرا۔ کئی دن گزر گئے۔ مانک وقت پر کھانا کھاتا، کھیتوں میں کام بھی کرتا مگر سب کے چہروں کو یوں دیکھتا جیسے وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتا۔

''میں اس کی بیوی کس بات کی ہوں میں تو بس اس سے بیاہے جانے کی مجرم ہوں'' نئی دلہن دن رات رونے میں جٹ گئی۔

بیاہے جانے کا یہ جرم اگلے مہینے مانک کی نئی بیوی اور مانک کی ماں کی آس بن گئی۔ مانک کی بیوی کا پاؤں بھاری ہو چکا تھا۔

ماں نے مانک کو اکیلے بٹھا کر یہ بات سمجھائی مگر مانک ماں کا چہرہ یوں دیکھتا رہا جیسے اسے بات سمجھ

نہ آئی ہو۔

یہ بات چاہے مانک کو سمجھ نہ آئی مگر یہ بات تھی بہت بڑی۔ ماں نے نئی بہو کو حوصلہ دیا کہ تو ہمت سے یہ وقت کاٹ لے، جس دن تیرا بچہ مانک کی جھولی میں ڈالوں گی، مانک کی ساری حسیّں لوٹ آئیں گی۔

اور پھر وہ وقت کٹ گیا۔ مانک کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ ماں نے نومولود کو نہلایا، دھلایا اور کالے کپڑے میں لپیٹ کر مانک کی جھولی میں ڈال دیا۔ مانک جھولی میں رکھے ہوئے بچے کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور پھر چیخ کر کہنے لگا "اسے پرے ہٹاؤ، مجھے اس میں سے مٹی کے تیل کی بو آتی ہے۔"

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: زاہد حسن

کہانی در کہانی

نرملا جب بچی تھی، دُودھ پینے کے لیے ایک پیالہ اس کے لیے رکھا جاتا تھا۔ سفید پیالا تھا، بس اُس کے نچلے حصے میں ہرے رنگ کی پھول پتیاں کاڑھی ہوئی تھیں۔ نمی جب دُودھ کے گلاس سے منہ موڑ لیتی تب ہی اُس کی ماں نے دُودھ کے گلاس کی جگہ یہ پیالہ رکھ دیا تھا۔ اور نرملا کو لالچ دیا تھا کہ اگر وہ سارا دُودھ پی لے گی تو پیالے میں اُسے خوبصورت پھول پتے نظر آئیں گے۔ یہ پھول پتے دیکھنے کی خواہش میں نمی نے سارا دُودھ پی لیا تھا۔ ماں اور نمی دونوں کو یہ پیالہ راس آ گیا تھا۔ نمی کی پھول پتے دیکھنے کی آرزو میں کمی آتی چلی گئی۔

اور پھر جب نمی نرملا بن گئی۔ دُودھ پینے سے چائے پینے کی اُس کی عُمر آ گئی تھی تو اُسے لگا کہ جیسے کوئی ہریاول اُس پیالے کی نچلی تہہ میں اُگی ہوئی تھی اور اس کی جوانی اُس چہرے کو ڈھونڈنے لگی تھی، جس کے ہونٹ اُس کے دِل کے بھرے ہوئے پیالے کو ایک ہی گھونٹ میں پی لیں گے اور اس کی ہریالی کا جادو ڈھونڈ لیں گے اور پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ نرملا کو یقین ہو چلا کہ اس کے بھرے ہوئے دِل کے پیالے کو پینے والا کوئی نہیں اور پھر جب اُس نے اپنے دِل کے پیالے کو خود ہی گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیا تو اسے لگا کہ ایک نچلی ہریاول کا ٹکڑا وہاں نہیں لگا ہوا تھا بلکہ قید ہوا ہوا تھا اور اُسے اس قید سے کوئی چھڑوا نہیں سکتا تھا اور نرملا جب نمی ہوا کرتی تھی، تب وہ تاروں کو نہیں دیکھا کرتی تھی بلکہ تاروں میں سے اپنے لیے تارا چنا کرتی تھی۔ سب سے بڑا تارا اور سب سے چمکتا ہوا تارا اور پھر جب وہ نرملا سے نمی بن گئی تب وہ مردوں میں سے اس مرد کا چہرہ ڈھونڈنے لگی تھی جو سب سے پیارا ہو اور سب سے چمکدار اور پھر وہ وقت آ چلا کہ جب نرملا کو محسوس ہونے لگا کہ اصل میں اُس کا اپنا تصور ہی وہ تارا تھا جو ستاروں بھرے آسمان پر سب سے بڑا تھا اور سب سے چمکدار بھی۔

نرملا جب بچی ہوا کرتی تھی، تب وہ سورج کی دُھوپ کو سینکا نہیں کرتی تھی، گھونٹ بھر کے ہی لیا کرتی تھی اور جس دن بڑے بادل آ جایا کرتے تھے۔ سورج نہیں نظر آتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سورج کو ایک خط لکھے اور پھر جب اُسے خط لکھنا آیا تو اسے پتہ چلا تھا کہ سورج کو خط نہیں لکھا جا سکتا تھا تب اُسے ایک ایسے چہرے کی تلاش ہوئی جو سورج سا ہو اور جب وہ اسے خط لکھے تو اسے لگے کہ اس نے سورج کو خط لکھا ہے۔ گلی سے پرے گھر کی چھت پر ایک لڑکا چھٹی والے دن میز پر کتابیں دھرے گھنٹوں پڑھا کرتا تھا۔ نمی کو وہ بہت خوب صورت لگتا تھا۔ وہ کبھی کبھار چھٹی والے دن پتنگ بھی اُڑایا کرتا تھا۔ ایک دن پتنگ اڑاتے میں وہ لگاتار نمی کو دیکھتا رہا اور پھر اُس نے ڈور کو ٹھنکا مار کے نمی کے کندھوں پر پھینک دیا تھا۔ نمی نے آہستہ سے اسے پکڑ لیا اور پنسل کے ساتھ ایک مختصر سا خط لکھا ''تم ہر روز وقت پر چھت پر ایسے آیا کرو جیسے سورج آیا کرتا ہے'' اور پھر دونوں کناروں سے پکڑے پتنگ کو اڑا دیا۔ لڑکے نے ڈور کھینچ لی اور پتنگ پر لکھا ہوا نمی کا سندیسہ پڑھ کے اُسے جواب میں ایک خط لکھا۔ اُس نے کاغذ کو پتنگ کے کنارے سے باندھا اور پتنگ کو اڑا دیا اور اسے لا نمی کے کندھوں پر پھینکا۔ نمی نے خط کھول لیا اور اسے لے اپنے کمرے میں جا کر پڑھنے لگی۔ خط نمی کے ہاتھوں سے گر پڑا۔ اس لڑکے کو خط لکھ کے نمی کو لگا تھا کہ اس نے سورج کو خط لکھا تھا لیکن اُس خط کا جواب پڑھ کر نمی کو لگا تھا کہ سورج کا پتہ غلط درج ہو گیا تھا کیوں کہ جواب میں جو خط آیا تھا وہ سورج کا نہیں تھا، وہ سکول جاتی لڑکیوں کے پیچھے جانے والے عام لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا خط تھا۔ نمی نے وہ خط پھاڑ دیا اور تب سے وہ گھر کی چھت پر اس وقت تک نہ گئی جس وقت تک اسے احساس ہوتا کہ اس دوسری چھت پر کوئی ہوگا.... اور پھر وہ وقت آ چلا کہ جب نرملا کو یقین آ گیا کہ کسی رومانٹک کہانی کا ہیرو'' کہانی میں سے اُٹھا کر اپنے ساتھ والی کُرسی پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔

لیکن جوانی کی عمر وہ عمر ہوا کرتی ہے جب ماضی زیادہ دور نہیں رہ جایا کرتا۔ انسان لحظہ بھر ٹھہر کے اُس کے بارے میں سوچنے لگتا ہے، تب وہ اچانک خاموشی سے اس کے قریب سے گزر کے آگے جا ٹھہرتا ہے۔ اور پھر مستقبل بن کے اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ نرملا کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

نرملا کے کالج کا ایک پروفیسر تھا۔ نرملا نے آنکھوں میں عزت بھر کے اس کی طرف دیکھا تھا لیکن پھر جب اُس نے اپنے نام کے ساتھ نرملا کا نام جوڑ کے بہت شوخ سی باتیں پھیلانا شروع کر دی تھیں تب نرملا اس کے لیے اپنے من میں رکھی عزت کے بارے میں سوچ کر حیران رہ گئی تھی۔

اور ایک دن کسی نے نرملا پر منتوں، سماجتوں کا اتنا بوجھ ڈال دیا تھا کہ اُسے اپنا آپ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا کہ اس کی وہ منتیں، سماجتیں خوف بننے لگی تھیں اور نرملا ان منتوں، سماجتوں کے خوف کا بھید جاننے کے لیے بالکل تنہا ہو کے رہ گئی تھی۔

تب نرملا کو محسوس ہوا تھا کہ عورت کو جیتنے میں یا پھر سمجھنے میں کسی مرد کی دلچسپی نہیں تھی۔ مرد کی دلچسپی محض عورت کو کھو دینے میں ہوتی ہے۔

ایک عمر ہوتی ہے، جب مرد اپنے آپ کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن پھر وہ وقت آجاتا ہے کہ جب اُسے خوشی کا جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اُداسی کا سچ بولنے لگتا ہے۔ نرملا بھی اپنے آپ کے ساتھ اُداسی کا سچ بولنے لگی تھی اور اس لیے اُس نے اپنے من کی ساری تلاش چھوڑ کے اپنی ماں کے کہنے پر چپ چپ بیاہ کروالیا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ مردوں کی شکلیں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں۔ سوچنے اور بولنے کا طریقہ کار سبھی کا ایک ہی جیسا ہوتا ہے اور پھر جب یہ ہی ایک جیسا ہوتا ہے تو پھر اوپر سے چہرہ کتنا ہی کوئی مختلف ہو.....

اور نرملا کے ہر احساس کو اپنے لیے قبر کھودنے کا ڈھنگ آگیا تھا۔ اُداسی جو منہ پر لٹکتی رہا کرتی تھی۔ نرملا کو احساس کی اُس لاش کی طرح رکھتی تھی جسے کوئی قبر میں ڈالنا بھول جائے۔ نرملا کو یہ اچھا نہیں تھا لگتا، اس لیے اُس کے چہرے پر بکھری اُداسی بھی کسی نے نہیں دیکھی تھی اور اُس کے ہر احساس نے یہ ڈھنگ سیکھ لیا تھا کہ وہ جب بھی مرجاتا اپنے لیے ایک قبر کھود لیا کرتا اور اپنی لاش کو اس میں چھپالیتا۔

نرملا نے تمام عمر کسی کو خط نہ لکھا۔ وہ جب بھی لکھنا چاہتی لکھ نہ سکتی۔ تب اُسے محسوس ہوتا کہ وہ خط مر گیا تھا وہ ایک کاپی میں نظمیں لکھنے لگ پڑی تھی۔ ہر نظم جیسے ایک قبر تھی۔ جس میں وہ ہر مردہ خط دبا دیا کرتی تھی۔

برسوں پر برس بیت گئے۔ نرملا نے اپنی نظم کبھی کسی کو نہیں دکھائی تھی اور اپنی کہانی کبھی اپنے آپ کو بھی نہیں سنائی تھی، لیکن آج انیس (۱۹) برس کا بیٹا اس کے پاس کھڑا تھا۔

''کیشور! تیجی، تمھاری دوست لڑکی ہے؟''

''دوست نہیں کہہ سکتا، محض واقف ہے.......''

''آج پھر اس کا خط آیا ہے پچھلے ہفتے بھی آیا تھا......''

''میں نے جواب نہیں دیا۔''

''کیوں؟''

''جواب دینے کا کیا فائدہ؟''

''ایک بار تم نے کہا تھا کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔''

''کہا تھا... لیکن ممی لگتا ہے کوئی لڑکی میرے دوست نہیں بن سکتی۔ سبھی کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں لیکن سب کے سوچنے، بولنے کا طریقہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے.... مَیں نے اُسے ایک خط لکھا تھا لگتا ہے اُسے سمجھ ہی نہیں آیا۔ آپ کو سناؤں؟ مَیں نے اسے لکھا تھا کہ تجھے خط لکھنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے گھر میں داخل ہو رہا ہو اور جہاں دروازہ کھٹکھٹانے کی بھی اُسے ضرورت نہ ہو، میرے کمرے میں اس وقت بیتھوون کا سنگیت بج رہا ہے اور میرے من میں ایک خواہش نرم نرم پیروں سے رقص کرتی ہے........ اور جواب میں اُسے جو خط لکھا وہ محض موسم کا حال تھا جیسے اُسی دروازے سے پلٹ آیا ہوں۔ وہ میرا گھر نہیں کوئی بیگانہ گھر ہوگا۔ اس طرح کسی کو خط لکھ کر کسی کو کھو دینے سے تو بہتر تھا میں کوئی نظم ہی لکھ لیتا......''

''کیشور...... نظم'' نرملا کے گلے میں سے اُس کی آواز یوں لڑکھڑا کر نکلی جیسے اُسے کہیں بڑی شدید چوٹ لگی ہو یا بہت پُرانا درد جاگ اُٹھا ہو.....''

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ:: قمر الزمان

کینی دا سفر

اخبار میں خبر ضرور چھپی ہے لیکن پولیس کی تحقیقات اور ڈاکٹر کی رپورٹ کے باوجود، یہ خبر غلط ہے.........

عنوان اور خبر کے بیچ جو کچھ ہوتا ہے، کسی نے بھی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہوتا، اس لئے ہر خبر کو لوگوں کا قیاس کہا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں۔ اور قیاس اکثر غلط ہوتا ہے۔

کینی اور اس کی خبر کے بیچ جو کچھ ہوا ہے میں اس کے پل پل کا گواہ ہوں....... کیونکہ جن دنوں وہ کسی اور سے باتیں نہیں کرتی تھی، ان دنوں وہ دیر تک میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ میرا مطلب ہے---- اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ اور ایسے دن اس کی زندگی میں بہت ہی کم آئے جن دنوں اس نے کسی اور سے باتیں کی ہوں۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اخبار میں کینی کی جو خبر چھپی ہے، وہ خبر غلط ہے۔ میں یہ حلفیہ بیان کرتا ہوں----

میں: کینی کے کمرے میں لگا ہوا کینی کے قد کے برابر آئینہ۔

میں نے کینی کا بچپن نہیں دیکھا، ابھرتی جوانی بھی نہیں۔ میں نے پہلی بار جب اسے دیکھا تھا وہ بھر پور جوان تھی اور اس کے فن کی شہرت عروج پر تھی۔ مگر اس کے جنم کے بارے اور اس کے شروع کے دنوں کے بارے میں میری جانکاری فقط اتنی تھی جتنی کہ وہ میرے سامنے بیٹھ کر نئے پرانے خطوط کو پڑھتی اور پھر بہت سی سوچیں اپنے ماتھے میں بھر کر وہ مجھ میں اپنا آپ دیکھا کرتی تھی۔

اس کی ماں ایک پولش ڈاکٹر تھی اور اس کا باپ ہندوستانی---- بنگالی میوزیشن۔ کبھی اس کی ماں ہندوستان آئی ہوگی، اس کے باپ سے شادی کر کے پھر ہندوستان ہی رہ گئی ہوگی۔ انہوں نے مل کر کوئی گھر بنایا ہوگا۔---- مگر جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں ان دنوں اس کا باپ ہندوستان میں تھا، مگر اس کی ماں

واپس پولینڈ جا چکی تھی۔ کبھی کبھی اس کی ماں کا خط آتا تھا، اور وہ اس خط کو میرے پاس بیٹھ کر دیر تک پڑھتی رہتی تھی۔ ایسے کئی خط میرے دیکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط میں ایک طویل خط مجھے بہت یاد ہے، ''میری کینی! تجھے جب بھی خط لکھتی ہوں، ہمیشہ لکھتی ہوں ''میری کینی'، اور یہ لفظ 'میری' لکھتے وقت میں ہمیشہ سوچ میں پڑ جاتی ہوں یہ پولینڈ میرے بچپن سے ہی مجھے 'میرا' لگا کرتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا جب ہندوستان، حقیقتاً میرا نہ ہوتے ہوئے، مجھے میرا لگنے لگا---- اور پھر وہ وقت آیا جب ہندوستان میرے لئے میرا نہیں رہا۔ میں نے سوچا تھا ہندوستان نہ سہی، مگر پولینڈ ضرور میرے لئے میرا رہے گا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اسے بھی میرا کہنے کے لئے مجھ میں کچھ نہیں رہا۔ اس لئے تمہیں، جسے بلاشبہ میں نے اپنے بطن سے جنم دیا ہے---- جب 'میری' کہتی ہوں، تب سوچ میں پڑ جاتی ہوں---- سوچتی ہوں---- اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ ہوتا جسے اپنے جیتے جی، ہمیشہ 'میرا' کہہ سکتی تو کم از کم ایسا ضرور ہونا چاہیے جسے ''میرا اپنا آپ'' کہہ سکوں۔ مجھے یہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ اگر مجھے تھوڑا سا بھی نصیب ہو جاتا تو میں ہندوستان سے کبھی واپس نہ آتی، تمہیں ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی، مگر جس کی خاطر میرا یہ اپنا میرا نہیں رہا، اسے روز وہاں ایک اجنبی، اور اجنبی، مزید اجنبی ہوتے ہوئے دیکھتے رہنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ پولینڈ واپس آ گئی ہوں، اس لئے نہیں کہ یہ ''میرا'' ہے، صرف اس لئے کہ یہ اس سے دور ہے۔ تو نے کئی بار مجھے لکھا ہے کہ میں زندگی میں دوبارہ کچھ دیکھنے کی امید کیوں نہیں کرتی؟ میرے پاس ابھی عمر، شکل، ہنر، شہرت، پیسہ، سب کچھ ہے لیکن ایک چیز بہت حد تک ختم ہو گئی ہے کینی! من کی امنگ ختم ہو گئی ہے۔ تیرے باپ نے وہاں کوئی اور عورت ڈھونڈ لی ہے، ٹھیک ہے، اس کی امنگ باقی ہو گی لیکن مجھ سے میری ساری امنگ خرچ ہو گئی ہے۔ ایک ہی بار خرچ ہو گئی ہے۔ میں مذہبی عورت نہیں۔ صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں ایک فضول خرچ عورت تھی، من کی ساری دولت ایک ہی بار خرچ کر ڈالی، اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بارشوں کے یہ دن صرف انسان کی بے مقصد زندگی میں آتے ہیں؟ یہ بڑے بھیانک دن ہوتے ہیں اگر کوئی میری بات سن لے تو میں کہوں کہ ان دنوں کے لئے اپنے دل میں امنگ باقی رکھنی چاہیے۔ دل کی دھڑکن بچا کر رکھنی چاہیے۔ اور دل کی دھڑکن کو تیز کرنے والا عشق بچا کر رکھنا چاہیے۔ عشق نہیں تو عشق کی امید ضرور بچا کر رکھنی چاہیے۔ لیکن میں کسی کو کیا کہہ سکتی ہوں---- اپنی یہ بات میں نے خود بھی نہیں سنی---- تمہاری بدنصیب ماں''

مجھے پتہ ہے کہ یہ خط کینی نے ایک بار نہیں کئی بار پڑھا تھا اور اس کے گلابی چہرے میں جو رنگ کئی بار

گھوما تھا، وہ اپنی ماں کے لئے ترس کا رنگ تھا، کسی گہرے درد کا رنگ نہیں تھا۔ اور جواب میں اس نے اپنی ماں کو جو خط لکھا تھا وہ انتہائی سادہ خط تھا کیوں کہ اس کو اپنی ماں کے خط کی زیادہ سمجھ نہیں آئی تھی۔ جو حادثہ اس کی ماں کی زندگی میں ہوا تھا۔ اسی طرح کا حادثہ اس کی اپنی زندگی میں بھی ہوا تھا۔ اس نے پچھلے دنوں شادی کی تھی۔ اور شادی کے بعد اسے پتہ چلا کہ اس کے شوہر کو اس سے زیادہ دلچسپی کسی اور عورت میں تھی۔ اور وہ اپنے شوہر سے الگ ہو کر، علیحدہ رہنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کو اپنی ماں کے خط کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ لیکن کینی نے لکھا تھا کہ اس کے دن کے چین اور رات کی نیند میں اس حادثے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ وہ ہنستی تھی، روتی تھی تو بھارتی ناچ کا فن اس کے جسم کے ایک ایک انگ میں چمک اٹھتا تھا۔

اس خط کے جواب میں کینی کو اس کی ماں کا جو خط آیا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ صرف اتنا کہ اس کی ماں کو اپنی بیٹی کے دل کی حالت پر رشک آ رہا تھا۔

کینی اس مختصر خط کو اپنے ہاتھ میں لئے، بہت دیر میرے سامنے بیٹھی رہی تھی اور پھر مسکرا کر اس نے میری طرف ---- اپنے مہین نقوش والے گورے گلابی چہرے کی طرف ---- دیکھا تھا، اور پھر آہستہ سے اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔ ''میں شاید اپنی ماں پر نہیں گئی۔ اپنی ماں جیسا من مجھے ورثے میں نہیں ملا۔''

میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے کینی کو جب دیکھا تھا، اس کی جوانی جوبن پر تھی۔ اور اس کے فن کی شہرت اپنے عروج پر تھی۔ اس لئے یہ ایک دن کی بات نہیں، روزانہ کا معمول ہے۔ میں دیکھتا تھا کہ دن بھر بیسیوں خط کینی کو آتے تھے، اس کے فن کی، اس کے حسن کی تعریفوں سے بھرے ہوئے۔ لیکن جس سستی اور بے دلی سے کینی ان خطوط کو پڑھتی تھی، وہ مجھے معلوم ہے۔ ان خطوط میں کچھ سیاہی کی جگہ خون سے لکھے ہوتے تھے۔ اور مجھے یاد ہے کہ کینی خون کی صورت سے گھبرا کر اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ کینی اکثر خطوط کے جواب نہیں دیتی تھی۔ لیکن کچھ ایسے سنجیدہ خط بھی ہوتے تھے، جن کا جواب کینی مٹھاس بھرے شکریے کے ساتھ لکھ دیا کرتی تھی۔

پھر کچھ دنوں بعد میں نے کینی کے چہرے پر واضح فرق دیکھا اس کے بعد کینی کو ایک ہی لگن میں دیکھتا آیا تھا، وہ دو گھنٹے رقص کا ریاض میرے سامنے کرتی تھی ---- اور پھر میں نے دیکھا وہ میرے سامنے کھڑی کھڑی سوچوں میں گم رہنے لگی تھی۔ جیسے ریاض کرتے ہوئے اس کا جسم تھک جاتا ہو۔ شاید یہ تھکاوٹ نہیں اکتاہٹ ہوا کرتی تھی۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ کیا سوچتی تھی ---- اس نے میرے سامنے کھڑے ہو

کر دیر تک اپنی آنکھوں میں دیکھا (میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں، بڑی بڑی، کالی بنگالی آنکھیں) پھر ایک گہرا سانس بھر کر وہ اپنی ماں کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط لکھ کر لفافے میں ڈالنے کے بجائے اس نے وہ خط سامنے رکھ لیا اور پاس پڑے ہوئے گدے کے ساتھ ٹیک لگا کر دیر تک اپنے لکھے ہوئے خط کو پڑھتی رہی ---- "ماں! کبھی تو نے مجھے لکھا تھا کہ تجھے مجھ پر رشک آتا ہے۔ ایک عجیب اکتاہٹ، نمی کی طرح مجھ میں سرایت کر گئی ہے۔ میرے کمرے میں ایک سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا ہے ---- گہرے سرخ رنگ کا ---- اور مجھے لگتا ہے کہ میرے خیال کا سارا رنگ میرے ماتھے سے اترتا ہے، میرے ہونٹوں میں سے اترتا ہوا، میرے دل میں اترتا ہے، پھر اترتا اترتا میرے پیروں سے اترتا، اصل میں میرے پیروں کے نیچے آ گیا ہے اور روز پیروں میں مسلا جاتا ہے۔ میری عمر مجھے بھوسے جیسی لگنے لگی ہے۔ باہر سے عمر کہیں نظر نہیں آتی اور نہ ہی اندر سے کہیں ---- اور کھوئے ہوئے رنگوں کے ساتھ ان کی علامات بھی کھوئی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ماں! کیا رنگ حقیقت میں کھو گیا ہے؟ یا کہیں گہری نیند سو گیا ہے؟ کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر اس کی موجودگی کہیں ضرور رہتی ہے ---- کچھ بوجھ سا میرے ماتھے میں پڑا ہوا لگتا ہے۔ زندگی میں لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، روز پڑتا ہے، میں ایک مشہور رقاصہ ہوں، اس لئے عام عورت کی زندگی کی طرح کبھی کوئی 'وہ' نہیں ملا جسے دیکھ کر میرے حسن کا یہ رنگ جاگ جائے۔ شاید میرے اندر کوئی رنگ نہیں۔ مجھے صرف اس کا شک ہے۔ زندگی سے جی بھر گیا ہے لیکن ایک درد کو ترس گئی ہوں ماں! جس درد کو جھیلتے جھیلتے تیری عمر رائیگاں گئی ہے، میں اس درد کو ترس گئی ہوں۔ میری عمر بھی رائیگاں گئی ہے، لیکن اپنے ہی ہاتھوں سے، کاش! کہیں یہ کسی درد سے بتا سکتی!"

اس خط کے جواب میں کینی کو ماں کی طرف سے جو خط موصول ہوا وہ بہت مختصر سا تھا۔ لیکن بڑے خوف سے بھرا ہوا تھا۔ لکھا تھا: "کینی! میں نے زندگی میں کبھی کسی خدا سے دعا نہیں کی۔ تیرا خط پڑھ کر میں دعا کر رہی ہوں کہ جو مقدر تو اپنے لئے مانگ رہی ہے، کہیں یہ مقدر تجھے مل نہ جائے۔"

یہ خط پڑھ کر کینی کا منہ دیکھنے والا تھا۔ بڑا معصوم لیکن زندگی کی تشنگی سے بلکتا ہوا ---- اور جلدی سے میرے سامنے کھڑے ہو کر، اس نے اپنا ماتھا مجھ میں نظر آنے والے اپنے ماتھے سے جوڑ کر کہا۔ "اے خدا! میری دعا سننا میری ماں کی نہیں۔"

مجھے کیا معلوم کہ اس دن میں نے کینی کا جو بچوں جیسا بھولا چہرہ دیکھا، وہ چہرہ پھر کبھی مجھے دیکھنا

نصیب نہیں ہوگا۔ یہ ایسے تھا جیسے کسی بچے نے آگ کے سرخ شعلے دیکھ کر اپنے دونوں بازو اس کی طرف بڑھا دیے ہوں۔ اور ادھر سے رب نے لاڈ سے آگ کے وہ سرخ شعلے اس بچے کے ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

ایک دن جب کینی نیم خوابیدہ اٹھ کر بیرونی کمرے میں آئی۔ وہاں، جہاں میں تھا میرے سامنے کھڑی ہو کر اس نے اپنی نیند سے اٹی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں گھٹی گھٹی تھیں---- نظر آ رہا تھا کہ رات وہ اچھی طرح نہیں سوئی تھی۔ اور نظر آ رہا تھا رات کو اس کی نیند میں جس چہرے کے خیال نے خلل ڈالا تھا، وہ وہی تھا جسے کل رات کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کل رات کو رقص سے واپسی پر، جو اسے گھر چھوڑنے آ گیا تھا، وہ کچھ دیر اندر آ کر کمرے میں بیٹھا تھا، اس لئے میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ یہاں سے اٹھ کر ایک بار وہ باروچی خانے میں گیا تھا اور پھر پانی کے دو گلاس لا کر ایک اس نے خود پینا شروع کر دیا تھا اور ایک اس نے بڑی بے تکلفی سے کینی کے سامنے رکھ دیا تھا۔ گھر کینی کا تھا، پانی کینی کو پوچھنا چاہیے تھا اور لے کر آنا چاہیے تھا، لیکن کینی کی جگہ جب اس، باہر سے آنے والے نے---- پانی کا گلاس لا کر کینی کے سامنے رکھ دیا، تب کینی کچھ پریشان سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بالکل پریشان نہیں تھا، اس کے برعکس اس نے پانی کا گلاس رکھتے ہوئے کہا تھا ''مجھے پیاس لگی ہوئی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ آپ کو بھی پیاس لگی ہو گی۔'' کینی نے کچھ نہ کہا، پانی پی لیا تھا۔ لیکن جب وہ چلا گیا تھا تو کینی پھر پریشان سی ہو گئی تھی۔ پھر وہ اندر والے کمرے میں سونے کے لئے چلی گئی تھی۔ آج صبح وہ جب اٹھ کر آئی تو اس کی آنکھوں میں رات کی بے چین نیند کی سیاہی تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑی ہو کر اپنی آنکھوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے خود ہی رات والے الفاظ کو ہونٹوں میں دہرایا ''مجھے پیاس لگی ہوئی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ آپ کو بھی پیاس لگی ہو گی'' ایک بار کینی کے ماتھے پر ہلکی سی سلوٹ پڑ گئی---- جیسے وہ سوچ رہی ہو---- اس کی پیاس سے اپنی پیاس ملانے والا وہ کون ہوتا تھا؟ لیکن وہ مسکرائی۔ اس کے ہونٹ نہیں اس کے ماتھے کی سلوٹ مسکرائی۔ اور جو بات اس نے رات کو جواب میں نہیں کہی تھی، اب اکیلے کھڑے ہو کر کہی، ''تجھے جب بھی پیاس لگے گی تو پانی کا گلاس پیئے گا، کیا تجھے ہر بار یاد آ جائے گا کہ مجھے بھی پیاس لگی ہوئی ہو گی.........؟''

اس کے بعد وہ کئی بار کینی سے ملنے کے لئے آیا۔ پہلے دن مجھے اس کا نام پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن دوسرے دن معلوم ہو گیا تھا کیونکہ نوکرانی نے جب اندر آ کر کہا تھا کہ کوئی جاوید صاحب ملنے کے لئے آئے ہیں۔ اس وقت میرے پاس بیٹھ کر کتاب پڑھتے ہوئے کینی چونک گئی تھی۔ اور پھر اندر آنے والا وہی تھا جو میں

نے اس سے پچھلے دن دیکھا تھا۔ دو دن نہیں گزرے تھے کہ میں نے اسے پھر دیکھا، اور پھر دیکھا۔ کینی جب ایک بار اکیلی میرے سامنے کھڑی ہوئی، تب اس کے چہرے پر ڈوبتے چڑھتے رنگ کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا----اس کا ماتھا بھی ضرور ٹھنکا ہوگا! میں حیران تھا کہ آج تک اس نے اپنے کسی بھی جاننے والے کو اپنے گھر آنے کی ڈھیل نہیں دی تھی، لیکن یہ 'کوئی' کس طرح کا تھا جس کے سامنے کینی سے کوئی بہانہ نہیں بنایا جا رہا تھا۔

اور پھر اس دن میرا ماتھا مزید ٹھنکا، جس دن اس نے کینی کو بتایا کہ وہ پندرہ دنوں کے لئے شہر سے باہر جا رہا تھا اور اس کے جانے کے بعد کینی نے بے چین ہو کر انتظار کے دن انگلیوں پر گننے شروع کیے۔ ''مائی گاڈ، اٹ ہیز ہیپنڈ'' کینی نے میرے سامنے کھڑے ہو کر ایک بار کہا اور پھر حیران ہو کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اس شہد جیسی تھی جس کی مٹھاس میں شہد کی مکھی کا ڈنگ بھی ملا ہوا تھا۔

''اری کینی...... '' پتہ نہیں میں نے کہا کہ اس نے، اس کے ہونٹ اصل میں میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہی ہونٹوں پر کسی کے ہونٹوں کے پیار کو اپنے پچھتاوے میں دہرا کر دیکھ رہے تھے----وہ ابھی باہر سے آئی تھی وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا----یہ پچھلے سال کے کسی مہینے کی بات ہے----اس نے باہر سے آتے ہی کمرے کا دروازہ بند کر کے، سب سے پہلے جو بات کی تھی، وہ میرے سامنے کھڑے ہو کر، خود کو دیکھا تھا، اپنے آپ کو آواز دی تھی، اور پھر پیار سے اپنے ہونٹوں سے ہونٹ مس کیے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اپنے آپ کو ہی آواز دینے کی عادت اسے اسی دن پڑی تھی۔ اس سے اگلے تین سو پینسٹھ دنوں میں اس نے کوئی تین ہزار پینسٹھ بار اپنے آپ کو آوازیں دی ہوں گی۔ اس طرح جیسے اس کا اپنا آپ اس سے جدا ہو رہا ہو۔ پرایا ہو رہا تھا اور پرائے ہوتے ہوئے خود کو کبھی چین سے دیکھتی اور کبھی بے چینی سے۔ ایک دن اس نے انتہائی کھولتے ہوئے غصے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ پہلی شام وہ آیا تھا تو کینی نے اسے جھولی پھیلا کر کہا تھا کہ وہ اپنے دفتر میں اب اس سیکرٹری لڑکی کو نہ رکھے، جس سے پہلے کبھی کوئی اس کے مراسم تھے۔ اور کینی نے اسے بڑے نرم لہجے میں کہا تھا کہ اس سے ملنے سے پہلے اس کا جو کچھ بھی کسی لڑکی سے رشتہ تھا، اس کا کوئی شکوہ وہ اس سے کبھی نہیں کرے گی۔ لیکن اب ان کو بیتے ہوئے کی یاد دلانے والی کوئی چیز خواہ مخواہ سامنے نہیں رکھنی چاہیے۔ اس نے کینی کی مانگ کو بڑی بے پروائی سے جھٹلا دیا تھا اور کہا تھا کہ اس لڑکی کے بغیر اس کے دفتر کے کام کا بڑا حرج ہوگا۔ اس کے سامنے تو نہیں مگر اس کے جانے بعد کینی بہت روئی تھی۔ اس رات وہ اپنے اندر

والے کمرے میں اپنے پلنگ پر سونے کے لئے بھی نہیں گئی تھی۔ باہر قالین پر ہی الٹی پڑی پڑی سوگئی۔ صبح اٹھ کر اس نے نوکرانی سے خاص طور پر کہا کہ آج خواہ کسی کا فون بھی آئے وہ اسے بلانے اندر نہیں آئے گی۔ فون باہر والے برآمدے میں تھا۔ لیکن دو پہر کے بعد وہ خود ہی دروازے کے پاس کھڑی ہو کر فون کی آواز کا انتظار کرنے لگی تھی۔ یہ وہ دن تھا جب اس نے رات کے وقت بہت کھولتے غصے میں میرے سامنے کھڑی ہو کر، اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ اس دن وہ اپنے آپ سے بہت ناراض تھی۔

اس کا یہ غصہ تیسرے دن اتر گیا۔ تیسرے دن وہ آیا اور اس نے آتے ہی کینی سے کہا کہ آج اس نے اپنے دفتر کی سیکرٹری کو دو ماہ کی پیشگی تنخواہ دے کر فارغ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے کینی سے وعدہ بھی کیا کہ وہ کوئی لڑکی۔۔۔۔سیکرٹری اب اپنے دفتر میں نہیں رکھے گا۔

لیکن غصہ شاید بدلے کا بخار تھا، عجیب سے بدلے کا بخار، اب وہ کینی سے جاوید کو چڑھ گیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ کینی کو انگلینڈ کے ایک کلب کی طرف سے دعوت نامہ آیا تھا۔ کینی کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کا یہ پہلا موقع تھا اور کینی خوش تھی۔ کچھ اسے یہ امید تھی کہ وہ انگلینڈ سے آسانی سے پولینڈ جا سکے گی اور اپنی ماں سے مل سکے گی۔ لیکن جب کینی نے پاسپورٹ کے لئے فارم بھرا تو فارم کی خانہ پری کے لئے اسے اس کے شوہر کا نام بھی لکھنا پڑا۔ بلاشبہ وہ کئی سال سے اکیلی رہ رہی تھی لیکن اس نے ابھی تک طلاق نہیں لی تھی۔ اس لئے اس فارم کی خانہ پری کے لئے اسے اس آدمی کا نام اس میں لکھنا پڑا تھا، جس کے ساتھ کبھی اس کی شادی ہوئی تھی اور جاوید نے جب یہ فارم پڑھا تو فارم میں نام دیکھ کر وہ لال پیلا ہوا۔ ''میں یہ نام بالکل برداشت نہیں کر سکتا'' اور اس نے غصے میں آ کر فارم پھاڑ دیا۔

کینی اور فارم لا سکتی تھی۔ پُر کر سکتی تھی، لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کینی کے قدم ایک نازک موڑ پر آ کر رک گئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ جاوید کی غیر حاضری میں مزید فارم لائے گی، بھرے گی، اور پاسپورٹ بنوا کر انگلینڈ چلی جائے گی تو جاوید کو وہ ہمیشہ کے لئے کھو دے گی۔ اس کا سوچتا ہوا چہرہ میں سارا دن دیکھتا تھا، اور دیکھتا تھا کیا ہے ایک لمحے وہ جاوید کو کھونے کا حوصلا اکٹھا کرتی تھی، تو دوسرے لمحے ریت کے بنے محل کی طرح اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی۔

وہ انگلینڈ نہیں گئی تھی۔ جاوید کبھی بھی اس روٹھی خوشی کو نہیں مناتا تھا۔ لیکن زیادہ دفع یہ کینی کو منانی پڑتی تھی۔ اور پھر ہوتے ہوتے یہ بات صرف کینی کے لئے ہی رہ گئی تھی۔ باہر والے دروازے اور باہر والی

سڑک تک دوڑتے ہوئے، اور ناراض ہو کر جانے والے جاوید کو منا کر لاتے ہوئے، میں نے کینی کو کئی بار دیکھا۔ ایک دن کینی روئے جا رہی تھی۔ اتنا کہ وہ پاس سے اٹھ کر جاتے ہوئے جاوید کو کچھ نہ کہہ سکی۔ جاوید چلا گیا۔ کینی روتے روتے بھی اس کے واپس آتے پاؤں کی آواز کا انتظار کرتی رہی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ جاوید اسے ایسے روتے ہوئے چھوڑ کر نہیں جا سکے گا۔ دروازے سے واپس آ جائے گا۔ باہر والی سڑک سے واپس آ جائے گا لیکن جاوید نہیں آیا۔ کینی کی وہ رات اس کی عمر پر بھاری ہو گئی تھی۔ یہ شادی وہ رات جب کینی کا اپنا آپ، اپنی ہی نظروں میں ہلکا ہوتا گیا۔ دوسرے دن جب خود ہی اس نے جاوید کو فون کرنے کی پہل کی، اور پھر جاوید جب آیا، اس نے کل رات والی بات ہنسی میں ٹال دی اور کینی نے چپ چاپ وہ بات ٹل جانے دی، پھر جب اس نے جاوید کو منانے کا کوئی اور موقع خالی نہ جانے دیا اور پھر........ اور پھر........

ان تین سو پینسٹھ دنوں میں کینی نے کوئی تین ہزار پینسٹھ بار میرے سامنے کھڑے ہو کر کینی کو آوازیں دیں۔ ''اری کینی!........ وہ کبھی بے چینی سے آواز دیتی اور کبھی ترس سے، کبھی پیار سے، کبھی نفرت سے........

ان دنوں میں کینی نے اپنی ماں کو کئی خط لکھے، لیکن کوئی خط ڈاک کی نظر نہیں کیا۔ جس لمحے وہ خط لکھتی، اگلے ہی لمحے اس کے دل کا موسم بدل جاتا اور وہ خط اسے بے معنی لگنے لگتا۔ موسم دل کے اختیار میں نہیں تھا دل موسم کے اختیار میں تھا۔ جاوید اسے خوش ملتا وہ خوش ہو جاتی ایک تار کی طرح وہ کسی رہتی، کانپتی رہتی۔ جاوید کا جی کرتا تو وہ اس تار میں سے سوئے ہوئے گیت جگا لیتا۔ جاوید کا دل کرتا وہ اس تار میں سے بلکتے ہوئے سر نکال لیتا۔

کینی کو جاوید سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اس نے کینی کو وہ خوشی دی تھی، جو کینی کو کوئی اور نہیں دے سکا۔ اس نے کینی کو وہ درد دیا تھا، جو کینی کو کوئی نہیں دے سکا۔ وہ خوشی کو منکے کی طرح سنبھالتی پھرتی، سانپ کی طرح اکیلی بیٹھ کر اس سے کھیلتی۔

کینی کو سکیچنگ کا شوق تھا، ایک بار اس نے ایک بڑی خوبصورت کاپی پر جاوید کا ایک سکیچ بنایا۔ جاوید کو دکھایا۔ جاوید کو اچھا لگا اور دوسرے صفحے پر اس نے اپنی پنسل سے کینی کا سکیچ بنا دیا۔ جاوید کی ڈرائینگ کینی سے بھی زیادہ اچھی تھی۔ پھر اس کاپی پر انہوں نے کئی سکیچ بنائے۔ ایک بار وہ پانچ دنوں کے لئے پہاڑ پر گئے تھے، وہاں انہوں نے پہاڑی جھرنوں کے کئی سکیچ بنائے۔ پھر اپنی پسند کی نظمیں چنیں اور اس کاپی میں لکھیں

اس کا پی کو وہ اپنی بیٹی کہتے تھے۔اس کا نام انہوں نے عطیہ رکھا ہوا تھا۔اس عطیہ کو وہ پیار سے آتی بلاتے تھے اور قسمت والے خوش لمحوں میں جاوید کینی کو'' آتی۔ماں'' کہہ کر پکارتا تھا اور کینی جاوید کو'' آتی۔پا'' کہہ کر۔

اداس راتوں میں کینی کو ایک بھیانک خواب آتا تھا ایک دن اس نے میرے پاس بیٹھ کر جاوید کو بتایا تھا کہ وہ جب اداس ہوتی تھی تو رات خواب میں ان کی بیٹی مرجاتی تھی----آتی کا ورق ورق پھٹ جاتا تھا ان کی بیٹی کا ایک ایک حصہ کٹ جاتا تھا۔

خوشی کو آئے دن روٹھنے کی عادت پڑ گئی تھی اور کینی کو آئے دن منانے کی ،لیکن ایک دن ایسا بھی آ گیا کہ کینی اسے مناتے مناتے آپ ہی روٹھ گئی۔کسی سے نہیں اپنے آپ سے۔جاوید کے پاس ان دنوں میں کوئی اس کے دور کے رشتہ داروں کی بھابھی آ کر رہنے لگ پڑی تھی۔جاوید کے اس بھائی سے اس بھابھی کو طلاق لئے کئی سال ہو چکے تھے یہ بھابھی کینی کو اچھی نہ لگی۔ایک بار جاوید اس کو کینی کے گھر ساتھ لایا تھا۔اور اس بھابھی نے ایک عجیب سے انداز میں جاوید کی تعریف کرتے ہوئے اسے کہا تھا،''یوٗر سمائل از ہانٹنگ''----اور اس دن اس نے کینی ہی کے گھر کینی کی موجودگی کو آنکھوں سے اوجھل کر کے دیکھا تھا کینی کو اگر کوئی دعوی تھا تو جاوید پر اسے کسی تیسرے سے کوئی شکوہ نہیں تھا اور اس دن کینی اس بات سے زخمی ہو گئی تھی کہ جاوید کو اس بھابھی کے کسی رویے سے کوئی شکایت نہ تھی۔اور اب یہی بھابھی جاوید کے پاس رہنے کے لئے آ گئی تھی۔''اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا.......مجھ سے یہ بات کس لئے چھپالی.......'' کینی کا پرانا زخم ہرا ہو گیا کیونکہ آج اچانک اسے یہ بات جاوید کے نوکر سے معلوم ہوئی تھی۔اور پھر جب کینی نے جاوید کو فون کیا تو جاوید نے ہنس کر کینی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔''ایسے ہی نہ بولتی جایا کر----یہ میں نے تجھے اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تجھے خواہ مخواہ تکلیف ہوگی''

''ایسے ہی نہ بولتی جایا کر........'' کینی نے میرے سامنے کھڑے ہو کر کئی بار یہ الفاظ اپنے آپ سے کہے۔اس کی آنکھیں بھر آتیں تھیں اور یہ الفاظ اس کے ہونٹوں میں بار بار سسکیاں لے رہے تھے، ''کینی.......تو میری بات کیوں نہیں سنتی.........تم ایسے ہی بولے جاتی ہو---'' اور پھر کینی اپنے آپ کو چپ کراتے کراتے حواس کھو بیٹھی۔جاوید وہاں نہیں تھا،لیکن وہ کمرے میں کھڑی جاوید سے باتیں کرنے لگی''تم سمجھتے کیوں نہیں----میں ایسے ہی بول رہی ہوں؟ کبھی کسی کو ویسے ہی درد ہوتا ہے؟ چھاتیوں میں سے رونا ایسے ہی آتا ہے؟ تو میرے ساتھ ٹھیک سے نہیں بولتا،میری آدھی جان نکل جاتی ہے،کبھی کسی کی آدھی

جان ایسے ہی نکل جاتی ہے؟.........

اور حواس باختہ کینی چپ ہونے کے بجائے مزید بولتی گئی۔ پھر اس نے جاوید کو فون کیا----اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جاوید کو اس کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز سن کر ہمیشہ ہی غصہ آجاتا تھا، آج بھی آگیا اور اس نے ایک ہی لفظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ یہ لفظ اس کے کانوں میں گھونج اٹھا۔کینی نے چونک کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور پھر بلک کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑ گئے تھے۔ان آنکھوں سے وہ اپنی آنکھوں کو دیکھ کر چیخ پڑی۔''شٹ اپ....... کینی شٹ اپ.......''

یہ جاوید کا کہا ہوا لفظ تھا، کینی نے حکماً مان لیا اور کینی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جاوید سے اتنی دور چلی جائے جہاں سے جاوید کو کبھی اس کی آواز نہیں آسکے گی۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلی جائے گی........

مجھے معلوم ہے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کینی نے میرے پاس بیٹھ کر اپنی ماں کو خط لکھا کہ میں جلد پولینڈ آرہی ہوں اور پھر ہمیشہ وہیں رہوں گی۔کینی نے یہ خط لفافے میں ڈالا میرے سامنے ٹکٹ لگائی اور پھر نوکرانی کو بلا کر یہ خط ڈاک خانے میں ڈالنے کے لئے دے دیا۔

کینی کے پاؤں اُس دھرتی سے رشتہ توڑ چکے تھے جس دھرتی پر کھڑے ہو کر اس کی آواز جاوید تک جاسکتی تھی۔ وہ جلدی سے پاسپورٹ کے دفتر گئی اور وہاں سے وہ فارم لے کر آئی جو کہ پاسپورٹ کے حصول کے لئے ضروری تھا اور کینی نے وہ فارم میرے پاس بیٹھ کر پر کیا۔

پولینڈ پہنچنے کا، راستہ بہت لمبا تھا۔لیکن کینی کے پاؤں بہت جلدی میں تھے، رکتے ہی نہ تھے۔ رات ہوتی جارہی تھی اور جیسے جیسے رات کا اندھیرا بڑھ رہا تھا، کینی کو ایک سوچ آرہی تھی۔'' جانے میں بہت دن لگ جائیں گے...... بہت دن...... اتنے دن تم چپ نہیں رہوگی......

ایک کینی وہ تھی جو شاید کبھی چپ نہیں رہ سکتی تھی ایک کینی وہ تھی جس کے پاؤں دھرتی کے اس گڑھے سے بہت دور چلے جانا چاہتے تھے، ایک کینی وہ تھی جس کے پاؤں اسی جگہ جمے ہوئے تھے۔ایک کینی وہ تھی جس کا سر فخر سے بلند تھا اور وہ اس فخر پر ساری دنیا کی دولت لٹا سکتی تھی۔ایک کینی وہ تھی جس کا سر محبوب کی دہلیز پر جھکا ہوا تھا، اور وہ محبت کی ایک بوند کے لئے جھولی پھیلا کر کھڑی ہوسکتی تھی۔

کینی کو جانا تھا، ضرور جانا تھا، جو کچھ بھی اس کے راستے میں کھڑا تھا، اس سے گزر کر جانا تھا۔
کینی راہ سے ہٹتی نہیں تھی۔ اس لئے کینی نے رات سوتے وقت کمرے کے سارے دروازے

اچھی طرح بند کر لئے پولینڈ سے ماں کی بھیجی ہوئی کونیاک کی بوتل نکالی، اس نے ایک ایک گھونٹ کو اس طرح پیا جیسے وہ ماں سے باتیں کر رہی تھی --- یہ کونیاک اس نے دو گلاسوں میں ڈالی تھی، ایک گلاس اپنے حصے کا ایک ماں کے حصے کا۔ وہ ایک کے بعد دوسرے سے گھونٹ بھرتی رہی۔ نیند کی گولیاں آج اس کے پاس صرف دو تھیں۔ اور پھر کینی نے جھوم کر میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور پھر کہنے لگی ---''تم میرے راستے میں نہیں آ سکتے... پیچھے ہٹ...... مورکھ......''

اور پھر اس نے کمرے میں پڑی ہوئی ''عطیہ'' کا ایک ایک ورق پھاڑا۔ آتی ماں نے اپنی بچی کا ایک ایک انگ چوما---

تو نے یتیم ہو جانا تھا آتی! میرے بعد..... ''اس نے کہا اور پھر مسکرا پڑی۔ اور پھر کمرے میں رکھی ہوئی گیس کو کھلا چھوڑ کر وہ سو گئی۔

☆☆☆☆
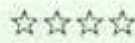
بھارت نا ٹیم کی پر مہارت ڈانسر کینی تارا نے کل رات خودکشی کر لی، اخبارات میں یہ خبر چھپی ہے، لیکن باوجود پولیس کی تحقیقات کے اور ڈاکٹروں کی رپورٹ کے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ خبر غلط ہے۔ کینی نے کبھی مرنا نہیں چاہا، ہمیشہ زندہ رہنا چاہا ہے۔ کینی کو پولینڈ جانا تھا، لیکن جانے میں بہت دیر تھی، اس لئے وہ کسی اور دیس سدھار گئی ہے اور عشق میں پاگل ہوئی ایک کینی اس کے راستے میں بیٹھی ہوئی تھی، اس کو اس نے بڑی مشکل سے راستے تے ہٹایا ہے۔

☆☆☆☆
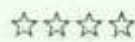
امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد اعجاز

تہہ خانہ

ہوا کچھ تیز سی ہوگئی۔۔۔

شاید اس لیے کہ ہوا میں تمہارا سانس ملا ہوا تھا۔۔۔

اور ہوا کے سینے میں کھڑے ہوے درختوں کے پتے دھڑکنے لگ پڑے۔۔۔

میں، ہڈیوں اور ماس کی ایک عمارت، ایک عرصہ خاموش کھڑی رہی۔

پھر جیسے خود ہی اپنے وجود میں سے باہر آئی ہوں۔۔۔

میں نے باہر کے راستے کی جانب دیکھا۔

تم باہر کے راستے سے گزر رہے تھے۔

راستے کے اوپر سے کئی لوگ گزرتے ہیں، مگر اس طرح نہیں۔

تم اس کے اوپر یوں مٹک مٹک کر چل رہے تھے، جیسے تمہارے پاؤں اس راستے سے باتیں کر رہے ہوں۔۔۔

تم نے معلوم نہیں اسے کیا کہا۔۔۔ کہ راستے کی مٹی کا رنگ گلابی سا ہو گیا۔۔۔

اور پھر میں کتنے دن اس کی جانب دیکھتی رہی۔۔۔

اور پھر میں نے ایک دن دیکھا۔۔۔

تم باہر کے دروازے کے سامنے درخت کے نیچے کھڑے ہوے تھے۔

اس درخت کا خیال ہے۔۔۔ کہ اس دن اسے پہلی بار بور لگا تھا۔

اور میں کئی دن اس درخت کے بور کو دیکھتی رہی۔

ایک دن بہت گرم دوپہر تھی۔۔۔

تم آئے، اور باہر کے دروازے کے سامنے ایسے کھڑے ہو گئے، جیسے اس دروازے سے تم پانی کے کسی کنویں کا راستہ پوچھ رہے ہو۔

دروازے نے گھبرا کر ایک بار تمہاری طرف دیکھا، پھر میری طرف۔اور دروازے کے اندر گھر کی چوکھٹیں تھیں۔۔۔

تم نے چوکھٹوں پر نظر ڈالی، ان کے سوئے نصیب جاگ پڑے۔اور پھر میں نے اندر جا کر گھڑے میں سے پانی کا ایک کٹورا بھرا۔اور تم نے چپ چاپ اندر آ کر پانی کا کٹورا پی لیا۔

معلوم نہیں تم کہاں سے آتے تھے، کہاں جاتے تھے، صرف اتنا معلوم تھا کہ میرا گھر تمہارے راستے میں پڑتا تھا اور تم جب بھی وہاں سے گزرتے تھے، تمہیں پیاس لگ جاتی تھی اور میں پانی کا کٹورا بھر کر تمہارے سامنے رکھ دیتی تھی۔

'میرا نام یوریفس ہے' ایک دن تم نے پانی پیتے ہوئے بتایا تھا۔

مجھے یوں لگتا تھا۔۔۔تمہارے آنے کے وقت کوزہ ہمیشہ پانی سے لبالب رہتا تھا، اور تمہارے چلے جانے کے بعد ہمیشہ خشک کٹورے کی طرح ہو جاتا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔۔۔تمہارے خشک گلے ایسا ہو جاتا تھا۔۔۔

میں۔۔۔تین منزلہ عمارت ہوں۔

تم نے صرف ایک منزل دیکھی تھی، دوسری منزل، اور ایک دن جب تم نے کہا۔۔۔پانی پیتے ہوئے۔۔۔اچانک تم دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگ پڑے تھے۔

تمہیں شاید پیاس کے ساتھ ساتھ کچھ بھوک بھی تھی، اور شاید تم نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وجود کی بھوک کو مٹانے والی چیز دوسری منزل پر تھی۔تم نے سیڑھیوں کی جانب دیکھا، تو میں بھی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگ پڑی۔

اور سیڑھیاں چڑھتے جب تم نے اپنا قدم سیڑھیوں کی دیوار پر رکھا۔۔۔تو میری پسلی میں سے ایک

کپکپاہٹ سی گزرتی گئی۔

سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد سامنے۔بیلوں سی ڈھکی ہوئی بالکونی ہے اور سونے والا کمرہ۔

تم بیلوں سی ڈھکی ہوئی بالکونی میں کھڑے ہو گئے اور میں لکڑی کے گھٹے کو جلانے لگ پڑی تھی۔پھر ٹھنڈی روٹی کو گرم کرنے لگی کہ تم پہ نظر پڑی۔

او خدایا! تمہارے چہرے پر تپش آرہی تھی۔شاید تمہارے چہرے پر آگ کی لاٹ کا عکس پڑ رہا تھا۔۔۔

جلتی لکڑیوں میں سے کچھ چنگاریاں نکل کر میرے پاؤں کے قریب آ پڑی تھی۔

پاؤں میں ایک ٹیس سی اٹھی، لیکن میں نے چنگاریوں کو اپنے پاؤں کے تلووٴں سے روند ڈالا تھا۔

گرم روٹی تمہارے سامنے رکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اور میں نے دیکھا۔۔۔روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے تمہارے ہاتھوں کی انگلیاں بھی کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنی کپکپاہٹ اپنے وجود کے اندر چھپالی تھی۔تم ایک عرصہ میری طرف دیکھتے رہے۔۔۔جیسے میرے وجود میں چھپی اس کپکپاہٹ کو ڈھونڈ رہے ہو۔۔۔

وجود کی کپکپاہٹ کو شاید نظروں سے نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔۔۔تم نے زور سے مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔۔۔یوں اپنے وجود کی کپکپاہٹ سے میرے وجود کی کپکپاہٹ کو ڈھونڈ لیا۔۔۔

لکڑی کے گٹھوں میں ابھی تک آگ جل رہی تھی۔۔۔اور اس کی لاٹوں کے سائے ہمارے چہروں پر پڑ رہے تھے۔۔۔

تین منزلہ عمارت کے نیچے۔۔۔ایک تہہ خانہ ہے۔کسی کو نظر نہیں آتا، مگر ہے، اور اس دن جب تم چلے گئے، رات کو میں نے اپنی عمر کا بیسواں سال اپنے وجود سے اتار کر اس تہہ خانہ میں رکھ دیا۔سوچتی تھی۔۔۔تم جب چاہو گے، تمہیں نکال کر دکھادوں گی۔۔۔تمہاری امانت۔۔۔

آواز کی ایک لکیر سی۔۔۔جو سیدھی سینے میں سے نکل کر میرے گلے میں سے گزرتی تھی۔۔۔اور پھر میرے لبوں کے قریب آ کر چھوٹے چھوٹے دائروں میں بدل جاتی تھی۔یو۔۔۔رے۔۔ ن۔۔۔س۔۔۔

اور میری آواز میرے لبوں سے نکل کر میرے کانوں میں چلی جایا کرتی تھی، مگر۔ایک مدت تک میرے لبوں پر ہی پڑی رہتی تھی۔۔۔

میرے اندر ایک مقام پر۔۔۔بائیں طرف۔۔۔معلوم ہوتا تھا جیسے آگ سی جل رہی ہو،اور جس کی تپش سے اس آواز کے دائرے ڈھل جاتے تھے اور یہ پھر میری ناڑ میں سے گزر کر میری چھاتی میں چلی جاتی تھی۔اور یہ لکیر جیسی۔۔۔میرے سینے سے نکل کر میرے گلے میں سے گزرتی تھی۔۔۔اور پھر لبوں کے قریب آ کر چھوٹے چھوٹے دائروں میں تبدیل ہو جاتی تھی۔۔۔یو۔۔۔رے۔۔۔ن۔۔۔س۔۔۔

دن اور رات بھی شاید اسی آواز کی مانند گھومتے تھے۔۔۔وہ بھی ایک دائرے میں چلتے رہے اور یہ آواز بھی۔

ایک دن تم نے کہا۔۔۔بہت مدت بعد۔۔۔تم آئے لیکن اس دن تمہارے پروں میں پہلی منزل والا جذبہ تھا، نہ دوسری منزل والا،تم سیدھے اس تیسری منزل پر آ گئے، جہاں میرے انتظار کے دنوں ایسی ۔۔۔بند، ٹھنڈیاں اور خاموش سیکڑوں کتابیں پڑی ہوئی تھی۔

تم کتنی دیر خاموش کھڑے رہے! معلوم ہوتا تھا۔۔۔جیسے کتابوں میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہو گیا ہو۔پھر میں نے آگے بڑھ کر تمہارے ہاتھ کو ایسے چھوا۔۔۔جیسے آہستہ سے ایک کتاب کی جلد کو اٹھا کر اس کے پہلے صفحے کو دیکھنا مقصود ہو۔

تم ہنس دیئے۔۔۔اور کتاب کے سارے صفحے تم نے اپنی آنکھوں میں بھر لیے،اور ساری عبارت لبوں پر۔تم نے میرے لبوں کو ایسے چوسا۔۔۔جیسے میں نے تمہارے لبوں کی ساری عبارت کو اپنے لبوں سے پڑھنا ہو۔۔

تم جس طرح سج سج قدم اٹھاتے اوپر کی منزل پر آئے تھے، ویسے سج سج قدم اٹھاتے میرا ہاتھ تھامے نیچے۔۔۔درمیانی منزل پر آ گئے ،بیلوں والی بالکونی میں سے گزر کر میرے کمرے میں۔پھر ایک عرصہ تم مخمل کے بستر کو اپنی چوڑی مردانہ ہتھیلیوں سے سہلاتے رہے۔پیچھے بہت طویل خشک دن تھے اور آگے معلوم نہیں کیا تھا،لیکن ان یادوں میں سے یاد کا ایک لمحہ اٹھا جس نے اپنا ایک بازو بیتے ہوئے وقت پر پھیلا دیا اور دوسرا دور تک آنے والے وقت پر۔۔۔یوں آگے پیچھے۔۔۔تاحدِ نظر۔۔۔وہ لمحہ پھیل گیا۔

اس سے لمحہ بھر پہلے ماس کی ایک دیوار تمہارے گرد تھی اور ماس کی ایک دیوار میرے گرد۔لیکن ماس اور مٹی کی دیواریں معلوم نہیں کیوں گھل گئیں۔۔۔اور تم مجھ کو یوں ملے۔۔۔جیسے ایک ندی کا پانی،ایک ندی کو ملتا

ہے۔۔۔اور اس لمحے معلوم نہیں کس قدر ہنس اس پانی میں تیر رہے تھے۔

ندیاں جب خشک ہو جاتی ہیں۔۔۔پھر مٹی بن جاتی ہیں، مجھے لگا تم قریب تھے تو میں ایک ندی تھی، اور تم چلے گئے، تو میں پھر دھرتی ماں۔۔۔مٹی ماں۔۔۔ماس مٹی کی ایک عورت تھی۔

اس رات اور پھر ہر رات۔۔۔مجھے معلوم ہوتا رہا۔۔۔کہ میری کوکھ میں سے کسی کے رونے کی آواز آتی ہے۔

تمہیں مدتوں پھر واپس آنے کا دھیان ہی نہیں رہا۔اور ایک رات۔۔۔جب کافی دیر میری کوکھ میں سے رونے کی آواز آتی رہی۔۔۔میں نے اپنی کوکھ کو اس آواز سمیت، اس تہہ خانہ میں جا کر رکھ دیا۔۔۔جہاں کبھی میں نے اپنی عمر کے بیسویں سال کو رکھا تھا۔۔۔

کبھی کبھی۔۔۔میں موم بتی جلا کر۔۔۔تہہ خانے میں جاتی تھی۔۔۔ایک مدت اپنی عمر کے بیسویں سال کو دیکھتی رہتی تھی۔۔۔اور پھر ایک مدت اپنی کوکھ میں سے کسی کے رونے کی آواز کو سنتی رہتی تھی، سوچتی تھی۔۔۔اب جب تم آؤ گے، میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں اس تہہ خانے میں لے جاؤں گی۔۔۔

پھر مدت بعد۔۔۔تم ایک بار آئے، لیکن اس مرتبہ تم اکیلے نہیں تھے۔۔۔باہر دروازے کے پاس کھڑی کتنی ہی مصروفیتیں تمہارے ساتھ تھی۔۔۔تم نے ایک لمحہ کے لیے اندر آ کر جلدی سے پانی کا ایک کٹورا پیا۔۔۔اور جب میں نے تہہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔تم نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور لوٹ آنے کا اقرار پکڑا کر چلے گئے۔۔۔

تمہارے اقرار کو میں نے پھول کی مانند پکڑا نہیں تھا۔۔۔اپنی ہتھیلی میں بو لیا تھا، پھر وہ ایک عرصہ تمہاری ہتھیلی میں پڑا رہا۔۔۔

مگر ماس کی ہتھیلی آخر ماس کی ہوتی ہے۔۔۔یہ مٹی کی طرح ہمیشہ جوان نہیں رہتی۔اس پر عمر کی سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔۔۔یہ جب بنجر ہونے لگتی ہے۔۔۔اس کے اندر اگا ہوا ہر پتا مرجھا جاتا ہے۔تمہارے اقرار کا پھول بھی مرجھا گیا، اور میں نے کانپتی ہتھیلی سے ایک دن اس مرجھائے ہوئے پھول کو تہ خانے کے گاڑھے اندھیرے میں رکھ دیا۔۔۔

تیسری منزل پر بہت سی کتابیں ہیں۔۔۔دنیا بھر کی تاریخوں کی، مگر ان میں سے ایک کتاب کم

ہے۔۔۔ان میں میرے تہہ خانے کی تاریخ کی کوئی کتاب نہیں۔

جس نے دنیا کی تاریخ پڑھی ہے۔۔۔وہ جانتا ہے۔۔۔کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ایک یورینس نام کا مرد ہوتا تھا، اور ایک گایا نام کی عورت ہوتی تھی۔۔۔اور گایا کی کوکھ میں سے جو بھی بچہ جنم لیتا، یورینس اسے دھرتی کی تہہ میں دبا دیتا تھا اور گایا کو دھرتی میں ہمیشہ بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی تھی۔۔۔

مگر آج کی تاریخ کسی کو معلوم نہیں پڑتی۔۔۔کہ بیسویں صدی میں ایک گایا ہوتی تھی، اس نے ایک یورینس سے محبت کی تھی، اور اس نے اپنی کوکھ کو کسی تہہ خانے میں رکھ دیا تھا۔۔۔جس میں سے ہمیشہ ایک بچے کے رونے کی آواز آتی رہتی تھی۔۔۔کسی کو معلوم نہیں کہ رونے کی آواز صرف جنم لیے بچے کے گلے میں سے ہی نہیں نکلتی۔۔۔بغیر جنم لیے بچے کے گلے میں سے بھی رونے کی آواز آتی ہے۔۔

☆☆☆☆
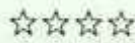
امرتا پریتم

ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ: خورشید قائم خانی

جنگلی بوٹی

انگوری، میرے پڑوسیوں کے گھر، ان کے پرانے نوکر کی نئی نویلی دلہن ہے۔ ایک تو نئی اس لیے کہ وہ اپنے خاوند کی دوسری بیوی ہے، سو اس کا خاوند ''دوہاجو'' ٹھہرا۔ اگر جو کا مطلب ''جون'' ہو تو اس کا مطلب ہوا دوسری جون میں پڑا ہوا آدمی۔ انگوری چوں کہ ابھی بیاہ کی پہلی ہی جون میں ہے، اس لیے نئی ہوئی۔ دوسرے وہ اس بات سے بھی نئی ہے کہ اس کا گونا آئے ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔

پانچ چھ سال ہوئے، جب بھاتی اپنے مالکوں سے چھٹی لے کر اپنی پہلی بیوی کا ''کریا'' کرنے کیلیے اپنے گاؤں گیا تھا تو کہتے ہیں کہ کریا والے دن انگوری کے باپ نے اس کا انگوچھا نچوڑ دیا تھا۔ کیس بھی مرد کا یہ انگوچھا، اس کی بیوی کی موت پر بھلے آنسوؤں سے نہ بھیگا ہو، پر کریا کے چوتھے دن نہا کر بدن پونچھنے پر کسی لڑکی کا باپ اگر یہ انگوچھا نچوڑ دے تو گاؤں کی اس معمولی سی رسم کے مطابق جیسے وہ کہہ رہا ہو!

''اس مرنے والی کی جگہ میں تمھیں اپنی بیٹی دیتا ہوں اور اب تمھیں رونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارا آنسوؤں سے بھیگا ہوا انگوچھا سکھا دیا ہے۔''

اس طرح پر بھاتی کا انگوری کے ساتھ دوسرا بیاہ ہو گیا تھا۔ لیکن، ایک تو انگوری ابھی عمر کی چھوٹی تھی، اور دوسرے انگوری کی ماں گھٹیئے کے روگ میں پڑی تھی، اس لیے گونے کی بات پانچ چھ، سال پر جا پڑتی تھی..... پھر ایک ایک کر کے پانچ سال بھی بیت گئے اور اس سال جب پر بھاتی اپنے مالکوں سے چھٹی لے کر اپنے گاؤں گونا لینے گیا تھا تو اپنے مالکوں کو پہلے ہی کہہ گیا تھا کہ یا تو وہ اپنی پتنی کو بھی ساتھ لائے گا اور شہر میں اپنے ساتھ رکھے گا اور یا پھر وہ بھی گاؤں سے نہیں لوٹے گا۔ مالک پہلے تو کہنے لگے کہ ایک پر بھاتی کی جگہ وہ اپنی رسوئی سے دو جنوں کی روٹی نہیں دے سکتے، پر جب پر بھاتی نے کہا کہ وہ کوٹھری کے پچھواڑے کی جگہ لیپ

پوت کر اپنا چولھا الگ بنائے گی، اپنا پکائے گی اور اپنا کھائے گی تو اس کے مالک یہ بات مان گئے تھے۔

سو انگوری شہر آ گئی تھی۔ گو انگوری نے شہر آ کر کچھ دن محلے کے مردوں سے تو کیا عورتوں سے بھی گھونگھٹ نہیں اٹھایا تھا، پر پھر دھیرے دھیرے اس کا گھونگھٹ جھینا (پتلا) ہوتا گیا۔ وہ پیروں میں چاندی کی جھانجریں پہن کر چھنک چھنک کرتی محلے کی رونق بن گئی تھی۔ ایک جھانجر اس نے پاؤں میں پہنی ہوتی، تو دوسری اپنی ہنسی میں۔ گو وہ دن کا بیشتر حصہ اپنی کوٹھری میں رہتی تھی پر جب باہر نکلتی تو ایک رونق اس کے پاؤں کے ساتھ ساتھ چلتی سنائی دیتی۔

''یہ کیا پہنا ہے انگوری؟''

''یہ تو میرے پیروں کی چھیل چوڑی ہے۔''

''اور یہ انگلیوں میں؟''

''یہ بچھوا ہے بچھوا''

''اور یہ بانہوں میں؟''

''یہ تو پچھیلا ہے۔''

''اور ماتھے پر؟''

''علی بند کہویں اسے۔''

''آج تم نے کمر میں کچھ نہیں پہنا؟''

''تگڑی بہت بھاری لگتی، کل کو پہنوں گی۔ آج تو میں نے توک بھی نہیں پہنا۔ اس کا ٹانکا ٹوٹ گیا ہے۔ کل سہر (شہر) کو جاؤں گی۔ میری ناک کا تنکا بھی تھا، اتا بڑا، میری ساس نے دیا نہیں تھا؟''

اس طرح انگوری اپنے چاندی کے گہنے ایک نخرے کے ساتھ پہنتی اور نخرے سے دکھاتی تھی۔

پچھلے دنوں جب موسم بدلا، تو انگوری کا اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ کئی بار میرے گھر کے سامنے آ بیٹھتی۔ میرے گھر کے سامنے نیم کے بڑے بڑے پیڑ ہیں، اور ان پیڑوں کے پاس ہی ذرا اونچی جگہ پر ایک پرانا کنواں ہے۔ گو محلے کا کوئی آدمی اس کنویں سے پانی نہیں بھرتا، لیکن اس کے پار ایک سرکاری سڑک بن رہی ہے اور اس کے گرد اکثر پانی جمع رہتا ہے اور یہ جگہ بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے۔

''کیا پڑھتی ہو بی بی جی؟'' ایک دن انگوری جب آئی، میں نیم کے تلے بیٹھ کر ایک کتاب پڑھ رہی

تھی۔

''تم پڑھو گی؟''

''میرے کو پڑھنا نہیں آتا۔''

''سیکھ لو''

''نہ۔''

''کیوں؟''

''عورت کو پاپ لگتا ہے پڑھنے سے۔''

''اچھا، عورت کو پاپ لگتا ہے، مرد کو نہیں لگتا؟''

''نہ۔ مرد کو نہیں لگتا۔''

''تم کو کس نے بتلایا؟''

''میں جانتی ہوں۔''

''پھر میں تو پڑھتی ہوں۔ مجھے پاپ لگے گا؟''

''نہ، شہر کی عورت کو پاپ نہیں لگتا۔''

میں بھی ہنس پڑی اور انگوری بھی۔ انگوری نے جو کچھ سیکھا، سنا تھا، اس میں اسے کوئی شک شبہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ وہ اگر ہنستی، کھیلتی اپنی زندگی کے دائرے میں سکھی رہ سکتی ہے، تو اس کے لیے یہی ٹھیک تھا۔ ویسے میں انگوری کے منہ کی اور دھیان لگا کر دیکھتی رہی۔ گہرے سانولے رنگ میں اس کے بدن کا ماس گتھا ہوا تھا۔ کہتے ہیں عورت آٹے کی لوئی ہوتی ہے۔ پر کئی ایک کا گوشت پوست اس ڈھیلے آٹے کی طرح ہوتا ہے، جس کی روٹی کبھی گول نہیں بنتی اور کئی ایک کے بدن کا ماس، بالکل خمیرے آٹے جیسا، جسے بیلنے سے پھیلایا نہیں جا سکتا۔ صرف کسی کسی کے بدن کا ماس اتنا سخت گتھا ہوا ہوتا ہے کہ روٹی تو کیا چاہے پوریاں بیل لو.....

میں انگوری کے منہ کی اور دیکھتی رہی، انگوری کی چھاتی کی اور، انگوری کی پنڈلیوں کی اور..... وہ اتنے سخت میرے کی طرح گتھی ہوئی تھی کہ جس سے مٹھریاں تلی جا سکتی تھیں اور میں نے اس انگوری کا پربھاتی بھی دیکھا ہوا تھا۔ ٹھگنے قد کا، ڈھلکے ہوئے منہ کا، کسورے جیسا۔ اور پھر انگوری کے روپ کی اور دیکھ کر مجھے اس کے

مرد کے بارے میں ایک عجیب خیال آیا کہ پربھاتی اصل میں آٹے کی اس گھنی گندھی ہوئی لوئی کو پکا کر کھانے کا حق دار نہیں۔ وہ تو اس لوئی کو ڈھک کر رکھنے والا بھانڈا ہے..... اس نسبت سے مجھے خود ہی ہنسی آ گئی۔ پر انگوری کو میں اس نسبت کی بھنک نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے میں اس سے اس کے گاؤں کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی۔ ماں باپ کی،، بہن بھائیوں کی اور کھیتوں کھلیانوں کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا:

''انگوری تمہارے گاؤں میں شادی کیسے ہوتی ہے؟''

''لڑکی جب چھوٹی سی ہوتی ہے، پانچ، سات سال کی تو وہ کسی کے پاؤں پوج لیتی ہے۔''

''کیسے پوجتی ہے پاؤں؟''

''لڑکی کا باپ جاتا ہے، پھولوں کی ایک تھالی لے جاتا ہے۔ ساتھ روپے، پیسے اور لڑکے کے سامنے رکھ دیتا ہے۔''

''یہ تو ایک طرح سے باپ نے پاؤں پوجے، لڑکی نے تو نہیں؟''

''لڑکی کی طرف سے تو پوجے نا۔''

''پر لڑکی نے تو اس کو دیکھا بھی نہیں!''

''لڑکیاں نہیں دیکھتیں۔''

''لڑکیاں اپنے ہونے والے پتی کو نہیں دیکھتیں؟''

''نہ۔''

''کوئی لڑکی اپنے ہونے والے پتی کو نہیں دیکھتی؟''

''نہ۔''

پہلے تو انگوری نے نہ کر دی پر پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی:

''جو لڑکیاں پریم کرتی ہیں وہ دیکھتی ہیں۔''

''تمہارے گاؤں میں لڑکیاں پریم کرتی ہیں؟''

''کوئی کوئی۔''

''جو پریم کرتی ہیں، ان کو پاپ نہیں لگتا؟''

مجھے اصل میں انگوری کی وہ بات یاد آگئی تھی کہ عورت کو پڑھنے سے پاپ لگتا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس حساب سے پریم کرنے والی کو بھی پاپ لگتا ہوگا۔

''پاپ لگتا ہے، بڑا پاپ لگتا ہے۔'' انگوری نے جلدی سے کہا۔

''اگر پاپ لگتا ہے تو وہ پریم کیوں کرتی ہیں؟''

''جو تو.... بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی آدمی جب کسی چھوکری کو کچھ کھلا دیتا ہے تو وہ اس سے پریم کرنے لگ جاتی ہے۔''

''کوئی کیا کھلا دیتا ہے اس کو؟''

''ایک جنگلی بوٹی ہوتی ہے۔ بس وہی پان میں ڈال کر یا مٹھائی میں ملا کر کھلا دیتا ہے۔ چھوکری اس سے پریم کرنے لگتی ہے۔ پھر اسے وہی اچھا لگتا ہے، دنیا کا اور کوئی اچھا نہیں لگتا۔''

''سچ؟''

''میں جانتی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''کیسے دیکھا؟''

''میری ایک سکھی تھی۔ اتی بڑی تھی میرے سے!''

''پھر؟''

''پھر کیا؟ وہ تو پاگل ہوگئی اس کے پیچھے۔ سہر چلی گئی اس کے ساتھ۔''

''یہ تجھے کیسے پتہ چلا کہ تیری سکھی کو اس نے بوٹی کھلائی تھی؟''

''برفی میں ڈال کر کھلائی تھی، اور نہیں تو کیا؟ وہ ایسے ہی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر چلی جاتی؟ وہ اس کو بہت ساری چیزیں لا کر دیتا تھا۔ سہر سے دھوتی لاتا، چوڑیاں بھی لاتا شیشے کی، اور موتیوں کی مالا بھی لاتا تھا۔''

''یہ چیزیں ہوئی نا۔ پر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ اس نے جنگلی بوٹی کھلائی تھی؟''

''نہیں کھلائی تھی تو وہ اس سے پریم کرنے کیوں لگ گئی؟''

''پریم تو یوں بھی ہو جاتا ہے۔''

''نہیں ایسے نہیں ہوتا۔ جس سے ماں باپ برا مان جائیں، بھلا اس سے پریم کیسے ہو سکتا ہے؟''

''تو نے وہ جنگلی بوٹی دیکھی ہے؟''

''میں نے تو نہیں دیکھی ۔ وہ تو بہت دور سے لاتے ہیں ۔ پھر چھپا کر مٹھائی میں ڈال دیتے ہیں ۔ یا پان میں ڈال دیتے ہیں ۔ میری ماں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کسی کے ہاتھ سے مٹھائی نہیں کھانا۔''

''تو نے بہت اچھا کیا کہ کسی کے ہاتھ سے مٹھائی نہیں کھائی ۔ پر تیری سکھی نے کیسے کھالی؟''

''اپنا کیا پائے گی!''

کہنے کو تو انگوری نے کہہ دیا،'اپنا کیا پائے گی' پر اسے شاید سہیلی پر ترس آگیا، دکھے ہوئے من سے کہنے لگی۔

''باوری ہوگئی تھی بے چاری۔ بالوں کو کنگھی بھی نہیں لگاتی تھی ۔ رات کو اُٹھ اُٹھ کر گانے گاتی تھی۔''

''کیا گاتی تھی؟''

''پتہ نہیں کیا گاتی تھی ۔ جو کوئی بوٹی کھا لیتی ہے، گاتی بہت ہے اور روتی بھی بہت ہے۔''

بات گانے سے رونے تک آن پہنچی تھی ۔ اس لیے میں نے انگوری سے اور کچھ نہ پوچھا۔

اور اب کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن انگوری نیم کے پیڑ تلے چپ چاپ میرے پاس آ کھڑی ہوئی ۔ پہلے جب انگوری آیا کرتی تھی تو چھم چھم کرتی آواز بیس گز دور سے ہی سنائی دے جاتی تھی ۔ پر آج اس کے پیروں کی جھانجریں جانے کہاں کھو گئی تھیں ۔ میں نے کتاب سے سر اٹھایا اور پوچھا:

''کیا بات ہے انگوری؟''

انگوری پہلے تو دیر تک میری اور دیکھتی رہی، پھر دھیرے دھیرے سے کہنے لگی۔

''بی بی جی، مجھے پڑھنا سکھا دو۔''

''کسی کو خط لکھوگی؟''

انگوری نے پھر جواب نہیں دیا اور ٹکٹکی باندھے سامنے کی اور دیکھنے لگی۔

یہ دوپہر کی بات تھی ۔ میں انگوری کو نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی چھوڑ کر اندر آ گئی تھی ۔ شام کو پھر کہیں میں باہر نکلی تو دیکھا، انگوری اب بھی نیم کے پیڑ تلے بیٹھی ہے ۔ بڑی سمٹی ہوئی سی تھی ۔ شاید اس لیے کہ شام کی ٹھنڈی ہوا بدن میں تھوڑی کپکپی چھوڑ رہی تھی۔

میں انگوری کی پیٹھ کی اور تھی ۔ انگوری کے ہونٹوں پر گیت تھا، پر بالکل سسکی جیسا:

''میری مندری میں لاگو نگنوا۔ ہو بیری کیسے کاٹوں جوبنوا۔''

انگوری نے میرے پاؤں کی آہٹ سن لی۔ منہ پھیر کر دیکھا اور پھر اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لیا۔

''تو تو بہت اچھا گاتی ہے انگوری!''

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ انگوری نے اپنی آنکھوں میں کانپتے آنسو روک لیے اور ان کی جگہ اپنے ہونٹوں پر ایک کانپتی ہنسی رکھ دی ہے۔

''مجھے گانا نہیں آتا۔''

''آتا ہے...''

''یہ تو...''

''تیری سکھی گاتی تھی؟''

''اسی سے سنا تھا۔''

''پھر مجھے بھی سناؤ۔''

''ایسے ہی گنتی ہے برس کی۔ چار مہینے ٹھنڈی ہوتی ہے، چار مہینے گرمی اور چار مہینے برکھا...''

''ایسے نہیں گا کے سناؤ۔''

انگوری نے گایا تو نہیں پر بارہ مہینوں کو ایسا گیت دیا جیسے یہ سارا حساب وہ اپنی انگلیوں پر کر رہی ہو۔

''چار مہینے راجا ٹھنڈی ہوت ہے

تھر تھر کانپے کلیجوا

چار مہینے راجا گرمی ہوت ہے

تھر تھر کانپے پونوا

چار مہینے راجا برکھا ہوت ہے

تھر تھر کانپے بدروا۔''

''انگوری!''

انگوری ٹکٹکی باندھے میرے منہ کی اور دیکھنے لگی۔ من میں آیا کہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھوں۔ ''پگلی، کہیں جنگلی بوٹی تو نہیں کھالی؟'' میرا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا بھی گیا۔ مگر میں نے اس کی بجائے یہ پوچھا:

''تو نے کھانا بھی کھایا ہے کہ نہیں؟''

''کھانا؟'' انگوری نے منہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ کے نیچے مجھے لگا کہ انگوری کا کل شریر کانپ رہا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اس نے گیت گایا ہو۔ برکھا کے موسم میں کانپنے والے بادلوں کا، گرمی کے موسم میں کانپتی ہوا کا اور سردی کے موسم میں کانپنے والے کلیجے کا۔ اس گیت کی ساری کپکپی اس کے بدن میں سمائی ہوئی تھی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ انگوری اپنی روٹی خود بناتی ہے۔ پربھاتی مالکوں کی روٹی بناتا تھا اور ان ہی کے گھر میں کھاتا تھا۔ اس لیے انگوری کو اس کی روٹی کی فکر نہیں تھی۔ اس لیے میں نے پھر کہا:

''تو نے آج روٹی پکائی تھی کہ نہیں؟''

''ابھی نہیں۔''

''سویرے بنائی تھی؟ چائے پی تھی؟''

''چائے؟ آج تو دودھ ہی نہیں تھا۔''

''آج دودھ کیوں نہیں لیا تھا؟''

''وے تو میں لیتی نہیں، وے تو....''

''تو روز چائے نہیں پیتی؟''

''پیتی ہوں۔''

''پھر آج کیا ہوا؟''

''دودھ تو وے رام تارا....''

رام تارا ہمارے محلے کا چوکیدار ہے۔ سب کا ساجھا چوکیدار۔ ساری رات پہرہ دیتا ہے۔ وہ سویرے سارخوب انیندہ ہوتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جب انگوری نہیں آئی تھی، تو وہ صبح سویرے ہمارے گھروں سے چائے کا گلاس مانگا کرتا۔ کبھی کسی کے گھر سے تو کبھی کسے کے اور چائے پی کر وہ کنویں کے پاس کھاٹ بچھا کر سو رہتا۔ پر جب سے انگوری آئی تھی وہ سویرے ہی کسی گوالے سے دودھ لے آتا، انگوری کے چولھے کا پتیلا چڑھاتا، اور انگوری، پربھاتی اور رام تارا تینوں چولہے کے گرد بیٹھ کر چائے پیتے تھے.... اور ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ رام تارا پچھلے تین دنوں سے چھٹی لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔

مجھے دکھ بری ہنسی آئی اور میں نے کہا: ''اور انگوری تم نے تین دنوں سے چائے نہیں پی ہے؟''

''نہ۔'' انگوری نے زبان سے کچھ کہے بنا صرف سر ہلا دیا۔

''روٹی بھی نہیں کھائی؟''

انگوری سے بولا نہ گیا۔ لگ رہا تھا کہ اگر انگوری نے روٹی کھائی بھی ہوگی تو نہ کھانے کے برابر ہی۔ رام تارے کی کل شکل و شباہت میرے سامنے آ گئی۔ بڑے پھرتیلے ہاتھ پاؤں، گٹھیلا بدن، جس کے پاس ہلکے ہلکے ہنستی ہوئی، شرماتی آنکھیں تھیں اور جس کی زبان کو بات کرنے کا خاص سلیقہ تھا۔

''انگوری!''

''جی!''

کہیں جنگلی بوٹی تو نہیں کھالی تو نے؟''

انگوری کے چہرے پر آنسو بہ نکلے۔ ان آنسوؤں نے بہ بہ کر انگوری کی لٹوں کو بھگو دیا۔ اور پھر ان آنسوؤں نے بہ بہ کر اس کے ہونٹوں کو بھگو دیا۔ انگوری کے منہ سے نکلتے الفاظ بھی گیلے تھے۔

''مجھے قسم ہو جو میں نے اس کے ہاتھ سے کبھی مٹھائی کھائی ہو۔ میں نے پان بھی کبھی نہیں کھایا۔ صرف چائے... جانے اس نے چائے میں ہی...''

اور آگے انگوری کی ساری آواز اس کے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ: خورشید قائم خانی

پانچ برس لمبی سڑک

تپش موسم کی تھی، من کی نہیں۔

ہوائی جہاز وقت پر آیا تھا، پر نیچے ایئر پورٹ سے ابھی سگنل نہیں ملا تھا۔ جہاز کو دلی پہنچنے کی خبر دینے کے بعد بھی، ابھی دس منٹ اور گزارنے کے لیے اسے شہر کے اوپر چکر لگانے تھے۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے شہر کے منڈیرے پہچانے۔ منڈیرے، قلعے، کھنڈر اور کھیت...... یہ سب اس نے کئی ممالک میں دیکھے تھے۔ ہر ملک میں ان چیزوں کے یہی نام ہوتے ہیں، گو ہر ملک میں ان کی تاریخ الگ الگ ہوتی ہے۔ ایک انسان سے الگ دوسرے انسان کی طرح۔ مگر جس طرح انسان کا نام انسان ہی رہتا ہے، منڈیروں اور قلعوں کے بھی یہی نام ہوتے ہیں..... صرف ایک معمولی سا فرق تھا۔ باہر ملک میں دیکھتے وقت خیال آتا کہ انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ پر آج اپنے دیس میں انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں دوسری بار دیکھ رہا ہے۔ اسے خیال آیا کہ اگر وہ پھر کچھ دن کے بعد پردیس گیا، تو انہیں دیکھ کر بھی ایسا ہی لگے گا کہ وہ ان کو دوسری بار دیکھ رہا ہے۔ بالکل آج کی طرح۔ یہ دیس اور پردیس کا فرق نہیں تھا۔ یہ صرف پہلی بار اور دوسری بار دیکھنے کا فرق تھا۔

جہاز نے ''لینڈ'' کیا۔ ایئر پورٹ بھی جانا پہچانا سا لگا، دوسری بار دیکھنے کی طرح۔ گرمی موسم کی تھی، من کی نہیں اوور کوٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور سویٹر نکال کر کندھے پر رکھ لیا۔

کسٹم سے گزرتے وقت اس نے ایک فارم بھرنا تھا کہ پچھلے نو دن وہ کہاں رہا تھا۔ پچھلے نو دن سے وہ صرف جرمنی میں تھا۔ اس نے فارم بھر دیا اور اسے خیال آیا، شکر ہے کسٹم والے محض نو دن کا حال پوچھتے ہیں، بیس پچیس دن کا نہیں۔ ورنہ تو اسے سلسلہ وار یاد کرنا پڑتا کہ کون سی تاریخ کو وہ کس دیس میں کہاں کہاں تھا۔ اس نے واپسی کے سفر کے دوران ایک مہینہ محض ایسے ہی گزارا تھا..... کبھی کس دیس کا ٹکٹ لے لیتا، تو کبھی

کس دیس کا۔ اگر کسی ملک کا ویزا اسے نہ ملتا تو وہ کسی اور ملک کو چل دیتا۔

پاسپورٹ کی چیکنگ کے بعد پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے، ایک افسر نے مسکرا کر کہا، ''جناب پانچ برس بعد دیس میں آرہے ہیں!'' بالکل اسی طرح جیسے راستے میں ایئر ہوسٹس نے کئی بار بتلایا تھا کہ اس وقت تک ہم اتنے ہزار کلو میٹر طے کر چکے ہیں۔ گنتی عجیب چیز ہوتی ہے، اسے خیال آیا۔ پر تیسری بو کی بات ایک تھیسس لکھنے کے برابر ہوگی۔ وہ ابھی ابھی ایک پردیسی زبان سیکھ کر اور اس کے لٹریچر پر تھیسس لکھ کر، ایک ڈگری لے کر آیا تھا۔ نئے تھیسس کے بارے میں کوئی بات وہ ابھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے صرف پسینے اور پھولوں کی بو سونگھتا ہوا وہ ایئر پورٹ سے باہر آگیا۔

گھر میں صرف ماں تھی۔ جانے کے وقت باپ بھی تھا، چھوٹا بھائی بھی، اور ایک لڑکی..... نہیں، وہ لڑکی گھر میں نہیں تھی۔ وہ صرف اسی دن، اس کے جانے کے دن آئی تھی۔ ماں کو صرف ایسے ہی کچھ گھنٹوں کے لیے بھرم ہوا تھا کہ وہ لڑکی..... جسے اب چھوٹا بھائی بیاہ کرا کے لے گیا، اور نوکری میں کہیں پر رہتا تھا، گھر میں نہیں تھا۔ باپ بھی اب اس دنیا میں نہیں تھا، سو گھر میں صرف ماں تھی۔

بہت سی چیزیں اندر سے بدل جاتی ہیں، مگر باہر سے وہی لگتی ہیں اور کئی باہر سے بدل جاتی ہیں مگر اندر سے ویسی ہی رہتی ہیں۔ اس کا کمرہ بالکل اسی طرح تھا..... اس کا پیلا غالیچہ، اس کی کھڑکی کے مسٹری پردے، اس کی میز پر پڑا ہوا ہری دھاریوں کا گل دان اور دہلیز میں پڑا ہوا گھبراخا کی پائیدان۔ چاندنی کا پودا بھی اس کی کھڑکی کے سامنے اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ پر پہلے اس سب کچھ کی بو..... دیواروں کی ٹھنڈی بو کے سمیت..... اس کے ساتھ لپٹ سی جاتی تھی۔ اور اب اسے لگا کہ وہ اس کے ساتھ لپٹنے سے شرماتی، صرف اس کے پاس سے گزر جاتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے اندر، کہیں کیا بدل گیا تھا۔

ماں کشمیری ریشم کی طرح ملائم تھی اور تنی سی بھی۔ پر اب عمر نے جیسے اسے دھو سا دیا تھا۔ وہ پوری کی پوری سکڑی ہوئی لگتی تھی۔ ماں سے ملتے وقت اس کا ہاتھ ماں کے منہ پر ایسے چلا گیا تھا، جیسے اپنی ہتھیلی سے اس ماس پر پڑی شکنوں کو نکال دینا چاہتا ہو۔ ماں کی آواز بھی بڑی دھیمی اور باریک سی ہوگئی تھی۔ شاید پہلے اس کی آواز کا زور اس کے مرد کے قد جتنا تھا اور اب اس کے بنا نیچا ہو گیا تھا، مشکل سے اس کے اپنے قد جتنا۔ جب اس نے بیٹے کا منہ دیکھا تو اس کی آنکھیں پہلے کی طرح چمک اٹھی تھیں۔ وہ کہیں کہیں، کسی جگہ پر بالکل وہی تھی، جیسے ہمیشہ ہوتی تھی۔ صرف اس کے ظاہر میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔

''مجھے پتہ تھا، تو آج یا کل کسی دن بھی اچانک آجائے گا۔''

ماں نے کہا۔

اس نے اپنے کمرے میں رکھے ہوئے تازہ پھولوں کو دیکھا اور پھر ماں کی طرف۔ ماں کی آواز لجا گئی۔ ''یہ تو میں روز رکھتی تھی۔''

''روز؟'' '' کتنے دنوں سے؟'' وہ ہنس پڑا۔

''روزانہ''، ماں کی آواز اس کے جسم کی طرح سکڑ گئی۔ ''جس دن سے تو گیا ہے۔''

''پانچ برس سے!'' وہ چونک سا گیا۔

ماں لجا بھری گھبراہٹ سے بچنے کے لیے رسوئی میں چلی گئی۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ لائٹر پر انگلی رکھی، تو اس کا ہاتھ ٹھٹھک گیا۔ اس نے ماں کے سامنے آج تک سگریٹ نہیں پی تھی۔

ماں نے شاید اس کے ہاتھ میں تھما سگریٹ کا پیکٹ دیکھ لیا تھا۔ وہ دھیرے سے رسوئی سے باہر آئی اور بیٹھک سے ایش ٹرے لاکر اس کی میز پر رکھ گئی۔

اس یاد آیا..... چھوٹپن میں، ماں نے ایک بار اسے چوری سے سگریٹ پیتے دیکھ لیا تھا اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دی تھی.....

ماں شاید وہی تھی پر وقت بدل گیا تھا۔

ماں پھر رسوئی میں چلی گئی۔ وہ چپ چاپ سگریٹ پینے لگا۔

''مجھے پتہ تاھ، تو آج یا کل کسی دن بھی آجائے گا.....''

اسے ماں کی ابھی ابھی کہی گئی بات یاد آئی اور اس کے ساتھ ملتی جلتی ایک اور بات بھی یاد آئی۔

''مجھے پتہ لگ جائے گا، جس دن تمہیں آنا ہوگا، میں خود اس دن تمہارے پاس آجاؤں گی۔'' بہت پہلے جب وہ پردیس جا رہا تھا، تو ایک لڑکی نے اسے یہ بات کہی تھی۔

اس لڑکی سے اس کی واقفیت پرانی تھی، مگر دوستی نہیں تھی۔ پر پانچ برس قبل پردیس جانے کے وقت وہ آگئی تھی اور اسے اس کے ساتھ محبت ہوگئی تھی.....

جیسے جہاز میں بیٹھے کسی مسافر کو اگلی بندرگاہ پر اتر جانے والے مسافر سے اچانک ایسی چاہت محسوس

ہوتی ہے کہ پل بھر میں وہ اسے بہت کچھ کہہ دینا اور اس سے سن لینا چاہتا ہے اور ایسے وقتوں میں برسوں میں گزرنے والا سفر پلوں میں گزرنے لگتا ہے۔

اس نے یہ ''گزرنا'' دیکھا تھا، اس لڑکی کے ساتھ۔

''تمہارا کیا خیال ہے، میں جو کچھ جاتے وقت ہوں، وہی آتے وقت بھی ہوں گا؟'' اس نے کہا۔

''میں تمہاری بات نہیں کہہ رہی، میں اپنی بات کرتی ہوں،'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تم یہیں ہوگی، یہ تمہیں کس طرح پتہ ہے؟''

''لڑکیوں کو پتا ہوتا ہے۔''

''تو لڑکیاں باوری ہوتی ہیں۔'' وہ ہنس پڑا، لڑکی رو پڑی تھی۔

جانے میں بہت تھوڑے دن تھے۔ پانچ دن اور پانچ راتیں لگا کر اس لڑکی نے اس کے لئے پوری بانہوں والا سویٹر بن دیا تھا۔ اسے پہناتے وقت کہا تھا! ''بس ایک..... وعدہ مانگتی ہوں اور وہ یہ کہ جس دن تم واپس لوٹو، تو یہی سویٹر پہن کر آنا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ میں وہاں پانچ برس..... '' اس نے جو کچھ کہنا چاہا، لڑکی نے سمجھ لیا تھا۔ لڑکی نے سمجھ لیا تھا۔

اس نے کہا، ''میں تم سے ان ہونے اقرار نہیں مانگتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہاں کا وہیں چھوڑ آنا۔''

وہ کتنی دیر اس لڑکی کے منہ کی طرف تکتا رہا تھا۔ اور پھر اسے یہ سب کچھ عورت کا مخصوص چھل لگا تھا۔ وہ بے وفائی کو چھوٹ دے رہی تھی پر اس پر وفا کا بار لاد کر کہہ رہی تھی: ''میں تمہیں خط لکھنے کو بھی نہیں کہوں گی۔ صرف اس دن تمہارے پاس آؤ گی، جس دن تم واپس لوٹ کر آؤ گے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ میں کس دن لوٹ کر آؤں گا؟''

اس نے لڑکی کو چھیڑنے کے لئے کہا تھا اور اس نے جواب میں کہا تھا۔

''مجھے پتہ لگ جائے گا، جس دن بھی تمہیں آنا ہوگا۔''

اس دن وہ ہنس دیا تھا۔ اس نے پردیس دیکھا تھا، برس دیکھے تھے، لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔ پر کسی چیز میں ڈوب کر نہیں دیکھا تھا، صرف کنارے سے چھو کر۔

اور وہ سوچتا رہا تھا...... شاید ڈوب جانا اس کی فطرت میں نہیں، یا وہ چلتا ہے تو ایک بوجھ بھی اس کے ساتھ چلتا ہے، جو ہر جگہ اس کے پیروں کو جکڑ لیتا ہے۔

ہر دیس کی دوستی اس نے اسی دیس میں چھوڑ دی تھی۔ اپنی افتادِ طبع کے تحت، یا اس لڑکی کے کہنے پر، یہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

واپسی کے وقت جب وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا تو وہ سویٹر کو ہاتھ میں تھام کر کتنی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ وہ اسے سامان میں پیک کر دے یا اس لڑکی کی بات رکھتے ہوئے پہن لے۔

''جو سویٹر پہن کر جانا، پانچ برس بعد وہی پہن کر آنا'' یہ اسے حماقت خیز لگا تھا۔ حماقت خیز بھی اور جذباتی بھی اور کسی حد تک جھوٹا بھی، کیوں کہ جس بدن پر یہ سویٹر پہنا تھا وہ اب اس طرح نہ تھا جس طرح وہ لے کر گیا تھا۔ پھر بھی اس نے سویٹر کو پیک نہیں کیا، پہن لیا۔ جب وہ سویٹر پہن کر شیشے کے سامنے کھڑا ہوا...... اسے آرٹ گیلریوں میں بیٹھے وہ آرٹسٹ یاد آئے، جو پرانی اور کلاسیک پینٹنگز کی ہو بہو نقلیں تیار کرتے تھے، اور سویٹر پہن کر لگا اس نے بھی اپنی نقل تیار کر لی ہے۔

اس نقل پر وہ شرمندہ نہیں تھا، صرف اس کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ ماں کو وہ سب کچھ یاد تھا جو بھی اسے اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ خود بھول گیا تھا۔

''کھا کے تو دیکھ اچھا بنا ہے؟'' ماں نے جب پنیر کا پراٹھا بنا کر اس کے سامنے رکھا تو اس کو یاد آیا کہ پنیر کا پراٹھا اسے بہت پسند تھا۔ ماں نے اس کے جانے کے دن بھی بنایا تھا۔

اس نے ایک ٹکڑا توڑ کر مکھن میں ڈبویا اور پھر ماں کے منہ میں ڈال کر ہنس پڑا: ''وہاں لوگ پنیر تو بہت کھاتے ہیں، پر، پنیر کا پراٹھا کوئی نہیں کھاتا۔''

یہ بچپن سے اس کی عادت تھی، جب گھر میں ہوتا تو روٹی کا پہلا ٹکڑا توڑ کر ماں کے منہ میں ڈال دیتا تھا۔

''تو سات ولایت گھوم کر بھی وہی کا وہی ہے۔'' ماں کے منہ سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس نے کہا، ''تو آ گیا ہے، سب کچھ پھر سے اسی طرح ہو گیا ہے۔''

گو وہ ''وہ'' نہیں تھی۔ کچھ بھی وہ نہیں تھا، جاتے وقت جو کچھ تھا وہ بدل گیا تھا۔ اس نے باپ کی بات نہیں چھیڑی تھی، صرف اس کے خالی پلنگ کی طرف دیکھا تھا، اور پھر آنکھیں پھیر لی تھیں۔ ماں کے دن بہ

دن مرجھاتے چہرے کی بات بھی نہیں کی تھی۔ چھوٹے بھائی کی خیر خبر پوچھی تھی، پر یہ نہیں کہا تھا کہ ماں کو اکیلا چھوڑ کر وہ اتنی دور کیوں چلا گیا تھا۔ پر ماں کہے جا رہی تھی۔ ''سب کچھ پھر اسی طرح ہو گیا ہے۔.....''

اس نے ماں کی مرضی کی کچھ اور باتیں یاد کرنا چاہیں۔ پوچھا، ''بھابھی کیسی ہے؟ تمھیں پسند ہے؟''

ماں نے جواب نہیں دیا۔ صرف سوال کیا، ''میرا خیال تھا ولایت سے کوئی لڑکی........'' وہ سن کر ہنس پڑا۔

''بولتا کیوں نہیں؟''

''ولایت کی لڑکیاں ولایت میں ہی اچھی لگتی ہیں، سب وہیں چھوڑ آیا ہوں۔''

''میں نے تو پچھلے دونوں کمرے اسی مہینے خالی کروا لیے تھے، سوچا، تجھے ضرورت ہوگی۔''

''تو کیا کمرے کرائے پر دیے ہوئے تھے؟

چھوٹا بھی چلا گیا تھا۔ گھر اتنا خالی تھا، اس لیے پچھلے کمرے چڑھا دیے تھے۔ ذرا ہاتھ بھی کھلا ہو گیا تھا.....''

''تمھیں پیسوں کی کمی تھی؟'' اسے پریشانی سی ہوئی۔

''نہیں، پر۔ ہاتھ میں چار پیسے ہوں تو اچھا ہوتا ہے۔''

''چھوٹے کی تنخواہ تھوڑی نہیں، وہ........''

''پر وہ بھی اب فیملی والا ہے، آ کل ہی میں اس کے گھر........''

''اچھا! تو میری ماں، دادی بن جائے گی.......''

اس نے ماں کو ہنسانا چاہا، پر ماں کہہ رہی تھی، ''مجھے تو کوئی حرج نہ ہوتا جو تو ولایت سے کوئی لڑکی........''

وہ ماں کو ہنسانے کے جتن میں تھا، اس لیے کہنے لگا، ''لانے تو لگا تھا پر یاد آیا کہ تم نے جاتے وقت پکی کی تھی کہ میں ولایت سے کسی کو ساتھ نہ لاؤں۔''

اسے یاد آیا..... جانے والے دن، وہ لڑکی جب ملنے آئی تھی تو وہ ماں کو اچھی لگی تھی۔ ماں نے دونوں کو اکٹھا دیکھ کر تاکید کی تھی، ''دیکھو کہیں ولایت سے نہ کوئی لے آنا۔ کوئی بھی اپنے دیس کی لڑکی کی ہوڑ نہیں کر سکتی.....''

پر اس وقت ماں کہہ رہی تھی، ''وہ تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ میں نے تیری خوشی کے بیچ تھوڑے آنا تھا، پیچھے ایک خط میں تجھے لکھا بھی تھا کہ جو تیرا جی چاہتا ہو......''

''یہ تو میں نے سوچا تم نے ایسے ہی لکھ دیا ہوگا،'' وہ ہنس پڑا اور پھر کہنے لگا۔

''اچھا، جو تم کہو تو اگلی بار لے آؤں گا۔''

''تو کیا تو پھر جائے گا؟'' ماں گھبرا سی گئی۔

''وہ بھی جو تم کہو تو، نہیں تو نہیں۔''

اسے احساس ہوا کہ اسے آتے ہی جانے کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

آتے وقت اسے ایک یونیورسٹی سے ایک نوکری آفر ہوئی تھی۔ پو وہ اتنے برسوں بعد ایک بار واپس آنا چاہتا تھا، چاہے چند ماہ کے لیے ہی سہی۔

''جو تم کہو گی تو نہیں جاؤں گا۔'' اس نے پھر ایک بار دہرایا۔

ماں کو کچھ تسلی ہوگئی، کہنے لگی۔ ''تو سامنے ہوگا، چولھے میں آگ جلانے کی ہمت تو آجائے گی، ویسے تو کئی بار چارپائی نہیں اٹھا جاتا۔''

''ماں تم اتنی اداس تھیں، تو چھوٹے کے ساتھ اس کے گھر......''

''میں یہاں اپنے گھر اچھی ہوں، اب تو آگیا ہے، مجھے اور کیا چاہیے۔''

اس کو لگا ماں بہت اداس تھی، اور شاید اس کی داسی کی وجہ صرف اس کا اکیلا پن نہیں ہے، کوئی اور وجہ بھی ہے۔

کھڑکی میں آتی دھوپ کی لکیر دیوار پر بڑی شوخ سی دکھائی پڑتی تھی۔

اس نے کھڑکی کے پردے کو سرکا دیا اور اسے غالیچے کا پیلا رنگ ایسے لگا جیسے بے فکر سا ہو کر کمرے میں سو گیا ہو۔

''تو تھک گیا ہوگا۔ کچھ آرام کر لے۔'' ماں نے کہا اور میز سے رکابیاں اٹھا کر کمرے سے جانے لگی۔

''نہیں مجھے نیند نہیں آرہی،'' اس نے ہلکا سا جھوٹ بولا اور کہا، ''میں تمھارے لیے کچھ چیزیں لایا ہوں، دیکھوں پوری آتی ہیں کہ نہیں۔''

اس نے سوٹ کیس کھولا۔ ایک گرم کالی اون کی شال تھی، پروں کی مانند ہلکی۔ ماں کے کندھوں پر ڈال کر کہنے لگا، ''یہ جاڑے کی چیز ہے۔ پر ایک منٹ اسے اوڑھ کر دکھاؤ، یہ تمھیں بہت جچے گی۔''

پھر اس نے فر کے سلیپر نکالے۔ ماں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ ماں کا دھیان بٹانے کے لیے اور چیزیں دکھانے لگا۔ پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی ڈبیا میں کچھ سکے تھے...... اٹلی کے لیرا، یوگوسلاویہ کے دینار، بلغاریہ کے لیوا، جرمنی کے مارک اور ہنگری و رومانیہ کے بھی تھے...... اس نے سکوں کو کھنکھنایا اور کہنے لگا، ''ماں! تم نے کہا تھا نا کہ چھوٹے کے گھر بہت جلد کوئی بچہ......''

''ہاں، ہاں! کہا تھا۔'' ماں کمرے سے جانے کے لیے ہڑبڑائی۔

''یہ اپنے بھتیجے کو دوں گا۔'' اور پھر اس نے سوٹ کیس سے اور چیزیں نکالیں......

چھوٹے کے لیے یہ کیمرا اور بھابھی کے لیے......''

ماں روہانسی سی ہو گئی۔

اس کا ہاتھ رک گیا۔ ''ماں! کیا بات ہے، تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔''

ماں چپ رہی۔

اس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ماں کو کوئی قصوار لگتا تھا۔ پتا نہیں کون؟ اور سوچ سوچ کر اسے اپنا منھ ہی قصوار لگنے لگا۔ اس نے ایک بے بسی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

''ماں، تم کچھ بتلانا چاہتی ہو، پر بتاتی نہیں۔''

''وہ لڑکی......''

''کون سی لڑکی؟''

''جو تجھے اس دن ملنے آئی تھی، جس نے تجھے ایک سوئیٹر......''

''ہاں کیا ہوا اس لڑکی کو؟''

''اس نے چھوٹے سے بیاہ کر لیا ہے۔''

ماں کے کندھے پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ کس سا گیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا ہاتھ نے کندھے کا سہارا لیا تھا، پر دوسرے پل لگا کہ ہاتھ نے کندھے کو سہارا دیا تھا۔

اور وہ ہنس پڑا۔ ''سو اب وہ میری بھابی ہے!''

ماں اس کے منہ کی اور دیکھنے لگی۔

''مجھے خط کیوں نہیں لکھا تھا؟''

''کیا لکھتی...... کیا انھوں نے یہ لکھنے والی بات کی تھی؟''

''چھوٹے نے بھی صرف بیاہ کی خبر دی تھی اور کچھ نہیں لکھا تھا۔''

''دونوں شرمندہ تھے، تجھے کیا لکھتے۔''

کھلے سوٹ کیس کے پاس جو دوسرا بند سوٹ کیس تھا، اس کا اوور کوٹ اور وہ سویٹر پڑا تھا، جو اس نے صبح آتے وقت پہن رکھا تھا۔

وہ ایک منٹ سویٹر کی طرف دیکھتا رہا، سویٹر گچھا سا ہو کر اوور کوٹ کے نیچے دبکا سا نظر آیا۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: علی یاسر

مترا

سامنے ایک دروازہ ہے۔ صرف یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں دروازے سے باہر ہوں کہ اندر............

نہیں اندر ہوں۔ کیونکہ چار ہزار سال سے بھی پرانی انڈو ویلی کا وہ بہاؤ اس کے اندر ہے جس میں بہہ کے میں نے اپنی بیٹی کا نام مترا رکھا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے چار ہزار سال پہلے میرے دراوڑ باپ نے زمین کے محافظ دیوتاؤں کا نام مترا اور ورُن رکھا تھا۔ ورُن کا تعلق آسمان کے ساتھ تھا، متر کا زمین سے۔ میری بیٹی کا تعلق زمین کے ساتھ تھا، اسی لیے میں نے اس کا نام مترا رکھا۔

مترا ابھی یہیں تھی، ابھی پتہ نہیں کہاں چلی گئی........اسی سامنے کے دروازے سے........

او مترا! تُو کہاں سے آ گئی؟ تُو کہاں چھپی ہوئی تھی؟ میں حیران ہوتا ہوں، اور مترا ہنستی ہے، کہتی ہے ''پاپا میں یہیں تھی، دروازے کے پیچھے.....''

مترا جب بہت چھوٹی ہوتی تھی اس وقت بھی اسے دروازے کے پیچھے چھپ جانے کی عادت تھی.......

وہ میری گود میں بیٹھ کر پھر پوچھتی ہے ''پاپا! میری ماں اسی طرح کی تھی؟''

''یہ ہے تیری ماں'' میں اسے ٹیکسلا کے کھنڈروں سے نکلی ہوئی وہ مہر دکھاتا ہوں، جس پر ایک ایسی دیوی کندہ ہے جس کی کوکھ سے کتنے ہی پھول اور پتے اگے ہوئے تھے۔

وہ پوچھتی ہے ''پاپا! میں بھی ماں کے جسم سے ایک پھول کی طرح اُگی تھی؟''

''ہاں تو'' میں کہتا ہوں، پھر وہ زور سے ہنستی ہے اور پوچھتی ہے ''دیکھو پاپا! میرے بدن سے بھی

پھول جیسی خوشبو آتی ہے کہ نہیں؟''

میں اس کی پیشانی کے پاس اپنا سر لا کر اس کے گھنگھریالے بالوں کو سونگھتا ہوں، ''اس کنول سے گلاب کی خوشبو آتی ہے، اس کنول سے موتیے کی، اس کنول سے.........''

وہ جلدی جلدی پوچھتی ہے، ''اور میرے ہاتھوں سے؟''

میں اس کی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں کو سونگھ کر کہتا ہوں ''ان میں سے پیپل کے پتوں کی.......''

وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ہتھیلیوں کو میرے ہاتھوں سے چھڑا کر خود سونگھتی ہے اور پوچھتی ہے ''پاپا! میرے ہاتھوں سے تیز پتوں کی خوشبو کیوں نہیں آتی؟ مجھے تیز پتوں کی خوشبو بہت اچھی لگتی ہے''۔

میں ہمیشہ کی طرح کہتا ہوں ''وہ اس لیے کہ انسان نے اس دھرتی پر جو پہلا درخت اگایا تھا، وہ پیپل تھا۔ پیپل کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے نا اس لیے''۔

میری اور مترا کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ہم روزانہ یہی باتیں کرتے ہیں، لیکن وہ روز نئی لگتی ہیں۔ مترا اپنی دونوں ہتھیلیاں میرے سر پر رکھ کر پوچھتی ہے ''پاپا! میرے ہاتھوں سے بھی ٹھنڈی چھاؤں آتی ہے؟''

''ہاں بڑی ٹھنڈی.......'' میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

وہ پھر کہتی ہے ''لیکن میرے ہاتھ تو بہت چھوٹے ہیں، ان کی چھاؤں بھی چھوٹی سی ہے''۔

میں کہتا ہوں ''یہ بڑے ہو جائیں گے....... دیکھو! روز بڑے ہو رہے ہیں......''

پھر اس کے ہاتھ تھام کر جب میں اسے دیکھنے لگتا ہوں....... وہ ہاتھ میرے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں......

میرے سر پر سے میرے پیپل کے پتوں کی چھاؤں ہٹ جاتی ہے.......

یہ محرومی، یہ ویرانی شاید بدھ کی سمادی کے نام اوستھا ہے۔ جس میں چیتنا سمارتکھ۔ تھارتھ کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے.......

مترا ابھی بیس برس کی دوشیزہ، میری اس سمادھی میں سے میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے.......

کہتی ہے ''پاپا! اب اسی طرح مجھے دروازے کے پیچھے تلاش مت کرنا، میں جا رہی ہوں.....!''

''کہاں؟ کس کے پاس؟ کس کے ساتھ؟'' میرے ہاتھوں کی جھریاں کپکپاتی ہیں۔

مترا دھیمے سے مسکرا دیتی ہے، کہتی ہے ''اسی کے ساتھ، اسی کے پاس جس کے ہاتھوں سے تیز پتوں کی خوشبو آتی ہے....''

میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ سوچتا ہوں....... مجھے بیس برس یہ خیال ہی نہ رہا کہ بیٹی جب جوان ہوتی ہے، اس کے ہاتھ پیپل کے پتے نہیں رہتے۔ ان میں سے تیز پتوں کی تیکھی خوشبو اٹھتی ہے، اور وہ کسی مرد کے ان ہاتھوں کو ڈھونڈتی ہے جن سے تیز پتوں کی تیکھی خوشبو آتی ہو...

میں اسے پیار دینے کے لیے اپنے ہاتھ اٹھاتا ہوں، تو میرے ہاتھوں کے اوپر میرے جھریوں کے بل پھر کپکپاتے ہیں۔

مترا کی ناک میں جڑا ہوا موتی، اس کی تیسری آنکھ کی طرح میری طرف دیکھتا ہے اور اس کے پاؤں کی پازیبیں میرے پاؤں میں کھنک کر کہتی ہیں...... ''اس کی ماں کی طرح اب اس کے جسم میں سے پھول اور پتے اگنے کا وقت آ گیا''

میں مترا کے سر پر پیار دینے لگتا ہوں تو میری انگلیاں اس کے بالوں کے چھلوں میں پھنس جاتی ہیں۔

کوئی زور سے دروازے کو ہلاتا ہے، چھت بھی ہلتی ہے۔ پیروں تلے کی زمین بھی۔ مترا دروازے کی طرف دیکھتی ہے، میں اس کے بالوں سے اپنی انگلیاں چھڑاتا ہوں، لیکن وہ چھلوں میں پھنس جاتی ہیں........ ''ان انگلیوں سے میں نے تجھے تھوڑا تھوڑا کر کے پالا تھا....'' میں کہتا ہوں لیکن مترا کے کان میری طرف نہیں، دروازے کی طرف ہیں۔

دروازے میں سے ایک تلوار چمکتی ہے، اور میرے ہاتھوں پر جھپٹ کر، مترا کو میرے ہاتھوں سے چھڑا لیتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں...... میری انگلیاں، مترا کے بالوں میں پھنسی ہوئی، میرے ہاتھوں سے جدا ہو کر اسی کے ساتھ چلی گئی ہیں........

دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ میں دانتوں میں زبان دبا کر لہو کو پونچھتا، اس غار کی طرف دوڑتا ہوں..... جو چار ہزار سال سے بھی پرانا ہے، اور ابھی مجھے اس کے سوا کوئی پناہ نہیں دے سکتا.......

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: علی یاسر
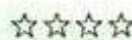
سفید دھوتی۔۔زری کا کفن

وہ دونوں ایک مرتبہ اُس وقت بھی ملی تھیں جب وہ زندہ تھیں.....

اس وقت ایک کی عمر بیس سال تھی، دوسری کی چالیس برس۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ جس کی عمر بیس برس تھی، اس نے اس دوسری کی بہو بننے کی ٹھان لی تھی لیکن چالیس برس عمر والی نے اس کی ساس بننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

شادی کی رسم ہوئی تھی لیکن صرف اس کے لیے جس کی عمر بیس سال تھی۔ جس کی عمر چالیس برس تھی اس کے لیے نہیں۔ سو یہ رسم اسے ہمیشہ نظر آتی رہی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن یہ رسم اسے کبھی بھی نہ نظر آئی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی نفی کر دی تھی۔

''تم جیتے جی میرے گھر کی دہلیز پار نہیں کر سکتی''۔ ایک فرمان کی طرح اس نے کہا تھا، جس کی عمر اس وقت چالیس برس تھی۔

''تم مجھے مردہ سمجھ لو، لیکن گھر کی دہلیز پار کر لینے دو'' یہ دہائی اس نے دی تھی جس کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔

''میں نے جیتے جی تمہارا چہرہ نہیں دیکھنا، نہ زندہ کا نہ مری ہوئی کا'' اور اس نے اپنے قدموں کے قریب ہوئے اس کے ماتھے کو پیروں کے ساتھ پرے کر دیا تھا اور گھر کی دہلیز زور زور سے ہنسنے لگی تھی......

اس دہلیز کی ہنسی میں...... مشکلوں کی دولت کی ہنسی بھی ملی ہوئی تھی اور ایک خاندان کی ضد کا قہقہہ بھی۔ یہ قہقہہ اتنا بلند آواز تھا کہ جس کی عمر اس وقت بیس سال تھی؛ اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

کانوں سے ہاتھ اٹھا کر اس نے کئی مرتبہ اس کی طرف دیکھا تھا جس کے پیچھے یہ گھر تھا، اور گھر کی

دہلیز تھی۔ لیکن وہ اس وقت بھی چپ تھا، بعد میں بھی چپ رہا۔ صرف دہلیز جو اس وقت بھی ہنستی تھی، بعد میں بھی ہنستی رہی۔

او پھر یہ دہلیز اور بھی ہنسی......... جب ایک باہر، اس دہلیز سے باہر گئی، اور ایک ڈولی اس دہلیز سے اندر آئی، جس کی عمر اس وقت بیس سال تھی اور وہ دور ایک سکول کے کوارٹر میں بیٹھ کر اس دہلیز کو دیکھا کرتی تھی۔ اس نے اس کی ہنسی کے ڈر سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

وقت تھا........ گزرتا رہا۔ اور پھر جس کی عمر اس وقت چالیس برس تھی، اس کی عمر ساٹھ برس ہوگئی۔ اور جس کی بیس برس تھی، اس کی چالیس برس ہوگئی۔ دہلیز کا قہقہہ بھی شاید بوڑھا ہوگیا تھا۔ وہ اندر کی طرف دیکھتا تو بھی کھانسنے لگ جاتا، باہر کی طرف دیکھتا تو بھی کھانسنے لگ جاتا۔

اور پھر وہ مرگئی جس نے دوسری کو حکم دیا تھا کہ تم میرے جیتے جی اس گھر کی دہلیز نہیں پھلانگ سکتی۔ اور حکم دینے والی ابھی دہلیز سے اندر تھی، اگرچہ ایک لاش تھی، ارد گرد رشتے داروں کا ہجوم تھا، کیوڑے کی مہک تھی اور ذری کا کفن تھا..... ایک اس کے حکم کی عدولی ہوگئی۔

وہ دہلیز سے اندر آگئی جسے آنے کا حکم نہیں تھا اور اس کے پاؤں کے پاس کھڑی ہوگئی، جس نے حکم دیا تھا۔ ایک کے ماتھے نے دوسری کے پیروں کو چھوا۔ اور ذری کا کفن گھبرا کر سفید دھوتی کو دیکھنے لگا......

''یہ کون ہے؟..... خاموش رہو.......... یہ بھی اس کی بہو تھی........ کہاں ہوتی تھی........ پتا نہیں......'' رشتہ داروں اور عزیزوں میں کھسر پھسر ہوئی لیکن ذری کا کفن اب سفید دھوتی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔

سفید دھوتی ایک پل آئی، دوسرے پل گئی۔ کفن میں جاتی کو بوڑھی دہلیز نے روکا اور پوچھا، ''تم نے اس کا حکم موڑ دیا؟''

''نہیں'' سفید دھوتی نے جواب دیا۔ ''اس نے کہا تھا تم جیتے جی دہلیز پار نہیں کر سکتی، میں جیتے جی تمہارا چہرہ نہیں دیکھوں گی''۔ میں اس وقت ہی مرگئی تھی، وہ تو آج مری ہے۔ یہ تو ایک لاش دوسری لاش سے ملنے آئی تھی۔

پھر سفید دھوتی دہلیز سے باہر چلی گئی اور کچھ عرصے بعد ذری کا کفن بھی دہلیز سے باہر چلا گیا۔
بوڑھی دہلیز کتنا عرصہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہی.........

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: حمزہ حسین شیخ

اجنبی اندھیرا

ایک اندھیرا تھا جسے وہ جب سے پیدا ہوئی تھی' تب سے پہچانتی تھی۔۔۔

پیدا ہوئی تو کسی کی آواز نہیں سنی تھی شاید دائی کی کہ ''چھوٹی'' آ گئی۔ اس سے پہلے گھر میں ایک اور بیٹی تھی۔ اس لیے پیدائشی طور پر وہ چھوٹی پیدا ہوئی۔

پھر سال سوا سال وہ چھوٹی رہی کہ گھر میں ایک اور بیٹی پیدا ہوئی اور وہ اس لیے 'منجھلی' ہو گئی۔۔

ماں نہیں بچ سکی اور نہ ہی نئی آنے والی چھوٹی مگر وہ منجھلی ایک اندھیرے میں اُسی طرح کھڑی رہی اور اندھیرے کے ساتھ ہل گئی۔

اس کا کسی نے نام نہیں رکھا اور وہ اسی طرح بے نام رہی۔۔۔ ''منجھلی''۔ بڑی سسرال کے پاس پردیس چلی گئی اور باپ ''پرلوک''۔ تو گھر میں کام کاج کرنے والے باپ کے ایک دوست نے اس کو اندھیرے میں ایک راستہ دکھایا جس پر پیدل چلتے چلتے وہ آخر اپنی روٹی کمانے والے تعلق تک پہنچ گئی۔

روٹی کمانے کا آسرا گاؤں کے چھوٹے سے سکول کی چھوٹی سی نوکری کا تھا۔ اس آسرے کی چھوٹی سی آس میں اس نے پہلی بار اپنا نام ڈھونڈ لیا۔ خود ہی جو اس کے ہاتھ لگا۔ یہ نام وچنی تھا جو اس نے ''وچلی'' کو بدل کر اپنے ساتھ جوڑ لیا۔ مگر جو ابھی تک اس کے دماغ کو اجنبی لگتا اور کئی بار یہ اس کے دماغ میں آتا ہی نہیں تھا۔۔۔

ایک حادثہ بھی اس اندھیرے میں ہوا۔۔۔ اس کو اس کے باپ کے دوست کے حوالے سے ایک بندے کے ساتھ جوڑ کے سکول میں ایک کہانی چلی' جس کی اس بندے نے اپنی نوکری بچانے کے لیے وچنی کو کہا کہ وہ نوکری چھوڑ دے۔ یہ سچ تھا کہ ہاتھ میں پکڑا آسرا چھوٹنے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ گئے۔۔۔ مگر اس

بندے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس آسرے کے واسطے تو وچنی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہی اندھیرے کا ہاتھ بھی تھام لیا۔

بس یہ اندھیرا تھا جسے وہ جب سے پیدا ہوئی تھی، پہچانتی تھی۔۔ مگر آج جب اپنا گاؤں چھوڑ کے اس نے ایک بڑے شہر کی راہ لی تو سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترتے ہی اس نے دیکھا سامنے ایک نیا اجنبی اندھیرا ہے۔ بالکل اس شہر کی جگمگ کرتی بتیوں کی طرح جو پہلے سے واقف اندھیرے سے بالکل مختلف طرح کا تھا۔۔۔

اور اس نے گھبرا کر اپنے دائیں طرف ٹٹولا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا' جو اس کے باپ کا دوست تھا اور جو اس کو اس اجنبی شہر میں لے کے آیا تھا اور کہہ رہا تھا، ''بڑے شہروں کی بات کچھ اور ہوتی ہے، وہاں گاؤں کی طرح کوئی کسی پر بات نہیں کرتا۔۔ تمہیں پہلے سے بھی اچھی نوکری ملے گی۔۔۔ میں ہر ہفتے چھٹی کو تمہارے ساتھ رہوں گا۔۔۔ پھر بس گنتی کے سال رہتے ہیں' گزر جائیں گے اور جب میں پنشن لے لوں گا تو تیرے پاس آ کے رہوں گا۔۔۔۔''

اس آسرے میں معلوم نہیں احسان مندی تھی کہ معلوم نہیں محبت، وچنی سے کچھ بھی جدا نہ ہوا مگر آسرا ضرور تھا۔ وچنی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور شہر کے اجنبی اندھیرے کو دیکھنے لگی جس میں شہر کی ساری جگمگ کرتی روشنیاں ڈوبی ہوئی تھیں۔۔۔

پھر کوئی چھ مہینے گزر گئے۔۔۔ مگر یہ اجنبی اندھیرا'۔۔۔ اسی طرح اس کو اجنبی لگتا تھا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے سرکاری نوکروں کی بستی میں کمرہ کرائے پر لیا۔ سارا دن ڈگری ہاتھ میں لے کر وہ سکولوں کی خاک چھانتی اور پچھلی تنخواہوں سے جمع کیے ہوئے پیسے روزانہ لگ جاتے اور جمع کیے ہوئے پیسے ختم ہونے لگے۔ اور اندھیرا اسی طرح اجنبی ہی رہا۔

اس چہرے سے واقفیت گانٹھنے کے لیے وہ ٹائپ سیکھنے لگی۔ کیا پتہ شاید اس طرح کوئی سبیل بن جائے۔ وہاں اس کے ساتھ ٹائپ سیکھتی لڑکیاں اس کو بتاتی تھیں کہ شہر میں سب سے بڑی ڈگری ''سفارش'' ہوتی ہے اور وہ گھبرا کے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جس میں ایسی کوئی ڈگری نہیں تھی۔۔۔۔

اس کے ہاتھ میں صرف فن تھا پر نوکری کے لیے جو چاہیے تھا وہ ہنر اس کے پاس نہیں تھا۔ اچانک ایک دن کسی نے آ کے اس کو ڈھونڈ لیا۔ یہ ڈھونڈنے والا ایک مل کا مالک تھا جس نے اس کی طرف دیکھتے ہی اپنے دفتر کے ایک کونے میں پڑی ہوئی ایک میز اور ایک کرسی اس کو دی اور ماہانہ تنخواہ بھی مقرر کر دی۔

اس کے اپنے چھوٹے سے آئینے نے اس کو کبھی نہیں بتایا کہ وہ ایک کھوئے ہوئے موتی کی طرح خوبصورت ہے اور اگر اس کو دھو پونچھ کر کالی مخمل پر رکھ دیا جائے تو دیکھنے والے کی آنکھ چندھیا جائے گی۔۔۔مگر یہ بات مل کے مالک کو شاید اس کی اپنی نظر نے بتا دی تھی۔۔۔

اس کے باپ کا دوست ہر روز تو نہیں مگر ہر دو تین دن بعد ضرور آتا۔ اس نے وچنی کے گاؤں سے واقف ہونے کے باوجود اس سے کوئی رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ مگر ہمسایوں اور مل کے مالک کے لیے وہ وچنی کا چاچا تھا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔'' وچنی سوچتی۔ ''ایک عورت اور ایک مرد کا ایک کمرے میں رہنا اور سونا، لوگوں کو صرف بنے بنائے رشتوں کی سمجھ آتی ہے۔'' ''وہ پہلے گھر سے اور پھر نوکری سے فارغ ہو کر' یہاں آ جائے گا' میرے ساتھ گھر بسائے گا تو پھر اب میں اس کو چاچا کہتی ہوں' پھر کیا کہوں گی؟'' پھر وہ اپنے آپ سے پوچھتی ''پھر ہمسائے تبدیل کر لوں گی اور کیا پتہ' اس وقت تک نوکری بھی بدل جائے۔ یہ کونسی پکی نوکری ہے۔۔۔''

اس کے لیے شہر کا اندھیرا ابھی تک اجنبی تھا اور اس لیے مل کا مالک بھی جس نے اس کو شہر میں پہلی نوکری دی تھی اور اس کی ساری مہربانیاں بھی اجنبی تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے پانچ نئی ساڑھیاں' ایک گرم کوٹ اور کشمیر کی دو گرم شالیں اس کو خرید کر دی تھیں۔ اور یہ سارے روپے جو اس نے کہے تھے کہ اس کی تنخواہ سے آہستہ آہستہ وصول کرے گا مگر اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ کسی مہینے بھی اس کی تنخواہ نہیں کٹی۔ یہ سب 'وچنی' کے لیے اجنبی اندھیرا تھا جو ابھی تک واقف ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھار اسے یوں لگتا کہ یہ اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اس میں اس کا اپنا سالوں کا جانا پہچانا چہرہ بھی تھا۔ وہ اپنے بالوں کی چٹیا بنایا کرتی تھی مگر مل کے مالک نے جب اس کو ایک ''ہیر ڈریسر'' کے پاس بھیجا تو واپسی پر اس کا اپنا چہرہ بھی اس کو اجنبی لگا۔ دفتر میں سارے کام کرنے والے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ سچ مچ جیسے کسی نے ایک موتی کو دھو پونچھ کر کے کالی مخمل پر جما دیا تھا۔۔۔

اور پھر یہ ایک انوکھا حادثہ پیش آیا۔ اب وہ ٹائپسٹ کے ساتھ ساتھ سیکرٹری بھی ہو گئی۔۔ اس لیے مل کے مالک کی ڈاک بھی اس نے ہی کھولنی ہوتی تھی۔ ایک دن وہ خطوط کھول رہی تھی کہ ایک خط اس کے نام کے ساتھ تھا۔ یہ اس کے باپ کے دوست کا تھا اور مل کے مالک کے نام پر تھا جس میں ایک ہزار روپے دینے پر شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ مگر ساتھ ہی پانچ سو روپے اور بھی مانگے تھے۔

'وچنی' کے ماتھے میں ٹیس اُٹھی اور اس کے پیروں تک دوڑ گئی۔ خط کا ایک ایک لفظ کاغذ پر واضح تھا مگر اس کی آنکھوں میں ہر لفظ کانپ گیا۔ پرانے واقف اندھیرے سے ایک سایہ نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

مل مالک کے سامنے اس کا ایک ہی سوال تھا' آپ نے ایک ہزار روپیہ اس کو بھیجا اور مجھے بتایا نہیں۔۔۔''

جواب چھوٹا سا تھا، ''اس نے کہا تھا۔۔۔ کہ تم کو نہیں بتانا'' مگر کچھ تھا جو چھوٹے سے جواب سے نکل کر 'وچنی' کی عمر کے سالوں تک پھیل گیا۔۔۔

اس نے مل مالک سے صرف ایک منت کی کہ آئندہ کبھی وہ اسے بتائے بغیر کسی کو کچھ نہیں بھیجے گا۔

''ٹھیک ہے تمہارے لیے دیئے تھے اگر تم نہیں چاہتی' تو نہیں دوں گا،'' مل مالک نے اقرار کیا مگر 'وچنی' سادے سے فقرے ''تمہارے لیے'' کو سن کر کانپ گئی۔

وہ کسی گروپیر کے جنم دن کی چھٹی پر اس کے پاس رہنا تھا۔ کمرے کی ایک چابی وہ ساتھ لے جاتا اور جب دوپہر کی گاڑی آتی تو آ کر پہلے خود کمرہ کھولتا تھا۔

وچنی شام کو چھ بجے کام سے لوٹی تو وہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ پہلی بار وجنی کو احساس ہوا۔۔۔ آج اس نے اپنا نہیں، غلطی سے کسی اور کا کمرہ کھول لیا ہے۔۔۔''

پیر دہلیز پر رُک گئے۔

''مجھے پتا تھا' تم آنے والی ہوگی' دیکھو میں نے تمہارے لیے چائے بنا کے رکھی ہوئی ہے۔۔۔'' اس کی آواز آئی۔ جانی پہچانی' پہچانے ہوئے اندھیرے کا حصہ۔ وچنی نے چائے کا پیالہ اس کے ہاتھوں سے لیا اور صبر کے گھونٹ کی طرح پینے لگی۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں ہاتھ آگے بڑھے اور انھوں نے وجنی کی ساڑھی کا پلو کھینچا۔ اس کی انگلیوں کو اسی طرح چھونا چاہا جیسے واقف ہاتھ چھوتے ہیں۔

''مجھے بیچنے کے بعد بھی میرا لطف چاہتے ہو؟'' وہ دیوار کی ایک اینٹ کی طرح کمرے میں گونجی اور پھر دیوار کی طرح ڈھے گئی۔

اس نے تیز نظر کے ساتھ اس کو دیکھا پھر کہا ''اگر میں گلی محلے والوں کو بلالوں اور بتاؤں' میں تیرا کون

ہوں تو اس محلے میں تو کیا تو کسی محلے میں نہیں رہ سکے گی۔۔۔'' یہ الفاظ ایک ہتھوڑا تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ساری دیوار گر جائے گی۔ مگر وجنی اینٹوں کی دیوار سے پتھر کی دیوار بن گئی اور بولی' ''پہلے تم سے نبڑ دوں گی' گلی محلے کا بعد میں سوچوں گی۔۔۔'' اس نے اُٹھ کر 'وجنی' کا ہاتھ موڑا اور پھر اپنا لوہے کا پنجہ اس کی گردن میں ڈالا۔ ''یہاں کون ہے تیرا؟ جو تمہیں چھڑائے گا۔۔۔۔''

وجنی کی چیخ خود اس کے کانوں سے ٹکرائی مگر چیخ کی آواز دوسروں نے بھی سن لی اور تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ہاتھ ڈھیلا ہوا تو وہ دروازے تک آئی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

''یہاں کون ہے میرا۔۔۔۔'' دروازے کے باہر سچ مچ اجنبی اندھیرا تھا۔ وجنی ٹھٹھک کر ٹھہر گئی۔ مگر اس کے پیروں کو شاید اس سے کچھ پوچھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ آگے چل پڑی۔۔۔ گلی کے موڑ والے گھر کی طرف' جس میں ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔

اس گھر سے وجنی نے ایک ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی مگر نمبر گھماتے ہوئے وجنی کے ہاتھ کانپ گئے۔ ''یہ اجنبی اندھیرا تھا جس سے ڈر کر ایک دن میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور آج اس کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے میں پھر سے اجنبی اندھیرے سے ایک ہاتھ مانگ رہی ہوں۔۔۔'' وجنی کو محسوس ہوا جیسے اجنبی اندھیرا آج زور سے ہنس رہا ہو۔۔۔۔

وجنی کے کان کانپتے رہے ہاتھ کانپتے رہے مگر ٹیلی فون کے نمبر نہیں کانپے۔ دوسری جانب مل مالک کی آواز پوچھ رہی تھی۔۔۔'' کون وجنی۔۔۔ تم گھبرائی ہوئی ہو؟ کس کے پاس؟ اسی کے پاس؟ اور آواز نے کہا ''میں ابھی آتا ہوں۔۔۔''

منٹوں میں وہ وہاں پہنچ گیا۔ ایک اجنبی اندھیرے کا ہاتھ اور اس وجنی کا ہاتھ اس سے چھڑا دیا۔ اس کے واقف اندھیرے سے۔ مگر اس رات جب وجنی کمرے میں اکیلی بیٹھی تو اس نے سوچا' ''اب آگے؟۔۔۔ اس اجنبی اندھیرے کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے کس کو آواز دوں گی؟ تو اس کا اپنا ہاتھ اس کی بھری آنکھوں کے سامنے پھیل گیا' ''معلوم نہیں اس اپنے ہاتھ کا آسرا مجھے کب ملے گا۔۔۔۔ کب؟۔۔۔ کب؟''

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: الیاس بابر

''مُرکی'' عرف بلاکی

''بالی عرف کوکے والی''

کمار جب صبح کالج گیا تھا تو کمار کی ماں راجونتی ''مُرکی'' کی کوٹھڑی میں بیمار مُرکی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں تو پچھلے ہفتے جب مُرکی بیمار پڑی تو راجونتی اپنے ہاتھوں سے اسے دوا پلاتی رہی پر آج اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے کل ہی ایک طرح سے جواب دے دیا تھا اور وہ پچھلی رات سے مُرکی کے پاس سے نہیں اٹھی تھی۔ کمار جب کالج سے واپس آیا تو اس نے ماں سے کہا کہ اگر تمہیں کسی اور پر یقین نہیں تو کم از کم مجھ پر تو کرو، تم دو گھڑی آرام کرلو میں ''مُرکی'' کے پاس بیٹھتا ہوں۔ راجونتی نے ''کمار'' کا کہنا مان لیا اور ''مُرکی'' کے کمرے سے باہر آ گئی۔ مشکل سے گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اس نے کمار کو اٹھا دیا اور پھر خود ''مُرکی'' کے پاس بیٹھ گئی۔

''مُرکی'' ہوش میں نہیں تھی۔ راجونتی نے اسے ایک دو مرتبہ ہلایا اور کوئی بات کہ مُرکیئے! دیکھو یہ کمار آیا ہے۔۔۔؟ پر ''مُرکی'' عرف بُلا کی کی حالت ایسی نہ تھی کہ کچھ دیکھ یا سن سکے۔

پھر اس کی سانسیں اکھڑنے لگ گئیں۔ کئی بار راجونتی کی آنکھیں بھر گئیں لیکن فوراً ہی اس نے اپنی چادر کے پلو سے پونچھ لیں وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کے رونے کی آواز ''مُرکی'' کے کانوں میں نہ پڑ جائے اور پھر کچھ ہی دیر بعد راجونتی چلا چلا کر رونے لگ گئی۔ اب ''مُرکی'' کے کانوں میں کوئی آواز نہیں پڑ سکتی تھی۔

''بی بی! اب آپ آرام کریں۔ آپ نے جتنی ''مُرکی'' کی خدمت کی ہے نا اتنی تو کوئی اپنوں کی نہیں کرتا۔۔۔ ہم خود اسے غسل شسل دے لیں گی'' محلے کی دو تین عورتوں نے آ کر کہا۔ یہ عورتیں لوگوں کے

گھروں میں برتن دھوتی تھیں۔ راجونتی نے ان عورتوں کو چھوٹے موٹے کام سونپ دیے اور خود ''مُر کی'' کو نہلانے لگ گئی۔

وہ جب ''مُر کی'' کے کپڑے اتارنے لگی تو کمر پر شلوار کی جگہ پر اس کے ہاتھ کو کوئی چیز چُبھی۔ ''مُر کی'' کے نیفے میں ایک جابی ٹنگی ہوئی تھی۔ کتنے دنوں سے ''مُر کی'' بیمار تھی۔۔۔ کئی دنوں سے اس کے کپڑے تبدیل نہیں ہو سکے تھے۔۔۔ نیفے میں ٹنگی ہوئی چابی اب اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ راجونتی نے جب چابی کو کھینچ کر اتارا تو وہاں چابی کی شکل کا گہرا زخم بن چکا تھا۔۔۔ راجونتی کی چیخیں نکل گئیں۔

''مُر کی'' کو جب لوگ۔۔۔ میں جدا کر لوٹے' کمار نے ماں کو پلنگ پر لیٹے لیٹے چائے کے دو گھونٹ پلانے کی کوشش کی۔

''آج میرے حلق سے کچھ نہیں اتر رہا ہے کمار''

ماں' صرف تمہیں ہی ''مُر کی'' سے پیار نہیں تھا۔ مجھے بھی اس سے بڑا پیار تھا۔ چھوٹے ہوتے ہوئے مجھے یہی کھلاتی تھی۔ اور بڑی ہوئی تو میرے لیے کھانا پکانا کرتی رہی۔

پر صرف یہی بات نہیں!

''ہم سے جو ہو سکا۔ کیا' اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا پر۔۔۔

''عورت کی جون کاٹنا بڑا مشکل ہوتا ہے کمار! میں ''مُر کی'' کو نہیں روتی میں عورت کی جون کو روتی ہوتی۔۔۔ جا تو سو جا''

کمار کچھ نہیں بولا' اور ماں کے پلنگ پر بیٹھا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ماں کے سر کو دباتے دباتے ماں کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ گیا۔

ماں! آج میں تمہارے ساتھ سوؤں گا۔

''ابھی بھی تو چھوٹا ہی ہے'' ماں نے پیار سے کمار کے گالوں پر چپت لگائی اور پھر اس کی آنکھوں کے گرد کتنے ہی منظر اتر آئے ''ایسے ہی تو چھوٹے ہوتے ہوئے ''مُر کی'' کی چارپائی پر لیٹ کر ضد کیا کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہی سوؤں گا۔''

''کمار نے لاڈ سے اپنا سر ماں کے قریب کر دیا''

میں 32' 33 برس کی تھی جب تو پیدا ہوا۔۔۔ میں سوچا کرتی تھی کہ شاید میں اس دنیا سے یونہی گزر

جاؤں گی۔ اپنی جھولی پھیلا پھیلا کر میں رب سے تجھے مانگا کرتی تھی۔ یہ عورت ہونے کی جون بھی بڑی عجیب ہے۔۔ اگر اس کی گود میں بچے نہ کھیلیں تو بھی زندگی خراب۔۔ تم پیدا ہوئے میری زندگی تو سنور گئی۔۔۔ پر ''مُر کی'' کی بیماری۔۔۔ اس کے مرد نے اسے چھوڑ دیا اور اس کی جون بگڑ گئی۔

ماں! ''مُر کی'' کی کب شادی ہوئی تھی؟ میں نے تو کبھی اس کے مرد کو نہیں دیکھا؟'' لیٹا ہوا کمارا چانک سے اٹھ کے بیٹھ گیا اور کہنے لگا ''میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں 'مُر کی'' کو یہاں ہی دیکھا ہے' اپنے گھر' اس پچھلی کوٹھڑی میں۔''

''ہوئی تھی اس نمانی کی شادی' تو چھوٹا تھا اس وقت' چار سالوں کا' شاید پانچ کا!

تو کیا وہ اپنے سسرال گئی تھی؟''

''سسرال خاک تھے' نہ کوئی پیدا کرنے والا نہ کوئی جلانے والا''

''ماں' مجھے ساری بات بتاؤ''

''اس کا باپ ہمارے گھر کا پرانا نوکر تھا' جب تیری پیدائش ہوئی تو اس نے منت سماجت کی کہ اس کی بیوی گاؤں میں مرگئی ہے اور بیٹی اس کے چچاؤں کے پاس اکیلی رہ گئی ہے۔۔۔ اور اگر میں مان جاؤں تو وہ اپنی بیٹی کو یہاں لے آئے۔۔۔ وہ تجھے کھلائے گی خدمت کرے گی بس اس کو دو وقت کی روٹی مل جائے صلے میں' یہی بہت ہے۔

''پھر؟''

میں نے تو شکر کیا کہ چلو کوئی ہاتھ بٹانے والا مل جائے گا۔۔۔ وہ گاؤں سے اپنی بیٹی کو لے آیا۔۔۔ مشکل سے اس کی عمر بارہ سال ہوگی۔ بڑی نازک اور چھوئی موئی سی' مجھے بہت اچھی لگی۔ جب یہ آئی اس نے کالی شلوار اور ہرے رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ جسم کمزور تھا' پر رنگ چٹا سفید اور نین نقش بڑے پیارے تھے۔۔۔ کانوں میں اس نے چاندی کی بالیاں پہنی ہوئی تھیں اور ناک میں چھوٹی سا کوکا۔۔۔

''پھر؟'' کمارے نے بے چینی سے پوچھا۔

''تمہیں تو وہ شاید اپنے ہاتھوں سے نہیں اپنی جان سے کھلاتی تھی۔ تم اس وقت اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے تھے۔ کبھی تم اس کے کانوں کی بالیوں کو پکڑ کر کھینچتے اور کبھی تمہارا ہاتھ اس کے کوکے میں پڑ جاتا۔ میں پیار سے کبھی اس کو بالیوں والی کے نام سے پکارتی کبھی کوکے والی۔''

ماں، اسے ''ثمر کی'' اور بلا کی کے نام تم نے ہی دیئے تھے؟

''ہاں''، میں نے ہی اس کے یہ نام رکھے تھے۔۔۔ پر یاد نہیں کب رکھے تھے۔

''کیوں؟''

وہ جب بڑی ہوئی سترہ برس کی، تو نمانی کو بڑا روپ چڑھا۔۔۔ میں دانتوں تلے زبان دبا کر کہا کرتی

''ہائے نماپیے مُرکیئے۔۔۔ کس کے کانوں میں پڑے گی تُو؟

اور کس کے ناک میں کوکے کی طرح چمکے گی۔

کمار مسکرایا۔

''بڑے سوہنے پہاڑی گیت گاتی تھی پگلی۔۔ اڑتے پرندے بھی رُک جاتے تھے۔

پھر!

اس کے باپ نے اپنے گاؤں میں اس کا سودا کر دیا۔

ان کے ہاں بیٹیوں کی جگہ رقم ملا کرتی تھی۔

لڑکا اچھا تھا؟

''اچھا کیونکر تھا۔۔۔ دوسرا جو تھا۔''

''دوسرا'' کیا مطلب ماں؟

جس کی پہلی بیوی مر گئی ہو

پھر تو ماں عمر میں بڑا ہو گا؟

بڑا بھی تھا۔۔۔ ساتھ اس میں کچھ اور بھی تھا۔۔۔ شاید آنکھوں میں کوئی کسر تھی۔۔۔ مجھے اب صحیح طرح سے یاد نہیں۔۔۔ پر تھا پیسے والا۔ تبھی تو اس نے خوب قیمت لگائی تھی۔

پھر؟

باپ نے جب تات پکی کر دی۔ یہ راتوں رات شہر کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔۔۔''

وہ کون تھا؟

میں نے دیکھا تو نہیں، پر خود ہی بتاتی تھی کہ بڑا چھبیلا لڑکا تھا''

''ہمارے اس شہر کا ہو گا؟''

''اسی شہر کا' اسی بستی کا' صدر بازار میں جو ہوٹل ہے ناں' وہاں کام کرتا تھا۔۔۔ کیک بناتا تھا وہاں

پھر؟

چار چھے مہینے اس کے ساتھ کسی شہر میں رہی۔۔۔ پگلی نے گھر بنایا جو کچھ پاس تھا سب لگا دیا۔۔۔ بڑے موٹے موٹے چاندی کے کڑے تھے۔۔۔ گلے میں چاندی کی زنجیر تھی۔۔۔ تیری سالگرہ پر میں نے اس کو سونے کی ایک انگوٹھی بنا کر دی تھی ایک مرتبہ بالیاں بھی دی تھیں۔۔۔ نمانی نے سب کچھ بیچ باچ کر گھر کے لیے چیزیں خرید لیں

اور پھر؟

''پھر کوئی اور لڑکی اس لڑکے کی نظروں میں بس گئی۔۔۔ وہ اسے کسی گاؤں دوسرے کا میلا دکھانے کے لیے لے گیا اور رات کو ہوٹل میں جب یہ سوئی ہوئی تھی اس کے دوپٹے سے گھر کی چابی کھول کر اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کمار نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر استفہامیہ انداز میں پوچھا'' اس نے اپنے مرد کو ڈھونڈا نہیں؟

''کہتی تھی کہ من کے سودے میں جب اس کا من ہی ٹوٹ گیا تو پھر تن کو کیا ڈھونڈنا''

''کمال عورت تھی''

یہ بات اس نے اچھی کی۔۔ کسی خدا ترس بندے سے گھر کا کرایہ لے کر واپس لوٹ آئی ورنہ آج کہاں خوار ہو رہی ہوتی۔ یہاں ہمارے گھر آ گئی؟

ہاں یہاں ہمارے گھر۔۔۔ ہمارے گھر کہاں اپنے گھر۔۔۔ اپنی اس کوٹھڑی میں۔۔۔ میں نے جس دن اسے کوٹھڑی دی تھی۔ اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں نے جیتے جی کبھی اسے کام سے نہیں نکالنا اور نہ ہی میرا بیٹا کمار بڑا ہو کر اسے اس کوٹھڑی سے نکالے گا۔

کمار کا دل بھر آیا۔۔۔ پر وہ مرد تھا۔۔۔ اس کی آنکھوں کا پانی آنکھوں ہی میں رہا۔۔۔ راجونتی کی آنکھیں چھلک گئیں۔

''میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ عورت کی جون سمجھتے نہیں کیسی ہوتی ہے۔

جب یہ یہاں آئی تھی اس کا منہ ایک ایسے بچھڑے کی طرح تھا جو اپنا گھر بھول گیا ہو۔۔۔ جسے کسی عورت کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ ہو۔۔۔

''ماں تم بہت اچھی ہو۔۔۔اگر تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو۔۔۔۔''

میں نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا کمار۔۔۔اس کی خدمت کا پھل چکایا ہے۔۔۔کملی کے رُوپ کو دیکھ کر میں کہا کرتی تھی کہ ''مُر کیئے! کس کے کانوں میں پڑے گی تو؟ جب ''مُر کی'' واپس آئی کہنے لگی ''ماں! مجھے کسی نے کانوں میں ڈالا تھا پر پھر اس کے کان پھٹ گئے شاید میرا وزن کچھ زیادہ تھا۔

راجونتی پھر رو پڑی۔۔۔بھری ہوئی آواز میں کہنے لگی۔۔۔ایسا پیار کرتے ہیں مرد؟ ایک ''مُر کی'' اتاری ایک پہنی۔

کمار کی آنکھیں بھر آئیں' شاید مرد ذات کی لاج رکھنے کے لیے ماں تبھی تم نے اس بار میری سالگرہ پر مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ''مُر کی'' کو اس کے جیتے جی اس کوٹھڑی سے نہیں نکالوں گا؟

''ہاں کمار! تبھی میں نے تم سے وعدہ لیا تھا۔اس کے مرد نے جب اس سے اس کے گھر کی چابیاں اس کے پلو سے کھول لی تھیں۔۔۔۔میں نے اس کوٹھڑی کی چابیاں اسے دے کر کہا تھا کہ تیرے جیتے جی کبھی کوئی تم سے یہ چابیاں نہیں چھینے گا۔

اور کمار۔۔۔۔جب میں نے اسے غسل دیا تو اس کوٹھڑی کی چابی اس کے نیفے کے ساتھ سندھی ہوئی تھی۔۔۔۔بالکل اس کے گوشت میں چپکی ہوئی۔۔۔۔اس چابی نے اس کے جسم میں زخم کر دیا تھا۔

جیتے جی اس نے اس چابی کو اپنے جسم سے علیحدہ نہیں کیا

''مُر کی'' ۔۔۔ٹلا کی۔۔۔ایک عورت

راجونتی ایسے روئی جیسے اس کی آنکھوں میں ''مُر کی'' کے آنسو نہیں رُکے ہوئے تھے نہیں بلکہ تمام عورت ذات کے آنسو!

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: الیاس بابر

ترشول

سنیل کی ماں نے، سنیل کی شادی کے لیے خطوں کی صورت میں جتنے بھی پیغام آئے اور جن پانچ خطوں کے ساتھ پانچ لڑکیوں کی تصویریں بھی آئی تھیں وہ سب کچھ سنیل کے سامنے رکھ دیا۔ پھر جب سنیل نے سرسری نظر سے وہ سارے خط اور تصویریں دیکھ لیں تو ماں نے بڑے ارمان سے سنیل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سنیل اُسی طرح خالی خالی نظروں سے سامنے والی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔جس طرح وہ خطوں اور تصویروں کو دیکھنے سے پہلے سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

ماں نے ان تصویروں والی لڑکیوں میں سے ایک کو دل میں پسند کر لیا تھا مگر وہ سنیل کی پسند کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے اتنی دیر چپ رہی۔ پر جب سنیل نے کسی کے لیے کوئی رائے نہیں دی تو ماں نے اپنی پسند کی لڑکی کی تصویر باقی تصویروں سے الگ کر کے سنیل کے سامنے رکھ دی۔

سنیل نے تصویر کی بجائے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔۔۔''ماں میں اپنی ذات برادری کی پابندیاں جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے کسی کے ماں باپ مجھے ذاتی طور پر اپنی بیٹی سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ پر میری ایک شرط ہے کہ میں کسی بھی لڑکی کے لیے ہاں کرنے سے پہلے اس کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ سو جس لڑکی کے ماں باپ میری شرط مان لیں میں صرف اسی کے بارے میں سوچ سکتا ہوں وہ چاہے اس تصویر والی لڑکی ہو۔۔۔ چاہے کوئی اور!

کچھ دنوں بعد ماں نے اپنی پسند کی لڑکی کے والدین کو سنیل کی اس شرط پر راضی کر لیا۔ شرط مانی گئی تھی، پر شرط منوا کر ماں خوش نہیں تھی کیوں کہ دوسری طرف شرط سے نہیں مگر ایک عندیہ دیا گیا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ اور اگر سنیل کو یہ رشتہ منظور ہوا تو کسی قسم کا جہیز نہیں دیا جائے گا۔ اور ماں جس کی شدید خواہش تھی کہ اس کے بیٹے

کی شادی اس لڑکی سے ہوا سی پر۔۔۔۔

(میں سنیل کی آنکھیں جو پورے دو سالوں سے اپنے کمرے کی دیواروں کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی تھیں۔۔۔ جیسے دیواروں پر اب کوئی سایہ سا پلنے لگ پڑا تھا۔)

پھر آخر کار ملاقات کا وقت آ گیا۔ لڑکی والوں کے گھر میں پچھلی طرف ایک کچا کوٹھا تھا۔۔۔ ناریل کے درختوں میں چھپا ہوا۔۔۔ جس کی برادری کی آنکھوں سے بچ بچا کر صفائی ستھرائی کر دی گئی تھی۔

اس کچے کوٹھے کی دیواروں میں تھوڑا اونچا کر کے ایک لکڑی کا تختہ چنا ہوا تھا شاید گھر کا کچھ کاٹھ کباڑ یہاں رکھا جاتا تھا۔۔۔ اسے دھو دھا کر لڑکی کے بیٹھنے کے قابل بنا دیا گیا تھا۔۔۔ سنیل کے بیٹھنے کے لیے ایک لکڑی کی کرسی کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔

سنیل جانتا تھا کہ اس وقت اسے گھر کے صدر دروازے سے خوش آمدید نہیں کہا جائے گا۔ اسے پچھواڑے سے جانا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسے ملاقات کرنی تھی۔۔۔ ملاقات کے وقت اسے اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ وہ اپنی ماں سے اس لڑکی کا نام پوچھنا بھول گیا تھا۔۔۔

پھر جب لکڑی کے تختے کے پاس اپنے آپ میں سمٹی ایک لڑکی نے نمستے کہنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے تو کچھ گھبرا کر سنیل کے منہ سے نکلا۔۔۔ بیٹھئے محترمہ! آپ کا جو بھی نام ہے۔۔۔

لڑکی نے ایک نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا' پر سنیل کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ کرسی کی طرف اس کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سمٹی سمٹائی سی دیوار کے پاس تختے پر بیٹھ گئی۔

خاموشی کا یہ حصار لڑکی نے نہیں توڑنا تھا' اس لیے جب خاموشی کچھ طویل ہوگئی تو اس نے ایک نظر بھر کر سنیل کی طرف دیکھا اور حیران ہوگئی کہ وہ ابھی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ آج صبح ماں نے رنگین پٹی والی دھوتی اسے خاص طور پر پہنائی تھی۔۔۔ کیسر کے ڈنٹھے سے اسے نہانے کے لیے کہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل بھی خاص طور پر ڈلوایا تھا اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں بھی۔۔۔

اور اسے بھی خبر تھی کہ آج اس کے حسن کو پرکھا جائے گا۔۔۔ لیکن وہ حیران ہوئی کہ شادی کا فیصلہ کرنے والا جو خاص طور پر ملاقات کی شرط رکھ کر آیا تھا ایک نظر بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

سنیل کرسی پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے ہی خیالوں کی دھند میں لپٹا ہوا ہو۔۔۔

اور جیسے سورج کی دھوپ اچانک گہری دھند کو چیر دیتی ہے سنیل کی آواز اچانک چمک پڑی ''میں کوئی

شیو جی نہیں پر ایک ترشول ہے جو ساری عمر میرے ہاتھ میں رہے گا۔

لڑکی گھبرا گئی اور سنیل کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگی۔

سنیل بھی اس وقت اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔۔۔۔ جسے بھی میرے ساتھ عمر گزارنی ہے اسے میرے سنگ یہ ترشول بھی اُٹھانا پڑے گا۔ بس میں یہی بتانا چاہتا تھا۔ اس لیے ملنے کی شرط رکھی تھی۔

لڑکی اپنے ہی جسم میں سمٹی ہوئی تھی پر اسے یوں لگا جیسے اس کا انگ انگ گھٹ رہا ہے۔

وہ سنیل کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

وہ کہنے لگا۔ ''جیسے کسی پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اردگرد کے نشیب اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔۔ ایسے ہی میں جب بچپن سے گزر کر جوانی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔۔ مجھے یوں لگا کہ میرے دائیں بائیں گہرے نشیب ہوں۔۔۔ جو روز اور گہرے ہوتے جاتے ہوں میں روز خواب میں ڈرتا کہ ابھی کسی پہاڑ کے پتھر سے میرا پاؤں پھسلے گا اور میں ایک گہرے نشیب میں گر جاؤں گا۔

ایم اے کر رہا تھا' جب گھر میں ماں نے میری شادی کی بات چلادی پتہ نہیں اس بات میں کیا راز تھا کہ مجھے روز رات کے وقت خوف سا آنے لگا۔ مجھے آئے دن خواب آنے لگے کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ اور میں میری بیوی میرے ساتھ پہاڑ پر چڑھ رہی ہے اور میں اچانک سوچتا ہوں کہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گہرائی میں پھینک دوں یا ایسے لگتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دوں گا۔

سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں پڑا کاجل گہرے سیاہ بادلوں کی طرح اس کی آنکھوں میں پھیل گیا ہو۔

لیکن سنیل کا دھیان لڑکی کی طرف نہیں تھا۔۔ وہ اپنی ہی دُھن میں کہے جا رہا تھا۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے اتنا خوف آنے لگ گیا کہ میں گھبرا کر پہلے ایک ماہر نفسیات کے پاس چلا گیا۔۔۔ پھر ایک درگاہ پر جہاں ایک دن ایک مسلمان فقیر نے مجھے بتایا کہ تم پر کسی رُوح کی پکڑ ہے۔ اُسی نے بتایا کہ یہ تمہاری سوتیلی ماں کی بھٹکی ہوئی رُوح ہے جو تمہارے باپ سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے کسی کا گھر آباد نہیں ہو سکے گا۔۔۔

اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے باپ کی کوئی پہلی بیوی بھی تھی جسے اس نے چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات پہلی مرتبہ مجھے اس مسلمان فقیر نے بتائی۔۔۔ وہ عورت اور اس کے بچے کہاں ہیں؟۔۔۔ میرے باپ

نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔۔۔ میں نے اس درگاہ پر پھر اسی فقیر کو ڈھونڈنا چاہا پر وہ مجھے نہیں ملا۔ کسی نے ایک بڑے پنڈت کے بارے میں بتایا میں اس کے پاس گیا پر اس نے صرف اتنا کہا کہ تمہاری سوتیلی ماں اب زندہ نہیں رہی ہوگی۔ تبھی وہ بھٹکتی رُوح بن کر تمہیں پریشان کر رہی ہے۔۔۔ اس کا موت کے وقت ودھی وت کریا کرم نہیں ہوا۔۔۔ اسی لیے اس کی رُوح بھٹک رہی ہے۔ تم ہردوارے جا کر اس کے نام کی ودھی وت کریا کرم کرو۔

میں نے گھر میں یہ بات ماں سے کی نہ باپ کو کچھ بتایا۔ البتہ ہردوار جا کر اس کے نام پر دان پن بھی کیا۔ کریا کرم بھی، مگر میری حالت میں فرق نہیں پڑا۔ البتہ کچھ دن پہلے میرے نام ایک چٹھی آئی جو میری سوتیلی بہن نے لکھی تھی کہ اب ماں بھی نہیں رہی۔۔۔ بھائی پہلے ہی مر چکا ہے۔۔۔۔ میں اکیلی ہوں اور اب تیرے سوا میرا کوئی بھائی نہیں آخر میں تیری بہن ہوں تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آتے؟۔۔۔۔

اسی پنڈت جس نے کریا کرم کی صلاح دی تھی نے کہا کہ تیری بہن کا یہ چٹھی ضرور اس کریا کرم کا اثر ہے، تیری سوتیلی ماں کی بھٹکتی رُوح نے اب خود اپنی بیٹی کو صلاح دی ہوگی کہ تمہیں چٹھی لکھے۔ ورگرنہ آج تک تمہیں کسی نے چٹھی کیوں نہیں لکھی۔۔۔

میں اپنے ماں باپ سے چوری، اس خط پر لکھے پتے پر سے اپنی بہن کو ڈھونڈ لیا۔ وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر بڑا روئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اپنی ماں کی موت کے بعد وہ اپنے باپ کے گھر گئی تھی مگر باپ نے اسے آسرا نہیں دیا۔ اور میری ماں نے صبح سے آئی ہوئی میری بہن کو صرف کھانا کھلایا اور دوپہر کو کہہ دیا کہ اب وہ جا سکتی ہے۔

میری یہ بہن مجھ سے عمر میں کافی بڑی ہے۔۔۔ جیسے تیسے کر کے اس کے غریب ماموں نے اس کی شادی کر دی تھی۔ اس کا خاوند اچھا آدمی ہے۔ اس کو صرف ایک دُکھ تھا کہ اس کے باپ نے کبھی اس کا حال نہیں پوچھا اور پھر ایک خواب جو بار بار اسے آتا جس میں وہ اپنے مرے ہوئے چھوٹے بھائی کی صورت دیکھتی۔۔۔ یہی وہ بات تھی جس پر ایک دن مجبور ہو کر اس نے مجھے چٹھی لکھ دی۔

سنیل جب یہ سب کچھ بتا رہا تھا، اس کے سامنے لکڑی کے تختے پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو یوں لگا کہ اس کی آنکھوں کا کاجل جو گہرے سیاہ بادل کے جیسے اس کی آنکھوں میں پھیل گیا تھا۔ اب ان بادلوں کے بیچ سے کچھ روشنی پھوٹنے لگ گئی تھی۔ وہ تختے سے سرک کر آگے سنیل کی کرسی کے کچھ نزدیک آ گئی تھی۔

سنیل کہہ رہا تھا۔۔۔ مجھے اس دن کا تو پتہ نہیں جب میری یہ بہن اپنے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنے ہمارے گھر آئی تھی۔۔۔ ہمارے نہیں اپنے گھر آئی تھی۔۔۔

اب میرا رشتہ صرف میری اس بہن کے ساتھ ہے اور کسی کے ساتھ نہیں میں اب بھی اپنے ماں باپ کے گھر رہتا ہوں مگر میں یہ رسم اب زیادہ دیر تک نہیں نبھا سکتا۔۔۔ انہیں بالکل خبر نہیں کہ دفتر کی چھٹیوں میں میں جب باہر جاتا ہوں تو کدھر جاتا ہوں۔۔۔ میں اپنی بہن کے ہاں جا کر کئی کئی دن رہتا ہوں۔۔۔ میری تنخواہ کا کچھ حصہ میری بہن کے ہاں جاتا ہے۔۔۔ وہ بڑی غریب ہے۔۔۔ لیکن سُکھی ہے۔

سنیل کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کے ارد گرد جو رنگیلی پٹی والی دھوتی تھی۔۔۔ لڑکی کو لگا کہ اس پٹی کے دو رنگ ساری دھوتی پر پھیلتے جا رہے ہوں۔

اسے لگا ۔۔۔ نجانے یہ سنیل کے من کے اس راز کا اثر تھا جو اس نے آج تک اپنے سگے ماں باپ کو بھی نہیں بتایا تھا اور آج اچانک اس اجنبی لڑکی کے ساتھ راز بانٹنے آ گیا تھا۔۔۔ یا اُن آنکھوں کا اثر تھا جو اس سے سیدھی لڑکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

سنیل کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ یہی ترشول ہے۔ درگاہ والے فقیر کے مطابق میری بھیانک بے چینی اس لیے ہے کہ مجھے ایک بھٹکتی ہوئی رُوح کی پکڑ ہو گئی تھی میری اس بہن کے کہنے کے مطابق یہ اس کے مرے ہوئے بھائی کی رُوح تھی۔۔۔ جس نے میری صورت میں دوبارہ جنم لیا ہے۔ میرے مطابق یہ میرے باپ کا گناہ ہے۔ جس نے پچھتاوے کی صورت میں اس کے گھر دوبارہ جنم لے لیا ہے۔

سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے اچانک تختے سے اُٹھ کر سنیل کے پیر چھوئے اور سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے منہ سے بہت مدہم آواز میں اعتماد سے یہ الفاظ نکلے ''میں یہ ترشول اُٹھا سکتی ہوں۔۔۔

سنیل نجانے کتنی دیر چُپ چاپ اس لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ پھر کہنے لگا۔۔۔ ہم دونوں! میں ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھ سکا۔

میرا نام پاربتی ہے۔۔۔ لڑکی میٹھا سا ہنس کر بولی۔۔۔ آج تک کچھ اور نام تھا پر آج سے میرا نام پاربتی ہے۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: قمر الزمان

پنجر

1935ء میں

دن سرمئی تھا، بوری کا ایک ٹکڑا پاؤں تلے دبائے پورو مٹر نکال رہی تھی، انگلیوں میں پکڑی ہوئی پھلی کا منہ کھول کر جب اس نے دانوں کو مٹھی میں سرکانا چاہا تو ایک سفید سنڈی اس کے انگوٹھے سے چپک گئی جیسے کسی کا پاؤں کیچڑ سے بھرے گڑھے میں جا پڑے، پورو کو کراہت ہوئی، اس نے ہاتھ جھٹک کر سنڈی کو دور پھینکتے ہوئے اپنے ہاتھ دونوں گھٹنوں کے بیچ دبا لیے۔ بھری پھلیاں، نکالے ہوئے دانے اور خالی چھلکے پورو کے سامنے بکھرے پڑے رہے۔ جڑے گھٹنوں سے ہاتھ نکال کر اس نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔ پورو کو محسوس ہوا، سر سے پاؤں تک اس کا بدن مٹروں کی اس پھلی جیسا تھا، جس کے اندر پھلیوں کے صاف دانوں کے بجائے ایک غلیظ سنڈی پرورش پا رہی تھی۔ پورو کو اپنے پورے جسم سے کراہت آئی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے پیٹ میں پلنے والی سنڈی کو گرا دے، اپنے بدن سے دور کر دے، اس طرح جیسے کوئی چبھے ہوئے کانٹے کو ناخنوں میں پھنسا کر نکال دیتا ہے، جیسے کوئی چمٹے ہوئے بھا کھڑے اتار پھینکتا ہے، جس طرح کوئی چمٹی ہوئی چیچڑی کو اکھاڑ دیتا ہے، جیسے کوئی چپکی ہوئی جونک کو کھینچ کر پھینک دیتا ہے.....

پورو نے سامنے دیوار کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، بیتے ہوئے دن ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

پورو ضلع گجرات کے چھتو آنی گاؤں کے شاہوں کی بیٹی تھی۔ شاہ، دیر ہوئی شاہ نہیں رہے تھے، مگر پھر بھی وہ شاہ کہلواتے رہے۔ دنوں کے پھیر سے شاہوں کے اس گھر کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ان کے دیگچوں اور ولٹوہیوں جیسے بڑے بڑے برتن بھی بک گئے تھے۔ وہ برتن بھی جن پر ان کے پرکھوں کے نام کندہ تھے۔

بدنامی کے ڈر سے بچ کر پورو کا والد اور چچا اپنا گاؤں چھوڑ کر سیام چلے گئے تھے۔ جہاں جانے سے ان کے دن جلد ہی پھر گئے۔ پورو اس وقت دوڑتی پھرتی تھی اور اس کی ماں کی گود میں ایک لڑکا تھا۔ اجڑے ہوئے شاہوں کا کنبہ دوبارہ اپنے گاؤں آیا۔ پورو کے والد نے اپنا گروی رکھا ہوا مکان چھڑوایا اور اپنے بزرگوں کے نام کی لاج رکھی۔ بلاشبہ اس کے والد کو ایک نیا مکان بنانے کے لئے اس سے کم پیسے صرف کرنے پڑتے، مگر اس نے اندھا دھند لگائے گئے سود کا بھی خیال نہ کیا اور ایک بار دانتوں تلے زبان دے کر اپنے پرکھوں کا بھرم رکھا۔

اناج، فصلیں اور باقی گھر کا چھوٹا بڑا سامان سمیٹ کر وہ پھر سیام چلے گئے، مگر اب ان کا مکان، ان کا نام گاؤں میں زندہ رہا۔ اس کے بعد جب وہ اپنے گاؤں واپس آئے، اس وقت پورو پورے چودہ برس کی تھی۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی تھا، اس سے چھوٹی اس کی اوپر تلے تین بہنیں تھی اور اس مرتبہ اس کی ماں کو چھٹی بار کسی بچے کی امید تھی۔ شاہوں کے اس خاندان نے گاؤں آ کر پہلا کام یہ کیا کہ ساتھ والے گاؤں رتووال کے ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں لڑکا دیکھا۔ اس کی ماں سوچ رہی تھی جب وہ سوتک سے فارغ ہو گی تو بڑے چاؤ سے اپنی بیٹی کے لئے جیون ساتھی ڈھونڈے گی۔ اس مرتبہ وہ اچھی طرح سوچ کر آئے تھے کہ اس فرض سے ضرور سبکدوش ہو کر سیام واپس آئیں گے۔

پورو کے ہونے والے سسرال کے گھر ان دنوں تین دودھ دینے والی بھینسیں اور گاؤں میں ان کا اکلوتا مکان تھا جس پر پکی اینٹوں کی ممٹی بنی ہوئی تھی۔ گھر کے صدر دروازے پر انہوں نے ''اوم'' لکھوایا تھا۔ لڑکا خوبصورت، عقلمند اور سمجھدار نظر آتا تھا۔

پورو کے باپ نے پانچ روپے اور گڑ کی روڑی دے کر لڑکا روک لیا تھا۔ ان دنوں گجرات کے ضلع میں بدلے کی شادی کا رواج تھا۔ جس لڑکے سے پورو کی منگنی ہوئی اس کے بدلے میں اس لڑکے کی بہن کی منگنی پورو کے بھائی سے ہوئی۔ حالانکہ پورو کا بھائی اس وقت صرف بارہ برس کا تھا اور اس کی منگیتر بہت ہی چھوٹی۔

دو سال بعد اوپر تلے تین لڑکیوں کی پیدائش سے پورو کی ماں تھک چکی تھی اور اب جب کہ ان کے دن بھی پھر گئے تھے، گھر میں کھانے کو سب کچھ تھا، ضرورت کی ہر چیز میسر تھی، اس کا دل کرتا کہ وہ پھر ایک بیٹے کو جنم دے۔

اس مرتبہ ماں نے گاؤں آ کر دوسرا کام یہ کیا کہ بدھ ماتا کی پوجا کروائی۔ گاؤں کی کچھ عورتوں نے

پورو کے صحن میں گوبر کی ایک گڑیا بنائی، سرخ دوپٹے کو کناری لگا کر اس گڑیا کے سر پر دیا، دو ماشے سونے کی چھوٹی سی نتھ بنوا کر گڑیا کے ناک میں ڈالی اور سب نے مل کر گایا:

بدھ ماتا رُسی آویں تے منّی جاویں

بدھ ماتا رُسی آویں تے منّی جاویں

(بدھ ماتا! روٹھی ہوئی آؤ اور ہم سے خوش ہو کر جاؤ)

ان کے ہاں بھی اور ان کے نزدیکی گاؤں کی عورتوں کو بھی یہ یقین تھا کہ ہر بچے کی پیدائش پر بدھ ماتا خود آتی ہے۔ اگر تو بدھ ماتا اپنے خاوند کے ساتھ ہنستی کھیلتی آتی ہے تو آ کر پلک جھپکتے لڑکی بنا کر چلی جاتی ہے کیونکہ اس کو اپنے خاوند کے پاس جانے کی جلدی ہوتی ہے لیکن جب بدھ ماتا اپنے خاوند سے روٹھ کر آتی ہے تو اس کو واپس جانے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی، آ کر دیر تک بیٹھتی ہے اور آرام سے لڑکا بنا دیتی ہے۔ لہذا عورتوں نے پھر گانا شروع کیا۔

بدھ ماتا رُسی آویں تے منّی جاویں

بدھ ماتا رُسی آویں تے منّی جاویں

بدھ ماتا شاید کہیں قریب ہی سے سن رہی تھی، اس نے ان کا کہا مان لیا۔ پندرھویں سولہویں دن کے بعد پورو کی ماں کے ہاں لڑکا ہوا۔ شاہوں کے قریبی اور دور دراز کے رشتہ داروں کی طرف سے مبارکبادیں ملنے لگیں۔ فکر کی بس ایک ہی بات تھی کہ لڑکا تین لڑکیوں کے بعد ہوا تھا چونکہ تین بہنوں کے بعد یہ بھائی پیدا ہوا تھا اس لئے پورو کی ماں کو بہت فکر تھی کہ جیسے بھی ہو لڑکا زندہ رہے۔ اگر زندہ رہے تو اپنے والدین پر بوجھ نہ بنے۔ بدھ ماتا کو منانے والی عورتیں ایک بار پھر اکٹھی ہوئیں اور کانسی کے بڑے تھال کو درمیان سے توڑ کر لڑکے کو بیچ سے دونوں طرف گزارا، ساتھ ہی گاتیں رہیں۔

ترکھلاں دی دھار آئی

ترکھلاں دی دھار آئی

(تین دراج بعد بھینس نے دودھ دیا)

تین بیٹیوں کی یلغار کے بعد جنے لڑکے کے سارے شگن سکون سے منا کر انہیں یقین ہو گیا کہ لڑکا بچ جائے گا۔

پندرھویں سال کی اٹھان سے پورو کے بدن کا ایک ایک انگ جھومنے لگا تھا۔ پچھلے سال کی ساری قمیضیں اسے تنگ ہو چکی تھیں۔ قریبی منڈی سے اس نے پھولوں والی چھینٹ کے نئے کپڑے سلوائے۔ اوڑھنیوں کو ابرق سے سجایا۔

پورو کی ساری سہیلیوں نے اس کو دور سے اس کا منگیتر رام چند دکھا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کا عکس ہو بہو ویسا ہی اتر آیا اور اسے سوچ سوچ کر اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔

وہ باہر جانے سے جھجکتی تھی۔ ساتھ کے گاؤں والوں کا اس کے گاؤں آنا جانا بہت تھا۔ اس بات سے وہ بہت خوف کھاتی تھی کہ اس کے سرالی گاؤں والے اس کو دیکھ لیں گے۔ مگر اب اس گاؤں میں بھی ایک سے زیادہ مسلک کے لوگ تھے۔ جیسے ہی دن ڈھلتا پورو اور اس کی سہیلیاں کھیتوں میں گھوم آتیں۔ کئی بار وہ اپنے کھیتوں کے قریب سے گزرنے والی کچی سڑک کے پاس میدان میں رک جاتیں۔ ان میں سے کبھی کوئی ساگ توڑنے بیٹھ جاتی، کبھی کسی بیری کے پاس جا کھڑی ہوتی، بیر گراتی اور چنتی اور سہیلیوں کو باتوں میں لگائے رکھتی۔ وہ سڑک اس کے ہونے والے سسرال کو جاتی تھی۔

دل ہی دل میں وہ سوچتی کہ شاید اس کے منگیتر کا وہاں سے گزر ہو۔ وہ گزرتے ہوئے کو ایک بار دیکھ لے۔ اس کے دل کی دھڑکن اس سڑک کے کنارے تیز ہو جاتی۔ پھر ساری ساری رات اپنے گبھرو منگیتر کے خوابوں میں کھوئی رہتی۔

ایک دن پورو کی جوتی اُسے ایڑی کے قریب سے زیادہ تنگ کر رہی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی پیچھے رہ جاتی تھی۔ وہ اور اس کی سہیلیاں کھیتوں سے ہو کر واپس گھروں کو آ رہی تھیں۔ شام کا اندھیرا پگھلے ہوئے شیشے کی طرح پھیل گیا تھا۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی لڑکیاں گاؤں کے راستے پر تھیں۔ کبھی پورو چوڑی پگڈنڈی اور خالی زمین سے بلا جھجک گزرتی اور کبھی کچھ درختوں، پیلوں اور جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ ان کی شاخیں پکڑ پکڑ کر آگے گزرتی تھی۔ تمام لڑکیاں ایک قطار میں آگے پیچھے راستے پر چل رہی تھیں، پورو کچھ پیچھے رہ گئی تھی کیونکہ دائیں پاؤں کی ایڑی کے قریب ایک بڑا سا چھالا ابھر آیا تھا۔ اس نے تنگ جوتے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لئے اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔

لڑکیاں پورو سے کہتی تھیں کہ اس کا داہنا پاؤں بائیں کی نسبت بھاری تھا۔ اس کے دائیں پاؤں کو جوتا کاٹتا۔ اس طرح اس کا دایاں ہاتھ بھی بائیں کی نسبت بھاری تھا۔ ''دیکھنا چوڑا اچڑھاتے ہوئے معلوم

پڑے گا" اسے لڑکیاں چھیڑتی تھیں۔ اسے خیال گزرا جیسے ہاتھی دانت سے بنی سرخ چوڑیاں اس کی بانہوں میں پہنائی جارہی ہیں، پچھلی کھلی کھلی چوڑیاں چڑھانے کے بعد اگلی چھوٹی چوڑیاں اُس کے دائیں ہاتھ میں پھنس گئی ہیں، نائی نے اس کے انگوٹھے کی ہڈی کو تیل ملنے کے بعد زور آزمائی کی ہے اور ہاتھی دانت کی سرخ چوڑی اس کے بازو میں چڑھانے لگا ہے۔ پورو کو خیال آیا کہ اگر اس کی ہاتھی دانت والی سرخ چوڑی اس کے دائیں ہاتھ میں ٹوٹ جائے تو؟ اس خیال سے اُس کے کلیجے کو دھچکا سا لگا۔ "ہائے! یہ کتنا برا شگون ہے" اس کے شگن کی چوڑی، اس کے سہاگ کی چوڑی کیوں اس کے بازو میں ٹوٹے۔ پورو نے اپنے دائیں بازو کو حقارت سے دیکھا۔ پرماتما کرے اس کا منگیتر، ہمیشہ جیئے، کئی لاکھ برس زندہ رہے۔ پورو کو یاد آیا کہ ان کے گاؤں میں چوڑیاں چڑھاتے ہوئے ایک لڑکی کی چوڑی واقعی ٹوٹ گئی تھی اور پاس کھڑی عورتیں "رام رام" کہہ کر پرماتما سے اس کے شوہر کی خیریت کی دعا کرنے لگی تھیں۔ پھر سنار سے مہین سی سونے کی تار اس ٹوٹی ہوئی چوڑی میں پرو کر پھر اس لڑکی کو چوڑی چڑھائی گئی تھی۔ اس طرح انہوں نے اس کے شوہر کی ٹوٹی سانسیں پھر سے جوڑ دی تھیں۔

پورو انہی برے شگونوں کی ڈور میں الجھی ہوئی تھی کہ بائیں جانب کے پیپل کی اوٹ سے ایک آدمی نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پورو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے فوراً دیکھا۔ ان کے گاؤں کا جوان لڑکا رشید اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رشیدے کو شاید بائیسواں سال ہوگا۔ اس کی بھرپور جوانی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

پورو نے دیکھا رشیدے کی دونوں آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ وہ کانپ کر رہ گئی، اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ رشیدے کا پہلو بچا کر دوڑ پڑی۔

وہ بھاگتی بھاگتی لڑکیوں کے ساتھ جا ملی۔ اب وہ اپنے گھروں کی چوکھٹوں کے پاس پہنچ گئی تھیں اور پورو کا سانس بحال نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ رشیدے نے اس کو زبان سے کچھ نہ کہا۔

"ارے لڑکا تھا کہ ببر شیر" سہیلیوں نے اس سے مذاق کیا مگر پورو کی ابھی تک جان میں جان نہیں آ رہی تھی۔

"ارے پگلی! شیر تو صرف پھاڑ کر کھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر ریچھ کسی اکیلی عورت کو مل جائے تو اسے مارتا نہیں، اٹھا لیتا ہے۔ اپنی گپھا میں لے جا کر اسے اپنی بیوی بنا لیتا ہے۔" سہیلیوں میں سے ایک نے

بات کی۔

ایک مرتبہ پھر پورو کی جان مٹھی میں آ گئی۔ ہائے اس بد بخت کا کیا حال ہو گا جس کو ریچھ اپنی بیوی بنا لے۔ یہ سوچ کر اس کا رنگ اڑنے لگا۔ اس کو پھر رشیدے کی پھیلی پھیلی آنکھیں یاد آ گئیں۔

اب پورو اپنے گھر پہنچ گئی تھی، سہیلیاں ہنستی کھیلتی آگے چلی گئیں۔

اس بات کے دوسرے دن جب وہ اور اس کی سکھیاں کھیتوں میں مونگرے توڑ رہی تھیں، وہ جلدی سے کچھ مونگرے چلتے کنوئیں سے دھولائی۔ چھوٹے مونگروں کی ڈنڈیاں توڑ کر اس نے تین چار مونگرے اپنے منہ میں ڈال لئے اور اچانک اُس نے دیکھا کہ نزدیک کے درخت کے پاس رشیدا کھڑا ہوا تھا۔

پورو کی ٹانگوں سے جیسے جان کسی نے کھینچ لی ہو۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''سوہنیو ڈرتے کیوں ہو؟ ہم تو آپ کے نوکر ہیں۔'' آج رشیدا بول پڑا تھا۔ رشیدے کے چہرے پر شرارت نظر آ رہی تھی۔

پورو کو ایسے لگا جیسے ابھی رشیدا ریچھ جیسے چوڑے پنجے لئے اس کی طرف لپکے گا۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں ریچھ کے ناخنوں کی طرح اس کی گردن کے گرد پھیل جائیں گی پھر وہ اس کو گھسیٹتا ہوا لے جائے گا اور پھر........اور پھر.........

نصیب اچھے تھے اس نے دیکھا، دو کمی (کھیتوں میں کام کرنے والے) سامنے سے آ رہے تھے۔ رشیدا ویسے ہی کھڑا رہا۔ وہ لال ٹماٹروں سے بھری ہوئی کیاری کو پھلانگ کر تیز تیز ڈگ بھرتی اپنی سہیلیوں سے جا ملی۔

اس دن وہ بہت نڈھال تھی۔ سارا راستہ لڑکیوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر چلتی رہی۔ سائے سے بھی کانپ جاتی۔ معمولی آہٹ سے لرز اٹھتی۔

اس نے نہ ہی ماں کو کچھ بتایا اور نہ ہی باپ کو۔ اس کی سہیلیاں کہتی تھیں بھلا یہ کوئی ایسی بات ہے جو والدین سے کی جائے! جوان لڑکیوں کو راہ چلتے لوگ دیکھتے اور جھانکتے ہی آئے ہیں۔ زبانی کلامی کبھی وہ ان کے غلام بن جاتے، کبھی خود کو ان کے ملازم گردانتے اور اول فول بولتے ہی رہتے ہیں۔ بولتے جائیں، بھونکتے رہیں، بھلا کوئی کتوں کے بھونکنے سے ڈر کر سڑکوں پر چلنا چھوڑ دیتا ہے؟

اس دن ان کے گاؤں میں ایک چھ سات سال کے لڑکے کو ایک پاگل کتے نے کاٹ کھایا۔ محلے کی

عورتوں نے مل کر لڑکے کے زخم پر سرخ مرچیں باندھیں۔ مرچوں کی کڑواہٹ سے کتے کے دانتوں کا زہر ختم ہو جاتا تھا۔ پورو نے یہ خبر سنی۔ فوراً اسے خیال آیا کہ وہ سرخ مرچیں کوٹ کر رشیدے کی آنکھوں میں بھر دے۔ رشیدے کی آنکھوں کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ زہر آلود ہو جاتی۔

سہیلیاں اس کے بازو کھینچتیں، مگر اس کو حوصلہ نہ ہوتا کہ وہ کھیتوں کو جائے۔

اب اس کی شادی نزدیک آ رہی تھی۔ اس کے والد نے گھی اور میدہ اکٹھا کر کے گھر رکھ لیا تھا۔ اس کی ماں نے بھرے ہوئے باغوں کی پیلی لکڑی سے صندوق بھر لیا تھا۔ سیام سے واپسی پر سامان اوپر نیچے ٹھونس کر اس نے جہیز والا سفید ٹرنک توڑ دیا تھا۔ دوپٹوں پر گوٹے کناری کی تہیں لگاتے لگاتے اس کی پوریں جواب دے گئی تھیں۔ اندرونی کمرہ چمک رہا تھا۔ جس میں اس نے پورو کے جہیز کے لئے پیتل کے پورے اکیاون برتن اکٹھے کر لئے تھے۔ ان دنوں دیہاتوں میں کروشیے کا کام بہت مشہور تھا۔ پورو نے کروشیے کی ٹکیاں جوڑ جوڑ کر پلنگ کی چادر بنائی تھی۔ دوسوت کے تانے بانے گن گن کر چار خانوں والے پھول بنانا سیکھے تھے اور اپنے ہاتھوں سے جہیز کیلئے ڈلو اور موڑھے بنائے تھے۔

پورو نے بان کے چھوٹے سے گچھے سے دیگچی کو صاف کیا، پھر دوبار پانی سے ساگ کو دھو کر اس میں چنے کی دال ڈالی اور دیگچی کو منہ تک بھر دیا۔ مٹی کے بنے چولھے پر دودھ ہلکی آنچ میں کڑھ رہا تھا۔ اس نے لکڑی کے دو چار ٹکڑے چولھے میں ڈالے اور ساگ اوپر رکھ دیا۔

اس کی شادی اب بالکل نزدیک تھی۔ اس کی ماں کو انتظار تھا کہ ہوسکتا ہے آج کل میں اس کے سسرال سے کوئی کپڑوں کا ناپ ہی نہ لینے آ جائے۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ وہ کتنی سگھڑ بیٹی ہے۔ کھانا تو وہ صحن میں گھومتے پھرتے ہی بنا لیتی تھی۔ اس کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ اس کو جوانی بھی طوفانی آئی ہے۔ اس کے سفید دودھیا چہرے پر آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ اس کی ماں نے لالچ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اس سوچ میں تھی کہ پورو اب سسرال چلی جائے گی اور اس کا میکا بھائیں بھائیں کرے گا۔ وہ اپنی ماں کا دایاں بازو تھی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہر بیٹی کی ماں کو رونا پڑتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اس کی ماں نے گانا شروع کر دیا:

لاویں تے لاویں نہ کلیجے دے نال مائے
دسیں تے دسیں اک بات نی

باتاں تے لمیاں نی دھیاں کیوں جمیاں نی

اج وچھوڑے والی رات نی

(ماں! آج مجھے کلیجے سے لگاؤ نا! اور مجھے ایک بات سمجھاؤ، بیٹی! باتیں تو بہت لمبی ہیں مگر خدا جانے بیٹیاں کیوں دنیا میں آتی ہیں، مختصر یہ کہ آج ہمارے بچھڑنے کی رات ہے)

اس کی ماں کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ پورو رسوئی کے چھوٹے چھوٹے کام سمیٹتے ہوئے اپنی ماں کی آواز سن رہی تھی۔ اس کو بچھڑ جانے کا خوف ہوا۔ اس کی ماں نے پھر گانا شروع کیا۔

چرکھا جوڑ ہنی آں میں چھوپے جو پانی آں میں

پڑیاں تے والے میرے کھیس نی

پتراں نوں دتے اچے محل تے ماڑیاں

دھیاں نوں دتا پردیس نی

(جب میں چرخہ لے کر بیٹھتی ہوں اور سوت کی اٹیوں کا ڈھیر لگاتی ہوں اور اُن سے جو کھیس بنتے ہیں، صرف وہ میرا جہیز ہیں، ماں! تو بیٹوں کو محل اور کھلیان دیتی ہے اور بیٹیوں کیلئے تیرے پاس سوائے پردیس کے کچھ بھی نہیں!)

وہ بھاگتی ہوئی آئی اور ماں کے گھٹنوں سے لگ گئی۔ ماں بیٹی دونوں رو پڑیں۔ ہر بیٹی کی جوانی اس کو اپنی ماں سے جدا کر دیتی ہے۔

ماں نے دل بڑا کرتے ہوئے بیٹی کی پشت پر پیار کیا۔ سہ پہر کا ملگجا اندھیرا ان کے صحن میں اتر آیا تھا۔ ماں کو یاد آیا کہ آج دوسرے وقت کے پکانے کے لئے کچھ نہیں شاید پورو کے سسرال سے ہی کوئی نہ آجائے۔

پورو کو اس کی ماں نے کہا کہ وہ چھوٹی بہن کو ساتھ لے جائے اور قریبی کھیتوں سے کچھ بھنڈیاں ہی توڑ لائے۔ پھر ماں نے سمجھایا کہ گڑ کی بھیلی ڈال کر تھوڑے سے میٹھے چاول بھی پکا لے۔

پورو کا دل آج انجانے خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لیا اور باہر چل پڑی۔

اس نے بھنڈیاں توڑیں، دو چار مونگرے توڑے اور الٹے پاؤں چھوٹی بہن کو ساتھ لیکر گھر کو واپس

مڑی۔ جاتے ہوئے اسے صرف یہ خیال ہی آتا رہا کہ وہ اب اپنی ماں سے جدا ہو جائے گی، اپنی بہنوں سے بچھڑ جائے گی۔ اپنے نومولود بھائی سے دور چلی جائے گی۔ لیکن آتے ہوئے اس کو جیسے کوئی دھچکا لگتا ہے۔ ایک خیال آیا۔ اری جانے والی! ہو سکتا ہے یہاں رشیدا ہی مل جائے۔

اس نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ ''پورو دوڑ کیوں رہی ہو؟'' اس کی چھوٹی بہن کو سانس چڑھ گیا تھا۔

پورو کے پیچھے سے دوڑتی ہوئی ایک گھوڑی آئی۔ وہ ابھی پگڈنڈی سے ایک طرف بھی نہیں ہوئی تھی کہ نہ جانے گھوڑی تھی کہ گھوڑی کا سوار پورو کے دائیں کندھے سے آ لگا۔ پورو جیسے بالکل ہی گرنے لگی تھی کہ اس کو کسی نے کندھے سے کھینچ کر گھوڑی پر ڈال لیا، اس کی چیخیں اڑتی ہوئی گھوڑی کے ساتھ لحہ بہ لحہ دور ہوتی چلی گئیں۔ اس کی چھوٹی بہن کانپتی ہی رہ گئی۔

معلوم نہیں وہ گھوڑی کہاں سے آئی تھی، پتہ نہیں اس کا سوار کون تھا، نامعلوم گھوڑی کتنی دیر بھاگتی رہی۔ پورو بے ہوش ہو گئی۔ اس کو جب ہوش آیا، وہ چار دیواری اور بند دروازے والے ایک مکان میں چارپائی کے اوپر تھی۔

اس کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے دیواروں سے ماتھا ٹکرایا، اس نے دروازے سے ماتھا ٹکرایا۔

تھک ہار کر وہ چارپائی پر گر گئی، پھر بے ہوش ہو گئی۔

اس کو جب ہوش آئی، کوئی اس کے سر میں گرم گھی سے مالش کر رہا تھا۔ اس کو ایک بار تو خیال آیا شاید اس کی ماں اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کو سخت بخار تھا۔

''اماں جی!'' اس کے منہ سے نکلا۔

''میرا کیا معاف کر اور ایک بار ہوش کر پورو!'' کسی نے سرہانے کی طرف سے کہا۔

بخار میں جلتی ہوئی پورو نے سر اٹھا کر دیکھا، رشیدا اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ پورو کی ایک چیخ نکلی اور اس پر غشی طاری ہو گئی۔

اس نے دیکھا کالے بالوں والا ایک ریچھ اس کے بالوں میں اپنے پنجے پھیر رہا تھا۔ وہ ایک گپھا میں قید تھی۔ وہ سمٹتی جا رہی تھی۔ ریچھ پھیلتا جا رہا تھا۔ ریچھ نے اپنے بالوں سے بھری بانہوں میں اسے لپیٹ لیا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، کوئی اس کے پاؤں کے تلوؤں کی مساج کر رہا تھا۔ پھر کسی نے اس کے کندھے پکڑے۔ پھر کسی نے پانی کے چلو اس کے منہ میں ڈالے۔

ریچھ کی گپھا کہ رشیدے کا گھر؟ پورو کا سر چکرا رہا تھا، پھر شاید وہ سوئی۔

اس کو اپنی ماں، اپنا گاؤں سب کچھ یاد تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس گپھا میں پڑے پڑے کئی سال ہو گئے تھے۔ رشیدے کی شکل دیکھنے کی اسے عادت ہو گئی تھی۔ نہ رشیدے نے اس کو کبھی کچھ کہا تھا نہ اس نے رشیدے کو بلایا تھا۔ سوئی ہوئی کے منہ میں رشیدا گرم کیے ہوئے گڑ اور گھی کے چمچ ڈالتا۔ کبھی کچھ اس کے معدے میں اتر جاتا، کبھی وہ تھوک دیتی تھی۔

پھر اس نے حوصلہ کر کے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے پاس'' رشیدا چارپائی کے سامنے لکڑی کے ایک چوکے پر بیٹھا تھا۔ رشیدے کا چہرہ نیچے تھا، آج رشیدے کی پھٹی پھٹی آنکھیں پورو کے چہرے پر نہیں پڑ رہی تھیں۔

''تو مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟'' پورو کو پوچھنے کا حوصلہ ہوا۔

''پھر کبھی بتاؤں گا'' رشیدے نے اتنا کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ گم سم پورو چارپائی پر لیٹی رہی۔

اب کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پورو نے دیکھا باہر ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ دالان کے ساتھ ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور پھر باہر کا دروازہ۔

وہ کانپتے کانپتے اٹھی، اس نے چاروں طرف دیواروں کو دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ ابھی کوئی دیواروں کے بیچ سے نکل آئے گا، اس کو بازوؤں سے پکڑ کر چارپائی پر پھینک دے گا، لیکن دیواروں سے کوئی نہ نکلا۔ پورو باہر والے دالان میں آ گئی۔

دالان کے ایک کونے میں چولھے پر بجھی ہوئی آگ تھی۔ پاس ایک ہانڈی، توا اور پرات بکھرے ہوئے تھے۔ پانی سے بھری گاگر کونے میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ کانپتے پیروں سے برآمدے میں آئی۔ باہر والے دروازے کے پاس آئی پھر پیچھے مڑ کر کوٹھڑی کی طرف دیکھا، پھر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

لیکن مکان کا دروازہ پورو کی قسمت کی طرح بند تھا۔ پورو نے بند دروازے سے سر جوڑا، لیکن

دروازے کو پورو کے گرے ہوئے سر پر ترس آیا نہ اوندھے پڑے ہوئے چہرے پر، نہ بھیگی ہوئی آنکھوں پر۔

پلو سے منہ پونچھ کر وہ دروازے سے واپس آئی۔ گاگر سے پانی کا ایک چلو بھر کر آنکھوں پر ڈالا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ وہ دروازے کو کھٹکھٹا کر دیکھے، شاید کوئی پڑوسی یا راہ گیر اس کی آواز سن لے۔

اس نے دالان کی کچی اور اونچی دیواروں کی طرف دیکھا پھر ایک بار پورے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازے کے سوراخوں میں سے دیکھا۔ باہر کھلا سا میدان تھا، کوئی مکان، جھونپڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر بے بس ہوگئی، وہ نا معلوم کس جنگل میں تھی ....

پورو دروازے کے پاس کھڑی تھی، باہر سے دروازہ کھلا۔ رشیدے نے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا، پھر تالا لگا دیا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔

''پورو یونہی کیوں ہوا سے سر ٹکراتی ہے، اندر چل اور کچھ کھا لے، تو نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔'' رشیدے نے کھڑے کہا۔ نہ تو پورو کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، نہ ہی اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''مجھ پر ترس کھا رشیدے مجھے گھر چھوڑ آ!'' پورو اس کے پیروں پر گر پڑی۔

آج رشیدے نے پورو کو اپنے مضبوط جوان بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''میرے من کی آگ کو کون بجھائے گا؟''

رشیدے نے ہاتھ پاؤں چلاتی پورو کو اپنی بانہوں میں پکڑے رکھا۔

وہ دن بھی گزر گیا، وہ رات بھی گزر گئی۔ پھر رشیدے نے اس کو کچھ نہ کہا۔ دروازہ اسی طرح بند تھا، رشیدا ویسے ہی اس کے پہرے پر تھا۔

رشیدا اس گھر سے باہر جاتا، گھنٹا دو گھنٹے باہر ہی گزار آتا۔ پورو قید رہتی۔ پھر صبح و شام کے گھرے اندھیروں میں رشیدا پورو کا ہاتھ پکڑ کر اس کو گھر سے باہر لے جانے لگا۔ پورو نے دیکھا اس کے علاوہ آس پاس کے اس میدان میں کوئی گھر نہیں تھا۔ رشیدے کے اس مکان کے ارد گرد دور دور تک پھیلا ہوا ایک باغ تھا۔ یہ گھر شاید باغ کے مالیوں کا گھر تھا۔ باغ میں مالی ہونگے، لیکن پورو نے نہ ان کو سنا اور نہ ہی کبھی دیکھا تھا۔ نہ پورو کے دن گزرتے، نہ پورو کی راتیں ختم ہوتیں۔ پورو صرف یہی شکر کرتی تھی کہ رشیدے نے اس کو کبھی کوئی بری بھلی نہیں کہی تھی۔ اس کی عزت ابھی تک محفوظ تھی۔ یہ اور بات کہ اس پر نہ اس کی منتیں اثر کرتیں، نہ ہی اس کی گالیاں۔

پورو کے اپنے خیال کے مطابق اسے قید ہوئے پورے پندرہ دن ہو گئے تھے۔
ایک دن رشیدے نے ریشم کا ایک سرخ جوڑا پورو کے سامنے لا کر رکھا۔ اس سے پہلے بھی رشیدا سوت کے جوڑے اس کے پہننے کے لئے لایا تھا، لیکن اس مرتبہ رشیدے نے لال ریشم کا جوڑا اس پر رکھتے ہوئے کہا'' صبح نہا دھو کر تیار ہو جانا، مولوی آ کر ہمارا نکاح پڑھا دے گا۔''
پورو کا دل دھک سے رہ گیا۔ جا بد بخت!'' جواب تک نہیں ہوا، وہ ہو کر رہے گا۔''
اس دن وہ پھر رشیدے کے پاؤں پر گر پڑی۔
''پورو ہونا ہوانا کچھ نہیں! یونہی میرے سر گناہوں کا بوجھ مت بڑھا۔ قسم ہے اللہ پاک کی، مجھ سے تیرا رونا دیکھا نہیں جاتا۔'' رشیدے نے منہ پھیر کر کہا۔
پورو کو سمجھ نہ آئی کہ اگر رشیدا اتنا ہی مہربان تھا تو اس نے اس کے سر پر اتنا قہر کیوں ڈھایا۔
''تجھے اپنے اللہ کی قسم ہے رشیدیا، مجھے سچ بتا تو نے مجھ سے ایسا کیوں کیا؟''
''پورو تیرا میرا رشتہ ہمارے پرکھوں کے لینے دینے کا نتیجہ ہیں۔ اب تجھے ان باتوں سے کیا لینا دینا ہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا، میں تجھے ساری عمر دکھی نہیں ہونے دوں گا۔
پورو حیران تھی، پریشان تھی، یہ کیسا بندہ ہے۔'' پورو! ہمارے شیخوں کے گھرانے اور تمہارے شاہوں کے گھرانے میں ہمارے دادا کے وقت سے ایک بیر چلا آ رہا ہے۔ تیرے دادا نے پانچ سو کے عوض گروی رکھے ہمارے مکان پر سود در سود لگائے تھے اور پھر نیلامی کروا کر شیخوں کے گھرانے کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں،'' اس کے منشیوں اور کارندوں نے ہمارے گھر کی عورتوں کو برا بھلا کہا اور میرے دادا کی بڑی بیٹی کو زبردستی تیرے دادا کے بڑے بیٹے نے تین راتیں اپنے گھر رکھا۔ تیرے دادا کے سامنے اتنا بڑا ظلم ہوا، لیکن شیخوں کا گھرانہ اس وقت بیلنے میں آئے گنے کی طرح شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ سب خون کے آنسو پی کر رہ گئے، لیکن میرے دادا نے اپنے بیٹوں کو قرآن پر قسمیں اٹھوائیں تھیں کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ اس سے اگلی پود کے وقت یہ چنگاری دبی رہی۔ اب جب کہ تیری شادی اسی گاؤں میں ہونے لگی، میرے دادا کے بیٹوں کے خون میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے مجھ سے قسمیں اٹھوائیں، میرے خون کو للکارا اور مجھ سے قول لیا کہ تم شاہوں کی بیٹی کو شادی سے پہلے پہلے کسی بھی دن اٹھا لو گے۔'' رشیدا چپ ہو گیا۔ ایک میری محبت کا جوش، دوسرا میری حمایت میں سارا شیخ گھرانہ۔ میں تجھے لے آیا ہوں، لیکن مجھ سے قسم لے لے،

مجھ سے تیرا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔'' رشیدے نے پھر کہا۔

پورو نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ ''تیری پھوپھی کو میرے تایا نے اٹھالیا۔ لیکن رشیدیا! اس میں میرا کیا قصور؟ ہائے میں کہیں کی نہ رہی!'' پورو کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

''یہی بات تو میں کہتا تھا لیکن میرے چچا مجھے لعنت ملامت کرتے تھے۔''

''تو رشیدیا، تو نے ان کے بہکاوے میں آکر مجھے مار دیا؟'' پورو روتی کہہ گئی۔

''پورو! تمام عمر تیرے آگے دنیا بھر کی نعمتوں کے ڈھیر لگا کر رکھوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے رشیدے کا گلا بھر آیا تھا۔ ''میں تیرے تائے کی طرح نہیں کروں گا کہ بیوی کی طرح رکھی عورت کو تین راتوں کے بعد دھکا دے دوں۔''

''رشیدیا مجھے ایک بار اپنی ماں سے ملا دے۔'' پورو کو کہنے کے لئے بس یہی سوجھا۔

''نیک بخت! اب اُس گھر میں تیری جگہ نہیں۔ شاہوں کی برادری کا کون ہندو اب ان کے گھر کا پانی پئے گا۔ تم میرے گھر پندرہ دن رہ چکی ہو۔''

''لیکن میں نے تیرے گھر سے صرف کھایا پیا ہے، میں.....'' پورو آگے کچھ نہ کہہ سکی لیکن رشیدا سمجھ گیا جو پورو کہنا چاہتی تھی۔

''اس بات کو کون مانے گا پورو۔ یہ تو میری شرافت ہے کہ پہلے میں تیرے ساتھ نکاح پڑھواؤں گا۔'' رشیدے نے نرم نگاہوں سے پورو کی طرف دیکھا۔

پورو کے دل میں اس کا منگیتر آگیا تھا۔ اس کو تیل چڑھنا تھا، اس نے مائیوں بیٹھنا تھا۔ اس نے ہلدی کا ابٹن لگانا تھا۔ اس نے ہاتھی دانت کا بنا چوڑا چڑھانا تھا۔ اس نے کوڈیوں والے گانے چھنکانے تھے، اس نے ریشمی سوٹ پہننے تھے۔ اس کو روپ چڑھنا تھا۔ اس نے ڈولی میں بیٹھنا تھا۔ وہ.........وہ.........

وہ بے گناہ تھی۔ وہ مان نہیں سکتی تھی کہ کس طرح اس کی ماں پتھر ہو جائے گی، کیسے اس کا باپ فولاد کا ہو جائے گا۔ کیسے وہ اپنی بیٹی کو اپنے گھر سے دھتکار دیں گے۔ کس طرح اس کے گھر کے دروازے اسے اندر آنے سے انکار کر دیں گے......

''میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا جب میں گھر نہ پہنچی ہوں گی، میری بہن......''

''وہ روتے پیٹتے رہے ہیں اسی طرح جیسے میرا دادا، میرا باپ اور چچے میری پھوپھی کے چلے جانے

کے وقت ۔ پولیس بھی بہت گھوم پھر چکی ہے لیکن وہ بھی کوئی سراغ نہیں لگا سکی، لگا بھی کیسے سکتی ہے پولیس نے پورے پانچ سو روپے کھائے ہیں۔"

رشید امسکرا پڑا۔

"تم جانتی ہو اس وقت ہمارا پلڑا بھاری ہے۔ سارا گاؤں مسلمانوں کا ہے اور کوئی ہندو آنکھ اٹھا کر ہماری طرف نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے جان و مال محفوظ ہیں۔ ان کو اپنے سر سلامت چاہئیں، وہ بول نہیں سکتے۔ اگر وہ ہمارے گھر کی طرف انگلی بھی اٹھا دیتے تو ہمارے لوگ انہیں کھالا بھی پار نہ کرنے دیتے۔"

رشیدے نے ہنس کر کہا۔ شاید اس کے اندر پرانے انتقام کی آگ سلگ اٹھی تھی۔ پورو کو رشیدے کے چہرے سے شدید نفرت تھی۔ اس کی دنیا گئی، جہان گیا۔ شاید اس کے ماں باپ چھوٹو آنی کو اپنی بیٹی کی قربانی دے کر سیام واپس لوٹ گئے ہوں۔

"میرے ماں باپ سیام چلے گئے ہیں؟" پورو نے چاپلوسانہ پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں۔" رشیدے نے بتا دیا۔ "میں کہاں رہتی ہوں؟ اپنے گاؤں سے کتنی دور؟" پورو نے اسی خوشامد میں پوچھا۔"

"تو اپنے گاؤں کی پچھلی طرف، ماگو گاؤں کے کنویں کے دوسری طرف میرے باغ میں۔ لیکن تو شاید اپنے گاؤں جانے کا خواب دیکھتی ہوگی۔ ابھی نہیں ذرا ٹھہر..... بات دب جائے تو چھ مہینے کے بعد وہاں بھی جائیں گے۔" رشید امسکرا پڑا۔

پورو گم سم سی ہوگئی۔ رشیدے نے چاولوں کے میٹھے پلاؤ کی ایک پرات بھر کر اس کے آگے رکھ دی۔ رشید اجب باہر جاتا شاید کسی کے ہاتھ اپنے گاؤں سے کھانا منگوا لیتا، پورو کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس دن پورو کے دل میں امید کی کچھ رمق پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ہمت اسے جواب نہ دے جائے یہ سوچ کر پورو نے چاولوں کے دو چار نوالے نگل لئے۔ پانی بھی گھونٹ گھونٹ کر کے پورا کٹورا پی لیا۔ اس رات پورو نے پوری کوشش سے اپنے من کو پکا لیا۔ رشیدے کے سرہانے دروازے کی چابی پڑی ہوئی تھی پورو نے دھیرے سے اٹھائی۔ دروازہ کھولا، اس کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ رشید اب جاگا کہ جاگا لیکن اس کی خوش قسمتی یا بدقسمتی رشید انہ جاگا۔

باہر رات کا سناٹا دیکھ کر پورو کانپ گئی۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ رشیدے کے پاس واپس چلی جائے۔ کیا پتہ وہ رات کے اندھیرے میں چھتو آنی کا راستہ بھی ڈھونڈ سکے گی یا نہیں۔ شاید رات کے اندھیرے میں وہ رشیدے سے بھی گئے گزرے کسی کمی کمین کے ہاتھ لگ جائے۔ نہ جانے اس کا کیا حال ہو لیکن پورو کو اپنی ماں کا چہرہ یاد آیا۔ اسے بہن بھائی یاد آئے۔ اس نے ویسے ہی ماگو گاؤں کے کنوئیں کی سمت کا اندازہ لگایا۔ ڈرتی کانپتی وہ چل پڑی۔ رات کا گہرا اندھیرا چھٹ گیا تھا۔ ماگو گاؤں کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اس نے اندھیرے میں ہی چھتو آنی گاؤں کا پچھواڑہ پہچانا، اب وہ نہ ادھر کی تھی اور نہ اُدھر کی۔ اس نے رہی سہی ہمت پیروں کے حوالے کی اور دوڑتی گئی۔ اس نے چھتو آنی گاؤں کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے گھر کی طرف مڑتی ہوئی گلی پہچانی، اس نے ہلکے ہوتے ہوئے اندھیرے میں گھر کی منڈیر پہچانی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جیسے ہی اندر سے کسی نے دروازہ کھولا وہ اپنی ڈیوڑھی میں فرش پر گر پڑی۔ اس نے اپنی ہمت کا آخری حصہ بھی صرف کر دیا تھا۔ اب وہ دوڑتی ہانپتی اپنے گھر پہنچ چکی تھی اور اب اس کی ہمت جیسے جواب دے چکی تھی۔ پورو نے اندھیرے میں ٹٹولتی آنکھوں سے دیکھا اس کی ماں، اس کا باپ دیا ہاتھ میں لئے اس کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔ پورو نے ایک زخمی جانور کی طرح برآمدے کے کچے فرش پر سسکنا شروع کیا۔ اس نے دیکھا اس کی ماں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ماں نے گری ہوئی پورو کو جھولی میں بٹھا لیا۔ اس نے ماں کی چھاتیوں سے اپنے ماتھے کو اس طرح چمٹا لیا جیسے ٹوٹی ہوئیں آنتیں ابھی جڑ جائیں گی۔ پھر پورو کی ماں کی چیخیں نکل گئیں۔ لوگ ابھی اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس کے باپ نے اپنی بیوی کا شانہ ہلایا۔ اس کی ماں نے پلو کو نے سے اکٹھا کر کے منہ میں ٹھونس لیا۔ ''بیٹی تیری قسمت! اب ہمارے بس میں کچھ نہیں'' اسے باپ کی آواز آئی۔ وہ ماں سے چمٹی رہی۔

''ابھی شیخ آجائیں گے اور ہم سب کو ختم کر دیں گے۔ مجھے اپنے ساتھ سیام لے چلو۔'' پورو نے اپنا سر ماں کی چھاتی سے ہٹا کر پورے دعوے سے کہا۔

''ہم تجھے کہاں رکھیں گے، کون تجھے بیاہ کر لے جائے گا، تیرا دھرم گیا، تیرا جنم گیا، اگر ہم بولے تو ہمارے خون کا قطرہ بھی نہیں ملے گا۔

''ہائے! مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دو!'' پورو نے تڑپ کر کہا۔

''پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ اب یہاں سے چلی جا، ابھی شیخ آتے ہی ہوں گے۔ تیرے باپ اور

بھائی کا کہیں نشان بھی نہیں ملے گا۔ وہ سب کو ماردیں گے۔'' ماں نے نہ جانے کیسے دل پر پتھر رکھ کر یہ بات کی۔

پورو کو یاد آیا رشیدا کہتا تھا نیک بختے اب اس گھر میں تیری کوئی جگہ نہیں۔ کیا رشیدا سچ کہتا تھا۔ پورو کو ایک بار اپنا منگیتر یاد آیا۔ کیسی منگنی اور کیسی شادی۔ کیا وہ اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ اس نے اس کا حال بھی نہ پوچھا۔ پھر اس کا جینے کو جی نہ کیا۔ اس نے سوچا اور تو سارے راستے بند تھے شاید موت کا راستہ کھلا ہو۔ وہ اٹھ کر باہر کی سمت چل پڑی نہ ہی ماں نے روکا اور نہ باپ نے، پورو چلی گئی۔ آتے ہوئے وہ زندگی سے ملنے آرہی تھی، اس میں جینے کی امنگ تھی۔ ماں باپ سے ملنے کے لئے بہت ڈرتی ہوئی آئی تھی، واپسی پر وہ موت سے ملنے جارہی تھی۔ اب اس میں کوئی ڈر نہیں تھا۔ موت سے زیادہ کسی نے کیا لینا ہے۔ وہ نڈر ما گوگاؤں کے کنویں کی سمت جارہی تھی۔ سامنے رشیدا تیزی سے آرہا تھا۔ پورو کے پاؤں جم گئے۔ موت نے بھی پورو پر اپنا دروازہ بند کردیا تھا۔ پورو کو محسوس ہوا ان پندرہ دنوں نے اس کے بدن سے سارا گوشت اتار لیا تھا۔ اب وہ بس ایک ایسا پنجر تھی جس کی نہ کوئی شکل نہ صورت، نہ کوئی دل نہ کوئی مرضی۔ رشیدے نے آکر اسے بازو سے پکڑ لیا، وہ اس کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔ اس کے تین دن بعد ایک مولوی آیا۔ دو تین آدمی اور آئے۔ انہوں نے پورو کا نکاح رشیدے کے ساتھ کردیا اور پھر خود ہی رشیدے نے بتایا کہ اس کے ماں باپ خیریت سے سیام چلے گئے ہیں۔ چھوتو آنی کے نام سے پورو کو نفرت ہوگئی تھی۔ رشیدا بھی اس بات کو سمجھتا تھا۔ پھر چھوتو آنی اسے لیکر جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، شاید رشیدا سوچتا تھا کہ کہیں ساتھ والے گاؤں کے ہندو نہ بھڑک اٹھیں۔ چاہے اس وقت تک مہینہ پورا ہونے والا تھا اور کسی کو جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ بول سکے۔ ویسے بھی پرائی آگ میں کون کودتا ہے۔ ان کی پشتوں کی دشمنی تھی۔ کسی نے جاری رکھی اور کسی نے ختم کردی۔ رشیدے کی کوئی بہن یا ماں زندہ نہیں تھی۔ صرف بھائی تھے، چچا تھے۔ رشیدے نے پورو سے کہا کہ وہ اسے میلوں دور ایک گاؤں سکڑ آلے اپنے دادا کے پوتے کے رشتے کے بھائی رحیمے کی زمینوں پر لے جائے گا۔ شاید اس کی کچھ زمین کو اپنی زمین سے بدل بھی لے۔ اب پورو ہونی کے ہر دھکے کے لئے تیار تھی۔ سگے ماں باپ نے دھکا دے دیا اب گاؤں میں کیا رکھا تھا، یہاں نہ سہی وہاں ہی سہی۔

رشیدا خود ہی گھر کے بڑے کی طرح دو تین چھوٹے ٹرنک اور کچھ چھوٹا موٹا سامان لایا اور پورو کو لے کر سکڑ آلے چل پڑا۔ جیسے جیون کوئی راستوں پر آنکھیں بند کر کے چلتا ہے۔ وہ رشیدے کے ساتھ نئے گاؤں

میں آ گئی۔ نئے گاؤں میں پہنچتے ہی پورو اور رشیدے کو علیحدہ مکان مل گیا۔ شاید رشیدے نے پہلے ہی رحیمے کو کہہ کر یہ طے کر لیا تھا۔ رحیمے کا گھر ان سے زیادہ دور تھا لیکن جب رحیمے کے گھر سے عورتیں اس کو ملنے آئیں تو وہ پہلا موقع تھا جب پورو کو رشیدے کے رشتہ داروں میں سے عورتوں سے واسطہ پڑا۔

پورو ایک کھوئی ہوئی بچھڑیا کی طرح ان کے پاس بیٹھی رہی۔ ان بھلے لوگوں نے پورو سے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی۔ چھوٹی موٹی گھر کی ضرورتوں کے بارے میں پوچھتیں رہیں۔ رشیدا اس وقت تک پورو کو پورو کہتا تھا۔ نکاح کے وقت اس کا رکھا ہوا نام حمیداں آج بھی اس کی زبان پر نہیں چڑھا تھا۔ ایک دن اچانک رشیدا ایک آدمی کو گھر لے کر آیا۔ وہ بازوؤں پر عورتوں مردوں کے نام لکھتا تھا۔ اس دن پورو پھر کلیجہ تھام کر رہ گئی جب رشیدے کے کہنے پر اس نے بایاں بازو آگے کر دیا اور اس پر گہرے حروف سے ''حمیداں'' لکھا گیا۔ اس دن سے رشیدا بھی اسے حمیداں کہنے لگا۔ شاید یہ مشورہ رحیمے نے دیا تھا۔

پورو اب حمیداں بن گئی تھی لیکن ابھی تک جب رات کو پورو سونے کے لئے جاتی اس کے خوابوں میں اس کو سہیلیاں ملتی، اس کے خوابوں میں وہ ماں باپ کے گھر میں کھیلتی ہوئی ملتی۔ سارے اس کو پورو کہتے، پورو دن کی روشنی میں حمیداں بنتی، رات کے اندھیروں میں پورو ہوتی لیکن وہ سوچتی اصل میں نہ تو وہ حمیداں تھی اور نہ ہی پورو، وہ صرف ایک پنجر کا بس ایک ڈھانچہ تھی۔ جس کا نہ کوئی روپ تھا نہ ہی کوئی نام۔ پانچ چھے ماہ ہی گزرے تھے کہ پورو کے پنجر میں ایک ننھی سی جان نے سرکنا شروع کیا........

بیساکھی کا میلہ

دن سرمئی تھا اور بیتے ہوئے دن ایک ایک کر کے پورو کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے۔ بوری کے ایک ٹکڑے کو پاؤں کے نیچے دبائے وہ پتھر بنی انہیں دیکھتی رہی۔

باہر والا دروازہ کھول کر رشیدا اندر دالان میں آ کھڑا ہوا۔ اس کو جیسے دروازہ کھلنے کی آہٹ بھی سنائی نہ دی۔ اسے جیسے کوئی اندر آتا ہوا بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہی۔ رشیدے کو شاید سچ مچ پورو سے اب پیار ہو گیا تھا۔ رشیدا چپ چاپ آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''خدا کی بندی۔'' رشیدے نے پورو کو اپنے ایک بازو میں لے لیا۔ وہ آج بہت ہی اداس تھی، وہ نہ

ہل سکی اور نہ ہی بول۔

رشیدا اسے پیار کرتا رہا پھر خاصی دیر بعد پورو نے کہا۔

''آج مجھے اس طرح محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی میرے اندر میری آنتیں کتر رہا ہو۔''

رشیدا ہنستا رہا۔ پورو کا جی بہلاتا رہا۔ پھر رشیدے نے چولھے میں بجھی ہوئی آگ سلگائی اور پورو کو پاس بٹھا کر خود ایک چھوٹے پتیلے میں بٹیرے بھوننے لگا۔

''نہ تُو کہیں باہر جاتی ہے نہ تُو کسی سے ملتی جلتی ہے اس طرح تو آدمی کا جی خواہ مخواہ اداس ہو جاتا ہے۔'' رشیدے نے کچھ دیر ٹھہر کر کہا۔

''کہاں جاؤں، میرا اور ٹھکانہ ہی کہاں ہے؟''

پورو نے بہت ہی ناامیدی سے کہا۔

''اب تو گھر کی مالکن ہے۔ اور چار دنوں کے بعد تیرے صحن میں ایک ننھی جان کھیلے گی میری خاطر نہ سہی اس کی خاطر ہی سہی۔ تجھے دل لگانا چاہیے، اس بے چارے نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟'' رشیدے کو اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا۔

اس نے پورو کو اسی کا واسطہ دیا۔

پورو کو پھر وہ مٹروں میں سے نکلی ہوئی سنڈی یاد آ گئی۔ جس سنڈی کو دیکھ کر کسی کا جی متلائے، جس سنڈی کے ساتھ لگے مٹروں کو بھی کوئی دور نہ پھینک دے۔

''لاؤ! بٹیروں کے مسالے میں تھوڑے سے مٹر بھی ڈال دیں۔'' رشیدے نے پورو کے آگے بکھرے ہوئے مٹروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مٹر تو سارے پکے ہوئے ہیں، مٹروں کا کون سا موسم ہے۔ اوپر سے بیساکھ شروع ہونے کو ہے۔''

پورو کو معلوم تھا آج اس سے مٹر نہیں کھائے جائیں گے۔

''ہاں سچ، کل تو بیساکھی کا بڑا میلہ لگ رہا ہے۔'' رشیدے نے آرام سے کہا۔

''بیساکھی ...... بیساکھی ......'' پورو کے کانوں میں گونجنے لگا اور وہ پرات میں دو تین مٹھیاں آٹا ڈال کر گوندھنے لگی تا کہ اس کا خیال کسی اور طرف بٹ جائے۔

''آج تو میرا دل کر رہا ہے کہ گڑ ڈال کر سویاں بنائیں۔'' رشیدے نے کہا۔ پورو چپ چاپ اندر سے سویاں اور گڑ نکال لائی۔

اس وقت پورو کو یاد آیا کہ بہت دیر پہلے کی بات تھی جب ایک دن اس کی ماں بیٹھ کر سوجی کی سویاں بٹ رہی تھی اور اس نے کہا تھا ''ماں! اری ماں! میرا تو مشین پر بٹی ہوئی سویاں کھانے کو جی کرتا ہے۔'' اور ماں نے کسی تحمل کے بغیر کہا تھا ''اری پگلی ...... !وہ تو مسلمان کھاتے ہیں۔''

یہ بات یاد کر کے پہلے تو پورو کی آنکھیں بھر آئیں پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔

رشیدا اس کی ہنسی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ پورو نے وہ بات سنا دی، سناتے سناتے پھر اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ رشیدا شرمندہ سی ہنسی ہنستا رہا۔

اگلے دن پورو جب سو کر اٹھی، گاؤں میں بیساکھی کے ڈھول بج رہے تھے، پہلے تو کام کاج میں جتی رہی پھر وہ اپنی چھت پر چڑھ کر دور میدان میں لگے ہوئے بیساکھی کے میلے کو دیکھنے لگی۔

دور کھڑی پورو کو لوگوں کی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ لمبے تڑنگے جاٹ نئے تہمند باندھے ہوئے، ہاتھوں میں تیل سے چمکتی لاٹھیاں، بڑی گرمجوشی سے ادھر سے اُدھر جاتے، کئی گھوڑیوں پر سوار تھے، اپنے پیچھے عورتیں بھی بٹھائے ہوئے اور آگے ایک دو بچے بھی، کئی عورتیں بچوں کو انگلی لگائے چلی جا رہی تھیں۔ کئی نوجوان اپنی جوانی کے جوش میں آئے چھاتی نکال کر چل رہے تھے، کچھ گاتے جاتے، کچھ بولتے جاتے۔ دور میدان میں کشتیاں ہو رہی ہونگی۔ جلیبیوں کے تھال سجے ہونگے۔ گرم پکوڑوں کی خوشبو دور تک ہوا میں پھیلی ہوئی ہوگی۔ گڑ کے شکر پارے، میدے کی مٹھائیاں اور مٹھائیوں کے رنگ رنگ کے لوہے کے تھال سجے ہوں گے......

پورو کے سر میں لوہے کی چوٹ کی طرح ایک خیال آیا۔ اس کی ماں نے تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اور اس مرتبہ ...... اس مرتبہ اس کی پہلی بیساکھی تھی۔ کھڑی ہوئی پورو چھت پر بیٹھ گئی شاید اس وقت اس کی ماں نے اس کے چھوٹے سے بھائی کو پانی چکھایا ہوگا۔ نزدیک ہی بہتی ہوئی ندی سے پانی لے کر، گلاب کے پھول کو اس پانی میں بھگو کر اس کے بھائی کے چھوٹے چھوٹے گلابی ہونٹوں سے لگایا ہوگا۔ پھر اس کی ماں کو مبارکبادیں ملی ہوں گی اور شاید ...... شاید اس وقت اس کی ماں کو اپنے پیٹ سے جنی ہوئی پورو بھی یاد آئی ہوگی۔ پورو کی آنکھوں میں آنسو بھی آ آ کر تھم گئے تھے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھی رہی۔

جوان جاٹ لڑکوں کی ایک ٹولی کانوں میں پھول پھنسائے ہنستی گاتی دور سے گزر رہی تھی، ان میں

سے کوئی آدمی بولے جار ہا تھا۔

کھوہ تے بیٹھی داتن کردی

چٹیاں دنداں دی ماری

نی آپے تینوں لے جان گے

جہناں نوں لگیں پیاری

نی آپے تینوں لے جان گے

(کنویں پر بیٹھی تو داتن سے دانت صاف نہ کر، اور اپنے سفید دانت اور نہ چمکا، وہ خود ہی تجھے ساتھ لے جائیں گے، جنہیں تو پیاری لگے گی، وہ خود ہی تجھے ساتھ لے جائیں گے)

''ہائے کوئی پیاری لگنے والیوں کے حال تو دیکھے۔'' پورو کے منہ سے دھیرے سے نکلا۔ پھر پورو کو ایک خیال آیا۔ وہ رشیدے کو ہی پیاری لگی، رشیدا اس کو لے آیا۔ وہ اپنے منگیتر رام چند کو کیوں نہ پیاری لگی۔ اس نے تو اس کی خبر ہی نہ لی، وہ تو رام چند کو پیارا لگنا چاہتی تھی۔ رشیدے کو نہ تو اس نے خود سے ڈھونڈا اور نہ ہی اس کے ماں باپ نے۔

جاٹ ناچتے کودتے جار ہے تھے۔ بھنگڑا ڈال رہے تھے، بولیاں گا رہے تھے۔

تیرے لونگ دا وجا لشکارا

ہالیاں نوں ہل بھل گئے

(تیرے لونگ کی چمک جو پڑی، تو کسانوں کو اپنے ہل بھول گئے)

تیرا بھجیا پری دا لہنگا

پچھوں دیاں پین کنیاں

(تیرا پریوں (کے لبادے) جیسا لہنگا بھیگ گیا، (اور تیرے چلنے سے اس کی چھینٹیں پیچھے (آتے عاشقوں پر) برسنے لگیں)

سانوں کڈھ نہ دئیں مُیارے

نی راہے راہے جان والیے!

(ہمیں کہیں (راستے سے) ہٹا نہ دینا، اے راستے میں چلنے والی حسینہ)

پورو سوچتی سارے ہی گیت خوبصورت لڑکیوں کے سوہلے (گیت) گاتے ہیں۔ سارے ہی بھجن بچے پیاروں کو سراہتے ہیں۔ کبھی وہ بھی گیت بنیں گے جن میں میرے جیسی لڑکیوں کا رونا رویا ہوگا؟ کبھی وہ بھی بھجن ہوں گے جن میں بھگوان ہی کوئی نہ ہو؟ ابھرتی جوانی والی کچھ حسینائیں اکٹھی ہو کر میدان کی سمت جارہی تھیں۔ دور جاتے ہوئے جاٹ لڑکوں کے ٹولے مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہنستے تھے شاید اٹکھیلیاں کرتے تھے، ان کو دیکھ کر پورو سوچنے لگی۔ ''اچھا اگر اب ان جوان لڑکیوں کو یہ سارے لڑکے اپنے گھوڑوں پر بٹھا کر بھگا لے جائیں...... پھر کیا ہو؟ اچھا یہ ساری لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائیں......

پورو کا بچہ

سخت گرمی شروع ہو چکی تھی۔ زمین کپاس کی سوکھی ٹہنیاں ڈال کر جلائے ہوئے تنور کی پشت کی طرح دہک رہی تھی۔ پورو کبھی بیٹھتی، کبھی اٹھتی، کبھی لیٹ جاتی۔ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بار بار پانی پیتی۔ اس کی پڑوسن نے اسے کہا کہ آسانی سے نہ سہی جیسے کیسے ہو وہ نہالے اور اپنا سر بھی دھولے۔ پھر کیا معلوم اسی رات یا اگلے دن پورو کے ہاں کچھ ہو جائے تو پھر وہ کتنے ہی دن اٹھنے کے قابل نہ رہے گی۔

رشیدے نے دیکھا، پورو کا رنگ جسم سے اٹھنے والے درد سے اُٹی کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ رشیدے کو وہ وقت یاد آ گیا جب وہ چھتو آنی کی کچی سڑک سے پورو کو گھوڑی پر اپنے سامنے بٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ پورو کا رنگ اس وقت بھی سفید پھٹکوی جیسا تھا۔ اس وقت پورو کی روح سے ٹیسیں اٹھ رہیں تھیں۔ آج پورو کے جسم سے۔

رشیدے نے رحیمے کے گھر اپنے کھیتوں میں ایک کام کرنے والے کو بھیجا ہوا تھا۔ خود اسے پورو کو اکیلے چھوڑ کر جانے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ رحیمے کی ماں جب آئی، پورو کے چہرے پر شدید درد کی وجہ سے بل پڑ رہے تھے۔ آتے ہوئے رحیمے کی ماں اپنی گلی والی اسی ریشماں دائی کو بھی ساتھ لے آئی تھی جس نے رحیمے کی دونوں بیویوں کے بطن سے دو دو تین تین لڑکے لڑکیاں جنم دلوانے میں مدد کی تھی۔

دائی نے آتے ہی ایک پرانی دری کو فرش پر بچھا کر پورو کو لٹا دیا۔ پورو چارپائی کی نرماہٹ چھوڑ کر سخت زمین پر تڑپنے لگی۔ رشید دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ اسے اندر سے بند کیے ہوئے دروازے سے پورو

کے بھینچے ہوئے دانتوں سے شدید کراہنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس کا جی چاہتا کہ پورو کے جسم سے زیادہ نہیں تو آدھا درد کھینچ کر اپنے جسم میں سمو لے، پورو اکیلی تڑپتی رہی۔

دائی، نئے پنکھے سے پورو کے چہرے پر ہوا کے چھوٹے چھوٹے جھونکے چھوڑتی رہی۔ رحیمے کی ماں نے کئی بار پانی کے چلو پورو کے منہ میں ڈالے۔

تین اونچی چیخوں کے بعد باہر کھڑے رشیدے نے بچے کے رونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد پورو کی کوئی آواز نہ نکلی، رشیدے کو سانس آیا کہ اب اس کی کچھ خلاصی ہوگئی تھی۔ رشیدے کا دل کیا کہ وہ اندر آ جائے دائی تو شاید بچے کے گرد ہوگی، وہ خود جائے، پورو کو دبائے پکڑے، پورو آج تک اس کے ہاتھوں روتی ہی رہی تھی لیکن اندر اس کی چچی بیٹھی ہوئی تھی۔ اندر دائی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب تک وہ خود رشیدے کو اندر نہ بلائیں، رشیدے کا اندر جانا چھچھورا پن لگتا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے۔ پورو کی پھر آواز نہ آئی۔ رشیدے کے دل میں ایک ہول اٹھا۔ پورو زندہ تو ہے؟ تھوڑی بہت بھی آواز کیوں نہیں آرہی؟

ٹھیک آدھا گھنٹہ گزر گیا، جب دائی نے باہر آکر رشیدے سے کہا ''مبارک ہو بیٹا! لڑکا ہوا ہے۔''

''اس کا کیا حال ہے؟'' رشیدے کے منہ سے نکلا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ بیٹا لاکھوں بار مبارک ہو۔ اور کیا بیٹے چھت سے تو نہیں گرتے۔'' دائی نے ایک ایسے حوصلے سے مسکرا کر کہا جس حوصلے سے اس نے کئی عورتوں کے درد اپنے ہاتھوں میں سہے تھے۔

جب رشیدا اندر آیا، لیٹی ہوئی پورو کی آنکھیں الٹی ہوگئی تھیں۔ اس کے ایک طرف ایک سفید کپڑے میں لپٹا یا ہوا اس کا اور رشیدے کا بیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ رشیدے کے من سے خوشی پھوٹی، اس نے پورو کا من جیت لیا تھا، جوئے کے اس کھیل میں اس نے ساری کی ساری پورو کو جیت لیا تھا۔ اب پورو صرف اس کی بھگا کر لائی ہوئی رکھیل نہیں تھی۔ اب پورو صرف اس کے گھر پڑی ہوئی عورت نہیں تھی۔ اب پورو اس کے بیٹے کی ماں تھی۔

رحیمے کی ماں نے جیسے کہا، رشیدے نے ایک روپیہ اور گڑ کی بھیلی بیٹے کے سر کا صدقہ اتارا پھر پورو کی نیم خوابیدہ آنکھیں کھلیں اس نے رشیدے کو دیکھا۔

''اب تو مجھے کیا کہتا ہے؟ میں نے تجھے اپنا آپ دیا، تجھے ایک بیٹا دیا، اب میرے پاس باقی کیا بچا

ہے؟'' پورو اپنی گم سم زبان سے جیسے رشیدے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

گرم گڑ اور پسے ہوئے باداموں کے کچھ چمچ لینے کے بعد جب پورو کے جسم میں جان آئی تو پورو نے دیکھا، اس کے بائیں بازو سے اس کے بچے کا نرم ملائم چہرہ رگڑ کھا رہا تھا۔ پورو ڈر گئی۔ پورو کو لگا جیسے ایک نرم سفید سنڈی اس کے جسم پر چڑھ رہی تھی، اسے کراہت آئی، اس کا جی چاہا کہ اپنے بازو سے لگی ہوئی سنڈی کو جھٹک دے، اپنے بدن سے دور کر دے، اس طرح جیسے کوئی چبھے ہوئے کانٹے کو ناخنوں میں پھنسا کر نکال دیتا ہے، جیسے کوئی چمٹے ہوئے بھا کھڑے اتار پھینکتا ہے، جس طرح کوئی چمٹی ہوئی چیچڑی کو اکھاڑ دیتا ہے، جیسے کوئی لگی ہوئی جونک کو کھینچ لیتا ہے۔ رحیمے کی ماں نے پورے تیرہ دن ان کے گھر رہنا تھا۔ ابھی تو پورو کو بیٹا جنے چار ہی دن ہوئے تھے، پانچویں دن پورو کو دودھ اترا۔ روئی کی بتیاں بنا بنا کر دائی اس کے بچے کو دودھ کی بوندیں منہ سے لگاتی رہی۔ آج اس نے دودھ کے لئے بچے کو پورو کی گود میں ڈالا۔

بچہ پورو کی گود میں پڑا رہا۔ بچہ پورو کے جسم سے چمٹا رہا۔ پورو کی آنتوں میں کھچاؤ محسوس ہوا۔

پورو کا جی چاہا کہ بچے کو گلے لگا کر رو دے۔ بچہ اس کے اپنے ہی خون سے بنا کھلونا تھا، اس کے اپنے ماس کا بت تھا۔ بھری بھرائی دنیا میں یہی ایک بچہ اس کا اپنا تھا۔ اس نے کبھی ماں کا چہرہ نہیں دیکھنا، اس نے کبھی باپ کا چہرہ نہیں دیکھنا، اس نے کبھی بہن بھائیوں کے چہرے نہیں دیکھنے۔ وہ..... وہ صرف اپنے بچے کا چہرہ دیکھا کرے گی، جس کے خون میں اس کے اپنے ماں باپ کا خون ملا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ اس سے ناطہ تو توڑ گئے مگر اپنے اُس خون کو کس طرح علیحدہ کریں گے جو خون پورو کی ہڈیوں میں رچا ہوا تھا جو خون پورو کے ہاں جنے بیٹے کے خون میں ملا ہوا تھا۔ بچہ پورو کا دودھ پیتا رہا پھر پورو کو محسوس ہوا یہ بچہ زبردستی اس کی آنتوں سے اس کا دودھ کھینچ رہا تھا۔ زبردستی...... جبراً...... لڑکے کے باپ نے بھی تو اس کے ساتھ سب کچھ جبراً کیا تھا۔ بچہ بھی تو اپنے باپ کا بیٹا تھا، اپنے باپ کو خون تھا، اپنے باپ کا ماس تھا، اپنے باپ کا روپ تھا، نہ چاہتے ہوئے یہ بچہ اس کے پیٹ میں رکھا گیا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر یہ بچہ اس کے پیٹ میں پلا تھا اور اب یہ بچہ جبراً اس کی آنتوں سے دودھ کھینچ رہا تھا۔

پورو نے اپنے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔ اس کا ماتھا آگ میں پڑی اینٹ کی طرح گرم تھا۔ شاید اس کو بخار تھا۔ اس کے سر میں ایک خیال گھومنے لگا یہ بچہ...... اس بچے کا باپ...... سب مرد ذات...... مرد جو عورت کے جسم کو کتے کی ہڈی کی طرح چوستے ہیں۔ کتے کی ہڈی کی طرح چباتے ہیں...... بچہ پورو کا

دودھ پیتا رہا۔ پورو کا من کنوئیں کی ٹنڈوں کی طرح بھرتا اور خالی ہوتا رہا۔

یتیم

پورو کے گول مٹول بچے کو سب جاوید کہتے تھے۔ رسی سے بنی پلنگڑی (چھوٹا پلنگ) پر لٹا کر پورو اسے دیکھتی ہی رہتی، ہاتھ پاؤں چلا چلا کر وہ اوپر دی ہوئی چادر کو پیروں تک لا کر مسل دیتا۔ چاندی کی ایک پتلی سی پازیب پورو نے اس کے پاؤں میں پہنائی ہوئی تھی جب وہ ہاتھ پاؤں مارتا، پازیب کی ہلکی سی جھنکار پلنگڑی پر چھن چھن کرتی۔ بار بار پاؤں چلاتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور بچے کو ہچکیاں شروع ہو جاتیں۔ پھر پورو اس کے ہاتھوں کو دیکھتی، ہتھیلی کی طرف سے، اس کے ہاتھ بہت زیادہ سفید تھے اور ہاتھوں کے پیچھے والے حصے پر ماس اس طرح ابھرا ہوا تھا کہ پورو کو اس کے ہاتھ بالکل موم کے اس 'باوے' کی طرح محسوس ہوتے جو چھوٹی عمر میں اس نے سیام سے واپس آتے ہوئے کلکتے کے ایک بازار سے خریدا تھا۔ اس نے باوے کو کروشیے سے بنا ہوا کرتا پہنایا تھا۔ چھوٹے موتیوں کی ایک مالا پرو کر اس نے باوے کو پہنائی تھی، جاوید کے ہاتھ بالکل موم کے اس باوے کے ہاتھوں کی طرح چلبل چلبل کرتے تھے۔ موم کا وہ باوا شاید ابھی تک نہیں ٹوٹا ہوگا۔ پورو نے سوچنا شروع کر دیا، بعض اوقات کانچ اور مٹی کی بنی اشیاء کی معیاد بھی کتنی زیادہ ہوتی ہے شاید آج بھی اس کی کوئی بہن اس باوے سے کھیلتی ہوگی........

صبح سویرے پورو کھیتوں کو جاتی، رشیدا اپنے بیٹے کے پاس بیٹھتا۔ ایک دن ابھی اندھیرا ہی تھا، اس نے کھیتوں سے واپسی پر مسلمانوں کے کنوئیں پر ہاتھ پیر دھوئے۔ جب وہ اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ رہی تھی اسے اپنی گلی کی لڑکی کمو دکھائی دی۔ سردیوں کی ہلکی ہلکی ٹھنڈ شروع ہو گئی تھی، کمو پانی کی گاگر مٹی کے ڈھیلوں سے بنے تھڑے پر رکھ کر سانس لے رہی تھی۔ پورو جب اس کے پاس سے گزری، کمو نے جیسے ڈرتے ہوئے پانی کی گاگر اٹھالی۔ گاگر کا وزن شاید کمو کے شانوں سے سہا نہیں جا رہا تھا، گاگر کمو کے شانوں سے پھسلنے کو تھی۔ گاگر کے نیچے ٹکی ہوئی کمو کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کلائی سے دہری ہونے لگی۔ میں ہاتھ سے گاگر کے منہ کو سہارا دیتے ہوئے کمو کے منہ سے نکلا "ہائے ماں!"

پورو کے قدم رک گئے، وہ کمو کے پاس گئی، اس کا جی چاہا دس بارہ سال کی دبلی پتلی سی کمو کے

شانوں سے گاگر اٹھالے۔ کمو اس کے ساتھ ساتھ چلتی جائے۔ کمو جو کہ ننگے پاؤں تھی اور کمو جو ہمیشہ کھدر کی سادی شلوار کے پائنچے چڑھائے رکھتی تھی اور کمو جس کی دھاری دار قمیض کے کندھے پر لگا پیوند کبھی ادھڑ جاتا تھا کبھی پھر لگ جاتا تھا اور کمو جس کے بال ہمیشہ بان کی طرح کھردرے اور بکھرے رہتے تھے اور کمو جس کو ہمیشہ پورو نے دور سے دیکھا تھا، آج وہ نزدیک ہو کر کمو کے ان شانوں سے گاگر اٹھانا چاہتی تھی جن شانوں کی ہڈیاں پیتل کی گاگر سے ٹکرا رہی تھیں۔

''بڑی دیر ہو گئی ہے؟'' برتن کے بوجھ تلے دبی ہوئی کمو نے جیسے پورو سے ابھی دیر نہ ہونے کا ایک حوصلہ طلب کیا۔

''ابھی تو دن بھی نہیں نکلا۔'' پورو نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ لڑکی کو شاید حوصلہ ہوا۔ اس نے شانوں کا بوجھ پھر زمین پر رکھ دیا، گاگر کے منہ سے تھوڑا سا پانی چھلک کر کمو کے شانے پر گر گیا۔ گھسی ہوئی دھاری دار قمیض کو بھگو کر پانی نے کمو کے بدن کو ٹھنڈا کیا، سردی کی ایک لہر کمو کے بدن میں دوڑ گئی۔

پورو رک گئی۔ کمو پورو کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔ لمحہ بھر پہلے یہی کمو دیر ہونے کے ڈر سے برتن کے بوجھ سے سہی ہوئی تھی۔ کمو کے چہرے پر جما ہوا وہ ڈر تھا جو ہمیشہ پورو نے دیکھا تھا۔ اس لمحے اس کے چوڑے ہونٹوں پر بکھری ہوئی ہنسی پورو کو اس طرح محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کو ہنسنا ہی نہ آتا ہو اور وہ یونہی اپنے ہونٹوں کو مروڑ رہی ہو جیسے کسی کا منہ چڑاتے ہیں۔

''کمو تم روز اس وقت آتی ہو؟'' پورو نے کمو کو پکارے جانے سے کمو کا نام سنا تھا۔

''لگتا ہے آج کچھ دیر ہو گئی، مجھے مار پڑے گی۔'' کمو نے پھر گاگر کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے وقت اور وقت کا نام اس کے لئے بہت ڈراؤنا تھا۔ اس کی ہنسی کچے رنگوں کی طرح اس کے چہرے سے اتر گئی اور اندر کہیں پہلے سے پیدا شدہ ڈر اس کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔

''کمو وہ تیری کیا لگتی ہے؟''

''چچی۔'' کمو نے کہا اور کمو کا بازو گاگر کے بوجھ تلے مڑ گیا۔ شاید اس کے بوجھ سے، یا شاید لفظ چچی سے۔

''اگر تو کہے، میں تیری گاگر اٹھا لوں؟''

پورو نے کہا لیکن اپنا بازو آگے نہ کیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ اس کا نام

حمیداں ہے حمیداں، رشیدے کی بیوی........اور کمو ایک ہندو لڑکی ہے۔

''گاگر ناپاک ہو جائے گی۔'' کمو نے بے دھڑک کہا۔

''پانی تو ناپاک نہیں ہوگا میں پانی کو ہاتھ نہیں لگاتی جا کر گاگر دھو لینا۔'' پورو کہتی کہتی ہنس پڑی۔ کمو بھی جیسے ہنس پڑی لیکن کمو نے گاگر اٹھائے رکھی۔ دونوں مشکل سے چند قدم ہی گئی تھیں۔ کمو کا پاؤں دہرا ہو گیا۔ پورو نے گرتی گاگر پکڑ لی لیکن کمو پتھروں پر گر پڑی اس کے پاؤں میں موچ آ گئی۔

پورو نے گاگر رکھ کر کمو کا پاؤں پکڑا اور ہتھیلی سے اس کے ٹخنے کے قریب پاؤں کو ملا۔ بے پرواہ کمو اٹھنے کے قابل ہو گئی۔ پورو گاگر اٹھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''ہائے ماں........!'' کمو رو پڑی۔ پورو کو ایسے محسوس ہوا جیسے کمو اپنے سارے دکھوں کے شکایت اپنی مری ہوئی ماں سے کر رہی ہو۔

''جنم دے کر ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں'' پورو نے کئی بار کمو کی چچی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔ کمو کی نہ تو ماں تھی اور نہ باپ، کمو کا باپ تو شاید زندہ تھا لیکن کہتے تھے اس نے شہر میں کوئی عورت رکھی ہوئی تھی جو کمو کو ملنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے کمو کا باپ بھی کمو سے نہ ملتا۔ پورو سوچتی گئی، مائیں مر جائیں تو باپ بھی سوتیلے ہو جاتے ہیں، سوچتی سوچتی اپنی سوچوں میں اتر گئی۔ مائیں زندہ ہوں تب بھی باپ سوتیلے ہو جاتے ہیں، مائیں بھی سوتیلی ہو جاتی ہیں........

گاؤں صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ روشنی بڑھ گئی تھی اور ان کی گلی کا موڑ بھی نزدیک آ گیا تھا۔ دونوں کو ڈر تھا کہ پورو کو گاگر اٹھائے کوئی دیکھ لے گا، کمو نے ڈگمگاتے پاؤں سے گاگر سنبھالی۔ پورو نے تیز تیز قدم اٹھائے اور کمو سے الگ ہو کر گلی کی طرف مڑ گئی۔ اس دوپہر کو بچہ ضد کر رہا تھا اور پورو اپنے بچے کو بہلا پھسلا رہی تھی۔ جب کمو اس کا دروازہ کھول کر اس کے گھر آئی۔

پورو نے آگے بڑھ کر کمو کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اسے محسوس ہوا وہ اس کے اپنے بچے سے بھی زیادہ بہلائے جانے کی مستحق تھی۔ کمو جس کے خشک آنسوؤں کو کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ پورو کے بازو میں کمو کے آنسو چھلک پڑے۔ پورو کا جی چاہا کہ جیسے وہ جاوید کی ماں ہے، ویسے ہی کمو کی ماں بن جائے۔ کمو اڑیاں کرے، کمو ضد کرے اور وہ کمو کو اٹھا اٹھا بہلائے۔ کمو کو لئے پھرے، کمو کو چوم چوم کر تھک جائے، وہ جاوید کی ماں تھی، کمو کی ماں بھی بن جائے........وہ ایک اچھی بیٹی نہیں بن سکی تھی وہ ایک اچھی ماں بن

جائے........

کمو ہندو تھی اور پورو...... پورو ایک مسلمان تھی۔ چاہے وہ اپنے آپ کو پورو ہی سمجھتی تھی۔ کمو نے پورو کے گھر سے کچھ کھانا نہیں تھا۔ پورو کا دل چاہتا تھا کہ وہ کمو کو نوالے دے۔ وہ کمو کو دودھ کا کٹورا پلائے.......

پورو نے پھر کمو کا پاؤں ملا۔ ہتھیلیوں سے گرم گھی کا مساج کیا۔ روئی کے گالوں سے ٹکور کی۔ اب کمو بے تاب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اس کی چچی کا لمبا جھاڑو سلائیوں کی طرح گھوم رہا تھا۔ کمو لحاف (تلائی) سینے والی سوئی لینے کے بہانے آئی تھی۔ پورو نے کمو کو باداموں والا گڑ کھلایا اور لحاف سینے والی سوئی نکال کر دی۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ لوگوں کے بدن پر کپڑے اب موٹے ہو گئے تھے اور وہ سب روئی بھروا بھروا کر خالی چھیٹ کی واسکٹیں بنوائی تھیں۔ لوگوں نے موٹے کھیسوں کی بکلوں میں اپنے کندھے چھپائے پھر رہے تھے۔

کمو اپنی عمر کے سال کھائے جا رہی تھی۔ نہ تو کمو کے جسم پر جوانی اُمڈتی، نہ کمو کے بدن پر کپڑے بدلتے تھے۔ کمو کے ننگے پاؤں اب تڑک رہے تھے۔ پورو نے کمو کے لئے ایک نئی جوتی بنوائی لیکن کمو کے پاؤں میں اس جوتی کا پورا آنا آسان نہیں تھا۔

سوچ سوچ کر یہی ہوا، کمو نے وہ جوتی پہن لی اور چچی سے کہا "سامنے گنے کے کھیت میں پڑی ہوئی ملی ہے۔" چچی کہاں مانتی تھی۔ گاؤں میں ایسی کون ہے جو اپنی نئی جوتی ویسے ہی گم کر آئے؟ لیکن چپ کر گئی، کمو نے جوتی پہنے رکھی لیکن نئی چیزیں روز روز تو کسی کو نہیں ملتیں۔ پورو کمو کی ٹھٹھرتی ہڈیوں کو دیکھتی رہتی۔

صرف صبح کے اندھیروں کو معلوم تھا کہ پورو ہر روز کمو کی ایک آدھ گاگر اٹھا کر اُس کا ہاتھ بٹاتی۔ کمو ایک آدھ چکر پورو کے گھر بھی لگاتی۔ کبھی بیلنے میں کپاس بیل دیتی، کبھی چکی میں چنے دلنے لگتی۔ کبھی اکھلی میں مسالا پیس لیتی۔ پورو اس کا ہاتھ بٹاتی، چچی کا کام بڑے اچھے طریقے سے ہو جاتا۔ چھوٹے سے جاوید کو کمو کی عادت پڑ گئی تھی۔ کبھی کمو نہ آتی تو پورو اسے چھوٹے بچے کی طرف سے شکوہ کرتی، داؤ لگنے پر کمو آ جاتی، کبھی نہ بھولتی۔ اب پورو اور کمو ماں بیٹیوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ لیتیں اور دو سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑ جڑ بیٹھتیں۔ کئی بار پورو کا دل کرتا کہ وہ کمو کے لئے کچھ بنائے۔ کمو کے سوکھے جسم کے انگ پھولنے شروع ہو گئے تھے۔ کمو کے پچکے رخساروں پر ماس آ گیا تھا۔ پورو کے گھر آ کر کمو اپنے بال سنوارتی۔

پورو گھی لگے ہاتھوں سے کمو کی چٹیا بناتی۔

ایک دن صبح کے اندھیرے میں کمو، پورو کو پکڑ پکڑ کر روئے جا رہی تھی، پورو نے غور سے دیکھا، کمو گنے کے چھلکے کی طرح چسی ہوئی تھی۔

پورو نے اسے گلے لگایا لیکن کمو تھی کہ روتے ہوئے اسے ٹھیک سے سانس نہیں آ رہا تھا۔ رورو کر اس کا پلو بھیگا ہوا تھا۔ رورو کر اس کے ہاتھ بھیگ گئے تھے۔

''میری چچی کہتی ہے اگر اب تو اس کے گھر گئی تو میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

آخر کمو نے سب کچھ کہہ دیا اور پورو کے سینے سے سر لگا کر جی بھر کے روئی، جیسے پورو اس کا واحد سہارا تھی اور کمو کو کوئی ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔

''لیکن کیوں..... میں نے کیا کیا ہے؟'' پورو نے روتے ہوئے پوچھا۔

''چچی کہتی ہے، ہم نے سنا ہے کہ وہ بھاگ کر آئی ہوئی ہے تم بھی اسی طرح بھاگ جاؤ گی۔'' کمو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

صبح کا اجالا سفید ہو رہا تھا۔ پورو کا رنگ چرخے سے ٹوٹے ہوئے گالے جیسا ہو گیا......

جھوٹ جیسا سچ

پورو کے من میں اوپر تلے چوٹیں پڑتی رہیں۔ اس کا دل اور دماغ کم از کم دس سال بڑا ہو گیا تھا۔ پورو کی عمر بیس برس سے بڑھی نہ تھی لیکن جو کچھ اس کو عمر نہیں سکھا سکتی تھی وہ سب کچھ اس کے جیون کی چوٹوں نے سکھا دیا تھا اس لئے سیانا سوچنے والوں کی طرح پورو بہت سنجیدہ ہو گئی۔ اس کا من بہت تیز سوچتا تھا لیکن اسے کہنا نہیں آتا تھا۔ اس کے سب ولولے پانی سے ٹکرا کر بننے والی جھاگ کی طرح اٹھتے اور پھر پانی میں ہی ختم ہو جاتے۔

کبھی کبھار پورو رحیمے کے گھر، اس کی بیویوں کے پاس جا بیٹھتی تھی۔ ان کے پڑوس میں ہی ایک جوان لڑکی کا پیلا چہرہ اسے بہت کھینچتا تھا۔ کئی بار پورو کے جی میں آتا کہ اسے بلائے۔ شاید کسی دکھی کو ہی دکھیارے کی سمجھ ہوتی ہے۔ لڑکی کے پیلے چہرے پر جھکی ہوئی آنکھیں تھیں اور ان کا جھکاؤ پورو کی طرف کچھ اس

طرح تھا جیسے انہیں بھی پورو کی ضرورت تھی۔ آہستہ آہستہ پورو کو معلوم ہوا کہ دو سال پہلے اس لڑکی کا بیاہ ہوا تھا۔ کوئی کہتا تھا اسے جن بھوت چمٹے ہوئے تھے۔ کوئی کہتا تھا اس کو کوئی اندرونی بیماری تھی۔ پتہ نہیں اس پر کیا بیتی لیکن پیاز کی کونپل کی طرح اس کا جسم اندر سے خالی تھا۔ اس کا چہرہ ہر دَل کی طرح ہو گیا تھا۔

پورو نے آتے جاتے لڑکی سے واقفیت بنالی تھی اور اس کے بعد یہ واقفیت لڑکی کی ماں سے اپنے کھیس بنوا کر بڑھالی تھی۔ لڑکی کو سارے تارو کہتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں میں پورو نے سنا، تارو کو غشی کے دورے پڑتے تھے۔ ان دنوں تارو میکے آئی ہوئی تھی اور اب اسے اپنے سسرال جانا تھا۔ پورو نے سنا، ہر بار تارو کو سسرال جانے سے پہلے اسی طرح ہو جاتا تھا اور جب بھی وہ سسرال سے واپس میکے آتی تھی، ہر بار، اس کا ماس پہلے سے زیادہ سوکھا ہوا ہوتا تھا۔ ہر بار اس کی ہڈیاں پہلے سے زیادہ نکلی ہوئی ہوتی تھیں۔ سارے دیکھنے والے دل ہی دل میں سمجھتے تھے اب صرف چند ہی دنوں کی بات ہے۔ پھر اور سوکھنے کے لئے اس کے جسم پر ماس ہی نہیں رہے گا۔ نہ ہی میکے جانے والی کو سسرالی کچھ کہتے تھے اور نہ ہی اسے بھیجنے والے میکے کچھ بولتے تھے۔

ایک دن تارو اکیلی تھی۔ پورو اس کے پاس آگئی۔ پہلے بھی کئی بار تھوڑی بہت پوچھ گچھ کرتی تھی، آج اس سے باتیں کرنے لگی۔

''تارو! کسی سیانے نے بتایا تو ہو گا کہ تجھے کیا روگ ہے؟''

''کچھ بھی نہیں''

''کسی نے نبض دیکھی ہو گی......؟''

''ورق لگے مربے اور عرق کی بوتلیں پی پی کر تھک گئی ہوں۔''

''تارو! کچھ تو بتاؤ، کیوں اپنی جان کو روگ لگا لیا ہے؟''

''ویسے ہی دھرتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا بہن! کیوں فکر کرتی ہے؟''

''نہ جانے دھرتی پر کتنا بوجھ پڑا ہوا ہے، تیرے ساتھ کیا ہلکا ہو گا ماں سے تو پوچھ کر دیکھ جس نے مشکلوں سے پالا ہے۔''

''پالا ہو گا۔'' تارو نے ایک بے پرواہی سے کہا۔

''خود ہی چار دن رو دھو کر چپ کر جائے گی اب کون سی اس کی جان سکھی ہے۔'' تارو نے ہی پھر

کہا۔

''لیکن اتنی بھی کیا بات ہوگئی ہے ماں سے کہہ ابھی چار دن اور نہ بھیجے۔''

''پھر کیا فرق پڑ جائے گا جیسی یہاں ہوں ویسی ہی وہاں۔''

''ہاں بیٹیوں کو کوئی کتنی دیر رکھ سکتا ہے۔''

''بیٹیاں...... ہونہہ........ ''اور تارو ایک بار بڑبڑا کر چپ کر گئی۔ تارو کے اندر معلوم نہیں کیا بل پڑا تھا، معلوم نہیں تارو کیا کہنا چاہتی تھی پھر شاید تارو سے کہا نہ گیا۔

''بیٹیوں کا کیا ہے خود ہی جس کے ہاتھ چاہیں ان کے گلے کی رسی تھما دیں۔'' تارو نے خود ہی پھر ٹھہر کر کہا۔

''وہاں کا پانی اچھا ہے؟'' پورو نے پھر پوچھا۔

''نہ بھی اچھا ہو پھر بھی اچھا ہے'' تارو نے جواب دیا۔

''ہو سکتا ہے پانی ہی نہ اچھا لگا ہو'' پورو نے بات جاری رکھنے کے لئے کہہ دیا۔

''بیٹیوں کو ہمیشہ پانی مناسب ہی لگتے ہیں۔'' تارو نے کچھ اس طرح کہا کہ پورو اس کے چہرے کی طرف بس دیکھتی رہ گئی۔

''تارو! میں تیری اپنی ہوں، کچھ بتاتی کیوں نہیں......؟''

پورو نے اس طرح اپنائیت سے کہا تارو کا جی کھل اٹھا۔

''میری بہن! میں کیا بتاؤں، بیٹیوں کو کچھ بتانے کے لئے رب نے زبان ہی کب دی ہے.....؟''

''ٹھیک ہے تارو!''

''ماں باپ کے پاس میرے لئے جگہ نہیں تھی، کسی بھی بیٹی کے لئے والدین کے پاس جگہ نہیں ہوتی۔ میرے شوہر کے پاس میرے لئے کوئی جگہ نہیں، کیونکہ اس کا دل اور اس کا گھر کسی اور عورت سے ملا ہوا ہے۔''

''تارو کیا تیرے شوہر کا پہلے بھی بیاہ ہوا ہے پھر تیرے ماں باپ نے تجھے کیوں وہاں دیا؟''

''ان کو پہلے علم نہ تھا۔ ویسے بھی اس کا پہلا بیاہ نہیں ہوا اس نے صرف ایک عورت گھر میں رکھی ہوئی

ہے۔"

"لیکن اس کے ماں باپ کو تو خبر ہوگی؟"

"سب جانتے تھے۔ صرف وہ عورت ان کی ذات سے نہیں، کمی ذات سے ہے۔ اس کے ماں باپ کہتے تھے اپنی ذات کی بہو گھر میں لانی چاہیے۔"

"لیکن انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ پرائی بیٹی کا کیا حال ہوگا؟"

"دوسرے کے دکھ کو کون جانتا ہے۔ ویسے وہ کہتے ہیں ہم روٹی دیتے ہیں، کپڑے دیتے ہیں، گھر میں سب کچھ تو ہے پھر دکھ کیسا؟"

"جیسے عورت کو صرف روٹی اور کپڑا ہی چاہیے" پورو نے کہا۔

"تو دیکھتی نہیں میرے اندر آگ جل اٹھتی ہے، سارے دیکھتے ہیں پورو، دو سال ہو گئے ہیں میں روٹی اور کپڑے کے لئے اس کے پاس اپنا جسم بیچتی ہوں۔ دیکھ میں طوائف ہوں، دیکھ میں طوائف ہوں۔" یہ کہتے ہوئے تارو گر پڑی۔ تارو کی مٹھیاں بند ہوگئیں۔ تارو کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ تارو کا جسم لکڑی کے تختے جیسا ہو گیا۔ پورو ڈر گئی۔ تارو کے گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ پورو کو معلوم نہ تھا کہ کیا کرنا ہے۔ پورو ڈری اور گھبرائی، تارو کی ٹانگیں دبانے لگی، تارو کے شانے دبائے اور تارو کی ہتھیلیوں کا مساج کیا۔ تارو کو ہوش آ گیا۔

"تو مجھے ہاتھ مت لگا، میں طوائف ہوں، تو دیکھتی نہیں...... تو دیکھتی نہیں......"

تارو ایسی ہی باتیں کر رہی تھی، پورو سوچ رہی تھی کہ ابھی اسے ہوش نہیں آیا۔ اتنی دیر میں تارو کی ماں آ گئی۔

"ہائے کیا کروں میں، ایک تو قسمت کی ماری ہوں دوسرا اس کی باتوں نے مار دیا ہے۔"

تارو کی ماں نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔ پورو چپ چاپ کھڑی رہی۔

"اس نے اور اس کے بھائی نے تو ہماری جان نکال لی ہے۔ لاہور کالج میں پڑھنے کیا گیا ہے، بہن کو بھی پڑھا پڑھا کر بگاڑ دیا ہے۔ دیکھ کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہے۔" تارو کی ماں نے پھر دکھتے ہوئے دل سے کہا۔

"ماں! قہر بھی تو اس بے چاری پر نازل ہوا ہے۔" پورو کہنے لگی۔

"بیٹی......! ہم نے بیٹی جو دی ہے، ہمارا سر جھک گیا ہے، ہم کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ اچھا سلوک

کرے یا برا، آخر مرد ہے۔'' تارو کی ماں نے پھر کہا۔

''میرا سر بھی جھک گیا ہے، پاؤں بھی جکڑے گئے ہیں، اس کا کیا گیا، اس کو تو کوئی رب جھکا نہیں سکا، اس جیسا کوئی 'رب' پیدا ہی نہیں ہوا۔ رب نے ساری رسیاں میرے پاؤں میں ہی ڈال دی ہیں۔''

تارو کی مٹھیاں پھر بھنچ گئیں اور اس کے پاؤں پھر اکڑ گئے۔ ماں نے پانی کے کئی چھینٹے اس کے چہرے پر مارے۔ کئی چلو اس کے منہ میں ڈالے۔ آج پورو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس نے پہلی بار سنا تھا کہ لڑکیاں اس طرح بھی سوچ سکتی ہیں۔ لڑکیاں اس طرح بھی بول سکتی ہیں۔ اب تو اس کو کئی غبار اٹھتے تھے اور اسے کوئی نام نہیں آتا تھا۔

''یہ دھوکا ہے۔ یہ سراسر دھوکا ہے۔ میرا کوئی بیاہ نہیں ہوا۔ سب جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے پکڑتے کیوں ہو پیچھے ہٹو۔'' بیہوش تارو نے اپنے پاؤں زمین پر پٹخ دیے۔

''تارو ہوش کر، کیسی باتیں منہ سے نکال رہی ہے، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ وہ خاوند ہے تیرا، اپنا منہ بند رکھ، یونہی نہ بولتی جا۔'' تارو کی ماں اس طرح کہہ رہی تھی جیسے کسی انجان تارو کو ڈانٹ رہی ہو، ویسے اس کی اپنی آنکھیں نم تھیں۔ تارو کبھی ہوش میں آجاتی اور کبھی پھر سے حواس کھو بیٹھتی۔ ''وہاں جا کر یہ الٹی سیدھی باتیں نہ کرنا، جی قابو میں رکھ۔ وہ تجھے جانے یا نہ جانے، رب تو گواہ ہے ناں، تجھے وہ بیاہ کر لے گیا ہے۔'' تارو کی ماں کہہ رہی تھی۔

''اری ماں! اگر رب نے میرے بیاہ کی گواہی دی ہے تو جھوٹی گواہی دی ہوگی۔ اری ماں میرا کوئی بیاہ نہیں ہوا۔'' تارو حواس باختہ ہو کر چھت کے لمبے شہتیر دں کو دیکھنے لگی۔ پورو اس تارو کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جو تارو سب کچھ سوچتے ہوئے بھی، سب کچھ بولتے ہوئے بھی بیاہ کے اتنے بڑے جھوٹ سے چھٹکارہ نہیں پاسکتی تھی لیکن اس کی عمر کے دن بہت تیزی سے زندگی کے سارے جھوٹ سچ سے ناطہ توڑ رہے تھے۔

شام کا وقت ہو گیا تھا۔ پورو بھرے ہوئے دل کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی، اس کا من جیسے بھری بھرائی دنیا سے یکدم اچاٹ ہو گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اپنے گھر کی دیواروں سے بہل رہی تھی۔ اس کے اڑتے ہوئے من کو رشیدے کی چھوٹی چھوٹی باتوں نے، گھر کے چھوٹے موٹے کام کاج نے، سب سے بڑھ کر جاوید کے توتلے پن جیسے مہین دھاگے نے اپنی لپیٹ میں لے ہی لیا تھا۔ اس کا من کچھ ٹک گیا تھا۔ آج تارو کی رنج بھری باتوں نے جیسے پورو کے من کی تاریں ہلا دیں، اس کا من چین میں نہیں تھا۔ رات کا کھانا تیار کرتے ہوئے اس کو جیسے

نمک اور ہلدی کا تناسب بھول گیا تھا۔ اس کی دال بھوکھ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کی بے ڈھنگی روٹیاں کناروں سے جل گئیں۔ اگلے دن بھی درد کسی طرح سے بھی پچھلے دن کی نسبت کم نہ ہوا۔ پھر معلوم نہیں پارو کو کیا سوجھا اس نے اپنا کھانا دو وقت کر دیا۔ رات ابھی آدھی سے زیادہ بھی نہ ہوتی وہ جاگ اٹھتی، دھیان ایک جگہ لگا کر کئی کئی گھنٹے آنکھیں اور کان بند کر کے دنیا و مافیا سے بے خبر ہو جاتی۔

اس کا سونا کم ہو گیا، اس کا کھانا کم ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اس نے چوکر میں نمک ملا کر اپنے لئے ایک روٹی پکانی شروع کر دی جس کو گھی کا ہاتھ تک نہ لگتا جس کے ساتھ دودھ دہی بھی نہ ہوتا۔ وہ اسی روٹی کے سہارے سارا دن کاٹ لیتی۔ گنتی کے دنوں میں اس کی آنکھوں کے گرد نیلے نیلے ہالے گہرے ہونا شروع ہو گئے اور اس کا جسم بری طرح مرجھا گیا۔

پچھلے کچھ دنوں سے رشیدا بات بے بات پورو کا جی بہلاتا رہا۔ مذہبی تہواروں میں برتے گئے اصولوں پر ٹھٹھا ہنسی کرتا، پورو کا من پرچانے کی کوشش کرتا رہا۔ پیار بھی پہلے سے زیادہ کرنے لگا لیکن رشیدے کے سارے جتن جیسے پورو کے تر دل و دماغ سے نکل گئے۔

پورو کی حالت ویسی کی ویسی ہی رہی۔

رشیدے کا من روز جل جل کر اب بجھنے لگا تھا۔ پورو کا دن بہ دن اترتا ہوا چہرہ رشیدے سے دیکھا نہ جاتا جیسے رشیدے کے آنگن میں ویرانی نے پاؤں جما لئے ہوں۔ رشیدے کے چہرے پر بھی چپ نے ڈیرے ڈال لئے۔ وہ دونوں گھر، سماج اور جسم کی دیواروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی تھی۔ پورو کے گھر دودھ دینے والی بھینسیں تھیں۔ وہ روزانہ دودھ جماتی، دہی بلوتی، رشیدے کے کھیت میں کام کرنے والے جب چارہ وغیرہ لے کر آتے وہ ان کو، ان کے بچوں کے لئے لسی کے کٹورے بھر دیتی۔ مکھن ڈال دیتی، پورو کے منہ کچھ نہ لگتا۔ رشیدے کا من بھی جیسے کھانے پینے سے اکتا گیا تھا۔ گھر کے چولھے میں گرم آگ دہکتی لیکن گھر میں بول چال اور زندگی کی ساری ہریالی پر کہر جم گئی تھی۔

جاوید کے بھولے بھالے چہرے پر جیسے ماں باپ کے اداس چہروں کی پرچھائیاں پڑی ہوئی تھیں، جاوید کے لئے کوئی خاص چاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ بیشک پورو سارے فرائض نبھا رہی تھی اور بلاشبہ رشیدا جاوید کو دل سے پیار کرتا تھا۔

ایک رات سوئے ہوئے رشیدے کا جسم دہک اٹھا۔ سویر کو جب پورو نے رشیدے کے ماتھے پر

ہاتھ لگایا تو اُسے تیز بخار تھا۔

گاؤں کے حکیم نے اپنا دوا دارو کیا تھا۔ رشیدے کے بخار کو تیسرا دن تھا جب حکیم نے شبہ ظاہر کیا کہ رشیدے کو شاید معیادی بخار ہوا تھا۔

پورو کے سارے دھیان اور اداسی کو رشیدے کی بیماری نے کھینچ لیا تھا۔ وہ رشیدے کو دوا دیتی، جسم دباتی، رسوئی کو دیکھتی۔ جاوید کا چہرہ اتر گیا تھا، دوپہر ہو جاتی، جاوید کے چہرے پر میل جم جاتی، پورو کو اسکی کی دیکھ بھال کے لئے وقت نہ ملتا، کئی راتیں گزر گئیں، کئی دن گزرنے کے باوجود رشیدے کا بخار نہ اترا۔

''پورو میرا گناہ بخش دو، پورو میری بھول معاف کر دو، پورو...... پورو.......!'' رشیدا بخار کی غنودگی میں کہہ رہا تھا۔ رات کا تیسرا پہر تھا پورو گھبرا گئی، کئی دنوں کی تیمارداری اور راتوں کی بیداری نے پورو کو پہلے ہی تھکا دیا تھا، گھبرائی ہوئی پورو اٹھ کر رشیدے کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ رشیدے کا ماتھا سہلاتی رہی۔ رشیدے کے پاؤں دباتی رہی لیکن رشیدے کو ہوش نہیں تھا۔

''اچھا پورو میں چلتا ہوں..... پورو میری روح....'' رشیدا ٹوٹے پھوٹے جملے بولتا رہا۔ پورو کا جی ڈولنے لگا۔

''بس کر رشیدیا! میرے زخموں پر نمک نہ چھڑک۔'' پورو نے بلکتے ہوئے کہا لیکن رشیدے کو کوئی ہوش نہ تھا اور رشیدا اسی طرح کئی جملے بول رہا تھا۔ کوئی کوئی بات پورو کو سمجھ آتی اور کئی باتیں رشیدے کے گلے سے نکل کر اس کے ہونٹوں پر ہی ختم ہو جاتیں۔

رات کا اندھیرا بہت سیاہ تھا۔ پورو گھر میں اکیلی تھی لیکن پورو کو ایسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری دنیا میں اکیلی ہے۔ رشیدے کے بغیر کسی نے پورو کے زخموں پر مرہم نہیں رکھنا تھا۔

گھڑے کے ٹھنڈے پانی میں کپڑے کے ٹکڑے بھگو بھگو کر پورو نے رشیدے کے ماتھے پر رکھے۔ ماتھا چولھے کی اینٹ کی طرح گرم تھا، کپڑے پانی میں بھیگتے رہے، کٹورے میں ڈالا ہوا پانی منٹوں میں گرم ہو جاتا، پورو نے پانی بدلا اور اس کی آنکھوں سے کئی بوندیں نکل نکل کر رشیدے کے ماتھے پر پڑتی رہیں۔

جب صبح کی پو پھٹی اس وقت تک معلوم نہیں پانی کی ٹھنڈک سے یا آنسوؤں کی گرمی سے رشیدے کا بخار اتر گیا۔ رشیدے کا جسم کھل گیا تھا۔ رشیدے کی بیہوشی نیند کے آرام میں بدل گئی۔

رشیدے کی آنکھ جب کھلی تو اس کو اپنا جسم ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ اس کے ماتھے میں آج درد کی ٹیسیں

نہیں اٹھ رہی تھیں۔ رشیدے نے آرام سے سانس لیتے ہوئے بائیں جانب کروٹ لی۔ پورو رشیدے کے سرہانے زمین پر بیٹھی بیٹھی چارپائی کی ٹیک لگائے سو چکی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اب تک گیلا کپڑا پکڑا ہوا تھا اور پاؤں کے پاس پانی کا کٹورا پڑا ہوا تھا۔

اپنی ساری بیماری، پورو کی ساری خدمت، رشیدے کے من میں نبرد آزما تھی۔ بیتی ہوئی رات کا مشکل وقت، رشیدے نے پورو کے چہرے اور کٹورے میں پڑے کپڑوں کو اچھی طرح دیکھا اور اپنا کمزور سا لاغر ہاتھ پورو کے سر پر رکھ دیا۔ پورو کے بکھرے ہوئے بالوں میں رشیدے کی انگلیاں پھرتی رہیں، رشیدے کی پوریں پورو کے کانوں اور ماتھے کو دھیرے دھیرے چھوتی رہیں۔ پورو کا بت نیند کی آغوش میں گرا ہوا تھا۔ آنکھوں کے کناروں سے آنسو نکل نکل کر رشیدے کے کھیس پر پڑتے رہے۔ رشید اایک عجیب سے نشے میں جاگتا رہا۔

رشیدے نے پورو کے جسم پر تو قبضہ کر لیا تھا، رشیدے کو لالچ تھی کہ پورو کی روح تک تمام حقوق حاصل کر لے۔ پورو کی اداسیاں رشیدے کو نوچ نوچ کھاتی تھیں۔ اس وقت پورو ٹوٹی ہوئی گندل کی طرح رشیدے کی چارپائی سے لگی ہوئی تھی۔

رشیدے میں ہمت نہیں تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ وہ پورو کو کلیجے کے ساتھ بھینچ لے۔ پچھلے دنوں کی گہری اداسی سے رشیدے کا من ٹھکرایا ہوا تھا۔ اِس وقت رشیدے کو پورو کے چہرے سے نظر آ رہا تھا کہ پورو کے تن من میں رشیدے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ رشیدے نے ہاتھ مزید آگے کرتے ہوئے پورو کے رخسار سے لگا دیا۔ ہاتھ شاید زور سے دب گیا، ہاتھ کے دباؤ نے پورو کو جگا دیا۔ پورو ڈر گئی لیکن رشیدا کومل نظروں سے پورو کو دیکھتا رہا۔

رشیدے کو چارپائی پر پڑے پڑے ٹھیک دس دن ہو گئے تھے۔ اس کا بخار دھیرے دھیرے اتر گیا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا لیکن اس کا من بہت زیادہ چنچل تھا۔ پورو نے اپنا دھیان رشیدے کی طرف موڑ لیا تھا۔ رشیدے کے پاس بیٹھ بیٹھ کر پورو نے دن رات ایک کر دیے تھے۔ جاوید کو بنا سنوار کر پورو رشیدے کے پاس بٹھا دیتی، جاوید کو چھوٹے چھوٹے جملے سکھاتی، جاوید، رشیدے کے آگے پیچھے ہوتا اس کی نقلیں کرتا تھا۔ ماں کے سکھائے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جملے بولتا تھا۔

رشیدے کا من جاگا ہوا تھا۔ رشیدے کا تن پھول سا ہلکا تھا۔ رشیدا من ہی من میں اپنی بیماری کو

دعائیں دیتا تھا۔ خوشی پہلے سے دگنی تگنی ہو کر رشیدے کے صحن میں لوٹ آئی تھی۔

پورو کا جی چاہا کہ کسی دن سچ مچ وہ بھول جائے کہ رشیدے نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا وہ رشیدے کو بہت پیار کرے۔ رشیدا اس کا شوہر تھا۔ رشیدا اس کے بچے کا باپ تھا۔ بس یہی ایک سچ تھا باقی سب جھوٹ۔

ایک اور پنجر

اگلے چند دنوں میں رشیدے نے ایک دو چکر اپنے گاؤں چھتو آنی کے لگا لیے تھے۔ اس کی جوز مین اپنے بھائی کے ساتھ مشترکہ تھی، وہاں سے اپنے حصے کا اناج وغیرہ لے کر بیچ دیا تھا لیکن پورو جس دن کی سکڑ آلے آئی تھی اس نے گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ کبھی رشیدا کچھ کہتا تو پورو ہنس کر کہہ دیتی ''میں نہ تو اپنی مرضی سے اس گاؤں میں آئی تھی اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس گاؤں سے جاؤں گی۔'' جاوید اب دوڑتا پھرتا تھا۔ رشیدا ویسے شروع ہی سے نرم مزاج تھا، پورو سے وہ ویسے بھی پیار کرتا تھا لیکن جاوید سے اس کو بے حد پیار تھا۔ جاوید کو وہ چوم چوم کر بھی نہ تھکتا۔ جاوید بھولی بھالی باتیں بھی کرتا تھا ''ابا......ابا.......'' کہتا وہ رشیدے کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا تھا۔

پورو چولھے کو چکنی مٹی پوتتی۔ جاوید دوڑا دوڑا آکر گیلی مٹی کو تھپتھپاتا۔ پورو کے بنائے ہوئے چولھے کو بگاڑ جاتا۔ پورو لسی میں نمک ڈال کر پینے لگتی۔ جاوید ہلدی اور مرچیں اس کی لسی میں ملا دیتا۔ جاوید الماریوں کے پیچھے چھپ جاتا، رشیدا اسے ڈھونڈتا رہتا۔ جاوید کی بچگانہ ہنسی پر رشیدا مکی کے دانوں کی طرح کھل اٹھتا۔

ایک دن ایک عورت گلی میں مٹی کے کھلونے بیچ رہی تھی، جاوید مٹی کے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور سرکنڈوں کے جھنجھنے دیکھ کر پورو کا آنچل کھینچنے لگا۔ پورو نے تھوڑے سے دانوں اور پرانے کپڑوں کے عوض مٹی کے کھلونے خریدے اور ابھی وہ گلی میں ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ دور سے دوڑتی ہوئی ایک پاگل عورت گزری۔

عورتوں نے بھاگ کر اپنے بچے چھپا لیے، دروازے بند کر لیے، بچوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ پاگل عورت کے جسم پر پنڈلیوں تک اونچی ایک شلوار تھی، اس کے سوا اس کے جسم پر کچھ نہ تھا، اس کا رنگ شاید دھوپ سے جھلسا ہوا تھا یا ویسے ہی کالا تھا، اس کے سر پر بالوں کی لٹیں بن گئی تھیں جیسے جب سے وہ پیدا ہوئی

تھی، کبھی نہائی دھوئی نہیں تھی، ٹانگوں کو عجیب طریقے سے بل دیتی، بازوؤں کو عجیب طرح سے پھیلاتی تھی، چلتے ہوئے بھی دوڑے جانے کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے اس کی ڈراؤنی ہنسی میں چھدرے دانتوں پر ہی نظر جاتی تھی، اس کے سوکھے ہوئے جسم سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ایک پنجر جیسے دوڑتا پھرتا تھا۔

پورو دیکھ کر کھڑی رہی، پاگل دوڑتی ہوئی آئی اور کھلونے بیچنے والی گلیلی کے چھاج سے کھلونے مٹھیوں میں بھر کر بھاگ گئی۔ اس کی ڈراؤنی اور چیختی ہنسی کی آواز دیر تک گلی میں گونجتی رہی۔ پگلی بھاگ گئی، عورتیں پھر دروازے کھول کر باہر آ گئیں۔ کھلونے بیچنے والی اپنے آدھے چھاج کو دیکھتی رہی۔ عورتیں ہنستی رہیں کہ وہ پاگل کھلونے اور جھنجھنوں سے کسے ڈرائے گی۔ پگلی سارا دن کھیتوں میں گھومتی پھرتی۔ کھیت سے کچھ توڑ کر کھا لیتی، کئی دفع عورتیں ایک دو روٹیاں بیٹھی ہوئی پاگل کے سامنے پھینک دیتیں، وہ چبا جاتی۔ کئی بار عورتیں کوئی پھٹی پرانی قمیض اسے پہنا دیتیں، پاگل کھلکھلا کر ہنس پڑتی، قمیض پہنے رکھتی پھر اس کے بٹن توڑ دیتی پھر کسی دن قمیض دانتوں سے پھاڑ دیتی۔ لیریں اس کے گلے میں لٹکتی رہتیں، پھر پاگل ان لیروں کو بھی کھینچ کر اپنے جسم سے دور کر دیتی۔ کبھی اپنے جسم سے سب کچھ اتار پھینکتی۔ عورتیں پھر کوئی پھٹی پرانی شلوار، کوئی پھٹی پرانی قمیض اسے پہنا دیتیں۔

پگلی اب سکڑ آلے گاؤں میں جیسے رچ بس گئی تھی، اسے روز روز دیکھنے کی سب کو عادت ہو گئی تھی، کئی بار گاؤں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے اس کے پیچھے پڑ جاتے، تالیاں بجاتے، اسے دوڑاتے، وہ اس کے پیچھے بھاگتے، پھر کوئی راہ چلتا سیانا لڑکوں کو دھمکاتا، لڑکے اس کا پیچھا چھوڑ دیتے۔

چھوٹے چھوٹے بچوں نے ضد کرنا چھوڑ دی، مائیں اس پاگل کا ڈراوا دیتیں۔ ''پگلی پکڑ کر لے جائے گی'' روتے ہوئے بچے سہم کر چپ کر جاتے۔ پاگل کسی چھپر تلے پڑی رہتی۔ کبھی کوئی پانی کا پیالا اس کے پاس، روٹی کا ٹکڑا اس کے سرہانے رکھ دیتا۔ کسی رحم دل نے چھپر کے نیچے ایک پھٹا لحاف رکھ دیا۔ پگلی آرام سے وہاں جا کر رات بھر پڑی رہتی۔

پگلی بس دوڑتی تھی اور ہنستی تھی۔ کسی کے بچے کو کچھ نہ کہتی تھی، کبھی کسی کی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ زمین پر گرے پڑے روٹی کے ٹکڑوں کو اٹھا لیتی اور چاٹ لیتی۔ کچھ ہی دنوں میں سب نے دیکھا اور پورو نے حیران و پریشان ہو کر دیکھا، پگلی کے پیٹ کا ابھار بڑھ رہا تھا، سارے گاؤں کی عورتیں جیسے شرما گئیں ہوں۔

پگلی نہ تو کچھ بولتی تھی نہ بتاتی تھی۔ پگلی کا جسم دن بہ دن بھرتا جا رہا تھا۔ پگلی کی پسلیاں روز بروز کسی جا رہی تھیں۔ عورتوں کا جی چاہتا وہ پاگل کو کچھ پہنا کر رکھیں۔ وہ پاگل کو کسی متبادل جگہ رکھیں۔ پگلی کے دھیان میں کچھ نہ آتا تھا۔ پگلی ویسے ہی ہنستی اور ویسی کی ویسی دوڑتی رہتی۔ ایک دن جب شام گہری ہوگئی، دو چار مرد مل کر پگلی کو ڈراتے دھمکاتے گاؤں سے باہر چھوڑ آئے۔ اس رات پگلی کسی کو نظر نہ آئی۔ سب نے سوچا، اب پگلی اس گاؤں سے چلی گئی ہے، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ پگلی اب کسی اور گاؤں چلی جائے گی۔

دوسرا دن ابھی آدھا ہی گزرا تھا کہ پگلی پھر گاؤں کی زمینوں میں گھوم رہی تھی۔ پگلی پہلے کی طرح گاؤں کے کھیتوں میں ہنس رہی تھی۔

وہ کیسا مرد ہوگا، وہ کیسا وحشی ہوگا جس نے اس طرح کی پاگل عورت کا یہ حال کر دیا۔ ساری عورتیں لعنت ملامت کرنے لگیں۔ سب شرمندہ ہو جاتیں۔

''جس کے پاس نہ حسن تھا نہ جوانی تھی، ماس کا ایک بت، وہ بھی ہوش میں نہیں تھا، صرف زندہ ہڈیوں کا ایک پنجر...... ایک پاگل پنجر...... چیلوں نے اسے نوچ نوچ کر کھا لیا......'' پورو سوچ سوچ کر تھک جاتی۔ پگلی کا پیٹ روز بہ روز بڑھ رہا تھا۔

پنجر میں پنجر

صبح اندھیرا تھا، اندھیرے میں پورو بلا ناغہ کھیتوں کو جاتی تھی۔ وہ ابھی باہر والی پگڈنڈی پر چل رہ تھی، ایک درخت کے نیچے کسی انسان کا بت گرا ہوا تھا، وہ ٹھٹھک گئی لیکن اس کا دل اتنا چھوٹا نہیں تھا وہ دھیرے سے اس بت کی طرف بڑھی، اس کے لئے پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ پگلی درخت کے نیچے پتھر ہو چکی تھی اور اس کے پاؤں کے قریب ایک نومولود کا بت تھا۔ جس کا ناڑو ابھی اس کی اول سے لگا ہوا تھا۔

پورو نے آہ بھرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے اس کے ہوش اڑ گئے ہوں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جھرجھری گھوم گئی اور وہ الٹے پاؤں بھاگ کر رشیدے کو بلا لائی۔

ایک پھٹی ہوئی چادر کا پلو پورو نے پگلی کے جسم پر ڈالا، پھر رشیدے نے پگلی کی نبض کو ہاتھ سے ٹٹولا۔ نبض ٹٹولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ موت کی مہر پگلی کے چہرے پر نمایاں تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اس کے

ماتھے پر جم گئی تھی۔

قدرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ پگلی کے بالوں میں نظر آ رہی تھی، بچے کے منہ میں اس کا دایاں انگوٹھا تھا۔

''یا اللہ......'' رشیدے کے منہ سے نکلا اور چاقو سے اس نے بچے کا ناڑو کاٹ دیا۔

پورو نے سر کے پلو میں بچے کو لپیٹ لیا اور دونوں گھر واپس آ گئے۔

صبح کی دھند کی طرح سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی، آٹا گوندھتے ہوئے عورتوں کے ہاتھوں سے پراتیں چھوٹ گئیں، جلتے تنوروں کو چھوڑ کر عورتیں پورو کے گھر بچہ دیکھنے جاتیں۔

روئی کے گالے جیسا سفید اور ملائم بچہ پورو نے نہلا دھلا کر ایک چوکی پر لٹایا۔ گرم دودھ میں گرم کپڑا بھگو کر اس نے اس کے ہونٹوں پر لگایا۔ بچہ پورے انہماک سے دودھ کی بوندیں چوس رہا تھا۔ جاوید اپنے نئے مہمان کو مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''رب تیرا بھلا کرے۔''

''رب تجھے زیادہ دے۔''

''تمہارے بچے جئیں۔''

''بہت اچھا کیا ہے۔''

عورتیں آ آ کر کہتیں، رحم کرنے پر اس کی ہمت بندھاتیں اور واپس لوٹ جاتیں۔ دو چار آدمیوں نے مل کر پگلی کی نعش ٹھکانے لگا دی۔

شام ہونے کو تھی، پورو بچے کے کاموں میں مصروف تھی۔ رشیدے نے لالٹین کی بتی صاف کر کے جب جلائی۔ بچے نے موٹی موٹی آنکھوں سے لالٹین کی طرف دیکھا۔ ابھی اس کی کچی نظر ٹک نہیں رہی تھی پھر وہ اپنے دھیان ہو گیا۔ پورو نے سوچنا شروع کر دیا۔

پگلی کے کالے پنجر کو کس مرد نے ہاتھ لگایا ہو گا۔ شاید پگلی کی مرضی سے، شاید زبردستی سے اور اس مرد کو کبھی بھول کر بھی یاد نہ آیا کہ اس نے پگلی کے ساتھ کیسی ہونی برتی ہے۔ کبھی اس بھوکے مرد کو اپنے بچے کی بھی یاد نہ آئی جس کی امانت اس نے پگلی کے پاس رکھی تھی......

پگلی کو شاید علم بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر ایک بیٹا پیدا ہو گا۔ دردِ زہ اس نے کس طرح برداشت کیا ہو

گا۔ اس کے لئے کسی دائی کے دل میں رحم نہ اٹھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ چیختی ہوگی۔ کھلی ہواؤں کے جھونکوں سے لڑتی ہوگی۔ ٹھنڈی زمین کی مٹی پر بلکتی ہوگی لیکن قدرت کے کڑے قانون سے جڑا سارے درد سمیٹے اس کا بچہ خود باہر دنیا میں آیا ہوگا۔ مٹی پر گر گیا ہوگا اور درد کی ماری پگلی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوگی۔ پھر پورو کو یاد آتا، پگلی نے زندہ رہ کر کیا لینا تھا۔ اس نے اپنے بچے کی کونسی دیکھ بھال کرنی تھی۔ اچھا ہوا اس کی جان چھوٹ گئی۔ اس کا بچہ کتنا خوبصورت تھا۔ ٹیڑھی ہڈیوں کے پنجر میں کیسے اتنا خوبصورت بچہ پل گیا۔ کیسی موٹی موٹی اس کی آنکھیں تھیں۔ بھرا ہوا چہرہ تھا، پورے مرد کا ایک چھوٹا سا ڈھانچہ تھا۔ نہ جانے اس کا بد بخت باپ کون تھا........

انہیں سوچوں میں پورو کو نیند آ گئی۔ اس نے دیکھا ایک تیز گھوڑی پر رشیدا اسے اٹھا کر بھاگ رہا تھا۔ کسی باغ کے چھپر میں اس کو تین دن رکھا، رشیدے نے پورے تین دن رکھنے کے بعد گھر سے نکال دیا تھا۔ پورو پگلی ہوگئی۔ گلیوں میں پھرنے لگ پڑی، اس کے پیٹ میں ایک بچہ سرکنے لگ پڑا اور پھر....... پھر ایک دن ایک درخت کے سایے میں پورو نے ایک بچے کو جنم دیا جس کی شکل ہو بہو جاوید جیسی تھی۔ اس کا بچہ اس کی چھاتیوں سے لگ کر دودھ کے لئے رو رہا تھا اور پورو کو دودھ نہیں آ رہا تھا........

پورو کی ڈر سے آنکھ کھل گئی، سامنے چوکی پر اس کا نیا بچہ سخت رو رہا تھا۔ پورو نے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ پھر ڈرتے ہوئے اپنے جاوید کا چہرہ دیکھا۔ جو قریب ہی چارپائی پر تھوڑی دیر پہلے سو گیا تھا۔ پھر پورو نے ڈرتے ہوئے باہر چولھے کے پاس بیٹھے ہوئے رشیدے کو دیکھا۔ رشیدا ابھی تک اس کو چھوڑ کر نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس نے اس کو گھر سے نکالا تھا۔ وہ اپنے گھر میں صحیح سلامت تھی۔ رشیدا اس کا مہربان شوہر تھا اور جاوید اس کا گھنگریالے بالوں والا بہت خوبصورت بیٹا تھا۔ اس کی گلی میں رہنے والی کمو بھی اس سے چوری چھپے پیار کا اظہار کرتی۔ پورو کے دکھ بانٹتی تھی اور اب اس کا خاندان بڑھ گیا تھا، اس کے گھر میں اللہ نے ایک اور بیٹا بھیج دیا تھا۔ پورو نے اٹھ کر نومولود کا ماتھا چوم لیا۔

پورو نے اٹھ کر سفید زیرہ مٹھی بھر کر کھایا۔ جاوید پورو کا پورے دو سال تک دودھ پیتا رہا اور دودھ چھڑوائے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اس نے سنا ہوا تھا کہ سفید زیرہ کھانے سے عورت کو دودھ اتر آتا ہے۔ اس نے چھوٹے بچے کو اپنا دودھ پلانا شروع کر دیا۔

تین دن کے بعد پورو کو سچ مچ دودھ اتر آیا۔ گاؤں کی عورتیں دیکھ دیکھ حیران ہوتیں، بچہ پورو کے

چھوٹے بیٹے کی حیثیت سے پلنے لگا۔

دعویدار

جڑی ہوئی پاتھیوں میں جیسے دھیرے دھیرے آگ دہکتی ہے، گاؤں میں کھسر پھسر چل نکلی تھی۔
''پگلی ہندو تھی، اس کے بچے کو مسلمانوں نے لے لیا ہے، سارے گاؤں کے سامنے انہوں نے ہندو بچے کو مسلمان بنالیا ہے۔'' بلی جیسے اپنے بلونگڑے کو جگہ جگہ اٹھائے پھرتی ہے پورو چھوٹے بچے کو گلے سے لگا کر اندرونی کمرے میں جا بیٹھتی، دیواروں کو چیر چیر کر بھی باتیں اس کے کانوں میں پڑ جاتیں، پہلے تو ایک دو ہندو گھروں میں صلاح مشورے ہوتے رہے۔

''بلاشبہ پگلی ہندو تھی۔'' کوئی کہتا۔

''ہم نے خود سنا ہے کہ وہ لالہ موسیٰ کے کھاتے پیتے گھرانے کی اچھی بھلی بیٹی کو اس کی سوتن نے اس کو مسان (جلے ہوئے مردے کی راکھ) کھلا دیئے تھے۔ اس وقت سے وہ پاگل ہوگئی تھی۔'' کوئی کہتا۔

''سنا ہے گھر والوں نے زنجیروں میں باندھ باندھ کر رکھا لیکن اس کی قسمت میں خوار ہونا لکھا تھا۔'' کوئی یہ کہتا۔

''یہ تو صرف باتیں ہیں، میں نے خود اس کے بائیں بازو پر ''اوم'' کھدا ہوا دیکھا ہے'' کوئی آدمی اپنی بات پر زور دے کر کہتا۔

''اندھیر ہے دوستو! ہمارے دیکھتے دیکھتے مسلمان ہماری آنکھوں میں مٹی ڈال گئے......''

''لعنت ہے ہم پر، ہندو بچے کو انہوں نے پل بھر میں مسلمان بنالیا۔''

''چھوڑ دو دوستو! نہ جانے وہ کس کی ناجائز اولاد ہے۔ ہم اس کتے کے بچے کو کہاں باندھیں گے۔'' کوئی آدمی یہ بھی کہہ دیتا۔

''نالائق! سوال اس وقت مذہب کا ہے اس طرح تو کل کلاں کو وہ سارے گاؤں کو مسلمان بنالیں گے اور تم ان کا منہ دیکھتے رہو گے۔'' ایک دو آدمی اکٹھے ہی اونچی آواز میں بول اٹھتے۔

کمرے کی فضا کچھ اس طرح ہو جاتی جیسے دروازوں کے اندر وہ گھٹ کر رہ گئی ہو۔

''اس لڑکے کو واپس لے کے رہیں گے، دیکھ لیں گے کون ہماری راہ میں آتا ہے۔''

''اصل میں تو چار پیسوں کی بات ہے، مہری کو چندا اکٹھا کر دیں گے وہ خود ہی لڑکے کو پال پوس دے گی۔'' کوئی آدمی جوش سے زمین پر آگے سرکتے ہوئے کہتا۔

''ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں، سارا گاؤں مل کر ایک بچہ بھی نہیں پال سکتا؟''

''نہ جانے بچہ بھی پگلی کی طرح گونگا بہرہ ہی نہ نکلے کہ.......'' درمیان سے پھر کوئی آدمی بول اٹھتا۔

''پھر کیا ہے دھرم شالا میں بڑا ہو کر جھاڑو لگا دیا کریگا، دو وقت کی روٹی ہی کھائے گا۔''

پھر وہ ایک دوسرے کی دلیری پر ہلاشیری دیتے، اور خوش ہوتے۔

''پہلے مہری سے تو پوچھ لو۔'' کوئی آدمی کہہ دیتا۔

''ارے واہ، کیوں نہیں رکھے گی، چاندی کا جوتا اس کے سر میں دے ماریں گے اور پھر لڑکے کی بات کریں گے۔''

''ارے بچے کا کیا ہے، دھرم شالا میں تو ڈھور ڈنگروں کا ہی اتنا کام ہے، مفت میں کام کرنے والا مل جائے گا۔

''پہاڑ سے ابھی گری نہیں........ ارے لڑکا بڑا تو ہو لے، پہلے ہی اس کا....''

''ارے مرتے کیوں جا رہے ہو؟ اگر دھرم کے نام پر تم اتنا کچھ بھی نہیں کر سکتے تو جا مرو اندھے کنویں میں۔''

''تمہارے کھیت کا پانی کوئی اپنے کھیت کو لگا لے تو تم اس کا سر پھاڑ دیتے ہو، آج وہ تمہارے ہندوؤں کا لڑکا اٹھا کر لے گئے ہیں تو تمہارے منہ کو پھپھوندی کیوں لگ گئی ہے؟''

کمرے کی فضا اس طرح ہو جاتی جیسے اس میں پتھر کے کوئلوں کا دھواں مل گیا ہو۔ اب رشید اجب باہر اپنے کھیتوں کو جاتا تو پاس سے گزرتے ہوئے ہندو اسے گھور گھور کر دیکھتے، رشیدا اپنے ہی دھیان میں چلتا جاتا۔

ایک دو بار رشیدے نے دھیرے دھیرے پورو سے کہا بھئی'' گاؤں کی فضا اچھی نہیں، انہوں نے اس جھگڑے سے کیا لینا ہے۔ ویسے ہی بات بڑھ جائے گی۔ کوئی بات نہیں اگر ان کی یہی مرضی ہے وہ لڑکے

لے جاتے ہیں تو لے جائیں، جو لڑکے کی قسمت میں ہے وہ ہو جائے گا۔''

پورو کہتی تو کچھ نہ، ویسے اسے ہول اٹھتے۔ اس نے ہڈیوں کے چھوٹے سے پنجر کو دن رات گلے لگا لگا کر چھ ماہ کا کیا۔ اب وہ بھی جاوید جیسا گول مٹول نکلتا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پورو کو پہنچاننا شروع ہو گئی تھیں۔ جہاں جہاں پورو جاتی وہیں اس کی آنکھیں اس کا پیچھا کرتیں، وہ رشیدے کو دیکھ دیکھ کر اس کی طرف بڑھتا تھا......

پھر پورو سوچتی پہلے ہی دن ہندوؤں کو کیوں خیال نہ آیا، اسے لے جاتے، پال لیتے اس کو ماں کی آغوش دیتے۔ اس کو باپ کا پیار دیتے۔ پورو نے چھ مہینے راتیں جاگ جاگ کر گزاری تھیں۔ اس نے زیرہ پھانک پھانک کر اپنی نسوں سے دودھ نکالا تھا۔ اس نے اس کے گندے کپڑے دھو دھو کر اپنے ناخن گھسا لئے تھے۔ پھر پورو کو یاد آتا اس نے اپنے بچے کو شہد کی گھٹی دی تھی اور اپنے نزدیکی مسلمان گھروں مین پنجیری بانٹی تھی کہ بچے کو کہیں بڑے ہو کر یہ خیال نہ آئے کہ اس کے لئے کسی نے کچھ نہیں کیا۔

ایک دن.... گاؤں کے سرپنچ نے رشیدے کو بلا بھیجا۔ پورو کے ہونٹوں پر پپڑی جم گئی، وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سارا اسی کا کیا دھرا ہے۔ رشیدے کو وہ برا بھلا کہیں گے۔ رشیدے کی وہ بے عزتی کریں گے......

پورو کہہ رہی تھی کہ وہ رشیدے کے ساتھ جائے گی۔ ان کے سوالات کے جوابات اس کے پاس تھے، وہ خود جا کر ان سے لڑکے کی بھیگ مانگ لے گی..... لیکن رشید انہ مانا اور اکیلا ہی وہاں چلا گیا جہاں انہوں نے اسے بلایا تھا۔

گاؤں کے ایک ہندو سرپنچ کے صحن میں تین چار چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر گاؤں کے جانے پہچانے ہندو جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا رشیدا دو چار دوستوں کے ساتھ آئیگا یا ہو سکتا ہے نہ آئے پھر وہ رشیدے سے برے طریقے سے پیش آئیں گے لیکن رشیدا وہاں اکیلا ہی چلا آیا، سلام دعا کرتے ہوئے وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیوں بھئی کیا مرضی ہے تیری...؟ لڑکا واپس کرنا ہے کہ نہیں۔'' حقے کی نڑی کو منہ سے ایک طرف کرتے ہوئے ایک نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

''میری کیا مجال ہے؟ اللہ کی ذات ہے دینے والی اور لینے والی میں کون ہوتا ہوں۔'' رشیدے نے

ایک ہاتھ ماتھے پر رکھا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

''یہ تو ہوئیں چکنی چپڑی باتیں، سیدھی طرح بات کر۔'' ایک نے طیش میں آ کر کہا۔

''میں تو اللہ کے بھروسے پر اسے اٹھا لایا ہوں اگر دیر ہو جاتی تو شاید کسی حیوان کی نظر ہو جاتا لیکن اللہ کی طرف سے ابھی اس کی زندگی تھی......''

''ٹھیک ہے اگر رب کی طرف سے دھاگا لمبا ہے تو کوئی بھی اسے توڑ نہیں سکتا لیکن تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ اس کی ماں ہندو عورت تھی اور ایک ہندو کے بچے کو اٹھا کر لے جانا ہم برداشت نہیں کر سکتے۔''

''بھلے مانسو! مجھے نہیں معلوم کہ وہ ہندو تھی یا کچھ اور؟ وہ ہندو گھروں سے بھی کھاتی تھی اور مسلمان گھروں سے بھی کھاتی تھی......'' رشیدا کہہ رہا تھا۔

''لیکن وہ تو شدائن تھی تم تو شدائی نہیں ہو۔'' درمیان سے بات کاٹتے ہوئے کوئی کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے لیکن پہلے دن ہی اس لڑکے کو لے لیتے، پال لیتے، میں نے کب نہ کی ہے۔ مٹھی برابر وہ پنجر تھا، میری گھر والی نے دعائیں مانگ مانگ کر چھ ماہ نکالے ہیں اب وہ بچ نکلا ہے تو آپ کو بھی یاد آ گئی ہے۔ خدا کا خوف کھاؤ، خدا ترسی کرتے ہوئے آپ نے پالنا ہے، خدا ترسی کرتے ہوئے میں پال رہا ہوں اور اس میں سے میں نے کیا لینا ہے۔'' رشیدے نے کچھ اس طرح کہا کہ دو تین آدمیوں کے چہروں پر بھی یہی خیال نمودار ہوا، چھوڑو جانے دو، پال رہا ہے تو پالنے دیں، مفت میں بلا گلے میں ڈالنی ہے۔

''دیکھو! ہم بات بڑھانا نہیں چاہتے، نہ ہی وہ ہمارا کچھ لگتا ہے اور نہ ہی تمہارا کچھ لگتا ہے، یہ دھرم کا سوال ہے سو دھرم کی راہ میں الجھنا نہیں چاہیے ویسے ہی تم اپنی جان کے لئے خطرہ مول لے لو گے۔ کسی نے تمہارے ساتھ اگر اونچ نیچ کر دی تو ہم ذمہ دار نہیں اب خود ہی بھلے مانسوں کی طرح لڑکا واپس کر دو۔ ویسے ہی اگر چار دن کھلانے پلانے کے عوض چار پیسے لینے ہیں تو لے لو۔'' ایک سرپنچ نے کہا۔

''بیشک......بیشک.....'' کہہ کر سارے بول اٹھے۔

''اللہ...... اللہ......'' رشیدے نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کو لگائے۔

''مہری کھڑی ہے، ہمارے دو تین لوگ تیرے ساتھ جاتے ہیں اور لڑکے کو تیرے گھر سے لے آتے ہیں ہم خود ٹھیک کر لیں گے۔''

''میں ایک بار تم سب کی منت کرتا ہوں اس بے چارے پر رحم کھاؤ اور جہاں ہے وہیں رہنے دو۔

میری گھر والی اسے اپنے جنم دیئے ہوئے کی طرح پال رہی ہے۔'' رشیدے نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''ہم نے تجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے اگر تم سکھی رہنا چاہتے ہو تو بھلے مانس کی طرح چلو ورنہ ہم جانتے ہیں کہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلتا...... '' دو تین آدمی چار پائیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور چادروں کی بکل ماری، اندرونی کمرے سے مہری آ گئی۔ رشیدے کو کھڑا ہونا پڑا، سب لوگ رشیدے کے گھر کی طرف چل دیے۔ پورو اپنے گھر کے دراز ے کے پاس کھڑی ہو کر گلی سے قدموں کی چاپ سن رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے رشیدے کا جھکا سر اور تین چار آدمیوں کو اس کے ساتھ آتے دیکھا پورو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ آج پورو کو اپنے وہ دن یاد آ گئے جس دن اس کی ماں کا ساتھ چھوٹا، جس دن اس کے باپ نے آنکھیں پھیر لیں، جس دن اس کے بہن بھائی اس سے بچھڑ گئے تھے۔ یہ لڑکا بھی اس کے جسم کا حصہ بن چکا تھا اور اس رشتے کے ٹوٹنے میں بھی اتنا ہی درد تھا۔

پورو نے بھاگ کر لڑکے کو سینے سے چمٹا لیا۔ رشیدا اپنے صحن میں اس طرح آ کر کھڑا ہو گیا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ نہ تو رشیدے کو کچھ کہنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی پورو کو کچھ پوچھنے کی۔ مہری بھی پل بھر کو سکتے میں آ گئی۔ پورو کے سینے سے بچے کو علیحدہ کرنا بہت مشکل لگا۔

''جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے، ہم نے کام کاج بھی کرنا ہے۔'' ساتھ آئے ہوئے تینوں نے کرخت لہجے میں کہا۔

مہری نے دونوں ہاتھ بڑھا کر بچہ پورو کے ہاتھوں سے اچک لیا۔ پورو کا پلو لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ پورو کو اس طرح لگا جیسے لڑکا اپنے ہاتھ سے اس کا کلیجہ نکال رہا ہو۔ پورو کا پلو کھنچتا چلا گیا۔

مہری نے لڑکے کے ہاتھ سے پلو چھڑا دیا۔ لڑکا بلک اٹھا شاید اجنبی ہاتھوں سے۔ پورو ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح سہارا لیکر بیٹھ گئی۔ گلی کے موڑ سے ابھی تک بچے کے رونے کی صدا آ رہی تھی۔ شام تک پورو کی چھاتیوں سے دودھ کے بہنے سے اس کی قمیض بھیگ گئی۔ وہ کہتی تھی لڑکا بھوک سے بلک رہا ہو گا۔ اسی لئے اس کا دودھ نکل نکل کر بہہ رہا تھا۔ پورو کے گھر رات کا کھانا کسی نے بھی نہ کھایا جب جاوید نے معصومانہ انداز سے پوچھا۔

''ابا! ہمارے کاکے کو کہاں لے گئے ہیں؟'' یا ''ابا! ہمارا کاکا کب آئے گا؟''

پورو اور رشیدا لاجواب ہو کر جاوید کی طرف دیکھتے، شرمندہ سے ہو کر چپ کر جاتے۔

پورو کی آنکھوں کے سامنے کمو کا چہرہ آجاتا۔ پورو کی آنکھوں کے آگے لڑکے کا چہرہ آجاتا۔ پورو رہ رہ کر سوچتی، وہ ٹوٹے ہوئے پھولوں کو کیوں سینے سے لگا لگا کر بیٹھتی ہے؟ وہ ٹوٹی ہوئی کلیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کیوں کرتی ہے؟ سب ہی اس کے لئے غیر تھے۔ کوئی بھی اس کا اپنا نہیں بنتا تھا۔ پھر رہ رہ کر اس کو رشیدے کا چہرہ اچھا لگتا۔ ایک وہی اس سے نبھا کر رہا تھا۔ صرف وہی اس کا اپنا تھا، اس کے جاوید کا باپ۔

دوسرا دن اور پھر تیسرا دن گزرا اس سے اگلے روز سارے گاؤں میں ایک ہی شور تھا "لڑکے نے نہیں بچنا، لڑکا قریب المرگ دکھائی دیتا ہے، لڑکے کا کوئی حال نہیں، دودھ کا جو گھونٹ بھی اس کے حلق سے اترتا ویسے کا ویسا ہی باہر آجاتا۔"

پورو دو دیواروں کے ساتھ لگ لگ کر روتی، پورو کی چھاتیاں دودھ اکٹھا ہونے کی وجہ سے اکڑ گئیں۔ بچے کو دودھ پئے کافی دن ہو چکے تھے۔

"بچے کا دودھ چھڑوالیا ہے، بچے کی آہ ضرور پڑے گی۔"

"اگر لڑکا مر گیا تو گاؤں پر آفت آجائے گی۔"

"میں تو اپنے شوہر سے کہتی ہوں، بھلے مانسوں کی طرح جہاں سے بچہ لائے ہو وہاں ہی چھوڑ آؤ۔"

"ہم خود بچوں والے ہیں کسی کی آہ بہت بری ہوتی ہے۔"

"میرا مرد اپنی ہی منواتا ہے میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ پرائی آگ سے تم نے کیا لینا ہے؟"

"کہتے ہیں رات کو مہری نے ٹھنڈا دودھ لڑکے کو پلا دیا تھا، لڑکا کی جان کو خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔"

"بھینس کا دودھ بھلا چھوٹے سے بچے کو کیسے ہضم ہوتا، لڑکے کو ابکائیاں آنی شروع ہو گئیں۔"

"اری بچے نے دھوکہ کھایا ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہے اس کا چہرہ دیکھتا رہا ہے، اب وہ کیسے بھولے۔"

"بیچارا بے زبان ہے۔"

گاؤں کی ہندو عورتوں کے منہ پر یہی باتیں تھیں۔ پورو جب یہ باتیں سنتی اس کا جی چاہتا کہ بھاگی بھاگی دھرم شالا جائے اور ان کی منتیں کرے، ایسے ہی ایک جی کو مت مارو۔ بچہ میری جھولی میں ڈال دو، یہ بچ جائے گا۔

پورو کو حوصلہ نہ ہوتا، اسے امید نہیں تھی، پتھر دل مذہبی لوگ اس کی منت نہیں سنیں گے..... اس سے

اگلے دن بھی کچھ نہ ہوا۔

پھر اچانک رشیدے کے صحن میں دو چار لوگ آ کھڑے ہوئے۔

''یہ لو اس کی زندگی تمہارے حوالے کرتے ہیں اگر بچ سکتا ہے تو بچا لو اور انہوں نے سفید کپڑوں میں لپیٹا ہوا پیلا بے ہوش بچہ رشیدے کی جھولی میں ڈال دیا۔

ایک بار تو رشیدے کا جی چاہا کہ وہ کس کر ایک تھپڑ ان کے منہ پر دے مارے۔

''میری چھ ماہ کی خدمت کے عوض تم چاندی کے چار سکے دیتے تھے اب اس کی ٹانگیں قبر میں لٹکا کر میری حوالے کرنے آئے ہو، جاؤ جہاں مرضی لے جاؤ'' پورو کا خوش چہرہ دیکھ کر رشیدا سب کچھ پی گیا۔ ایک ہی ہفتے کے اندر اندر لوگوں نے سارے گاؤں نے دیکھا، لڑکا پورو کے صحن میں اچھا بھلا کھیل رہا تھا۔

رتو وال

رحیمے کی بوڑھی ماں کی دونوں آنکھوں کی روشنی ختم ہو رہی تھی۔ رحیمے کی ایک بیوی سات ماہ کی نرم و نازک بچی چھوڑ کر مر گئی اور اس کی دوسری بیوی کی ساس سے کم ہی بنتی تھی۔ رحیمے پر مشکل وقت دیکھ کر اسے افسوس ہوتا، ابھی تک اس کے ہاتھ پاؤں سلامت تھے وہ رسوئی کے بیسیوں کام سنوارتی تھی۔ اس نے روئی کات کات کر دریوں سے ٹرنک بھر دیے تھے، اس نے سوت کات کات کر چادروں اور کھیسوں سے گھر بھر دیا تھا۔ ابھی تک وہ اپنے بڑھاپے میں دانے صاف کر لیتی، آٹا پیس لیتی، کپاس بیل لیتی، صبح سویرے دودھ بلونے کے لئے بیٹھ جاتی تھی پھر بھی اس کی بہو اس کا مذاق اُڑاتی کرتی اور سوچتی تھی اگر وہ آنکھوں سے محتاج ہو گئی تو اس کو کسی نے پانی بھی نہیں پوچھنا۔

دن رات افسوس کرتی رحیمے کی ماں نے ایک دن پورو کی منت کی کہ وہ اگر پندرہ دنوں کے لئے اس کے ساتھ چلے تو وہ اپنا علاج کروا لے شاید اسے افاقہ ہو۔

''اماں! وہ حکیم کہاں رہتا ہے؟'' پورو نے پوچھا۔

''حکیم کہیں نہیں بیٹی! ایک باؤلی ہے اسے بزرگوں کی دین ہے۔ کہتے ہیں اس کے پانی سے روزانہ سویرے نماز پڑھ کر آنکھیں دھولی جائیں تو دنوں میں آنکھوں کی روشنی واپس آ سکتی ہے۔ سنا ہے وہاں

سے کئی نابیناؤں کی بینائی واپس آ گئی ہے۔ باؤلی کی مٹی بھی آنکھوں پر لگاتے ہیں۔''

''اماں وہ باؤلی کہاں ہے؟''

''رتووال گاؤں میں، ایک فقیر وہاں رہتا ہے۔ آئے گئے مریضوں کے لئے اس نے باؤلی کے پاس خیمہ لگوایا ہوا ہے۔''

پورو کے کانوں میں جیسے کسی نے تنکا چبھو دیا ہو۔ رتووال..... رتووال..... چھتو آنی کے کھیتوں کے پاس کھڑی ہو کر جس رتووال کو جاتی ہوئی سڑک کا پورو منہ دیکھتی تھی، جس سڑک سے کسی نے پورو کو لینے کے لئے گھوڑی پر چڑھ کر گزرنا تھا..... رتووال..... رتووال....

پورو کے پیروں سے وہ راستے کبھی میلے نہ ہوئے۔ پورو نے اپنی آنکھوں سے کبھی وہ گاؤں نہیں دیکھا۔ پورو کو ایک بھولا ہوا نام یاد آیا رام چند..... رام چند......

پورو کے اندر سے ایک دھواں اٹھا اور وہ ساری کی ساری شکوے شکایتوں سے لبریز ہو گئی۔

''ایک بار اس آدمی کا چہرہ تو دیکھوں، کس طرح کا ہے، ایک بار اس کا گاؤں تو دیکھوں کہ کیسا ہے؟''

''اچھا ماں! میں تیرے ساتھ جاؤں گی۔'' پورو کے منہ سے جلدی میں نکل گیا، پھر پورو شرمندہ سی ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے محسوس ہوا جیسے رحیمے کی ماں نے اس کے اندر کی بات بوجھ لی ہو۔

''اللہ کرے تیرے بچے جئیں، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔''

رحیمے کی ماں کے دل سے دعائیں نکلیں۔ شاید اس کے من میں خیال آیا کہ کہیں اس کی اپنی بہو بھی اتنا میٹھا بول سکتی۔

''اماں! جاوید کے باپ کو تم راضی کرو میں نہیں کہوں گی۔'' پورو نے شرمساری کے کہا۔

''لو دیکھو، وہ میرا بیٹا ہے، کبھی انکار نہیں کر سکتا۔ میری خاطر چار دن مشکل میں گزار لے گا۔'' رحیمے کی ماں نے بڑے دعوے سے کہا۔

پورو اچھی طرح جانتی تھی کہ رشید اس کی بات نہیں ٹالے گا لیکن رشیدے کے سامنے رتووال کا ذکر کرنا پورو کے لئے مشکل تھا۔

اس رات پورو کوئی خیال آئے "وہ میرا کون ہوتا ہے۔ میں تو آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھوں۔ پرایا مرد! مجھے اس کے گاؤں سے کیا؟ گاؤں میں رہتا ہے تو بے شک رہے، اماں اپنا علاج کروائے گی پھر ہم واپس آجائیں گے۔ پگلی یہ تیرا اندر ہے جو اس کے بارے میں سوچتا ہے، اسے تو تم ایک برے خواب کی طرح بھی یاد نہیں ہوگی......"

پورو سوچتی کہ اس کے گاؤں میں جا کر رات ہوتے ہی اس کے اندر سے جیسے کوئی سوئے ہوئے مردے اکھاڑے گا، اس کے اندر جیسے کوئی مردوں کو جگائے گا، ان کفنوں کو اتار کر کیا لینا؟ وہ رتووال نہ جائے۔ وہ رتووال کے راستے سے بھی نہ گزرے۔ پورو کی زبان سے نہ تو نہیں میں جواب آتا اور نہ ہی ہاں میں۔

جاوید باپ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے رشیدے نے اسے ساتھ نہ بھیجا۔ دونوں عورتوں کو پہنچانے کے لئے رحیمے کا ایک پرانا نوکر ان کے ساتھ گیا۔ پورو چھوٹے بچے کو ساتھ لے گئی۔

ان کا نوکر اپنا سارا سامان پیچھے رکھ کر یکے کے اگلے پھٹے پر یکے والے کے ساتھ بیٹھ گیا، پورو اور اماں آمنے سامنے سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔ یکے کے پہلے ہچکولوں سے ہی پورو کا بیٹا اس کی جھولی میں سو گیا۔ آگے بیٹھے ہوئے نوکر نے اس سے بچہ لے لیا۔ یکہ رتووال کے راستے پر چلنے لگا۔

گھوڑے کے کھروں کی آوازیں جیسے پورو کے دماغ میں بج رہی تھی۔ اس نے اپنا ماتھا یکے کے بانس سے ٹکایا اور اسے نیند آ گئی۔

سجی ہوئی پالکی میں پورو چاندی کے گچھے والے ایک گاؤ تکیے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چوڑے کے بوجھ سے اس کے بازو اٹھ نہیں رہتے تھے۔ ہوا کے ایک جھونکے سے پالکی کا کپڑا ذرا سا سرکا۔ مدہم سی روشنی میں اس نے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں پر حنا کے ٹھپے لگے ہوئے تھے۔ کتنی خالص حنا تھی۔ اس کی سہیلیوں نے بہت زیادہ لگا دی تھی۔ پگلی کہار نہ جانے کیسے چلتے ہیں، پالکی میں بیٹھے ہوئے اس کے پہلو تھک گئے تھے۔ پالکی ہچکولے کھا رہی ہے...... اس کے گندھے ہوئے سر سے اس کا آنچل ڈھلک گیا۔ اس نے ہاتھ اونچا کر کے آنچل ٹھیک کیا۔ کنگنوں کی جھنکار سے پالکی میں ایک کھڑکا ہوا۔ وہ بھوک سے نڈھال تھی۔ کل سے وہ کچھ کھا نہ سکی۔ اس کی ماں نے مٹھائی کی ایک ڈلی اس کی جھولی میں رکھ دی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ مٹھائی کا ایک ٹکڑا لے کر منہ میں ڈالے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی......

پورو کو کندھے سے پکڑ کر اماں ہلا رہی تھی۔ "سخت دوپہر ہو گئی ہے کوئی لقمہ منہ میں ڈال لے۔" یکے

والے نے یکہ کھڑا کر لیا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹے گاؤں کے پاس ٹھہر کر سب نے پانی پیا۔ پورو ڈر سے جاگ گئی۔ نہ کوئی پالکی تھی نہ کنگن تھے، نہ حنا تھی نہ چوڑا اور وہ خالی یکے کے پچھلے پھٹے پر ماں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی.......

پورو نے گھی لگے پراٹھے بنا کر اپنے ساتھ رکھ لئے تھے۔ اماں نے وہی گٹھڑی کھولی، نوکر کو چار پراٹھے دیے، خود لیے، پورو کے آگے رکھے، پورو سے نوالہ حلق میں نہیں اتر رہا تھا، تلے ہوئے پراٹھوں کے گھی سے پورو کو متلی ہو رہی تھی۔

''فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے، جلدی ختم کر لیں، رات گھوڑی کو آرام دلوا کر پھر میں نے سویرے واپس جانا ہے۔'' یکے والا کہہ رہا تھا، پھر ویسے ہی سواریاں یکے میں بیٹھ گئیں۔ پورو نے اپنا ماتھا یکے کے بازو پر ٹکا لیا، پچھلی رات اُس نے سفر کے لئے درکار سامان باندھا تھا اور رات جاگتی رہی تھی۔

پالکی پھر ہچکولے کھانے لگی۔ رتو وال کا راستہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یکدم باجوں اور شہنائیوں کی آواز اونچی ہوگئی۔ پالکی کے اردگرد باجے ہی باجے بج رہے تھے۔ پورو کو لگا رتو وال آ گیا ہے۔ باجوں کی آواز زیادہ اونچی ہوگئی۔ لڑکیاں گانے گا رہی تھیں۔ ایک عورت نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا..... پھر کسی نے ایک چھوٹا سا بچہ اس کی جھولی میں بٹھا دیا، بچہ اس کی جھولی میں رو رہا تھا، عورتیں کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ وہ بچے کا شگن کر رہی تھیں۔ اماں اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔ ''آج تجھے کتنی نیند آ رہی ہے، بچہ رو رہا ہے۔''

پورو پھر ڈر کر جاگ گئی۔ یکے کے پچھلے پھٹے پر بیٹھی ہوئی اماں اس سے بات کر رہی تھی۔

''کتنی بڑی بارات ہمارے پاس سے گزر گئی ہے۔ باجے پر باجے بج رہے تھے، آپ کو جاگ نہیں آئی۔'' نوکر کہہ رہا تھا۔

''تجھے سوئی ہوئی کو اس نے بچہ پکڑایا وہ بھی تم نے پکڑ لیا پھر بھی تو نیند سے نہیں جاگی۔'' اماں کہتے کہتے ہنس پڑی۔

یکہ رتو وال کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ جب باؤلی کے نزدیک جا کر سب لوگ یکے سے اترے۔ سامنے فقیر کا چھپرا تھا۔ خیموں کی جگہ فقیر نے دو تین چھپر بنوا لئے تھے جن میں دور دراز سے آئے گئے مسافر رہتے تھے۔ باؤلی کی مٹی، باؤلی کا پانی آنکھوں پر لگاتے تھے۔ مرادیں مانگتے تھے۔ فقیر نے ان نئے مسافروں کو ایک چھپر دلوا دیا۔ نوکر نے سب سامان چھپر میں رکھا اور اماں کو لے کر فقیر کے پاس چلا گیا۔ پورو نے چھپر میں

پڑی ہوئی بان کی چارپائی پر کھیس بچھا کر بچے کو لٹا دیا اور چھپر کی چوکھٹ میں کھڑے ہوکر سامنے کھیتوں کے پار گاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔

......میں رتو وال آگئی مجھے کسی نے بلاوا نہیں بھیجا، مجھے کوئی بھی لینے نہیں گیا، کسی نے بھی شہنائی نہ بجائی، کسی نے گانا نہیں گایا، کسی نے بھی میرے ہاتھوں میں چوڑی نہیں پہنائی، ایک چوڑی بھی میری بانہوں میں نہیں چھنکی۔ حنا کا ایک پتا بھی میرے ہاتھوں پر نہیں لگا۔

گاؤں کے باہر باؤلی کی چپ پورو کو کھائے جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس گاؤں سے بھاگ جائے، وہ یہاں سے دوڑ جائے۔ رہ رہ کر وہ دانت پیستی۔ اس گاؤں کے لوگ کس قدر بے قدرے ہیں، کوئی اسے نہیں کہتا کہ "بیٹھ جاؤ!" کوئی اسے نہیں کہتا "جیو" کوئی اسے نہیں کہتا......

پورو پھر کچھ سنبھلی۔ اسے لگا کہ وہ پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ کہیں وہ شدائیوں کی طرح گلیوں میں بھاگنے نہ لگ جائے۔ کہیں وہ اپنے کپڑے نہ پھاڑ دے۔ کہیں وہ اونچی آواز میں بولنے نہ لگ جائے۔

اماں کو فقیر نے بتایا، پورے تیرہ دن انہوں نے وہاں رہنا تھا۔ ان کا نوکر دوسرے دن واپس سکڑ آلے چلا گیا۔ آٹا، دال وہ ساتھ لے کر آئی تھیں۔ ویسے کوئی چاہے تو فقیر کی درگاہ سے بھی روٹی کھا سکتا تھا۔

پورو نے گاؤں کی طرف رخ نہ کیا۔ گاؤں کی کوئی بات بھی وہ کس سے پوچھتی اور کیا پوچھتی۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ گاؤں جاتی بھی تو کس بہانے......؟ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو فقیر کے نوکر چاکر سب کچھ وہیں لا دیتے تھے۔ پورو کو یہ سوچ کر ہول اٹھتا کہ وہ گاؤں کے باہر ہی سے واپس چلی جائے گی لیکن گاؤں تک نہ جا سکے گی۔ پورو کے جی میں آتا کہ ہو نہ ہو وہ جا کر سارا گاؤں دیکھ آئے، اس کا گھر بھی دیکھ آئے، اسے بھی دیکھ آئے لیکن اس کو کوئی نہ جانے..... پھر پورو سوچتی کہ اسے کیسے معلوم ہوگا کہ اس کا گھر کونسا ہے، وہ کسی سے پوچھے گی تو کیسے، پھر گھر کو اندر سے کیسے دیکھے گی تو کیسے...... پھر پورو سوچتی کہ اس نے گھر دیکھ کر کیا لینا تھا۔ اس کا اس گھر سے ناطہ ہی کیا تھا۔ کیوں اس کو اس طرح کے خیالات آتے ہیں، پورو کا جی کسی جگہ نہ ٹکتا۔ دن پر دن گزر رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے پورو کے منہ سے بھولا ہوا گیت نکلا۔

جے آئے ٹر چلے

ساڈے آیاں دا قدر نہیں

ہائے ربا! ساڈے آیاں دا صبر پوے

(جیسے آئے تھے ویسے ہی (خالی ہاتھ) لوٹ چلے، ہمارے آنے کی کسی نے قدر نہ کی، اے خدا! ہمارے آنے کا (ان لوگوں پر) صبر پڑے)

متعدد بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے اور کئی بار اس نے آنسو پئے۔ بچے کو اماں کے پاس لٹا کر پورو کھیتوں سے ہو آتی۔ وہ سوچتی ایک بار دیکھوں اور پہچان لوں۔

پھر وہ سوچتی اتنے سال ہو گئے ہیں کیا پتہ شکل کیسی ہو گئی ہو، چاہے وہ میرے پاس سے گزر جائے۔ مجھے اس کی اتنی زیادہ پہچان بھی تو نہیں ہے۔

کھیتوں میں کام کرنے والوں سے پورو کبھی کبھار پوچھ لیتی۔

''بھائی! یہ کس کے کھیت ہیں، دو گاجریں لینی تھی، ہم تو مسافر ہیں۔''

اگلے دن کسی نے سچ مچ رام چند کا نام لے لیا۔ پورو کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں۔ پورو کو چکراتے ہوئے محسوس ہوا کہ وہ اسی مٹی پر گر جائے گی۔ وہ اسی مٹی میں مٹی ہو جائے گی......

پورو اس کیکر کے نیچے کھڑی کی کھڑی رہ گئی، جیسے کسی نے اس کی ٹانگوں سے ہمت نکال لی ہو۔ اس کے پاؤں جیسے جم کر برف کے ڈھیلے ہو گئے ہوں، اس مٹی نے جیسے پورو کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہو۔

پورو کو محسوس ہوا وہ کھڑے کھڑے انار کا ایک بوٹا بن کر وہاں اگ پڑی ہو۔ جس کے سرخ اناروں کو جب بھی کوئی توڑنے لگتا وہ جلی ہوئی لکڑی کی طرح گر جاتے۔ اس کے سرخ اناروں کو جب بھی رام چند توڑتا، انار کے سرخ دانے خون کے قطرے بن کر اس کی قمیض پر گر پڑتے اور اسے انار کے بوٹے سے آواز آتی۔

میں بوٹا اگی ہوئی آں

میں بے مرادی موئی آں

(میں ایک پودے کی طرح اُگی ہوئی ہوں، میں ایک بے مراد لاش کی طرح ہوں)

کام کرنے والے نے کاٹے ہوئے چنوں کا گٹھا باندھ کر سر پر اٹھا لیا۔ پورو کے ہوش ٹھکانے آئے اور اس کو خیال آیا کہ جو شہزادی انار کا بوٹا بن کر اگی تھی، اس کی کہانی اس نے بچپن میں سنی تھی۔ آج تک وہ نہ تو شہزادی بن سکی نہ ہی انار کا بوٹا۔

''مالک آرہا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے کام کرنے والا چنوں کا گٹھا لے کر کنویں کی طرف چلا گیا۔ پورو کی آنکھوں سے آنسو زار و قطار گرنے لگے۔ رام چند جب پورو کے پاس سے گزرا تو اس کی نظر پورو کے چہرے کی طرف گھوم گئی جس پر آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ پورو کو نہ کیکر کی اوٹ یاد آئی اور نہ ہی پلو سے آنسو پونچھنا۔ شاید آنسوؤں کی برسات میں رام چند کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تم کون ہو بی بی؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟''

رام چند کے پاؤں پورو کے سامنے رک گئے۔ پورو بول بھی نہ سکی۔ ''تمہیں کوئی تکلیف ہے بی بی؟'' پورو کے کانوں میں پھر رام چند کی آواز پڑی۔ پورو کی زبان جیسے کسی نے پیچھے کھینچ لی تھی وہ بت بنی کھڑی رہی۔ اس کے اندر کے انتہائی صدمے سے آنسو بہہ نکلے۔ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ رام چند ٹھٹھک گیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا شاید وہ کسی کام کرنے والے کو مدد کے لئے بلاتا، لیکن پورو کے پیروں میں طاقت آ گئی۔ پورو گم سم چپ چاپ کھیتوں سے باہر چلی گئی۔ بے جان پورو اپنے چھپر میں آکر لیٹ گئی۔ اسی شام سکڑ آلے سے نوکر آ گیا تھا۔ اگلے دن ان سب نے گاؤں واپس چلے جانا تھا۔ اس رات پورو نے آنکھ بھی نہ جھپکی۔ ''میں اس کے سامنے ایک بول بھی نہ بول سکی۔'' پوچھتا تھا تو کون ہے بی بی؟ میں اس کو کیا بتاتی میں کون ہوں؟''

میری کہانی کو الفاظ کی زبان کون دے سکتا ہے۔ کبھی سوتے جاگتے، بیٹھتے اس کو میرا روتا چہرہ یاد آئے گا۔ وہ سوچے گا میں کون تھی، پھر شاید اس کو کوئی بھولی ہوئی کہانی یاد آ جائے گی۔ اس کی مری ہوئی پورو اس کو یاد آ جائے گی۔ پھر شاید اس کی آنکھوں سے بھی آنسو گرے گا۔ پھر پورو سوچتی کاش میں اس شہزادی طرح انار کا بوٹا بن سکتی۔ اس کے کھیتوں میں اُگ آتی، وہ میرے اناروں کو توڑتا، پھر میں انار میں سے بولتی، پتہ نہیں کون سے زمانے کی کہانیاں ہیں۔ آج کل کوئی بوٹا نہیں بنتا۔ رات کا پچھلا پہر تھا ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ پورو کو جیسے کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی سے اٹھا دیا۔ وہ باہر کھیتوں کی طرف چلی گئی۔ رات کے اندھیرے میں اس نے وہ کیکر پہچانا جہاں کل دوپہر کے وقت رام چند اس کے سامنے کھڑا رہا تھا۔

پورو نے جھک کر اسی جگہ سے پیروں کی مٹی اٹھائی، دونوں آنکھیں میچیں اور مٹی سے بھری مٹھی اپنی آنکھوں پر لگا لی۔ آنکھوں پر لگے ہوئے پورو کے دونوں ہاتھ کسی نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ پورو نے گھبرا

کر دیکھا، رام چند اس کے سامنے کھڑا تھا'' کیا تم پورو ہو؟'' رام چند پوچھ رہا تھا۔ ساری رات ایک ہی نام میرے کانوں میں بجتا رہا۔ '' سچ بتا تیرا نام پورو ہے؟'' رام چند نے پھر کہا۔ پورو کا دل کہتا تھا کہ رام چند کے پیروں میں گر جائے۔ وہ جی بھر کر روئے کہ وہ پورو ہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر بتائے کہ وہ پورو ہے۔ وہ اسی کی پورو تھی جسے اس نے گھوڑی پر بٹھا کر لینے آنا تھا۔ وہ وہی پورو تھی جس کے ساتھ اس نے چار پھیرے لینے تھے وہ وہی پورو تھی جس نے اس کے گھر پالکی میں بیٹھ کر آنا تھا۔ وہ پورو تھی پورو........

پورو کی زبان کو آج بھی کسی نے کھینچ لیا۔ پورو ایک بول بھی نہ بول سکی۔ رام چند کے ہاتھوں سے پورو نے اپنے دونوں ہاتھ واپس لے لیے اور پہلے جیسی گم سم پیچھے کو مڑ گئی۔ '' اگر تم پورو ہو تو مجھے ایک بار بتا جاؤ'' رام چند نے پورو کے پیچھے دو تیز قدم چلنے کے بعد کہا۔ '' میں پوری رات کھیتوں میں رہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ تو پھر آئے گی، میرا دل گواہی دیتا ہے تو پورو ہے۔''

'' پورو عرصہ ہو گیا مر گئی ہے'' پتا نہیں کیسے پورو کے منہ سے نکلا۔ پورو نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ پورو آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ اماں نے باؤلی والے سائیں کو حیثیت کے مطابق چڑھاوا چڑھایا۔ اماں اور اس کے باقی ساتھیوں سے لدا ہوا ایکہ صبح کی دھوپ چڑھنے سے پہلے ہی سکڑ آلی کے راستے چل پڑا۔

ایک آگ

ایک ایک کر کے کئی دن گزر گئے۔ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں کی طرح بیت گئے۔ پورو دودھ سے بھری ہوئی کاڑھنی چولھے پر کڑھنے کے لئے اپلے جوڑتی اور سارا دن پاتھیوں کی ہلکی ہلکی آگ دہکتی رہتی۔ پورو کو محسوس ہوتا اسکی چھاتی کے اندر کہیں کوئی چنگاری رکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کئی دنوں سے اس کے اندر کچھ دہکتا رہتا۔ کبھی وہ سوچتی کہ آج کل اس کا کھایا ہوا معدے میں ہی پڑا رہتا۔ اس کے گلے میں کچھ اٹکا رہتا۔ اس نے دیسی جو، بھی باسی پانی سے لیے۔ کبھی وہ سوچتی اسے گرمی ہو گئی ہے۔ اس نے تین چار دن کچی لسی کے پیالے پیے۔ کبھی وہ سوچتی اس کی ماں خیریت سے ہو۔ کبھی، پتہ نہیں اس کے اندر ایسے ہول کیوں اٹھتے تھے۔

انہیں دنوں کی بات ہے جب ایک دن رشید اگھر آیا تو اس کا چہرہ اس طرح اترا ہوا تھا جیسے کسی

طویل بیماری کے بعد اس کی ہڈیاں نکل آئی ہوں۔ رشیدے نے بتایا تو کچھ نہیں، ویسے وہ پورو سے بات چیت کرتا رہا۔

جاوید سے سکول کی باتیں بھی کرتا رہا۔ چھوٹے کے ساتھ کھیلتا بھی رہا۔ روٹی کھاتے ہوئے رشیدے کے چہرے کی طرف دیکھ کر پورو کو ایسا ہی لگا جیسے نوالہ رشیدے کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ رشیدے نے گھونٹ گھونٹ پانی کے ساتھ چند نوالے نگل لیے۔ رشیدے کا اترا ہوا من پورو سے چھپا ہوا نہ تھا۔

قریب قریب بچھائی ہوئی چارپائیوں پر لیٹ کر پورو نے رشیدے کے من کی بات جاننی چاہی۔ ''آج ہمارے گاؤں سے ایک آدمی آیا تھا، ہمارے اپنے کھیتوں سے۔'' رشیدے نے لحہ بھر چپ رہنے کے بعد کہا۔

''چھتو آلی سے........؟''

''ہاں........''

''پھر........؟''

''اس نے بتایا ہے کہ ہماری کٹی ہوئی فصلیں ایک جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ منوں دانے ڈھیروں کی صورت پڑے ہوئے تھے.......''

''پھر........؟''

''کسی نے رات کو آگ لگا دی ہے........''

''کیا.......؟''

''ساری فصل سے ایک دانہ بھی نہیں بچا۔''

''کسی نے جان بوجھ کر لگائی ہے......؟''

''شک تو یہی ہے.......''

''ایسا کون تھا......؟''

''کہہ رہا تھا آگ کے شعلوں سے آسمان سرخ ہو رہا تھا۔''

''پھر اب، ہمارا حصہ جو تھا سو تھا وہ بے چارے کیا کریں گے۔''

ان بے چاروں سے پورو کی مراد رشیدے کے بڑے، بھائی، چچاؤں اور تایاؤں سے تھی جن کا مشترکہ فصل میں حصہ تھا۔

رشیدا چپ کر گیا۔ پورو بھی جیسے سوچ میں پڑ گئی۔ بچے سو رہے تھے لیکن رشیدے اور پورو کی آنکھیں نیند سے خالی تھیں۔

''لیکن دوسرے کا گھر پھونک کر کسی نے کیا لینا تھا؟'' پورو نے کتنی مرتبہ رہ رہ کر کہا۔ رشیدا بالکل چپ رہا۔ پورو دیکھتی رہی، رشیدا کبھی دائیں اور کبھی بائیں کروٹ لیتا۔ کئی بار آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ رشیدے نے کئی بار اٹھ اٹھ کر پانی پیا۔

''بچے کو دوسری چارپائی پر ڈال دے آج مجھے اس کے ساتھ نیند نہیں آئے گی۔'' رشیدے نے ایک بار کہا۔

جاوید ہمیشہ باپ کے ساتھ سوتا تھا۔ چھوٹے کو پورو اپنے ساتھ سلا لیتی تھی۔ اس سے پہلے رشیدے نے اس طرح کبھی نہیں کہا۔ آج پورو حیران تھی لیکن پورو نے چپ چاپ جاوید کو اٹھا کر علیحدہ چارپائی پر سلا دیا۔

پھر کافی وقت گزر گیا۔ رشیدے کی پسلیاں کروٹیں بدل بدل کر چور ہو گئیں لیکن نیند رشیدے کے نزدیک نہ پھٹکی۔

''اڑتی اڑتی خبر سنی ہے۔ یہ خبر نہیں معلوم سچی ہے کہ جھوٹی۔'' لیٹے لیٹے رشیدے نے کہا۔

''کیا......؟'' پورو نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

رشیدا پھر چپ کر گیا وہ اس نتیجہ پر پہنچنا چاہ رہا تھا کہ پورو کو یہ بات بتانی چاہیے کہ نہیں۔ رشیدے کی چپ طویل ہو گئی۔ پورو اپنی چارپائی سے اٹھ کر رشیدے کی چارپائی پر آ بیٹھی۔

''سنا ہے آج گاؤں میں ایک اجنبی لڑکا آیا تھا وہ زیادہ کسی سے ملا جلا نہیں۔ گاؤں کے ایک دو لوگوں کو شک ہے کہ وہ...... تیرا بھائی تھا۔''

''میرا بھائی...... '' پورو نے اچانک کہا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا مجھے تو گاؤں گئے ہوئے دیر ہو گئی ہے یہ باتیں اس آدمی کی زبانی ہیں۔'' رشیدا کہہ کر پھر چپ ہو گیا۔

پورو کا سر چکرانے لگا۔

''میرا بھائی؟ میرا بھائی اب جوان ہو گیا ہو گا، دس گیارہ سال ہو گئے ہیں مجھے اس کی شکل دیکھے ہوئے، پتہ نہیں اس کی شکل اب کیسی ہے اچانک دیکھ لوں تو پہچان بھی نہ پاؤں، اس کی مسیں بھیگ چکی ہوں گی، نو سال کا تو جاوید بھی ہونے کو ہے۔'' پورو کے من میں کئی خیال گھومنے لگے۔

رشیدے نے اسے صرف اتنا ہی بتایا کہ پورو کے پرانے گھر کے بارے میں اس نے گاؤں کے کسی آدمی سے پوچھا تھا کہ یہ گھر کس کا تھا لیکن اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا لوگوں کو صرف شک تھا کانوں سے کسی نے کچھ نہیں سنا تھا۔

''سچ میں وہ گاؤں آیا ہو گا'' اسے میں یاد آئی ہوں گی۔ اس کی بہن، اس کی اپنی بہن، اس کے اپنے ماں باپ کی جنی ہوئی......''

پورو کے من میں کئی خیال آنے لگے۔ پورو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پورو کو پل بھر کے لئے لگی ہوئی آگ کا دکھ بھول گیا، جلی ہوئی گندم کی راکھ سے اپنے بہن بھائیوں کی گرمی کا احساس ہو رہا تھا، پیار کی ایک روشن چنگاری اس کے من میں چمک اٹھی۔

''شاید اسی نے آگ لگائی ہو، کیا پتہ اس نے اپنے اندر کا غبار نکالنے کے لئے یہ بدلہ لیا ہو۔ اس کی جوان ہڈیوں میں خون نے جوش مارا ہو گا۔ اسے بہن کے دکھ نے ستایا ہو گا۔ میں ایک بار اگر اس کا چہرہ دیکھ لوں، نہ جانے میرے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔'' پورو کو کئی طرح کے خیالات اور امیدوں نے گھیر لیا۔

پھر پورو کئی طرح کے تفکرات میں گھر گئی۔ تھوڑی دیر پہلے پورو کی ہمدریاں ان کے ساتھ تھیں جن کا منوں اناج جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اس وقت پورو کی ہمدردی اس کے ساتھ ہو گئی تھی جس نے شاید اس اناج کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ کہیں آگ لگانے والا وہی نہ ہو...... ہو سکتا ہے کسی اور نے لگائی ہو اور شک کی بناء وہ پکڑا جائے...... پورو کی سوچیں فکر مندی میں بدل گئیں۔ کچھ بھی ہو وہ بھائی کا سر سلامت چاہتی تھی۔ وہ سوچتی تھی شاید اس کے بھائی کے من میں کوئی دکھ اور پیار کی آگ جلتی تھی، اسی آگ میں سے ایک چنگاری کھیتوں میں پھینک دی۔ وہ سوچتی اس کے بھائی کو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ رشیدا چھتو آنی میں نہیں رہتا۔

پھر نڈھال ہو کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ کنویں کی ٹنڈوں کی طرح اس کے من میں قسم قسم کے خیالات آتے رہے، پورو کی جب آنکھ کھلی، اس کے سامنے آگ ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ گھاس کے تنکوں سے لے کر

کھیتوں کی اونچائی تک سب کچھ جل رہا تھا۔ پھر اس نے سپنے میں دیکھا کہ ایک خوبصورت جوان لڑکا آگ کے شعلوں کے پاس بیٹھ کر اپنے ہاتھ تاپ رہا تھا.......

ڈر سے اس کی آنکھ کھل گئی، اس کے جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا، اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ جب ملٹری والوں نے آگ بجھائی اور کمروں سے لوگ نکالے، ہانکتے اور دھکیلتے ہوئے لوگوں کو گاڑیوں میں بیٹھا لیا۔ انہوں نے تین آدھے جلے ہوئے آدمیوں کو نکال دیا جن کے جسم سے چربی پگھل رہی تھی۔ جن کا ماس جلنے کی وجہ سے ہڈیوں سے علیحدہ لٹک رہا تھا۔ جن کی کہنیوں اور گھٹنوں سے ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ لوگوں کے گاڑیوں میں بیٹھتے ہی وہ تینوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کی لاشیں وہیں زمین پر پھینک کر گاڑیاں چل پڑیں۔ ان کے گھر والے چیختے رہ گئے لیکن ملٹری والوں کے پاس ان کے کریا کرم کا وقت نہیں تھا۔

پورو کا گاؤں خالی ہو گیا تھا۔ دوسری قوم کا کوئی آدمی بھی باقی نہیں بچا تھا۔ صرف تین جلی ہوئی لاشیں حویلی کے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔ جن کے پنجروں پر بچے کھچے گوشت کو گاؤں کے کوؤں اور کتوں نے اڑا لیا تھا۔ اب بھی پنجر آدھی جلی ہوئی حویلی کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔

پورو کی آنکھوں میں جیسے کسی نے شیشے کی کرچیاں ڈال دی ہوں۔ ایک دن پورو نے دیکھا دس بارہ منچلے لڑکے ایک ننگی جوان لڑکی کو آگے دھکیلتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھول ڈھمکے بجاتے ہوئے اس کے گاؤں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ نہیں معلوم کس گاؤں سے آئے تھے اور کس گاؤں جا رہے تھے۔

پورو کو ایسے ہی لگتا جیسے اس دنیا میں جینا ہی حرام ہے، اس دنیا میں بیٹی کا پیدا ہونا ہی حرام ہے۔ اس شام پورو کو گنے کے کھیت میں چھپی ہوئی ایک جوان لڑکی ملی، جسے رات کے گھنے اندھیرے میں وہ گھر لے آئی۔ اس لڑکی نے پورو کو بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں ایک کیمپ تھا جہاں گاؤں کے ہندو اکٹھے ہو کر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ ملٹری والے انہیں یہاں سے نکال کر دوسری طرف ہندوستان لے جائیں۔ اس طرف کی فوج کیمپ کی حفاظت کرتی تھی، لیکن ہر روز رات کو کچھ مسلمان آکر چوری چھپے کیمپ کی جوان لڑکیوں کو چن کر لے جاتے تھے اور دوسری صبح واپس چھوڑ جاتے تھے۔

اس لڑکی نے پورو کو بتایا کہ ''پوری دس راتیں ہو گئی تھیں، اسے ہر روز رات کو طرح طرح کے لوگوں کے گھر جانا پڑتا تھا۔ آج سے پچھلی رات کسی نہ کسی طرح وہ لے جانے والے کو دھوکہ دے کر دوڑ آئی تھی۔ دوڑتی دوڑتی اس گاؤں میں آ پہنچی تھی ۔ جب سویر کی پو پھوٹی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں

جائے ...." وہ سارادن چپ چاپ گنے کے کھیت میں بھوکی پڑی رہی۔ پورو سن کر حواس باختہ ہوگئی۔ اسے سننا مشکل ہوگیا، اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ پورو نے لڑکی کو پچھلے کمرے میں چھپالیا۔ اس کمرے میں ان کی گندم پڑی ہوئی تھی۔ بھینس کا چارا پڑا ہوا تھا۔ دوسرے دن دو آدمی پھرتے پھراتے ہوئے آئے، سارے گاؤں سے پوچھ پچھ کی کہ کسی نے لڑکی کو دیکھا ہے؟ وہ گاؤں کے دالانوں میں تاک جھانک کر کے چلے گئے لیکن لڑکی کے بارے میں کسی نے کچھ نہ بتایا۔

پورو کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب بھی اس دھرتی سے گندم کے پہلے جیسے سنہری خوشے پیدا ہوں گے، جس دھرتی کے ہونٹوں پر انسانوں کا خون جم گیا تھا۔ کیا اس دھرتی کے مکئی کے بھٹوں سے پہلے جیسی خوشبو آئے گی جس کے کھیتوں میں مردے گل سڑ رہے تھے۔ کیا یہ عورتیں دوبارہ ان مردوں کے لیے بیٹے جنیں گی جنہوں نے ان عورتوں کی، اپنی بیویوں، بہنوں کی عزت اس طرح نیلام کی تھی۔

پورو کے گاؤں کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک قافلہ آیا۔ لوگ جوق در جوق پیدل چل رہے تھے۔ لوگوں نے ایک ایک گڈے کو بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ تھوڑے سے سپاہی لوگوں کے آگے آگے تھے، کچھ لوگوں کے پیچھے پیچھے تھے۔ لوگوں کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ راستوں کی گرد اُڑ کر بری قسمت کی طرح ان کے سروں میں پڑی ہوئی تھی۔ قافلے کو رات پورو کے گاؤں میں پہنچنے کے بعد پڑی۔ پورو کے ہوش ٹھکانے نہیں آ رہے تھے۔ پورو کو رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ سڑک رتووال کی طرف سے آتی ہے، قافلے میں اس کا رام چند ضرور ہوگا۔ ایک آخری ملاقات ...... بس ایک بار ...... آخری بار ...... اس کے بعد کبھی اسے اس کے گاؤں کی خبر نہیں ملے گی ......

قافلے والے بچے کھچے گہنوں اور روپوں کے بدلے راستے میں آنے والے دیہاتوں سے اناج خرید لیتے تھے۔ دیہاتوں سے کچھ مرد اور عورتیں جا کر ان سے سودا طے کر لیتے۔ اسی بہانے پورو نے قافلے پر نظر دوڑائی ....

پورو نے قافلے میں بیٹھے ہوئے رام چند کو دیکھا۔ رام چند نے رتووال کے کھیتوں میں کھڑی ،آنسوؤں میں تر چہرے والی پورو کو پہچان لیا۔

رتووال کے کھیتوں میں پورو کا منہ سخت صدمے کی وجہ سے بند تھا اور آج پورو کا منہ پاس کھڑے پہریداروں نے بند کیا ہوا تھا، پورو کچھ نہ کہہ سکی۔

''آپ کو اناج دانے کی ضرورت ہوگی۔'' پھر پورو نے رام چند کی طرف منہ کر کے کہا۔

''ہاں'' رام چند کی نگاہ پورو کے چہرے سے پرے نہ ہٹتی تھی، شاید وہ ابھی پہچان رہا تھا۔

''ٹھیک .... ! قیمت تیار رکھنا میں رات کو پہنچ جاؤں گی۔'' پاس کھڑے سپاہی کی طرف دیکھ کر پورو نے رام چند کی طرف دیکھا اور واپس آ گئی۔

پورو نے رشیدے کو کہا کہ گھر میں چھپی ہوئی لڑکی کو قافلے میں شامل کرنا ہے، پھر پورو نے آٹے اور مٹی کے برتن میں پڑے ہوئے دیسی گھی کی پوٹلی باندھی اور لڑکی کو ساتھ لے کر رات کے اندھیرے میں سوئے ہوئے قافلے میں چلی گئی۔

سارا دن پیدل چلنے کے بعد لوگ تھکن سے چور تھے۔ بلاشبہ ہر وقت خطرہ ان کے سروں پر چمگادڑوں کی طرح منڈلا رہا تھا، پھر بھی لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے .... ''میں رات کو پہنچ جاؤں گی۔'' رام چند کے کانوں میں پورو کی آواز شام سے گونج رہی تھی۔ رام چند رات کے اندھیرے میں کسی کے قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

پہرے دار گھوم پھر کر پہرا دے رہے تھے جب پورو پنجوں کے بل چلتی ہوئی قافلے میں گھس گئی۔

رام چند کے سامنے سر پر رکھی ہوئی پوٹلی نیچے رکھی اور لڑکی کو بٹھا دیا۔

''تم پورو ہی ہو ناں؟'' رام چند نے آج بھی رتووال کے کھیتوں والا سوال کیا۔

''اب بھی کچھ پوچھنا باقی ہے؟'' آج پورو نے ایک پیار بھرے غصے میں کہا۔

یہ پورو کی پوری زندگی میں اس سے پہلا اور آخری شکوہ تھا۔ رام چند نے سر جھکا لیا۔

''میرے والدین کی کوئی خبر .... ؟'' پورو نے ایک آہ بھر کر پوچھا۔

''وہ جب سے شادی کر کے گئے ہیں واپس نہیں لوٹے لیکن .... رام چند کہتے کہتے رک گیا۔

''شادی .... کس کی شادی .... ؟'' پورو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''تمہارے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک رات چپ چاپ تمہاری چھوٹی بہن کے ساتھ میرے پھیرے کرائے اور تمہارے بھائی کے ساتھ میری بہن کے، اس کے بعد سے وہ گاؤں واپس نہیں لوٹے۔ آج کل بھی وہ سیام میں رہتے ہیں لیکن ...... '' رام چند پھر کہتے کہتے رک گیا۔

''میری بہن .... پھر تو وہ بھی قافلے میں ہی ہوگی۔'' پورو کے لیے رام چند سے اپنی بہن کی

شادی کی خبر بالکل نئی تھی۔

''نہیں پچھلے دنوں تمہارا بھائی آیا تھا، وہ اپنی بیوی کو میکے چھوڑ گیا اور بہن کو گھر لے گیا تھا، وہ یہاں آیا تو وہ بھی ....'' رام چند کی آنکھوں سے چھم چھم کر کے آنسو بہنے لگے۔

''وہ بھی .... کیا ہوا ہے اسے ....؟'' پورو کی سمجھ میں نہ آیا۔

''معلوم نہیں کس وقت میری بہن اٹھائی گئی، گھر سے نکلتے وقت ہمارے ساتھ تھی۔ میں بوڑھی ماں کو پشت پر اٹھا کر قافلے میں شامل ہوا تو وہ میرے پیچھے آ رہی تھی لیکن قافلے میں نہیں ہے........'' رام چند نے تیز چلتے ہوئے سانسوں کو روک روک کر بتایا۔ رام چند کی گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں لیکن اس نے اپنی پگڑی کا پلو منہ میں دبا لیا۔

''میری ماں خود کو پیٹ پیٹ کر نیلی ہوگئی ہے۔'' رام چند نے بتایا۔

پورو کا جسم درد سے چورا ہو گیا۔

''کھوج لگانا، ہوسکتا ہے کہیں سے کوئی پتہ لگ جائے، کیا معلوم مرگئی ہے یا زندہ ہے۔'' رام چند نے آخری کوشش کی، اپنے اندر سے اٹھتے درد کی وجہ سے پورو سے بولا نہ گیا۔

''شاید اس کا نام لاجو ہے۔'' پورو کو پرانی یاد آئی، اپنی منگنی کے وقت اس نے اپنے بھائی کی منگیتر کا نام سنا تھا۔

''ہاں........ اس کی بازو پر بھی اس کا نام کھدا ہوا ہے۔''

رام چند بتا رہا تھا۔ سپاہی ویسے ہی پہرا دے رہے تھے۔ سوئے ہوئے لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے رام چند اور پورو آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

''اس لڑکی کو حوالے کرنا تھا اسے اپنے قافلے میں لے جاؤ۔ ہندوستان جا کر کھوجنا، اگر اس بیچاری کے والدین مل گئے تو........'' پورو نے لڑکی کا ہاتھ رام چند کے ہاتھ میں دے دیا۔

''میرا بھائی ادھر آیا تھا، اگر میں ایک بار اس کو دیکھ سکتی۔''

پورو نے بڑی امید سے کہا۔

''پچھلے دنوں جب تمہارے چھتو آنی والے کھیتوں میں آگ لگی تھی، یاد ہے؟'' رام چند کہہ رہا تھا۔

''آگ........؟ ہاں آگ لگی تھی۔ کیا یہ بات سچ تھی کہ میرے بھائی نے وہ آگ لگائی

تھی........؟''

پورو کو وہ دن یاد آ گیا جب رشیدے نے ایک افواہ سنائی تھی۔

''ہاں اس نے لگائی تھی۔ تمہارے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں رہتی ہو، اس نے غصے میں آ کر رشیدے کے کھیتوں کو پھونک ڈالا......''

پورو کو رشک سا آیا، اس کا بھائی جوان ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں بہن کا بدلہ جاگ رہا تھا، اس کے دل میں بہن کی یاد بسی تھی۔ ساتھ ہی پورو کو تازہ واردات یاد آئی، اس کے بھائی کی بیوی گم ہو گئی تھی، کسی نے زبردستی اٹھالی تھی۔ معلوم نہیں کس حال میں تھی وہ.........اس کے رام چند کی بہن.........

''مجھے سکڑ آلی ایک خط لکھنا، اپنا پتہ بھی لکھنا۔ اگر لاجو کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو میں لکھ بھیجوں گی.......''پورو نے کہا۔

رات کا اندھیرا اچھٹ رہا تھا۔ سپاہی قافلے والوں کو جگانے لگے۔ قافلے نے راہ لینی تھی۔ پورو اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

پورو نے دونوں ہاتھ رام چند کے آگے جوڑ دیے۔ پورو سے کچھ بولا نہ گیا۔ کھڑی پورو نے قافلے سے باہر پاؤں نکالا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اس کے آگے لاٹھی تان لی۔

''تم کون ہو، کدھر جا رہی ہو.........؟''

''میں اناج بیچنے آئی تھی.........''

''کتنا اناج بیچا ہے؟ پیسے دکھاؤ.........''سپاہی نے تیز آواز میں پوچھا۔

پورو نے ہاتھ چادر میں کرتے ہوئے اپنی چاندی کی انگوٹھی اتار لی اور سپاہی کو دکھا کر تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دی۔

معلوم نہیں یہ بات سپاہی نے سوچی یا نہیں کہ ہندو لوگ کم ہی چاندی کے گہنے پہنتے ہیں، اس نے اناج کے بدلے چاندی کی انگوٹھی کس سے لی؟

پورو کی بھابی

رات کو چارپائی پر لیٹے پورو چھت کے کالے شہتیروں کو دیکھتی رہتی۔ اس کا من ان لوگوں کے بند کمروں میں گھومتا رہا جن کے اندر لوگوں نے لوگوں کی بیٹیاں، لوگوں کی بہنیں، لوگوں کی بیویاں زبردستی رکھی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک لاجو ہوگی۔ لاجو رام چند کی بہن اور اس کی بھابی، لاجو کا اجنبی چہرہ پورو کی آنکھوں کے آگے آ جاتا۔ ٹوٹے ہوئے پتے جیسا لاجو کا چہرہ، جھڑے ہوئے کھیت جیسا لاجو کا چہرہ۔ پورو سوچتی لاجو شادی شدہ تھی ہو سکتا ہے اس کا کوئی بچہ بھی ہو۔ اس کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ ہوا ہوگا۔ اس کے جسم پر کیا کیا گزری ہوگی۔ پتہ نہیں وہ بدقسمت کہاں ہوگی۔ وہ اس کو کیسے ڈھونڈے؟ کیسے پہچانے؟ پورو سوچتی اس دن گنے کے کھیت والی لڑکی لاجو ہی نکل آتی، وہ اس کو قافلے کے ساتھ ملا آتی۔ وہ اس کو رام چند کے حوالے کر آتی۔ پورو نے ساری کی ساری بات رشیدے کو بتائی اور رشیدے کے پاؤں پڑی۔

''جس طرح بھی ہو مجھ پر کرم کر میں نے ساری عمر تم سے کچھ نہیں مانگا جس طرح بھی ممکن ہے لاجو کا پتہ لگا دے۔''

پورو کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری تھے۔ رشیدے نے اس سے اقرار کیا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ رشیدے کو یہ یقین تھا کہ ہو نہ ہو لاجو رتووال میں ہی ہے۔ گھر سے وہ بھائی کے ساتھ نکلی، لیکن قافلے میں نہیں پہنچی۔ اکٹھے ہو رہے لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی اور وہ کسی کے ہتھے لگ گئی تھی۔ رشیدے نے دو چکر رتووال کے لگائے لیکن وہ لوگوں کے صحن کیسے چھانتا۔ وہ گاؤں کی کئی دکانوں سے سودا سلف خریدتا، لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ اتنا ضرور سنا کہ گاؤں کے کچھ لوگوں نے جاتے ہوئے قافلے سے دو چار لڑکیاں اڑا لی تھیں۔ رشیدے کو پکا یقین تھا کہ لاجو انہی میں سے کسی کے گھر میں کسی کے پاس تھی۔ اس گاؤں کے لوگ رشیدے کو نہیں جانتے تھے۔ رشیدے کا کوئی دوست، رشتے دار اس گاؤں میں نہیں تھا۔ وہ چار دن کس کے ہاں رہتا۔ کس سے وہ گاؤں والوں کے بارے میں معلوم کرتا۔ رشیدے کے ساتھ پورو نے ایک تدبیر سوچی۔ باؤلی والے سائیں کو وہ جانتے تھے۔ دونوں نے بچوں کو ساتھ لیا اور سائیں کی ایک چھپری میں جا ٹکے۔ ویسے بھی پریشانی سے پورو کی دن رات جاگ جاگ کر آنکھیں زبردستی بند ہو رہی تھیں۔ روز صبح پورو نماز پڑھ کر باؤلی کے پانی سے آنکھیں دھوتی۔ سائیں کو شیرینی چڑھاتی اور دن کو نئے کھیسوں کی گانٹھ باندھ کر

گاؤں میں بیچنے چلی جاتی۔ گاؤں کے مرد حضرات کھیتوں میں ہوتے تھے۔ گاؤں کی عورتیں گھروں میں اکیلی اپنے کام کاج میں مصروف ہوتیں۔ پورو تمام گھروں میں جا جا پوچھتی۔ وہ کھیسوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت بتاتی، اس کا بھاؤ کم ہی کسی سے بنتا۔ ویسے بھی گاؤں میں لوگوں کے پاس اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دریاں کھیس ہی کافی ہوتے ہیں۔ پھر انہیں لوٹ مار سے بھی کافی کچھ مل گیا تھا۔ کسی کو خریدنے کی چاہ نہیں تھی۔ لیکن پورو ڈھٹائی سے ان کے صحن میں جا بیٹھتی۔ اندر باہر جھانکتی ہوئی عورتوں کو باتوں میں لگا لیتی۔ گاؤں کی لوٹ مار کی باتیں چھیڑ لیتی۔ کیا کیا کس کے حصے میں آیا تھا ہنس ہنس کے ان سے پوچھتی، پھر ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانوں کی بات چھیڑ لیتی۔ پورو کو رام چند کے مکان کی پہچان نہیں تھی۔ رشیدے اور پورو کو یقین تھا کہ ہو نہ ہو لاجو کو جو لے گیا ہے، ہو سکتا ہے اس نے لاجو کے گھر کو بھی سنبھال لیا ہو۔ پورو نے اس گھر میں ایک آدھ بار چکر بھی لگایا، لیکن ایک بوڑھی عورت باہر والی ڈیوڑھی سے ہی اس کو واپس بھیج دیتی تھی کہ انہوں نے کچھ نہیں لینا۔ ایک دن پورو جیسے زبردستی کسی کے گھر داخل ہوتے ہیں، صحن تک چلی گئی۔ ''اماں! کچھ نہ لینا لیکن دیکھ تو لو، میں تم سے دیکھنے کی قیمت تو نہیں مانگتی۔'' پورو نے کھیسوں کی گانٹھ زمین پر رکھ کر کھیس پھیلا دیے۔ صحن میں اس بڑھیا کے بغیر کوئی بھی نہیں تھا۔ ''اللہ بھلا کرے مجھے پانی کا گھونٹ تو پلا، صبح سے پیاسی ہوں۔'' پورو نے بڑھیا کی منت کرتے ہوئے کہا۔

''پانی چھوڑ کر تو لسی کا کٹورا پی لے لیکن اگر تو نے کھیس چادریں بیچنی ہیں تو کسی شہر میں جا۔ وہاں لوگ نہ ہی کاتتے ہیں اور نہ ہی بنتے ہیں۔ دیہاتوں میں کس کے پاس کھیسوں کی کمی ہے۔''

بڑھیا نے پورو کو صلاح دی اور اندر کی طرف منہ کر کے آواز دی ''نیک بخت! لسی کا ایک کٹورا تو لاؤ۔''

پورو کا دل دھڑکنے لگا، اندر سے آنے والی مٹیار کا منہ سچ مچ ٹوٹے ہوئے پتے جیسا تھا۔ کھنچے ہوئے پروں جیسا تھا۔ پورو کا ماتھا ٹھنکا، ہو نہ ہو یہ تو لاجو ہے۔ جب تک پورو کو کہیں پر لاجو کا شک نہیں ہوا تھا، تب تک پورو کو ایک لگن تھی۔ کہیں لاجو نظر آئے۔ اب پورو کو لاجو کا شک پڑ گیا تھا۔ لیکن اس کو سمجھ نہ آئی کہ وہ اپنے شک کی پرکھ کیسے کرے۔ ''لڑکی ٹھیک تو ہے؟'' پورو نے بڑی ہمدردی سے کہا اور لڑکی کے ہاتھوں سے لسی کا کٹورا پکڑا۔

''ٹھیک ہی ہے، بس ایسے ہی ذرا؟'' بڑھیا نے بات آئی گئی کر دی۔

''نمک کی ڈلی ہے تھوڑا سا ملا لوں۔'' پورو نے لسی کا ایک گھونٹ بھر کے کٹورا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ لڑکی نے چپ چاپ نمک کی ڈلی لا کر پورو کے آگے کر دی۔ پورو نے اس کے ہاتھوں سے ڈلی پکڑتے ہوئے اس کی ایک انگلی کو دبایا۔ لڑکی نے ذرا گھبرا کر پورو کی طرف دیکھا۔ لیکن نہ تو اس کے ہونٹوں پر کوئی ہنسی آئی نہ ہی اس کے منہ سے کوئی حرف نکلا۔ لڑکی گنے کے چھلکے کی طرح تھی۔ پورو کو اور بھی یقین ہو گیا یہ لڑکی لاجو بیشک نہ ہو لیکن تھی کوئی زبردستی بسائی گئی لڑکی۔ پورو کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہی گھر رام چند کا گھر تھا۔ پورو کو پکا یقین ہو گیا تھا یہ لڑکی لاجو ہی تھی۔ لسی ایک ہی سانس میں چڑھا کر کٹورا زمین پر رکھتے ہوئے لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔ ''آؤ میں تمہاری نبض دیکھوں، رنگ تو تمہارا ہلدی کی طرح ہو گیا ہے'' کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے پورو نے اس کی بائیں بازو سے قمیض پرے سرکا دی۔ لڑکی کی بازو پر ہندی میں نام کھدا ہوا تھا ''لاجو'' لڑکی پھر بھی کچھ نہ بولی۔ پوہ ماگھ کے کیڑے کی طرح خاموشی اس کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی۔

''کوئی تعویذ دے دے لڑکی گھر میں رچ بس جائے لڑکے سے بھی کچھ نہیں بولتی۔'' بڑھیا نے اترے ہوئے منہ سے کہا۔

پورو سے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، پھر بھی پورو نے تیزی سے جواب دیا ''میرے پاس ایسا تعویذ ہے یہ دنوں میں ہی مکئی کے دانے کی طرح کھل اٹھے گی۔''

''جو تم کہو گی میں دوں گی، مجھے وہ تعویذ لا دو۔'' بڑھیا نے پورو کا آنچل پکڑ لیا۔

''لو! اللہ نے خیریت رکھی تو میں کل ہی لے آؤں گی'' کہتے کہتے پورو نے کھیسوں کی گانٹھ باندھ لی۔ لڑکی ایک گونگے بہرے بت کی طرح اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کھیسوں کی گانٹھ تلے آج پورو کی کمر ٹوٹ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی باؤلی والی چھپری تک پہنچی۔ ''اب آگے تو جا اور تیرا کام'' پورو نے رشیدے کو پوری بات سنانے کے بعد کہا۔

''کوئی ایسی تدبیر تو سوجھے'' رشیدا سوچنے لگا۔

''جس طرح مجھے گھوڑی پر بٹھا لیا تھا اب بھی ہمت کرو۔'' پورو نے رشیدے کو ایک چوٹ لگائی اور ہنس پڑی۔ پھر پورو اور رشیدا کتنی ہی تدبیریں سوچتے رہے لیکن کوئی جچتی نہیں تھی۔ رشیدا کہتا ''یہاں سے تو بھگا لے جانا مشکل نہیں، میں اسے آگے کیسے پہنچاؤں گا؟'' پورو کو اس سے پہلے کبھی خیال نہیں آیا تھا، لیکن آج اسے ایک اور سوچ آئی۔

''میرے ماں باپ نے پھر مجھے قبول نہیں کیا، اپنی بیٹی کو، اب اپنی بہو کو قبول کریں گے۔''

''اگر انہوں نے واپس لینے سے ہی انکار کر دیا تو؟'' رشیدے نے پورو کو بتایا کہ ان کی سرکار کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ زبردستی اٹھائی گئی لڑکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر واپس کر دیں کیونکہ ان کے بدلے میں دوسری طرف سے ڈھونڈی گئی لڑکیاں ملنی تھیں۔ ''ساری لڑکیوں کے والدین ان کو واپس لے لیں گے؟'' پورو کے من کو دھچکا لگا۔ اس کے لئے دنیا کے سارے دھرم اس کے راستے میں کانٹے بن کر بچھ گئے تھے۔ اس کے ماں باپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس کے سسرال والے اس کو قبول نہیں کرتے تھے۔ آج سب مذاہب پر سے بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ آج........

پورو نے اپنے خیالوں کا سلسلہ منقطع کیا اور صرف لاجو کے بارے میں سوچنے لگی۔ تارے گن گن کر پورو نے رات کاٹی۔ وہ اگلے دن وقت کا کھوج لگاتی رہی کہ کس وقت لاجو کے گھر والی بڑھیا اپنے بیٹے کو کھیتوں میں روٹی دینے گئی ہوگی؟ اس نے دو نئے کھیس سر کے اوپر رکھے اور دوپٹے کے پلو سے کاغذ میں لپیٹی ہوئی چٹکی راکھ باندھ لی۔

لاجو کے گھر کا بند دروازہ ہاتھوں سے کھولتے وقت پورو نے سارے پیر فقیر یاد کیے۔ پورو کو عرصے سے بھولے ہوئے دیوی دیوتاؤں کے نام یاد آئے۔ اس سے پہلے کسی بھی دن رب اور خدا کا نام لیتے ہوئے پورو کہہ دیتی تھی رب اس کا سوتیلا باپ ہے، خدا کی وہ سوتیلی بیٹی ہے۔ کسی بھی رب کو اس کا درد نہیں لیکن آج پورو کو یقین آ گیا۔ اس نے جھجھکتے ہوئے کسی رب کو یاد کیا کہ کسی طرح اس کا میل اکیلی لاجو کے ساتھ ہو جائے........

دوپہر کے کھانے کا وقت پورو کو سوجھا۔ بڑھیا اپنے بیٹے کو روٹی دینے گئی ہوئی تھی اور لاجو بالکل اکیلی ایک خالی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔

''اماں کہاں ہے........؟'' پورو نے صحن میں پاؤں رکھتے ہی پوچھ لیا۔

''کھیتوں کی طرف گئی ہے........'' لاجو نے کل کی کھیس بیچنے والی کو دیکھ کر کہا۔

کھیسوں والی کے ساتھ جاگی ہوئی لاجو کی دلچسپی لاجو کے چہرے پر عیاں تھی۔ لاجو اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ پورو کو ایک بار اپنی ماں کا چہرہ، اپنی بہن کا چہرہ، اپنا چہرہ بھی لاجو کے چہرے میں نظر آیا۔ پورو لاجو کے گلے سے چمٹ گئی۔

پورو کو خوب رونا آیا، اسے محسوس ہوا اس کے رونے سے دیواریں پھٹ جائیں گی، اس کا رونا کھیتوں کو چیر دے گا، اس کا رونا دیہاتوں سے گزر جائے گا، اس کا رونا شہر پھلانگ جائے گا اس کا رونا........ پورو نے رونے کی آواز گلے سے نہ نکلنے دی۔

''تم لاجو ہو میری بھابھی........ ''پورو نے ساری گھمبیرتا اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔

''تم پورو ہو........؟''لاجو نے اس کے سینے سے الگ ہو کر اس کا چہرہ دیکھا لیکن لاجو نے پہلے کبھی بھی پورو کو نہیں دیکھا تھا جو پہچان جاتی پھر بھی لاجو کو پورو کا چہرہ بالکل پورو کے بھائی جیسا لگا، اپنے خاوند جیسا...... لاجو کی صدمے سے آنکھیں بھر آئیں جیسے وہ اپنے خاوند کے سامنے آنکھیں نہ اٹھا سکتی ہو۔ لاجو پورو کی ٹانگوں پر گر پڑی۔ لاجو کے من پر جو بیت رہی تھی شاید پورو اپنی رگوں میں بھی محسوس کر رہی تھی پورو کے پاس پوچھنے کو کچھ نہ تھا۔ پورو نے بھینچ بھینچ کر لاجو کو کلیجے سے لگایا۔

''کوئی آجائے گا لاجو! میری بات سن۔''پورو کو وقت کی نزاکت کا خیال آیا، لاجو کی ہچکی بندھ گئی، لاجو کو سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

''وہ کب واپس آتی ہے؟''پورو نے پھر پوچھا۔

''میں نہیں جانتی مجھے اپنے ساتھ لے چل........ ''لاجو کھڑی نہیں ہو رہی تھی پورو کی ٹانگوں کو چھوڑتی ہی نہیں تھی۔

''لینے ہی تو آئی ہوں، اور کیا کرنے آئی ہوں میری بات تو سن۔''پورو نے کندھوں سے پکڑ کر لاجو کا چہرہ اوپر کیا۔

''ہائے مجھے لے چل۔''

''لیکن تم سنبھل کر بیٹھو کوئی آجائے گا۔''

''مجھے یہاں سے بھگا لے جا میں ساری عمر تمہاری نوکرانی بن کر رہوں گی۔''

''پاگل نہ بن، اس طرح بھگا کر میں کہاں لے جاؤں گی، میری بات سن۔''

لاجو کے چہرے پر آنسو خشک ہونے کا نام نہ لیتے۔ پورو کو ڈر تھا کہ بات بھی مکمل نہیں ہو پائے گی اور بڑھیا آجائے گی، پورو نے دوپٹے کے پلو سے لاجو کا منہ پونچھا اور واسطے دے دے کر اسے چپ کرایا۔

''کبھی تو باہر آتی جاتی ہو........؟''

''نہیں.........''

''لیکن صبح کھیتوں میں تو جاتی ہوگی......،آج ویسے بھی اماوس ہے،آج رات اگر تم باہر والے کنویں کے پاس آسکو تو وہاں رشید اگھوڑی لے کر کھڑا ہوگا۔''

لاجو جیسے جھک گئی رات کو اکیلے کنویں کے پاس پہنچنا ہی اسے محال لگتا تھا پھر وہ رشیدے کو جانتی بھی نہیں تھی اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کسی کی جان سلامت نہیں تھی ''میں گھر سے نکلوں گی کیسے؟''

''بڑھیا کوئی افیم وغیرہ تو نہیں کھاتی........؟''

''میں نے تو نہیں دیکھا''

''ایک بار اگر وہاں پر پہنچ جاؤ تو.........''

''لیکن وہاں.......میں اس کو نہیں جانتی اگر تم وہاں ہو تو..........''

وہ تو رات بھر میں فاصلہ طے کر لے گا، میں ہوئی تو دونوں راستے میں ہی رہ جائیں گے۔

''میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔''

''تم مجھ پر اعتبار کرو، تمہاری تسلی کے لئے میرے ہاتھ کی یہ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں ہوگی، لینا۔''

''اگر آج رات موقع نہ ملا تو........؟''

''پھر اس سے اگلی رات، وہ پوری تین راتیں تمہارا انتظار کرے گا۔''

''گلی میں سے شور کی آواز آرہی ہے شاید کوئی آگیا ہے۔''

پورو چارپائی سے نیچے بیٹھ گئی، چارپائی کی ادوائن کی طرف کھیس رکھ کر پورو نے دوپٹے کے پلو سے بندھی ہوئی راکھ کی پڑیا دیکھی کہ اگر بڑھیا آگئی تو اسے وہ تعویذ اور راکھ دے سکے، لیکن بڑھیا ابھی نہیں آئی تھی۔

''اگر تم اس تعویذ کے بہانے مجھے روز باؤلی پر لے جایا کرو اور پھر کسی دن.........؟''لاجو نے اپنی آواز پہلے سے بھی آہستہ کر لی۔

''اس طرح مجھ پر پورا شک ہو جائے گا۔ میں چاہتی ہوں وہ تمہیں گاؤں سے لے کر نکل جائے اور میں بعد میں بھی دو تین دن گاؤں میں آتی جاتی رہوں، کوئی بھی مجھ پر انگلی نہ رکھ سکے۔''

''مجھے ڈر ہے اگر راستے میں کسی نے پکڑ لیا........؟''

''پھر جو قسمت میں لکھا ہے، پہلے کون سی قسمت ہمارے ساتھ ہے۔''

''لیکن میں ساری عمر کے لئے تم پر بوجھ بن جاؤں گی۔''

''یہ باتیں پھر کریں گے اس وقت نہیں، میرا خیال ہے میں چلی ہی جاؤں تو اچھا ہے بڑھیا آج مجھے نہ ہی دیکھے تو........''

''ہائے مجھے بھی لے چل......'' لاجو اجنبیوں کی طرح جانے کے لئے تیار پورو کو چمٹ گئی۔ پورو نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے لاجو کو گلے لگا کر بھینچا پھر ''آج رات ...... آدھی رات........ کل پرمت چھوڑنا'' یہ کہتے ہوئے پورو کھیس سنبھال کر گھر سے باہر نکل گئی۔

بان کی چارپائی پر لاجو نے دونوں پاؤں پسار لیے۔ آج لاجو کے انگ انگ میں ایک شوخی تھی۔ پھر جیسے لاجو کو ساری دیواروں سے ایک آواز آئی ''آج رات .... آدھی رات.........'' لاجو نے دالان کی ایک ایک اینٹ پر نگاہ ڈالی ''یہی میرا گھر تھا، یہاں ہی میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی، یہیں میں جوان ہوئی، اسی گھر سے میری ڈولی نکلی، میں یہاں ہی واپس میکے آئی۔ سب اس گھر سے چلے گئے لیکن میرا مردہ اسی گھر میں ذلیل ہوتا رہا۔ میں اپنے ہی گھر میں پردیسن ہوگئی۔ اسی گھر نے مجھے پیدا کیا، اسی نے مجھے کھا لیا۔'' لاجو گھر کی دہلیز کو دیکھنے لگی۔ اس دہلیز کو بھی شرم نہیں آئی۔ اس نے مجھے خوار ہوتے دیکھا ان دیواروں کو لاج نہ آئی جنھوں نے میری عزت تار تار ہوتے دیکھی لیکن آج........ آج رات........ سب دیواریں ٹوٹ جائیں گی۔ سب دہلیزیں ڈھے جائیں گی۔ میں........''

بڑھیا باہر والا بند دروازہ کھول کر صحن میں آ پہنچی تھی۔

''صحیح وقت پر آ گئی ہو۔'' لاجو نے من ہی من میں کہا۔

''آج اس کھیسوں والی نے آنا تھا۔ ابھی نہیں آئی؟'' بڑھیا نے آتے ہی پہلی بات یہی پوچھی پھر ہاتھ میں پکڑا ساگ، کھانے کا چھوٹا موٹا سامان زمین پر رکھ کر لاجو کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

کھیسوں والی کا نام سن کر لاجو کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ ''نہیں........''

لاجو نے انکار میں سر ہلا کر کہا پھر لاجو سوچنے لگ گئی۔

''پورو کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہ رہی ہوں؟ وہ مجھے کیسے ڈھونڈنے آئی؟ وہ کس گاؤں میں رہتی ہے؟ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا؟ پوچھنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ آج رات ...... آدھی

رات........'' پھر لاجو کے من سے یہ آواز اٹھی اور کانوں سے ٹکرانے لگی۔

''میں نے کہا مٹھی بھر موٹھ ڈال کر چاولوں کی دیگچی پکنے کے لیے رکھ دو میں تو تھک گئی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے بڑھیا چار پائی پر آرام سے لیٹ گئی۔

جیسے آخری کام کو کوئی جلدی ختم کرتا ہے، لاجو نے اٹھ کر موٹھ صاف کیے، چاول صاف کیے اور چولھے میں لکڑی کے دو چار ٹکڑے ڈال کر چھوٹی دیگچی اوپر رکھ دی۔ زیادہ تر بڑھیا ہی آٹا گوندھتی تھی لیکن آج لاجو نے خود سے آٹا چھانا اور گوندھا۔

آج کا دن کسی ٹوٹے ہوئے جوتے کی طرح لمبا ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی، جب بڑھیا کا بیٹا گھر آیا تو لاجو زیادہ نہ چڑی۔ اس سے پہلے جب بھی اسے دیکھتی تھی تو جیسے اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتی تھیں۔

دیگچی میں پھیرتے ہوئے لاجو کے ہاتھ سے تین بار چمچ گرا، دو بار ہاتھ سے بیلن چھوٹا، ایک دو بار تو گھی کا کٹورا بھی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔

''دھیان سے کام کر'' ایک دو بار بڑھیا نے کرخت لہجے سے کہا۔

''آنکھیں ہیں کہ بٹن.......'' بڑھیا کے بیٹے نے بھی اسے ٹوکا۔

لیکن لاجو آج بڑھیا کو بھی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ اس کے بیٹے کی تو جیسے آج وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج گھر کے برتن بڑھیا اور اس کے بیٹے کا منہ چڑا رہے ہوں۔ لاجو میں آج بہت زیادہ ہمت آ گئی تھی۔ نہ تو وہ خوفزدہ تھی اور نہ ہی اسے کوئی سوچ آ رہی تھی۔ بس ایک طے شدہ وقت قریب آ رہا تھا۔ ابھی رات ہو جانی تھی ابھی سب نے سو جانا تھا اور لاجو کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے صابن لگی کلائی سے چوڑی کی طرح نکل جانا تھا۔ آج سے پہلے لاجو جلتی کڑھتی اٹھ کر، دارو کی بوتل لا کر بڑھیا کے بیٹے کے آگے رکھ دیتی۔ آج لاجو خود ہی کمرے سے بوتل نکال لائی۔ یہ بوتل بڑھیا کے بیٹے نے الاچیاں ڈلوا کر دو آتشہ بنوائی تھی اور پرانی اور تیز ہونے کی وجہ سے الگ رکھی ہوئی تھی۔

بڑھیا کا بیٹا سوچ رہا تھا'' آج موٹھ کی کھچڑی بھی ملائی جیسی بنائی تھی، آج لاجو خود ہی دارو کی بوتل نکال لائی تھی اور لاجو آج بہت خوش تھی، آج......''

بڑھیا اونگھ رہی تھی۔

''صحن میں ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ میں نے تمہاری چارپائی کمرے بچھادی ہے جا اور جاکر لیٹ جا۔''
لاجو نے گھر کی مالکن کی طرح بڑھیا سے کہا۔ ایک بار تو بڑھیا نے تیوری چڑھا کر لاجو کی طرف دیکھا۔

''آج تو جیسے دن ہی پھر گئے ہیں۔ آج تو میں نے اسے تعویذ ڈلوانا تھا، پہلے ہی اثر ہو گیا ہے۔''
بڑھیا نے دل ہی دل میں سوچا اور کمرے میں جاکر لیٹ گئی۔

رات کا اندھیرا لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ بڑھیا کا بیٹا دارو کے نشے میں چور لاجو کے بازو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ رات کا پہلا پہر کب کا گزر چکا تھا۔ گھر کی دیواروں نے جہاں لڑکیوں کے اتنے ہیر پھیر دیکھے تھے، آدھی رات کے وقت یہ بھی دیکھا کہ لاجو بے پاؤں ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر گھر کی دہلیز سے باہر نکل گئی۔

قدم گن گن کر چلتے ہوئے لاجو کو ایک دھچکا سا محسوس ہوتا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔
کسی نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا ہے، کسی نے اس کا گلا پکڑ لیا ہے۔ سردیوں کی ابتدائی ٹھنڈ میں بھی لاجو کی کنپٹی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔

بلاشبہ رات اندھیری تھی لیکن چمکتے ہوئے تاروں کی مدھم روشنی بھی لاجو کو بُری لگ رہی تھی۔ لاجو اپنے گھر کی پکی دیوار کے پاس سے گزر کر اگلے گھروں کے راستے پر جاتے ہوئے ٹھٹھک گئی۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے گھر کی اونچی دیوار کو دیکھا۔ ساری گلی میں خاموشی ٹھہرے کی طرح جمی ہوئی تھی۔ پھر بھی لاجو نے گلی کا سیدھا راستہ چھوڑ کر گھروں کے پچھواڑے کا لمبا راستہ اختیار کیا۔ گھروں کی قطار جب ختم ہو گئی، باہر کے کنوئیں تک پہنچنے کے لئے درمیان میں ایک کھلا میدان آتا تھا۔ یہاں لاجو کے ننگے پیروں سے ایک جھرجھری اٹھی اور اس کے ماتھے کی رگوں میں پھیل گئی۔ لاجو نے پیچھے مڑ کر قبروں کی طرح سوئے ہوئے گھروں کو دیکھا، ابھی تک کوئی آفت نہیں آئی تھی ابھی تک کوئی قبروں سے اٹھ کر نہیں آیا تھا۔ لاجو کو سانس کی آواز بھی سنار کی دھونکنی کی طرح لگ رہی تھی، لیکن لاجو کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ لاجو نے ایک بار چمکتے ہوئے تاروں کی پھیلی ہوئی روشنی کی طرف دیکھا اور میدان کی طرف چل پڑی۔

لاجو کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ میدان میں سے گزرتے ہوئے کوئی بھی اسے دور سے دیکھ سکتا تھا۔ لاجو کو پہنے ہوئے کپڑوں کی سفیدی بھی ڈراتی تھی۔ لیکن وہ میدان سے گزر گئی تھی، اس نے پیچھے مڑ کر

دیکھا پیچھے، میدان خالی تھا۔ کنویں کو ایک نظر دیکھ کر لاجو کو ایک بار ہول اٹھا۔ کنویں پر تو کوئی بھی نہیں تھا، رشیدا بھی نہ آیا، وہ تو کہیں کی نہیں رہی۔ لاجو کو واپس جانے کا خیال ماتھے پر چوٹ جیسا لگتا۔ کنویں کے گرد اس نے چکر لگایا۔ اس نے جیسے دل میں ٹھان لی کہ اگر دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تو آج وہ اسی کنویں میں ڈوب مرے گی۔

چادر اوڑھے قریبی جھاڑیوں سے ایک آدمی نکل آیا۔

''بہن تم لاجو ہو........؟'' آدمی نے لاجو کے قریب آ کر لپٹی ہوئی چادر سے چہرہ باہر نکالا۔

''میری نشانی دکھا دو بھائی......!'' لاجو نے رشیدے کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ رشیدے کے چہرے پر بہت زیادہ ترس مہر کی طرح ثبت تھا۔ رشیدے نے ہاتھ کی انگوٹھی لاجو کے سامنے کر دی۔

''تمہیں پہنچا کر کل یا پرسوں پورو کو لے جاؤں گا، بچے اس کے ساتھ ہیں۔''

رشیدا کنویں کے چبوترے سے اتر کر جھاڑیوں سے پار بندھی ہوئی گھوڑی کھول لایا۔

''یا اللہ!'' رشیدے نے ایک بار کہا اور لاجو کو بازو کے سہارے گھوڑی پر بٹھا لیا۔ گھوڑی کو ایڑ لگاتے ہی رشیدے کے من میں خیال آ گیا، جب اس نے پورو کو چھتو آنی کے کچے راستے سے کھینچ کر گھوڑی پر دھر لیا تھا۔ رشیدا آج حیران تھا کہ ایک بار پھر اسے گھوڑی دوڑانی پڑی تھی۔ گاؤں کی ایک اور منیار پھر ایک بار اٹھانی پڑی۔ جوانی کی وہ طاقت آج رشیدے کے بازوؤں میں نہیں تھی۔

رشیدا سوچ رہا تھا، پورو کو اٹھا کر وہ جیسے جیسے گھوڑی کو دوڑاتا جاتا تھا منوں بھاری ایک پتھر اس کی روح پر پڑتا جاتا تھا۔ برس ہا برس اس کی روح پر ایک بوجھ لدا رہا۔ آج جیسے جیسے اُس کی گھوڑی رتووال کی حدیں پیچھے چھوڑے جا رہی تھی، رشیدے کو محسوس ہوتا اس کی روح پر سے منوں بھاری پتھر پرے سرکتا جا رہا تھا۔ رشیدا جیسے ہلکا پھلکا ہو کر گھوڑی دوڑا رہا تھا۔

حمیداں

پو پھوٹتے ہی لاجو کے گم ہونے کی خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ منکوں میں ابھی مدھانیاں پڑی ہوئی تھیں جب ہر گھر میں لاجو کی باتیں ہونے لگیں۔ قریبی دیہاتوں میں کہیں بھی کسی ہندو کا نشان نہیں تھا اور کسی

مسلمان نے یہ کام کس لیے کرنا تھا، لوگ بے حد پریشان تھے۔

روشنی لحہ بہ لحہ تیز ہو کر دھوپ میں بدل گئی تھی۔ اپلوں سے بھرے چولہوں پر رکھی دیگچیوں میں لوگوں کی دالیں پک چکی تھیں۔ عورتیں ابھی تندور دہکا رہی تھیں، جن سے جلتی ہوئی کپاس کی خشک ٹہنیوں کی خوشبو اور اٹھتی ہوئی مہک نے سارے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، تب پورو نے گاؤں کی دہلیز پر قدم رکھا۔

آج لاجو کے گھر کا دروازہ کسی جانور کے کھلے منہ کی طرح وا تھا۔ پورو نے جب اس گھر کے دروازے پر قدم رکھا۔ صحن میں رات کے بکھرے ہوئے جھوٹے برتنوں پر مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ پورو کو دکھائی دیا کہ کسی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

''اری کہیں وہ کلموہی دیکھی ہے؟'' بڑھیا کے ماتھے پر اتنی سلوٹیں تھیں جیسے کسی نے مٹی کی ثابت گاگر اس کے ماتھے پر توڑ دی ہو۔

''کون اماں؟'' پورو نے سر پر رکھے کھیس صحن میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اری وہی بدقسمت، اللہ اس کو اٹھا لے؟'' بڑھیا نے پھر ساری نفرت ماتھے کی سلوٹوں میں بھر کر کہا۔

''ہائے ہائے کون؟ بہو کدھر ہے.........؟''

''اری وہی جل مرنی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

''ہائے ہائے کس کے ساتھ؟ میں تو اس کے لیے تعویذ اور راکھ لے کر آئی تھی.........''

''چولھے میں ڈالو تعویذ اور راکھ، اس کو تو معلوم نہیں جن لے گئے ہیں یا بھوت۔''

''چھوڑو اماں! گاؤں سے کس نے اٹھا لے جانی تھی۔ باہر کھیتوں میں گئی ہو گی ابھی آ جائے گی۔''

''کمال کرتی ہو! کھیتوں میں گئی ہے، اوپر سے شکر دوپہر ہو گئی ہے۔''

''لیکن اماں! وہ کوئی روٹی کا ٹکڑا تو نہیں تھی کہ جسے کوے لے اُڑے ہوں۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں، ہو سکتا ہے کسی کنویں میں ڈوب مری ہو۔ شاید کسی تالاب میں گر گئی ہو۔ مجھے تو پہلے دن سے ہی اس پر بھروسہ نہیں تھا لیکن یہ بدبخت لڑکا ہی اس پر مرتا تھا اور کہتا تھا اس نے کہاں جانا ہے، اس کے تو آگے نہ کوئی پیچھے۔''

''کیوں اماں اس کے ماں باپ کس گاؤں کے ہیں؟''

''اری! اجڑ گئے ماں باپ۔ میں تو پہلے دن سے کہتی تھی اس طرح پرائی اینٹوں سے گھر نہیں بستے۔ لیکن اس کا تو دل آ گیا تھا، بڑھیا کی کون سنتا ہے۔ لو اب تم سے کیا چھپانا، سارا گاؤں جانتا تھا کہ یہ ہندوؤں کی بیٹی تھی۔ جب ہندو گاؤں سے جانے لگے تو میرا بیٹا اس کو کہیں سے لے آیا۔ اللہ جانتا ہے میں تو پہلے دن سے ہی کہتی تھی بہنیں، بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ اللہ دتے! تو ایسے ہی گناہوں کا بوجھ اٹھا لایا ہے۔ آخر کس روز یہ بوجھ سر سے اتاریں گے؟''

''اچھا یہ بات تھی! اسی لیے اماں وہ چپ سی ہوئی لگتی تھی، لیکن بھاگ کر کہاں جائے گی؟ اس کا کوئی دور نہ نزدیک۔ آسمان سے گری اور کھجور میں اٹکی۔ میرے خیال میں تو وہ کسی کنویں میں گر گئی ہوگی، چاہے تو جان بوجھ کر مری ہو، یا ہو سکتا ہے اس کی موت آئی تھی۔''

''ہائے ری کلنک سے تو پیچھا چھوٹا مگر، لڑکا میری جان کو آ گیا ہے، کہتا ہے تو اندھی تھی، تمہیں پتہ ہی نہیں چلا وہ کوئی چڑیا کا بوٹ تو نہیں تھی جو کسی نے جیب میں ڈال لیا۔''

''پر اماں وہ پہلے بھی کبھی اکیلی باہر جاتی تھی؟''

''اری کہاں، مرے ہوؤں کے پاس جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو جب میں لڑکے کو دن کا کھانا دینے جاتی تھی تو باہر دروازے پر تالا لگا جاتی تھی۔ پھر لڑکا بھی کہے اور میں بھی سوچوں۔ بے چاری نے کہاں جانا ہے۔ اگر آٹھوں پہر سر پر کھڑے رہو تو بندے کا دل گھر میں نہیں لگتا بس دوپہر کو تھوڑی دیر ہی اکیلی رہتی تھی۔ کل کھانا دے کر آئی تھی تو اچھی بھلی یہاں بیٹھی ہوئی تھی، رات کو موٹھ ڈال کر کھچڑی پکائی تھی۔ باتھو کا ساگ دیگچے میں پکایا تھا، روٹی پکائی تھی، ہم ماں بیٹے کو کھلائی تھی۔ خود کھائی، پھر رات کو میری چار پائی کمرے میں بچھائی تھی۔ کہتی تھی اماں صحن میں ٹھنڈ ہو گئی ہے۔ لڑکے نے ذرا دارو کا گھونٹ پیا تھا۔ پھر میں سو مر گئی، پتہ نہیں کب یہ انہونی بیت گئی۔ صبح اٹھ کر میں نے آوازیں دیں لیکن کوئی ہوتا تو سنتا۔''

''میں نے کہا کنویں دیکھے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ جانے کے قابل تو تھی نہیں۔''

''جانا بھی کس کے ساتھ تھا؟'' بڑھیا نے اپنے اترے ہوئے ماتھے کو گھٹنوں پر رکھ لیا۔

''حیرانی کی بات ہے، گوشت کی کوئی بوٹی تو نہیں تھی جو کتے بلی نے منہ میں ڈال لی ہو۔ گاؤں تو سارا آپ لوگوں نے چھان مارا ہوگا؟''

''ہاں جی، صبح سے یہاں گاؤں کا ایک ایک آدمی آیا ہے، لوگوں نے زمین کا چپہ چپہ چھان مارا

ہے۔ اب میرا اللہ دتے اور گاؤں کے کچھ لوگ کنویں دیکھنے گئے ہیں۔ شاید مری ہوئی کی لاش ہی مل جائے اور لڑکے کو بھی افسوس نہ رہے کہ کدھر چلی گئی؟ لڑکا سلامت رہے، عورتیں اور بہت ہیں۔''

ابھی تک پورو افسوس...... شوق کے سارے رنگ اپنے چہرے پر اتارتی، چڑھاتی رہی تھی۔ اب دو تین آدمی باہر سے آ گئے تھے۔

''ہم تو سارے کنویں چھان آئے ہیں۔ اس کی تو کہیں سے ہڈی پسلی بھی نہیں ملی۔'' یہ کہہ کر تینوں آدمی صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔

''جائے جہنم میں، تم نے کس لیے اپنی جان کو روگ لگا لیا ہے۔ کوئی بھوت پریت لے گئے ہوں گے۔'' بڑھیا نے اللہ دتے کی طرف منہ کر کے افسردگی سے کہا۔

پورو کو پتا چل گیا کہ یہی اللہ دتا ہے۔ پورو کو لاجو کا اترا ہوا چہرہ یاد آیا جو کسی چڑیا کے پنجر کی طرح تھا جس کی جان بھوکی چیل کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔

''میرے خیال میں وہ رات کو اٹھ کر باہر گئی ہو گی اور کوئی جانور کھا گیا ہو گا۔'' ایک آدمی نے اللہ دتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ادھر ہی کوئی گیدڑ گھوم پھر رہا ہو گا اور بھلا گاؤں کے پاس کس جانور نے کھانے کو دوڑنا تھا؟'' دوسرے نے پاس سے کہا۔

''ہماری طرف سے چور لے جائیں، تم تو کوئی نوالہ حلق سے اتارو۔'' بڑھیا نے اپنے بیٹے کو دلاسہ دیا اور اٹھ کر کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

''اچھا اماں! اللہ تمہارا کلیجہ ٹھنڈا کرے، میں اب چلتی ہوں۔'' پورو نے بندھی بندھائی کھیسوں کی گانٹھ سر پر رکھ لی۔

''میں نے کہا تم کون ہو؟'' اللہ دتے نے پورو کو گھورتے ہوئے کہا۔ ابھی تک اللہ دتے نے پورو کو گاؤں کی عورت سمجھ کر دھیان نہیں دیا تھا لیکن کھیسوں کی گانٹھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو اللہ دتا کھردرے لہجے میں بولا۔ ''یہ کون ہے؟''

کھیس وغیرہ بیچتی ہے اور کون ہے؟'' قریب سے ہی بڑھیا نے جواب دیا۔

''میں نے اس سے پہلے تو تمہیں کبھی گاؤں میں نہیں دیکھا۔'' اللہ دتے نے شک کی بنا پر کہا۔

''کتنے دنوں سے بیچ رہی ہے۔'' بڑھیا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''میری گود میں دو لڑکے ہیں، سب دیہاتوں میں گھوم پھر کر چار پیسے کما لیتی ہوں۔'' پورو کا جی چاہے وہ پر لگا کر یہاں سے اڑ جائے، وہ کس لیے پیچھے گاؤں میں رہ گئی ہے۔ رات کو ساتھ ہی چلی جاتی تو کس نے پتہ کرنا تھا۔

''لیکن تم ہندو ہو یا مسلمان؟'' اللہ دتے کا شک ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی مذاق کرنے لگے ''کیا خیال ہے گھر بٹھانی ہے۔'' اللہ دتے کو ساتھی نے گد گدا کر کہا۔

''ہائے رے بھائیو! میں ہندو کہاں سے ہوں'' اور پورو نے اپنا دور پڑا جوتا پاؤں میں اٹکایا اور گانٹھ سنبھال کر باہر جانے لگی۔

''ہندو کا نام اس کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا'' اللہ دتے نے پھر ایک بھاری آواز میں کہا۔

''بھائی تمہارا تو شک ہی نہیں جاتا۔ یہ دیکھو میرا نام حمیداں ہے۔'' پورو نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اپنے بائیں بازو پر لکھا ہوا نام دکھایا۔

''جا ری جا، اس کا تو سر گھوم گیا ہے۔'' بڑھیا نے دور سے کہا۔

''مجھے اگر کوئی خبر ملی تو میں خود آ کر بتاؤں گی اماں!'' یہ کہتے ہوئے پورو تیز قدموں سے گلی کی طرف چل دی۔ باؤلی والے چھپر میں پورو نے اپنے دونوں چھوٹے بچے چھوڑے ہوئے تھے، جاوید اب سیانا ہو گیا تھا، چھوٹے کا دل بہلائے رکھتا تھا۔ پورو نے وہ رات گھڑیاں گن گن کر گزاری۔ دوسرے دن اس کے رشیدے نے لاجو کو سکڑ آلی اپنے گھر چھوڑ کر پورو کے پاس واپس آنا تھا۔ وہ رات رتووال میں پورو کی آخری رات تھی۔ وہ تارے گنتی ہوئی دونوں بچوں کو لیکر چارپائی پر لیٹ گئی۔ رتووال سے آج پورو کی ساری یادیں اور فریادیں مٹ چکی تھیں۔ پورو کو پچھلی بار رتووال آنا یاد آیا۔ کھیتوں کھلیانوں کے چکر لگانا یاد آیا، پھر آخری دن رام چند سے کھیتوں میں ملنا یاد آیا۔ پچھلی بار پورو نے رام چند کے کھیت کھلیان دیکھے تھے۔ اس بار پورو نے رام چند کا وہ گھر بھی دیکھا جس کو دیکھنے کی حسرت پورو کو برس ہا برس رہی۔ پورو سوچنے لگی کہ اسی گھر میں اس نے بہو بن کر آنا تھا، اس گھر میں اس کی بہن بیاہ کر آئی، اسی گھر میں اس کا بھائی بارات لے کر آیا لیکن پورو نے اس گھر کو کب دیکھا، جب اس گھر میں گھر والوں کی پرچھائیں بھی باقی نہ رہی۔ اس گھر کے جبڑوں میں اس نے

صرف لاجو کا چبایا ہوا پنجر دیکھا۔ شکر ہے لاجو بھی اس وقت تک قید سے آزاد ہوگئی تھی۔ پورو پھر سوچنے لگی آج تو وہ خود ہی اس گھر کے پنجر میں پھنسی ہوئی تھی۔

صرف ''حمیداں'' نام نے اسے بچالیا۔ معلوم نہیں کس وقت پورو کی آنکھ لگی اور رات کی تاریکی دھیرے دھیرے صبح کے اجالے میں بدل گئی۔

من کی باتیں

آنے جانے کا سالم یکہ طے کر کے رشید ارتو وال آیا اور پورو کو لے کر سکڑ آلی واپس چلا گیا۔ لاجو کی آنکھیں تو جیسے لو ہے کے بند دروازے پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ پورو کے پہنچنے کی پہلی آہٹ سنتے ہی لاجو نے بند دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ رشیدے نے باہر بھی ایک تالا لگایا ہوا تھا تا کہ گاؤں والوں کو شک نہ ہو۔ برآمدے کا دروازہ اندر سے بند کر کے پورو، لاجو اور رشیدا اندرونی کمرے میں یکبارگی ایسے بیٹھ گئے جیسے شیر سے ڈرے ہوئے ہرنوں کی ڈار کو جنگل میں کوئی نئی پناہ مل گئی ہو۔ لاجو اور پورو دونوں کو اس طرح محسوس ہوا جیسے وہ اکٹھی کھیلتی ہوں، اکٹھی پلی بڑھی ہوں، دونوں ایک دوسرے کی ہم عمر ہوں، لیکن وقت کی گردش نے انہیں برس ہا برس جدا کر دیا ہو اور آج پھر کسی طوفان کے بعد، کسی بلا کی تیز ہوا کے بعد دونوں آپس میں مل بیٹھی ہوں۔ برسوں کی جدائی اور زندگی کی کہانیاں دونوں کے ہونٹوں پر جم چکی تھیں۔ دونوں کو کہنے اور سننے کی جلدی تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے میں خاصی دیر ہوگئی تھی۔ رشیدے کو اس بات کا خیال آیا کہ دونوں اکیلی بیٹھ کر دل کی کہہ سن لیں۔ اصل میں رشیدا شروع سے ہی برا نہیں تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ پورو کے ساتھ کوئی لین دین کا کھاتہ تھا ورنہ وہ اتنا برا نہیں تھا کہ راہ چلتے کسی کی نیک سیرت بہن، بیٹی کو زبردستی گھر ڈال لیتا۔ پورو کو اپنی بیوی بنانے کے بعد رشیدے نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی بہن یا بیٹی کو نہ دیکھا۔ دونوں بچوں کو سلا کر وہ پچھلے کمرے میں چارپائی بچھا کر لیٹ گئیں۔ رشیدا اس روز ساتھ والے کمرے میں سویا۔

''رتو وال کا قافلہ اسی گاؤں سے گزرا تھا۔'' پورو نے ہی پہلے بات شروع کی۔

''تم نے دیکھا تھا؟'' لاجو اور پورو آج تک مل کر نہیں بیٹھی تھیں۔ لاجو کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ پورو نے اسے کیسے ڈھونڈا؟ کیوں ڈھونڈا؟

''میں تیرے بھائی سے ملی تھی، تبھی تو مجھے تیرے بارے میں معلوم ہوا۔''

''ہیں......؟''

''ہاں...... ''اور پورو کو اس دن کے قافلے والے رام چند کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

''تم نے اسے کیسے پہچانا......؟ تم نے تو کبھی اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔''

لاجو کے من ہی من میں ساری سوچیں گھوم گئیں۔ کیسے پورو اس کے بھائی کی منگیتر تھی، کیسے اس کے بھائی کا بیاہ ہونے والا تھا، کس طرح پورو گم ہو گئی، پھر کس طرح پورو کی چھوٹی بہن کی اس سے شادی ہوئی۔

''میں نے اسے پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا۔'' پورو نے رتووال کے کھیتوں والی ساری بات لاجو کو بتائی۔ پورو نے یہ بھی بتایا کہ ''اس وقت تک اسے معلوم نہیں تھا کہ رام چند اس کا بہنوئی بن چکا ہے۔''

''مجھے کبھی کسی کی خیر خبر نہیں ملی، سوائے اس دن کے جس دن قافلہ یہاں سے گزرا۔ مرے ہوؤں کو بھی لوگ یاد رکھتے ہیں، ان کے نام کے کھانے کھلاتے ہیں۔ کبھی کبھار میرا بھی تو گھر میں کوئی نام لیتا ہوگا؟'' پورو کا جی بھر آیا۔

لاجو نے اس کو بتایا کہ اس کا باپ دو سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کئی بار پورو کا نام لے لے کر بین کرتی تھی۔

''میری ماں کی قسمت، بیٹی بھی اس کی جیتے جی مر گئی اور اب بہو بھی...... ''پورو نے کہا تو پورو اور لاجو دونوں رو پڑیں۔ دونوں چارپائی کی بالیں کے ساتھ لگی رہیں جیسے بچھڑ خانے کی گائیں۔ ''جب تم وہاں جاؤ گی، میری ماں سے ملو گی تو ایک بار اسے کہنا مجھ زندہ کا چہرہ دیکھے۔'' پورو نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

''میں...... میں...... وہاں کہاں جانا ہے......؟''

''تم اپنے گھر جاؤ گی، اپنے خاوند کے پاس، اپنے بھائی کے پاس۔''

''میں تو جیتے جی مر گئی ہوں مجھے کون قبول کرے گا؟''

''نہیں لاجو! میں جیتے جی یہ ناانصافی نہیں ہونے دوں گی، تم اپنے گھر جاؤ گی۔ تمہارا اس میں کیا قصور ہے؟''

''لیکن تمہارا کیا قصور تھا، تمہیں آج تک گھر والوں نے قبول نہیں کیا۔''

''میری اور بات تھی لاجو.........!''

''تمہاری بات اور کیوں تھی؟ تم کوئی اپنی مرضی سے آئی تھیں؟ تم نے بھی تو مجبوراً........''

''ہاں لاجو! اس وقت میں اکیلی تھی، میرے والدین میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ لوگوں کے طعنے سنتے مگر انہوں نے اپنا کلیجہ کاٹ ڈالا۔ اب کسی ایک کے نہیں سب کے کلیجے کو ہاتھ پڑا ہے۔''

''نہیں پورو! میری قسمت اچھی ہوتی تو یہ ظلم ہی نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہے مجھے کوئی نہیں لینے آئے گا۔''

''میں کہہ رہی ہوں نا! تیرے بھائی کا خط ضرور آئے گا۔ ہم تیرے بارے میں خبر دیں گے تو وہ ضرور تجھے لینے آئیں گے۔ میرا بھائی کیسا دِکھتا ہے؟'' پورو چاہت سے پوچھنے لگی۔

لاجو کو اپنا شوہر یاد آیا ''وہ کیسے اس سے نظریں ملائے گی؟ وہ کیسے گھر والوں کا سامنا کرے گی؟'' لاجو سوچنے لگی مگر اُس کو جیسے یقین تھا کہ اسے کوئی بھی لینے نہیں آئے گا۔ ''ویسے کسی سہانی آس کے سہارے جتنے دن چاہے گزار لو۔''

''نہیں لاجو! کوئی نہ کوئی ضرور تجھے لینے آئے گا۔ آج کوئی کسی کو طعنہ نہیں دے سکتا، سب لوگ اپنی بہنوں، بیٹیوں کو لے جا رہے ہیں۔ رشید ابتا رہا تھا کہ دوسری طرف سے بھی لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کے اپنی عورتیں واپس لا رہے ہیں۔ کئی عورتوں کے تو بچے بھی پیدا ہوگئے ہیں۔'' پھر دونوں گم سم، عورتوں کی اس بے بسی کو سوچنے لگیں۔

لاجو سوچنے لگی کہ آج تک اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ معلوم نہیں اس میں کیا نقص تھا۔ آج یہی نقص اسے بچا گیا، ورنہ معلوم نہیں اس کا کیا حال ہوتا؟ ''پہلے وہ ایک کو روتے تھے اب دو کو رو لیں گے۔ میں نے کہیں نہیں جانا پورو! میں کس منہ سے جاؤں گی۔ میں تیرے بچوں کی نوکری کر کے روٹی کھا لوں گی۔''

''اس طرح کیوں کہتی ہو لاجو! میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو، یہ تمہارا اپنا گھر ہے لیکن لاجو وہ تمہیں ضرور لے جائیں گے۔ میں دنیا جہان کے واسطے دے کر ان کو دے کر منا لوں گی۔'' لاجو نے پورو کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''تم اپنی کہو، کیسی ہو پورو؟''

''رشیدے کی پیٹھ سنتی ہے۔ پہلا گناہ جو اس نے کیا سو کیا مگر اس کے بعد اس نے مجھے کبھی برا بھلا نہیں کہا۔ وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں کیسے تمہیں ڈھونڈ نکالتی؟''

''مجھے واپس لانے کے لیے اس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ہے۔ اگر کہیں اس شیطان کو پتہ لگ جاتا تو اس نے میری ہڈیاں جلا کر پانی پینا تھا.....''

''اس نے جلانی کب تھی پگلی! وہ لوگ تو دفنا دیتے ہیں۔''

''کیا معلوم، لیکن پورو کہیں وہ اس گاؤں کا سراغ تو نہیں لگا لے گا؟ میرا تو جی ڈرتا ہے کہیں تمہارا بستا گھر برباد نہ کر دوں۔''

''ابھی تک تو ان کو تیرے سایے کا بھی پتہ نہیں لگا تھا۔''

اور پورو نے وہ ساری بات سنائی کہ کس طرح وہ لاجو کے گم ہو جانے کے بعد بڑھیا اور اس کے بیٹے سی ملی تھی۔

''پہلے اِسی اندرونی کمرے میں کئی دن ایک ہندو لڑکی چھپائے رکھی تھی، کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا پھر میں اس دن اسے قافلے میں چھوڑ آئی تھی۔ تجھے بھی اس گاؤں میں چوری رکھنا ہے تاکہ گاؤں میں کسی کو شبہ نہ ہونے پائے۔ جس دن خط آ گیا تجھے چپکے سے جا کر لاہور چھوڑ آنا ہے کسی کو کان و کان خبر بھی نہیں ہوگی۔''

''اگر ان کا خط نہ آیا.....''

''میرا دل گواہی دیتا ہے لاجو! تیرا بھائی ضرور خط لکھے گا۔''

ہچکولے

دنوں پر دن گزرتے گئے۔ ہر صبح منہ اٹھاتی رہی، ہر شام سر جھکاتی رہی نہ لاجو کے بارے میں کوئی خبر باہر نکلی نہ ہی لاجو کے گھر والوں کی کوئی خبر پہنچی۔ ویسے پورو اور لاجو کا ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ رات کو جب نیند سے ان کی آنکھیں بھر جاتی دونوں کی آنکھوں میں خواب ہی خواب بکھر جاتے۔ صبح اٹھ کر

وہ ایک دوسرے سے خوب باتیں کرتیں۔ خوابوں کی اچھی بری تعبیریں سوچتیں۔ کبھی ان کے من میں کوئی ترنگ باقی نہ رہتی کبھی ان کا من تھم جاتا۔ کئی بار لاجو چولھے سے کوئلہ لے کر لکیریں کھینچنے بیٹھ جاتی، کبھی اسے لکیریں راہ بجھاتیں۔ کئی بار لاجو کے رخساروں پر آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ بہت دفع لاجو، پورو کے بچوں سے کھیل کر جی بہلا لیتی، ویسے لاجو کا من اکثر ناس ہی سوچتا۔ اسے امید نہیں تھی کہ کبھی کوئی اس کی خبر بھی لے گا لیکن پورو کا من اندر ہی اندر گواہی دیتا تھا کہ کسی دن اچانک ہی کوئی آ جائے گا۔ کسی دن اچانک کوئی خط آ جائے گا۔ لاجو کے دن پھر اچھے ہوں گے۔ پورو اپنی طرف سے لاجو کی اچھی طرح تواضع کرتی تھی۔ سوچتی تھی وہ شاید چند دنوں کے لئے اس کے پاس امانت ہے پھر شاید اسے کبھی نہ مل سکے گی، کبھی نہ دیکھ پائے گی۔ باقی سب کے چہرے بھی اسے اس وقت صرف لاجو کے چہرے میں سے دکھائی دیتے تھے۔ کب کسی نے اس کے گھر رہنے آنا تھا، کب کسی نے اس سے ملنے آنا تھا۔ اس کے اپنے رشتہ داروں میں سے لاجو نے بھی اس کے گھر نہیں آنا تھا۔ رات کے اندھیروں نے لاجو کا بھید بہت وفاداری سے سنبھالا لیکن گاؤں کے ڈاکیے نے تین پیسوں کا ایک بھی کارڈ لا کر ان کے صحن میں نہ پھینکا۔ خیالات جیسے لاجو اور پورو کے چہرے پر جم گئے تھے۔ صرف لاجو کو ایک ڈھارس تھی کہ کبھی پورو اور رشیدے نے اس کا جی میلا نہ ہونے دیا۔ لیکن سارا دن گھر میں بند چھپی ہوئی لاجو سوچتی تھی کہ پہاڑ سی عمر اس کے سر پر لٹک رہی تھی کب اس کے دن پورے ہونگے؟

پورو کا کسی کے گھر زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ لاجو اندرونی کمرے میں ہی بیٹھتی تھی یا پھر دوپہر کے وقت باہر کے دروازے کی چٹخنی لگا کر چرخا کاتتی رہتی۔ دھاگے ختم ہو جاتے، دن ختم ہو جاتے، لیکن سوچیں نہ ختم ہوتیں۔

سخت سردی گزر گئی پھاگن کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ پانیوں کی ٹھنڈک کم ہو گئی تھی۔ ایک دن ڈھلتی دوپہر میں رشیدا جب گھر کی دہلیز سے گزرا، لاجو اور پورو کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

سہمے ہوئے چہرے کے ساتھ دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ کتنی ہی دیر رشیدا کچھ کہہ نہ پایا۔ لاجو کے کلیجے کو جیسے مٹھی میں بھر کر چھوڑ رہا تھا۔ اس کو ایک ہی ڈر تھا کہ رتووال کی بڑھیا اور اس کے بیٹے نے لاجو کا کھوج لگا لیا ہے۔ وہ اس کو زبردستی کھینچ تان کر لے جائیں گے، معلوم نہیں پورو اور رشیدے کے ساتھ کیا کریں گے۔ رشیدا چارپائی کے کنارے بیٹھ گیا۔ قمیض کی بازو کے ساتھ دونوں آنکھیں پونچھ کر لاجو کو چمکارا۔

اس کے ہاتھوں میں وہی جذبہ تھا جو ایک بزرگ باپ کا بیٹی سسرال وداع کرتے ہوئے ہوتا ہے۔

رشیدے کا من بڑا دکھی ہو رہا تھا پھر رشیدے نے اپنے من کو تھام کر کہا ''آج رام چند آیا تھا۔''

''یہاں؟'' لاجو اور پورو کے منہ سے یکبارگی آواز نکلی۔

''ہاں، کچھ ہندوستانی، کچھ پاکستانی سپاہی اس کے ساتھ تھے، اسی طرح لوگ گاؤں گاؤں، شہر شہر جا کر گمشدہ لڑکیاں ڈھونڈ رہے ہیں، مجھے اکیلے میں بھی رام چند ملا تھا۔'' رشید ابتا رہا تھا۔

''سچ مجھے لینے آئے ہیں؟'' لاجو نے یکبارگی کہا اور پھر کہہ کر شرمندہ سی ہوگئی۔ اس کو لگا اس کا سوال بے موقع تھا۔

''جھلی نہ ہو تو اور کیا کرنے آئے ہیں......؟'' رشیدے نے کہا۔

پورو نے ابھی تک چپ نہیں توڑی تھی۔ وہ من ہی من میں نہال ہوئی جا رہی تھی کہ اس کا یقین سچا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رام چند آئے گا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ بیل ضرور منڈھے چڑھے گی، لاجو تو ایسے ہی اپنا دل چھوڑ دیتی تھی۔ جن دنوں رشیدا بھی مایوس ہو جاتا تھا پورو کا دل گواہی دیتا تھا، رام چند ضرور آئے گا، سو آج وہ دن آ گیا ہے۔

''اکیلا ہے......'' لاجو نے پوچھا۔

رشیدا سمجھ گیا کہ لاجو کے اس طرح پوچھنے کا کیا مطلب ہے۔

''ہاں ابھی تو اکیلا آیا ہے لیکن تم فکر نہ کرو لاجو! تمہارے گھر والے تمہیں صدقے واری ہوتے ہوئے لے جائیں گے۔'' لاجو کو کچھ تسلی ہوگئی۔

''تمہارا نام سن کر، تمہاری خبر سن کر رام چند کا رونا تھمنے میں نہیں آتا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا بھی دل بھر آتا تھا۔'' رشیدے کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ لاجو اور پورو نے رونا شروع کر دیا۔

''میں نے انہیں اچھی طرح سمجھا بجھا دیا ہے۔ آج یہاں اس طرح تمہیں حوالے کرنے سے سارے گاؤں کو خبر ہو جاتی، ہو سکتا ہے رتووال تک بھی بات پہنچ جاتی۔ میں نے انہیں کہا ہے آپ لاہور واپس چلے جائیں میں لڑکی کو لے کر لاہور پہنچ جاؤں گا اور وہیں آپ کے حوالے کر دوں گا۔''

''یہ بہت اچھا کیا ہے۔'' پورو نے جواب دیا۔

''ہم وہاں آج سے پانچویں دن پہنچیں گے۔ اس وقت تک وہ پورو کے بھائی کو بھی امرتسر سے بلا لیں گے۔ میں نے سوچا تھا ایک بار پورو بھی اپنے بھائی کو مل لے گی۔'' رشیدا لاجو کو چمکارتے ہوئے بتا رہا

تھا۔

پورو کے رکے ہوئے آنسو بہنے لگے۔ لاجو نے پورو کی جھولی میں سر رکھ کر پورو کو بھینچ لیا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ دونوں کے دکھ مشترک ہو گئے تھے۔ دونوں کے آنسو ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔

لاہور پہنچنے کا راستہ مشکل سے ڈیڑھ دن کا تھا۔ ابھی یہاں سے روانہ ہونے میں پورے تین دن تھے۔ اگلے دن پورو نے بیسن پسوایا، بھینسوں کے دودھ کا جمع کیا ہوا مکھن نکالا، کشمش اور میوے ڈال کر پورو سارا دن پنّیاں (لڈو) بناتی رہی، جیسے بیٹی کو سسرال بھیجنا ہو۔ پورو نے ایک چاندی کی کڑھائی والا جوڑا نکالا، لاجو کو کلیجے سے لگاتی رہی۔ لاجو کو بھینچ بھینچ کر روتی رہی۔

پھر تین دن بعد دونوں بچوں کو ساتھ لے کر پورو، لاجو اور رشید اماں اندھیرے گاؤں سے نکلے اور گاڑی پکڑی۔

پچھلے چار دنوں سے پورو کو سارا سارا دن اور ساری ساری رات کئی خیال آتے رہے۔ من ہی من میں کچھ طے کرتی رہتی۔ میں لاجو سے کہوں گی میری ماں سے جا کر یہ کہنا، میری ماں کو جا کر یہ بتانا۔ کسی طرح مجھ جیتی جاگتی کا منہ دیکھے...... سوچتے سوچتے پورو کا دل بھر آیا۔ سوچتے سوچتے پورو کو کہنے کے لیے بہت کچھ یاد آیا۔ سوچتے سوچتے پورو کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

لاجو کو اپنے بھائی اور اپنے خاوند کا چہرہ دیکھنا بڑا عجیب لگتا تھا جیسے کوئی مرنے کے بعد دوسری دنیا میں کھوئے ہوئے چہروں کو دیکھنے کی آس رکھتا ہو۔ بلاشبہ لاجو کو اپنے گھر والوں سے بچھڑے ہوئے پانچ چھ ماہ ہو گئے تھے، لیکن لاجو کو ایسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک بار مرنے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں جی اٹھی ہے۔

سفر کے دوران تمام وقت دونوں کے من ہچکولے کھاتے رہے۔

ایک پل

پولیس کے پہرے میں جب وہ ملے، لاجو کی پلکیں اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ پورو نے اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا، ملاپ کی اس گھڑی کے دوسری جانب ہمیشہ کے لئے جدائی نظر آ رہی تھی۔ کسی کے بھی آنسو تھمنے میں

نہیں آ رہے تھے۔

مردوں کے دل بھی ڈول گئے۔ اس انہونی کے بعد کسی کے پاس پوچھنے یا بتانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ رو رو کر ان کے ہاتھ بھیگ گئے۔ زاروقطار رونے سے ان کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

''واسطہ ہے کبھی بھول کر بھی لاجو کی بے عزتی نہ کرنا۔'' پہلے پہل پورو بولی۔

''پورو ہمیں شرمندہ نہ کر۔'' آخرکار لاجو کے بھائی نے کہا۔

لاجو کا خاوند کچھ نہ بول سکا اور نہ ہی شاید کچھ سن سکا۔ آج اس نے صرف اپنی بیوی ہی نہیں دیکھی، آج اس نے ہوش سے پہلے کی کھوئی ہوئی بہن دیکھی تھی۔

برس ہا برس اس کے اندر ایک آگ سلگتی رہی تھی۔ اسی کی ایک چنگاری اس نے رشیدے کے کھیت کو دکھائی تھی، اس کا سارا کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ برس ہا برس وہ اس شہزادی کی کہانی کو سوچتا رہا تھا، جس کو ایک دیو چرا کو لے گیا تھا پھر پورب دیس کا ایک شہزادہ اپنے جادوئی تیروں کے ذریعے اس کو چھڑا لے گیا تھا۔ چھوٹی عمر میں وہ کئی سادھوؤں، سنتوں سے جادو کے تیر مانگتا رہا۔ جوان ہو کر وہ پورو کے بارے میں سوچ سوچ کر دانت پیستا رہتا۔ آج برسوں کی کھوئی ہوئی پورو اس کی آنکھوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ رشیدے نے اس کی بیوی کو بچایا ہے۔ اس گھڑی اسے صرف یہی یاد تھا کہ رشید اس کی بہن کو اٹھا لے گیا تھا۔

پولیس والوں کی لاری تیار ہو گئی تھی، ہندوستانی پولیس کے سپاہیوں نے اعلان کیا:

''آؤ! دوسری طرف جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں، لاری تیار ہے۔''

رام چند نے رشیدے کے گلے لگ کر بار بار اسے کہا:

''تیری مہربانی بھائی! تیرا احسان نہیں بھولیں گے۔''

رشیدے کے چہرے پر احسان کرنے کی خوشی بھی تھی، لیکن رشیدے کی نظریں لاجو کو بچا کر بھی شرمندہ تھیں۔ رشیدے کو پورو کا اٹھالے جانا یاد آ رہا تھا، پھر اسے محسوس ہوا اس پر چڑھا ہوا قرضہ کچھ نہ کچھ اتر رہا تھا۔

ایک بار آواز پھر آئی ''دوسری طرف جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں۔''

پورو نے چاندی کی کڑھائی والا جوڑا اور بیسن کی 'پنیوں' (لڈوؤں کی پوٹلی لاجو کے ہاتھ میں دی، لاجو

کو بھینچ بھینچ کر گلے لگایا اور پھر آخری ملن کے لیے اپنے بھائی کے سینے سے لگ گئی۔

''پورو.......''پورو کا بھائی صرف اتنا ہی کہہ سکا اور اس نے پورو کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

''میری بات سن، اس وقت......''پورو کے بھائی نے پھر جی کڑا کر کے کہا۔ پورو کو اپنے بھائی کی بات سمجھ میں آ گئی، پورو کو ایک بار خیال آیا۔

''اگر میں اس وقت کہہ دوں میں ایک ہندو عورت ہوں تو وہ ضرور ان کے ساتھ لاری میں بٹھا کر لے جائیں گے، میں بھی......لاجو کی طرح......ملک کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح......''

پورو کے رکے ہوئے آنسو پھر نکل آئے اس نے دھیرے سے اپنے بھائی سے اپنا بازو چھڑا لیا اور دور کھڑے رشیدے کے پاس جا کر اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''لاجو اپنے گھر واپس جائے گی تو سمجھنا وہ پورو کی صورت میں آ گئی ہے۔ میری جگہ اب یہی ہے۔'' پورو نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھائی کو آہستہ سے کہا۔

رام چند نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ دونوں ہاتھ پورو کے آگے جوڑ دیے۔ کوئی اندرونی دکھ رام چند کے ہونٹوں پر جم گیا، رام چند بول بھی نہ سکا۔

''لڑکی چاہے ہندو ہو یا مسلمان، جو بھی لڑکی اپنے ٹھکانے پہنچ رہی ہے سمجھو اس میں پورو کی روح ٹھکانے پہنچ رہی ہے۔'' پورو نے من ہی من میں کہا اور دونوں آنکھیں زمین پر جھکا کر رام چند کو آخری پرنام کیا۔

لاری چل پڑی تھی، خالی سڑک پر گرد پھیل گئی۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

جہنم کی آگ

ہنگری کا ادیب آرتھر کوئسلر پیدائشی یہودی تھا۔ اس وقت کہ جب 1933 میں ہٹلر کے دور میں جرمنی کے شہروں میں کئی لاکھ کتابیں جلائی گئی تھیں، کوئسلر کی کتابیں بھی جلائی گئیں اور پھر جب 1952 میں سٹالن کے دور میں سوویت یونین کے مقبوضہ جرمن شہروں میں نوے لاکھ کتابیں جلائی گئیں، تب بھی کوئسلر کی کتابیں اس آگ کے حوالے ہوئی تھیں اور اس دوسری آگ کی راکھ میں کوئسلر کو اپنی کتاب کا ایک ادھ جلا ورق ملا تھا جس پر اس کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔ اس ادھ جلے ورق کو کوئسلر نے فریم کروا کے اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں کر دیا تھا وہ کہتا تھا کہ زندگی میں دو دفعہ کسی کی کتابیں جلائے جانے کا شرف آخر کتنے ادیبوں کو حاصل ہے؟

دسمبر 1987 میں جب اچانک دلی سے پاکستانی ادیب فخر زمان کا فون آیا کہ برسوں کے انتظار کے بعد انہیں اب پہلی دفعہ ہندوستان آنے کا موقع ملا ہے اور وہ تین دن میرے گھر قیام کریں گے تو آرتھر کوئسلر کی زندگی کا وہ واقعہ میری نظروں کے سامنے آ گیا جب فخر زمان کے دیس میں ان کی ساری تصانیف ضبط کی گئی تھیں اور انہیں انڈیا کا ویزا بھی نہیں دیا جا رہا تھا۔ فخر زمان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی وگرنہ ذہنی رفاقت تو برسوں پر محیط تھی۔ تین دن میں ہم نے ڈھیروں باتیں کیں۔ اس دوران انہوں نے بتایا کہ ان کی تمام کتابوں کا ایک مجموعہ چھپ رہا ہے۔ میں نے آرتھر کوئسلر والے واقعہ کی روشنی میں پوچھا کہ آپ کی تمام تصانیف ضبط کی گئی ہیں، اگر ان سب کا ایک مجموعہ چھپ گیا تو کیا وہ ضبط نہیں ہو جائے گا؟

فخر نے کہا 'شاید ہو جائے گا۔ دوسری بار شاید نہ ہو کیوں کہ سرکاری کاغذوں میں ان کتابوں کا جو نام درج ہے ان سے مختلف نام سے یہ کتابیں چھپیں گی۔'

وہ ہنس دیئے اندر تو وہی نام ہوں گے۔ قانون کے اس دلچسپ پہلو پر وہ ہنستے رہے پھر فخر نے کہا کہ 'میری کتاب ''بندی وان'' کی ڈرامائی تشکیل کی گئی ہے یہ کتاب ضبط شدہ ہے۔ ادھر چھپ نہیں سکتی لہٰذا اس کی

ڈرامائی تشکیل پر اعتراض ہونا چاہیے یا نہیں۔۔۔ جب اُوپر والے یہ فیصلہ نہ کر سکے تو اس پر پابندی لگادی کہ یہ کھیل عوامی پلیٹ فارم پر نہیں دکھایا جا سکتا اسے اپنے گھر میں بیٹھ کے کھیل لو۔۔۔ سو ہم نے اس ڈرامے کو اپنے ایک دوست کی وسیع و کشادہ کوٹھی میں تشکیل دیا۔ جتنے لوگ بھی اس جگہ سما سکتے تھے۔ بے نظیر بھٹو بھی آئی تھیں کوٹھی کے چاروں طرف سرکاری پہرا لگا ہوا تھا۔ ادھر ایک دوست نے ڈرامے کی وڈیو ریکارڈنگ کر لی۔ یہ ریکارڈنگ گھریلو وڈیو کیمرے سے کی گئی تھی لہٰذا تکنیکی اعتبار سے اچھی نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک دستاویز بن گئی ہے۔'

فخر کا ناول ''بندی وان'' میں نے پڑھا ہے لہٰذا میں جان سکتی ہوں کہ اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کتنے دل گردے والے شخص نے کی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا ایک ایک کردار آتا گیا اور درد کی چبھن بن کے آنکھوں سے بہتا گیا۔ اس وقت فخر نے بتایا کہ 'میں وہ فلم تمہیں دکھانے کے لیے لایا ہوں' میری پہلی حیرانی ایک سوال کی صورت میں تھی کہ انہوں نے لانے کی اجازت کیسے دی؟ پھر یاد آیا کہ فخر سیدھا اپنے ملک سے نہیں آیا۔ پیرس سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ وہ فلم دیکھتے ہوئے مجھے آرتھر کوئسلر کی دیوار پر لگا ہوا اس کا ادھ جلا ورق یاد آتا رہا۔ میں نے دیکھا فخر مسکرا رہے ہیں جیسے کوئسلر کی طرح کہہ رہے ہوں، ''دیکھو یہ ہے لوگوں کا وہ دکھ جو ضبط شدہ قرار دیا گیا ہے مگر وقت کے درد کو کاغذ پر اتارنے کا شرف آخر کتنے ادیبوں کو حاصل ہوتا ہے نا کہ اسے ضبط شدہ قرار دینے کا فخر؟۔۔۔'

اگلے دن 26 دسمبر کی شام کو دلی کی ''قلم زاد'' تنظیم کی طرف سے فخر زمان کو استقبالیہ دیا گیا۔ اُردو کے ادیب قمر رئیس نے صدارت کی۔ میں اس دعوت کی مہمانِ خصوصی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے فخر کے کردار گھوم رہے تھے۔ اس لیے جب بطور مہمانِ خصوصی مجھے چند حرف کہنے کے لیے بلایا گیا تو میں نے کہا 'فخر زمان اپنے ناول ''بندی وان'' میں زیڈ کا کردار پیش کرتے ہیں تو زیڈ کہتا ہے کل جو انسانی قتل ہوا تھا وہ بھی میں تھا آج جو قتل ہو رہا ہے وہ بھی میں ہوں۔ آنے والے کل میں جو قتل ہوگا وہ بھی میں ہوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے میرے دل کا یہ عالم ہے کہ وہ ''زیڈ'' فخر زمان بھی ہے اور میں بھی۔ یہ بات کرتے ہوئے مجھے فراق گورکھپوری بہت یاد آئے جو اکثر ایک بات سنایا کرتے تھے۔ میں نے ان کے حوالے سے دہرایا کہ ''ادبی تاریخ میں جنت اور جہنم کا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا والوں نے دیکھا کہ یہ شاعر ادیب ہیں۔ یہ پتہ نہیں عوام کا دکھ اپنے دلوں میں کیوں بسا لیتے ہیں کہ پھر ساری زندگی تڑپتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں عوام

کے دکھ سے کوئی سروکار نہیں ہوگا انہوں نے زندگی کو دو نام دیے ایک جنت جوان کی اپنی زندگی کے لیے تھا۔ ایک دوزخ جو شاعروں اور ادیبوں کے لیے تھا۔ پھر ایک دفعہ جنت میں ایسی ٹھنڈی ہوا چلی کہ لوگ سردی سے کانپنے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ جہنم میں بہت آگ جلتی ہے، اس لیے تھوڑی آگ جہنم سے مانگ لی جائے۔ لیکن جب انہوں نے اہلِ جہنم سے آگ کی فرمائش کی تو جہنم سے جواب آیا کہ اِدھر فالتو آگ نہیں ہوتی۔ اِدھر جو لوگ آتے ہیں وہ اپنی آگ ساتھ لے کر آتے ہیں۔ تو ایسی ہی آگ شاعروں اور ادیبوں کے سینوں میں جلتی ہے۔ یہ آگ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ اس آگ کو حاصل کرنے کے لیے شاعر یا ادیب ہونا ضروری ہے۔

اس حوالے سے بات بڑھاتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کی منفی قوتوں کے اندھیرے میں شعور کی آگ فخر زمان کی صورت میں جلتی ہے، ہم سب بھی اسے اپنے اپنے سینوں میں لے کر ان کی آگ کا استقبال کرنے آئے ہیں۔ وہ تین دن فخر زمان سے میری طویل ملاقات کے دن تھے جس سے نکلنے والی چنگاریاں منفی قوتوں کی اندھیری دنیا کو چیرتی چلی گئیں۔

☆☆☆☆
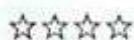
کجھ ہور ویروے

(یاداں)

کئی گلاں رگاں وچ پئیاں ہوئیاں سن۔لکھنوں رہ جاندیاں ہن۔ ''رسیدی ٹکٹ'' وچ بہت کجھ درج کیتا سی، پر کجھ گلاں سن، جو چیتیوں لانبھے ہو گئیاں۔ شاید ایس لئی کہ اوہ وجود وچ اینیاں دس گئیاں سن، کہ چیتا وی اوہناں نوں وکھرے طور تے پچھان نہیں سکیا۔

اک گھٹنا (واقعہ) ایہ سی، کہ جدوں پنجاں گو ورھیاں دی ساں، میرے پِتا نے میرے کولوں باؤنی صاحب گردوارے وچ ارداس کروائی سی۔ بھری سنگت وچ۔

گھر وچ اوہ ارداس دا حرف حرف کئی دن چیتے کرواؤندے رہے سن، تے تاکید کیتی سی دبس ہتھ جوڑ کے حضوری وچ کھلو جانا ہے۔ اکھاں میٹ لینیاں ہن۔ ہر پاسے لوک ہون گے پر توں کسے ول ویکھنا نہیں۔ اوہناں نوں سوچنا وی نہیں کہ لوک تینوں کویں ویکھ رہے ہن۔ سارا دھیان ارداس وچ رکھنا ہے۔ آپنے مونہہ دھیان ہو کے کھلونا ہے۔ ایس طرحاں تینوں کوئی حرف نہیں بھلے گا'۔

جاپدا ہے، ایہ چھوٹی جہی گل میریاں رگاں وچ اُتر گئی۔ ساری زندگی دھیان آپنے لفظاں نال جڑیا رہیا۔ جس ویلے، جو لکھ رہی ہوندی ہاں، پوری دی پوری اوہدے وچ سمائی ہوئی ہوندی ہاں۔ کدے خیال نہیں آیا کہ لوک ایہنوں پڑھ کے کیہ آکھن گے۔ نندا اُستت کیہ ہوندیاں ہن، اوس عمر وچ میں نہیں سی جاندی۔ پر میرے پِتا جاندے سن۔ پتا نہیں اوہ اوہناں دی دُور اندیشی سی یاں قدرت دا کوئی کرم، جہنے میرے وجود وچ اوہ

گئی پا دتی کہ فیر نندا اُستت دیاں وڈیاں وارداتاں وچوں گزرن ویلے وی، من تھاویں رہیا۔ جے کدے گھڑی ڈولیا وی، تاں اگلے پل تھاویں ہو گیا۔

اک گھٹنا ہور سی، جو اج وی میرے لئی رہس وچ لپٹی ہوئی ہے۔ عمر شاید ستاں کو ورھیاں دی ہووے گی کہ لاہور دے چونا منڈی والے مکان وچ جو سبھ توں وڈا کمرا سی، میرے پتا کئی پُراچین کھرڑیاں نوں وچھا کے، اوتھے بہندے سن۔ تے اوہناں دے کئی حصے کسے کاتب نوں بلا کے، بڑی خش خطی نال کاپی کرواندے سن۔ اک دن میں اوتھے ننگے سر چلی گئی، تاں پتا نے چپیڑ ماری۔ اوہناں دا حکم سی، کہ اوس کمرے وچ سبھ نے سر ڈھک کے آونا ہے۔ اوہناں دی نظر وچ اوہ کتاباں دا ادب رکھن والی گل سی۔ اوس ویلے میں ایہ چپیڑ چپ کر کے جر لئی۔ پر لگدا ہے، جو جریا سی، اوہ میرے من کولوں جریاں نہیں سی گیا۔ کجھ ای گھنٹیاں پچھوں تیز بخار ہو گیا۔ ماں ٹھنڈے پانی دیاں پٹیاں سر تے رکھدی پئی سی۔ جس ویلے میں تڑپ کے ماں دے مونہہ ول ویکھیا سی، تے آکھیا سی۔ اج جہڑیاں کتاباں لئی مینوں چپیڑ ماری اے، ایہو جہیاں میں آپے لکھ سکدی ہاں۔۔۔۔

ایہ قیامتی حرف میری زبان تے جس طرحاں آئے سن، میں اج تک نہیں جاندی۔

فیر کجھ ورھیاں پچھوں اک گھٹنا واپری، جہنے میرے پتا دی زندگی وچ اک موڑ لے آندا۔ اوہ سکھ اتہاس دیاں وارداتاں لکھدے تے سناندے ہوندے سن۔ تے اوسے اتہاس نوں پرسارن لئی، اک وار وتوں ودھ پیسے خرچ کے، کجھ سلائیڈز بنوائے۔ اک پروجیکٹر لیا، تے اک وڈی ساری سکرین جہنوں دیوار تے لا کے، اوہ سلائیڈ ویکھے تے وکھائے جا سکدے سن۔ اوہناں ساریاں چتراں دی جو ویاکھیا کرنی ہوندی سی، پتا جی بول کے کردے سن۔

گھٹنا ایہ ہوئی کہ اِک وار اوہناں نے اک گردوارے دی دیوار اُتے سکرین لا کے، بھری سنگت نوں اوہ سلائیڈ وکھائے۔ لوک گرو پریم وچ بجھے ہوئے، ویکھ رہے سن کہ بھیڑ وچوں دو نہنگ سکھ اُٹھ کھلوتے کہ گردوارے وچ ایہ سنیما نہیں چلے گا۔۔۔۔

اوس ویلے میں وی اوتھے ساں، پتا جی نال لے گئے سن۔ چھوٹی جہی نوں۔ ویکھیا۔ پتا جی چپ دے چُپ ہو گئے سن۔ اِک آدمی پتا جی نال گیا سی۔ اوس سامان والے کالے ٹرنک نوں چکن رکھن لئی۔ سو پتا جی نے اوہنوں سارا سامان ٹرنک وچ پا کے، بند کرن لئی آکھیا تے چھیتی نال میرا ہتھ پھڑ کے، مینوں سنبھالدے، اوہ بھیڑ وِچوں نکل کے باہر آ گئے۔۔۔۔۔

ایہ گھٹنا سی کہ اوس توں بعد پتا جی نے اِک خاموشی اختیار کر لئی۔ سکھ اتہاس بارے جو لیکچر دیندے سن، چھڈ دِتے۔ اوہناں دا آکھیا اکو فقرا سی۔ 'کسے مورکھ نال بحث نہیں ہو سکدی۔'

اوہ کالا ٹرنک فیر کدی نہیں کھولھیا گیا۔ جدوں پتا جی لاہور چھڈ کے بہار چلے گئے، شاید 1945 وچ، کہ اوتھے کجھ زمین خرید کے، اوہ آپنی اک کٹیا پا لین گے، تاں اوہ کالا ٹرنک اوسے طرحاں بند دا بند، پچھے لاہور والے مکان وچ پیا رہیا۔ فیر 1947 وچ لاہور چھڈدے ویلے، ایس طرحاں میرا سبھ کجھ اوس مکان وچ رہ گیا، اوسے طرحاں اوہ کالا ٹرنک وی۔ ایسے گھٹنا نے، ظاہرا طور تے میرے پتا دا من اُپرام کر دتا سی، اوہناں دی زندگی دا راہ بدل دتا سی۔ پر کدے سوچدی ہاں، تاں لگدا ہے، کہ ایس گھٹنا نے مینوں کنیاں وختاں توں بچا لیا۔

میں کدے وی وقتی طور تے جذباتی ہو کے، کسے سنستھا (تنظیم) نال نہیں جُڑ سکی۔ کئی وار ویلے آئے، کانگرس نال جڑن دی پیشکش ہوئی، فیر کمیونسٹ پارٹی نال، تے فیر جدوں راج سبھا دی ممبر ساں، اِک دن جنرل اروڑا نے پچھیا۔ کیہ میں کانگریس دی ممبر ہاں؟ میں کہیا نہیں، تاں اوہناں نے سکھ منچ نال جڑن دی پیشکش کیتی۔ ایہ وی آکھیا کہ مینوں آپنے اظہار لئی بہت وڈا منچ ملے گا۔ میں ہس پئی، آکھیا۔ نہیں جنرل صاحب، مینوں کوئی منچ نہیں چاہیدا۔ میں کسے سنستھا نال نہیں جڑ سکدی۔

(لپی انتر: جمیل احمد پال)

امرتا پریتم
گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم

ہم سب غدار ہیں

میں نہیں جانتی۔ دنیا میں پہلی سیاسی جماعت کون سی تھی اور وقت کا وہ کون سا دباؤ تھا جس کے باعث اسے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونا پڑا تھا۔۔۔ اسی طرح میں یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کون سی ایسی شے تھی جس کی لوگوں کو ضرورت تھی اور کس پہلے منافع خور نے اسے گوداموں میں چھپا دیا تھا۔ لیکن ایک بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اتنی تیکنیکی ترقی کے ہوتے ہوئے بھی' یہ ایسا دور ہے جب انسانی رشتے زمین دوز ہوگئے ہیں۔

ایک مرد اور عورت کے انتہائی نجی رشتے سے لے کر' انسان اور اقتدار کے رشتے تک میں ایک ایسا تعلق ہوتا ہے جو ایک بہت ملائم اور خوبصورت چیز ہوسکتا تھا اور وہی تعلق آج انگ انگ کو زخمی کرتا کسی سے پہچانا نہیں جا رہا۔۔۔

اگرچہ شادیاں آج بھی جشن کے انداز میں کی جاتی ہیں' انتخابات آج بھی ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ لڑے جاتے ہیں اور وفاداری کی قسمتیں آج بھی اسی سجاوٹی رسموں کے ساتھ کھائی جاتی ہیں لیکن گھروں کی سیج بھی اسی طرح چپ اور اداس ہے جیسے حکومتی کرسیاں۔ سیجوں اور کرسیوں نے جیسے اپنی اپنی قسمت کے آگے ہار مان کر سر جھکا دیا ہے۔

پتہ نہیں کس نے کس پر وار کیا ہے۔ کوئی چیز ہر جگہ مر رہی ہے اور ہوا' جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' میں ایک عجیب سی باس بھر گئی ہے اور کوئی چیز بہت زور سے ہنس رہی ہے۔۔۔ یہ نصب العین کی ہنسی ہے۔ لیکن کیسی! لگتا ہے اس کی جون بدل گئی ہے اور اس گناہ گار ''نصب العین'' کی ہنسی بہت بھیانک ہوگئی ہے۔ کوئی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اپنی کمائی لٹاتا ہے۔ علم کی خاطر نہیں بلکہ اس وسیلے کی خاطر جہاں لگائے ہوئے

سرمائے کو ضربیں دے کر لوٹا جا سکے۔ کوئی دوستیاں گانٹھتا ہے، کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے لیے نہیں یا تبادلہ خیالات کی خاطر نہیں بلکہ دوسروں کے وسائل پر پاؤں رکھ کر آگے قدم بڑھانے کے لیے۔ شادی کی سیج بھی تن اور من کی سانجھ کے لیے نہیں ہوتی۔۔۔ خواہ یہ عمل کسی بھی ''نصب العین'' کے لیے ہو اور یا پھر صرف اس لیے کہ عورت کا قانونی۔ بیسوا بننا معاشرے کی ساخت میں شامل ہے۔

زندگی کے بہت سے میدان ہیں جہاں روزمرہ کا انسانی واسطہ، زندگی کی ضرورتوں کا حصہ ہے۔ لیکن ہر واسطہ شک سے بھرا ہوا ہے اور ہر چیز بکاؤ ہے۔۔۔ انصاف سے لے کر انسان تک!

تالیوں کی گونج ابھی کانوں میں تازہ ہوتی ہے کہ ''نصب العین'' کا روپ بدل جاتا ہے۔ کل کی ہار، آج کی جیت بنتی ہے تو ''بغاوت'' جیسا لفظ اسی لمحے ''بدلہ'' قرار پاتا ہے۔

ایک رومانین نظم میرے سامنے ہے، جس میں مستقبل کے بارے میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب ہر چیز کاغذ کی بن جائے گی۔ انسانی چیخیں کاغذ کے سانپوں کی طرح رینگیں گی اور دھرتی کباب کھا کر ان لوگوں سے ہاتھ پونچھے گی جو پیپر نیپکن بن چکے ہوں گے۔ وہ دن آ گیا ہے۔۔۔

اس وقت میں انتھونی کوئین کی خودنوشت سوانح حیات پڑھ رہی ہوں اور اس ساری صورت حال میں اس کی چیخ سن رہی ہوں۔۔۔ ''ہم سب غدار ہیں کیونکہ ہم پیار کرنا بھول گئے ہیں۔''

اگرچہ یہ بات سچ ہے کہ یہ انسانی قدروں کی حتمی موت نہیں لیکن صورت حال کی گراوٹ یہ ہے کہ قدریں خوف زدہ ہو کر کہیں چھپ گئی ہیں اور اس موت جیسی کسی نہ کسی انتھونی کوئین کی چیخ سنائی دے رہی ہے۔۔۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ: احمد سلیم

مصور امروز کا فن اور شخصیت

(امروز سے امرتا پریتم کا انٹرویو)

امرتا:- امروز! ہلوں' کدالوں والے گھرانے میں جنم لے کر آپ نے کھیتوں کے اوزار تھامنے کی بجائے ہاتھوں میں رنگ اور بُرش کیسے لے لیے؟

امروز:- یہ بھی ہل ہی چلا رہا ہوں۔۔۔ خیالوں کی زمین پر۔ بچپن میں گھر میں ہر وقت ڈرائنگ کرتا رہتا تھا' حالانکہ سکول میں ڈرائنگ نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ شروع میں جن چیزوں کی ڈرائنگ کی' وہ سب کھیتوں اور ہل' کدالوں سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔

امرتا:- آپ عورت کی ڈرائنگ کے ماہر ہیں' کیا عورت کا بنیادی تصور کھیتوں میں روٹی لے کر جانے والی عورت کا تھا؟

امروز:- نہیں' جب ہلوں کدالوں کی ڈرائنگ کرتا تھا' تب عورت کی ڈرائنگ نہیں کرتا تھا۔ ہل کدال بھی میرا سپنا نہیں تھا۔۔۔ وہ صرف 'آبجیکٹ' تھے۔

امرتا:- سارے فنکار حقیقت کی وضاحت الگ الگ ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ حقیقت کو نئے زاویے سے دیکھنے کا نام بھی حقیقت ہوتا ہے' حقیقت میں سے پھر حقیقت کی تعمیر بھی حقیقت ہوتی ہے۔ کچھ کے لیے 'ایبسٹریکشن' بھی ان کی حقیقت ہوتی ہے۔ اور کچھ کے لیے کسی سپنوں کا رنگوں اور لکیروں میں ظاہر ہونا بھی حقیقت ہوتی ہے۔ امروز! آپ حقیقت کی کیا تشریح کرتے ہیں؟

امروز:- میرے مطابق ہر حقیقت ایک نئی حقیقت کو جنم دیتی ہے۔ وہ شاید عام آنکھ کی پکڑ میں نہیں آتی'

مگر اسے فنکار کی نظر ضرور پہچان لیتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے، جیسے کسی 'فلاسفر' کو آج میں سے کل بھی نظر آ جاتا ہے۔ یہاں میں پابلو پکاسو کے 'بلز ہیڈ' کی مثال دے سکتا ہوں۔۔ ایک 'ٹرائی سائیکل' کا ہینڈل ہے، اور ایک اس کی گدی۔ اس نے گدی کو ہینڈل کے درمیان میں لٹکا کر بیل کے سر کی شکل بنا دی۔ 'ٹرائی سائیکل' کی حقیقت میں سے اس نے بیل کے سر کی حقیقت نکال لی۔ یہ تصور کا سفر ہے۔

امرتا:- تو' باہری چیزوں سے جب اندر کی نظر ملتی ہے، تب کئی نئی شکلیں جنم لیتی ہیں، نئی حقیقتیں۔ مگر یہ بتائیں کہ آپ اپنے فن کے ناظرین کو کیا احساس دینا چاہتے ہیں۔ خوبصورت کھڑے ہوئے لمحوں کے چین کا یا حرکت کی بے چینی کا؟

امرتا:- حرکت کی اور سوچ کی بے چینی کا۔

امرتا:- کینوس کو رنگوں اور ہاتھوں کے سامنے رکھنے سے پہلے آپ۔۔۔ 'پنسل سکیچ' بناتے ہیں' یا صرف ذہنی 'سکیچ'؟

امروز:- دونوں۔

امرتا:- امریکن مصور آئیوان البرائیٹ اپنی ایک پینٹنگ پر بیس سال کام کرتے رہے تھے' اور ان کے لفظوں میں وہ ساری دنیا کی سیاحت تھی۔ کیا آپ کو بھی کسی ایک پینٹنگ نے ایسے کئی برس باندھے رکھا ہے؟

امروز:- عورت کی ڈرائنگ کرتے ہوئے مجھے تیس برس ہو گئے ہیں۔ مہارت کے ساتھ میں بڑی جلدی عورت کے نقش و نگار تو خوبصورت بنا لیتا تھا۔ مگر اس کا غور و فکر اس کے ماتھے میں بھرنے میں بہت برس لگ گئے۔ سینکڑوں تصویریں بنا کر بھی میں عورت کی تصویر کو 'ایک تصویر' کہہ سکتا ہوں' جس پر میں نے تیس برس لگا دیئے ہیں۔ وہ تصویر اب اس برس بنی ہے۔۔۔

امرتا:- کون سی؟

امروز:- میرے کمرے میں ایک پینٹنگ ہے' وہی۔

امرتا:- جس میں عورت ایک ساز کی شکل میں ہے اور اس کا بدن ایسے ہے جیسے ساز کے تار سُر کیئے ہوئے ہوں۔۔۔

امروز:- ہاں' وہ پینٹنگ صرف ایک ہی لائن کی پینٹنگ ہے۔۔ عورت' خیال کی شکل میں بھی' ساز کی شکل میں بھی۔

امرتا:۔ تو پچھلے تیس سالوں سے عورت آپ کے فن کی 'تھیم' ہے۔ آپ نے کبھی ان تیس سالوں میں اس 'تھیم' کی گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہا؟

امروز:۔ میں اس 'تھیم' کی گرفت میں نہیں ہوں' اس کے ساتھ چل رہا ہوں۔ ہم دونوں چل رہے ہیں۔ ہمسفروں کی طرح۔

امرتا:۔ کئی آرٹسٹوں کے خیال میں کسی کا 'پورٹریٹ' بنانا شادی کرنے جیسا ہوتا ہے۔ ماڈل سے عجیب سا اپناؤ پیدا ہو جاتا ہے' اور 'پورٹریٹ' کبھی اچھی بنتی ہے' کبھی خراب بھی' جیسے شادی کامیاب بھی ہو سکتی ہے' ناکام بھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

امروز:۔ میں نے زندگی میں صرف ایک ہی 'پورٹرے' بنائی ہے' ایک ہی شخص کی' اور میرے تجربے میں یہ شادی نہیں' عشق ہے۔ اب میں اس کو بغیر دیکھے بھی اس کا 'پورٹریٹ' بنا سکتا ہوں۔

امرتا:۔ مگر عشق بھی تو دیوی بیاہ ہوتا ہے' کیوں؟ نہیں؟

امروز:۔ اگر بیاہ کے ساتھ دیوی لفظ آ سکتا ہے' تو بڑی خوشی سے عشق کو بیاہ کہہ لو۔ پھر یہ بیاہ بھی زہے قسمت!

امرتا:۔ کئی مصوروں کے لیے کوئی خاص رنگ بڑا لاڈلا ہوتا ہے' کوئی ایسا ہی رنگ آپ کو بھی خاص طور سے اپنی طرف کھینچتا ہے؟ جیسے کالڈر کہتا ہے کہ لال رنگ اسے اتنا اچھا لگتا ہے کہ اس کا دل کرتا ہے کہ وہ ہر چیز کو لال رنگ میں رنگ دے۔۔۔

امروز:۔ دھوپ کا رنگ مجھ پر اتنا چھایا رہتا ہے کہ میرا جی کرتا ہے۔ ہر چیز دھوپ رنگی کر دوں۔۔۔

امرتا:۔ آپ نے آج تک اپنی تصویروں کی نمائش بھی نہیں کی' کیوں؟

امروز:۔ دو چیزوں کے لیے نمائش کی جاتی ہے۔۔ ایک' دوسروں کی رائے لینے کے لیے' اور دوسری' تصویروں کو بیچنے کے لیے۔ کسی کی رائے کی مجھے ضرورت نہیں' مجھے اپنی رائے پر یقین ہے۔ اور تصویریں میں بیچنے کے لیے بناتا نہیں۔ پھر میں نمائش کیوں کروں؟ ویسے مجھے نمائش لفظ پر بھی اعتراض ہے۔

امرتا:۔ کیوں؟

امروز:۔ کیونکہ اس لفظ کی رُوح میں ہماری اپنی رُوح کی تہذیب نہیں ہے۔ کوئی انسان خوبصورتی کا مجسمہ ہو خدا کی نعمت ہے' مگر اسے 'شوکیس' میں کھڑا کر دیا جائے' یہ میری آنکھوں کو قبول نہیں ہوتا۔

مگر اسے فنکار کی نظر ضرور پہچان لیتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے' جیسے کسی 'فلاسفر' کو آج میں سے کل بھی نظر آ جاتا ہے۔ یہاں میں پابلو پکاسو کے 'بلز ہیڈ' کی مثال دے سکتا ہوں۔۔ ایک 'ٹرائی سائیکل' کا ہینڈل ہے' اور ایک اس کی گدی۔ اس نے گدی کو ہینڈل کے درمیان میں لٹکا کر بیل کے سر کی شکل بنا دی۔ 'ٹرائی سائیکل' کی حقیقت میں سے اس نے بیل کے سر کی حقیقت نکال لی۔ یہ تصور کا سفر ہے۔

امرتا:- تو' باہری چیزوں سے جب اندر کی نظر ملتی ہے' تب کئی نئی شکلیں جنم لیتی ہیں' نئی حقیقتیں۔ مگر یہ بتائیں کہ آپ اپنے فن کے ناظرین کو کیا احساس دینا چاہتے ہیں۔ خوبصورت کھڑے ہوئے لمحوں کے چین کا یا حرکت کی بے چینی کا؟

امرتا:- حرکت کی اور سوچ کی بے چینی کا۔

امرتا:- کینوس کو رنگوں اور ہاتھوں کے سامنے رکھنے سے پہلے آپ۔۔۔ پنسل سکیچ' بناتے ہیں' یا صرف ذہنی سکیچ'؟

امروز:- دونوں۔

امرتا:- امریکن مصور آئیوان البرائیٹ اپنی ایک پینٹنگ پر بیس سال کام کرتے رہے تھے' اور ان کے لفظوں میں وہ ساری دنیا کی سیاحت تھی۔ کیا آپ کو بھی کسی ایک پینٹنگ نے ایسے کئی برس باندھے رکھا ہے؟

امروز:- عورت کی ڈرائنگ کرتے ہوئے مجھے تیس برس ہو گئے ہیں۔ مہارت کے ساتھ میں بڑی جلدی عورت کے نقش و نگار تو خوبصورت بنا لیتا تھا۔ مگر اس کا غور و فکر اس کے ماتھے میں بھرنے میں بہت برس لگ گئے۔ سینکڑوں تصویریں بنا کر بھی میں عورت کی تصویر کو' ایک تصویر' کہہ سکتا ہوں' جس پر میں نے تیس برس لگا دیئے ہیں۔ وہ تصویر اب اس برس بنی ہے۔۔۔

امرتا:- کون سی؟

امروز:- میرے کمرے میں ایک پینٹنگ ہے' وہی۔

امرتا:- جس میں عورت ایک ساز کی شکل میں ہے اور اس کا بدن ایسے ہے جیسے ساز کے تار سُر کیئے ہوئے ہوں۔۔۔

امروز:- ہاں' وہ پینٹنگ صرف ایک ہی لائن کی پینٹنگ ہے۔۔ عورت' خیال کی شکل میں بھی' ساز کی شکل میں بھی۔

امرتا:۔ تو پچھلے تیس سالوں سے عورت آپ کے فن کی 'تھیم' ہے۔ آپ نے کبھی ان تیس سالوں میں اس 'تھیم' کی گرفت سے آزاد ہونا نہیں چاہا؟

امروز:۔ میں اس 'تھیم' کی گرفت میں نہیں ہوں'اس کے ساتھ چل رہا ہوں۔ ہم دونوں چل رہے ہیں۔ ہمسفروں کی طرح۔

امرتا:۔ کئی آرٹسٹوں کے خیال میں کسی کا 'پورٹریٹ' بنانا شادی کرنے جیسا ہوتا ہے۔ ماڈل سے عجیب سا اپناؤ پیدا ہو جاتا ہے' اور 'پورٹریٹ' کبھی اچھی بنتی ہے' کبھی خراب بھی' جیسے شادی کامیاب بھی ہو سکتی ہے' ناکام بھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

امروز:۔ میں نے زندگی میں صرف ایک ہی 'پورٹرے' بنائی ہے' ایک ہی شخص کی' اور میرے تجربے میں یہ شادی نہیں' عشق ہے۔ اب میں اس کو بغیر دیکھے بھی اس کا 'پورٹریٹ' بنا سکتا ہوں۔

امرتا:۔ مگر عشق بھی تو دیوی بیاہ ہوتا ہے' کیوں؟ نہیں؟

امروز:۔ اگر بیاہ کے ساتھ دیوی لفظ آ سکتا ہے' تو بڑی خوشی سے عشق کو بیاہ کہہ لو۔ پھر یہ بیاہ بھی زہے قسمت!

امرتا:۔ کئی مصوروں کے لیے کوئی خاص رنگ بڑا لاڈلا ہوتا ہے' کوئی ایسا ہی رنگ آپ کو بھی خاص طور سے اپنی طرف کھینچتا ہے؟ جیسے کالڈر کہتا ہے کہ لال رنگ اسے اتنا اچھا لگتا ہے کہ اس کا دل کرتا ہے کہ وہ ہر چیز کو لال رنگ میں رنگ دے۔۔۔

امروز:۔ دھوپ کا رنگ مجھ پر اتنا چھایا رہتا ہے کہ میرا جی کرتا ہے۔ ہر چیز دھوپ رنگی کر دوں۔۔۔

امرتا:۔ آپ نے آج تک اپنی تصویروں کی نمائش بھی نہیں کی' کیوں؟

امروز:۔ دو چیزوں کے لیے نمائش کی جاتی ہے۔۔ ایک 'دوسروں کی رائے لینے کے لیے' اور دوسری' تصویروں کو بیچنے کے لیے۔ کسی کی رائے کی مجھے ضرورت نہیں' مجھے اپنی رائے پر یقین ہے۔ اور تصویریں میں بیچنے کے لیے بناتا نہیں۔ پھر میں نمائش کیوں کروں؟ ویسے مجھے نمائش لفظ پر بھی اعتراض ہے۔

امرتا:۔ کیوں؟

امروز:۔ کیونکہ اس لفظ کی رُوح میں ہماری اپنی رُوح کی تہذیب نہیں ہے۔ کوئی انسان خوبصورتی کا مجسمہ ہو' خدا کی نعمت ہے' مگر اسے 'شوکیس' میں کھڑا کر دیا جائے' یہ میری آنکھوں کو قبول نہیں ہوتا۔

امرتا:- پھر فن ناظرین تک کیسے پہنچے؟

امروز:- یہ خوبصورتی کا عمل نہیں ہے کہ وہ ناظرین کو ڈھونڈتی پھرے' یہ ناظرین کا عمل ہے کہ وہ خوبصورتی کو ڈھونڈیں۔

امرتا:- جیسے سنگیت کار اپنے سازوں کو پوجا کی حد تک عزت دیتے ہیں' ساز کھولنے سے پہلے اسے سلام تک کرتے ہیں یا مصنف لکھے ہوئے کاغذوں پر پاؤں نہیں آنے دیتے' اسی طرح آپ کی مصوری کے کاروبار میں بھی آپ کے رنگوں اور برشوں کے لیے خاص عزت کی کوئی رسم ہے؟

امروز:- ماحول کا ادب اور کام کرنے کی جگہ کی پاکیزگی میرے لیے ضروری ہے اور آرٹسٹوں کے بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ ہاں! کاریگروں میں یہ ادب نسل در نسل پلتا آرہا دکھائی دیتا ہے۔ 1950 کی ایک بات بتاتا ہوں۔۔

میں ایک آرٹسٹ کے یہاں کام کرتا تھا' بمبئی میں کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ وہاں عورتیں لے آتا ہے۔ ایک دن میں نے اسے ایک عورت کو لاتے دیکھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ شام کو جاتے وقت میں نے اسے کہا کہ وہ کام کے وقت عورتیں نہ لائے۔ کام کے گھنٹے کام کو وقف ہونے چاہیں' ایک دل سے۔ مگر دل سے۔ مگر میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی' نہ میرا ادب' اور نہ کام کی جگہ کے متعلق میرا نظریہ۔ وہ عورتیں پھر بھی آتی رہیں۔ آخر ہار کر میں نے اس آرٹسٹ کو ایک دن سوچنے کی مہلت دی' کہا کہ اگر وہ کام کے وقت میں آئیں تو میں کل سے کام پر نہیں آؤں گا۔ مگر اس دن بھی وہ عورتوں کو وہاں لے آیا تھا اور میں پھر اگلے دن سے کام پر نہیں گیا۔

امرتا:- ذہنی تصور کو باہر اتارنے کے لیے آپ رنگ' کینوس' لکڑی' کئی طرح کی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں' کبھی اس سے الٹ تجربہ بھی ہوا ہے کہ کسی طرح کے 'میٹریل' نے آپ سے اپنی ضرورت کے مطابق کسی شکل وساخت کی مانگ کی ہو؟

امروز:- بالکل ہوا ہے۔ میں جب بھی 'ٹائم پیس' کو دیکھتا تھا' ہمیشہ اس میں کچھ۔۔ خالی پن دکھائی دیتا تھا۔ ایک دن نہ جانے کس طرح میں نے 'ٹائم پیس' کو دیکھا' اور اس نے مجھے اور میں نے اس میں دو وقت اکٹھے کردیئے۔ ایک جس کا اشارہ دینے کے لیے دو سوئیاں تھیں' اور دوسرا' ایک نظم' جس کے لفظ اس کے خیال کی رفتار بتاتے تھے۔۔۔ اور اس طرح میں نے اس کا خالی پن نظم کے خیال سے بھر دیا۔

امرتا:۔یہ تجربہ صرف ایک دفعہ ہوا؟

امروز:۔اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ہوا تھا۔ میں ایک نئی 'کینوس' گھر لا رہا تھا' راستے میں اس سے کوئی چیز ٹکرا گئی اور وہ ایک جگہ سے تھوڑی سی پھٹ گئی۔ میں نے کئی دن تک وہ 'کینوس' ایک طرف ڈال رکھی۔ پھر محسوس ہونے لگا کہ اس 'کینوس' کی پھٹی ہوئی جگہ میری طرف دیکھتی ہے۔۔۔ مجھ سے کوئی نیا وجود مانگتی ہے۔ میں نے اس پھٹی ہوئی جگہ پر پت جھڑ کا ایک زرد پتہ بنا دیا' جو ہوا میں اکیلا اڑتا ہوا سا بیچ سے پھٹ گیا ہو۔۔۔ باقی ساری 'کینوس' پر خالی پن اور ویرانی پینٹ کر دی۔۔۔

امرتا:۔ پنجاب نے مصوری کا 'میوزیم' بنایا ہے' پنجاب کے فنکاروں کے شاہکار حفاظت سے رکھنے کے لیے۔ اس میں آپ کی کوئی چیز بھی نہیں ہے' کیوں؟

امروز:۔انجمن کوئی بھی ہو اس کا عمل فن کو پیار کرنا نہیں ہوتا' 'پیٹرنائیز' کرنا ہوتا ہے۔ وہ فنکاروں کو اپنا فخر نہیں سمجھتیں' انہیں فخر عطا کرنا چاہتی ہیں۔۔ بخشش کی طرح۔ اس لیے وہ کبھی فنکار کے پاس چل کر نہیں آتیں' ہمیشہ چاہتی ہیں کہ فنکار ان کے پاس چل کر آئے۔ افسر شاہی خوشامد پسند ہوتی ہیں آرٹ پسند نہیں۔

امرتا:۔ مگر بہت سے فنکار انجمنوں سے لیے ہوئے تمغے اور 'ایوارڈ' بڑے فخر سے دکھاتے ہیں۔

امروز:۔ہاں' فخر والا حصہ تو دکھاتے ہیں' مگر بے عزتی والا نہیں۔ تمغے دکھاتے ہیں' مگر یہ نہیں بتاتے کہ یہ کیسے لیے؟ ویسے بھی افسر شاہی سے بے عزتی کروا کر لی ہوئی عزت' عزت کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ خاص کر اپنی نظر میں؟

امرتا:۔ فن کے تنقید نگاروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

امروز:۔ بہت سے تو گملوں میں لگے ہوئے بڑ کے پیڑ ہوتے ہیں۔۔ ڈیڑھ فٹے قد آور چیزوں کے دشمن۔

امرتا:۔' آرٹ کریٹک' تو بڑے' ہائی براؤ' ہوتے ہیں۔۔۔

امروز:۔ہاں' اکثر ہوتے ہیں' مگر ماتھے کے بغیر' ہائی براؤ'۔۔۔

امرتا:۔ آرٹسٹوں کی زندگی میں وقتی لگاؤ بہت آتے ہیں۔۔' افیئرز' یہ کیوں ہوتا ہے؟ آپ کی نظر میں محبت کے لفظ کا کیا تجزیہ ہے؟

امروز:۔ محبت کا مطلب جب تک صرف 'جیتنا' ہوگا' تب تک یہی ہوتا رہے گا۔ وقتی لگاؤ۔۔۔ بار بار

جیتنے کا عمل ہوتا ہے' کیونکہ ایک بار جیتنے کے بعد جیتنے کے معنی ختم ہو جاتے ہیں' جیتی ہوئی چیز ملکیت ہو جاتی ہے' کسی کونے میں بیکار پڑی ہوئی۔ میرے خیال میں محبت کسی کو جیتنا نہیں' کسی کو پانا ہے۔ جیسے کوئی اپنے آپ کو پاتا ہے' اپنی نت نئی خواہشات کو جان کر' اسی طرح دوسرے کو پانا ہوتا ہے' اس کے اندر کی 'پاسبلیٹیز' کو کھوج کر' پہچان کر' آرٹسٹ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ وہ خود محبوب ہونا چاہتا ہے مگر عورت کو یا بیوی بنالیتا ہے' یا رکھیل' اسے محبوبہ نہیں بناتا۔ یہ نظر کا مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں محبوب صرف نظر نہیں ہوتا' نقطۂ نظر ہوتا ہے۔۔۔ محبت ایک دوسرے کی زمین میں اگنا ہوتا ہے' اگنا اور کھلنا۔۔۔

امرتا:- امروز' شخصیت کے ارتقاء کو آپ نے دھرتی کے پیداواری عمل سے جوڑا ہے۔۔۔ یہ شاید کسانی نظریہ ہے۔ اس نظریے کو دیکھ کر سوچتی ہوں۔۔۔ اگر سارے فنکار کسان خاندان سے آتے تو شاید فن کے ساتھ فن کی شخصیت بھی۔۔۔ کھل جاتی۔۔۔ مگر یہاں ایک سوال اور اٹھتا ہے کہ دوسرے کی زمین میں اگر خود کے اگنے کی توقع نہ رہے' تب؟

امروز:- میں نے یہ کب کہا ہے کہ ہر زمین میں ہر بیج اگ سکتا ہے اور پھل سکتا ہے۔ ہر بیج کے لیے مناسب زمین ہوتی ہے' کوئی سی زمین نہیں۔ محبت اسی مناسب زمین کی تلاش اور پہچان کا نام ہے۔۔۔

امرتا:- میرا مطلب تھا کہ جسے آپ نے بیج کے لیے زرخیز زمین سمجھا ہو اگر وہ زرخیز نہ نکلے' تب؟

امروز:- تب وہ زمین بدل لے۔ جسے خود کے ارتقاء کا عشق ہے' اسے زرخیز دھرتی کھوجنی پڑے گی۔ گھاس پھوس تو کہیں بھی اگ آتا ہے۔ ایک سوال تو یہ ہے۔۔۔ زرخیز دھرتی کھوجنے کا۔ یہ ہی اصل میں محبت کی تلاش ہوتی ہے۔ اور دوسرا بڑا سوال ہے۔۔۔ بیج کو ثابت رکھنے کا۔ شاید اس بات پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا کہ کچھ بھی اگانے کے لیے سالم بیج بیجنا ہوتا ہے۔ بیج کے ٹکڑے کر دو تو کوئی ٹکڑا نہیں اگتا۔ فنکار جب چھوٹے چھوٹے 'افیئرز' میں بٹ جاتا ہے' اس کا 'خود' کبھی نہیں اگ پاتا۔

امرتا:- 'مینٹل اینٹی گریشن' کے بارے میں دنیا میں کئی 'کانفرنسز' ہو چکی ہیں' مگر اسے لے کر شاید کبھی بھی' اتنے سادے لفظوں میں 'ڈیفائن' نہیں کیا گیا۔۔۔ مگر ایک سوال اور' طبیعت میں کبھی کوئی بے بسی جیسی چیز محسوس کی ہے آپ نے؟

امروز:- کام میری بے بسی ہے۔

امرتا:- کام وجود کی بے بسی ہوتا ہے۔ وہ ہر سچے فنکار کی بے بسی ہے' مگر میرا مطلب تھا کہ عام چیزوں

میں سے کوئی چیز بے بسی کا درجہ لے سکتی ہے؟

امروز:-انگور۔۔ مجھے موسم کے بڑھیا انگور کہیں دکھائی دے جائیں۔۔۔

امرتا:- پھر میرا خیال ہے' آدم کے نام کے ساتھ سیب کھانے کا جو واقعہ دہرایا جاتا ہے' سیب کی جگہ انگوروں کو بھی دی جا سکتی ہے۔

امروز:- میرے متعلق ضرور دی جا سکتی ہے۔

امرتا:-فنِ جدید کے بارے میں اور کچھ کہنا چاہیں گے؟

امروز:-یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ فن میں آنے سے پہلے زندگی میں آنی چاہیے' زندگی کے غور و فکر میں۔ تب ہی وہ فن میں فطری ہو سکتی ہے۔ آج کے فن میں جو جدت دکھائی دیتی ہے' وہ قدرتی نہیں ہے۔۔۔۔وہ بالکل ایسے ہے۔ جیسے' کینوس' کی جگہ بان کی چارپائی کو دیوار پر لٹکا کر اس کا بان درمیان میں۔ سے توڑ دیا گیا ہو' اور نیچے اس' پینٹنگ' کا نام لکھ دیا گیا ہو' باڈی اینڈ سول'۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

ہندی سے ترجمہ: شبنم شکیل

سیاہ حاشیہ

میرا بیٹا کچھ عرصے سے بیمار تھا اور اسے اس حالت میں چھوڑ کر ملازمت پر جانا بہت حوصلے کی بات تھی۔ کام پر جانے کی مجبوری یہ تھی کہ میں آل انڈیا ریڈیو پر روزانہ ''اجرت'' کی بنیاد پر ملازم تھی۔ اگر ایک دن نہ جاتی تو اس دن کا معاوضہ کاٹ لیا جاتا تھا۔ جس روز کی میں بات کر رہی ہوں اس روز مجھے بچے کے لیے کچھ دوائیں خریدنی تھیں اور دوائیں مہنگی بھی بہت تھیں۔ ادھر بچہ مصر تھا کہ گھر پر رہوں۔ اسے ذرا تسلی دینے کے لیے میں دہلیز سے پھر واپس آ گئی تو ڈاکیے نے مجھے دو (2) خط لا کر دیئے۔ بچے نے جب مجھے دوبارہ بیٹھ کر خط پڑھنے میں مصروف دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔

ایک خط تو میرے کسی خیر خواہ کا تھا' جس نے لکھا تھا کہ امرتا مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہاری کتاب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل نہیں کی گئی۔ تم جانتی ہو کہ یہاں میرٹ کی بنیاد پر تو کوئی کام ہوتا نہیں' ہر جگہ سفارش چلتی ہے۔ میں تو تمہاری اصول پرستی کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ تم ایسے مسئلوں میں خود ارباب اختیار سے بات کیوں نہیں کرتیں۔ خط پڑھ کر جو شدید مایوسی مجھے ہوئی اسے برداشت کرنا ذرا مشکل مرحلہ تھا۔ بہر حال میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ لفافہ اپنے بچے کو دیا اور اسے مصروف رکھنے کے لیے کہا کہ وہ اس پر سے ٹکٹ اتارے۔

دوسرا خط سعادت حسن منٹو کی طرف سے تھا۔ جنہوں نے لکھا تھا' امرتا میں زندگی میں دو مرتبہ رویا ہوں۔ ایک دفعہ جب میرے بیٹے کا انتقال ہوا اور دوسری دفعہ۔۔۔ تمہاری نظم پڑھ کر کہ وہ نظم کہ جس میں تم نے کہا ہے کہ ''بچے چاند کو چندا ماموں کہتے ہیں اس لیے کہ وہ چمکتا ہے۔ مگر اب چاند کی روشنی ایسی جگہوں پر ماند پڑتی جا رہی ہے کہ جہاں لوگ غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔'' منٹو کے خط کو پڑھ کر میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا

پھاکا محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میری کتاب کی ہزاروں کا پیاں بک چکی ہیں، جیسے مجھے ملازمت پر مستقل کر دیا گیا ہے۔ جیسے میرے بچے کا بخار یکدم اتر گیا ہے۔ یہ 1955 کی بات ہے۔ دوسرے دن میں نے منٹو کو خط لکھا۔ مگر اس کا جواب موصول ہونے سے پہلے میں نے سن لیا کہ منٹو کا انتقال ہو گیا ہے۔ کرشن چندر نے بہت دِل گرفتہ ہو کر مجھے لکھا۔ آل انڈیا ریڈیو نے منٹو کے سینکڑوں ڈرامے اپنے ہاں سے نشر کیے تھے مگر ان لوگوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اس کی موت پر کوئی تعزیتی پروگرام نشر کرے۔ اُردو بازار کہ جہاں منٹو کی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں بک چکی ہیں اور بک رہی ہیں' اسی طرح کھلا ہوا ہے۔ کرشن چندر کی آنکھیں یقیناً اس وقت خون کے آنسو رو رہی ہوں گی' جب اس نے مجھے لکھا کہ' منٹو کوئی وزیر تو تھا نہیں کہ اس کی موت پر ایک دن کے لیے قومی پرچم سرنگوں کیا جاتا۔ نہ ہی وہ کسی مافیا تنظیم کا رکن تھا کہ اس کے لیے بازار بند ہو جاتے وہ تو محض غریب اور مظلوم طبقے کی نمائندگی کرنے والا ایک ادیب تھا' اس کی تحریریں طوائفوں' تانگے والوں' ڈاکیوں اور موچیوں کی زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ بھلا ایسے آدمی کے لیے کون روتا ہے۔ میں نے سوچا کہ واقعی ذرا سیاست دانوں کو دیکھیں کہ جو قومی مفاد کی آڑ میں لوگوں کی جیبیں بھی کاٹ لیتے ہیں اور پھر بھی قابل احترام رہتے ہیں۔ شائد قابل احترام کہلانے کی کسوٹی یہی ہو' اور ادھر منٹو کا وہ ''گرہ کٹ'' بھی ہے کہ جو اپنی ذلت و رسوائی سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھ کاٹ لیتا ہے۔ مگر پھر بھی ایک گھٹیا گرہ کٹ ہی کہلاتا ہے۔ شاید اس طرح سے وہ اس دنیا میں اپنی ساکھ برباد نہیں ہونے دیتا۔ منٹو نے عورت کے ان ہاتھوں کا مشاہدہ کیا تھا کہ جو ساری رات پھولوں سے کانٹے چنتے رہے اور پھر جن ہاتھوں نے پھولوں کو اپنے بستر پر بچھا دیا تھا۔ مگر کانٹوں کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ منٹو کی کہانیوں سے پھولوں کی مہک نہیں آتی بلکہ ابلتے ہوئے لہو کی خوشبو آتی ہے۔ منٹو نے ایسے انسانوں کا بھی مشاہدہ کیا تھا کہ جن کی رُوح عرصہ ہوا مر چکی تھی' جو چلتی پھرتی لاش تھے اور وہ جس جگہ بھی جاتے ان کے آس پاس موت کو سونگھا جا سکتا تھا۔ جب منٹو نے مشاہدات کو اپنے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' میں جگہ دی تو اس پر فحاشی کا الزام لگ گیا۔ منٹو نے ایسے بدقسمت لوگوں کے بارے میں کہانیاں لکھیں کہ جن کی زندگی ایک مرگ مسلسل تھی۔ منٹو نے اس چاقو کی کہانی لکھی تھی جو ایک ہلکی سی کرچ کی آواز سے کسی کی گردن میں پیوست ہو جاتا تھا۔ یہ ایسا چاقو تھا جو ایک لمحہ کسی کے ہاتھ میں ہوتا اور دوسرے لمحے کسی کی کمر میں۔ اس نے اس قینچی کی کہانی بھی لکھی کہ جس نے ملک کے بٹوارے میں انتہائی بے رحمی سے کام لیا تھا۔ یہ سارا کچھ لکھنے کی وجہ سے اس پر اتنی غلاظت اچھالی گئی کہ خدا کی پناہ۔ کرشن

چندر نے بڑے کرب کے عالم میں لکھا کہ آج لاکھوں کے اس شہر میں کسی ایک کے پاس بھی اتنا وقت نہیں کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر منٹو کے بارے میں سوچے۔ میں اس درزی۔۔۔عبدالغنی کی تلاش میں نکلا تھا جس نے منٹو سے سوٹ کی سلائی لینے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کہ منٹو نے ''ہتک'' جیسا افسانہ تخلیق کیا تھا۔ وہ درزی تو نہیں ملا مگر ایک ٹانگے والے نے مجھے ٹانگے میں بٹھانے سے انکار کرتے ہوئے کہا' آج ٹانگہ نہیں چلے گا۔ منٹو صاحب مر گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ واقعی آج ٹانگے والوں سے ٹانگہ چلانا مشکل ہوگا۔ مگر ایسے لوگ کہ جو ایک عورت کو رو دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بہت خوش ہوں گے۔ کیونکہ ایسے ظالموں کے منہ پر طمانچہ مارنے والا اب کوئی نہیں رہا۔ اب کوئی ''کھول دو'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' جیسی کہانیاں لکھنے والا بھی نہیں رہا۔ منٹو نے انکل سام کو بھی بہت سے خط لکھے ہیں۔ جب وہ انکل سام کی خارجہ پالیسی پر قلم اٹھاتا تو وہ زہر میں بجھا ہوا ہوتا تھا۔ انکل سام بھی سوچتا ہوگا کہ آخر ایسے بھتیجے پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں۔ خیر منٹو چلا گیا۔ انکل سام بھی خوش ہوگا کہ اب ایسے خطوط اسے کوئی نہیں لکھے گا۔ کیونکہ اس قسم کے لوگ صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔
ﺖ نئی تبدیلیوں اور انتشار کے اس دور میں مجھے ایک اور کہانی یاد آ رہی ہے کہ' جس میں ایک جوان لڑکی اپنی دادی سے ان پھولوں سے متعلق معلومات چاہتی ہے کہ جن کا رنگ ایسا پکا ہوتا ہے کہ اگر دھاگے کو اس میں رنگ لیا جائے تو یہ کبھی نہیں اترتا۔ دادی نے اسے وہ پھول منگوا دیئے۔ لڑکی نے ان پھولوں کے رنگ میں اپنے دھاگوں کو رنگ کر اس میں لینن کی تصویر بنائی۔ یہ تصویر مکمل ہونے کے قریب تھی کہ اسے پتہ چلا کہ' لینن کا انتقال ہوگیا ہے۔ لڑکی نے ایک عام کالے رنگ کا دھاگہ لے کر تصویر کے ارد گرد سیاہ حاشیہ بنا دیا۔ دن گزرتے رہے'۔۔۔۔ ہوائیں چلیں' طوفان آئے اور سیاہ حاشیے کا رنگ اڑ گیا۔ مگر لینن کی تصویر اسی طرح سے چمکتی دمکتی رہی۔ اس کے پائیدار رنگ قائم و دائم رہے۔ دراصل وہ سیاہ حاشیہ افسوس کی علامت تھا۔ چنانچہ مٹ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اسی طرح منٹو کی شہرت پر بھی جو سیاہ دھبہ لگایا گیا ہے وہ باقی نہیں رہے گا۔ البتہ اس کی کہانیاں ادب کے اُفق پر تاابد زندہ و تابندہ رہیں گی۔ کچھ عرصہ ہوا جب منٹو کی کہانیوں کا پنجابی میں ترجمہ ہوا۔ تو مجھے ان پر ایک تعارفی دیباچہ لکھنے کو کہا گیا اور جب بھاری دِل کے ساتھ میں نے دیباچہ لکھا تو میرے ذہن میں یہ روسی کہانی پھر سے تازہ ہوگئی۔

☆☆

امرتا پریتم

اردو میں اردو زبان میں ترجمہ: ازھر مُنیر

گرہن کتھا

جس روز میرا جنم ہوا اُس روز گرہن لگا ہوا تھا۔

معلوم نہیں دن تھا یا رات۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ اگر دن تھا تو وہ گھڑی سورج گرہن کی ہوگی اور رات تھی تو چاند گرہن کی۔

ہماری دیومالا بیان کرتی ہے کہ جس ہاتھی کے ماتھے سے موتی ملتا ہے اُس کا جنم اُس گھڑی ہوتا ہے جب سورج یا چاند کو گرہن لگا ہو۔

گھر، قبیلہ، سماج، مذہب اور سیاست بھی ہمارے چاند سورج ہی ہوتے ہیں تو اس سے جب گرہن لگے کوئی شاعر، عاشق یا درویش جنم لیتا ہے تو سچ یہ ہے کہ درد کا موتی اُس کے ماتھے میں پڑ جاتا ہے۔

سوچ اور آگہی کا سفر بہت طویل ہوتا ہے۔

گھر، قبیلے کو جب ٹوٹتے رشتوں کا گرہن لگتا ہے تو جس آگہی کا جنم ہوتا ہے اُس کے درد کی انتہا اپنی ہی طرح کی ہوتی ہے۔

سماج کو جب طرح طرح کی ناانصافیوں کا گرہن لگتا ہے تو سوچ کے احساس کی شدت اپنی ہی طرح کی ہوتی ہے۔

مذہب کے چاند کی، جب فرقہ پرستی کا گرہن لگتا ہے تو آسمان کی رُوح کیسے تڑپتی ہے؟ اس سوچ کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔

اور سیاست کے سورج کو جب طاقت کی ہوس کا گرہن لگتا ہے تو دھرتی کی رُوح کیوں بلکتی ہے؟ یہ سوچ اپنی ہی طرح کی ہوتی ہے۔

دُنیا کی ادبی تاریخ کو درد کے موتی ملتے ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کسی کرم والے کی سوچ کو کتنے گرہن دیکھنے اور جھیلنے پڑتے ہیں۔

چاند اور سورج کا کچھ حصہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کا حادثہ نفسیاتی حوالے سے اُس وقت بھی پیش آتا ہے جب رشتوں کے ٹوٹنے سے اعتماد کی زمین پیروں کے نیچے سے ہل جاتی ہے۔

آسمان کے چاند کو اُس سے بھی گرہن لگتا ہے جب فرقہ پرستی کے ہاتھ رُوحوں کے جلتے چراغوں کو بُجھا دیتے ہیں اور آسمان کے سورج کو اُس وقت بھی گرہن لگتا ہے جب طاقت کی ہوس کالی گھٹا کی مانند اُٹھتی ہے اور لوگوں سے اُن کے گھروں اور صحنوں کی روشنی میں چھن جاتی ہے۔ جنہیں قلبی طاقت کا شعور ملا اور انہوں نے موتی کے رنگ کی اصلیت کی تاثیر کو پہچانا وہ کہتے ہیں ''جو موتی چاند کے رنگ کا ہو اُس کا دیوتا اِندر ہوتا ہے۔ موتی کا رنگ زرد ہو تو وُرن ہوتا ہے۔ پکے ہوئے انار کے دانے کی طرح سرخ ہو تو وایو ہوتا ہے۔ دیے کی لو جیسا چمک دار ہو تو اگنی ہوتا ہے اور اگر اس کا رنگ گاڑھا سیاہی مائل ہو تو پھر موت کا دیوتا یم ہوتا ہے۔''

درد کے کتنے ہی رنگ ہوتے ہیں اور انہیں اپنانے والا خدا جانے کتنے رنگ اور کتنے دیوتا جھیلتا ہے۔

کہہ سکتی ہوں کہ میں نے آج تک جو بھی لکھا ہے وہ یہ لمبی گرہن کتھا ہے۔

نامعلوم کا بلاوا

تشکیک کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر

اِندر کی گائے کا دُودھ دوہا

کس نے بھر لیے برتن اپنے؟

کون سُنے گا ہوا کی آہیں؟

چل ری زندگی! چل ہمیں تقدیر کا بلاوا آیا ہے

کوئی بات کی جاسکتی ہے تو اُس سے جب تقدیر کا بلاوا آتا ہے۔ محبت تو خدا کی مانند نامعلوم کا نام ہے۔ اس کی بات جس قدر اشاروں میں اُترتی ہے وہ سلطان باہو کی ہُو ہے۔ سلطان باہو کوشش کرتا ہے چمپا کی اُس بُوٹی کی بات کہنے کی جو من کی مٹی میں اُگتی ہے۔ اسی قدر کہتا ہے کہ ''نفی اثبات دا پانی ملیا'' یعنی ہاں کا پانی بھی ملتا ہے اور نہ کا بھی۔ مگر یہ اشارہ نامعلوم کی طرف نہیں، تقدیر کے بلاوے کی طرف ہے جسے سُن کر کوئی نامعلوم کی راہ پہ چل پڑتا ہے۔

یہ ایک بیج کے پھوٹنے کا سفر ہے جہاں ہاں کا پانی ملا تو قدم تیز تیز اُٹھنے لگے نہ کا ملا تو قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ مگر جب بیج پھوٹ نکلا' ایک خوشبو اپنے اندر کھلنے لگی تب وہ چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کہہ پاتا۔ جب خوشبو سے دیوانہ ہو جاتا ہے تو اُس کے ہونٹوں سے فقط ''ہُو'' نکلتا ہے جو ہر کان میں ایک ترنگ کی طرح دوڑ جاتا ہے۔ ایک اُمنگ بھر دیتا ہے۔

اِس سفر کے مفہوم کو کسی حد تک میرا کی آواز میں بھی پہچانا جا سکتا ہے جب وہ کہتی ہے ''لاکھ چوراسی رو چوڑلو پیارو! میں کئی بار'' اور ساتھ ہی کہتی ہے ''جنم جنم کیا پتی کیا' او تو پتی دیہی کے سنگ'' اور جسے پانا تھا وہ نہیں ملا تو کہتی ہے ''میں کنواری یوں رہی۔۔۔''

وہ جو جنم جم کا چوڑا پہن کر ہر دن میں سے گزرتے کچھ ''کنوارا'' رہ جاتا ہے وہ فراق ہے' سفر کا درد ہے۔ میرا کے پاؤں جب نامعلوم میں اُتر گئے تو بات رقص کے گھنگھروؤں میں اُتر گئی۔ مگر رقص کے گھنگھروؤں سے کچھ پوچھا یا جانا نہیں جا سکتا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ معلوم کی سرحد کہاں واقع ہے؟ اور جو کچھ اس سے آگے ہے وہ کیا ہے؟ بس اتنا جان پائی ہوں کہ جو اِس سرحد سے آگے ہے وہاں سے کوئی اشارے ملتے ہیں جو میری گرفت میں نہیں آتے۔

بہت چھوٹی تھی' بچی سی' جب شام کے وقت سورج میری آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو رہا ہوتا تو میں رونے لگ پڑتی۔ ماں کا پلو کھینچتی' بلکتی اور پوچھتی سورج کہاں چلا گیا۔ ماں ہنس پڑتی۔ کہتی

''تم کھانا کھا کے سو جاؤ۔ جاگو گی تو سورج آ جائے گا۔''

تو میں کہتی ''لیکن وہ گیا کیوں ہے؟''

لگتا تھا سامنے ایک اندھیرا سا بچھ گیا ہے۔ معلوم نہیں کتنا جس میں' میں گُم ہو جاؤں گی۔

رات یوں لگتی جیسے اندھیرے کا ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے۔ میں اس کنارے پر ہوں اور سورج دریا کے کہیں اُس پار چلا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہاں؟ اور میں یہیں کھڑی رہ جاؤں گی۔ کبھی پار نہیں جا پاؤں گی۔

اور یاد آتا ہے۔ جب بچپن رخصت ہو رہا تھا تو یوں لگا میرا ''میں'' میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ اس نادانی کی عمر میں کسی نامعلوم کا یہ تقاضا کیوں تھا؟ میں کبھی نہ جان پائی۔

اُن دِنوں ایک نظم لکھی تھی کنارے سے مخاطب ہو کر

کنارے رے کنارے! ذرا اپنی بانہوں کا گھیرا کھول دو

ہم نے لہروں لہروں جانا ہے

ہواؤں کے ہیروں میں چکر ہے' کیسے کوئی ٹھکانہ تلاش کریں؟

راہیں کشادہ' رشتے تنگ' جی اُداس اُداس

کھوئے ہوئے مکھڑے مل نہ پائیں' ریت سے کی چھانوں

یوں لگتا تھا کنارے پہ بیٹھی وقت کی ریت چھان رہی ہوں مگر جو کھو گیا ہے وہ مل نہیں پا رہا۔ وہ کیا تھا جو گم ہو گیا تھا میں اس کا کوئی نام نہ رکھ پائی۔

بڑی ہوئی' من کی مٹی میں پریت کی پہلی پتی اُگی تو جانا میں لوہے کے ایک ٹکڑے کی مانند مقناطیس کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہوں۔ یہ اندر سے ٹوٹنے کا سے تھا۔ ایک ٹکڑا ''میں'' مقناطیس کی طرف چلتا رہا اور ایک ٹکڑا ''میں'' در و دیوار کے سائے میں بیٹھا رہا۔ فقط میری نظمیں تھیں جو کاغذ پر اُترتی رہیں اور کاغذ ہوا میں بکھرتے رہے۔

نامعلوم کا سفر میلوں تک اُس ویرانی کا سفر ہوتا ہے جس میں جدائی کے جنگلی پھول تو کھلتے ہیں مگر ان کے سوا اور کچھ نہیں اُگ پاتا۔

یہ طلب کیا ہے؟ یہ پیاس کیا ہے؟ اس کا اندازہ فارسی کے ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریگستان میں جو لوگ چمکتی ریت کو دیکھ کر بھی پانی کا دھوکہ نہیں کھاتے' وہ دانش مند تو ضرور ہوں گے مگر اُن کی پیاس میں یقیناً کچھ کمی ہوتی۔

اُس وقت کچھ اور نہیں مگر اتنا ضرور جان پائی کہ میری پیاس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ برسوں کے صحرا میں جب محبت کسی کے چہرے کے نقوش میں کھنکنے لگ گئی تو یوں لگا جیسے نامعلوم کا بلاوا آیا ہے اور جب بلاوا آ گیا تو یوں لگا اب نامعلوم کی طرف جانا ہی ہوگا۔

رات کی دُلہن نے دعوت کی

تاروں نے چاول چھڑکے' کسی نے دیگیں چڑھا دیں

کون ہے جو چاند کی صراحی لے آیا؟

روشنی گھونٹ شراب کا اور امبر گہری آنکھیں

زندگی میں اس طرح کے بلاوے کا مل جانا ایک بہت بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ پھر معلوم کی سرحد کب اور کیسے

چُھٹ گئی؟ میں نہیں جانتی۔ کچھ بھی گرفت میں نہیں آتا۔ فقط اِس قدر جانا کہ پیروں میں تلملاہٹ تھی نامعلوم کی راہ پر چل نکلنے کی۔

جانے وہ کیسی رات ہوتی ہے جو کسی سپنے کا ماتھا چوم لیتی ہے اور پھر خیالوں کے پیروں میں ایک جھانجھ سی بجنے لگ پڑتی ہے۔ اور یہی میرا کے گھنگھرو ہیں جن سے کچھ پوچھا' جانا نہیں جا سکتا۔

سر پہ جب برسوں کے بادل ٹکراتے ہیں' بوند بوند ٹوٹتے ہیں اور کبھی ان کی چھاتی سے بجلی بھی کڑک جاتی ہے اس وقت من کی مٹی میں پڑے ہوئے جنم جنم کے بیج معلوم نہیں کہاں تک سہم جاتے' سوکھتے اور بھیگتے ہیں اور جو بیج پھوٹ نکلتے ہیں' پیڑ بن جاتے ہیں اور چلتی ہوائیں اُن کے شگوفے' پتے اور پھل' پھول جھاڑ دیتی ہیں۔ میں نے آج تک جو بھی لکھا ہے ان سبھی حرفوں کو میں ان پیڑوں سے جھڑے شگوفے اور پتے مانتی ہوں۔ یہی احساس ایک نظم میں اُترا تھا

نہیں' خاموشی کے اس پیڑ سے میں نے کوئی حرف نہیں توڑا
یہ تو جو پیڑ سے جھڑ گئے تھے
میں نے وہی حرف چُنے ہیں

گورکھ وانی کی تہوں میں اُترتے رجنیش اُس عہد کا ایک قصہ بیان کرتے ہیں جب بھگوان نے انسانی نسل بنائی تو خود بھی انہی کے بیچ رہنے لگا۔ لوگوں کو کوئی معمولی سی ضرورت بھی پیش آ جاتی تو وہ جھٹ سے جا کر اُس کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ وقت بے وقت۔ اور مطالبے بھی ایسے جو ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ کوئی کہتا

''بھگوان! میں نے آج کپڑے رنگنے ہیں' انہیں سکھانا ہے۔ اس لیے ذرا خیال رکھنا آج بارش نہ ہونے پائے۔''

کوئی اور کہتا

''پرمیشور! آج بارش برسا دو۔ میں نے کھیتوں میں بیج بوئے ہیں' کہیں خشک نہ ہو جائیں۔ انہیں پانی ملنا ضروری ہے۔''

تو ان جیسے مطالبے سُن سُن کر بھگوان کا سر چکرا گیا۔ اُس نے تھک ہار کے ایک روز دیوتاؤں کو بلا بھیجا۔ ان سے پوچھا

''بتاؤ میں کہاں چلا جاؤں؟ جی چاہتا ہے ہمالیہ کی چوٹی پہ چلا جاؤں جہاں کوئی نہ پہنچ پائے۔ میں تو

سخت پچھتا رہا ہوں یہ انسان کی نسل بنا کے۔''

دیوتاؤں نے آنکھیں بند کیں، مستقبل پہ نظر ڈالی اور کہا

''ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے کے لیے بھی کوئی پہنچنے والا ہے۔ کوئی ایک بار پہنچ گیا تو مشینوں اور کلوں کی مدد سے کتنے ہی لوگ پہنچ جائیں گے۔ وہاں بھی سرائیں بن جائیں گی۔ ہوٹل کھل جائیں گے۔''

بھگوان نے کہا

''پھر کیا چاند پہ چلا جاؤں؟'' دیوتا پھر دھیان میں مگن ہوئے۔ بولے

''تکنیک کی مدد سے انسان وہاں بھی پہنچنے والے ہیں۔''

بھگوان بہت اُداس تھے۔ تب ایک بزرگ دیوتا نے اُن کے قریب ہو کر کہا

''ایک جگہ ہے جہاں انسان کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ اور وہ جگہ ہے اُس کا باطن۔ آپ وہاں جا کر بیٹھ جائیں۔ انسان نے ہمیشہ باہر کی طرف بھٹکنا ہے۔ اپنے اندر کبھی نہیں اُترنا۔''

سو اس روز سے بھگوان۔ خدا۔ رب ہر انسان کے اندر بستا ہے۔ جہاں انسان اُسے دیکھ ہی نہیں پاتا۔ کبھی کوئی بدھ، کوئی کرشن، کوئی نانک، کوئی گورکھ اُسے اپنے اندر تلاش کر لیتے ہیں۔ پر وہ وصل کی ساعت ہوتی ہے اور اُن کے ساتھ کی تو خود خدا کو بھی ضرورت ہوتی ہے۔

مختصراً یہ بات حقیقتاً سچ ہے۔ ساری انسانی نسل ہمیشہ باہر کی طرف بھٹکتی رہی ہے۔ بات بات پہ جھگڑتی، دُنیا کو خود ہی بساتی اور خود ہی اُجاڑتی ہے۔

1992 کی بات ہے۔ 12 مارچ کی صبح ہونے والی تھی جب مجھ نیند کی تہہ میں اُتری کو کسی نے پیغام دیا کہ سائیں بابا نے بلایا ہے۔ میں حیرت سے پاگل ہو جاتی ہوں۔ پوچھتی ہوں

''ہر ڑی والے سائیں بابا؟ انہوں نے خود مجھے یاد کیا ہے؟''

میں جاتی ہوں۔ دیکھتی ہوں سامنے نیم تاریکی میں سائیں بابا بیٹھے ہیں۔ مجھے آتا دیکھ کر مجھ پہ ایک نگاہ ڈالتے ہیں پھر دریافت کرتے ہیں

''ایک بات بتاؤ۔ تم اتنی اُداسی کیوں ہو؟''

میں وہیں کھڑے کھڑے جواب دیتی ہوں

''آپ بتائیں میں کیا کروں سائیں بابا؟ میرے چاروں طرف جھوٹ ہی جھوٹ پھیلا ہے۔ کوئی سچ نہیں

بولتا۔ میں کیا کروں؟"

وہ چپ چاپ زمین کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔

بس اسی قدر خواب تھا۔ لیکن جانا کہ کوئی درد معلوم نہیں میری رگوں میں کہاں تک اُترا ہوا ہے کہ سائیں بابا سے ملاقات کی گھڑی آئی تو غنیمت کی اس ساعت میں بھی یہی درد میرے ہونٹوں پہ بلکنے لگا۔ مجھے لگا یہ بھی میری گرہن کتھا کا کرم ہے۔ میری تقدیر ہے۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم

پنجابی سے اردو زبان میں ترجمہ: علی یاسر

امروز

ساحر ایک خیال تھا، ہوا میں چمکتا ہوا شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا جادو، لیکن امروز کے ساتھ گزاری زندگی درمیان کے کچھ سالوں کے علاوہ ایک بے خودی کے عالم میں پہنچ گئی ہے۔ اس عالم کو شاید ابھی ابھی یاد آئی ایک بات سے تھاما جاسکتا ہے۔ ایک دن گھر میں آئے کسی مہمان نے میرا اور امروز کا ہاتھ دیکھا اور کہنے لگا ''تمھارے ہاتھ میں دولت کی بہت گہری اور طویل لکیر ہے، تمہیں زندگی میں کبھی دولت کی کمی نہیں آسکتی''، لیکن امروز کو کہنے لگا کہ تم سے کبھی دولت اکٹھی نہیں ہوگی، تمھارے ہاتھ کی لکیر جگہ جگہ سے شکستہ ہے۔ امروز نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام کر کہا ''اچھا تو ہم دونوں ایک ریکھا کے ساتھ گزارہ کرلیں گے''۔

1964ء میں جب امروز نے حوض خاص رہنے کے لیے پٹیل نگر والا مکان چھوڑ دیا تو اس دن اپنے نوکر کی آخری تنخواہ دے کر اس کے پاس ایک سو اور کچھ روپے بچ گئے تھے۔ لیکن اس وقت اس نے ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں نوکری کرلی تھی۔ اس لیے اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ دو تین ماہ بعد اس نے لاؤڈ تھنکنگ کی طرح کہا ''میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس دس ہزار روپے ہوں تا کہ جب جی چاہے نوکری چھوڑ سکوں اور کوئی من چاہا تجربہ کرسکوں''۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی کہی بات پوری ہوجائے۔ جلد ہی ایک سبب بھی پیدا ہوگیا کہ امروز کو تنخواہ کے علاوہ پانچ سو روپے ماہوار کا کام الگ سے ملنے لگا۔ سو خرچ میں سے جتنی کفایت شعاری کرسکتی تھی کی اور امروز کے دس ہزار جمع کرنے کی ٹھان لی۔

سال سوا سال کے عرصے میں واقعی دس ہزار جمع ہوگئے تو امروز نے ایک دن اچانک نوکری چھوڑ دی، الگ کام پانچ سو روپے کا سہارہ بھی اگلے مہینے سے اچانک بند ہوگیا۔ مجھے تین ماہ کے لیے یورپ جانا تھا، چلی گئی۔ میری غیر موجودگی میں امروز نے بوتیک کا تجربہ کرنے کا سوچ لیا اور اس کے لیے اپنے بھائی کو دکن کی

طرف بھیج دیا تا کہ وہ وہاں سے بوتیک کا کوئی اچھا سا کاریگر تلاش کر کے لائے۔ میں یورپ سے واپس آئی تو اس نے گرین پارک میں تین سو روپے ماہوار کرائے کا ایک مکان لیا ہوا تھا جس میں دو کاریگر رہ رہے تھے اور رنگوں کے کڑاہے ابل کر نئے خریدے ہوئے کپڑے کے تھانوں پر بوتیک کا تجربہ کر رہے تھے۔ رنگ پورے نہیں آ رہے تھے اور ڈبو ڈبو کر کپڑوں کے ڈھیر لگا کر پھینکا جا رہا تھا۔

ان دنوں امروز کا مزاج دہلی کے اس موسم جیسا تھا جب ابھی دوپہر کے وقت جسم گرمی سے جھلس رہا ہو اور ابھی سہ پہر کو سردی سے ٹھٹھر رہا ہو۔ کچھ کہنا چاہا لیکن سارے لفظ اکارت تھے۔

اوپر سے ڈھائی سو روپے ماہانہ پر ایک درزی آ گیا جو کچھ بہتر بنے ہوئے کپڑوں کو کتر کتر کر قمیصوں کی شکل میں سی رہا تھا لیکن قمیصوں کی کمر کا سائز اردو شاعری کی حسینہ کی کمر جیسا تھا۔

ان پانچ سو قمیصوں کا حشر یہ ہوا کہ انھیں برس ہا برس تک سنبھالنے کے لیے ایک الماری بنوانی پڑی۔ ایک بڑا ٹرنک خریدنا پڑا اور پھر انھیں دیکھتے ہی جلدی سے الماری کا دروازہ اور ٹرنک کا ڈھکن بند کرنے کے سوا کوئی چارا نہ رہا۔ ایک دن کی بات آج بھی یاد آ جائے تو ہنسی پھوٹ بہتی ہے۔ ایک دن ایک امریکی عورت کو ایک قمیص بہت پسند آئی، وہ اسے بتا رہا تھا کہ اردو شاعری کی حسینہ کی کمر کے لیے سلی قمیص اسے پوری نہیں آئے گی لیکن اس نے ایک پردے کے پیچھے ہو کر کسی طرح وہ قمیص پھنسا لی لیکن اتارنے لگی تو اتر نہیں رہی تھی۔ اس نے اکتا کر پردے کے پیچھے سے آواز دی ''پلیز گیٹ می آؤٹ آف دس شرٹ''۔ دس ہزار ختم ہو گئے تو امروز نے اپنا اکلوتا پلاٹ بیچ دیا جو ساڑھے چھے ہزار کا بکا اور ایک سال کے اس تجربے میں کتابوں کے اکا دکا ٹائٹلوں کا کام کر کے اس نے جو بھی کمایا تھا، اس سمیت اس کے خرچ کی رقم بیس ہزار ہو گئی۔ پھر اس کا دل بوتیک سے اچاٹ ہو گیا۔ اس تجربے میں سے سلک کی ایک قمیص اور سلک کی ایک ساڑھی جو امروز نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی، میرے پاس ہے۔ جب بھی یہ قمیص یا ساڑھی پہننے لگتی ہوں، بیس ہزار کا خیال آ جاتا ہے اور کبھی اداس ہونے لگوں تو امروز ہنس دیتا ہے۔ ''اتنی قیمتی ساڑھی تو کسی ملکہ نے بھی نہیں پہنی ہوگی، تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ آج تم نے دس ہزار کی ساڑھی پہنی ہوئی ہے''۔ سو یہ میری ساڑھی بھی دس ہزار روپے کی ہے اور قمیص بھی دس ہزار کی۔

میں سچ مچ امیر ہوں۔ یہ امروز کے اس حوصلے کی امیری ہے جو بیس ہزار گنوا کے بھی اس طرح ہنس سکتا تھا اور یہ دس ہزار بھی وہ جو اس نے نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ بعد میں۔ امروز کو سمجھنا مشکل نہیں، اس میں

مسلسل چلی آ رہی ایک ریکھا ہے (ہاتھ میں نہیں، پیشانی کی سوچ میں)۔ اس کے من میں چیزوں کی وہ شکلیں ابھرتی ہیں جنہیں کاغذ پر یا لکڑ لوہے پر اتارنا صرف اسی کے بس کی بات ہے۔ بڑے کمالات دکھانا اس کے بس میں نہیں۔ اس نے ٹیکسٹائل کے عجیب و غریب ڈیزائن بنائے۔ میں دیکھتی تو اسے کہتی کہ اگر یہ سچ مچ کاغذوں سے اتر کر دو دو گز کپڑوں پر آ جائیں تو سارے ہندوستان کی لڑکیاں پریاں ہو جائیں۔ یہ ڈیزائن کاغذوں پر بنانے اس کے بس میں تھے، اس نے بنا لئے، انھیں کپڑوں پر اتارنے کے لیے کسی مل کی ضرورت تھی۔ ہمارے ملک کی غریبی یہ نہیں کہ اس کے پاس ملیں نہیں، غریبی یہ ہے کہ ملوں والے اہلِ نظر نہیں ہیں۔ یہ ڈیزائن دو مرتبہ دو ملوں والوں کو دکھائے تھے لیکن تجربہ یہ ہوا تھا کہ وہ لوگ آئیون رینڈ کے اس فقرے جیسے تھے جو ایسے لوگوں کے لیے ان کی تقدیر کی طرح لکھا ہوا تھا ''پرفیکٹ ایڈیٹس''۔

اصل میں اسی بے بسی کی وجہ سے امروز نے بوتیک کا ذریعہ سوچا تھا کہ کچھ ڈیزائن ملوں کی محتاجی سے سرخرو ہو کر کپڑوں کا جسم چھو سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کام جب تک کاریگروں کے ہاتھوں میں تھا، قابلِ ذکر نہیں تھا لیکن جب آخر کار امروز نے اس کا سارا عمل اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا تو کچھ چیزیں ایسی تیار ہوئی تھیں کہ ان سے آنکھ نہیں ہٹائی جاتی تھی۔ لیکن ایسی چیزوں کے لیے کچھ جاپانیوں اور کچھ امریکیوں کے سوا کوئی خریدار نہیں تھا اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی تھی کہ جب یہ ہنر عروج تک پہنچ چکا تھا تو دو گز کپڑا خریدنے کے لیے بھی پیسے نہیں بچے تھے۔

یہ معمولی ذریعہ بھی پہنچ سے باہر ہو گیا تو اس تجربے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ تجربے عمل میں آئے جن کے لیے ایک مرتبہ میں پچاس، سو روپے سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امروز نے گھڑیوں کے ڈائل ڈیزائن کرنے شروع کر دیے۔ جب پچاس روپے اکٹھے ہوتے، وہ ایک گھڑی خرید لیتا، اس کا ڈائل ڈیزائن کرتا، آج بھی ہماری ایک الماری ان گھڑیوں سے بھری ہوئی ہے جنہیں چابی دینا ممکن نہیں لیکن کبھی کبھی ہم وہ الماری کھولتے ہیں تو ساری گھڑیوں کو چابی دے کر ان کی ٹک ٹک بیتھوون کی سمفنی کی طرح سنتے ہیں۔

گھڑیوں میں ہمیشہ ایک وقت ہوتا ہے لیکن امروز نے گھڑیوں میں دو وقت حاصل کرنا چاہے۔ ایک تو عام وقت جو سوئیاں بتاتی ہیں دوسرا وہ جو دنیا کے کچھ شاعر لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ اسی لئے امروز نے نمبروں والے ڈائل نکال کر گھڑیوں میں وہ ڈائل ڈال دیے جن پر اس نے دنیا کے ان شاعروں کی سطریں لکھی تھیں جن میں کئی پل کشید ہوئے تھے۔ سب گھڑیوں میں کسی کے ڈائل پر فیض کا شعر ہے، کسی پر قاسمی کا، کسی

پروارث شاہ کا، کسی پر شو کمار کا۔

اسی طرح امروز کے ڈیزائن کردہ کئی کیلنڈر ہیں۔ کسی کی شکل چوکور میز جیسی ہے جن پر تاریخیں اور دن شطرنج کے مہروں کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔ کسی کی شکل درخت جیسی ہے جسے تاریخوں اور دنوں کے ہرے پتوں سے سجایا گیا ہے۔ کسی کی شکل ایک ساز جیسی ہے جس کی تاروں کو کسنے والی چابیاں سال کے دن اور مہینے ہیں۔ یہ سب کچھ اگر اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں دکھایا جاسکتا تو ہندوستان کا نام امیر ہوسکتا تھا لیکن کسی سرکاری مشینری کو چابی دے پانا نہ میرے بس میں ہے نہ امروز کے۔ جب کوئی کسی کا حال اپناتا ہے، اصل اپناہٹ میں اس کا اور دوسرے کا ماضی بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ایک کا الگ اور دوسرے کا الگ نہیں رہ جاتا اگرچہ آنکھوں سے نہیں دیکھا ہوتا لیکن وہ بھی اپنے ہونے کا حصہ بن جاتا ہے۔ اپنے بدن کے کسی پرانے زخم کی طرح۔

امروز کو علم ہے کہ موہن سنگھ کے لیے میری قدروں میں میری محبت شامل نہیں تھی۔ ایک دفعہ جب وہ موہن سنگھ کی کتاب ''جندرے'' کا کور ڈیزائن بنا رہا تھا تو کتاب کی شکل کے مطابق اس نے دو قفل بنانے تھے۔ میرے دو بچے جو موہن سنگھ کی سوچ میں دو پھولوں کے قفل تھے، لیکن امروز نے ٹائٹل پر تین قفل بنائے، کہنے لگا کہ تیسرا سب سے بڑا قفل تو بچوں کی ماں تھی جو موہن سنگھ کو نظر ہی نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ادھوری نظم کو پورا کرنے کے لیے دو کی جگہ تین قفل بنائے ہیں۔ اس وقت امروز نے میری سوچ اپنی پیشانی میں سمائی ہوئی تھی۔ امروز کو علم ہے کہ میں نے ساحر سے محبت کی تھی۔ یہ علم ہونا اپنے آپ میں بڑی بات نہیں لیکن اس سے پرے جو کچھ بہت بڑا ہے، وہ امروز کا میری ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ لینا ہے۔ امروز جب ساحر کی کتاب ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' کا ٹائٹل بنا رہا تھا تو ہاتھ میں کاغذ لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر کے کمرے میں میں اور دیوندر بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوندر واحد دوست ہے جس کے ساتھ میں ساحر کی بات کر لیتی تھی، اسی لیے دیوندر نے ماضی میں اتر کر ایک بار ٹائٹل کی طرف دیکھا۔ ایک بار میری طرف لیکن میرے اور دیوندر سے بڑھ کر امروز نے میرے ماضی میں اتر کر کہا ''سالا خواب بُننے کی بات کرتا ہے، خواب بُننے کی نہیں''۔ میں ہنس پڑی ''سالا جولاہا ساری عمر خواب بُنتا ہی رہا، کبھی کسی کا خواب نہ بُنا''۔ میں اور دیوندر کافی دیر ہنستے رہے اس درد سمیت جو ایسے وقت ایسی ہنسی میں شامل ہوتا ہے۔ کبھی حیران ہو جاتی ہوں، امروز نے مجھے کس طرح اپنایا ہے، اس درد سمیت جو اس کی اپنی خوشی کا مخالف ہے۔ ایک دفعہ ہنس کر کہا۔ ''ایمو، اگر مجھے ساحر مل جاتا تو آپ نہ

ملتے''۔ تو وہ مجھ سے بھی زیادہ مجھے اپنا کر کہنے لگا ''میں نے تو ضرور ملنا تھا، چاہے تمہیں ساحر کے گھر نماز پڑھتی ہوئی کو جا کر ڈھونڈ لیتا''۔

سوچتی ہوں، کیا کوئی خدا ایسے انسان سے الگ ہوتا ہے۔

امروز جو یہ ہے، اگر نہ ہوتا تو میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر یہ شعر کبھی نہ لکھ سکتی۔

باپ اور بھائی، دوست اور خاوند
کسی لفظ کا نہیں کوئی رشتہ
میں نے جب یوں دیکھا تجھ کو
سارے لفظ ہوئے ہیں گہرے

☆☆☆☆

امرتا پریتم بنام مظہر الاسلام

۔۔۔اے خدا!

مظہر کا یہ لفظ سُن لے!

اور

انسان کی تقدیر میں لکھ دے

امرتا

☆☆☆☆

دوست!

اب کے بہار کا نیا پہلو دیکھا

بدن سے چھو کر بھی اور تصور سے چھو کر بھی

نہیں جانتی تھی کہ سُرخ پھول اس طرح بھی کھلتے ہیں

اس تحفے کا بہت بہت شکریہ!

امرتا

آپ کو ایک خط ملا ہوگا' وارث شاہ تقریب کے لیے ہندوستان آنے کا،

جواب کا انتظار ہے۔۔۔

کاتب امروز

☆☆☆☆

مظہر الاسلام دوست!

اک مدت ہوگئی۔ تہاڈی خیر خبر آئیاں

اوہ بڑا ظالم موسم ہے، کتوں دی عقل دی مہک

ورگی آواز سنائی نہیں دیندی

اخباراں دی کُجھ کٹنگ بھیج رہی ہاں

تُسی اپنیاں نویاں کہانیاں تے ’کہانی کیویں بنی‘ ورگے مضمون

ضرور بھیجو۔۔۔ ناگ منی لئی تے

میرے تے امروز لئی خط بھیجو

امرتا

کاتب امروز کا سلام اور آپ جیسے سب سنجیدہ لوگوں کو بھی۔

☆☆☆☆

امرتا پریتم بنام احمد سلیم

(میرے نام امرتا پریتم کے یہ خطوط گورمکھی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ سترہ برسوں (85-1968) پر محیط خطوں کا یہ انتخاب امرتا پریتم کی فنی اور شخصی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 1985 کے بعد کے خطوط کی فائل میرے آرکائیوز سے غائب ہے اس لیے اس دور کے خطوط کا انتخاب نہیں کیا جاسکا۔ اُردو ترجمہ دانستہ طور پر پنجابی محاورے کے قریب تر رکھا گیا ہے تاکہ امرتا پریتم کا بیان اور انداز بیان مسخ نہ ہونے پائے۔ ایک دو مقامات پر لفظ پڑھے نہیں جاسکے اس لیے وہاں (۔۔۔) کے نشان دیے گئے ہیں۔

ان خطوں میں 'ناگ منی' کے پرچوں اور امرتا کی مجھے بھیجی ہوئی کتابوں کا بار بار تذکرہ ملتا ہے' جو مجھے اکثر نہیں مل پاتی تھیں۔ دراصل یہ 1971 کے بعد کے چند برس تھے جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ معطل تھا اور یہ خط وکتابت اکثر بذریعہ لندن یا آنے جانے والوں کی معرفت ہوتی تھی۔ ان خطوں میں دوسرا تذکرہ جواں مرگ سارا شگفتہ کا ہے جو امرتا پریتم کو اتنی عزیز تھی کہ انہوں نے اس کی جواں مرگی کا نوحہ کتابی صورت میں 'ایک تھی سارا' کے نام سے شائع کیا۔)

پیارے احمد سلیم جی،

آپ کے خطوں کا بہت شکریہ۔ سارے خط میں نے بڑی قدر سے پڑھے ہیں۔ پڑھے نہیں، پڑھوائے ہیں، مجھے اُردو نہیں آتی۔

آپ 'ناگ منی' پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس سے لگتا ہے کہ آپ پنجابی (گورمکھی) پڑھ سکتے ہیں اس لیے خط اُردو میں لکھوانے کی بجائے خود لکھ رہی ہوں۔

ویت نام کے بارے میں، میری نئی نظم 'ناگ منی' کے تازہ شمارے کے ٹائٹل پر چھپی ہے۔ پرچہ بھیج رہی ہوں۔ پچھلے سال ایک بہت اچھی نظم لندن میں شائع ہوئی تھی، انگریزی زبان میں۔ کسی پچھلے شمارے میں، میں نے اس کا پنجابی ترجمہ شائع کیا تھا۔ وہ شمارہ بھی بھیج رہی ہوں۔ یہ اینڈرئین مچیل کی نظم ہے، صفحہ 18 پر۔

اگر آپ گورمکھی رسم الخط میں پنجابی پڑھ سکتے ہیں تو آئندہ سے 'ناگ منی' بھیج دیا کروں گی۔ آپ وہاں سے مجھے احمد ندیم قاسمی کا پرچہ 'فنون' بھجوادیں۔

آپ کی اور آپ کے دوست کی نظم ملی۔ آپ سے اور بھی اونچے معیار کی نظموں کا تقاضہ کرتی ہوں۔

پیار سے امرتا پریتم

28-08-68 ،

☆☆☆☆

کوئی محبوب نظر ہی
محبوب چہرہ دیکھ سکتی ہے
اور کوئی محبوب قلم ہی
محبوب چہرہ تخلیق کر سکتا ہے
احمد سلیم کے محبوب قلم کے لیے
پیار بھی اور اس کا شکریہ بھی

امرتا پریتم

(حوالہ: امرتا پریتم کے نام احمد سلیم کی نظم) 7-7-69

احمد سلیم! او نیک آدمی!

تیرا سپنا ٹھیک ہی تھا۔ تیرا خط پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم سچ مچ تاریک غاروں سے گزر رہے ہیں نہ جانے انسانی محبت کی کب پرواہو گی۔

'ناگ منی' کے پرچے چند کتابیں اور یہ خط بھیجنے کا موقع ملا ہے۔ تیری نیک رُوح کو سلام!

سجاد حیدر میرے بہت پرانے اور بہت پیارے دوست ہیں۔ اب تو لگتا ہے انہیں دیکھے صدیاں بیت گئیں۔ خدا کرے جیتے جی ایک بار ملاقات ہو جائے۔

میں 23 راگست کو یوگوسلاویہ جا رہی ہوں۔ وہاں تین ہفتے رُکوں گی۔ پھر چیکوسلواکیہ اس کے بعد فرانس اور اکتوبر کے وسط میں لندن پہنچوں گی۔ وہاں تیرے خط کا انتظار کروں گی۔ اپنی نئی نظمیں 'ناگ منی' کے لیے ضرور بھیجنا۔

تیری امرتا پریتم

16-8-72

☆☆☆☆

6-11-74

پیارے احمد سلیم!

شکر ہے کہ اب تمہیں خط لکھنے کی راہ نکل آئی ہے۔ 'ناگ منی' کے پرچے اور دو نئی کتابیں لاہور کے پتے پر اسی وقت بھیج دی تھیں جب تمہارا پہلا خط ملا تھا۔ دوسرے خط میں آنے والے رقعے بنگلہ دیش پوسٹ کر دیئے ہیں۔

ایک دن ٹی وی سے تیری نظمیں پڑھیں۔ احمد سلیم کی بھی اور فخر زمان کی بھی۔ پتہ نہیں تم نے سنیں یا نہیں؟ 'ناگ منی' میں جمیلہ ہاشمی کا ناول 'آتش رفتہ' ترجمہ کر کے چھاپنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس اس کا پتہ نہیں اس کا پتہ بھی بھیج دو اور اس کی تصویر بھی تاکہ 'ناگ منی' میں اس کا سکیچ جا سکے۔

فہمیدہ بہت یاد آتی ہے۔

تیری کتابوں کے بارے میں مدت ہوئی لندن سے خط لکھا تھا' امید ہے مل گیا ہوگا۔

رشم کا پتہ وہی ہے۔

آئندہ 'ناگ منی' لاہور کے پتے پر بھیجوں یا اسلام آباد کے پتے پر' بتا دینا؟۔

تیری امرتا پریتم

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم!

لگتا ہے۔۔۔۔۔اب میرا خط کبھی تم تک پہنچ سکے گا اور تمہارے خط مجھ تک آ سکیں گے۔ اب فاصلے' مہربان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس بار 'ناگ منی' بھی بھیج رہی ہوں۔ شاید مل جائے۔ اطلاع دینا تاکہ آئندہ باقاعدگی سے بھیج دیا کروں۔

پتہ چلا کہ تمہاری خوبصورت سی بیوی ہے۔ میں 'ناگ منی' کے کالم 'ذکر خیر' کے لیے اس کا انٹرویو چاہتی ہوں۔ فخر زمان سے کہنا تیری بیوی کا انٹرویو کر کے بھیج دے اور تم فخر زمان کی بیوی کا۔ 'ناگ منی' میں یہ کالم دیکھا تو ہوگا۔

ایک اور کالم شروع کر رہی ہوں' میں اور میں' سیلف انٹرویو۔۔۔یعنی اپنے آپ سے ملاقات۔ اپنا سوال' اپنا جواب۔ وہ بھی ضرور لکھ کر بھیجو۔ تم بھی اور فخر زمان بھی۔

بہت پیار سے

امرتا پریتم

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم!

خط ملا' تیری محبت سچی' اس کا حق اور دعویٰ بھی سچا لیکن شکوہ سچا نہیں۔ میں نے جسے بھی 'ناگ منی' کے پرچے اور کتابیں لے جانے کے لیے کہا' ہر ایک نے زیادہ وزن سے ڈرتے ہوئے انکار کر دیا۔ فہمیدہ کے پاس بھی وزن زیادہ تھا' کتابیں نہیں لے جا سکی۔

پچھلے سال ۔۔۔ پریم سنگھ کے ہاتھ میں نے پورے سال کی فائل بھیجی تھی۔ وہ لاہور شہباز ملک کو دے آئے تھے کہ تمہیں کراچی پوسٹ کر دیں۔ پتہ نہیں وہ سارے پرچے تمہیں کیوں نہیں ملے۔

میری کہانیاں یا کچھ بھی چھاپنے کا تمہیں پورا حق ہے۔

لاہور میں نواز چودھری نے مکتبہء شعر و ادب کی طرف سے 'رسیدی ٹکٹ' شائع کی ہے۔ اس میں 'میرا سولہواں برس' والا باب لے کر چھاپ لو۔

جنوری اور فروری کے نئے شمارے بذریعہ ڈاک بھیج رہی ہوں۔

بہت سے لوگ اِدھر آتے ہیں لیکن تمہیں بھی' جیسے بھی ہو سکے' آنا چاہیے۔ کیوں نہیں آتے؟ عُرس کے دنوں میں ہی آ جاؤ۔

امروز کی طرف سے بہت پیار

تیری امرتا

5-1-80

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم

'زندگی نامہ' ٹائٹل کے تحت اُردو اور فارسی کی جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں' وہ مجھے درکار ہیں۔

1-زندگی نامہ، اقبال لاہوری 2-زندگی نامہ، تقی زادہ 3- زندگی نامہ، علی 4-زندگی نامہ، بیرونی

5-زندگی نامہ، شیخ طوسی اور زندگی نامہ، پیشہ دراں سیریز کی کئی کتابیں بھی ہیں۔

اس کے علاوہ نظموں' غزلوں' مضامین (اُردو کے) جن کا عنوان 'زندگی نامہ' ہو (بھی درکار ہیں)

یہاں ہندی کی ایک ادیبہ نے مجھ پر مقدمہ دائر کردیا ہے۔ میرے ناول کا نام ہے ''ہردت کا زندگی نامہ' جبکہ ہندی کتاب کا عنوان تھا 'زندگی نامہ'۔ اس کا دعوٰی ہے کہ لفظ 'زندگی نامہ' اُردو یا فارسی میں استعمال نہیں ہوتا۔ یہ لفظ صرف اسی نے استعمال کیا ہے' جو سراسر غلط بات ہے۔

اسی حوالے کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ کتابیں چاہئیں۔

پیار سے

امرتا

☆☆☆☆

پیارے احمد سلیم

ڈائری بھیج رہی ہوں۔ سارا کی کتاب ابھی کراچی نہیں پہنچی۔ تیرا مضمون 'ناگ منی' میں چھپا تھا' دیکھ لیا ہوگا۔

پاکستان میں 'زندگی نامہ' کے عنوان سے جو بھی کتاب چھپی ہو' وہ مجھے ضرور بھیجنا۔

یہ 'زندگی نامہ' خواہ کسی بھی ادیب کا ہو' یا یہ کوئی مضمون ہو' افسانہ یا کوئی نظم غزل' جو بھی ملیں۔ لفظ 'زندگی نامہ' استعمال ہوا ہو۔

'ناگ منی' باقاعدگی سے مل رہا ہوگا

پیار سے

امرتا

<u>پس نوشت</u>

سندھی ادب میں بھی اگر کسی تحریر میں 'زندگی نامہ' کا استعمال ہوا ہو' تو ان کے حوالے بھیج دینا۔

امرتا

4-2-85

☆☆☆☆

پیارا احمد سلیم!

مدت ہوئی تیرا خط نہیں آیا۔ میں نے 'زندگی نامہ' کے حوالے سے ایک خط لکھا تھا۔ پتہ نہیں' تجھے ملا ہے یا نہیں۔

1- سارا کے بارے میں کتاب لکھ رہی ہوں۔ اس کے لیے اس کے سارے خط' نظمیں' ڈائریاں' جو بھی ہوں' مجھے مل سکیں تو کتاب کا کینوس وسیع ہو جائے گا۔ اسی طرح تم نے جو کچھ بھی سارا کے بارے میں لکھا ہو یا ثروت سلطانہ اور دوسرے دوستوں نے لکھا ہو' وہ بھی مجھے بھجوا دو۔

2- پنجابی اکادمی دِلی۔۔۔۔اگلے سال جنوری میں پنجابی مشاعرہ منعقد کروانا چاہتی ہے' ہند۔ پاک مشاعرہ۔ اس کے لیے تم نے تو آنا ہی ہے۔ باقاعدہ دعوت نامہ اکادمی کی طرف سے پہنچ جائے گا۔ مجھے دوسرے پنجابی شاعروں کے نام بھی لکھ بھیجو' بہت اچھے نام' ان کے پتے بھی' تصویریں بھی تاکہ میں دعوت نامے بھجوا سکوں۔

3- نئی نظمیں ضرور لکھی ہوں گی' 'ناگ منی' کے لیے بھجوا دو۔

4- ثروت (سلطانہ) سے کہو' سارا کے بارے میں اپنا مضمون لکھ بھیجے۔

5- مظہر الاسلام کے بارے میں، میں نے ایک مضمون لکھا ہے جو یہاں ہندی کے سب سے بڑے ہفت روزہ میں چھپا ہے، بھیج رہی ہوں۔ ہو سکے تو وہاں اُردو میں چھپوا دو۔

خط کے جواب کی منتظر ہوں۔

امرتا

17-8-85

☆☆☆☆

پینٹنگ: ظاہر رشید
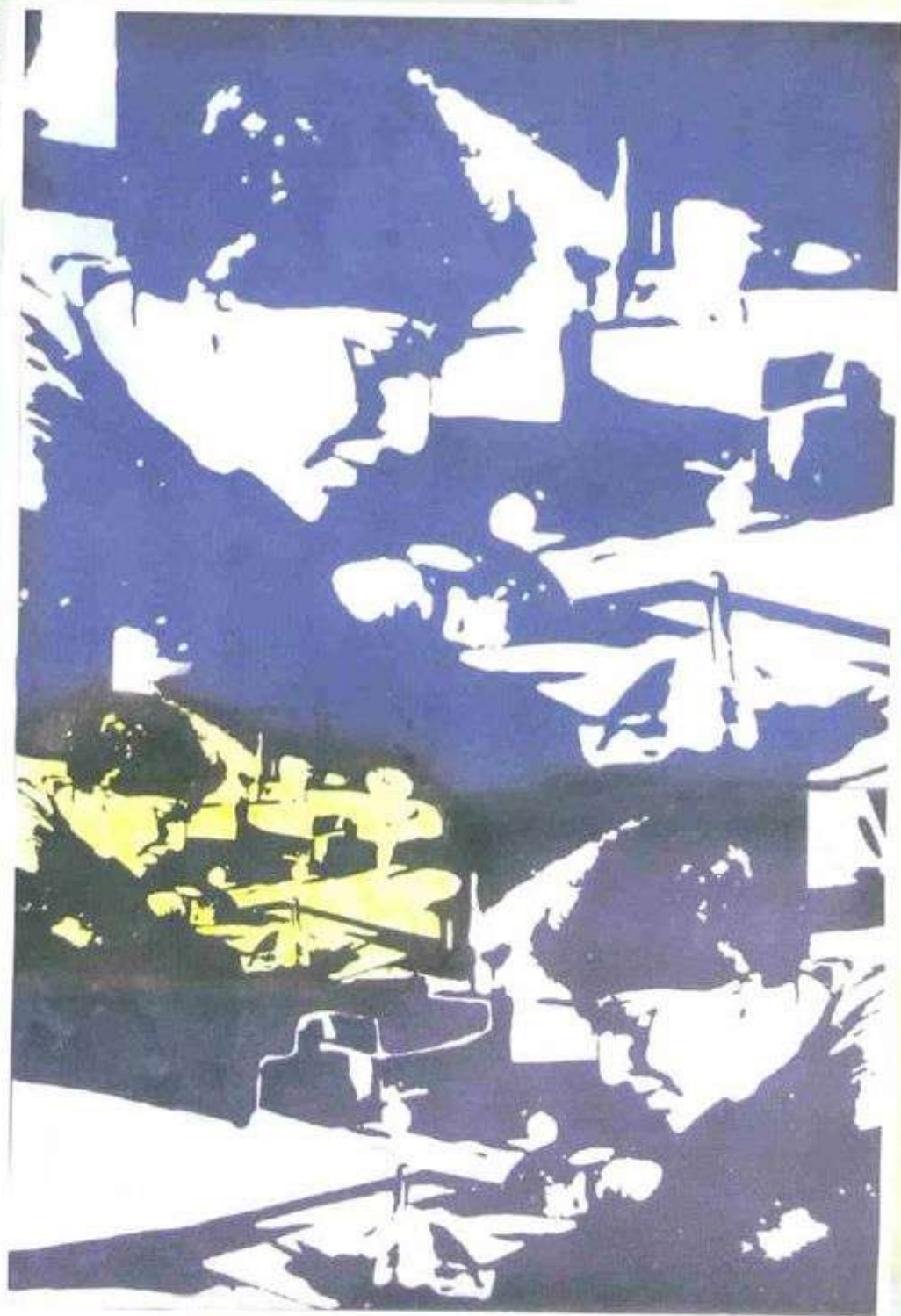
نی جندے میریئے

نی جندے میریئے!

آ نی میریئے جندے!

اجے وی اوہو سُپنے تیرے
اکھیاں وچ لٹکدے . .

پوناں وچ سوگندھاں اُندی
جھمدیاں چوں اتھرو پُندی
شاہ راتاں دی میڈھی وچ
کوئی لکھاں تارے گُندے . .

پر سرگھی دا رنگ گھسمیلا
ترکالاں دا بول کسیلا

دُھناں دا موہنہ پے گیا سوا
اکھیاں نوں پیا مُندے . .

نہ ہندھی نہ چجھی چھوہی
نہ تیری نہ میری ہوئی
پر عشقاں دی کوری کنی
پِندی جاندی اندے . .

تیل بناں جگدے نہ دیوے
جندو باجھ کیویں کوئی جیوے
سورج کولوں منگ کے چانن
چن چمکدے ہُندے . .

تیریاں پیراں نوں راہ لبھے
میریاں پیراں نوں راہ لبھے
آ کھ سے نوں ایس کنڈیالی
دھرتی دا موہنہ رندے . .

بلونت گارگی

امرت کور سے امرتا پریتم تک

اُن دِنوں امرتا پریتم ''امرت کور'' ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں پھاگن کے سالانہ میلہ میں پریت نگر گیا۔ لنگر کے باہر نوتیج سنگھ ملا تو اُس نے یہ خبر سنائی اس بار کوی دربار اچھا رہے گا، امرت کور بھی آئی ہے۔

''راج کماری امرت کور'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھائی گیت لکھنے والی امرت کور بہت خوب صورت لڑکی ہے اور بہت خوب صورت شاعری کرتی ہے۔''

''خوب صورت لڑکیاں کم ہی خوب صورت شاعری کر پاتی ہیں۔۔۔۔۔'' میں نے اظہارِ تعجب کیا۔

نوتیج بولا، ''مگر امرت تو کمال ہی ہے! ابھی اِدھر آئی تو تم سے ملا دوں گا پریت لڑی میں اکثر اُس کی نظمیں چھپتی ہیں۔۔۔۔۔ جذبات سے لبریز محبت سے سرشار عظیم نظمیں۔ خود بھی وہ بہت خوب صورت ہے۔''

امرتا ملی۔ اُس نے آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا جس کے دنبالے کانوں تک پہنچے تھے، میانہ قد، اُس کے چہرے پر ایسی مجسم عورت کا وقار تھا، جسے لوگوں رُوپ وَتی کہہ کہہ کر پُر وقار بنا دیا ہے۔

مَیں نے کہا۔ ''بھئی نوتیج مجھے تو یہ لڑکی خوب صورت نہیں معلوم ہوتی۔''

''کیوں؟''

''بہت معمولی سی ہے۔''

''شام کو کوی دربار تھا، بہت سے کوئیوں نے اپنی اپنی کویتائیں پڑھیں۔ اُمرتا نے بنگال کے قحط پر ایک نظم پڑھی۔''

''کتنا کچھ فالتو''

اُس نے بڑی ادا سے نظم جو روایتی بندھنوں سے آزاد تھی سنائی۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں نوتیج میرے

پاس ہی بیٹھا تھا۔ مَیں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا

''بڑی بوگس ہے یہ نظم! مجھے تو بالکل اچھی نہیں لگی۔''

نوتیج بولا، ''بنگال کے عظیم قحط پر ہے۔''

مَیں نے کہا، ''عظیم قحط ہی لکھنے سے کوئی نظم عظیم نہیں بن جاتی۔ مجھے تو یہ بہت گھٹیا سی لگی۔ اُس نے مجھ پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا۔''

پریت نگر میں جسے بھی دیکھو اُمرتا کی تعریف کرر ہا تھا۔ جیسے کوئی چائے کی پیالی میں گڑ کی پوری بھیلی گھول ڈالے۔ ایسی ہی یہ تعریف تھی مجھے اِس سے کچھ چڑ سی ہوگئی۔

یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اُس کے بعد مَیں بہت عرصہ تک اُمرتا سے نہ ملا۔

پھر مَیں لاہور ریڈیو اسٹیشن پر نوکر ہو گیا۔ وہاں کرتار سنگھ دگل نے بتایا۔

''پہلے کبھی کبھی اُمرتا پروگرام دینے آتی تھی، لیکن اَب اُس نے آنے سے انکار کر دیا ہے؟''

''کیوں؟''

''پتا نہیں۔''

ایک دِن ادیبوں کی میٹنگ تھی، ہم نے اُمرتا کو دعوت نامہ بھیجا۔ وہ نہیں آئی پھر ایک میٹنگ میرے گھر پر ہوئی۔ اُس نے کہلا دیا۔

''کوشش کروں گی۔''

شام کو ٹینس کھیل کر لوٹتی ہوئی سائیکل پر وہ میرے گھر یہ کہنے آگئی کہ کل وہ میٹنگ میں نہ آسکے گی، اُسے ضروری کام ہے۔ مَیں نے بیٹھنے کو کہا۔ اجنبیوں کی طرح بیٹھ گئی۔

نوکر چائے لے آیا۔۔۔۔۔ ''چائے پیو گی؟''

''چائے تو مَیں کم ہی پیتی ہوں۔''

''آج ایک پیالی لیجیے۔''

مَیں نے کیتلی سے ایک چائے کی بھری۔

''اچھا بتایئے! آپ میٹنگ میں کیوں نہیں آرہی ہیں؟''

''مَیں میٹنگ میں جانا پسند نہیں کرتی۔''

''سنا ہے پہلے آپ ریڈیو پر پروگرام دیتی تھیں۔۔۔''

''ہاں!''

''میں نے ستار بجانے کے کچھ پروگرام دیے ہیں۔اَب مجھے ریڈیو اچھا نہیں لگتا۔''

''ریڈیو۔۔۔یا ریڈیو کے لوگ؟''

دونوں۔۔۔ایک عورت کے لیے گھر اور سماج کی ایسی بندشیں ہوتی ہیں کہ وہ اس طرح کے بے تحاشہ کھلے ماحول کو پسند نہیں کر سکتی۔لوگ پان کھا رہے ہیں۔۔۔سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہے ہیں۔چائے کے پیالے اڑا رہے ہیں،۔۔ہاہا' ہو ہو کا ہلڑ مچا ہوا ہے۔

''مجھے اس طرح مردوں میں بیٹھ کر کام کرنا بُرا لگتا ہے۔اِس لیے مَیں نے ریڈیو اسٹیشن جانا چھوڑ دیا۔''

بات ختم ہو گئی۔

''کیا لکھ رہی ہیں آج کل؟ کوئی نظم سنائیے۔''

''کسی دِن ہمارے گھر آیئے تو سناؤں گی۔مَیں نظم سنانے دوسروں کے گھر نہیں جاتی۔''

''اچھا کسی دِن آؤں گا۔''

کچھ مہینوں کے بعد مَیں اُمرتا کے گھر گیا۔اُس نے گھمٹی بازار سے مکان بدل کر انارکلی میں ایک فلیٹ لے لیا تھا۔فلیٹ میں چار پانچ کمرے تھے۔جالی دار پردے تصویریں'صوفے۔

ہم نے چائے پی۔نظم کوئی نہیں پڑھی۔

مَیں نے اپنی جدوجہد کی بات چھیڑی۔اُمرتا نے اپنی جدوجہد کی بات چلائی۔

''آپ کیا جدوجہد کر رہی ہیں؟''

مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

اُن دونوں میرے لیے جدوجہد کا مطلب ''معاشی جدوجہد'' تھا۔مَیں نے تین سال لاہور میں بیکار گھوم کر جگہ جگہ ٹیوشن کر کے آخر کار ریڈیو اسٹیشن پر سو روپے کی نوکری ڈھونڈ لی تھی۔اُمرتا کون سی جدوجہد کر رہی تھی؟''

اُمرتا کی شادی انارکلی کے بہت امیر تاجر کے ساتھ ہوئی تھی۔لاکھوں کا کاروبار تھا۔شام کو وہ ایک

شاندار فٹن میں بیٹھ کر لارنس باغ کی سیر کو جاتی تھی۔

وہ کچھ سوچ کر بولی ''معاشی جدوجہد''

''اگر آپ کو مشکلات کا سامنا ہے تو ایک معمولی انسان کو کتنی ہوں گی۔''

مَیں نے پریشان ہو کر کہا۔

''معاشی' سماجی' جسمانی ۔۔۔ ہر طرح کی پریشانیاں مجھے ہیں۔ پریشانیوں کے جھنڈ ہیں۔ میرے چاروں طرف جتنے ملنے والے آتے ہیں' دو چار کو چھوڑ کر سب ہی پریشانیوں کے پٹارے ہوتے ہیں؟''

اس کا چہرہ زرد اور مضمحل تھا' جیسے کوئی عرصہ سے بیمار ہو۔

''آپ بیمار رہی ہیں؟''

''ہاں! اَب بھی بیمار ہوں ہر چیز کھوکھلی سی لگتی ہے۔ اکثر تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ شعر و شاعری بھی فضول سامن بہلاوا ہے، کیا رکھا ہے اس میں؟ میں اپنی پچھلی نظموں پر نظر ڈالتی ہوں ۔۔۔ چھ کتابیں! ہوں مجھے اس پر کوئی خاص فخر نہیں۔ پتہ نہیں کیسے لکھ ڈالیں اتنی نظمیں! اب ایک بھی نہیں ہوتی جیسے میں رُک کر سوچنے لگی ہوں' یہ سب کیا ہے'' انسان کو کبھی کبھی سوچنے کے لیے رُک جانا چاہیے۔ آج کل مَیں رُک گئی ہوں، اسی طرح میری شاعری بھی رُک گئی ہے' اس لیے کچھ تھکی ہاری لگتی ہوں ۔۔۔۔''

معاف کیجیے ۔۔۔ ''مَیں کیسی باتیں لے بیٹھی ہوں!''

مَیں نے دیکھا اُمرتا میں تھکاوٹ تھی۔ اُس کے چہرے پر زردی بکھری ہوئی تھی۔ چہرے کی لکیریں کھچی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی نے چاروں طرف سے اُس کا چہرہ کس دیا ہو۔ چہرے پر سے فالتو گوشت چھٹ گیا تھا۔ فکر میں سے فالتو سماجی فرائض کی چھال اتر رہی تھی۔ کتنا کچھ فالتو چھٹ گیا تھا۔ مَیں اس دل دیکھ سکتا تھا۔ جو سونے کی ڈلی کی طرح سنار کی بھٹی میں آگ کے نیچے دہک رہا تھا۔

باتیں زندگی کے بارے میں' سماج کے بارے میں' فنکار کی قسمت کے بارے ہوتی رہیں۔ بیچ بیچ میں کوئی اور بات بھی ہونے لگتی۔ چائے کی پیالی بناتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''آپ کو پیاز کے پکوڑے اچھے لگتے ہیں کہ مرچ کے؟''

''مرچوں کے''

''مرد تو مرچوں سے کتراتے ہیں آپ مرچیں کیسے کھا لیتے ہیں؟''

''بچپن میں مَیں نے ماں کی کڑوی باتیں کھائی ہیں۔ یہ مرچیں اُن سے زیادہ کڑوی نہیں۔ بھلا آپ کو مرچیں کیوں خوش ذائقہ لگتی ہیں؟''

''اس لیے کہ مَیں نے اتنی میٹھی چیزیں کھائی ہیں کہ اَب کڑوی چیزیں اچھی نہیں لگتی! اسی طرح تعریف کی بات ہے، مجھے بہت تعریف اچھی نہیں لگتی! ایک دوسرے کی تعریف سے انسان کی بات کا معیار ایک خاص سمت میں اونچا نہیں اٹھتا۔ محبت اور نفرت ۔۔۔۔خیالات کے دو عکس، دو گہرائیاں۔۔۔۔۔زندگی کی تصویر دکھاتے ہیں۔''

''آپ کا عقیدہ پیار پر ہے یا نفرت میں؟''

''نفرت بھی اتنی قابل نفرت چیز نہیں۔ پیار کا الٹا پہلو ہی تو ہے۔ دوپٹے کے سامنے پیار اور اُلٹی طرف 'جہاں آپ کو ٹانکے نظر آئیں، نفرت ہے۔ کئی لڑکیاں دوپٹے کو سیدھے طرف سے اوڑھتی ہیں اور کئی اُلٹی طرف سے۔'' آپ شاعری کا دوپٹہ کس طرف اوڑھتی ہیں؟''

''آج کل مَیں اوڑھنی کو اُلٹی طرف سے کاڑھ رہی ہوں' نفرت کی سوئی سے۔''

اس کا منہ اور بھی کھنچ گیا اور اس کی ناک سوئی کی طرح تیکھی تیکھی لگنے لگی۔

ہم دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اُس نے پھر چائے منگوائی۔ مَیں کبھی چائے کو نہ نہیں کہتا۔ میری وجہ سے اُس کو بھی کئی پیالیاں پینا پڑیں۔

مَیں نے کہا۔'' آج ایک روڈ پر دو چھرے بازیاں ہوئیں۔ دو آدمی مرے۔ کئی دوست لاہور چھوڑنے کی سوچ میں ہیں۔ مارکاٹ میں آپ کہاں جائیں گی؟''

''کہیں بھی نہیں۔''

''رہیں گی کہاں؟''

''لاہور میں ہی۔ یہ فساد تو کچھ لوگوں کا پاگل پن ہے۔ نفرت کا پھوڑا پھٹ گیا ہے۔ گندا خوں بہہ رہا ہے اس کے بعد آرام ہو جائے گا۔ مَیں نہیں چھوڑوں گی۔ لاہور کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں کی گلیوں کے موڑ' انارکلی' راوی' لارنس باغ ہر چیز سے مجھے پیار ہے۔ لاہور چھوڑ کر مَیں نہیں جاؤں گی۔''

شام گہرا گئی۔ انارکلی میں بجلی کی بتیاں جل اٹھیں۔ مَیں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''اچھا کبھی ملے تو نظم سنا دوں گی۔ اس وقت میرے پاس کوئی اچھی نظم نہیں'' اُس نے الوداع کہی۔

فسادوں کا زور بڑھتا گیا۔ لوگ لاہور چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ پنجاب کی راج دہانی چھن جانے سے بہت سے لوگ دلی آگئے۔ اُمرتا پریتم بھی آگئی اور ریڈیو اسٹیشن پر کام کرنے لگی۔

لوگ پان کھا رہے ہیں' سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہے ہیں' چائے کی پیالیاں اڑا رہے ہیں' ہا۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔ہو۔۔۔۔ہو۔۔۔۔کا ہلڑ مچا ہوا ہے۔ ان مردوں کے بیچ بیٹھی اُمرتا کام کر رہی تھی۔

فسادوں میں اُس کا گھر لٹ گیا تھا۔ اُس کی کتابیں' اُس کی بگھی اور جالی دار پردے اور کوٹھی وہیں رہ گئے تھے۔ دلی میں آ کر وہ پٹیالہ ہاؤس کے سرونٹس کی کھولی میں رہنے لگی۔ جب بڑے بڑے ٹھکیدار کاروباری آ کر اپنے نام مکان اور دکانیں الاٹ کروا رہے تھے۔ اُمرتا نے اپنے نام صرف پیار اور درد الاٹ کروالیا تھا۔

ساون کا مہینہ تھا بادلوں کے سرمئی کنارے نیچے ہی نیچے لٹک رہے تھے۔ جیسے بوڑھے امیر کی بندھی ہوئی پگڑی کھل گئی ہو۔ برسات اَب ہوئی مَیں اُمرتا کے گھر میں تھا۔ اُس نے کہا۔

''کالی داس نے میگھ کا دوت بنا کر ٹھیک ہی بھیجا تھا۔ پیار کا پیغام سرکاری ڈاکیہ نہیں لے جاسکتا۔ پرانے وقتوں میں کبوتر لے کر جاتے تھے اور اس سے بھی پہلے بادل' بادل اَب بھی پیغام لے کر جاسکتے ہیں اگر کوئی اُن کو اپنا پیغام ان بادلوں کو ہی دینا چاہتے ہوں، چور کی ماں کی طرح اُن کا دل بہت گہرا ہوتا ہے۔ یہ پریتم کا سارا بھید چھپا کر لے آتے ہیں اور لے جاتے ہیں۔''

ایک دم مَیں نے اس سے سوال کیا

''تم کس سے پیار کرتی ہو؟''

''اپنے آپ سے''

''جھوٹ''

وہ کچھ دیر چُپ رہی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھایا اور ہنسنے لگی۔ پھر دفعتاً گمبھیر ہوگئی اور اُس کی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں گہرائیاں چھاگئیں۔

''میرا پیار دل سے اندر کر باہر نہیں چھلکتا' یہ سکوت ہے' خاموش چُپ چاپ' پہاڑوں میں گھری ہوئی گہری جھیل کی طرح مردوں کا پیار ڈومنی کی ندیا کی طرح اچھن اچھن پڑتا ہے مَیں ایسے پیار کو اچھا نہیں سمجھتی۔ مرد اپنے پیار کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ عورت اسے چھپاتی ہے۔ مرد اس کو چوراہے پر رکھ کر لوگوں کو دکھا دکھا کر خوش ہوتا ہے۔ عورت اپنے آنچل میں سمیٹ کر گانٹھ باندھ لیتی ہے اور اَب رات کے اندھیرے میں جب کوئی نہیں

ہوتا' تو وہ اسے دیکھتی ہے اس کے ساتھ کھیلتی ہے' جیسے جگنو آدھی رات میں روشنی سے کھلتا ہے۔۔۔۔۔اس کی روشنی میں مست اور کوئی آ جائے تو ایک دم اسے منہ میں رکھ کر خاموش ہو جاتی ہے۔

اُمرتا نے محبت کی نظمیں لکھیں۔۔۔۔۔گورکی اس لڑکی کی طرح جسے ایک پوشیدہ محبت کرنے والے سے محبت تھی اور جو دونوں کی طرف سے خط لکھتی تھی۔اپنے آپ ہی پوسٹ کر کے آپ ہی پڑھ لیتی اور خوش ہو جاتی تھی۔اُمرتا کا یہ پیار مجھے اس طرح لگا، لیکن نہیں اُمرتا کے پیار میں گورکی کے پیار کی بھوکی اُس لڑکی کی طرح ایک زمانہ کی آواز تھی' ساتھ ہی اتھاہ۔۔۔۔۔سمندر کی جیسی خواہش اور جذبہ۔اس محبت کے جذبے کا سمبل ایک انسان تھا' کوئی تصوراتی دیوتا نہیں ایک مرد۔

ایک د،ن اُس نے اپنی نئی نظم سنائی۔!

''امبر''۔۔۔۔

ناریل کا پیڑ ہے

اور نیا چاند

سفید کھوپرے کی پھانک

ناریل کو کس نے توڑا؟

آج جس نے اس کا پانی چکھا۔

نظم سُن کر مَیں نے پوچھا۔

''تمھیں ناریل کا خیال کہاں سے آیا؟''

''ناریل کا خیال۔۔۔۔۔''وہ سوچنے لگی۔

''بھلا تم کیا سوچ رہی تھیں جب یہ گیت لکھا؟''

''مَیں اُس وقت بمبئی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔بمبئی یاد آ رہی تھی۔مجھے بمبئی اچھی لگتی ہے''۔

''کیوں؟''

''وہاں میرے احباب ہیں۔شاید مَیں نے بمبئی میں سمندر کے پتلے کناروں پر اُگے ناریل کے پیڑ دیکھے تھے اور اُن میں سے جھانکتی چاند کی پھانک۔اس طرح کے نقش میرے دل پر منقش ہو گئے تھے،اُن کا خیال آ رہا تھا۔''

میں نے کہا کہ!

''ٹھیک! لیکن مجھے اِس گیت میں ایک مرد اور عورت کے بھرپور پیار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔'' امبر ''مرد کی علامت ہے اور زمین عورت کی۔ تم نے امبر کو پکارا ہے اور ناریل کا پیڑ لکھا ہے۔ ناریل کا پیڑ مرد کی علامت ہے تم نے چاند اور سفید گری کا ذکر کیا ہے، جو عورت کا رُوپ ہے ہر تہوار پر مبارک کام شروع کرنے سے پہلے مرد کے پہلی بار ملنے اور ان کی اٹوٹ محبت کی علامت ہے' تمھارا گیت عورت اور مرد کے گہرے جسمانی اور روحانی لطف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''

وہ سوچنے لگی۔۔۔

اُس نے یہ سب کچھ نہیں سوچا تھا۔ اُس نے صرف تاثرات محسوس کیے تھے اس کے حساس میں، دل میں چاہے صرف بمبئی کا ساحل کا پیڑ اور چاند تھا، لیکن اُس کے تحت الشعور میں ایک بھرپور عورت اور مرد کے جذبات سے بھرا عکس تھا۔

اُس نے دوسری نظم پڑھی۔ یہ کسی کے خط کے جواب میں لکھی تھی۔

اُس کے زیادہ تر گیت دِل کے راز ہیں۔ کبھی اداس، کبھی غمگین، کبھی محبت سے لبریز پکار اور کبھی جذبات کی کرنیں، کبھی وہ شکایت کرتی، کبھی خواب دیکھتی ہے۔ یہ سارے گیت آپ بیتی ہیں۔ اسی لیے اِس میں درد بھی ہے اور اثر بھی۔

میں نے کچھ دیر رُک کر پوچھا

''امرتا'' تمھیں پیار نے بہت دُکھ دیا ہے۔''

''بہت''

''بہت؟''

''ہاں۔۔۔ دُکھ اور سکھ بھی۔ پیار کی دین دُکھ ہے لیکن اس کی جڑوں میں سکھ ہے اِسی طرح سکھ کی کوکھ سے بھی دُکھ جنم لیتا ہے، لگتا ہے جیسے چیزی کی دو سرے ہوں۔۔۔ ایک دُکھ اور ایک سکھ۔۔۔ میں نے چیزی سر پر اُوڑھ لی ہے اور اِس کے دونوں کنارے اپنے دانتوں میں دبا لیے ہیں۔''

انھی دِنوں میں نے اس کی ایک اور نظم اس کی ڈائری سے پڑھی ایک سوال میرے دماغ میں چکر کاٹتا رہا یہ گیت اس نے کسی دوست کے ساتھ انڈیا گیٹ پر سیر کرتے ہوئے لکھا اور ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

اس کے پہلے گیتوں میں، کھلے پھولو، بادلوں کے آنچلوں اور قوس وقزح کا ذکر تھا۔ جذبات کا طوفان تھا، خاموشی نہیں، اس وقت وہ بے چین تھی اور کسی انجانے پیار کی ناشناس مٹھاس کا ذکر کر رہی تھی۔

دھیرے دھیرے اسے ڈھونگ، جھوٹی اوٹ اور سماج کے ٹھیکے داروں سے چڑ ہونے لگی۔ سماج کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کا بنایا ہوا قانون، جس کو وہ خود نہیں مانتے لیکن اندھا دھند دوسرں پر لاد دینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکا، ملمع کی سی جھوٹی پرت اتر گئی' آسمان اونچا اونچا لگنے لگا۔ زمین چوڑی چوڑی اور پیڑوں' پتیوں اور سورج اور تاروں کی نئی شکل دیکھنے لگی۔

اس کے بعد بمبئی چلی گئی اور کئی مہینہ تک میری اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ جب دوبارہ دِلی آئی، تو وہ بہت کھوئی ہوئی اور اداس تھی جیسے کوئی چیز کہیں بھول آئی ہو۔

کچھ دِنوں بعد ملاقات ہوئی، مَیں نے کہا۔

''مطلع کس قدر صاف ہے!''

''ہوگا'' اُس نے جواب دیا۔

''دھوپ کتنی کن کنی ہے!''

''ہوگی''

''گھاس کتنی ہری ہے''

''ہوگی''

آج کل اُمرتا کی کوٹھی ہری ہے۔ نچلی منزل میں وہ خود رہ رہی ہے اوپر کی چھت تیار ہو رہی ہے۔ اسے جب بھی ٹیلیفون کرو، وہ سمینٹ کا نرخ سنگ مرمر کی قسمیں' ساگواں اور شیشم کی خصویات اور انیٹوں کی گرانی کی ہی بات کرتی ہے۔

''جب میں پہنچا'' اوپر کی چھت کی رگڑوائی ہو رہی تھی۔ مزدور مشین سے اوپر کے فرش کو رگڑ رہے تھے۔ سارا گھر اُس آواز سے گونج رہا تھا۔

مَیں نے کہا

''تیرے گھر میں بڑا شور ہے!''

اُمرتا بولی بس ایک ہفتہ اور ہے یہ شور۔۔۔۔اس کے بعد بالکل خاموشی ہو جائے گی۔۔۔۔سکون!
مجھے اس گھر کی بہت خواہش تھی۔''

''یہ شور نہیں۔'' کیونکہ اسی میں مجھے خاموشی کی آس ہے لیکن کافی ہاؤس کے شور سے مجھے نفرت ہے' جہاں لوگ بول رہے ہوں۔ زور زور سے باتیں کر رہے ہوں۔۔۔۔۔یوں لگتا ہے جیسے کتے بھونک رہے ہوں۔''

''اتنی بڑی کوٹھی میں تُو اکیلی رہتی ہے؟۔۔۔۔اس کی رکھوالی کے لیے کوئی کتا کیوں نہیں رکھ لیتی؟''

''کون سا کتا اچھا رہے گا؟''

''بل ڈاگ بل ٹیریر'' آل سیشن یا کوئی دیسی کتا' دیسی کتے دیسی عورتوں کی طرح خونخوار اور وفا دار ہوتے ہیں۔''

''مجھے کوئی کتا ضرور رکھنا چاہیے۔ میری کوٹھی اکیلی ہے۔۔۔ بالکل ایک طرف آگے نیم کا گھنا پیڑ ہے اور خالی کنواں' مجھے کتا ضرور رکھنا چاہیے۔ اکیلی ہوتی ہوں۔۔۔۔

بہت ڈر لگتا ہے۔ باہر کتا بندھا ہو گا تو ہر ایک پھیری والا، چندہ مانگنے والا، درشن کرنے والا نہیں آسکے گا ان درشن بازوں سے بڑی نفرت ہے۔''

''تیرا مطلب ہے پڑھنے والوں سے۔''

وہ ہنسنے لگی۔۔۔۔

''نہیں پڑھنے والے تو خط ہی بھیجتے ہیں، لیکن ہر نیا شاعر اور افسانہ نگار۔ اپنی کہانی یا نظم سنانے آتا ہے۔ عام طور سے پہلے یہی کہتا ہے کہ درشن کرنے آیا ہے۔ کچھ افسانہ نگار بڑی انکساری کے ساتھ آتے ہیں مجھے انکساری سے بھی ڈر لگتا ہے اکثر یہ انکساری والے۔''

''انکساری'' تیزی' مٹھاس' اُمرتا۔۔۔۔!۔۔۔تیرے گھر میں بڑا شور ہے۔'' اس نے کہا

''کچھ لوگ بہت اَدب سے ملتے ہیں' لیکن دو دن بعد ہی اپنا عشق ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر دیتے ہیں جیسے کوئی الا ئچی کی طرح پیش کرے۔ مجھے اس عشق سے نفرت ہے جو الا ئچی کی طرح پیش کیا جائے۔

''کیا تو نے کسی سے نفرت کی ہے؟''

''پوچھ پیار کس سے کیا؟''

چلو یہی سہی!''

''مَیں نے جسے پیار کیا، اُس کے بارے میں لکھا ہے؟''

''تُو نے کتنے مردوں سے پیار کیا ہے؟''

وہ خاموش ہوگئی اور باہر دیکھنے لگی، جہاں نیم کی ٹہنیاں کانپ رہی تھیں۔ اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی نہیں دوڑی' بلکہ درد کی لکیریں پھیل گئیں۔

اُس نے کہا'' دو مردوں کو پہلے سے تو نفرت کا سوال ہی نہیں۔۔۔۔''

''اُس کا جب بھی خیال آتا ہے۔ ہمیشہ خوب صورتی کا خیال آیا۔۔۔۔کومل سندرتا کا اُس کی آواز بہت سہانی تھی ایک بار اُس کی آواز مَیں نے ٹیلیفون پر سنی اور نظم لکھی۔ اُس آواز کو مَیں نے ہمیشہ سندر کشش کی شکل میں دیکھا۔ وہ کبھی غصہ سے نہیں بھٹکا۔ جب کبھی اُسے غصہ آیا وہ چپ ہوگیا۔ اُس کا پیار بے لوث تھا۔ خدا کی طرح۔''

''بکواس''

مَیں نے اُس کے تصور پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا

''وہ بولی ہاں بکواس ایشو اور پیار دونوں بکواس ہیں''

''اس آدمی کا نام کیا تھا؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیا پتہ وہ ناراض ہو جائے۔''

تو دیہاتی عورت کی طرح ہے جو اپنے خصم کا نام نہیں لیتی۔ اگر اس کے خصم کا نام گلاب سنگھ ہو تو وہ پھولوں کی بات کرے گی گلاب نہیں کہے گی۔

وہ کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

''ہاں مجھے دیہاتی عورت ہی کے کچھ رسم و رواج اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔مہندی، سرماسی، کڑواچوتھ۔۔۔۔۔۔''

''کیا تو کڑواچوتھ کا برت رکھتی ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''جب میرا شوہر کے خصم ہونے پر عقیدہ تھا۔ اُس وقت میں برت نہیں رکھتی تھی۔ اَب جب خصم کے شوہر ہونے پر یقین نہیں رہا تو کڑوا چوتھ کا برت رکھتی ہوں۔''

مَیں نے بات کا رُخ بدل کر کہا ''تو اپنے پریموں کا ذکر کر رہی تھی۔ پہلا پریمی مجھے وہم سا لگتا ہے۔۔۔ مایوس اور دوسرا؟''

''دوسرا پہلے سے بالکل الٹا ہے، بہت ہی سادہ۔۔۔۔ مَیں نے اُس کا پیار بھی دیکھا ہے۔۔ مَیں نے اس کی خوب صورتی بھی اور کرختگی بھی۔''

''تو بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہی ہے؟''

اُمرتا میز پر دو گھڑیاں پاس پاس رکھے ہوئے تھی اور وہ اُنھیں بار بار چھیڑ رہی تھی۔

اُس نے کہا

''دونوں گھڑیوں کا وقت ملا رہی تھی۔۔۔''

''دو گھڑیاں کبھی نہیں دیکھیں۔''

مَیں نے پوچھا

''کہاں سے خریدی ہیں؟''

وہ زور زور سے ہنسنے لگی

''یہ دونوں گھڑیاں میرے دو پریموں نے دیں۔۔۔ دونوں کو نہ جانے کیا سوجھی۔۔۔ یہ گھڑیاں سوکنوں کی طرح ہیں۔۔۔ ان میں کوئی بات ضرور ہے۔ کب مجھ سے میرا دوسرا پریمی روٹھ جاتا ہے تو دوسری گھڑی بند ہو جاتی اور پہلی گھڑی چلنے لگتی ہے اور جب وہ مان جاتا ہے تو پہلی گھڑی رُک جاتی ہے اور دوسری گھڑی ٹِک ٹِک کرنے لگتی ہے ایک بار مَیں نے دونوں گھڑیاں لگا ئیں۔۔۔ گھڑیوں کا جوڑا۔۔۔ وقت کا جوڑا۔۔۔ پگھلتے ہوئے وقت کے گول دائرے''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اُس کے چہرے کے پیچھے سلگتی ہوئی کسی فکر نے اُس کی خوشی جذب کر لی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

وہ خاموش رہی۔

مَیں اُسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ اُس امرتا کو جو لاہور کے فسادات کے بعد اجڑ کر دِلی شہر میں آئی

اور دھیرے دھیرے اُس نے اپنے فن کو نکھارا اور سماج میں اپنے لیے بہت اونچا مقام بنایا۔ اُس کا لڑکا کالج پڑھتا ہے۔ اُس کی جوان بیٹی اپنی خوب صورت ماں کے انداز اور بالوں کے اسٹائل کی نقل کرتی ہے۔ اُس کی کتابیں ترجمہ ہو کر ہندی، اُردو، گجراتی اور بہت سی غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اُس کی دو منزلہ پکی کوٹھی تیار ہو رہی تھی۔

مَیں نے پوچھا۔

''تو کیا سوچ رہی ہے؟''

وہ بولی

''میں محفوظ محسوس کر رہی ہوں، کتابیں، بچے، گھر، کوٹھی۔۔۔۔۔ سب کچھ ہے لیکن مَیں خود کو ایک عورت کے لیے اس سے بڑا خو، اس سے بڑی مایوسی، اس سے بڑی شکست کیا ہو گی کہ اس کا پریم کامیاب رہا؟ اسے اپنے پریم کے لحہ لحہ بدلتے رُوپ کا پتہ نہ چلے۔ اِس پریم کا مستقبل کیا ہے۔۔۔ مَیں نہیں جانتی۔ مَیں نے کل کے بارے میں سوچنا بند کر دیا ہے، بس آج؟ مَیں صرف اِس لحہ کی مسرت میں زندہ ہوں۔۔۔ ایک ناکامیاب زندگی مَیں نے بمشکل اختیار کر لی ہے۔ مَیں اس کی طرح ہوں۔ جو روزانہ کماتی ہے اور کھا پکا کر سو جاتی۔ کل اُسے کام ملے گا یا نہیں' وہ نہیں جانتی۔ میرا پریم۔۔۔ ایسا ہی ہے۔''

اچانک خاموشی چھا گئی۔ گہری گھنی خموشی چھت کے اوپر گرجتی ہوئی مشین بند ہو گئی تھی۔ ایک بج چکا تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے لگے تھے۔ اُمرتا اس کی طرح بیٹھی تھی، جس نے صبح سے ریت کے کئی چھوٹے چھوٹے گروندے بنائے اور اَب بار بار ڈھا رہی تھی!!

☆☆☆☆

امرتا پریتم

گورمکھی سے اردو زبان میں ترجمہ و انتخاب: احمد سلیم

سُرخ دھاگے کا رشتہ

(دوسری خودنوشت سوانح عمری ''سُرخ دھاگے کا رشتہ'' سے اقتباسات)

ساحر

میں نے اس زندگی میں دو بار محبت کی ہے۔ پہلی ساحر سے' اور دوسری امروز سے۔ ساحر کو میں نے آج سے تقریباً پینتالیس برس پہلے' پریت نگر ضلع امرتسر کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ میں نے اپنی کتاب 'رسیدی ٹکٹ' میں اس ملاقات کا ذکر لکھا ہوا ہے کہ اگلے روز جب ہم سب نے پریت نگر سے واپس لاہور پہنچنا تھا' اور ہم کو جو بس ملنی تھی' وہ ایک نزدیکی گاؤں لوپوکی سے ملنی تھی' جہاں تک ہم سب نے پیدل چل کر جانا تھا۔ اور وہ راستہ چلتے ہوئے میں کتنا ہی فاصلہ اس جگہ پر چلتی رہی' جہاں ساحر کے جسم کا ایک لمبا سایہ پڑ رہا تھا۔ اور اس کے بعد۔۔۔ برسوں تک مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں ہمیشہ اس کے سائے میں چلتی رہی ہوں۔

یہ اس زندگی کی وہ حقیقت تھی' جو میں نے بسر کی تھی' اور لکھی تھی۔ لیکن یہ کس جنم کا سایہ تھا' اب جس سائے میں' میں چل رہی تھی' یہ نہیں جانا۔

یہ میں نے 1983 کی 5 جنوری کی رات کو جانا' جب گزشتہ جنم کو دیکھتے' میں نے اس محل کے راجے کی صورت میں ساحر کو دیکھا' جہاں 8 مارچ والے دن اس کی بیوی کی صورت میں' میں نے قدم رکھا تھا اور 29 دسمبر والے دن مجھے ایک عورت نے زہر کا پیالہ دے کر مروا دیا تھا۔

یہ تاریخیں۔۔۔ میرے سپنے نے مجھے بتائی ہیں۔۔۔

آج جب جنم جنم کے یہ ٹوٹے تار آپس میں جڑ رہے ہیں' تو اس جنم میں ساحر کے لیے میری محبت کی وجہ

آسانی سے میری سمجھ میں آ رہی ہے۔

اور یہ بھی۔۔۔۔ کہ 8 مارچ' چیت کا مہینہ بنتا ہے' جب اس جنم میں' میں نے کتنی ہی وہ نظمیں لکھیں' جن کا نام چیت ہے۔۔۔

یہ ساحر سے ملاقات تھی' کہ جب نظم لکھی تھی۔۔۔

دونویں لوک میرے رُشنائے

دوا کھاں نوں لبھا آ کے 'ٹور گواچا ہویا۔۔۔

نہیں جانتی تھی' کہ اس وقت یہ کیوں لکھا' کہ ایک گم شدہ نور آج میری آنکھوں کو ملا ہے۔ میں یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ گم ہو جانے کا احساس میرے اندر 1868 سے پڑا ہوا تھا۔۔۔

ایک اور نظم لکھی' جس کی دو سطریں ہیں۔۔۔

دونویں نین ویراگے میرے بھر بھر کے اج رُنے

ست سمندر بیراں اگے کعبہ پرلے بنّے۔۔۔۔

اس وقت میں اس ''پرلے بنّے'' لفظ کو گزشتہ جنم کے ساتھ نہیں جوڑ سکی تھی۔ اور نہ ہی ست سمندر کی دوری کو پچھلے جنم کی دُوری کے ساتھ۔

ایک جنم میں یہ بھی لکھا تھا۔۔۔

پیار تیرے دیاں کچیاں گنڈاں' توں نہ سکیوں کھول

پیار مرے دیاں کچیاں گنڈاں' میں نہ سکیاں کھول۔۔۔

میں اس وقت یہ نہیں جانتی تھی کہ میں نظم میں جن گانٹھوں کا ذکر کر رہی ہوں' وہ پچھلے جنم نے باندھی تھیں اور جن کو یہ جنم بھی نہیں کھول سکا تھا۔

اس نظم میں دو سطریں تھیں۔۔۔

کھول کھول کے لوک ہاریا' کھول کھول پر لوک

کیہڑے رَب دا زور وسدا' دو تنداں دے کول

آج یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ میرے شعوری دل سے چوری میرے لاشعور دل نے ان گانٹھوں کو زبردستی کھولنے والے ''لوک'' کا ذکر بھی کر دیا تھا اور ''پرلوک'' کا بھی' مگر مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ''لوک'' کا معنی

مجھے مردانے والوں سے تھا اور ''پرلوک'' کا معنی اس وقت کی موت سے اگلے وقت کا تھا۔۔۔

اسی طرح ایک اور نظم تھی۔۔۔۔

رایہہ رات جیکن رحمتاں دی بدلی وردی رہی
ایہہ رات تیرے وعدیاں نوں پُوریاں کردی رہی
بہت اُچیاں ہن دیواراں، روشنی دِسدی نئیں۔۔
رات سپنے کھیڈ دی ہے، ہور کُجھ دِسدی نئیں

او خدایا! میں ''بہت اُچیاں دیواراں'' کا ذکر کے بھی نہیں جانا کہ میں دو لفظوں کے درمیان پڑی ہوئی دیواروں کی بات کر رہی ہوں، جن کے بارے میں کوئی روشنی نظر نہیں آتی۔

اس جنم میں تو کوئی وعدہ نہیں تھا، پھر یہ کون سے وعدوں کا ذکر میں نے نظم میں کیا تھا؟

جب نظم لکھی اس وقت نہیں جانتی تھی لیکن اب جانتی ہوں۔۔۔ یہ پوری نظم میں نے سپنے میں لکھی تھی۔ اس سپنے کا پہلا حصہ تھا کہ مجھے تیز بخار ہے اور ساحر نے آرام سے میرے تپتے ماتھے پر ہاتھ رکھا ہے۔ میں اس کے ہاتھ کے لمس سے بخار کی بے ہوشی میں بند سی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھتی ہوں اور کہتی ہوں ''میں نے سوچا تھا، تم کبھی نہیں آؤ گے''۔۔۔۔ اور اس نے جواب دیا ''مجھے تو علم تھا کہ میں آؤں گا''

اور پھر سپنے میں مجھے جاگ آ جاتی ہے۔ وہ جاگ بھی سپنے کا حصہ تھی۔ اس وقت میں نے پوری ایک نظم لکھی تھی۔۔۔۔

ایہہ رات ساری تیرے خیالاں، چہ گزار کے
میں ہنے ہنے جاگی آں، ستے بہشتاں اسار کے
ایہہ رات جیکن رحمتاں دی بدلی وردی رہی۔۔۔
ایہہ رات تیرے وعدیاں نوں پُوریاں کردی رہی۔۔۔
پنچھی دی ڈار بن کے خیال کئی آوندے رہے
ہونٹھ میرے ساہ تیرے دی مہک نُوں پیندے رہے۔۔۔
بہت اُچیاں ہن دیواراں، روشنی دسدی نئیں۔۔۔
رات سپنے کھیڈ دی ہے ہور کُجھ دسدی نئیں۔۔۔

ہر میرا نغمہ جیویں میں خط کوئی لکھدی رہی

حیراں ہاں' اک سطروی تیرے تک پجدی نہیں ---

اور جب اس سپنے سے جاگ آئی تھی' میں نے یہ نظم صرف کاغذ پر نقل کی تھی' آج سوچتی ہوں کہ یہ بھی خدا کا کرم ہوا ہے کہ میں نے اس قول واقرار کے مہینے کا دیدار پایا ہے' جس کے بارے میں خود ہی لکھا تھا اور جانا نہیں تھا ---

آوندا تے لنگھ جاندا تیرے قولاں دا مہینہ

میلاں دے میل لمبے ریتاں دے نال اُنے

جیویں ڈاچیاں نوں بدھی ٹلی دا کھڑاک آوندا

تیرے قولاں دا مہینہ -----

اور ڈاچیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز اب میں نے کانوں سے سن لی ہے ---

نہیں جانتی تھی کہ میں نے ساحر کی محبت میں یہ کیوں لکھا تھا؟

دھرتی دا ہوکا نکلیا آسمان نے سسکی بھری ---

پھلاں دا سی اک قافلہ' تتے تھلاں چوں گزریا ---

اور نہیں جانتی کہ میں اپنے ہی گزشتہ جنم کی داستان لکھ رہی تھی --- اور اپنے ہی قتل کی رات کا ذکر کر رہی تھی --- "یہ کس طرح کی رات تھی' آج دوڑ کر گزری جب چاند کا ایک پھول تھا' پاؤں کے نیچے آ گیا ---"

کوئی غیبی قوت تھی جو میری ساری زندگی مجھے میرے گزشتہ جنم بارے اشارہ دیتی رہی۔ اور محسوس ہوتا ہے --- جب اس نے یہ سمجھ لیا کہ میں اس کے اشارے کی زبان نہیں پڑھ سکتی --- تو اس نے اس منظر کی صورت میں مجھے کچھ دکھا دیا جو میں سمجھ سکتی تھی ---

آج یہ سب کچھ سوچتی ہوں تو اس کے کئی اشارے سامنے آتے ہیں جو اس نے مجھے دکھائے تھے۔ ان میں سے ایک اشارہ اس سپنے کی صورت میں تھا' جس میں' میں نے ہی خود کو ایک ققنس کی شکل میں دیکھا تھا۔

دیکھا تھا کہ ایک جنگل پھولوں کا بھرا ہوا ہے۔ جس میں ایک پھولوں سے لدے درخت پر بیٹھ کر ایک ققنس گا رہا ہے۔ اور پھر جوں جوں اس کا گیت اونچے سُروں میں ہو جاتا ہے اس میں اتنی مٹھاس اور اتنی تلخی پیدا

ہو جاتی ہے کہ اس کے پروں میں سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ وہی آگ کے شعلے پھر اتنے اونچے ہو جاتے ہیں کہ وہ ققنس اپنی ہی آگ میں راکھ ہو جاتا ہے۔۔۔

آگ کی تپش سے ہی میری نیند کھل گئی تھی۔ اس وقت میرا ماتھا' میرے ہاتھ' اور میرا انگ انگ جل رہا تھا۔ اس تپتے ہاتھ میں' میں نے قلم لے کر۔۔۔۔۔ ایک نظم لکھی تھی۔۔۔

لکھ جا میری تقدیر نوں میرے لئی
میں جی رہی تیرے بناں تیرے لئی۔۔۔
حرف میرے تڑپ اُٹھدے ہن ایویں
سلگدے ہن رات بھر تارے جیویں
عمر میری بے وفا اُمکدی پئی۔۔۔۔۔۔
رُوح میری بے چین ہے تیرے لئی۔۔۔
سپنیاں نوں چھیڑ کے آجا ذرا۔۔۔
رات باقی بہت ہے نہ جا ذرا۔۔۔
ققنس دیپک راگ نوں اَج گائے گا۔۔۔
عشق دی ایس لاٹ تے جل جائے گا۔۔۔۔
راکھ ہی ایس اگ دا انجام ہے۔۔۔۔
ققنس دی ایس راکھ نوں پرَ نام ہے۔۔۔۔

اس سپنے اور اس نظم کے بعد' میں کئی مہینے پاؤں میں جوتی نہیں پہن سکی تھی۔ پاؤں جلتے تھے۔ کئی بار میں کچی مٹی پر پانی چھڑک کر اپنے دونوں پاؤں اس مٹی پر رکھ چھوڑتی تھی۔۔۔

آج محسوس ہوتا ہے۔۔۔ میں جس قوت کا اشارہ نہیں سمجھی تھی' میرے لاشعوری دل نے مجھ سے ایک اس طرح کی نظم لکھوائی تھی جس میں اس کے اشارے کو سمجھ کر مجھ سے میرے گزشتہ جنم کی چتا کی راکھ کو پرنام کروایا تھا۔۔۔

جب ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی اس وقت ایک سپنے نے مجھے بڑا سیدھا اشارہ دیا تھا' لیکن میں ہی اس کا اشارہ سمجھی نہیں تھی۔

سپنا آیا تھا کہ سامنے ساحر کی پشت نظر آ رہی ہے۔ اس کے پتلے جسم پر کھلی اور سفید قمیض ہے۔ میرے پاس میرے والد کھڑے ہیں اور وہ ساحر کی پشت کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔۔۔۔ ''پہچان سکتی ہو؟'' اور پھر خود ہی کہتے ہیں۔۔۔۔ ''یہ تمہاری تقدیر ہے۔''

بعد میں، میں نے یہ سپنا اپنی کتاب ''کالا گلاب'' میں لکھا تھا۔ لیکن نہ اس کو دیکھ کر اور نہ اس کو لکھ کر جانا کہ میرے والد 'تقدیر' لفظ کو میرے گزشتہ جنم کے ساتھ جوڑ کر کہہ رہے تھے۔

پتھر کی مورت

2 نومبر 1984 کی رات تھی، جب سامنے پورا آسمان ایک سمندر کی طرح پھیل گیا، جس میں سے روشنی کی لہریں اٹھتی رہیں، اچانک میں نے روشنی کی ایک لہر کو کہا۔۔۔۔ میں اپنا پچھلا جنم دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔

آنکھوں کے سامنے اچانک سرسوتی کی مورتی آ گئی اور میں اس کی دونوں آنکھوں کی درمیانی جگہ کی طرف نہ معلوم کتنی دیر دیکھتی رہی۔۔۔۔

سرسوتی کے دونوں پپوٹوں کی درمیانی جگہ کی طرف دیکھتے دیکھتے مجھے محسوس ہوا کہ میرے اپنے ماتھے پر دونوں پپوٹوں کی درمیانی جگہ پر کچھ ہل رہا ہے۔۔۔۔

میں نے اپنے ماتھے پر، ہونے والی سرسراہٹ کو کہا۔۔۔۔ میں اپنا پچھلا جنم دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔

اچانک آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے روشنی کے سمندر میں سے کچھ لہریں اٹھیں، اور ان لہروں میں سے کچھ شکلیں ملنے لگ گئیں۔ لیکن اتنی تیزی سے کہ کچھ بھی پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔

پھر اچانک ایک سفید پتھر کا کھمبا دکھائی دینے لگا، جو کتنی دیر تک آنکھوں کے آگے نظر آتا رہا۔ اور پھر دیکھا کہ اس کھمبے پر پتھر کی ایک چٹان لگی ہوئی ہے اور اس پر میری تصویر کندہ ہے۔۔۔۔ میں غور سے اس چٹان کو دیکھ رہی تھی، جب کانوں میں ایک آواز آئی۔۔۔۔ ''تم نے جس سے محبت کی تھی، اس نے تمہاری محبت کو اس وقت جانا، جب تم نہ رہی۔ تمہاری نظمیں ہواؤں میں پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔۔ پھر اس نے تمہاری یاد میں یہ پتھر لگوایا تھا۔۔۔۔ یہ کھمبا اس کے محل میں تھا۔۔۔۔

''راجے کے حرم کی ایک عورت تمہارے نام سے بھی دکھی تھی، تمہاری صورت سے بھی۔ اس نے اس کھمبے سے پتھر کی مورت کو تڑوانے کی بہت کوشش کی، مگر تڑوا نہ سکی۔ یہ کھمبا اسی طرح قائم ہے، اب بھی۔۔۔۔''

میں تڑپ کر پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ محل کہاں ہے؟ لیکن یہ سوال میرے حلق میں کھڑا رہا۔۔۔اور سامنے سے سب کچھ غائب ہو گیا۔۔۔

جاگ کر ایک یقین جیسا احساس ہوا کہ وہ پتھر کی مورت جس کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھی، آج میں اس کو امروز کے نام سے جانتی ہوں۔

میرے کمرے میں سے، میری آواز امروز کے کمرے میں پہنچ جاتی ہے۔ میں نے بتی جلائی، اور آوازیں دے کر امروز کو بلایا، اور کہا'' ۔۔۔دیکھو! میں نے تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر دیکھی ہے، جو تم نے کبھی نہیں بنائی۔۔۔''

امروز

اس زندگی میں میری امروز سے پہلی ملاقات 1956 میں ہوئی تھی۔ اور کچھ ہی ملاقاتوں کے بعد ایک عجیب تڑپ اور ایک عجیب سکون میرے ماتھے پر اتر آیا تھا۔۔۔

اس سے بیس سال پہلے مجھے ایک سپنا آیا تھا کہ کوئی دو منزلہ مکان ہے جس کی ایک کھڑکی میں سے، مکان کے پچھلے حصے والا جنگل بھی نظر آتا ہے اور وہاں بہتی ایک ندی بھی۔

اور اس کھڑکی کے قریب ایک کینوس ہے جس پر کوئی تصویر بنا رہا ہے۔۔۔

یہ سپنا مجھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے لگاتار بیس سال آتا رہا۔ لیکن جب امروز سے ملاقات ہوئی تو پھر یہ سپنا نہیں آیا۔

ایک احساس ہوتا تھا کہ بیس سال کی آوارگی نے۔۔۔اپنی شدت سے۔۔۔حقیقت کی صورت اختیار کی ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں کر سکی تھی کہ احساس کی یہ شدت صرف بیس سالوں کی نہیں، کئی جنموں سے ہے جس کے سال شمار نہیں کیے جا سکتے۔۔۔

امروز کی ملاقات نے میرے شعوری دل کے بند دروازے پر معلوم نہیں کیسی دستک دی تھی کہ میں نے نظم لکھی۔۔۔

ورنہ بھیڑ حیاتے ارکھ صدق دی لاج
ریت تھلاں وچ آ رہی، قدماں دی آواز۔۔۔

مگر یہ نہ جانا کہ یہ ریت تھل صرف اس زندگی کے ویران برسوں کے نہیں' یہ ریت تھل بہت لمبے ہیں۔
پچھلے جنموں کے بھی ویران برسوں تک پھیلے ہوئے۔۔۔

اور جب لکھا۔۔۔

در نہ بھیڑ حیاتئے !دیکھ ذرا اک وار
متھے کرناں بنھ کے' سورج آیا غیر۔۔۔

اس وقت اس ''فیر'' لفظ کا راز نہیں جانا تھا۔ صرف نظمیں تھیں جو کاغذوں پر حروف کی بوندوں کی طرح برسنے لگی تھیں۔ یہ لکھ کر بھی کہ ''اٹھ اپنے گھڑے چوں پانی دا کول دے! دھولواں گی بیٹھ کے راہواں دے حادثے''۔۔۔۔۔ یہ نہیں جانا کہ میں نے جن حادثوں کو دھو لینے کی بات کی ہے' وہ حادثے کئی جنموں کے ہیں۔

اس وقت ایک نظم لکھی تھی۔۔۔۔

نظر تیری نے ہتھ پھڑایا
اِکو ملاقات وِچ گلاں عمر دی پوڑی چڑھ آئیاں۔۔۔۔

اور اس وقت میں نے 'عمر' لفظ کے معنی نہیں جانے تھے۔ اور نہ یہ بات کہ اس کی سیڑھیاں پچھلے جنموں تک بھی اترتی ہیں۔۔۔

نظموں کا میلہ

پہلی ستمبر۔۔۔ جس رات سے پیدا ہوئی تھی' اس رات معلوم نہیں کون سا پہر تھا' جس وقت دیکھا کوئی بہت بڑی جگہ ہے جہاں پنجابی کے شاعر جمع ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ میں شاعروں کے اس میلے میں شامل ہو جاؤں' میں انکار کرتی ہوں۔۔۔

میں انکار کرتی ہوں کہ میں کبھی سٹیج پر نظم پڑھنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ لوگ اتنا تقاضا کرتے ہیں کہ میں ایک بار ان میں شامل ضرور ہو جاؤں' چاہے آخری بار۔۔۔

اور میں ان میں شامل ہو کر جب سٹیج کو سنبھالتی ہوں تو کہتی ہوں۔۔۔۔۔ آج ہم نے نظموں کا میلہ کرنا ہے لیکن اس سے پہلے ہم سب پہلے بلھے شاہ کا دھیان کریں اور اس کی ایک سطر کی طرح اپنے دل و دماغ کی

حالت بنالیں۔۔۔

کہتی ہوں۔۔۔الف اللہ دل کرتا میرا مینوں ب دی خبر نہ کائی۔۔۔۔

اور کہتی ہوں۔۔۔آؤ! اپنی اپنی نظم کہنے سے پہلے ہم الف اللہ کی حالت میں پہنچ جائیں!

یہ کہہ رہی ہوتی ہوں۔۔۔جس وقت جاگ آ گئی۔

لاشعوری دل کے اشارے

1986 میں جب میں ''انسائیکلو پیڈیا آف اَن ایکسپلینڈ'' پڑھ رہی تھی تو کئی حوالے سامنے آئے کہ دنیا میں کئی لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں جن کو کوئی غیبی قوت ملتی ہے اور ان سے کئی کتابیں لکھوا جاتی ہے۔ لیکن اپنے متعلق مجھے کبھی اس طرح کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ میں نے آج تک جو لکھا ہے اپنے ہاتھ اور اپنے اردگرد گزرے واقعات کی بنیاد پر ہمیشہ شعوری دل کے ساتھ لکھا ہے۔

کئی نظمیں ضرور ہیں۔۔۔جو مکمل یا نامکمل سپنے میں لکھیں اور پھر جاگ کر کاغذ پر اتار لیں لیکن ان کے متعلق بھی کبھی اس طرح کی غلط فہمی نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے کسی دیوی قوت نے لکھوائی تھیں۔۔۔

لیکن 1986 میں۔۔۔۔8 فروری کی صبح ایک خیال آیا کہ میں نے جتنی بھی کہانیاں شعوری دل کے ساتھ لکھی تھیں اور جن کی ڈور آنکھوں دیکھے واقعات کے ساتھ جڑی ہوئی تھی کیا ان میں کوئی عنصر اس طرح کے بھی ملے ہوئے تھے جو میرے لاشعوری دل نے مجھ سے لکھوائے تھے؟

جی۔سی۔ جنگ کے الفاظ میں ''بہت چھوٹی عمر سے مجھے معلوم تھا کہ قسمت نے یہ میری زندگی جو میرے نام کی ہے یہ کسی مقصد کا قرض اتارنے کے لیے ہے'' اور جنگ اپنی اس حالت کو ایک فقرے میں ''بلڈی سٹرگل'' بھی کہتا ہے اور ''سپریم ایکسٹیسی'' بھی۔۔۔

جنگ کو میں بیسویں صدی کا وہ عالم مانتی ہوں جنہوں نے علم النفس کے مطالعہ کو فطری مطالعہ سے نکال کر رُوحانی مطالعہ تک پہنچا دیا۔ درویشانہ شعور تک۔۔۔ مجھے ایسا کوئی دعویٰ نہیں، لیکن میں نے یہ جنگ کے باطنی دل کی حالت بسر کی ہے۔ وہ جس کو ایک سانس میں ''بلڈی سٹرگل'' بھی کہا جاسکتا ہے اور ''سپریم ایکسٹیسی'' بھی۔

آج اسی باطنی دل کی گہرائی پانے کے لیے میں اپنے ناولوں کے کرداروں کو دکھائی دینے والے کچھ وہ

سپنے اور وہ واقعات اپنے سامنے رکھ رہی ہوں' جو دراصل وہ ناول لکھتے ہوئے' میں نے شعوری دل کے ساتھ رقم کیے تھے۔ مگر نہیں جانتی کہ ان میں میرے لاشعور کا کون سا اور کتنا عنصر ملا ہوا تھا کچھ کچھ برسوں' یا کچھ کچھ مہینوں کے فاصلے کے بعد وہ میرے ساتھ گزر گئے۔۔۔۔

میرا ناول ''ڈاکٹر دیو'' پہلی بار 1949 میں شائع ہوا تھا۔ وہ کسی ممتا اور کسی ڈاکٹر دیو کی محبت کی داستان تھی جو دل کے راستے چلتی دونوں کے جسم میں سے گزر گئی تھی' لیکن اس کو دھرتی پر پاؤں رکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

ماں باپ کی فاصلے کی دیوار جب دونوں کے راستے میں حائل کر دی جاتی ہے تو ممتا کی کوکھ میں سے پیدا ہوا بیٹا بھی کسی اور دیوار کے پیچھے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس بیٹے سے اور دل کے مرد سے بچھڑ کر ممتا کے لیے سماج کے دائرے میں جو گھر تعمیر کیا جاتا ہے وہاں جب وہ ایک بچے کو پیدا کرتی ہے تو اس کے نقوش میں سے زبردستی بیٹے کے نقوش کو علیحدہ نہیں کر سکتی تو ایک دن تڑپ کر اپنے تن من کا سارا درد گھر کے صحن میں رکھ دیتی ہے اور اس گھر کو الوداع کہہ کر کسی سکول میں چھوٹی سی نوکری کرنے لگ جاتی ہے۔

وہ ممتا' جب دنیاوی رشتوں کے تار کھول دیتی ہے تو سکول کے رہائشی کمرے میں رہتے ہوئے ایک سپنا سا آتا ہے'' کمرے کی ہلکے نیل کے ساتھ لپی دیواریں اس طرح نرم ہوتی گئیں کہ پرسکون نیلے پانی کی طرح نظر آنے لگیں۔۔۔ ممتا کی چارپائی ایک کشتی کی طرح اس پانی میں ہلنے لگی۔۔۔۔ وہ کشتی پُرسکون پانیوں میں پانی کے بہاؤ کی طرف بہنے لگی تو ممتا کی نظر ان کناروں کی طرف گئی جہاں کئی سائے نظر آ رہے تھے۔

ان سایوں میں سے ہی ایک چہرہ دیو کا نظر آیا' ہمیشہ کی طرح سجا دکھائی دیتا' جس کی طرف دیکھتے ممتا کی آنکھیں بھر آئیں اور ہونٹ ہلنے لگے۔۔۔۔ الوداع دیو! الوداع! دل کرتا ہے' کشتی کھڑی ہو جائے' میں کنارے لگ جاؤں' لیکن اب ہمت نہیں۔۔۔ یہ پانی کی دھار اب مجھے کنارے سے بہت دور لے آئی ہے۔۔۔

کشتی اسی طرح آگے بڑھتی گئی۔ دیو کا سایہ پیچھے رہتا گیا اور کنارے کی اگلی طرف اس کو جگدیش کا چہرہ دکھائی دیا' جس کے گھر میں اس کے ماں باپ نے اس کا ڈولا اتارا تھا۔ اور ممتا کو محسوس ہوا۔۔۔ اس چہرے پر ایک اداسی تھی شکوہ تھا اور ایک ہمدردی تھی۔ ممتا نے آنکھیں جھکا لیں اور کہا۔۔۔ مجھے معاف کر دینا' آپ موتیوں کے بیوپاری تھے لیکن میں جب آئی تو میرے پاس صرف خالی ڈولا تھا۔۔۔ آپ کے آگے میری

غریبی شرما گئی۔۔۔۔میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکی۔۔۔۔

کشتی اسی طرح پانی کے حوالے ہوتی رہی اور ممتا کو ایک ویران کنارے پر ایک بچے کی صورت دکھائی دیتی ہے جو ممتا کی طرف دیکھتا رہتا ہے لیکن پہچان نہیں سکتا۔۔۔۔اور ممتا نے کانپ کر اپنا سر جھکا لیا۔۔۔

پھر تھوڑی سی دوری پر۔۔۔اسی کنارے پر ایک بچی کی صورت نظر آتی ہے جو کنارے کی ریت مٹی میں لڑھکتی لڑھکتی اس کی طرف دیکھتی ہے اور ممتا کو محسوس ہوتا ہے۔۔۔وہ بچی ابھی پانی میں گر پڑے گی۔۔۔وہ گھبرا کر بازو پھیلاتی ہے کہ بچی کو تھام لے' لیکن اس کے بازو پھیلے رہ جاتے ہیں' کنارا دور پیچھے رہ جاتا ہے۔۔۔۔

کشتی اسی طرح پانی کے حوالے ہے اور ممتا کو اب کنارے پر کھڑے کئی بُت نظر آتے ہیں۔۔۔ماں باپ کا' بڑے بھائی کا' بڑی بہن کا' اور سب گھٹنوں کے بل جھک کر کہہ رہے ہیں۔۔۔ہم کو معاف کردو بیٹی! ہم کو معاف کردے بہن۔۔۔ہم گناہ گار ہیں۔۔۔۔

اور ممتا کو ان چاروں کے سروں پر لٹکتے ہوئے کئی اور سائے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ان بزرگوں کے جو اس سے پہچانے نہیں جاتے۔ لیکن وہ سب کی طرف دیکھتی ہے تو اس کے منہ سے نکلتا ہے۔۔۔رب آپ کو معاف کرے!

پھر یہی کشتی تھی جو آہستہ آہستہ اس چارپائی کی شکل اختیار کرنے لگی' جس کے اوپر اس رات ممتا سوئی ہوئی تھی اور نیلے پانی جمتے جمتے کمرے کی نیلی دیواریں بننے لگے۔

اس ناول کا نصف شعوری حال میں ممتا کو آیا سپنا' میں نے 1948 میں دیکھا تھا۔ اور چاہے لکھنے کے دوران میں ممتا کی نصف شعوری کیفیت میں سے خود بھی گزری تھی لیکن میرا 'ایک مصنف کا' ایک حصہ اس سب کچھ سے بے تعلق تھا' جو صرف تماشائی تھا اور صرف مصنف۔

لیکن میں قدرت کے اس راز کو نہیں جانتی کہ ٹھیک یہی سپنا' پورے بارہ برس بعد 1960 میں میرے ساتھ کس طرح بیت گیا۔

میں نے جب سماج کے سب رشتوں کی گانٹھیں کھول کر' اپنی زندگی امروز کے ساتھ بسر کرنے کا قدم اٹھایا تھا تو میرے دونوں بچے' ان کا باپ' اور تمام رشتے دار کناروں پر کھڑے ٹھیک اسی طرح نظر آئے تھے جن سے میں الوداع بھی مانگ رہی تھی اور معافی بھی۔۔۔۔

1948 میں جو حالات ممتا کی زندگی کے تھے' ان کے کوئی آثار میری زندگی میں نہیں دکھائی دیتے تھے۔
لیکن بارہ برس بعد وہ سارے آثار اچانک میری زندگی کے آسمان پر کالے بادلوں کی طرح چھا گئے اور ان بادلوں میں سے برستی موسلادھار بارش سے' میرے گھر کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح گھل گئیں جس طرح ممتا کے کمرے کی گھلی تھیں۔ اور میری چارپائی بھی ممتا کی چارپائی کی طرح ایک کشتی بن کر پانیوں کے حوالے ہو گئی تھی۔

''بند دروازہ'' نام کا میرا ایک ناول 1196 میں چھپا تھا۔ اس کمی اور سمیش کی محبت' تنکا تنکا جوڑ کر' اپنے لیے ایک گھونسلہ بنا لیتی ہے کہ اچانک سماج کی طرف سے اس طرح کی ہوا چلتی ہے کہ وہ گھونسلہ ڈولنے لگتا ہے۔ سمیش کے دل کو دوطرفہ خیالات گھیرنے لگتے ہیں۔ اس کے باپ کی طرف سے اس کو اس طرح کی پیشکش ملتی ہے' کہ اس کی پناہ اگر وہ قبول کر لے تو دنیاوی کامیابی کا ایک بڑا راستہ اس کے لیے کھل سکتا ہے۔ اس وقت کمی کی محبت اس کو کسی راستے کا حوصلہ نہیں' راستے کی رکاوٹ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اس کو سرخرو کرنے کے لیے اس گھونسلے کو خود ہی چھوڑ دیتی ہے' جو کبھی دونوں نے تنکا تنکا جوڑ کر بنایا تھا۔

اور کمی جب اس گھونسلے میں سے قدم باہر رکھتی ہے تو سمیش کے لیے ایک خط لکھ کر' اس خالی گھونسلے میں رکھ آتی ہے'' سمیش! تمہارا گھر تمہیں مبارک! دھرم کے' سماج کے' شہرت کے' عزت آبرو کے کتنے خوبصورت پھول ہیں' تمہارے پھولدان میں اور محل کی طرح سجا تمہارا گھر۔۔۔ لیکن میری محبت راستوں کی گرد کی طرح' تمہارے پاؤں پر پڑ گئی۔ آج تم اپنے خوبصورت گھر میں جاتے وقت ایک پائیدان سے اپنے پاؤں پونچھ لینا!''

یہ ناول میں نے 1960 کے اگست ماہ میں لکھ کر جب امروز کو سنایا تھا تو اس نے ناول کے مسودے کو چوم کر کہا تھا'' ہماری دونوں کی زندگی کے حالات کمی اور سمیش کے حالات ہیں' لیکن ہماری زندگی کا اختتام یہ نہیں ہوگا' جو کمی اور سمیش کی زندگی کا ہوا۔۔۔

لیکن خدا کا کرم اور خدم کا قہر کون جان سکتا ہے! ٹھیک تین ماہ کے بعد میں ٹھیک اسی مقام پر کھڑی تھی' جہاں تین ماہ پہلے کمی کھڑی تھی۔۔۔

اور ایک بھیانک حقیقت سامنے تھی کہ جو خط کمی نے سمیش کے نام لکھا تھا' وہ دراصل میں نے لکھا تھا' امروز کے نام' لیکن تین ماہ پہلے۔۔۔

خط وہی رہا تھا' لیکن اس پر دستخط بدل گئے تھے۔۔۔

دو چار پائیاں

کل رات کا سپنا کچھ دھندلا سا یاد میں ہے کہ امروز کے ہاتھوں میں ہون کی چیزیں پکڑی ہوئی ہیں۔۔۔ ایک سرخ کپڑا اور چھوٹی موٹی کئی چیزیں۔ اور امروز نے کہا۔۔۔ باہر بیٹھک میں ایک نیا میز لگا کر یہ سب رکھ دیں! روزانہ ایک جگہ پر سب کچھ مل جائے گا۔ اور جواب میں' میں نے کہا۔۔۔ نہیں' بیٹھک میں نہیں۔ وہاں کئی لوگ ملنے کے لیے آتے ہیں۔۔۔ ان کی نگاہ میں نہیں رکھنا۔۔۔ پھر معلوم نہیں وہ سب کچھ کہاں رکھا۔۔۔ کچھ یاد نہیں۔۔۔

لیکن آج رات میں دیر تک لزگرین کی کتاب پڑھتی رہی تھی کہ ستاروں کا اور انسان کی تقدیر کا کیا رشتہ ہے۔۔۔ کہ صبح ہونے والی تھی' جب میرے سامنے ایک سنت دکھائی دیئے۔ میں نے ایک ایک کاغذ ان کے سامنے کیا اور کہا۔۔۔ دیکھیں! یہ شنی اور شکر دونوں مل کر سورج کی پناہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کیا کریں گے؟

ساتھ ہی دیکھا کہ میری طرف دو چار پائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ جن پر شنی اور شکر بیٹھے ہوئے ہیں' سفید چادریں لپیٹ کر۔ اس سنت نے سرسری سی نگاہ سے دیکھا اور کہا۔۔۔ ''ہاں' زندگی ان ہی کے اثر میں گزرے گی' لیکن میں نے تو یہ دیکھنا ہے کہ تم لوگ دل کو کتنا گھرا کر کے جیتے ہو' یا کتنا گھبرا کر جیتے ہو۔۔۔

محسوس ہوا۔۔۔ میں نے یہ باتیں سنت کے ساتھ سپنوں میں کی ہیں۔ اور میری اونگھتی سی حالت میں یہ احساس تھا۔۔۔ کہ یہ سپنا تھا' تب بھی وہ سپنا جاری رہا' اور میں نے سنت کو کہا۔۔۔ میں نے اسی طرح زندگی بسر کی ہے' اسی لیے میں نے نظم لکھی تھی کہ لوگ تو خدا سے مراد مانگنے کے لیے درخت کو چیتھڑا باندھتے آئے ہیں' اور پھر مراد پوری ہونے پر وہ چیتھڑا کھولتے آئے ہیں۔ لیکن ایک دفعہ خدا نے ایک درخت کو چیتھڑا باندھا' اور مراد مانگی کہ میں کوئی ایسا انسان دیکھوں۔۔۔ جو تمام دکھوں کو ہنس کر برداشت کر جائے! اور پھر میں نے خدا کو کہا۔۔۔ دیکھ! تم نے مجھ میں وہ انسان دیکھ لیا ہے' تیری مراد پوری ہوگئی ہے' اب آ کر اس درخت سے اپنا چیتھڑا کھول لو' جو ایک مراد مانگتے وقت تم نے باندھا تھا۔۔۔

یہ سب کہہ رہی تھی کہ امروز۔۔۔ صبح کی چائے لے کر آ گئے۔

اختتامیہ۔۔۔سُرخ دھاگے کا رشتہ

28 ستمبر 1988 والے دن ساہت اکیڈمی دہلی کی طرف سے ''میٹ دا آتھر'' سلسلے میں' میں نے اپنی نظموں اور کہانیوں کے بارے میں کچھ کہنا تھا' کہا کہ جس طرح وقت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے' کرائسٹ سے پہلے اور کرائسٹ کے بعد' میں ہر سوچ اور ہر تخلیق کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوں۔۔۔ایک باطنی احساس سے پہلے اور ایک باطنی احساس کے بعد۔۔۔

اس دن کی تقریر میں' باطنی احساس کی بات کرتے میں نے اپنے سپنوں کے ذریعے باطنی احساس کی تھوڑی سی بات کی تھی' برائے نام اشارتاً' لیکن وہ وقت اس کی تفصیل میں جانے کا نہیں تھا۔۔۔یہ کتاب' وہی تفصیل ہے۔تاریخ وار' جو سُرخ دھاگے کے رشتے کی گہرائی میں اترتی ہے۔۔۔

اس گہرائی میں سے نکلتے اس کی کتنی ڈائمینشنز ہیں' میں حیران سی میں نے' جتنی دیکھی ہیں' وہ کاغذ پر اتار دی ہیں۔لیکن وہ میرے کتنے جنموں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتی ہیں' یہ میری گرفت میں نہیں آتا۔۔۔

ایک کسی اور تقریر میں کہی ایک اور بات' میں یہاں بھی دہرانا چاہتی ہوں کہ فارسی کے ایک عالم ہمارے ایک شاعر نندلال گویا نے' کبھی بھیگی ہوئی آواز میں کہا تھا۔۔۔

ہم چو موج از پہن دریا رانمود
موج گشتو گرد دریا راسجود۔۔۔

یعنی

میں بھرے بہتے دریا میں سے ایک لہر کی طرح اٹھا ہوں
ایک لہر بن کر اپنے دریا کو سجدہ کرنے کے لیے۔۔۔

نندلال جی بہت بڑے عالم تھے' مجھے اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں' لیکن اسی دریا کی ایک بوند ہونے کے ناطے' مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شعوری اور لاشعوری دل کے ذریعے میں نے اپنے اس دھاگے کا رشتہ جتنا سا دیکھا ہے اور اس کی بات جتنی سی لکھی ہے' وہ اپنے دریا کو سجدہ کرنے کے لیے ہے۔۔۔

☆☆☆☆

زاہد حسن

حدیثِ درد

پیدائش: ۳۱ اگست ۱۹۱۹ء

وفات: ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء

رہائش: گوجرانوالہ، لاہور اور دہلی

تراجم: دُنیا کی چونتیس زبانوں میں ہوئے۔

ساہت اکادمی ایوارڈ: ۱۹۵۶ء میں ملا

۱۹۶۶ء تا ۲۰۰۲ء تک رسالہ ''ناگ منی'' نکالتی رہیں۔

۱۹۶۹ء: پدم شری ایوارڈ ملا۔

۱۹۷۳ء: دہلی یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی۔

۱۹۷۹ء: واپت سار وایوارڈ ملا۔

۱۹۸۳ء: (انڈیا کا سب سے بڑا غیر سرکاری ایوارڈ) بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈ ملا۔

۱۹۸۳ء: جودھ پور یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی۔

۱۹۸۳ء: وشنو بھارتی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کا اعزازی ڈگری ملی

۱۹۸۶ء: راج سبھا میں بطور ممبر سینٹ کے نامزدگی

۱۹۸۷ء: فرانس سرکار کی جانب سے اعزازی ڈگری

۱۹۸۹ء: ایس این ڈی ٹی بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری

۱۹۹۰ء: پنجابی اکادمی دہلی کی جانب سے وارث شاہ ایوارڈ۔

دوسرے ممالک کی یاترا:

سویت روس، بلغاریہ، یوگوسلادیہ، چیکوسلاواکیہ، ہنگری، فرانس، انگلینڈ، اٹلی جرمنی، ماریشس اور ناروے۔

تصانیف:

ناول: ڈاکٹر دیو، پنجر، آہلنا، اشوکا، اک سوال، بلاوا، بند دروازہ، رنگ داپتا، اک سی انیتا، چک نمبر ۳۶، دھرتی، ساگر تے سپیاں، دِلی دیاں گلیاں، ایکتا تے اپریل، جلاوطن، یاتری، جیب کترے، اک دا بوٹا، پکی حویلی، اَگ دی لکیر، کچی سڑک، کوئی نہیں جاندا، اوہناں دی کہانی، ایہہ سچ ہے، اِک خالی جگہ، تیرھواں سورج، انجادِن، کورے کاغذ، ہردت دازندگی نامہ، نہ رادھانہ رکمنی،

شعری مجموعے:

ٹھنڈیاں کرناں، امرت لہراں، جیوندا جیون، تریل دھوتے پھل، اوگیتاں والیا، بدلاں دے پلے وچ، سجھ دی لالی، لکی جیہی سوغات لوک پیڑ، پتھر گیٹے، لمیاں واٹاں، میں تواریخ ہاں ہند دی، سرگھی ویلا، سنیہڑے، اشوکا چیتے، کستوری، ناگ منی، کاغذ تے کینوس۔

شعری مجموعوں کے انتخاب:

چھے اُتاں، کاغذ تے کینوس توں پہلاں، میں جمع توں، چیتر نامہ، ۱۴۱ کوتاواں،

کہانی پراگے:

چھتی ورھے بعد، کنجیاں، آخری خط، گوجر دیاں پریاں، چانن داہوکا، جنگلی بوٹی، اجنبی،

منتخب کہانی پراگے:

ہیرے دی کنی، لٹیاں دی چھوکری، پنج ورھے لمی سڑک، اک شہر دی موت، تیسری عورت، مٹی دی ذات،

رپورتاژ:

بھارت دے اسریئے، موم بتیاں دے بھیت، باریاں جھروکے، کرچی لکیراں، کالا گلاب، اگ

دیاں لیکاں، اکیہ پتیاں دا گلاب، سفرنامہ، عورت اک درشٹی کون، اک اداس کتاب، اپنے اپنے چار ورھے، شوق صراحی، کیہڑی زندگی کیہڑا ساہت، کچے اکھر، اِک ہتھ مہندی، اک ہتھ چھالا، محبت اک درشٹی کون، میرے کال مکتا سمکائی، سورج ونشی، چندر ونشی، عاشق بھور فقیر تے ناگ کالے۔

آپ بیتی:

رسیدی ٹکٹ، لال دھاگے دا رشتہ، چونوین پترے، رچونویں اخبار دا اک پراگا، زندگی تے نظریہ۔

دستاویز، اُمرتا کی ڈائری ایڈیٹر: امروز)

اس کے علاوہ اُمرتا پریتم نے دوسری زبانوں میں سے بہت سی کتابوں کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ جو کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ یہ سب کچھ ملا کے اُمرتا کی کتابوں کی تعداد سوا سو کے قریب ہے۔

اُمرتا پریتم کی کچھ کُتب کا ترجمہ اِن زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ہندی، اُردو، انگریزی، گجراتی، مراٹھی، کنٹر، ملیالم، اڑیا، اسامی، بنگلہ، سندھی، روسی، بلغارین، پولیش، البانیئن، سرب، سپینش، اور فرنچ، کچھ نظموں اور کہانیوں کے تراجم اِن زبانوں میں ہو چکے ہیں:

تامل، تیلگو، کوکنی، ازبک، چیک، مقدونیئن ہنگرین، رومانیئن، یوکرینین، عربی، ڈینش، چینی، جاپانی، ویت نامی، جرمن اور نارویجین۔

☆☆☆☆

پینٹنگ: طاہر رشید
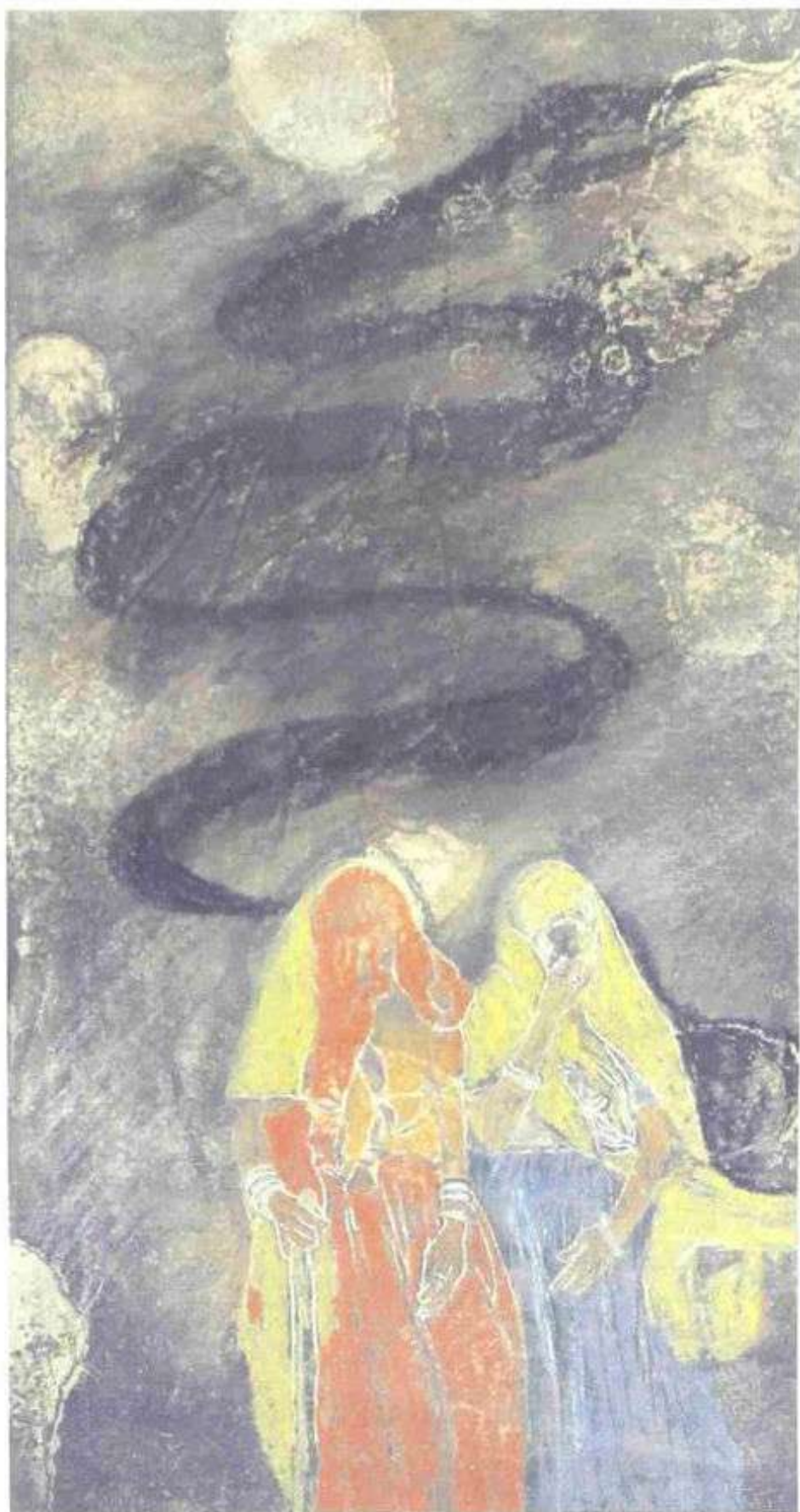
اک ملاقات

اک ملاقات

کئی ورھیاں دے پچھوں اچانک اک ملاقات
تے دوہاں دی جند اک نظم وانگ کنبی ۔۔۔۔۔

ساہمنے پوری رات سی
پر ادھی نظم اک گُٹھ وچ لگی رہی
تے ادھی نظم اک گُٹھ وچ لگی رہی ۔۔۔۔

پھر سویر سار ـــــــــ
اسیں کاغذ دے پاٹے ہوئے ٹکڑیاں دی طرح ملے
میں اپنے ہتھ وچ اوہدا ہتھ پھڑیا
اوس اپنی بانہہ وچ میری بانہہ لیتی

تے پھیر اسیں دووویں اک سنسر دی طرح ہسے
تے کاغذ نوں اک ٹھنڈے میز تے رکھ کے
اوس ساری نظم تے اک لیک پھیر دتی ۔۔۔۔

آصف فرخی

کتابِ عشق کا اگلا ورق

بعض فن کار شہرت کی ان منزلوں پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ جیتے جی زندگی کے جسم سے بھی بڑے نظر آنے لگتے ہیں کسی روایت کی طرح۔ کسی لیجنڈ کی طرح، امرتا پریتم اپنے پڑھنے والوں اور پسند کرنے والوں کو ایسی ہی شخصیت معلوم ہوتی ہیں، زندگی سے زیادہ زندگی سے لبریز۔

۴۷ء کے فسادات میں پنجاب کی دھرتی جب لہو نہا گئی تو امرتا پریتم کی گھائل آواز درد میں نکھر کر ابھری ''اج آکھاں وارث شاہ نوں......'' اس نظم پر اعتراضات بھی بہت ہوئے اور اسے سینہ بہ سینہ دہرایا بھی گیا لیکن اس سے ایک بات بالکل واضح ہوگئی۔ امرتا پریتم نے وارث شاہ کو صدیوں بعد اس طرح پکارا تھا جیسے کوئی اپنے سنگی، ساتھی، مونس وغم خوار کو پکارتا ہے۔ اس لہجے میں پکارنا امرتا جی کا ہی حق ہے کہ آج وہ پنجابی ادب کا سب سے بڑا نام ہیں۔ ان کی نظمیں اور کہانیاں ہندی اور اردو میں بھی اتنی ہی معروف ہیں کہ ان کے پڑھنے والوں کا دائرہ، کسی ایک زبان کے دائرے سے وسیع تر ہے۔ ان کی کتابیں، بغیر اجازت اور ناقص ترجمے کے ساتھ اردو میں پہنچتی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان میں ترجمے کی غیریت محسوس نہیں ہوتی بلکہ اپنی ہی بات محسوس ہوتی ہے۔ یہ تخلیق کا اعجاز ہے کہ زمان وزبان کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے، اور ایک اردو ہی پر کیا موقوف ہے، امرتا پریتم جدید ہندوستان کے معروف ترین قلم کاروں میں سے ہیں۔ وہ پہلی خاتون ہیں جنھیں ہندوستان کا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز، ساہتیہ اکیڈمی ادبی انعام دیا گیا۔ ہندوستان کے صدر مملکت انھیں پدم شری کا خطاب بھی دے چکے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں بھارتیہ جن پتھ انعام دیا گیا اور ۱۹۸۶ء میں انھیں پارلیمنٹ کے ایوان بالا کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ ان کی نظمیں اور کہانیاں دنیا

کی ۴۳ زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

ورجینا وولف نے کہا تھا کہ بھلا کون اس دل شاعر کی گرمی اور تشدد کی پیمائش کر سکتا ہے کہ جسے گرفتار کر کے ایک عورت کے جسم میں مقید کر دیا گیا۔ امرتا پریتم کی شاعری اس گرمی اور تشدد کا زندہ افسانہ ہے۔ ان کے نقادوں نے ان کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کی ہیں کہ وہ ابدی عورت کے دکھ کی تفسیر ہیں، کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک معمہ ہیں، نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک یہ سب شخصیت سازی کا پیدا کردہ اشتہاری ڈھکوسلا ہے۔ یہ سارے اعتراض اور مدح سرائی امرتا پریتم کی زندگی کے رنگ ہیں۔ اس زندگی کی کہانی انھوں نے بڑی جرأت اور نزاکت احساس کے ساتھ اپنی خودنوشت ''رسیدی ٹکٹ'' میں سنائی ہے۔ اس کتاب نے ادبی دنیا میں خاصا تہلکہ مچایا کہ اس میں امرتا جی نے بہت کھل کر دو مردوں سے اپنی رفاقت کو بیان کیا ہے، ایک ساحر لدھیانوی اور دوسرے امروز جنھوں نے امرتا جی کی ''ناگ منی'' کو رنگوں اور لکیروں سے سجادیا ہے۔

امروز اور امرتا جی کا گھر صحیح معنوں میں نگار خانہ معلوم ہوتا ہے۔ دیواریں ہیں کہ اوراق مصور کہ منھ سے بول پڑنے کو تیار۔ کونا کونا رنگوں سے مزین۔ ایک دیوار پر امرتا شیر گل کی تصویر ٹنگی ہوئی ہے۔ کونے میں لیمپ جل رہا ہے جس پر کئی زبانوں میں شاعری درج ہے۔ دن ہو کہ رات یہ لیمپ ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ یہ شاعری کی روشنی ہے جس کا اُجالا ہر وقت موجود رہتا ہے۔ امروز نے مجھے بتایا کہ اس لیمپ کے قریب دروازہ ہے جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اور اس کمرے کی دیواروں پر دنیا کے بہترین مصنف امروز کی لکیروں کے روپ میں جی اٹھے ہیں۔ وارث شاہ، خلیل جبران، آئین رینڈ، شیو کمار بٹالوی، ان تصویروں میں تازہ ترین تصویر اردو کی جواں مرگ شاعرہ سارا شگفتہ کی ہے جو امرتا جی کی تازہ ترین کتاب کا موضوع بھی ہے۔ امرتا جی نے مجھے بتایا کہ یہ کتاب بہت پسند کی جارہی ہے اور اس کی بہ دولت سارا شگفتہ کا نام دور دور تک سنا جانے لگا ہے۔

امرتا جی مدھم اور کومل سروں میں بولتی ہیں، جیسے شعر کہہ رہی ہوں۔ ان کی گفتگو جو یہاں من و عن درج کی جارہی ہے اردو کے مخصوص لہجے سے پوری طرح ہم آہنگ محسوس ہوتی ہے۔ شاعری کے اس ہمہ وقت روشن لیمپ کے اُجالے میں ان کا عمر رسیدہ چہرہ دمکنے لگتا ہے۔ اس چہرے کے تاثرات بتاتے ہیں کہ یہ وہ اُجالا ہے جو زندگی کو گہرائی میں اور پوری شدت کے ساتھ جینے سے آتا ہے۔ وارث شاہ کو پکار کر کتاب عشق کا

اگلا ورق کھولنے کی جو فرمائش انھوں نے کی تھی تو اس اگلے ورق کی تحریر ان کی اپنی شاعری کے علاوہ بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔

سوال: امرتا جی میں آپ سے اردو کے حوالے سے بات کرتا ہوں یعنی جس زبان میں میں نے آپ کو پڑھا ہے حالاں کہ یہ آپ کے اظہار کی زبان نہیں ہے لیکن آپ اس سے بہت دور بھی نہیں ہیں۔ کیا آپ کو اردو زبان اور ادب سے کسی رشتے یا تعلق کا احساس ہوتا ہے؟ خاص طور پر یوں بھی کہ اس زمانے میں اردو ادب نے جو راستے اختیار کیے ہیں اور ان راستوں پر جو موڑ آئے ہیں جیسے ترقی پسند تحریک، افسانے میں منٹو، کرشن اور بیدی کا دور تو ان سب چیزوں کو آپ نے قریب سے دیکھا ہے۔ دیکھنے کا عمل آپ کو کیسا لگا؟ اردو کے اس ادبی دھارے سے ہم سفری اور رفاقت کا احساس ہوا؟

امرتا پریتم: ایک بار اردو کانفرنس ہوئی تھی بمبئی میں۔ وہاں مجھے بھی بولنے کے لیے کہا گیا تھا تو وہاں میں نے ایک ہنگری کی نظم پڑھی تھی ایک ہنگیرین شاعر ہوئے ہیں وہار بیلا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے تجربوں پر وہ نظم لکھی تھی ''سپاہی کی واپسی'' جنگ کے دن ہیں اور ایک سپاہی ایسے محاذ پر ہے جہاں وہ اکیلا ہے اور ویرانی ہے۔ دور تک جنگل ہی جنگل ہے، کوئی انسان نہیں، کوئی گاؤں نہیں تو وہاں اسے پتا چلتا ہے جنگ کے ختم ہونے کا۔ وہاں سے اس نے واپس آنا ہے اکیلے، راستہ بہت مشکل ہے، تو اس وقت وہ دنیا کی جتنی خوب صورت چیزیں ہیں، جتنی حسین چیزیں ہیں، جتنے شاہ کار ہیں، وہ اپنے ذہن میں تصور کرتا ہے اور ایک ایک کے نام پر دس دس قدم چلتا ہے یعنی اپنے گھر کے آنگن میں سیب کے پیڑ کے نام پر جس پر پھول ابھی آئے نہیں، ان بچوں کے نام پر جو اس کی بیوی کی کوکھ میں سو رہے ہیں، ان کتابوں کے نام پر جو ابھی اس نے پڑھی نہیں۔ ان کھلونوں کے نام پر جو ابھی اس کے بچوں نے کھیلے نہیں اور اس طرح مائیکل اینجلو کے نام پر، اس کے شاہ کاروں کے نام پر، وینس کی حسین گلیوں کے نام پر چلتے چلتے وہ اتنی چیزیں گنتا ہے۔ دنیا کے اتنے شاہ کار ہیں وہ نظم دہراتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ ان میں، میں ایک لائن کا اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ میں دس قدم اردو زبان کے نام پر چلنا چاہتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ اردو زبان میں ایک ایسی نفاست ہے، بات کو کہنے کا انداز ہے اور جسے کہتے ہیں richness of the soul وہ بھی ہے اور انداز بیاں بھی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہیں کیوں کہ چیزیں تو دو ہی ہوتی ہیں your mind اور the way to say things یعنی کرافٹ تو وہ دونوں چیزیں اردو زبان میں موجود ہیں اور اس کی ایک خاص لذت ہے۔ باقی یہ

ضرور ہے کہ اردو زبان بادشاہوں کے پاس پلی، اس لیے اس میں کچھ تکلف بھی ہے اور ایک تہذیب جو باہر سے لی جاتی ہے وہ بھی ہے لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی اردو زبان کے پاس جو لہجہ ہے بات کہنے کا وہ بہت خوب صورت ہے۔

سوال: آپ کے جن ہم عصر اردو ادیبوں کے ابھی نام لیے تھے، کرشن، منٹو، بیدی، ان کا ادب اب آپ کو کیسا لگتا ہے، پہلے فکشن کی بات کریں۔ ان لوگوں کا فکشن اب آپ پڑھتی ہیں تو آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے؟

امرتا پریتم: فکشن کے لوگ اپنے اپنے وقت پر بہت اچھے تھے جس وقت کرشن چندر تھے، بیدی تھے وہ اپنے وقت کی آواز تھے لیکن آج بات اور ہے۔ وقت کے ساتھ ضرورت بدلتی ہے، انداز بدلتے ہیں بات کہنے کے، لیکن آج میں نے دیکھا ہے کہ مظہر الاسلام کے افسانوں اور منشایاد کے افسانوں میں جو بات آئی ہے وہ اس سے پہلے اردو زبان میں نہیں تھی۔

سوال: وہ کیا بات ہے؟

امرتا پریتم: وہ بات یہ ہے کہ اردو زبان کی جو روایت چلی آرہی ہے اس سے ہٹ کر ایک شدت ہے اور ساتھ ہی بات کہنے کا انداز بدلا ہے، سمبلز بدلے ہیں اور symbolically گہرائی میں جاسکنے کا وقت لیا ہے۔ مظہر الاسلام کے افسانوں پر میں نے ایک نمبر شائع کیا تھا اپنے میگزین کا۔ اس میں ان کی پانچ چھ کہانیاں اکٹھی تھیں۔ اسی طرح منشایاد پر کیا تھا بلکہ مظہر الاسلام نے ایک نظم لکھی، نئے سال کی ''دعا'' پہلی دعا اور انتم دعا دونوں اس میں تھیں۔ اس میں کچھ شعر انھوں نے...... اس کا ایک ٹکرا ہے کہ 'ہماری نظموں اور کہانیوں میں اے خدا سچائی اور محبت اُتار۔ تو اس نظم کو بھی میں نے بہت جگہ quote کیا ہے' اپنی تقریروں میں کیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میلان کندیرا اور گارسیا اور امرتا پریتم کی تحریروں میں اثر برقرار رکھ اور انھیں سچائیاں لکھنے کا حوصلہ دے۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک پیپر پڑھا تھا اپنی نظموں پر یہاں انڈیا انٹرنیشنل فیسٹیول میں یہی نومبر کے آخر میں تو اپنا پیپر پڑھنے کے بعد میں نے مظہر الاسلام کی نظم کا وہ حصہ پڑھا اور کہا کہ خدا ان کی دعا قبول کرے اور مجھے نئی سچائیاں لکھنے کا حوصلہ دے۔

سوال: امرتا جی آپ کی لکھی ہوئی سچائیوں سے ہم اپنی اپنی زندگیوں کے سچ کو تلاش کرتے ہیں، آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ آپ کے لکھے ہوئے سچ کو ہمارے یہاں بھی بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ آپ کی کتابیں پاکستان میں بھی بہت مقبول ہیں اتنی کہ ان کے جعلی ایڈیشن چھاپے جاتے ہیں بغیر اجازت اور خراب ترجمے

کے ساتھ۔

امرتا پریتم: دیکھیے دو باتیں ہیں، لوگ اتنا پیار کرتے ہیں تو اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں ان کا شکریہ ادا کرسکوں۔ وہ میرے نام سے کچھ بھی چھپے پڑھنا چاہتے ہیں لیکن تکلیف ایک بات کی ہوتی ہے کہ جو چھاپتے ہیں کیا وہ یہ سلیقہ بھی نہیں رکھ پاتے کہ ایک formal سی اجازت مجھ سے لے لیں اور جب کتاب چھپے تو اس کی ایک کاپی مجھے بھیج دیں اور سب سے بڑی بات اس کا ترجمہ خراب نہ کریں۔ اگر ترجمہ خراب ہو تو ادیب کا پورا امیج خراب ہوتا ہے۔ تو مجھے یہ تکلیف ہوتی ہے کہ جو پاٹھکوں کے پاس امیج پہنچے گا وہ صحیح نہیں ہوگا۔ میں انھیں خود ترجمہ کروا دوں، اجازت بھی دے دوں، پیسے کی بات نہیں ہے، جس پیار سے وہ چھاپتے ہیں لیکن اگر وہ اتنا رکھ پائیں کم از کم میری تسلی ہو، مجھے تکلیف تو نہ دینا چاہیں غلط ترجمے سے۔ جس ادیب کو چھاپتے ہیں اس کی طرف ان کا کیا حق بنتا ہے، اس کو تو ذرا سامنے رکھیں۔

سوال: امرتا جی آپ نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور ناول بھی لکھے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ کی شاعری میں جو گرمی ہے وہ ناولوں میں کچھ کم ہے، وہ آگ کچھ دبی دبی سی ہے یا یہ کہ ناولوں میں جذباتیت زیادہ ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کا جو اصلی کام ہے وہ آپ کی شاعری ہے اور ناولوں کی حیثیت ثانوی یا ضمنی ہے۔

امرتا پریتم: میں ایسا نہیں سوچتی، میں سوچتی ہوں کہ کئی بار بڑی کینوس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بات نظم میں نہیں کہہ پاتے کئی بار ایسا لگا نظم لکھنے لگی اور وہ افسانہ لکھا گیا یا افسانہ لکھنے لگی تو نظم لکھ گئی تو پھر میں سوچتی ہوں کہ ایک وقت آتا ہے یہ جو میڈیا ہے media of expression اور forms of expression ان کا فرق مٹ جاتا ہے۔ بات وہی ہوتی ہے، چاہے افسانے کی صورت میں کہی جائے یا نظم کی صورت میں کہی جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نظم میں شدت اس لیے زیادہ لگتی ہے کہ وہ بڑے کینوس پر نہیں ہوتی۔ اس میں اتنا گاڑھا پن ہوتا ہے، ایک نکتے پر سب کچھ سمٹ آتا ہے۔ اور افسانے میں اس کے perspectives بڑے ہو جاتے ہیں بلکہ اب تو نظمیں چھپنے لگی ہیں کئی زبانوں میں حالاں کہ نظم ترجمہ نہیں ہو پاتی اچھی طرح لیکن جس نے مجھے جانا، افسانوں سے جانا، نثر سے جانا، نظم سے نہیں۔

سوال: آپ نے ذکر کیا تھا اس دعا کا کہ امرتا پریتم نئی سچائیاں لکھنے کا حوصلہ رکھیں۔ آپ کی جس کتاب کے سچ نے لوگوں کو سب سے زیادہ حیران کیا وہ آپ کی آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ'' ہے۔ اپنے بارے میں اتنا

گہرا اور کڑوا سچ لکھتے ہوئے کیسا لگا؟ کیا یہ عمل تکلیف دہ ہوتا ہے؟

امرتا پریتم: نہیں تکلیف نہیں ہوئی۔ میرے لیے وہ اتنا ہی سہل تھا۔ میں جو جیتی ہوں کہہ پاتی ہوں، جو کہتی ہوں وہ جیتی ہوں۔ اس میں فرق نہیں۔ اگر جینے کا آپ معیار اور رکھیں، کہنے کا اور رکھیں تو پھر تکلیف ہوتی ہے۔ میرے لیے ایک ہی بات ہے۔

سوال: آپ بیتی لکھنے سے بہت سے ادیب اس لیے گھبراتے ہیں کہ اپنے سچ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا پڑتا ہے اور صرف دیکھنا ہی نہیں سب کو دکھانا بھی تو اپنی تمام نقابوں، گرہوں کو کھول کر برہنہ ہونا، اپنا آپ سب کے سامنے expose کرنا، اپنی آتما کی گہری اور نازک لرزشوں کو ساری دنیا کے سامنے بیان کرنا......

امرتا پریتم: جی ہاں، بالکل، یہ خیال آیا اور اسی میں، میں نے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ میرا بچہ بہت چھوٹا تھا تو جس گھر میں ہم رہتے تھے وہاں تک بجلی نہیں پہنچتی تھی اس لیے ریڈیو نہیں تھا۔ جو ہمسائے تھے ان کے پاس بیٹری کا ریڈیو تھا تو جب میں شام کو جاتی تھی آل انڈیا ریڈیو میں اپنا پروگرام کرنے کے لیے، اناؤنس کرتی تھی پروگرام اور پیش کرتی تھی پروگرام تو اس وقت میرا چھوٹا سا بچہ ہمسایوں کے گھر میں جا کر سنتا تھا کہ میری مما کی آواز ہے تو ایک دن اس کے بچے سے اس کی لڑائی ہوگئی اب وہ جا نہیں سکتا۔ میں جب واپس آئی تو مجھ سے کہنے لگا کہ ممی وعدہ کرو، میری ایک بات مانو گی، میں نے کہا بیٹے بتاؤ، میں مانوں گی۔ کہنے لگا، نہیں پہلے وعدہ کرو۔ وعدہ کیا تو اس نے کہا آپ سب کے ریڈیو پر بول لیجیے، بھولو کے ریڈیو پر مت بولیے (ہنسی) لیکن مشکل یہ ہے کہ جب ادیب لکھتا ہے تو...... مجھے تو ساری زندگی کتنے ہی بھولو ہیں جن کے ریڈیو پر بولنا پڑا۔ یہی اس کا دوسرا پہلو ہے۔ تکلیف ہوتی ہے جب اسے سمجھ نہیں پاتے، اس کی پاکیزگی تک پہنچ نہیں پاتے، تو بہت سی ہلکی باتیں کرتے ہیں تو من کو تکلیف ہوتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ صرف ان سے communication ہو جو اس بات کو سمجھ پائیں جن میں ایک wave length ہو لیکن جب کتاب ہوتی ہے تو wave length کی بات نہیں رہتی۔ وہ سب کے ہاتھ میں آتی ہے۔ اب ریڈیو پر تو کسی کا سوئچ آف یا سوئچ آن نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: اس کتاب کے جس حصے پر لوگ سب سے زیادہ چونکے وہ حصہ ہے جہاں آپ نے ساحر کا ذکر کیا ہے۔ اب ذاتی زندگی کی بات تو خیر الگ ہے لیکن جہاں تک ساحر کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے تو ساحر کی

شہرت میں بڑا زوال آیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ لوگ ان کے کلام پر جھومتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں خاصی کمی آ گئی ہے۔ اس میں اب وہ بات نظر نہیں آتی جو اس وقت لوگوں کو نظر آتی تھی جو بات آپ کی شاعری میں اب بھی زندہ وتابندہ ہے تو ساحر کی اس شاعرانہ حیثیت کے زوال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کو یہ شاعری اب کیسی محسوس ہوتی ہے؟

امرتا پریتم: اس کے بارے میں میں کیا کہہ سکتی ہوں، جتنی ان کے پاس تھی، جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے، انھوں نے کہہ دیا۔ جتنا بل تھا ان میں وہ دکھا دیا۔ مجھے یاد آتا ہے، ایک بار کہنے لگے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بھئی میری شاعری صرف teen agers کے لیے ہے، چلو کوئی بات نہیں teen agers پھر پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ تو ہوتے رہیں گے اور جب بھی ہوتے رہیں گے شاعری ان کی پسند کریں گے۔ وہ اصل میں فلموں میں جانے سے ان کا جو emotional side تھا وہ تو بہت آ پایا اور آج کی جسے جدید شاعری کہتے ہیں اس پر کچھ اور کہہ سکتے تھے۔ ان کے پاس طاقت تھی کہنے کے لیے لیکن شاید زندگی نے وقت نہیں دیا شاید ان کی توجہ شاعری کی طرف نہیں گئی جتنی فلم کی طرف ہوئی۔

سوال: امرتا جی اگر آپ بہت ذاتی سوال نہ سمجھیں تو یہ بتائیے کہ اب آپ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں تو آپ کو ساحر کیسے لگتے ہیں؟

امرتا پریتم: ساحر مجھے ایک بہت اچھے انسان لگتے ہیں، emotional، جذباتی اور خاموش۔ ایک ان میں خاص طرح کا سلیقہ تھا خاموشی کا، جو خاموشی کی آواز تھی وہ آج کے لوگوں میں نہیں ملتی یہ ان کی بڑی بات تھی۔ لیکن یہ ضرور لگتا ہے کہ اگر مجھے زندگی پھر سے جینے کو ملے پھر سے کوئی سامنے چناؤ ہو تو زندگی امروز کے ساتھ گزاروں گی بہت کچھ میں نے امروز سے پایا ہے۔

سوال: امرتا جی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ عمر کے مختلف مرحلوں میں آدمی کی جذباتی سطحیں بدلتی رہتی ہیں اور ان کے حوالے سے اس کے responses......

امرتا پریتم: جی ہاں بالکل بدلتی رہتی ہیں اور اس میں جس طرح گہرائی آتی ہے اس طرح سے اس کی تلاش بدلتی ہے۔

سوال: آپ کی تلاش کس طرح سے بدلی ہے؟ جس وقت آپ نے لکھنا شروع کیا تھا ۳۰ء کی دہائی میں، اس سے لے کر جو ایک لمبا سفر آپ نے طے کیا، اس میں آپ کی تلاش کی دشائیں کیا رہی ہیں؟

امرتا پریتم: اصل میں یوں سمجھیے کہ ساحر کو اتنی شدت سے سوچ پانا میرے اپنے خیالوں کا جادو تھا اور ایسے جادو انسان کئی بار بنتا ہے، پھر اس میں خود ہی لپٹ جاتا ہے کچھ اس طرح تھا کیوں کہ سب کلپنا میں تھا، تصور میں تھا، تخیل میں تھا۔ زندگی کی حقیقت میں تو نہیں تھا۔ زندگی کی حقیقت میں بھی وہ قائم رہ پائے یہ تو میں دیکھ نہیں پائی وہاں لیکن امروز کے ساتھ دیکھا کہ شدت زندگی کی حقیقت کس طرح بنتی ہے۔

سوال: بعض زندگیوں میں شدت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ شدت سارا شگفتہ کی زندگی میں بھی تھی، آپ نے اس شاعرہ کا ذکر کیا اور اس حوالے سے بھی اسے شہرت ملی اردو کے بہت سے نقاد اسے اچھی شاعرہ نہیں سمجھتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ آپ نے اس کا اتنا ذکر کیوں کیا، اس کی شاعری کو quote کیوں کیا؟

امرتا پریتم: میں تو اب بھی quote کرتی ہوں۔

سوال: آپ کو سارا شگفتہ کی شاعری مختلف کس وجہ سے محسوس ہوتی ہے؟

امرتا پریتم: میرا خیال ہے کہ سارا شگفتہ جو کہہ پائی ہے اپنی شاعری میں وہ بڑے بڑے شاعر نہیں کہہ پائے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے دلی میں کلچرل فیسٹیول ہوا تھا۔ ایک مہینے چلتا رہا۔ وہاں ایک دن مشاعرہ تھا۔ آپ تو جانتے ہیں آپ کے حالات کیسے ہیں، ہمارے حالات کیسے ہیں، مذہب کے نام پر کتنا جور ظلم ہو رہا ہے تو وہاں میں نے سارا کی ایک لائن سے اپنی نظم شروع کی تھی اس کا نام لے کر، اس کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے کہ اگر میں مسجد میں دعا مانگتی ہوں تو مندر روٹھ جاتے ہیں، تو میں سوچتی ہوں کہ اس وقت جو ہال تھا وہ اس قدر پگھل گیا تھا۔ ایک تو ہم اس دور سے گزر رہے ہیں اور کوئی شاعر اس طرح کہہ پایا ہے جیسے سارا نے کہا ہے کہ 'کیا عورت کا بدن سے زیادہ وطن نہیں ہے' اس کے پیچھے ہماری کتنی صدیاں کھڑی ہیں اس ایک لائن کے پیچھے یا جس طرح وہ کہتی ہے 'خدایا میں بہت کڑوی ہوں لیکن تیری شراب ہوں، کون کہہ پایا ہے یہ؟

سوال: شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے سارا شگفتہ کی زندگی کو بھی بہت قریب سے دیکھا کیوں کہ وہ آپ کو ایک طرح سے اپنی گرو مانتی تھی تو زندگی کرنے کا جو اس کا انداز تھا وہ آپ کو کیسا لگتا تھا؟

امرتا پریتم: مجھے لگا کہ وقت اسے سنبھال نہیں پایا۔ پہلے بھی لگا اور واقعہ ایسا ہوا کہ وقت اسے نہ سمجھ پایا نہ سنبھال پایا۔ میں نے تو ابھی پوری کتاب لکھی ہے سارا کی زندگی پر اور شاعری پر اس کا نام ہے ''ایک تھی سارہ'' اس کے بہت سے حصے اخباروں میں بھی آئے، ہندی میں بھی آئے، انگریزی میں بھی آئے، تو چاہتی ہوں کہ وہ کتاب آپ کے سامنے بھی آئے اور دوسرے لوگوں کے سامنے۔ دوسرے ملکوں میں انگریزی کے

میڈیم سے بھی آئے۔ اس کا ایک حصہ جہاں سے میں نے کتاب شروع کی ہے، آپ کہیں تو کتاب میں سے پڑھ کر آپ کے سامنے رکھ دوں؟

سوال: جی ہاں ضرور۔

امرتا پریتم: (پڑھتے ہوئے) میں نے آسمان سے ایک تارا ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔ بہت تیزی سے آسمان کے ذہن میں ایک جلتی ہوئی لکیر کھینچتا ہوا۔ لوگ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے کہ انھوں نے کئی بار ٹوٹے ہوئے تاروں کی گرم راکھ زمین پر گرتے ہوئے دیکھی ہے۔ میں نے بھی اس تارے کی گرم راکھ اپنے دل کے آنگن میں برستے ہوئے دیکھی ہے۔ جس طرح اور تاروں کے نام ہوتے ہیں، اسی طرح جو تارا میں نے ٹوٹتے ہوئے دیکھا اس کا بھی ایک نام تھا: سارا شگفتہ۔ اس تارے کے ٹوٹتے سمے آسمان کے ذہن میں جو ایک لمبی اور جلتی ہوئی لکیر کھنچ گئی تھی وہ لکیر سارا شگفتہ کی نظم تھی۔ نظم زمین پر گری تو خدا جانے اس کے کتنے ٹکڑے ہوا میں کھو گئے لیکن جو راکھ میں نے ہاتھ سے چھوکر دیکھی اس میں کتنے ہی جلتے ہوئے اکشر تھے جو میں نے اٹھا اٹھا کر کاغذوں پر رکھ لئے۔ نہیں جانتی کہ خدا نے ان کاغذوں کو ایسا شراپ کیوں دیا ہے کہ آپ ان پر کتنے ہی جلتے ہوئے اکشر رکھ دیں وہ کاغذ نہیں جلتے، جن لوگوں کے پاس احساس ہے جلتے ہوئے اکشروں کو پڑھتے ہوئے ان کے احساس سلگنے لگتے ہیں پر کوئی کاغذ نہیں جلتا۔ شاید یہ شراپ نہیں ہے۔ ہے بھی تو اسے شراپ نہیں کہنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو خدا جانے کتنی ہی دنیا کی کتابیں اپنے اکشروں کی آگ سے جل گئی ہوتیں۔

سوال: تو آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ سارا کے اکشروں میں بھی ایسی آگ تھی اور اسی آگ نے اسے جلا ڈالا۔

امرتا پریتم: اسے تو اکشروں کی آگ نے نہیں جلایا۔ اسے تو وقت نے جو اسے پہچان نہیں پایا، اس نے جلایا۔ اب اسی کے جو الگ الگ chapters ہیں، ان کے نام ہیں: مینا بازار، جھانجھر کی موت، چنگاریوں کا مقدر، انسانی کتاب کی آرزو، گجرے کے تین پھول، ایک اور اینٹ، خدا کی گلی، ننگا سورج، ایک چیخ کا اتہاس، ضمیر کا زہر، چوڑیوں کا قہقہہ، زخموں کی گواہی، حوا کا خط آدم کے نام، جلتی بجھتی عورت، ان میں یہ ساری باتیں تفصیل سے آئی ہیں۔

سوال: ابھی آپ نے بتایا کہ آپ نے سارا کی کوئی لائن ایک جلسے میں پڑھی جہاں کچھ سیاست اور مذہب کا بھی ذکر تھا تو یہ جو آپ کے دیس میں آج کل violence ہو رہی ہے، اس کے بارے میں آپ کیا محسوس

کرتی ہیں؟ کیا آج پنجاب کے لیے ایک بار پھر وارث شاہ کو پکارنے کی ضرورت ہے جیسے آپ نے ۴۷ء میں پکارا تھا؟

امرتا پریتم: اصل میں آج کا وارث شاہ تو انسان کی وہ evolution ہے، جو نہیں ہو پائی۔ ابھی دسمبر میں......

سوال: میں سمجھا نہیں، اس بات کی وضاحت کریں گی آپ؟

امرتا پریتم: یہی کہ انسان کی evolution نہیں ہو پائی۔ انسان چھوٹا ہے اور جو منفی طاقتیں ہیں وہ بڑی ہیں۔ ابھی یونیسکو کی کانفرنس تھی دسمبر میں پیرس میں، وہاں میں نے ایک پیپر پڑھنا تھا دنیا میں امن کے لیے، تو یہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ تو وہاں بھی ایک نکتہ اٹھایا جس پر وہ پیپر base کیا، وہ تھا کہ ہم جب تک سائنس اور spirituality کو اکٹھا نہیں کر پاتے تب تک یہ ہنگامے چلتے رہیں گے، جنگ کا خطرہ بھی رہے گا کیوں کہ جنگ کا خطرہ جن باتوں سے شروع ہوتا ہے وہ ہماری روزمرہ زندگی میں ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرت ہے، حسد ہے، انتقام ہے۔ آج یہاں دلّی میں ایک کانفرنس شروع ہوئی ہے اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کی اور سے تو وہاں مجھے ایک بات بہت خوب صورت لگی، راجیو گاندھی نے کہی کہ میں گاؤں میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں اور کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ یہ جو تہذیب ہے کیا ان لوگوں کے پاس ہم سے زیادہ ہے جنھوں نے بالکل کچھ علم حاصل نہیں کیا اور آج تہذیب کے نام پر ہمارے پاس جو کچھ ہے اس میں کتنی منفی طاقتیں شامل ہوئی ہیں؟ ہاں ایک بات جس کا میں ذکر کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ مذہب کے نام پر ہم پوری دنیا کے انسان سے محبت نہیں کرتے اس کے ایک ٹکڑے کو محبت کرتے ہیں۔ ایک فرقے کو محبت کرتے ہیں ایک حصے کو محبت کرتے ہیں باقی حصہ جو چھوٹ جاتا ہے اس سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد امن کیسے ہوگا۔ جب تک ہم پورے انسان کو الگ الگ نقطۂ نظر رکھتے ہوئے بھی، الگ الگ رسم و رواج رکھتے ہوئے بھی، الگ الگ جو باہر کی formalities ہیں وہ رکھتے ہوئے بھی اعتبار نہیں کریں گے کام کیسے چلے گا، تو ہم جو بٹ گئے ہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس کا مطلب ہے کہ جو انسانیت ہے اس کے ایک ٹکڑے کو انسان سمجھ رہے ہیں، الگ الگ ٹکڑوں میں اگر انسانیت کو بانٹ دیں گے تو اس کی بات کیسے کریں گے؟

سوال: اس ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو جسے راج نیتی نے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے جوڑنے کا کام تو کویتا ہی کرسکتی ہے، کویتا اور ساہتیہ۔

امرتا پریتم: ضرور کر سکتے ہیں لیکن وہ ساہت کار بھی کتنے ہیں آج کے وقت میں؟ وہ دنیا کو اتنا دینا نہیں چاہتے جتنا دنیا سے لینا چاہتے ہیں۔ شہرت کے نام پر، پیسے کے نام پر، یہ بہت بڑے ہتھیار ہیں، شہرت بھی بڑا ہتھیار ہے، طاقت بھی، دولت بھی، پیسہ بھی لیکن اگر انسان کے ہاتھ چھوٹے ہوں تو وہ بڑے ہتھیاروں کو کیسے استعمال کرے گا۔ ہاتھ تو کٹ جائیں گے۔ تو ہاتھوں کو بڑا کرنے کے لیے میرا جو سوال تھا، جو میں نے کانفرنس میں پوچھا تھا کہ سائنس بہت بڑی طاقت ہے لیکن سائنس کو استعمال کرنے والے جو ہاتھ ہیں ان میں جب تک spirituality نہیں ہوگی وہ discriminate نہیں کر پائیں گے تو سائنس کا غلط استعمال ہوگا۔

سوال: امرتا جی، پاکستان میں جو آپ کے چاہنے والے اور پڑھنے والے ہیں ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گی۔

امرتا پریتم: یہی جو میں یہاں کئی بار کہتی ہوں کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: ایک جو اکشروں کو پیار کرتے ہیں اور ایک جو اکشروں کا بیوپار کرتے ہیں۔ تو ہم اکشروں کو پیار کرنے والوں کی زندگی بڑھاتے چلے جائیں اور مذہب کے نقطۂ نظر کو اتنا وسیع کریں کہ وہ روحانیت کی منزل کو چھو جائے۔ روحانیت ایک ہی ہوتی ہے، مذہب کوئی بھی ہو اور یہ روحانیت محبت کرنا سکھاتی ہے، نفرت نہیں۔

☆☆☆☆

سمترا چوہدری
انگریزی سے ترجمہ: شبنم شکیل

حدیثِ دل

امرتا اس مٹی سے بنی ہوئی ہے جس سے رومانی باغیوں کا خمیر اُٹھتا ہے۔ ایک تنہا بچپن ایک کرب زدہ نوجوانی اور پھر شدید جذباتی جھگڑوں سے مرتعش دل کی نسوائیت' ایک شاعرہ اور ناول نگار کی حیثیت سے امرتا پریتم ان تمام تجربات کو من وعن صفحہ قرطاس پر اُتارنے میں اعتقاد رکھتی ہے جو اسے پیش آئے۔ وہ زندگی کے لیے شدید جذبات کے گہرے رنگوں میں سر سے پیر تک سرشار ہے۔ ایک عجب سا کرب ہر دم اس کے وجود کا احاطہ کیے رہتا ہے۔ اور جب یہی کرب پگھلے ہوئے لاوے کی طرح اس کی تحریروں میں اپنا راستہ تلاش کر لیتا ہے تو دل کا درد ذرا اوپر کو تھمتا ہے۔ مگر پھر دوبارہ سر اُٹھاتا ہے' فرسودہ اور مذہبی بنیاد پرستی پر اس کے کھلے ہوئے بے لاگ تنقیدی نظریات کی وجہ سے اس پر غیر شائستہ ہونے کی مہر ثبت کی جاتی ہے۔ اس کی چیختی ہوئی دیانت کی وجہ سے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر ان سب باتوں سے بے نیاز امرتا کی زندگی ایک ایسی کھلی کتاب کی طرح ہے جس میں صداقتوں کی خوبصورتی ہے۔

اس کی خودنوشت سوانح ''رسیدی ٹکٹ'' اور ''امرتا کی زندگی اور اس کا عہد'' ایسی کتابیں ہیں کہ جن کے جھروکے سے آپ اس کی زندگی میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ' اس نے کس آدمی سے پیار کیا' کیسے کیسے خواب دیکھے کون کون سی خواہشوں کی آگ میں اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ 75 (پچھتر) کتابوں کی مصنفہ امرتا کو جینا پتھ اور سہاہیتہ جیسی قابل احترام اکیڈمیوں کی طرف سے ایوارڈوں سے نوازا جا چکا ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں نے اسے اعزازی ڈگریاں بھی دی ہیں۔ مگر ان تمام اعزازات کے باوجود ایک درد ہے کہ تھمتا ہی نہیں۔ تب وہ شام کے دھندلکے میں دوبارہ اپنا قلم اُٹھاتی ہے اور اپنے اس انجانے خلا کو بھرنے کے لیے اُسی شدت سے پھر لکھنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سکون باہر کی دنیا سے ملنے والے ان اعترافی اعزازات

میں نہیں۔ روحانی خلا کی اس گہری خندق کو بھرنے کے لیے تخلیقی اظہار کی ضرورت ہے۔ سمترا چوہدری کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اس نے کیسے
کی یہ اسی کی زبانی سنیئے:

ایک فنکار ہونے کے ناتے ادیب کا منصب

ادیب وہ ہے کہ جو اپنی زندگی اور اپنی تحریر کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ اپنی ذات کی تمام ممکنات کی کھوج لگاتا ہے اور پھر وہ اسے معاشرے کو دے دیتا ہے۔ وہ دینے والوں میں سے ہے۔

ہم سب لوگ جسمانی سطح پر زندہ ہیں۔ جب تک ہم جسمانی، ذہنی اور رُوحانی طاقت کو یکجا نہیں کرتے ہماری نجات ممکن نہیں۔ خاص طور پر ایک ادیب کے لیے اپنے وجود کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اور مطابقت کا امتزاج بہت ضروری ہے۔ اسے باطنی ثمر کے ساتھ ہی پھلنے پھولنے اور پختہ ہونے کی ضرورت ہے۔ میں خود اپنی زندگی میں اس امر کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔ مکمل ہم آہنگی اور مطابقت کی اس خوبصورتی کا ابلاغ ضروری ہے۔ تجربے اور اس کے اظہار کے مابین بُعد و تفاوت نہ ہو۔ زندگی کلی طور پر برتنے کی چیز ہے جزوی طور پر نہیں۔

فن اور اخلاقیات

مادیت پرستی کے اس دور میں فن کے نام پر عامیانہ سوچ اور سکینڈلز کی دلالت کی جا رہی ہے۔ ایسے ہی جیسے مذہب کی آڑ میں لوگ قتل و غارت اور تشدد کی دلالت کرتے ہیں۔ یہ مایوس کن اور خطرناک رجحان ہے۔ جنس بذات خود ایک بہت خوبصورت چیز ہے۔ مگر کسی تحریر میں اس وقت عامیانہ اور عریاں نظر آتی ہے جب خود لکھنے والے کے کچھ ''در پردہ عزائم'' ہوتے ہیں۔ کتاب اپنے مقصد کا اظہار ایسے کرتی ہے، جیسے پھول اپنی مہک سے۔ روح کی مہک اپنا تعارف خود ہوتی ہے۔ کسی فن پارے کو تخلیق کرتے ہوئے اگر ادیب خود اپنی ''اعلیٰ ذہنی کیفیت'' میں لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کا قاری ایک ''اعلیٰ ذہنی تجربے'' سے گزرتا ہے تو پھر عریانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ادیب کا نصب العین یہ ہے کہ اس کی تحریریں اس کی ذات کا مظہر ہوں۔ مگر اس امر پر وہ کتنا قادر ہے اس کا فیصلہ اس کی تحریر ہی کر سکتی ہے۔

مذہب

میں مذہب اور دھرم کو الگ الگ سمجھتی ہوں۔ دھرم نام ہے روحانیت کا اور مذہب روحانیت کو ایک آئینی ادارے میں ڈھالنے کا۔ خدا کسی خارجی طاقت کا نام نہیں، وہ آپ کے وجود کا حصہ ہے۔ میں اس بات کی قائل ہوں کہ خدا باطن میں موجود ہوتا ہے۔ اور یہ کہ ہر خوبصورت چیز میں خدا ہے۔

آزادی

خواہ مرد کے لیے ہو یا عورت کے لیے، کلی اور قطعی آزادی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں ہے۔ جہاں ایک سطح پر عورت کا استحصال کیا جا رہا ہے وہاں ایک اور سطح پر مرد کا استحصال بھی ہو رہا ہے۔ آزادی کسی خارجی شے کا نام نہیں۔ یہ خود اپنے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت کے امتزاج کا نام ہے، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اسے خود اپنے آپ سے حاصل کیا جاتا ہے۔

ہم عصر ادیب خواتین

آج کی ادیب عورت کے پاس بہت آگہی ہے۔ شعور ہے جو اس کی تحریروں میں منعکس ہوتا ہے۔ مجھے ایک ایسی عورت یاد آ رہی ہے کہ جس کے بارے میں، میں نے ''ایک تھی سارہ'' ناول لکھا تھا۔ سارہ شگفتہ (30) تیس سالہ پاکستانی شاعرہ تھی۔ جسے میں اس حوالے سے ایک مثال تصور کرتی ہوں۔ وہ اپنی نظمیں مجھے بھیجا کرتی تھی، کیونکہ خود اس کے ملک میں انہیں شائع نہیں کیا جا رہا تھا۔ میں محض دو مرتبہ اسے ملی تھی۔ پھر 1984 میں اس نے خودکشی کر لی۔ وہ بے انتہا شعور کی مالک تھی اور یہ معاشرہ یقیناً ایسی عورت کا مستحق ہونے کے بل ہی نہ تھا۔ میں نے اس کی نظموں اور دو ملاقاتوں کی بنیاد پر یہ ناول لکھا۔

اپنے شہر کی بات

دہلی تقسیم کے وقت سے میرا شہر ہے۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس شہر کی تاریخ بالکل میری ہی طرح ہے۔ مختلف حکمرانوں کی عنایت سے ''یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا'' مگر ہر مرتبہ از سر نو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ پھر سے پھلنے پھولنے کے لیے۔ بالکل اسی طرح میں بہت سی چیزوں سے دل برداشتہ ہو کر اپنے آپ کو ایک کھنڈر کی طرح محسوس کرتی ہوں مگر پھر میری اندرونی طاقت میرا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیتی ہے۔

راجیہ سبھا کی رکن ہونے کی حیثیت سے

میں راجیہ سبھا کی رکن ہونے اور اپنے ادیب ہونے کو کوئی الگ الگ بات نہیں سمجھتی اور میں ان دونوں کے درمیان کوئی تصادم نہیں پاتی۔ جس طرح سے میں اپنا مافی الضمیر اپنی تحریروں کی وساطت سے بیان کرتی ہوں اسی طرح یہی کردار ایوان میں سوالات کر کے ادا کرتی ہوں۔ لیکن سیاست میں کچھ چیزیں مجھے افسردہ بھی کر دیتی ہیں۔ جیسے حزب اختلاف کا کردار۔ کئی مرتبہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حزبِ اختلاف کے ارکان کسی بل پر بحث کرتے ہوئے مخالفت برائے مخالفت کر رہے ہیں۔ گو اہلِ اقتدار کی مخالفت ایک مستحسن عمل ہے مگر ان باتوں کی بھی مخالفت کرنا کہ جو قوم کے مفاد میں ہوں۔ کچھ قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔

غیر مطبوعہ تخلیقات

خواب میرے نزدیک بہت اہم ہیں۔ ایک کتاب جس کی بنیاد میرے خوابوں پر ہے بہت جلد شائع ہو رہی ہے۔ اس کا نام ''لال دھاگے کا رشتہ'' ہے۔ میں نے یہ نام جاپانی فلسفے سے لیا ہے۔ ایک جاپانی راہب تھا۔ جس نے اپنے فلسفے میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ بچہ پیدائش کے عمل کے بعد ماں سے جسمانی طور پر جدا ہو جاتا ہے۔ مگر ذہنی طور پر وہ اس سے جڑا رہتا ہے۔ اس طرح سے ہم سب ذہنی طور پر لامکاں کی کائناتی طاقت سے ہمیشہ منسلک رہتے ہیں اور ہمارے خواب اس تعلق کے مظہر ہوتے ہیں۔ میں بہت دفعہ خوابوں میں اپنے پچھلے جنم کی جھلکیاں دیکھتی ہوں اور اسی حالت میں نظمیں بھی کہتی ہوں اور پھر جیسے ہی جاگتی ہوں انہیں فوراً کاغذ پر لکھ لیتی ہوں ''لال دھاگے کا رشتہ'' میں' میں نے لامکاں سے تعلق اور اپنے خوابوں سے اس کے رشتے کی بات کی ہے۔

قاری اور ادیب کا رشتہ

ادیب کے محسوسات کا مکمل ابلاغ ایک خوش آئند چیز ہے۔ ادیب اپنے پڑھنے والوں کو اپنی زرخیزی طبع میں شریک کرتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ قاری کو ذہن میں رکھ کر نہیں لکھتا وہ صرف اسے شریک کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے ہمدردیوں کی توقع بھی نہیں رکھتا اور نہ اپنی رائے ان پر ٹھونستا ہے۔ اس کی تحریریں اس کے اندر کھلے ہوئے گلزار کی طرح ہوتی ہیں۔ جس کے پھولوں کی مہک وہ ہر طرف پھیلاتا ہے۔ قاری اہم ہے مگر اس سے زیادہ اہم وہ باطنی تسکین ہے کہ جو مکمل ابلاغ سے ادیب کو حاصل ہوتی ہے۔ دولت شہرت' طاقت اور

شناخت وہ ہتھیار ہیں جن سے لوگ اپنی تشبیہ تراشتے ہیں' اس پر نقاشی کرتے ہیں لیکن اگر ان ہتھیاروں کو سنبھالنے کی صلاحیت نہ ہو تو معاملہ اس کے برعکس ہو سکتا ہے اور خود اپنا ہی بُت پاش پاش ہو سکتا ہے۔لوگ اپنی ظاہری شبیہہ پر بہت توجہ دیتے ہیں' مگر میں اپنی باطنی شبیہہ کو زیادہ اہم سمجھتی ہوں کئی مرتبہ میری یہ شبیہہ مجھے کچھ مایوس بھی کر دیتی ہے۔مگر میں اسے بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہتی ہوں اور اس کے لیے حوصلہ بھی مجھے اپنے ہی باطن سے ملتا ہے۔

جب میں اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میرا کوئی ایک بھی ایسا تجربہ نہیں ہے جس پر اب مجھے پچھتاوا ہو۔بقول فیض

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

میری شخصیت جو اس وقت ہے اس کی تطہیر کے لیے ہر تجربہ اپنی اپنی جگہ انتہائی ضروری تھا۔

☆☆☆☆

ایک مکالمہ

گلزار: 'چاند پکھراج کا' میری نئی کتاب، آپ کے لیے

امرتا: اچھی چھپی ہے، نظمیں بھی اچھی ہوں گی۔

گلزار: آپ جیسی تو نہیں ہیں۔ ہم تو سیکھتے ہیں آپ سے۔

امرتا: میرے سے۔۔۔۔۔ایک شیو جی کا بیاہ ہو رہا تھا تو پنڈت جی کہنے لگے کہ تمھارے باپ کا نام کیا ہے۔' انھوں نے کہا، 'وشنو' تو وہ بولے 'وشنو کے باپ کا نام کیا ہے۔' انھوں نے کہا 'برہما' تو وہ بولے 'برہما کے باپ کا نام کیا ہے؟' تو انھوں نے جواب دیا 'میں'۔۔۔تو کون کس سے سیکھتا ہے؟''

گلزار: جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا کالج کے زمانے میں تو ہم اپ کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ اچھی تشبیہ، اچھے استعارے اور اچھی شاعری کے لیے تو پہلے اور دوسرے باپ کا نام تو یاد ہے، اس سے آگے کا یاد نہیں ہے۔

☆☆☆☆

Amrita Pritam
Translated by: Hamza Hassan Sheikh

You Didn't Come

The copses conjured
The lips sweetened
With breeze of forest
You didn't come.

The redness of groves touched
The flowers wore the silk
For the fare of colours
You didn't come.

What did the sky say?
The heated clay too
Drank the drop of blessing
You didn't come.

How is this night?
That in the palace of life
The lamp of separation is,
Still burning
You didn't come.

Amrita Pritam
Translated by: Hamza Hassan Sheikh

Amrita Pritam

There was a pain.
Like a cigarette,
I smoked silently.
Some poems
I knocked off,
From cigarette
Like the ashes.

claim the feelings of love. She will always glitter cn the sky of love and her name will be adorned in the canopy of literature like a bride.

Somehow I always felt that Imroz would have become very sad after Amrita's death. He turned and said, "Why be sad? What I could not do, Nature did."

Her story cannot be completed with out the name of Sahir Ludhianvi. She was involved with him when she asked her husband for divorce. But Sahir then had a new woman in his life. Amrita grew closer to Imroz, whom she had known for many years and they were together for the rest of her life. Sahir remained a bachelor all his life; he had two failed love affairs with Amrita and a singer/actress Sudha Malhotra. These relationships could not be changed into marriage because these women's fathers refused to let them married to a Muslim. His relationship with Amrita Pritam was so passionate, that at one time while attending a press conference, Amrita wrote his name hundreds of times on a sheet of paper.

At the age of 16, the year she married Pritam Singh, an editor to whom she was engaged in early childhood, and changed her name to Amrita Pritam. After her divorce in 1960, her work became more clearly feminist. She worked until 1961 for All India Radio. A number of her works have been translated into English, French, Danish, Japanese and other languages from Punjabi and Urdu, including her autobiographical works Black Rose and Revenue Stamp (Raseedi Ticket in Punjabi). She died in her sleep on 31st October 2005 at the age of 86 years in New Dehli after a long illness. She survived by her partner Imroz, daughter- Kandlla; son-Navraj; daughter-in-law-Alka and her grandchildren-Tauras, Noor, Aman and Shilpi.

Though she is no more in this world but shadow of her love will always remain in this world. Her words will always

Love is a word which carries the depths of oceans. Ironically in societies that worship norms, love when it actually happens violating social system is still a four letter word.

Amrita is considered as a rebel poetess who remained faithful with her inner love for her whole life. She has created an excitement in the society when she decided to spend her life with her lover Imroz who was a painter and much younger than her. They lived together for 50 years, without marrying, under the same roof but in the separate rooms. They believed that in a true relationship, no law is needed. Law is made for irresponsible people.

Amrita says, "We never said, I love you" to each other because love is never claiming with tongue but it is taking care of small things for each other. When we decided to live with each other in the early 1950s, we didn't let anyone interfere with our decision. I told her, "You are my society. I am your society and why do you call it living? Aren't others living in relations?" As far as Sahir is concerned, he never asked her to come to him. If he had, she would have gone. And I would have respected her decision," says Imroz, forever smiling.

Imroz was a shadow, a dedicated friend, a lover and a humble in most ways. Egoless, self-assuming, a heart full of worship.....a love that is any woman's dream.

"What do you like most of Amrita?" Someone asked.

"Her presence." He replied.

When Amrita's body was being consumed by fire, one is introduced to a stoic Imroz deeply in love still but detached.

"At the end of the deserted cremation ground, a few people were standing, silently staring at the burning pyre. Away from everybody, alone, standing in a corner, was Imroz.

that as she is sharing the sorrows of her character as well as soothing their hearts as a grief-sharer.

She has penned many poems on Indo-Pak partition. The afraid and terrified faces became the titles of her poems all those characters who were shedding blood and on the other side others were seeking their way among the beasts for their safety. Her poems echo like the cries of poor. Though she composes the pain of her own but that becomes the representative of whole humanity. Her most famous poem "Aj Aakhan Waris Shah Nun" draws the feelings of many daughters of Punjab, Few lines are as;

Today, I call Waris Shah
Speak from the grave
Today, turn over the page
Of love's book again.

Once, a daughter of Punjab groaned
And you composed a lament
Now millions of daughters
Of this land sob.

Rise, O' narrator of miseries
Look at your Punjab
There are corpses all around
And Chenab is filled with blood.

Whether she composes the poem or pens the story, in both the love and pain remain as a natural feelings perhaps that appears as the representative of her own inner feelings.

Hamza Hassan Sheikh

Amrita Pritam: A Woman or Aphrodite

The deep emotions, the shadows of pain, the pang of separation and the songs of lovers, all these can be felt by any loving soul in the writing of Amrita Pritam. Her poems represent the rippling wave of pain and the short stories overshadow the social problems.

Her characters are vivid and full of emotions like herself. She portrays the life of village and farmers, labourer and the people belonging to lower class are among her characters which are true in emotions, faithful in love and the transparent in their passion. She writes the woeful feelings of dispirited souls with the feather of wounded bird and ink of blood. She feels the emotions of sad hearts and composes those in melancholy lines. She has penned small social topics in between her poems and short stories. Her famous short story "Ik Seeti Mar Mitra" is full of colourful emotions which abide in the deep core of every human. Dev Uncle of "Pardesi" and Karmanwali of "Karmanwali" show the pure characters of the society which are true in their principals of life as well as ignorant of the modern tricks. She talks about humanity boundless and borderless. Her pen doesn't know any kind of differences but shares the pains of every distressed heart.

The rhythm in her stories doesn't allow the reader to leave it incomplete. There is a flow in her story depth in her words and the true emotions in her characters. Her writings show a journey of struggle, love and pains which remain with her from early childhood till her end. After reading her stories it seems

On my visit to Pakistan whenever I pass through Gujranwala, the figure of Amrita jee conjures up in my mind and reminds me the tragic exodus that took place in the wake of partitioning humans. Her main theme for the promotion of Indo-Pak peace, her message of progressivism, secularism and humanism is a beacon light for us to determine our directions towards the salvation of humanity. The present generation has to emulate principles set by her. This is the message on her fourth death anniversary.

Dr Fatima Hussein

Amrita Pritam: The Doyen of Punjabi Literature

I have never met Amrita Pritam personally though I had always wanted to. I knew her through her poetry and novels mainly. As a writer, she was simply par excellence. The images, metaphors, similes and in fact the entire sensibility of her writings was rooted in the traditions and cultural ethos of the land of five rivers. Her famous poem 'Aj Akhan Waris Shah Noon' spoke pathetically of the human tragedy with all its carnage and vandalism that hardly any body can suppress his tears after going through it. Her later poetry is more inclined towards existentialism and that's why she came under the influence of Mahareshis near the fag end of her life. Her autobiography Raseedi Ticket is one of the most frank accounts of ones life that any writer has penned. Her novel Pinjar also deals with the trauma of partition and its characters are so living that the entire holocaust unfolds with a note of deep pathos.

I saw a movie, sometimes back and found it very moving. In fact, after watching this movie, my desire to meet her, increased. Many a times, I passed by her Hauz Khas residence but could not meet her.

Amrita Pritam was a symbol of secularism. She was great protagonist of women empowerment and struggled for it when she was the member of Rajya Sabha. She is perhaps, one of the few Indian writers who have got highest civil awards in India and honoured universally.

age was very troublesome. Her two-hour surgery took five hours. When she returned home, she hoped to walk again but her foot started aching again after a few days so she spent rest of her life on the bed as sitting or walking had become impossible for her because her body and bones were not strong enough for further surgery.

Although she did not need any award, we announced to confer on her Lifetime Achievement Award from the World Punjabi Congress in 2003 as a gesture. We got prepared a shield and Mehmood Butt, a great painter, drew her picture. At the awards ceremony, the Punjabi writers, poets and intellectuals paid rich tributes to Amrita Ji. A documentary on Amrita Ji, produced by Basu Bhatacharya, was also screened on the occasion. When I informed her on telephone about the award, Amrita Ji said it was a real pleasure for her because it was to be given to her in Pakistan but also she could not visit the place where she was born, grew up, got married and gave birth to her two children (her daughter Kundlan and son Noraj were born in Lahore) and where she spent 28 years of her life.

I will always be lamenting that Amrita Ji could not visit Pakistan, where I wanted to arrange a welcome for her in accordance with her status and prominence. She never promised to visit Lahore in spite of my repeated insistence and always used to say: "Well, I will see and will come if I felt to be in a good health." But she did not visit Lahore and I will never be able to forget it.

a Hindi book in which a whole chapter was written on me. She also wrote a few articles in English language on me. All this is an honour for me. Indeed, she was an extremely good person, a great human being, large hearted, promoter of peace, messenger of love and very enlightened woman having progressive views.

Throughout her life, Amrita Ji violated disciplines and revolted against traditions and this was the reason that she achieved great successes in her life. She got a good friend and life partner as Imroz. She first met him in 1955 and they befriended in 1960 before becoming life partners in 1964. They jointly launched Punjabi monthly 'Naag Mani' and established a publication house. This journal was launched in 1966 and closed in 2004. Amrita Ji used to select material for the journal while Imroz was responsible for proofreading and sketch drawing. This magazine of high quality has been very popular and created a group that has been producing a fine literature.

Amrita Ji encouraged good writers and used to praise their writings. She never wrote foreword or preface of every book for her publicity.

When I invited her to visit Pakistan, she said her health was no good enough and would definitely visit Pakistan whenever she got an opportunity. It has always been my passionate desire to see her in Pakistan. Whenever I telephoned her, she attended it and talked to me affectionately. Whether I have been in Pakistan or abroad, I used to make her a telephone call once a week to enquire about her well being.

When Amrita Pritam slipped in bathroom in February 2000 and got a bone fracture, she was 81 and bone fracture at this

Zaman in the darkness of today, we all have come with the same fire in our hearts to welcome him."

It was a great honour for me, who was already taking pride in sitting on the stage with a personality like Amrita Ji.

I also went around Delhi along with Imroz and Amrita Ji. We used to sit together in the evenings and our conversation covered some books, her recitation of any new poem on my insistence and expression of her experiences and observations about Sufis, rishis and dervishes. She showed two documentaries on herself that were made beautifully. I spent three days there just like my own home, just like one stays with his parents. Amrita Ji used to prepare lunch, Imroz placed food at table and prepared tea and sometimes I lent them a helping hand.

When I mentioned that she was not writing Punjabi poetry and had started writing in Hindi, she said she had not written a lot of poetry and did so when felt to do so otherwise she did not make any conscious effort to pen down a poem. She said there is a large readership of Hindi, therefore, it was necessary to write in Hindi.

Amrita Pritam received honorary D Lit degree from the Punjab University in 1987 and the French Government also awarded her an honorary degree the same year, while she received an honorary doctorate from the SNDT University of Bombay (now Mumbai) in 1989 and Punjabi Academy, Delhi conferred Waris Shah Award on her in 1990.

She gifted me her book about writers, including myself. She wrote about the writers and their works. She also gave me

allowed literary, cultural and political activities within walled premises, we screened this drama on the occasion of first World Punjab Conference in 1986 at a house in Lahore. She said she had read the novel, so she knew how difficult production of a drama was, as every character of the novel dropped from eyes as itching of a pain.

Next day, the Urdu writers hosted a reception for me from the platform of 'Qalam Zad' organisation. The reception was chaired by Urdu writer Qamar Raees and Amrita Ji was requested to be the chief guest. She agreed and while speaking about my poetry and novels, particularly 'Bandiwaan', said: "When Fakhar Zaman presents character of 'Z' in his novel 'Bandiwaan', 'Z' says he was murdered yesterday, being murdered today and will be murdered tomorrow. At the moment, I am thinking that Fakhar Zaman and I both are 'Z'.

"I remember Firaq Gorakhpuri used to narrate that the issue of paradise and hell cropped up in the history of literature when people noted the poets and writers filling their hearts with agonies of people and then groan for the whole life. The people who have nothing to do with masses gave two names to the life: paradise that was for them and the hell was for poets and writers. Once chilly winds started blowing in the paradise and they started shivering and thought about getting a little fire form the hell. When they requested the dwellers of the hell to lend them some fire, they replied that there was no extra fire because everyone who came to the hell brought it with him.

"The same fire is burning in the hearts of poets and writers and, none else can share it. To get it, being a poet or writer is a must. The fire of insight that is burning in the shape of Fakhar

When Bulgaria instituted an award in memory of its revolutionary poet Nikola Vaptsarov in 1997 and selected five writers from Russia, the United States, Italy, Poland and India for this award, Amrita Ji was selected from India. She received this award at a ceremony on October 16, 1980. In his speech on the occasion, the president of the award committee said: "We, Bulgarian writers and people are happy that a prominent Indian writer and poetess is our friend. We published her writings in Bulgaria and love it because her poetry accepts struggle for social values and human welfare."

Amrita Ji was given the symbol of liberty---an injured bird made of brass with wings spread skyward-and half of the award money ($ 1,300) in cash. She was honoured for attending the International Sofia Meeting of Writers attended by writers from 22 countries.

Amrita Ji was nominated for membership of Rajiya Sabha in 1986. In 1987, I was in Holland when renowned Punjabi fiction writer Ajeet Kor invited me to attend a two-day Punjabi Kahani Conference about my presence in the city. She asked me to reach her residence.

I reached her Hauz Khas home and stayed there for three days --- the golden moments of my life. I discussed with her literature, politics and Sufism as well as Punjabi Literature, literary figures and also exchanged views on Pakistan-India relations.

She knew about ban on my Punjabi books during the rule of Gen Zia-ul-Haq. When I asked her to watch video of a drama on my Punjabi novel 'Bandiwaan', she asked astonishingly how you produced a drama on this novel despite ban on your books. I informed her that when Zia-ul-Haq

strictly. So whenever I went abroad, I usee to write her letters and call her on telephone. On this, Amrita Ji always got pleased.

I came to know about Amrita Pritam after reading all her writings, particularly her biography 'Raseedi Ticket' (Receipt Stamp) that got published in 1976 and its second part titled 'Mein Jama Toon'. 'Raseedi Ticket' made a stir in the literary circles and several people objected that she might not have mentioned some points but I think there is nothing of this sort. In fact, she had no double standards and used to mention everything in a straight way. She did not conceal anything, on the pretext of any diplomacy, about her friends, her life and her views with regards to literature. I think every true author should do the same.

A poem written by Amrita Ji on the bloodshed on the occasion of division of India in 1947 'Aj Aakhan Warish Shah Noon Kton Qarban Vichon Bol' immortalised her in the Punjab poetry. She was the first woman recipient of of the Sahitya Akademi Award on collection of her Punjabi poetry 'Sanehre' and the title of Padma Shree in 1969. She received three D Lit degrees from Delhi, Jabalpur and Vishva Bharti Universities in 1973 and 1983 respectively.

Amrita Pritam visited Moscow on the occasion of World Peace Congress in 1973. Earlier she visited Tashkent, Tajikistan and Uzbekistan on the invitation of Moscow Writers Union in 1961 and Bulgaria in 1966. She was sent to Yugoslavia, Hungary and Romania by the Indian Government under a cultural exchange programme in 1967. She mentioned details of these visits in 'Raseedi Ticket' but the award she received from Bulgaria in 1980 was very important.

Fakhar Zaman

Amrita Pritam: A Great Wordsmith in Punjab's Literary History

When I was in college, I got inspiration from Amrita Pritam's poetry work, 'Naveen Rut' (New Season), to write in the mother language. However, the poetry of Amrita Ji impressed me a lot and besides Urdu and English, I started writing in Punjabi language. My first book 'Kanso Vele Dee' hit the bookshelves in 1972 and I sent a copy to Amrita Ji.

When telecasts of Indian TV started to be watched in Pakistan and the channel started airing Indian films, there was so much eagerness that people installed huge antennas to watch telecasts clearly. I used to watch with lot of interest the Punjabi Literary Programme 'Darpan' that was presented by Amrita Ji. One day she commented on my book and said: "This is very good poetry. These poems speak of a new sensibility and have given a new trend and shape to the Punjabi poetry. It has modernism and symbolism."

In reply, she wrote: "I got your book, I read and liked it. I expressed my views explicitly on everything liked by me."

Later, second book of my poetry 'Vangaar' got published and then my novel 'Satt Gawache Log' reached India. Amrita Ji liked my novel so much that she often mentioned it on television. Then I sent my next novels including 'IK Mare Bande Dee Kahani', 'Bandiwaan' and 'Be Watna' to Amrita Pritam. At that time, the travel from India was banned, however, correspondence continued but that too was censored

them, looked after them, and brought out their books as the finest of fine sculptures, like immortal paintings. Including Amrita's books which were always designed by Imroz. Bhapa Pritam Singh, who passed away a few months back! He published almost all the books which later got Sahitya Akademi Awards. And he himself was honoured almost twenty times with National Awards for publishing.

A whole goldan era of Punjabi literature, over which Amrita Pritam reigned supreme like a queen! Writing superb poetry which goes beyond times, writing the immortal poems including 'Ajj Aakhan Waaris Shah Noo' : the superb poem which contained the pain of Partition of the country, the 'Nine Dreams of Tripta' : Nanak's mother, 'A Travelogue of Thirst', and many others which created new imagery, distinctive style, new vocabulary, deep emotions and a unique lyrical quality.

From her prose, her novel 'Pinjar' (The Skeleton), and the short story 'Shah Di Kanjari (The Landlord's Prostitute) will live for ever.

Though we were only a couple of friends around her when she departed, all Punjabi lovers, all Punjabi writers and readers, all over the world, cried for her!

merry-making!

"Don't they know? Doesn't anybody realize that the queen of Punjabi literature is going on her last journey?"

In the shadows of descending deep grey dusk, in the desolate and forlorn crematorium of Green Park, her body was kept on the rough wood. Nobody knew what to do.

'Any special prayers?' the crematorium incharge asked.

All of us were silent.

The sort of affinity with the Ultimate that she had achieved, the sort of merging with the Infinite that only she was capable of attaining, resulting in absolute peace, and an end to all questions she had ever been asking all the realized souls including all the Sidh Yogis who flocked to her, including Osho Rajneesh, had been resolved. It didn't make any difference to her sort of last rituals were performed and what sort of prayers were said. Because all these prayers couldn't reach even the threshold of her exalted abode.

She had said all her prayers, and had gone beyond prayers, reaching a stage of communication and diving deep within one's soul where eternal light dwells! Ultimately resolving all questions, all queries! She had already 'arrived' where she had endeavoured to arrive.

When she went up flames, an important era of Punjabi literature came to an end. An era inhabited by the great Pubjabi writers like Nanak Singh, Bhai Veer Singh, Sardar Gurbaksh Singh, Mohan Singh, Charan Singh Shaheed, Dhani Ram Chatrik, Feroz Deen Sharaf, Kulwant Singh Virk, Balwant Gargi, Shiv Batalvi, Harbhajan Singh, Devinder Satyarthi !

And the greatest of the great Punjabi publisher, who had published all of them, over half a century and more, nurtured

A total merger of two souls! An absolute emersion in each other!

Their love was like an eternal journey towards

'moksha' ! Towards some unknown destination of ultimate redemption, tasting its nectar in every moment of their lives

....

It was four in the afternoon. According to her wish, hardly anybody was informed. No last bath was given. Clothes were not changed. No wailing, no crying, no photographs. She had planned all of it long back and ordered that her body should be taken without unnecessary delay to the crematorium.

From her first floor room, Imroz picked her up, wrapped up in the bed sheet she died on, like his own child, because she 'was' his only child, ever since they had decided in the very beginning of their relationship not to produce any child of their own, because they had to bring up the two children from her first marriage, Sally, the son, the flower of her womb, and Kandla whom she had adopted when my father, who treated her in Lahore, had advised her not to produce a child until she was fully cured, which took almost three to four years, and she needed a child. So she brought this chubby little girl, large-eyed and helpless, from an orphanage. Sally was born after she was completely cured.

In her last journey, she was accompanied by just four-five friends, and Imroz, her son and daughter, two grandchildren.

It was Diwali eve. Dazzling lights, crackers, people buying sweets in their finest saris and suits and diamonds and jewellery, revelory and noise on the streets!

Our small caravan of just the dead-bodies van, and two cars following it, passed through all the noise and

For the last three years, it was Imroz who had been looking after her like a mother. He, and Alka, Amrita's daughter-in-law.

Inderjeet met her in late fifties. After reading her first novel 'Doctor Dev', he rang her up. "Hello?" - She asked.

"Doctor Dev", he said, and put the receiver back into its cradle keeping also the surge of his love and emotion for Amrita in a cradle of silence.

He is a painter. For earning a living during the first creative years, when paintings are a private passion, but necessities of life and of painting materials makes people work on other jobs for making a living, he was working for an Urdu magazine 'Shama', making sketches to go with the poems and stories, and designing its covers.

'Shama' decided to serialise 'Doctor Dev' in Urdu translation. Designing was allocated to Inderjeet (now Imroz). He met Amrita to have a look at the sketches that Inderjeet had prepared, and it was the beginning of a unique relationship, the sort of relationship that kings immortalise in Taj Mahals!

Amrita would look at Imroz, and from the flicker of her eyelashes he knew if she wanted tea, or a cigarette, or wanted him to make a phone call!

They communicated with each other through their silences, with the sheer magic of togetherness.

It was a couple I have not come across anywhere else, in the whole of my very small world! Two suns revolving around each other in their two orbits, in infinite space, searching for the ultimate in life together with a simple naivety and beautiful, unparalleled companionship,

Ajeet Cour

An Era Vanishes

When the message came that Amrita had passed away, it struck me like a hammer against the ribs.

All of us, who had seen her suffering during the last three years, had been expecting this.

Even she was expecting the end almost with restless longing.

During the first phase of her slipping into a horribly unending suffering, she longed for death.

Later, when she drifted into the twilight zone of forgetfulness and oblivion, she waited with amazing patience and resignation.

.....

At her home in Hauz Khas, on her bed, she was lying like a cuddled-up embryo in a mother's womb.

Her body had shrunk! She looked almost like a cuddled-up child, in deep slumber, seeing dreams of fairylands and butterfly lands.

Her arms and legs were folded up, as if she was holding herself in an eternal embrace.

He was there, her love, her companion for the last forty years, looking peaceful and composed and resigned. Like a saint! Inderjeet, who had merged his self in Amrita, and acquired the name which contained syllables from both their names Imroz, He had spent almost half a century in a unique, meditative love with Amrita.

Amrita Pritam
Translated by Kartar Singh Duggal

Virgin

When I moved into your bed
I was not alone--- there were
two of us
A married woman and a virgin
To sleep with you
I had to offer the virgin in me
I did so
This slaughter is permissible
in law
Not the indignity of it
And I bore the onslaught of
the insult
The next morning
I looked at my blood stained
hands
I washed my hands
But the moment I stood
before the mirror
I found her standing there
The one whom I thought I
had slaughtered last night
Oh God!
Was it too dark in your bed
I had to kill one and I killed
the other?

clean-shaven Sikh.) He not only loved her, painted her eyes on doors and walls, designed book jackets for her but in the past few years of her life, when she was unable to move, looked after her to the last. He gave me a line drawing of Waris Shah, which I keep in my studio as an emblem of eternal love.

never looked back.

My first disappointment came when she won the Sahitya Akademi Award. She was a member of the selection panel. She cast the deciding vote in her own favour. I found it hard to digest but said nothing to her. When she was served with a warrant by an Amritsar Court for something she had written about Sikhism, I agreed to accompany her. Nothing came of it. When Krishna Sobti took her to court for stealing the title of her autobiography Zindaginamah, I appeared in the Delhi High Court as a defense witness. Other troubles came her way, I stood by her.

Amrita was not a highly educated woman, not exposed to good writing in languages other than Punjabi nor sophisticated enough to add new dimensions to her own. She was besotted by Bollywood and believed getting one of her novels or short stories accepted by a film-maker was the ultimate in success. All her stories and novels were sob stuff and uniformly second rate.

When I translated Pinjar, I gave half the share of royalties due to me to her on condition that she would tell me her life story and her love life. We had many sessions. She conceded she had been in love with Sahir Ludhianvi and no one else. He came over to Delhi to meet her. It came to nothing. I told her love life could be written behind a postage stamp. She used it as a title of her autobiography Raseedee Ticket. About Imroz, the one who devoted most of his life to her, she had not much to say. (He is not Muslim as the name might indicate, but a

Singh. The offer was readily accepted. On marriage, Amrita added her husband's name to her own and became Amrita Pritam. I met her couple of times in Lahore with other Punjabi writers all of whom were infatuated by her, chief among them Mohan Singh Mahir, then acknowledged as the best among younger poets. He claimed his affection was reciprocated. Amrita assured me it was not.

I got closer to Amrita Pritam after 1947 when we migrated from Lahore to Delhi. She got a job in the Punjabi service of All India Radio. It was about that time she decided to make a clean break from her past. She persuaded her husband to divorce her leaving their son in her custody. She did not formally renounce Sikhism but cut off her hair and took to smoking heavily. It was also around this time she composed her poem Aaj Aakhaan Waris Shah Noo addressed to the Sufi poet Waris Shah, author of the most famous tragic Punjabi saga of Heer & Ranjah.

Utth dard-mandaan dey dardiyaa tak apna Punjab
Beyley laashaan vichhiyaan
Teh lahoo da bharya Chenab

(Sharer of stricken hearts,
Look at your Punjab,
Corpses are strewn in the field
Blood flows in the Chenab.)

With this memorable lament, Amrita Pritam shot into fame in the Punjabi speaking world, both Pakistani and Indian. She

Amrita Pritam: Queen of Punjabi Literature

I had known Amrita Pritam for more than 60 years and, besides her live-in gentleman companion and her children, been closer to her than anyone else. I was the first to translate some of her works into English, including her best-known novel Pinjar (The Skeleton) and selections of her verse published in the brochure released by Prime Minister P.V. Narasimha Rao when she was given the Jnanpith Award. However, when T.V. and radio channels asked me to pay tribute to her when she died on October 31, I firmly said no. Then I heard and read what others had to say about her. Patwant Singh on N.D.T.V., in his usual haw haw English, spoke about her steadfast adherence to political principles. As a matter of fact, Amrita never bothered about politics and hardly ever read newspapers. Obituaries in newspapers repeated the same things about her life and work loaded, as is their practice, with superlatives. No one dared to mention her human failings. Amrita's father was a pracharak - a preacher of the Sikh faith from Gujranwala, where she was born. After the death of his wife, father and daughter moved to Lahore. Amrita grew into a pretty girl with almond-shaped eyes, fine features and a fair complexion. She was also petite, barely five feet tall and precocious. She began composing poetry in her teens. Her earliest work was in praise of Sikh gurus and what they stood for. She was lauded for her work. Among her many admirers was Jagat Singh Kwatra, owner of the leading hosiery store in Anarkali Bazaar. He asked for her hand for his son Pritam

پینٹنگ: امروز

پینٹنگ امروز

پینٹنگ وسیم خورشید
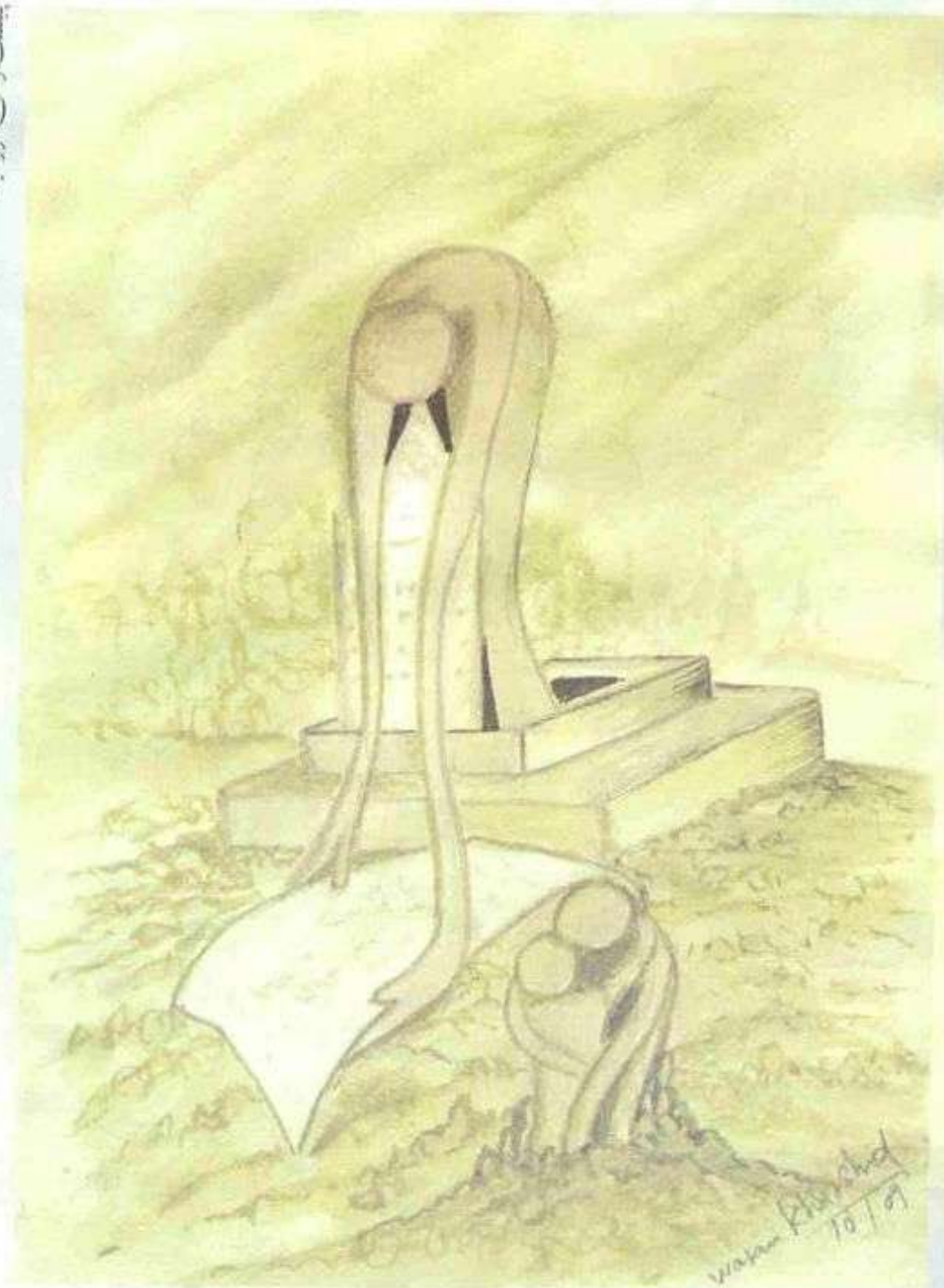
سہ ماہی ادبیات

چند خصوصی شمارے

سرورق کا مصور
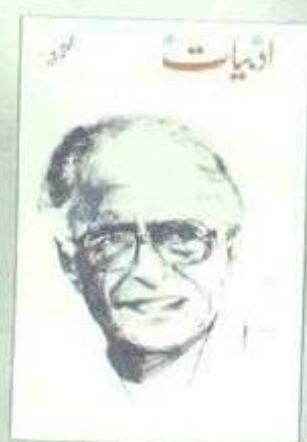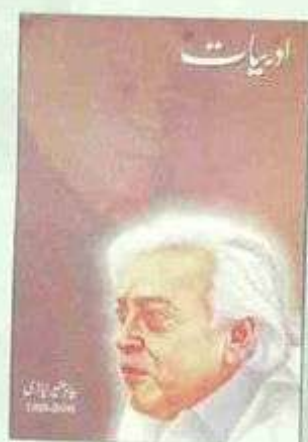
امروز

پیدائش: 26 جنوری 1926ء لائل پور، پاکستان

1943ء میو سکول آف آرٹس میں داخلہ لیا جہاں تین سال پینٹنگ سیکھی

1957ء میں دہلی میں امرتا پریتم سے پہلی ملاقات ہوئی

''کھیتوں میں کھیلتا کھیلتا رنگوں سے کھیلنے کے لیے لاہور کے میو آرٹس سکول میں جا پہنچا۔ تین سال آرٹس سکول میں رنگوں سے خوب کھیلا۔ آرٹس سکول کے بعد میں زندگی کے سکول میں داخل ہو گیا۔

جو کچھ ہو چکا ہے اسے دہرانے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے ہر وقت کچھ نیا کرنے کا شوق رہتا ہے اور میں اس کا انتظار بھی کرتا ہوں۔ میں نے ممبئی میں دو سال سینما کے بینرز بنائے، فلموں کے پوسٹر تیار کیے پھر مجھے کیلی گرافی نے اپنی طرف کھینچا۔ اگلے چھ سال میں "شمع" رسالے میں اپنی طرح کی کیلی گرافی کرتا رہا۔ ٹیکسٹائل ڈیزائن بھی بنائے، گھڑیوں کے ڈائل بھی ڈیزائن کیے اور ایک عمر شاعرہ امرتا پریتم کے ساتھ محبت اور آزادی کا "ست سنگ" دیکھا اور جیا''۔
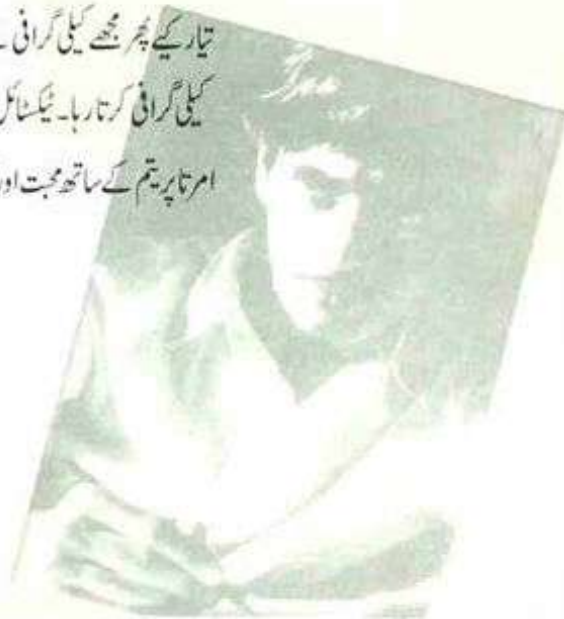
اکادمی ادبیات پاکستان کی تازہ مطبوعات

Quarterly Adabiyat Oct 2009 - Mar 2010

Amrita Pritam No.

آکھاں وارث شاہ نوں!

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول!
تے اج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول!
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وَین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن:
وے دردمنداں دیا دردیا! اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب

Pakistan Academy of Letters
Pitras Bukhari Road, H-8/1, Islamabad, Pakistan
www. academy.org.pk